ماہِ نو
1088
کے چار سال

جناب ذوالفقار علی بھٹو ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو آئین کی منظوری سے پہلے قومی اسمبلی سے خطاب کر رہے ہیں

ماہِ نو

مدیر اعلیٰ : بیگم مسرت برکی
مدیر : فضل قدیر
نائب مدیر : سید علی محمد حسینی

نومبر - دسمبر ۱۹۷۵ء
اشاعتِ خاص

جلد : ۲۸ چندہ سالانہ نو روپے
شمارہ : ۶ قیمت فی پرچہ : ڈیڑھ روپیہ

اس شمارے میں

ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۵۵، راولپنڈی

خورشید پرنٹرز۔ اسلام آباد

ابتدائیہ

کاروانِ ملت جواں عزم قیادت کی رہنمائی میں اپنے تابناک مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ عزم و ایمان کا فیضان ہے کہ آج عوامی حکومت نظم مملکت کے بارِ عظیم کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے اپنی حیاتِ فروزاں کے چار سال مکمل کر چکی ہے۔ اگر قوموں کی حیاتِ سیاسی پر نظر کیجئے تو یہ چار سال چند ثانئے قرار پائیں گے، مگر اس انتہائی قلیل مدت میں وہ کام انجام پا چکے ہیں جن کے لئے صدیوں کا عمل درکار ہوا کرتا ہے۔ ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی ٹھٹھرتی سرد رات میں جس آواز نے مایوسیوں کی سیاہ بدلیوں کو چیر کر یہ اعلان کیا تھا کہ ہم چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو چن کر ایک نیا پاکستان بنائیں گے وہ آواز آج ایک لازوال صداقت بن کر نہ صرف نئے پاکستان کی مستند آواز ہے بلکہ تیسری دنیا کے مضطرب انسانوں کی بھی مستند آواز بن چکی ہے جو متمول دنیا سے اپنے حقوق طلب کر رہی ہے۔

اس مختصر ترین مدت میں قوم نے جو فاصلہ طے کیا ہے اس پر اقوامِ عالم ششدر ہیں۔ شکست خوردگی اور مایوسی بھاپ بن کر تحلیل ہو گئی۔ ۹۳ ہزار سے زائد جنگی قیدی باعزت طور پر وطن لوٹ آئے۔ قوم نے انتظام و انصرام ملکی کے لئے آئین بنا لیا۔ جمہوریت کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں۔ محنت کشوں کی زندگیوں میں خوشیاں ڈول آئیں۔ مفلوک الحال کسانوں کے دن پھرتے، تعلیم عام اور مفت ہوئی، قومی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا اور ملکی دولت کے آبشار استحصال پسندوں کی مٹھیوں سے نکل کر عوام کی خدمت کے لئے رواں ہو گئے۔ یہ صفحات ابھی لکھے ہی جا رہے تھے کہ ایک اور مژدۂ جانفزا ملک بھر میں گونجنے لگا۔ تقریباً ۸ لاکھ چھوٹے مالکانِ اراضی کو مالیانہ معاف کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا اعلان تھا جس نے زرعی دنیا میں مسرت کی نئی لہر دوڑا دی۔ ان صفحات میں سیدھے سادے انداز میں ہم نے قوم کے سامنے ان چار سالوں کی میزان رکھ دی ہے۔ توقع ہے کہ ہمارے قارئین بصیرت سے اس کا مطالعہ کریں گے۔ اور ایک مرتبہ پھر قوم کے لئے خود کو وقف کر دیں گے اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کی تعمیر میں منہمک ہو جائیں گے۔

بلاشبہ یہ موقعہ ایک مجموعۂ عیدین ہے۔ اس مہینے قوم نے نئے عزم کے ساتھ نئے سفر کا آغاز کیا۔ اسی مہینے میں ہم معمارِ پاکستان حضرت بابائے قوم کا جشنِ ولادت مناتے ہیں اس شمارے میں مرحوم قاضی محمد عیسیٰ کا مضمون قائدِ اعظمؒ کی سوانح میں ایک خوبصورت نگینہ بن کر دمک رہا ہے اس کے لئے ہم قاضی صاحب موصوف کے ممنون ہیں۔ علامہ اقبال کا ایک نایاب خطبہ اور طوطئ شکر مقال خسرو پر مضامین بھی یقیناً قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوں گے ــــ خدا کرے یہ شمارہ قبولِ عام حاصل کر سکے۔

(ف۔ق)

قائداعظم میری زندگی میں ۔ چند جھلکیاں

قاضی محمد عیسیٰ

سال ۱۹۳۴ء تھا اور غالباً ستمبر یا اکتوبر کا مہینہ تھا۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ لندن کے پارک لین ہوٹل واقع پیکیڈلی (PICCADILLY) کے پیش کمرہ میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ہوٹل کے گول چکر والے دروازے (REVOLOVING DOOR) سے میں نے ایک خوش پوش شخص کو ہوٹل میں وارد ہوتے دیکھا۔ کئی لوگوں کو میں نے اپنی نشست کے دوران ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا لیکن کسی پر بھی میری نظریں ایسی نہ جمیں جیسے اس شخص پر۔ بہترین سوٹ میں ملبوس یہ شخص ہوٹل کے دفتر استقبالیہ کی طرف بڑھا اور وہاں سے اپنی چابی حاصل کر لی۔ پھر وہ لفٹ میں اوپر کو چلا گیا۔ میں تمام وقت اس شخصیت کو معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ آخر رہا نہ گیا اور میں استقبالیہ کے دفتر پہنچا اور پوچھا کہ وہ کون صاحب تھے؟ برجستہ جواب ملا "مسٹر جناح"

میں بیرسٹری کی غرض سے انگلستان میں مقیم تھا اس دن میں نے دل میں عہد کیا کہ میں بھی اپنے وطن کی اس مایۂ ناز ہستی کے جو ایک نامور قانون دان بھی ہے نقش قدم پر چلوں گا۔

۱۹۳۸ء میں بیرسٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں اپنے وطن واپس آیا۔ اور ارادہ کیا کہ کراچی میں اپنی پریکٹس شروع کروں۔ لیکن یورپ کو دیکھنے کے بعد دل میں یہ خواہش تھی کہ پورے ہندوستان کو بھی دیکھ لوں اور اس کے بعد جم کر اپنا کام شروع کروں۔ چنانچہ آخر جنوری ۱۹۳۹ء میں بمبئی پہنچا۔ چند دنوں کے قیام کے بعد اپنے ایک دوست ہز ہائی نیس نواب طالع محمد خان والیٔ ریاست پالن پور کے ہمراہ بمبئی کے مشہور گھوڑ دوڑ کے میدان پہنچا۔ ایکلپس کپ (ECLIPSE CUP) کا دن تھا ریس کورس میں تماشائیوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ میں باکس میں بیٹھا دوربین سے دوڑ کے میدان اور تماشائیوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک میں نے پیڈک (PADDOCK) یعنی اس چکر کے قریب جہاں گھوڑے ریس سے پہلے گھمائے جاتے ہیں اور جہاں لوگ ان کا قریب سے جائزہ لیتے ہیں۔ "مسٹر جناح" کو دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں گھوڑدوڑ کی کتاب تھی اور ایک آنکھ پر مونیکل عینک لگی ہوئی تھی۔ بے ساختہ میں نے نواب صاحب سے پوچھا کہ "کیا وہ مسٹر جناح ہیں؟" مجھ سے انہوں نے دوربین لی اور اس میں دیکھا اور دیکھنے کے بعد فرمایا: "ہاں مسٹر جناح ہی ہیں۔" "میں نے پوچھا کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟" جواب ملا "ہاں" "مجھے ان سے ملایئے"۔ میں نے بے چینی سے ان سے کہا۔ وہ میرے ہمراہ گئے اور جہاں مسٹر جناح کھڑے تھے ان سے ملے اور میرا تعارف ان

قائداعظم بلوچستان مسلم لیگ کے سابق صدر قاضی محمد عیسیٰ کے ساتھ

آل انڈیا مسلم لیگ کا چھبیسواں سالانہ ا

مسلم لیگ کے ایک سالانہ اجلاس کا منظر

مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لاہور میں
قائداعظم، لیاقت علی خان اور نواب ممدوٹ کے ساتھ

قائداعظم پہلی مجلس قانون ساز میں
رجسٹر پر دستخط کر رہے ہیں

اعظم مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ساتھ

قائداعظم کارکنان مسلم لیگ سے
خطاب کر رہے ہیں

قائداعظم کے دورہ سرحد کی ایک تصویر

مسلم لیگ نیشنل گارڈز

سے کرایا۔ پہلا جملہ جو نہایت گرمجوشی سے ان کی لبوں سے نکلا وہ تھا: "اچھا تو آپ بلوچستان سے آئے ہیں.....وہاں میری کوئی مسلم لیگ نہیں۔ وہاں میں نے ہر چند کوشش کی کہ کوئی ایسا شخص ملے جو کام کر سکے لیکن اب تک مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اچھا تو پھر تم یہ کام کیوں نہیں شروع کر دیتے؟" جواباً عرض کیا۔ "حضور میں ابھی ابھی انگلستان سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آیا ہوں۔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ مسلم لیگ کیا ہے اور ایک سیاسی جماعت کی بنیاد کیسے رکھی جاتی ہے۔" جواب ملا "تو اچھا تم اور نواب صاحب کل میرے ہاں لنچ پر آنا" ان دنوں قائدِ اعظم کا قیام مالا بار ہل کے اس مکان میں تھا جو لٹل گیبز روڈ پر تھا۔ (بعد میں اسی مالا بار ہل پر انہوں نے ایک دوسرا گھر بنایا۔ جس میں تقسیم کے وقت تک مقیم رہے) لنچ کے بعد نواب صاحب رخصت ہو گئے اور قائدِ اعظم نے شام تک مجھے اپنے پاس بٹھایا اور تحریکِ مسلم لیگ سے آشنا کیا۔ شام کو اپنی موٹر میں ہوٹل تاج محل بھیجا۔ ان کی محبت، اخلاص اور جذبے نے اس حد تک مجھے گرویدہ کر دیا کہ پریکٹس کا خیال دل سے نکل گیا اور میں واپس کوئٹہ پہنچ کر تن من دھن سے خدمت مسلم لیگ میں مشغول ہو گیا۔ صوبہ کے ہر ضلع اور تحصیل میں لیگ کی شاخیں قائم کیں۔ اس وقت تک کانگریس کی ہمنوا "انجمن وطن" کے لئے صوبے کا سیاسی میدان صاف تھا۔ لیکن اب مسلم لیگ کے ساتھ اس کی زور آزمائیاں شروع ہوئیں۔ حق کے سامنے کہاں کوئی ٹھہر سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ سیاست بلوچستان پر مسلم لیگ غالب آئی۔ غالباً ستمبر ۳۹ء میں صوبہ بلوچستان کی مسلم لیگ کا الحاق آل انڈیا مسلم لیگ سے پہلی بار ہوا۔ دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس تھا۔ قائدِ اعظم صدارت فرما رہے تھے۔ میں بھی خاص دعوت نامہ کے تحت ہال کے آخر میں دبک کر بیٹھا تھا۔ چونکہ بلوچستان صوبائی مسلم لیگ کا الحاق اس وقت تک نہیں ہوا تھا۔ اس لئے صوبہ بلوچستان کا کوئی رکن کونسل کا ممبر نہ تھا۔ کونسل کی کارروائی کے اختتام پر قائدِ اعظم کرسی سے اٹھے اور کونسل سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "آپ حضرات کو معلوم ہے کہ اب تک صرف صوبہ بلوچستان ہی ایک ایسا صوبہ تھا جس میں ہماری کوئی تنظیم نہ تھی۔ لیکن میں نہایت خوشی سے آج یہ اعلان کرتا ہوں کہ گذشتہ چند مہینوں سے وہاں بھی ایک زبردست انقلاب آگیا ہے۔ اب وہاں بھی ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہمارے ممبر بنے ہیں اور برابر بن رہے ہیں۔ پرائمری لیگوں، تحصیل لیگوں اور ضلع لیگوں کا جال بچھ گیا ہے۔ یہ کام گذشتہ سردیوں میں میں نے قاضی محمد عیسیٰ کے سپرد کیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ انہوں نے نہایت تندہی سے یہ کام سرانجام دیا ہے۔" ہال میں ہر طرف سے آوازیں اٹھیں۔ "ہم قاضی عیسیٰ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسٹیج پر بلایا جائے۔" جب آوازیں کم ہوئیں قائدِ اعظم نے مائیک پر کہا۔ "قاضی عیسیٰ اسٹیج پر آؤ۔"

لندن کے سلے ہوئے سوٹ میں ملبوس شرماتے ہوئے ہال کے آخر صف میں سے اٹھ کر میں آگے بڑھا۔ ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ اسٹیج کی سیڑھیوں کے پاس جب پہنچا تو وہاں بیٹھے ہوئے اکابرین لیگ نے مجھے اسٹیج پر گھسیٹ لیا۔ اور ہر ایک بغل گیر ہوا۔ نواب صاحب چھتاری نے بغل گیری کے بعد کہا۔ "ارے میاں جب ہم نے سنا کہ بلوچستان کے قاضی صاحب نے چند مہینوں میں یہ معجزہ کر کے دکھایا ہے تو خیال تھا کہ بلوچستان کا قاضی کوئی بھاری عمامہ پہننے والے اور ڈھیلے ڈھالے شلوار پوش کوئی سفید ریش ہوں گے۔" یہی الفاظ پھر انہوں نے مائک پر بھی دہرائے۔

چند ہی مہینوں کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس کا لاہور میں ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو انعقاد ہوا۔ بلوچستان مسلم لیگ کے مندوبین نے کثرت سے اجلاس میں شرکت کی۔ اس کے علاوہ بلوچستان مسلم لیگ نیشنل گارڈز کا ایک دستہ بھی خدمت قوم کرنے کے لئے ہمراہ تھا۔ قائدِ اعظم کے ارشاد پر میں نے صوبہ بلوچستان کی طرف سے پاکستان ریزولوشن (یعنی وہ قرار داد جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں پیش ہوئی) کی تائید میں تقریر کی (بر کوچک پاک و ہند میں میں تنہا وہ شخص رہ گیا ہوں جس نے اس قرار داد کی تائید کی) اس تاریخی اجلاس

کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کی نئی ورکنگ کمیٹی قائدِ اعظم نے مقرر کی اور مجھے ممبر لیا گیا۔ اس طرح مجھے یہ شرف حاصل ہوا کہ سب سے کم عمر ممبر تھا جو مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں لیا گیا۔ صوبہ سرحد میں چونکہ سرخ پوشوں میں خدائی خدمت گاروں یعنی کانگریس کے ہواخواہوں کا زور تھا۔ قائدِ اعظم چاہتے تھے کہ صوبہ سرحد کے لوگوں کے سامنے لاہور ریزولوشن کی تشریح کی جائے اور وہاں کے لوگوں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جائے اس غرض کے لئے قائدِ اعظم نے میری قیادت میں ایک وفد صوبہ سرحد بھیجا۔ وفد کے دیگر اراکین میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم مولانا عبدالحامد بدایونی مرحوم اور مولانا کرم علی ملیح آبادی تھے ہم نے صوبہ سرحد کے طول و عرض کا دورہ کیا جو نہایت کامیاب رہا۔ کانگریس کے بڑے سے بڑے گڑھ کی بنیادیں ہل گئیں۔ غالباً اس دورے کی کامیابی ہی کی وجہ سے جب قائدِ اعظم نے یہ فیصلہ کیا کہ صوبہ سرحد کی مسلم لیگ جو باہمی اختلافات کی وجہ سے بہت کمزور اور تقریباً ناکارہ ہو چکی تھی کی از سرِ نو تنظیم کی جائے تو صوبہ سرحد مسلم لیگ کو توڑ دیا گیا اور مجھے صوبہ سرحد کا آرگنائزر مقرر کیا گیا۔ تقریباً سال بھر پشاور میرا صدر مقام رہا۔ مسلم لیگ کی از سرِ نو تنظیم شروع ہوئی انہیں ایام میں صوبہ سرحد میں چار ضمنی انتخابات صوبائی اسمبلی کے لئے ہونے تھے۔ مسلم لیگ کی طرف سے میں نے چار نمائندوں کو مقرر کیا۔ اس سے پہلے قائدِ اعظم نے مجھے دہلی بلایا اور فرمایا "کوشش کرنا ایک آدھ سیٹ مسلم لیگ کو مل جائے" جواباً عرض کیا۔ "لیگ کے نمائندوں کو میں نہایت ایمانداری سے چن لوں گا۔ لیکن آپ یہ وعدہ کریں کہ میرے چنے ہوئے نمائندوں میں کوئی رد و بدل نہ ہوگا۔" قائدِ اعظم نے فرمایا۔ "یہ وعدہ میں نہیں کر سکتا کیونکہ ٹکٹ نہ ملنے پر ہر ایک ممبر کو حق ہے کہ میرے پاس اپیل پیش کرے۔ یہ میں کیسے کر سکتا ہوں کہ یہ حق اپیل ممبران سے چھین لوں۔"

ایک آدھ حلقے سے اپیلیں دائر ہوئیں لیکن میرے تمام فیصلے برقرار رہے۔ قائدِ اعظم نے مجھے اختیار دیا تھا کہ خرچ جو بھی ہو اس کی میں فکر نہ کروں۔ اللہ کے فضل و کرم سے چاروں حلقوں میں مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے۔ اور انہیں کامیابیوں کے بعد صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی وزارت بنی۔ جس کے وزیرِ اعظم مرحوم سردار اورنگ زیب تھے۔ اور ان کے دیگر ساتھیوں میں سے مرحوم سردار نشتر صاحب وزیر خزانہ مقرر ہوئے اور انہی دنوں میں سردار نشتر صاحب پہلی بار مسلم لیگ کے ممبر بنے۔ ہندوستان بھر سے مجھے پیغامات تہنیت موصول ہوئے کسی کو یہ امید ان دنوں میں نہیں ہو سکتی تھی کہ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو سو فیصد کامیابی ہوگی۔ قائدِ اعظم نے بھی مجھے پیغام خوشنودی سے سراہا جو اس مضمون کا تھا:

"WELL DONE MY BOY THE VICTORY IN THE RECENT BY-ELECTIONS IN THE FRONTIER IS YET ANOTHER FEATHER IN YOUR CAP"

جب میں پشاور سے دہلی آیا اور ان کی رہائش گاہ واقع ۱۰ اورنگ زیب روڈ پر پہنچا تو نہایت خوشی اور محبت کا اظہار کیا اور کچھ دیر کے بعد جب میں نے رخصت مانگی۔ تو فرمایا۔ "اچھا اب حساب دو کیا خرچ آیا ان الیکشنوں پر" میں نے عرض کیا "جانے دیں" انہوں نے کہا نہیں ایسا نہیں ہو سکتا بالآخر میں نے کہا ۲۵۰۰ روپیہ۔ چیک نکال کر دس ہزار روپیہ کا چیک دیا۔ اور فرمایا "یہ ناقابلِ یقین ہے کہ صرف اتنا خرچ ہوا" چیک کو دیکھ کر میں نے عرض کیا آپ نے تو دس ہزار کا چیک دیا ہے میں نے تو ڈھائی ہزار کہے تھے۔" فرمایا "ڈھائی ہزار فی سیٹ (SEAT) ۴ سیٹ کے دس ہزار ہوتے ہیں۔" میں نے عرض کی "حضور چاروں سیٹوں پر صرف ڈھائی ہزار روپیہ خرچ ہوئے۔" یقین نہیں کر رہے تھے۔ بادلِ نخواستہ پہلا چیک لے کر دوسرا ڈھائی ہزار کا چیک دیا۔

پہلی مرتبہ جون ۱۹۴۳ء میں قائدِ اعظم بلوچستان تشریف لائے اور صوبہ بلوچستان مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کا افتتاح فرمایا بلوچستان کی تاریخ میں اتنا ہجوم کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی

آج کے دن تک شہر کوئٹہ کبھی اتنا سجایا گیا۔ حالانکہ سرکاری خوش آمدید پر آج کل ہزاروں بلکہ لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ لیکن وفور محبت سے پبلک نے جو اس وقت کر کے دکھایا اس کی مثال نہیں ملتی۔ کوئٹہ فروٹ مارکیٹ کے قریب دکانداروں نے میوے کا ایک گیٹ بنایا۔ جلوس ریلوے اسٹیشن سے مسلم لیگ کے دفتر تک جہاں سے گزرا تھا قائدِ اعظم کے روزِ اول سے لے کر اس وقت تک کے جو سیاسی اقوال تھے، اردو اور انگریزی عبارت میں سلسلہ وار آویزاں تھے۔ قائد کی دوربین نگاہوں نے اس کا جائزہ لیا۔ اور جب میرے مکان یعنی اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو اپنی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح سے مخاطب ہو کر پوچھا "بتلاؤ اس جلوس کی خاص خوبی تم نے کیا دیکھی" کئی دروازے تھے۔ جھنڈیاں تھیں وغیرہ وغیرہ" جواب میں کہا گیا، قائدِ اعظم نے فرمایا۔ "نہیں خاص خوبی یہ تھی کہ اسٹیشن سے مسلم لیگ کے دفتر تک جو بھی اس راہ سے گزرا اس نے کتبوں کے پڑھنے کے بعد مسلم لیگ کی تمام تاریخ کا مطالعہ کیا۔"

قائدِ اعظم جذبات کی رو میں بہنے والے انسان نہ تھے۔ اور نہ ہی انہوں نے جذبات کا کبھی اظہار کیا۔ لیکن صوبہ بلوچستان کے مسلم لیگ کے اجلاس میں خطبۂ افتتاحیہ میں پہلی بار اپنی زندگی میں جذبات کا اظہار ہوا۔ فرمایا (ان کا خطبہ انگریزی میں تھا۔ یہ بھی میرے اصرار پر کیونکہ اسٹیج پر کئی انگریز فوجی افسر اور ان کی بیویاں جو قائدِ اعظم کو سننے کو ترس رہے تھے آئے تھے)

"حضرات! میری یہ عادت نہیں کہ کسی کی بے جا تعریف کروں۔ جب میں پہلی بار بمبئی کے ریس کورس میں آپ کے صدر قاضی عیسیٰ سے ملا تھا تو میں نے ان کا جائزہ لیا اور مکرر جائزہ لیا۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں میرا پیشہ وکالت ہے۔ اس وقت میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ یہ ہے کام کا آدمی۔ ان سالوں میں انہوں نے آپ کی خدمت کی آپ میں زندگی کی نئی لہر دوڑائی اور ایک مثالی لیگ قائم کی اس کامیابی کا نتیجہ آج میرے سامنے ظاہر ہو رہا ہے۔"

تقریباً دو مہینے میرے ہاں ان کا قیام رہا۔ شوخ رنگ کے لباسِ شب پہنتے تھے۔ اور صبح خود شیو کرتے تھے۔ سیفٹی ریزر سے نہیں بلکہ جسے نائیوں والا استرا کہتے ہیں یعنی کٹ تھروٹ (CUT THROAT) استرے سے۔ لڑائی کے ایام تھے بازار میں بلیڈز کی ہر وقت قلت رہتی تھی۔ میں نے ایک روز شکوہ کی صورت میں اس امر کا اظہار کیا۔ ہنس کر فرمایا۔ "میری طرح کٹ تھروٹ سے شیو کرنا شروع کر دو۔"

صبح سویرے ناشتے سے پہلے میرا لڑکا انور کمال اپنے پلنگ سے اتر کر سیدھا "دادا جناح" کے پاس ڈریسنگ روم میں پہنچ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ قائد نے چہرہ پر شیو کے لئے صابن لگایا تھا کہ انور میاں پہنچے۔ پوچھا "دادا جناح یہ کیا لگایا ہے۔" فرمایا صابن "پھر سوال کیا۔" آپ نے صابن کہاں لگایا؟" جواب ملا "منہ پر" پھر بچے نے سوال کیا۔" آپ بات کہاں سے کرتے ہیں۔ "منہ سے" اس پر بچے نے کہا "منہ کونسا جہاں آپ نے صابن لگایا ہے یا جہاں سے آپ بات کرتے ہیں۔" قائدِ اعظم بڑے خوش ہوئے اور خوشی خوشی ناشتہ پر یہ سب ہمیں سنایا۔ اور کہا کہ عیسیٰ تمہارا یہ بچہ ماشاء اللہ بڑا زیرک ہے۔

ناشتہ کے بعد قائدِ اعظم مجھے گھر پر چھوڑ کر موٹر میں شہر تشریف لے گئے۔ خود کھلونوں کی دکان پر گئے اور بچے کے لئے کھلونے لے آئے۔ انہی دنوں ایک شب کے لئے پشین ہمارے دیہاتی گاؤں تشریف لے گئے۔ تخلیے میں آرام کا دن اور رات گزارنے کے بعد روانہ ہونے سے پہلے کہا: "کاش میں ایک مہینہ یہاں رہ سکتا۔ آرام بھی مل جاتا اور کم از کم ایک لاکھ ڈالر بھی کما سکتا۔" میں نے ایک لاکھ ڈالر کے بارے میں پوچھا۔ جواب دیا "ایک امریکن میگزین نے انہیں یہ آفر کیا ہے کہ وہ اپنی سیاسی تحریک پر اگر لکھیں تو انہیں یہ معاوضہ ملے گا۔ اس میں آدھا تمہارا ہوتا۔ عیسیٰ" میں نے کہا غریب خانہ ہر وقت حاضر ہے ضرور آرام کریں۔ جواب ملا "میرے لئے آرام کہاں۔ ہمیں

ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔"

کوئٹہ ہی کے قیام میں مجھے بہ کار لیگ لاہور بھیجا اور چلتے وقت کہا کہ لاہور چھاؤنی میں ایک بنگلہ ہے جو غالباً نظیر احمد کا ہے۔ حال ہی میں بنایا ہے لیکن بیچنا چاہتا ہے یہ چیک لو۔ اس میں جو رقم وہ کہے بشرطیکہ تمہیں مکان پسند آئے۔ اندراج کر لو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو بڑی ذمہ داری ہے۔ فرض کریں کہ مجھے مکان پسند تو آیا۔ مگر آپ کو پسند نہ آیا تو پھر کیا ہوگا؟ مسکرا کر فرمایا "مجھے تمہاری پسند، ضرور پسند ہوگی۔" اس طرح وہ مکان جو بعد میں اور غالباً اب بھی لاہور کے فوجی۔ جی۔ او۔ سی کی رہائش گاہ ہے قائدِ اعظم نے خرید فرمایا۔ قائدِ اعظم کے سیاسی ارشادات کے علاوہ ان کی باتیں بڑی پیاری ہوتی تھیں۔ پہلی مرتبہ جب مجھے حکم ملا کہ علی گڑھ جاؤں اور وہاں پر طلباء سے خطاب کروں۔ میں نے عرض کیا۔ "جہاں بھی آپ جانے کا حکم دیں گے جاؤں گا۔ لیکن علی گڑھ ہرگز نہ جاؤں گا۔" پوچھا اس کی کیا وجہ۔ جواباً عرض کیا۔ "سنتے ہیں وہاں پر طلبا ہر کسی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میری اردو کیسی ہے۔ میرا بھی وہ ضرور مذاق اڑائیں گے۔" خوب ہنسے۔ اور فرمایا۔ "میری اردو اور تمہاری اردو ایسی ہے جو ہندوستان کے ہر گوشہ کے لوگ سمجھ سکتے ہیں اس کی فکر نہ کرو۔" بالآخر میں علی گڑھ گیا۔ بہت پسند آیا۔ اس کے بعد علی گڑھ کو مجھ سے اور مجھ کو علی گڑھ سے عشق ہو گیا۔ اور اتنی مرتبہ وہاں گیا کہ بعض لوگ اب تک یہ خیال کرتے ہیں کہ میری تعلیم علی گڑھ میں ہوئی ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ ۴۴ / ۴۵ میں صدر دفتر دریا گنج دہلی میں شعبہ اطلاعات و پبلسٹی کھولا قائدِ اعظم نے یہ شعبہ میرے حوالے کیا۔ قائد جب کسی پر ذمہ داری عائد فرماتے تو تفصیل کے بارے میں کچھ نہیں کہتے تھے۔ صرف یہ حکم ملتا تھا کہ یہ کام اب تمہیں کو سرانجام دینا ہے۔ میں نے شعبے کو تین اداروں میں تقسیم کیا۔ انگریزی سیکشن جس کے انچارج نورالعارفین تھے۔ جو سندھ ہائی کورٹ کے بعد میں جج بنے اور جنہوں نے حال ہی میں کراچی کے ایک حلقہ انتخاب سے مرکزی اسمبلی کی ایک نشست پی پی پی کے ٹکٹ پر جیت لی ہے۔ اردو سیکشن کے انچارج مسٹر کرمانی تھے، جنہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد سندھ گورنمنٹ کے پبلسٹی کے محکمہ میں اعلیٰ عہدہ حاصل کیا۔ اور چند دنوں بعد فوت ہو گئے۔ مولانا ظفر احمد انصاری حال ایم۔ این اے محکمہ اسلامیات کے انچارج تھے۔ لیگ کا یہ شعبہ اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ آل انڈیا کانگریس نے بھی نئی دہلی ہوٹل امپریل میں شعبہ اطلاعات قائم کر دیا۔ اور نامور کانگریسی خواتین کا دن بھر وہاں ہجوم رہتا تھا۔ ایک شام قائدِ اعظم کی رہائش گاہ پر پہنچا میں تقریباً ہر شام کو جب بھی قائدِ اعظم وہاں تشریف فرما ہوتے تھے پہنچ جاتا تھا۔ عرض کیا۔ "حضور میرے پاس دفتر میں ہمارے بڑے میاں یعنی مستقل آفس سکریٹری سید شمس الحسن ہیں اور دوسری طرف کانگریس کا دفتر دیویوں سے بھرا رہتا ہے۔ میں کیا کروں؟" خوب ہنسے اور فرمایا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری پبلسٹی ضرور مؤثر ثابت ہو رہی ہے جب ہی تو ایسے ہتھیار تمہارے خلاف استعمال کرنے شروع کر دیئے گئے ہیں۔" میں نے بھی مزاحاً عرض کیا کہ "اگر اجازت ہو۔ میں بھی کبھی ان کے دفتر جاؤں اور ان کے طریقہ کار سے واقفیت حاصل کر دوں۔" ہنس کر فرمایا "ضرور ضرور۔ ہو سکتا ہے تم انہیں اپنا ہم خیال بنا سکو۔"

ادارہ ماہِ نو سے عرض ہے کہ میں کہاں تک لکھتا رہوں۔ زندگی کے باقی ایام اگر میں اپنے محبوب قائدِ اعظم کے بارے میں لکھتا ہی رہوں تب بھی یہ کام سرانجام نہ پا سکے گا۔ کاش میرے پاس وقت اور وسائل ہوتے کہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر یہ کام کر سکتا۔ چلئے فی الحال اتنے ہی پر پیر کہنہ اور ماہِ نو اکتفا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کا ایک نایاب خطبہ

ایم حنیف شاہد

انجمن حمایت اسلام لاہور کے بیالیسویں سالانہ جلسے کا ۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء بروز شنبہ کا چوتھا اجلاس جناب صلاح الدین خدا بخش صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ سی۔ ایل بیرسٹر ایٹ لاء کلکتہ کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں علامہ سر شیخ محمد اقبالؒ نے بھی شرکت فرمائی۔ آپ نے "دی اسپرٹ آف مسلم کلچر (THE SPIRIT OF MUSLIM CULTURE) یعنی "روح تہذیب اسلامی" کے موضوع پر انگریزی زبان میں بے نظیر فاضلانہ و فلسفیانہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ ڈیڑھ گھنٹے تک اس خطبہ کا صرف ابتدائی حصہ ختم ہو سکا۔ علامہ ممدوح نے حیرت انگیز نکات پیدا کئے اور انتہائی کوشش کی کہ ہر انگریزی داں انہیں سمجھ سکے۔ آخر میں حاضرین کے بے حد اصرار پر آپ نے اردو زبان میں خطبہ کا خلاصہ ارشاد فرمایا جو ہدیۂ قارئین ہے۔ آپ نے فرمایا:

"ہر انسان کے دل میں مشاہدہ حقیقت کی ہوس ہے وہ چاہتا ہے کہ اسے نظامِ عالم سے آگاہی حاصل ہو زمان و مکان کی تہ سمجھ میں آجائے جو حقیقتِ کائنات کے اندر پوشیدہ ہے۔ اس کے مشاہدہ اور نظارہ کا موقع مل جائے ساری قومیں اس مشاہدہ کے لئے ہمیشہ بے تابی کا اظہار کرتی رہی ہیں۔ یہودیوں نے

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ "لن نؤمن لک حتیٰ نری اللہ جھرۃً"[1] (ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ تعالےٰ کو ظاہر اور کھلے طور پر نہ دیکھ لیں) خود حضرت موسیٰ "ربِ ارنی" فرماتے رہے۔

میں نے لکھا ہے ؎

خرد گفت او بچشم اندر نگنجد
نگاہِ شوق در امید و بیم است
نمیگردد کہن افسانۂ طور
کہ در ہر دل تمنائے کلیم است[2]

مشاہدۂ حقیقت کے حصول کے دو طریق ہیں:

(۱) سمع و بصر اور (۲) قلوب یا بہ اصطلاحِ قرآنِ حکیم "افئدہ" یہ ضروری ہے کہ ان دو طریقوں سے بقدرِ ضرورت کام لیا جائے یورپ نے اپنی ساری کوششیں صرف "سمع و بصر" تک محدود کر دیں اور "افئدہ" کو ترک کر دیا۔ مسلمانوں نے اپنی توجہات "افئدہ" پر مرتکز کر دیں اور "سمع و بصر" سے پورا کام نہ لیا بلکہ ساری ایشیائی تہذیب کا خاصہ یہی ہے کہ اس میں "افئدہ" پر بہت زور دیا گیا ہے اور "سمع و بصر" کی بالکل پرواہ نہیں کی گئی حالانکہ ضرورت دونوں طریقوں سے کام لینے کی ہے۔

نظامِ عالم کی آفرینش کو یوں سمجھو کہ حقیقت نے اپنی نمود یا اپنے آپ کو واضح کرنے کے لئے ایک نقطۂ خاص سے سفر کیا یا بہ اصطلاحِ صوفیہ کرام حُسن نے نظارے کے شوق میں اپنے آپ کو آشکارا کر دیا۔ اس خطِ سفر کا آخری نقطہ عالمِ ظاہر ہے۔ اب حقیقت تک پہنچنے کا راستہ یہ ہے کہ اس آخری نقطے سے الٹا سفر کیا جائے۔

مشاہدے کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ انسان اس میں اپنے آپ کو فنا کر دے۔ اسلام جس مشاہدے کا معلّم ہے وہ اپنے آپ کو قائم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی اسلام کا مشاہدہ مردانگی پر مبنی ہے۔ ایک شاعر نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی نعت میں یہ نکتہ بڑے اچھے طریق پر واضح کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نعت میں اس سے بہتر شعر نہیں لکھا گیا ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسّمے

یہ اسلامی آئیڈیل ہے۔ اسلامی نقطۂ خیال سے معراج یہی ہے کہ مشاہدۂ ذات کے بعد بھی عبودیت قائم رہے لیکن سرکشی اور تمرد کے لئے نہیں بلکہ خدمت و عبدیت کے لئے۔ مسلم کو کسی چیز میں فنا نہ ہونا چاہیئے۔ گو یہ فنا فی اللہ ہی کیوں نہ ہو۔ علامہ ممدوح نے اپنے خطبہ میں جو نکات بیان فرمائے ان میں سے چند حسبِ ذیل ہیں:

(۱) آنحضرت صلعم ختم الرسل ہیں

نبی اس لئے بھیجے گئے کہ وہ لوگوں کو جن کی سمجھ ابتدائی حالت میں تھی سمجھائیں۔ عین اس وقت جب دنیا میں غور و فکر کا زور شور شروع ہوا اور لوگ تقلید سے نہیں بلکہ اپنے فہم و ادراک کی مدد سے نتائج اخذ کرنے لگے گویا تقلید جامد کی جگہ افقِ عالم پر علم و ادراک کا آفتاب طلوع ہوا تو اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف سے آخری حجت۔ کو ارسال کر دیا اور کہہ دیا کہ اب کوئی ایسا شخص نہیں آ سکتا جس کی باتوں کو تم تنقید کے بغیر تسلیم کر لو۔ شہنشاہیت اور نبوت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور دماغی غلامی پر موت چھا گئی۔ عقل کے عروج کی ابتدا وہ روزِ سعید ہے جب ختم رسل صلعم مبعوث ہوئے اب اگر کوئی شخص نبوت کا مدعی ہو تو ہم اس کی دماغی حالت کا اسی طرح مطالعہ کریں گے جس طرح علم الحیات کا ماہر کسی مینڈک

---

[1] قرآن مجید پہلا پارہ سورہ البقرہ رکوع ۵ آیت ۵۵ (مرتب)

[2] علامہ سر شیخ محمد اقبال پیامِ مشرق (لالۂ طور) صفحہ ۳۰ (مرتب)

کے اجزاء کا مطالعہ کرتا ہے اور کیکڑے کے وجود پر غور و فکر کی نگاہ ڈالتا ہے۔

(٢) یورپ کی ترقی اس سے شروع ہوئی کہ اہلِ مغرب نے فلاسفۂ یونان کے فلسفے کے خلاف، جو تقویم پارینہ ہو چکا تھا علم جہاد بلند کیا۔ بیکنؔ نے استقرائی منطق پر زور دیا۔ موشگافی کے بجائے مشاہدات و تجربات حصولِ علم کا ذریعہ قرار دیئے گئے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ استقرائی منطق کا موجد اور مدوّنِ اول "یعقوب کندی" ہے بیکنؔ نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ بیکنؔ نے جو عربی پڑھا ہوا تھا اندلس کے عرب منطقیوں کی تصنیفات سے حظ وافر حاصل کیا اور ان کے خیالات کا ترجمہ کیا۔

(٣) ہندی حکماء اور یونانی طلبہ کے نزدیک یہ دنیا ایک مکمل نظام کی شان رکھتی ہے مگر امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ جیسے اکابرِ اسلام نے اس واہمہ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ انہوں نے قرآن کریم کی آیات بینات سے متاثر ہو کر دنیا کی عدم تکمیل کا دعوےٰ کیا اور ثابت کیا کہ دُنیا ابھی منازلِ ارتقا طے کر رہی ہے۔

(٤) فلسفۂ یونان کے خلاف جہاد کرنے کا ڈھنگ، یورپ کے اربابِ فکر نے مسلمان حکماء سے سیکھا۔ امام غزالیؒ نے فلسفۂ یونان کے پرخچے اڑا دیئے۔ ابنِ رشدؒ نے فلسفے کی قبائے دریدہ کو رفو کرنا چاہا مگر وہ اس مقصد میں ناکام رہا۔

(٥) ذوالنون مصریؒ بہت بڑے صوفی ہی نہیں تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے کیمیا دان بھی تھے: چنانچہ وہ حکیم جس نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ پانی جوہر بسیط نہیں بلکہ ایک مرکب شے ہے آپ ہی ہیں۔

(٦) اٹلی کے مشہور شاعر "دانتے" نے اپنی شہرۂ آفاق نظم میں بہشت بریں کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ تمام و کمال محی الدین ابن عربیؒ کی "فتوحاتِ مکیہ" سے ماخوذ ہے۔ اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے یورپ کے فلسفہ ہی پر نہیں بلکہ ادب پر بھی زبردست اثر ڈالا ہے۔

حضرت امیر خسروؒ دہلوی

سید عبدالقدوس ہاشمی

ایک پُرگو اور باکمال شاعر، ایک ماہر موسیقی، ایک عظیم المرتبت صوفی اور ایک بہترین نثر نگار۔ ولادت بمقام پٹیالی ضلع ایٹہ صوبۂ یوپی (ہندوستان) ۶۵۱ھ ہجری مطابق ۱۲۵۳ء عیسوی۔ وفات بمقام دہلی (دارالسلطنت ہندوستان) ۱۷ ذی قعدہ ۷۲۵ ہجری مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۳۲۵ء۔ مزار پر انوار، درگاہ نظام الدین اولیا، بستی نظام الدین ملحق بہ دہلی۔

امیر خسروؒ دہلوی نے ہندوستان کے پانچ مسلمان بادشاہوں کے دور دیکھے، اور ان میں سے بعض کی ملازمت میں بھی رہے۔ تقریباً ایک لاکھ اشعار کہے، اگر ان کی ہر مثنوی کو ایک تصنیف قرار دیا جائے تو ۹۹ کتابوں کے مصنف ہیں۔ حسب ذیل کتابیں اب بھی موجود ہیں۔

(۱) اعجاز خسروی، فارسی نثر، دو ضخیم جلدوں میں ہے اور اس زمانہ کے انداز فارسی نویسی کا بہترین نمونہ ہے۔

(۲) دیباچۂ دیوان غرۃ الکمال، مختصر سا دیباچہ ہے فارسی نثر میں جو خود اپنے دیوان غرۃ الکمال پر لکھا تھا۔

(۳) آئینہ سکندری۔ فارسی نظم (مثنوی)

(۴) تاج الفتوح		//

(۵) تغلق نامہ		//		//

(۶) خزائن الفتوح		//		//

(۷) دیول رانی وخضر خان		//		//

(۸) شیرین وخسرو		//		//

(۹) قران السعدین		//		//

(۱۰) مجنون و لیلیٰ		//		//

(۱۱) نہ سپہر		//		//

(۱۲) مطلع الانوار		//		//

(۱۳) ہشت بہشت　　فارسی نظم (مثنوی)
(۱۴) اشک و آہ　　"　　"
(۱۵) مثنوی عشقیہ　　"　　"
(۱۶) مثنوی در تعریفِ دہلی　　"　　"
(۱۷) کلیات عناصر۔ غزلیات کے چار دیوانوں (تحفۃ الصغر، وسط الحیٰوۃ، غرۃ الکمال، اور بقیہ نقیہ) کا مجموعہ امیر خسروؒ نے اپنی فارسی غزلیات کو شاعر کی عمر کے بموجب چار حصّوں میں منقسم کر دیا تھا۔ بچپن کا کلام تحفۃ الصغر کے نام سے ایک جگہ کر دیا۔ وسطی دور کا کلام وسط الحیٰوۃ کے نام سے، پختہ دور کی غزلیات کا نام غرۃ الکمال رکھا، اور اس کے بعد جو کچھ کہا اسے بقیہ نقیہ کا نام دیا۔

کہا جاتا ہے کہ خود امیر خسروؒ ہی نے اپنے ان چاروں دیوان کا انتخاب بھی تیار کر دیا تھا، اور مطبوعہ نولکشور پریس کا جو انتخاب ہمیں آج ملتا ہے وہ خود امیر خسروؒ ہی کا تیار کیا ہوا ہے۔

امیر خسروؒ کے زمانہ میں دہلی اور اس کے گرد و نواح میں جو بولی رائج تھی وہ اردو زبان کی ایک قدیم شکل ہی تھی لیکن اسے کھڑی بولی کہا جاتا تھا۔ امیر خسروؒ نے اس بولی میں بھی بطور تفنن طبع کچھ پہیلیاں کچھ کہہ مکرنیاں اور کچھ اشعار کہے ہیں جو بہت دلچسپ اور بہت مقبول ہیں۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس قسم کی وہ تمام چیزیں جو امیر خسروؒ کی طرف منسوب ہیں وہ سب کی سب امیر خسروؒ دہلوی کی ہیں بلکہ ان میں سے بہت سا حصّہ دوسروں کا کلام ہے جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بنتا اور بدلتا رہا ہے اور خالق باری (مصنفہ ضیاءالدین خسرو) کی طرح امیر خسروؒ کے نام سے منسوب ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ حصّہ ان کا حضرت امیر خسروؒ کا کہا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

فارسی ادب اور شاعری میں مرتبۂ کمال پر فائز ہونے اور طوطیٔ ہند کہلانے کے ساتھ ساتھ امیر خسروؒ دو اور خصوصیات کے بھی حامل ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ہندوستانی موسیقی کے بہت ہی باکمال ماہر بلکہ مجتہد تھے۔ اس حد تک کہ بعض راگ و راگنیاں انہوں نے جدید پیدا کیں۔ طنبورہ میں کچھ تاروں اور پردوں کو بدل کر ایک نیا ساز بنا دیا۔ دوسرے یہ کہ وہ باوجود درباری ہونے اور شعر و موسیقی کے دلدادہ ہونے کے ایک صاحب عرفان بزرگ اور ایک دانشمند صوفی بھی تھے۔ اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلوی المتوفی ۷۲۵ھ (شیخ محمد نظام الدینؒ بدایونی) کے مخلص مرید اور جان نثار پیروکار تھے۔ ان کے شیخ کی وفات امیر خسروؒ کی وفات سے چھ مہینے پہلے ہوئی ہے۔

فارسی شاعری میں امیر خسروؒ کا یہ درجہ ہے کہ انہیں بجا طور پر طوطیٔ ہند کہا جاتا ہے۔ شمس الدین حافظ شیرازی نے امیر خسروؒ کی وفات کے تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد غیاث الدین اعظم شاہ (سنارگاؤں۔ بنگال) کو ایک غزل لکھ کر بھیجی تھی، اس میں یہ شعر ہے

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

اس میں حافظ نے امیر خسروؒ کے کلام کی بے پناہ مقبولیت دیکھ کر شاعرانہ تعریض کی ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب خواجہ حافظ شیرازی نے دیکھا تو یہ دیکھا کہ فارسی جاننے والوں کی ساری دُنیا امیر خسروؒ کے اشعار سے گونج رہی ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر حافظ کے دل میں جو جذبات پیدا ہوتے ہوں گے اُن کا شاعرانہ اظہار اسی صورت میں ہو سکتا تھا۔ لیکن حق یہ ہے کہ خسروؒ کی غزلیات اس درجہ کی اور اس قدر اعلیٰ معیار تغزل کی حامل ہیں کہ خواجہ حافظ ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر غزل گو شاعر کو ان پر رشک آ سکتا ہے۔ بھلا ان اشعار کے کہنے والے پر کس صاحبِ ذوق کو رشک نہیں آئے گا۔

من عاشقم شورہ سر از کفر و ایمان بے خبر
دینم شدہ مہر کسے، ایمان من روئے کسے
آمد سجودِ زاہدان اندر حریم کعبہ
شد سجدہ گاہ عاشقان محراب ابروئے کسے

پری پیکر نگارے، سرو بالا لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود شب جائیکہ من بودم

صنم خود بین، رقیبان گوش بر آواز من حیران
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

امیر خسروؒ کی پُر گوئی اور "قادر الکلامی" کا کمال اگرچہ ان کی مثنویوں میں پوری طرح جلوہ گر ہے لیکن ان کے تخیل کی بلندی اور زبان و بیان پر قدرت کے جس قدر عمدہ نمونے ان کی غزلیات میں دکھائی دیتے ہیں، کسی اور جگہ نہیں دکھائی دیتے۔ شاعرانہ صنایع مثلاً ترصیع، براعۃ، لف و نشر بھی بہ کثرت ان کی غزلیات میں موجود ہیں۔

امیر خسروؒ کی نثر نویسی میں اُس زمانہ کے مذاق کے بموجب صنایع لفظی اور معنوی بدایع سے بہت کام لیا گیا ہے اور عام پڑھنے والے کو اس سے پوری طرح استفادہ مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن اس میں اغلاق کا عیب نہیں ہے۔ یہ اُس زمانہ کی صنعت نثر نویسی کے بموجب بہت اعلیٰ درجہ کی نثریں ہیں، اگرچہ آج ہمارے لئے بہت نامانوس ہیں۔

امیر خسروؒ کا نام ابوالحسن محمد بن امیر سیف الدین محمود لاچین ہے۔ لاچین ترک تتاری قبائل میں سے ایک چھوٹا سا قبیلہ ہے جس کا اصلی اور قدیم وطن روسی ترکستان میں تھا۔ لیکن ان کے بزرگ بلخ سے ہندوستان میں آئے تھے اور فوجی خدمات کے صلہ میں بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بن گئے تھے۔ ان کے والد کو پٹیالی ضلع ایٹہ (موجودہ یوپی۔ ہندوستان) میں ایک بڑی جائیداد حاصل تھی اور یہ وہیں رہتے تھے۔ امیر کا لفظ ان کے خاندان میں اصلی وطن سے بمعنی سردار چلا آرہا تھا۔ امیر خسروؒ کی والدہ ماجدہ نواب عماد الدولہ عماد الملک دہلی دربار کے مشہور و معروف درباری اور فوجی عہدہ دار کی صاحبزادی تھیں۔

امیر خسرو کی ولادت پٹیالی میں ہوئی۔ یہاں سے قریب ہی وہ مقام واقع ہے جہاں ہندوستان کی مشہور رزمیہ منظوم داستان مہابھارت کی ہیروئن اور علت العلل رانی دروپدی پیدا ہوئی تھیں اور آج تک ان کی یاد میں وہاں سالانہ میلہ لگتا ہے اور تیرتھ ہوا کرتا ہے۔ تاریخِ ولادت کے سلسلہ میں صرف سال معلوم ہے اور اس میں بھی تذکرہ نویسوں کا اختلاف ہے کہیں ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء لکھا ہے اور کہیں ۶۶۴ھ/۱۲۶۶ء۔ میرے خیال میں ۶۶۴ھ صحیح ہے۔

بہر حال تاریخِ ولادت میں اختلاف قابلِ اعتنا نہیں ہوتا۔ آدمی اپنے کارناموں اور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے قابلِ یاد اپنی وفات کے وقت ہو جاتا ہے۔ پیدائش کے وقت انسان کی عظمت کہاں نمایاں ہوتی ہے اور کون جانتا ہے کہ یہ بچہ کیا بننے والا ہے۔

امیر خسروؒ نے ابتدائی تعلیم مقامی اساتذہ سے حاصل کی۔ آٹھ سال کے ہوئے تو والد بزرگوار کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ یتیم ہونے کے بعد امیر خسروؒ دہلی میں رہنے لگے اور اپنے نانا عماد الملک کے زیرِ سایہ تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے۔ فارسی ادبیات میں تو کمال حاصل ہی کیا کہ اس وقت کمال کا یہی معیار دہلی میں تھا۔ عام زبان دہلی کی کھڑی بولی یا قدیم اُردو تھی۔ اس میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتے رہے۔ آدمی بڑے ذہین، دین دار اور بذلہ سنج تھے، بات میں بات پیدا کرتے اور اردو فارسی کے مرکب مصرعے بھی کہا کرتے تھے۔

جوان ہو کر دہلی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ مشہور چشتی بزرگ نظام الدین اولیاؒ خلیفہ حضرت فرید شکر گنجؒ کے مرید ہوئے اور اُن سے بڑی محبت کرنے لگے۔ بزرگ مرشد بھی اپنے اس مرید سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان میں موسیقی کا ذوق اور پھر اس فن میں ان کا کمال حضرت نظام الدین کی محفل ہائے سماع کا رہینِ منت ہے۔ امیر خسروؒ جب کسی بادشاہ کے ساتھ سفر میں نہ ہوتے بلکہ دہلی میں قیام پذیر ہوتے تو اپنے مرشد کو کبھی ستار و ساز پر اور کبھی بغیر ساز و ستار کے صوفیانہ و عاشقانہ غزلیں سنایا کرتے تھے۔ شاعر اور موسیقار کی حیثیت سے ان کی شہرت ان کی زندگی ہی میں دور دور پہنچ چکی تھی۔

۱۷ ذی قعدہ ۷۲۵ھ کو اپنے مرشد نظام الدین اولیاؒ کی وفات کے چھ ماہ کے بعد سلطان محمد تغلق کے دور میں بمقام دہلی وفات پائی اور مرشد کی قبر کے قریب ہی دفن کئے گئے۔ دہلی والے ہر سال ان کا عرس کیا کرتے ہیں۔

امیر خسرو۔ آبِ حیات کے قلمی مسودے میں

آغا سلمان باقر

یہ امیر خسرو کے حالات ہیں جو شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" کے مسودے میں اپنے ہاتھ سے تحریر فرمائے ہیں مسودے کا یہ حصہ چار صفحات پر مشتمل ہے مولانا نے اس کی نگارش میں واسطی قلم استعمال کیا ہے سرخیاں جامنی روشنائی سے تحریر فرمائی ہیں۔ شروع سے آخر تک تحریر کا انداز ایک سا نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آزاد نے مختصر آذکر کیا، بعد میں مواد مل جانے کے بعد دوسرے باریک قلم سے اضافہ کیا اور بہت سے اضافے نظرِ ثانی کے دوران ہوئے۔ اس دوران میں جن صفحات کا اضافہ ہوا، اُن کو "۴" اور "۴ م" سے متن میں شامل کیا۔ جس میں آئینہ کی پہیلی سے لے کر عورتوں کے گیت تک شامل ہیں۔ اس کے بعد ایک اور صفحہ بھی ہے، جو ایک الگ کاغذ پر ہے اس کا سائز "۶×۱۰" ہے یہ تحریر متواتر ایک ہی قلم سے لکھی گئی ہے۔ جا بجا نظرِ ثانی کے بعد اضافے بھی موجود ہیں۔ یہ باریک قلم سے بین السطور میں کئے گئے ہیں بعض جگہ مولانا نے پہلی تحریر پر ایک الگ کاغذ چپکا کر اُس پر دوبارہ وہی مضمون کچھ الفاظ اول بدل کر تحریر فرمایا ہے۔ میں نے بہت کوشش کے بعد اُس چیپی کے نیچے کی تحریریں پڑھی ہیں۔

جس کاغذ پر مولانا آزاد نے آبِ حیات کا مسودہ تحریر کیا ہے اسکی لمبائی چوڑائی ۶ × ۸ ہے اور کاغذ کے جن پرزوں پر مولانا نے لکھ کر چسپاں لگائی ہیں۔ وہ طلباء کے امتحانی پرچوں کے صفحات ہیں، وہ ایک طرف سے خالی تھے اس لئے مولانا نے انہیں بلا تکلف استعمال فرمایا۔

مسودے پر صفحات کے اندراج جامنی روشنائی سے کئے گئے ہیں اور اُس کا پہلا صفحہ مسودے میں نمبر ۲ اور آخری صفحہ مسودے پر نمبر ۵ ہے ان کے علاوہ پانچ صفحات بعد میں شامل کئے گئے ہیں، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

قلمی مسودے میں بعض الفاظ کو نمایاں لکھنے کے لئے بھی جامنی روشنائی کا استعمال کیا گیا ہے جس سے مسودے کا حسن بڑھ جاتا ہے۔

ایک بات اور قابلِ بیان اس مسودے میں نظر آئی کہ مولانا نے بعض واقعات کے حاشیے پر یا اُن کے بیان کے اختتام پر "صحیح البیاض" کے الفاظ یا "ص ص" تحریر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آبِ حیات کی تصنیف کے وقت مولانا آزاد کے پاس کوئی بیاض تھی۔ اور آبِ حیات مکمل ہونے کے بعد مولانا نے بہ نظرِ احتیاط مسودے کا دوبارہ جائزہ لیا اور واقعات و حالات کو بیاض کے مطابق کرنے کے بعد "صحیح البیاض" کی عبارت لکھی۔ لیکن میں نے آزاد کے کاغذات میں ایسی کوئی بیاض نہیں دیکھی اور کسی اہلِ علم سے بھی ایسا کوئی تذکرہ نہیں سُنا۔

امیر خسرو دہلوی کا ذکر مولانا آزاد نے اپنی ایک اور تصنیف "نگارستانِ فارس"

میں بھی کیا ہے، اور آبِ حیات، کے واقعات، وحالات کا اثر اس میں نمایاں ہے۔
میں نے آبِ حیات کے مسودے سے "امیر خسرو" کا حال اسی "رسم الخط" میں نقل کیا ہے، جس میں مولانا آزاد نے تحریر کیا۔ ہے اس سے بہت سی اہم لسانیاتی مشکلات حل ہوگئیں مثلاً مولانا نے اپنے قلم سے "عارسی" لکھا حالانکہ یہ لفظ آبِ حیات مطبوعہ میں "آرسی" لکھا ہے اسکا تلفظ تو یقیناً ایک سا ہے لیکن "عار-سی" یعنی "شرم سی" اصل مفہوم ہے، جس سے پہیلی کو چار چاند لگ جاتے ہیں اسی طرح ایک اور لفظ "نبولی" ہے اس سے دو مفہوم اخذ کئے گئے ہیں یعنی "نہ بول" اور دوسرے نیم کا پھل "نبولی" ایسے ہی کنایے پہیلی کے مفہوم کو دلچسپ اور معنی خیز بناتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں نے مولانا کی حذف شدہ یا قلم زد کردہ تمام عبارتیں اور الفاظ ہو بہو نقل کر دیئے ہیں اور ماہرین لسانیات و اردو کو دعوت دی ہے کہ وہ مولانا کے اندازِ تحریر کا بغور مشاہدہ کریں۔ اس مضمون میں بہت سی ایسی عبارتیں بھی ہیں جو آج تک آبِ حیات، میں قلم زد ہونے کے باعث شائع نہ ہو سکیں۔

میں نے آبِ حیات کے قلمی مسودے کو پیش نظر رکھ کر اس مضمون کو مرتب کیا ہے اور اوّل ایڈیشن آبِ حیات مطبوعہ ۱۸۸۰ء کو حوالے کے طور پر استعمال کیا ہے اور مولانا کے قلم سے کی گئی ہر اصلاح، ترمیم، اور کاٹ چھانٹ کو واضح کیا ہے۔ تاکہ مولانا کے خاص انداز، اسلوب اور انشاپردازی کے نشیب و فراز قاری اور نقاد تک پہنچ سکیں۔

نظمِ اُردو کی تاریخ [*]

" صنعت گاہ عالم میں نظم ایک عجیب صنعت صنایع آلہی سے ہے (ایسے [1]) دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ اوّل ایک مضمون کو ہم ایک سطر میں لکھتے ہیں اور نثر میں پڑھتے ہیں پھر اسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ لکھ کر دیکھتے ہیں تو اُس میں۔ اوّل وہ کیفیت خاص پیدا ہو جاتی ہے جسے موزونیت کہتے ہیں (اور [2]) دوسرے مضمون میں کچھہ [3] ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ تیسرے کلام میں زور بھی زیادہ ہو جاتا ہے [4] تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوشی یا غم یا کسی قسم (کا [5]) کے ذوق شوق کا [6] خیال انسان کے دل میں جوش مارتا ہے اور [7] وہ [8] قوت (تقریر [9]) بیان سے ٹکر کھاتا ہے تو زبان سے خود بخود [10] موزوں کلام نکلتا ہے اور یہہ اسیطرح [11] ہے جیسے پتھر اور لوہے سے آگ نکلتی ہے [12]۔
جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے (بموجب [13]) موافق کچھہ نکچھہ روئید کے بغیر [14]) نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح کوئی زبان اپنے اہل زبان کی حیثیت بموجب نظم سے خالی نہیں رہ سکتی۔ ہر روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی سرزمین کی خاصیت (دکھاتی [15])

---

[*] جامنی روشنائی سے لکھا ہے اور مولانا نے قلم زد کیا ہے۔

[1] مولانا نے قلمی مسودے میں قلم زد کر دیا ہے

[1] مولانا نے قلم زد کر کے نعم البدل کے طور پر "دوسرے" تحریر فرمایا ہے۔

[2] مسودے میں مولانا سے "کچھہ" کے نقاط رہ گئے ہیں

[3] مسودے میں مولانا سے "میں" کے نقاط رہ گئے ہیں۔

[4] مولانا نے "ص" کا نشان دے کر متن میں اضافہ کیا ہے، جو مسودے کے صفحے پر دائیں جانب کیا گیا ہے، جو نظر ثانی کے بعد مولانا نے قلم زد کر دیا عبارت یہ ہے "اور مضمون میں ایسی تیزی پیدا ہو جاتی ہے کہ اثر کا نشتر دل پر جا کر کھٹکتا ہے"

[5] "کا" قلم زد کر دیا اور اس کی بجائے "کے" تحریر کیا ہے۔

[6] مولانا نے باریک قلم سے یہ اضافہ کیا ہے "کا خیال" ہے۔

[8] نظر ثانی کے دوران مولانا نے باریک قلم سے اضافہ کیا۔

[9] مولانا نے "تقریر" قلم زد کر کے "بیان" اصلاح کی۔

[10] مولانا نے نظر ثانی میں باریک قلم سے اضافہ کیا۔

[11] مولانا نے نظر ثانی کے دوران "اور یہ اس طرح ہے" اضافہ کیا۔

[12] یہ تمام پیراگراف مولانا نے قلم زد کر دیا ہے میں نے یہ صرف اسلئے ہو بہو نقل کر دیا ہے تاکہ طالب علم ان کے انداز تحریر کو بآسانی سمجھ سکیں۔ نیز یہ عبارت "آب حیات" (مطبوعہ) میں شامل نہیں ہوئی۔

[13] مولانا نے قلم زد کر کے "موافق" اصلاح کی۔

[14] نظر ثانی کے دوران موٹے قلم سے کیا گیا اضافہ ہے۔

[15] مولانا نے "دکھاتی" کی بجائے "ظاہر کرتی" اصلاح کی۔

ظاہر کرتی ہے اسیطرح ایک نظم اپنی زبان کی شائستگی اور تہذیب علمی کے ساتھ زبانوں کے سلسلہ میں لطافت طبع کے درجہ ظاہر کرتی ہیں۔

زبان[1] اردو کے ظہور پر خیال کریں اور اُس کی تصنیفات پر نگاہ کریں تو اس میں نثر سے پہلے نظم نظر آئے گی[2]

اور یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے اور پیچھے تقریر کی قوت حاصل کرے (مگر[3]) ہاں نظم جوش طبع تھا اس لئے پہلے نکل پڑا۔ نثر شائستگی کے (لباس[4]) بوجھ سے گراں بار تھی اپنی ضرورت کے وقت ظہور کیا۔ بہرحال[5] نثر اردو کی تصنیف ۱۱۴۵ ہجری سے پہلے کوئی نظر نہیں آتی البتہ نظم کی حقیقت زبانی حکایتوں اور کتابی روایتوں کی خاک چھان کر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب برج بھاشا نے اپنی وسعت اخلاق سے عربی فارسی الفاظ کے مہمانوں کو[6] جگہ دی تو طبیعتوں میں اُس[7] اس قدرتی روئیدگی نے بھی زور کیا۔ لیکن وہ صدہا سال تک دوہروں کے رنگ میں ظہور کرتی رہی یعنی فارسی کی بحریں اور فارسی کے خیالات نہ آئے تھے[8] (البتہ[9]) امیر خسرو[10] تھے کہ جنکی طبیعت (ایجاد[11]) اختراع میں اعلیٰ درجہ (صنعت گری[12]) صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی مُلک سخن میں برج[13] بھاشا کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ انشا پردازی[14] کا کھولا خالق باری جسکا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی۔ اسیں[15] فارسی کی بحروں نے اوّل اثر کیا ہے۔ اور اُس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کون کون سے الفاظ مستعمل تھے جو اب متروک ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی پہیلیاں۔ عجیب و غریب لطافتوں سے ادا کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے نمک نے ہندی کے ذائقہ میں کیا لطف پیدا کیا ہے۔ مُکرنیاں۔ انمل دوسخنے وغیرہ خاص ان کے آئینہ کا جوہر چنانچہ ہر ایک کی مثالیں یہاں[16] لکھی جاتی ہیں۔ کیونکہ ان سے بھی اسوقت کی زبان کا کچھ کچھ پتا لگتا ہے۔

نبولی کی[16]　　ترور سے ایک تریا اتری اسنے بہت رجھایا.
　　باپ کا اسکے نام جو پوچھا آدھا[17] نام بتایا
پہیلی　　آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری
　　امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام نبولی[18]

---

[1] باریک قلم سے نئی سطر شروع کرنے کی ہدایت۔

[2] "نظم اردو کی تاریخ" کا پہلا صفحہ مسودے میں ختم ہوگیا۔

[3] مولانا نے "مگر" کو قلم زد کر کے "ہاں" اصلاح دی۔

[4] مولانا نے "لباس" کو قلم زد کر کے "بوجھ" اصلاح دی۔

[5] نئی سطر شروع کرنے کی ہدایت۔

[6] قلمی مسودے میں مولانا سے "کو" رہ گیا ہے، البتہ آبِ حیات ایڈیشن اوّل ۱۸۸۰ء میں "کو" لکھا ہوا ہے۔

[7] قلمی مسودے "اس" دو مرتبہ مولانا سے شائد سہواً لکھا گیا ہے۔ آبِ حیات مطبوعہ ۱۸۸۰ء میں ایک مرتبہ لکھا ہے۔

[8] میں نے یہاں تک مولانا کی عبارت اسلیئے نقل کی تاکہ تسلسل اور مضمون کا مفہوم برقرار رہے۔ امیر خسرو کا ذکر آبِ حیات میں یہاں سے شروع ہوتا ہے، جو قلمی مسودے میں "نظم اردو کی تاریخ" کا دوسرا صفحہ ہے۔

[9] "البتہ" قلمی مسودے میں لکھا ہے اور مطبوعہ میں نہیں۔

[10] "امیر خسرو" مولانا نے جامنی روشنائی سے مسودے میں نمایاں لکھا ہے

[11] مولانا نے مسودے میں "ایجاد و اختراع" پہلے مکمل لکھا، نظر ثانی کے دوران "ایجاد" قلم زد کر دیا

[12] مولانا نے مسودے میں "صنعت گری" لکھ کر قلم زد کر دیا اور دوبارہ "صنعت و ایجاد" باریک قلم سے لکھا۔

[13] مسودے میں "برج" کے ج کا نقطہ مولانا سے رہ گیا۔

[14] "انشاپردازی" "میں" "ء" مولانا نے استعمال نہیں کیا۔

[15] امیر خسرو کی تصنیف سنہ، تصنیف نا معلوم "خالق باری" کے لفظ مسودے میں جامنی روشنائی سے لکھے ہیں۔

[16] مسودے میں جامنی روشنائی سے لکھا ہے۔ تیز پنسل سے یہ بھی لکھا ہے کہ "درمیان میں چاہیئے"۔

[17] قلمی مسودے میں "آدھا" کے نیچے باریک قلم سے نظر ثانی کے دوران مولانا نے "نیم" لکھا ہے لیکن آبِ حیات پہلے ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں اس قسم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

[18] "نبولی" یہاں پر دوہرے معنی دیتا ہے۔ یعنی "نہ بولی" اور نیم کا پھل "نبولی"۔ قدیم رسم الخط میں یہی خوبی نظر آتی ہے۔

"ص"[1]
آئینہ کی پہیلی
"ص"[2]

فارسی بولی آئی نہ[3] ترکی سوچی پائی نہ
ہندی[4] بولتے عارسی[5] آیے۔ منہ دیکھو جو اسے بتایے

ناخن کی پہیلی

بیسوں کا سر کاٹ لیا نا مارا نا خون کیا

لال کی پہیلی

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہایے
دیکھ سفیدی ہوت انگارا گونگے سے بھڑ جایے
باتس کا مندر واہ کا باشا۔ ماشے کا وہ کہاجا
سنگ ملے تو سر پر راکھیں واہ کو را ورا جا
سی سی کرکے نام بتایا۔ تاہ ہیں بیٹھا ایک
الٹا سید ہا ہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک

بھید پہیلی مین کہی تو سن رے میرے لال[6]
عربی[7] ہندی فارسی تینوں کرو خیال

دلی[8] بلکہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں رسم ہے کہ عام عورتیں برسات کی بہاریں یہم گڑواتی ہیں۔ یا گھر میں درخت ہو تو انہیں جھولا ڈالواتی مل ملکر جھولتی ہیں اور گیت گا[9] کر جی خوش کرتی ہیں۔ انہیں شاید کوئی عورت ہوگی جو یہہ گیت نہ گاتی ہو۔

جو پیا آون[10] کہہ گے۔ اجہو[11] نہ آئے سوامی ہو
اے ہو جو پیا آون کہہ گے
آون آون کہہ گے۔ اج نہ بارہ ماس
اے ہو جو پیا آون کہہ گے۔ وغیرہ وغیرہ

یہہ گیت بھی انہی امیر خسرو[12] کا ہے اور بروا راگ[13] میں یے بھی انہی کی رکہی ہوئی ہے۔ اللہ اللہ کیا زبانیں تہیں کہ جو کچھہ اُنسے نکل گیا۔ عالم کو بہایا اور گویا زمانے[14] کے دل پر نقش ہو گیا ہزاروں گیت بنانے والوں نے بنائے اور گانے والوں نے گایے آج ہوئے کل بہول بہال گئے۔ مگر چہہ سو[15] برس گزرے۔ یہ آج تک ہیں۔ اور ہر برسات میں ویسا ہی رنگ دیئے جاتے ہیں۔ اس حسن قبول کو خداداد نہ کہیئے تو کیا کہیئے۔

---

[1] یہاں پر قلمی مسودے میں نیلی پنسل سے "ص" کا نشان ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے آئندہ صفحہ نظر ثانی کے دور کا اضافہ ہے کیونکہ اس پر بھی حوالے کا نشان "ص" موجود ہے اور دوسرے یوں بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ نظر ثانی کے دوران کیا گیا اضافہ ہے کہ یہ صفحہ باریک نب سے لکھا گیا ہے یاد ہے کہ مولانا نے گذشتہ صفحوں کی کانٹ چھانٹ باریک نب اور اسی قسم کی سیاہی سے کی ہے۔

[2] قلمی مسودے کے اس صفحے پر بھی گذشتہ صفحہ سے پیوستہ کا نشان ہے جو نیلی پنسل سے دیا گیا ہے۔

[3] قلمی مسودے میں "آئی نہ" لکھا ہے جبکہ اول ایڈیشن آب حیات میں "آئینہ" لکھا ہے۔

[4] "ہندی" کا نقطہ مولانا سے رہ گیا ہے۔

[5] "عارسی" قلمی مسودے میں لکھا ہے جبکہ مطبوعہ آب حیات میں "آرسی" لکھا ہے جس سے مفہوم کا حسن غارت ہو جاتا ہے۔ یعنی "عار سی" معنی "شرم سی" اس آئینہ کی پہیلی میں یہی خوبی ہے۔

[6] "لال" پر نیلی پنسل سے نمایاں کا نشان ہے۔

[7] "عربی" کا نقطہ مولانا سے رہ گیا ہے۔

[8] "دلی" سرخ روشنائی سے نمایاں اور موٹے قلم سے لکھا ہے۔

[9] مسودے میں "گا" کی بجائے "کا" لکھا گیا ہے۔

[10] "آون" کا نقطہ مولانا سے رہ گیا ہے۔

[11] آب حیات کے اول ایڈیشن میں "اجہوں" لکھا ہے۔

[12] نیلی پنسل سے نمایاں کیا ہے۔

[13] نیلی پنسل سے نمایاں کیا ہے۔

[14] یہاں پر قلمی مسودے کا صفحہ "ص" ختم ہوتا ہے۔ اس کا کوئی نمبر شمار نہیں ہے۔

[15] "چہہ" کے بعد "سو" قلمی مسودے میں پنسل سے کیا گیا اضافہ ہے، جو شاید مولانا نے نظر ثانی کے دوران کیا۔

بڑی بڑی عورتوں کے گانے کے لیئے ویسے گیت تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو۔ پیا۔ اور سوامی کی یاد میں اس طرح گا نا مناسب نہتھا[1]۔ لیکن دلمیں امنگ تو وہ بھی رکھتی تھیں اور فصل کی بہار انہیں بھی منافی نتھی۔ اُن کے لئے اور گیت رکھے تھے۔ چنانچہ ایک[2] لڑکی گویا اپنی سسرال میں ہے۔ برسات کی فصل آئی وہ جھولتی ہے اور ماں کی یاد میں گاتی ہے۔

امّاں میرے باوا کو بھیجو جی۔ کہ ساون آیا
لینے مجھے آکر لیجائے[3]
بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری۔ کہ ساون آیا
لینے وہ کیونکر آ سکتا ہے
امّاں مرے[4] بھائی کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری۔ کہ ساون آیا
لینے[5] بھلا اکیلا اتنی دور کیونکر آئے
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی۔ کہ ساون آیا
لینے اسکے لئے تو وہ دونوں[6] عذر نہیں
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری۔ کہ ساون آیا
بھلا وہ میری کب سنتا ہے[7]

ذرا غور کر کے دیکھو۔ باوجود علم وفضل اور اعلا[8] درجہ خیالات شاعرانہ کے۔ جب یہہ لوگ پستی کی طرف جھکتے تھے تو ایسے تہ کو پہنچتے تھے کہ تہ زمین کی ریت تک[9] نکال لاتے تھے۔ ان الفاظ وخیالات پر نظر کرو کیسے نیچر[10] میں ڈوبے ہوئے ہیں اور عورتوں اور لڑکیوں کے فطری خیالات اور دلوں کے ارمانوں کو کیا اصلی اصلی طور سے ظاہر کرتے ہیں[11]۔

"ص"[12]

مکرنیوں[13] کا انہیں موجد کہنا چاہیئے۔ نمونہ اسکا یہہ ہے۔

[14] مکرنی ۱۔ سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی دیا

[15] ۲۔ سرب سلونا سب گن نیکا
وا بن سب جگ لاگے پھیکا
وا کے سر پر ہووے کون
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی لون

[16] ۳۔ وہ آوے تب شادی ہوویئے[17]
اُس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگن وا کے بول
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی ڈھول

---

[1] مولانا نے "نہتھا" کو قدیم رسم الخط کے مطابق لکھا ہے۔
[2] "ایک" باریک قلم سے کیا گیا اضافہ ہے
[3] مولانا سے تحریر کے دوران "لیجائے" کے دو نقطے اور "ء" رہ گئی ہے
[4] "میرے" کے دو نقطے اور "بھائی" کی "ء" قلمی مسودے میں نہیں ہے۔
[5] نظرثانی کے دوران کا اضافہ ہے
[6] قدیم رسم الخط کی مناسبت سے مولانا نے "دونوں" کا "ں" رد کر دیا ہے
[7] قلمی مسودے میں "سنتا ہے" جبکہ آبِ حیات کے اوّل ایڈیشن میں "سنے گا" لکھا ہے۔
[8] مولانا نے "اعلیٰ" کو قدیم رسم الخط میں "اعلا" لکھا ہے۔

[9] "تک" کے دو نقطے مولانا سے رہ گئے ہیں
[10] "نیچر" کو نیلی پنسل کے نشان سے نمایاں کیا گیا ہے۔
[11] یہاں پر مسودے میں اضافی ورق کا دوسرا صفحہ ختم ہوتا ہے۔
[12] قلمی مسودے میں، صفحے کے دائیں جانب اوپر "ص" کا نشان ہے جس کا مطلب ہے یہ صفحہ بھی پہلے صفحے سے منسلک سمجھا جائے۔
[13] نئی سطر شروع کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔
[14][15][16] حاشیہ روشنائی سے نمایاں لکھا ہے قلمی مسودے میں ایک مرتبہ "مکرنی" لکھا ہے جبکہ آبِ حیات کے اوّل ایڈیشن میں تین مرتبہ "مکرنی" لکھا ہے۔
[17] مولانا نے "ہوویئے" کی "یے" کے جو دو نقطے دیئے ہیں، انہیں نظرثانی کے دوران پنسل سے مسودے پر قلم زد کر دیا ہے۔

ـ ایک کوئیں[1] پر چار عورتیں[2] پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو[3] کو رستہ چلتے چلتے پیاس لگی۔ کوئیں پر جا کر ایک سے پانی مانگا۔ انمیں سے ایک انہیں پہچانتی تھی۔ اسنے اوروں سے کہا کہ دیکھو۔ کھسرو[4] یہی ہے۔ انہوں نے پوچھا کیا تو وہی کھسرو ہے جس کے سب گیت گاتے ہیں۔ اور پہیلیاں، مکرنیاں، انملیں[5] سنتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ اس پر ایک انمیں سے بولی کہ مجھے کھیر کی (انمل) بات کہدے۔ دوسری نے چرخہ کا نام لیا۔ تیسری نے ڈھول کا۔ چوتھی نے کتے کا۔ انہوں نے کہا مجھے بہت پیاس لگی ہے۔ پہلے پانی تو پلا دو۔ وہ بولیں جب تک ہمارے[6] (انمل) بات نہ کہدیگا ہم نہ پلائیں گے۔ انہوں نے (فوراً)[7] جھٹ کہا۔

[8] انمل۔ کھیر پکائی جتن سے۔ چرخہ دیا جلا

آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول[10] بجا ـ لا پانی پلا[11]

"م"[12]

[13] اسی طرح کبھی کبھی ڈھکوسلا کہا کرتے تھے کہ وہ بھی انہی کا ایجاد ہے۔

---

[1] قدیم رسم الخط کے مطابق مولانا "کنویں" کو "کوئیں" لکھا ہے۔

[2] قلمی مسودے میں "عورتیں" لکھا ہے، جبکہ آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں بھی "عورتیں" ہی لکھا ہے، لیکن بعد میں تمام ایڈیشنوں میں "پنہاریاں" چھپا ہوا ہے یہ تبدیلی نہ جانے کیسے واقع ہوئی۔ [3] نیلی پنسل سے نمایاں لکھا ہے۔

[4] مولانا نے "کھسرو" لکھ کر گویا اس علاقے کا تلفظ واضح کیا ہے۔

[5] [6] مسودے میں مولانا نے "انمل" لکھ کر قلم زد کر دیا ہے اور دونوں جگہ "بات" استعمال کیا ہے۔

[6] قدیم رسم الخط میں "ہمارے" کو "ہماری" پڑھا جاتا تھا، لیکن لکھنے کا انداز مختلف تھا۔

[7] مولانا نے "فوراً" لکھ کر قلم زد کر دیا اور اس کے متبادل "جھٹ" استعمال کیا تاکہ تحریر میں زور پیدا ہو سکے۔ [9] جامنی روشنائی سے نمایاں لکھا ہے

[10] مولانا سے "ڈھول" کی "د" پر "ط" شاید رہ گئی ہے۔

[11] "م" کا آخری اضافی صفحہ بھی ختم ہو گیا [12] مسودے میں جامنی سیاہی سے متواتر صفحہ نمبر ۴ مولانا نے لکھا ہے [13] نئی سطر شروع کرنے کی ہدایت لکھی ہے

ڈھکوسلا۔[14] بھادوں پکی پیپلی چو چو پڑی کپاس

بی مہترانی دال پکاؤگی؟ یا ننگا ہی سو رہوں

دوسخنے۔[15] گوشت کیوں نہ کھایا ـ ڈوم کیوں نہ گایا گلا نہ تھا

جوتا کیوں نہ پہنا۔ سنبوسہ کیوں نہ کھایا تلا نہ تھا

انار کیوں نہ چکھا[16]۔ وزیر کیوں نہ رکھا دانا[17] نہ تھا

دوسخنے[18] فارسی سوداگر را چہ می باید۔ بوچے کو کیا چاہیئے دوکان

اُردو تشنہ را چہ می باید۔ ملاپ کو کیا چاہیے چاہ

شکار بچہ باید کرد۔ قوتِ مغز کو کیا چاہیئے بادام

[19] چونکہ موسیقی میں انکی طبیعت ایک بین تھی کہ بن بجائے پڑی بجتی تھی اسلیئے دھرپت کی جگہہ قول و قلبانہ قایم کر کے بہت سے راگ ایجاد کیئے کہ ان میں سے اکثر گیت ان کے آج تک ہندوستان کے زن و مرد کی زبانوں پر ہیں۔[20]

[21] بہار راگ اور بسنت کے میلے نے انہی کی طبیعت سے رنگ پکڑا ہے۔ بین کو مختصر کر کے ستار بھی انہی نے نکالا ہے۔[22]

"ص م"[23]

---

[14] [15] جامنی روشنائی سے نمایاں لکھا ہے۔

[16] "چکھنا" قدیم رسم الخط میں لکھا گیا ہے لیکن اسس پر دیئے گئے دو نقطے فاضل معلوم ہوتے ہیں۔

[17] مولانا نے پہلے "دانہ" لکھا، پھر اسے ہی درست کیا اور "دانا" لکھا جو قلمی مسودے میں کچھ یوں نظر آتا ہے "دانا"

[18] جامنی روشنائی سے نمایاں لکھا ہے۔ [19] نئی سطر شروع کرنے کی ہدایت لکھی

[20] نمبر ۱۳ سے یہاں تک تمام عبارت واسطی قلم اور گہری سیاہ روشنائی سے متواتر تحریر ہے۔

[21] تا [22] یہ پوری عبارت باریک نب سے لکھی گئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اضافہ مولانا آزاد نے نظرِ ثانی کے دوران کیا۔

[23] یہاں پر "م" کا متن میں اضافے کا نشان ہے جو ایک الگ کاغذ پر ہے یہ موٹا کاغذ لکیردار کاغذ ۶ × ۱۰ کی لمبائی چوڑائی کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متن میں یہ اضافہ، آبِ حیات کی طباعت کے دوران کا ہے۔ کیونکہ آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں ایک صفحہ کتاب کے صفحے نمبر ۸۲ کے ساتھ "متعلقہ صفحہ نمبر ۸۲" کے حوالے سے الگ، لکھائی چھپائی سے پیوستہ ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ متن کا اضافہ مولانا آزاد نے کتاب کی طباعت کے دوران کیا اور اُسے الگ چھپوا کر کتاب میں شامل کیا۔

سلطان جی صاحب کے ہاں کوئی سیاح کہ پاس فقیری ہیں تھے۔ مہمان آیئے۔ رانکو کو دسترخوان پر بیٹھے۔ کہانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں سیاح نے ایسی[1] دفتر کہولے کہ بہت رات گئی[2] ختم ہی نہوں۔ سلطان جی صاحب نے کچہ انگڑائیاں کسطرح کچھ جمائیاں بہی لیں۔ مگر وہ سادہ لوح کی طرح نہ سمجھے ـــ (سلطان جی صاحب[3]) آپ مہمان کی دل شکنی سمجہ کر کچہہ کہہ نہ سکے (اور[4]) مجبور بیٹھے رہے امیر خسرو بہی موجود تھے۔ مگر بول نہ سکتے تھے۔ کہ آدھی رات کی نوبت[5] بجی۔ اس وقت سلطان جی نے کہا کہ خسرو! یہہ کیا بجا؟ عرض کی آدھی رات کی نوبت ہے۔ پوچھا اسمیں کیا آواز آتی ہے؟ (انہوں نے کہا[6]) کہا (حضرت میری[7]) سمجھ میں تو ایسا آتا ہے۔

نان کر خوردی خانہ برو۔ نان کر خوردی خانہ برو۔ خانہ برو خانہ برو
نان کر خوردی خانہ برو۔ نہ کہ بدست توکردم خانہ گرد۔ خانہ برو خانہ برو

حرف حرف کے[8] حرکت و سکون پر خیال کرو کہ ایک ایک چوٹ کو کیا پورا پورا ادا کرتے[8] ہیں۔ اور نہ کہ بدست توکردم خانہ گرد[9] کو دیکھو اپنے کیا کام کیا نقل[10] ایک دن (کسی[11]) کوچہ میں سے گذر رہوا۔ دہنیا (کسی[12]) دوکان

---

[1] قدیم رسم الخط میں "ایسی" لکھا ہے جو "ایسے" پڑھنا چاہیئے۔

[2] یہ بھی قدیم رسم الخط ہے۔

[3] قلمی مسودے میں قلم زد کر دیا گیا ہے اور "آپ" استعمال کیا ہے۔ لیکن اول ایڈیشن آبِ حیات ۱۸۸۰ء میں "سلطان جی صاحب" ہی استعمال ہوا ہے۔

[4] مولانا نے قلم زد کر دیا ہے۔ [5] بادشاہوں کے ہاں اُس زمانہ میں چوپہری نوبت بجا کرتی تھی ـــ یہ حوالہ مولانا کے ہاتھ کا تحریر شدہ مسودے میں موجود ہے

[6] "انہوں نے کہا" مولانا نے قلم زد کر دیا ہے اور اسکی بجائے صرف "کہا" استعمال کیا ہے

[7] "حضرت میری" قلم زد کر دیا ہے۔

[8] قدیم رسم الخط کے مطابق لکھا ہے۔

[9] مولانا نے لکیر لگا کر نمایاں کیا ہے۔

[10] "نقل" مولانا نے نیلی پنسل سے نمایاں لکھا ہے۔

[11] مولانا نے "کسی" قلم زد کر دیا ہے۔

[12] مولانا نے "کسی" قلم زد کر دیا ہے۔

میں روئی دہنک رہا تھا کسی نے کہا کہ جس دہنیے کو دیکھو ایک ہی انداز پر روئی دہنکتا ہے۔ سب ایک ہی استاد کے شاگرد ہیں؟ کوئی بولا کہ قدرتی استاد نے سب کو ایک ہی انداز پر سیکھایا ہے۔ آپ نے کہا کہ سکہایا ہے اور ایک حرکت میں بھی تال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کوئی بولا کہ لفظوں میں کیونکر لا سکیں فرمایا (انہوں نے کہا کہ[13])

درپئے جاناں جان ہم رفت۔ جان ہم رفت۔ جان ہم رفت۔ رفت۔ رفت۔ جان ہم رفت
اینہم رفت و آن ہم رفت۔ آنہم رفت۔ آنہم رفت۔ اینہم آتہم اینہم آنہم رفت[14]
[15] رفتن رفتن رفتن دہ۔ دہ دہ رفتن دہ۔ رف رعت رفتن دہ رفتن دہ

نقل[16] محلہ کے سرے پر ایک بڑھیا ساقن کی دکان تہی۔ چہو (چہوں[17]) اس کا نام تھا۔ شہر کے بیہودہ لوگ وہاں بہنگ چرس پیا کرتے تھے۔ جب یہہ دربار سے پہر کر آتے یا تفریحاً گھر سے نکلتے تو بھی سلام کرتی۔ کبھی کبھی حقہ بہر کر ساتھیہ[18] لئے کھڑی ہوتی۔ یہ بہی اس کی دل شکنی کا خیال کر کے دو گہونٹ لے لیا کرتے۔ ایک دن اس نے کہا کہ بلالوں ہزاروں غزلیں۔ گیت۔ راگ راگنی بناتے ہو۔ کتابیں لکھتے ہو کوئی چیز لونڈی کے نام پر بہی[19] بنا دو۔ انہوں نے کہا بی چہوں[20] بہت اچھا۔ کئی دن کے بعد اس نے پہر کہا کہ بہیا رے کے لڑکے کے نام پر خالق باری لکھدی ذرا لونڈی کے نام کچہہ لکہدو[21] گے[22] تو کیا ہوگا۔

---

[13] مولانا نے "انہوں نے کہا" قلم زد کر دیا ہے۔

[14] یہاں پر ورق "۴۴" کا پہلا صفحہ ختم ہوا، اور صفحہ پلٹ دیا گیا۔

[15] دوسرا صفحہ شروع ہوتا ہے۔

[16] نیلی پنسل سے نمایاں لکھا گیا ہے

[17] مولانا نے "چہوں" لکھ "ں" قلم زد کر دیا ہے۔

[18] مولانا نے یہ لفظ "ساتہے" لکھا ہے۔ نہ جانے مسودے میں "ساتہیہ" کس طرح مولانا نے لکھ دیا۔

[19] مولانا نے "بہی" لکھا ہے۔

[20] مولانا نے "چہوں" لکھا ہے جبکہ اوپر صرف "چہو" لکھا ہے۔

[21] مولانا نے قدیم رسم الخط میں "لکھ دو" لکھا ہے۔

[22] مولانا نے "گے" لکھا ہے لیکن ایک کرسی رہ جانے سے "کے" پڑھا جاتا ہے۔ آب حیات میں "گے" لکھا ہے۔

آپنے سدا تر ہے لونڈی کا نام بھی رہ جائے گا۔ اپنے کئی دفعہ کہا تو ایکدن خیال آگیا کہ لو بنی یہ سنو۔

اور دن کی چو پہری باجے چموں کی اٹھے پہری
یعنے[12] پہر بادشاہوں سے بھی بڑی ہیں

یا ہر کوئی آپنے ناہیں آئین سارے شہری
(جنگل سے[13]) جنگلی گنواروں (کا کچھ[14]) کام نہیں۔ سفید پوش آئیں ہیں۔

ساف سوف کر کے آگے راکھے جسمیں ناہیں توسل
پیالہ بھنگ صاف مصفیٰ حاضر کرتی ہے جسمیں تُس تک نہو
اوروں کے جہاں سینک سماوے چھوکے وہاں موسل[15]
بھنگڑ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ وہ ایسی بھنگ

پیتا ہے جس سینک کھڑی رہے۔ آپ مبالغہ کرتے ہیں کہ یہہ ایسی گہری بھنگ بناتی ہے جس میں موسل کھڑا رہے[16]۔

خیر اُن کی بدولت جمو[17] کا بھی نام رہ گیا۔ حق پوچھو تو جس طرح ہر جاندار کی عمر ہے۔ اسی طرح کتاب کی بھی عمر ہے مثلاً[18] شاہنامہ کو نو سو برس ہوئے۔ سکندر نامہ کو ۷ سو برس سمجھو۔ گلستان بوستان ساڑھے ۶ سو کہو۔ زلیخا کی عمر قریب سو کے ہوئی مگر اب تک جوان ہیں۔ اردو میں باغ و بہار۔ بدر منیر وغیرہ جوان ہیں۔ فسانۂ عجائب جان بلب ہو گیا۔ بہت کتابیں[19] (اوّل[8]) اوّل شہرت پاتی ہیں۔ پھر گم نام ہو جاتی ہیں۔ یہ گویا بچے ہی تھے کہ مر گئے۔ بہتری تصنیف ہوتی ہیں اور چھپتی ہیں مگر کوئی نہیں پوچھتا۔ یہہ بچے گویا مرے ہی ہوئے پیدا ہوئے۔ (بہیں بعض کتابوں کی عمریں میعادِ معلوم ٹھہری ہوتی ہیں۔ وہ مدارس سرکاری کی تصنیفیں ہیں۔ کیونکہ جب تک تعلیم میں داخل ہیں۔ تب تک چھپتی ہیں اور خواہ مخواہ بکتی ہیں۔ لوگ پڑھتے ہیں۔ جب تعلیم سے خارج ہو گئیں مر گئیں۔ کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا[9]) مدرسوں کی کتابیں جب تک درس میں داخل ہیں۔ زندہ ہیں۔ خارج ہوئیں تو مردوں سے بدتر[10]۔

(قبول خاطر و لطفِ سخن خدا داد است
خدا یہ نعمت نصیب کرے[11])

غرض اسی جوش طبع اور ہنگامۂ ایجاد میں ایک تازہ ایجاد اور ہوا جس میں ہمارے لئے تین باتیں قابل لحاظ ہیں۔

اوّل[12] مضامینِ عاشقانہ ہیں وہ سلسلہ اشعار کا ہمارے ہاتھ آیا جسے غزل کہتے ہیں۔ وہی قافیے۔ یا ردیف اور قافیے دونوں کی پابندی۔ اسی طرح اوّل مطلع یا کئی مطلع۔ پھر چند شعر۔ اخیر میں مقطع اور اس میں

---

[13] تا [14] مولانا نے قلم رد کر دیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے پہلے یہ عبارت کچھ ایسے لکھی :-

"جنگل کے گنواروں کا کچھ کام نہیں۔ سفید پوش آتے ہیں"

لیکن بدل کر بھی عبارت یوں لکھی ہے :

"جنگل گنواروں کا کام نہیں۔ سفید پوش آتے ہیں۔"

[15] یہاں پر قلمی مسودے میں مولانا نے حوالے کا نشان "ا" دیا ہے اور یہی نشان مسودے کے حاشیے پر بھی موجود ہے لیکن کوئی حوالہ یا حاشیہ نہیں ہے۔ شاید مولانا حاشیہ لکھنا بھول گئے یا مناسب نہیں سمجھا۔

[16] [16] تک عبارت مولانا نے انتہائی باریک قلم سے تحریر کی ہے۔ قیاس کہتا ہے یہ نظر ثانی کے دوران کا اضافہ ہے۔

[17] مولانا نے "جمو" کے بین نقطے رہ گئے تھے مولانا نے "مثلاً" مسودے میں اس طرح لکھا ہے۔

[8] مولانا نے "اوّل" کو فاضل سمجھ کر قلم زد کر دیا۔

[9] قوسین کی پوری عبارت قلمی مسودے میں نہیں ہے البتہ آب حیات ایڈیشن اوّل ۱۸۸۰ء، صفحہ اضافی ۸۲ پر موجود ہے۔ نہ جانے یہ عبارت کس طرح آب حیات کے مطبوعہ ایڈیشن میں آگئی۔ آغا محمد باقر نبیرۂ آزاد مرحوم کا خیال تھا کہ مولانا نے آب حیات اور دربار اکبری کے مسودے جب کتابت ہو رہے تھے تو وہ اُس میں کچھ کچھ حصہ خود بھی کتابت کیا کرتے تھے تاکہ کام جلدی مکمل ہو جا سکے۔ ممکن ہے مولانا نے یہ اضافے بذات خود کتابت کے دوران فرمائے ہوں گے۔

[10] قلمی مسودے میں عبارت یہاں تک ہے اس کے بعد اضافی صفحہ "۸۳" ختم ہو جاتا ہے۔

[11] یہ شعر نہ ہی قلمی مسودے میں ہے اور نہ ہی آب حیات کے اوّل ایڈیشن میں ہے البتہ بعد کے ہر ایڈیشن میں یہ شعر موجود ہے۔ یہاں تک کہ "مقدمۂ آب حیات" مرتبہ آغا محمد باقر، ۱۹۵۷ء میں بھی ہے۔ نہ جانے یہ شعر کہاں سے وارد ہو گیا۔

[12] پنسل سے نمایاں کیا گیا ہے۔

تخلص (کا آئین[1]) [2]

دوسرے[3] عروض فارسی نے پہلا قدم ہندوستان میں رکھا۔ تیسرے[4]۔ فارسی اور بہاشا کو نون مرچ کیے طرح اس انداز سے ملایا ہے کہ خواہ مخواہ زبان پر چٹخارا[5] دیتا ہے (اور[6]) اسمیں یہہ بات سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ انھوں نے بنیاد عشق کی عورت ہی کی طرف سے قائم (کہی[7]) کی تہی جو کہ خاصہ نظم ہندی کا ہے۔ (اور[8]) مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس تعشق کا انقلاب کس وقت ہوا۔ غزل مذکور یہ ہے۔

(سے[9]) زحالِ مسکین مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں درایں

کہ تابِ ہجراں ندارم اے جان۔ نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں[10]

---

[1] "کا آئین" مولانا نے قلم زد کر دیا ہے۔

[2] یہ پوری عبارت (حوالہ نمبر ۱۲ اور ۱-۲) ایک الگ چیپی پر لکھ کر مولانا نے چپکائی ہے۔ چیپی پر یہ سطور دس[12] کی تعداد میں ہیں۔ اور انتہائی باریک قلم سے سیاہ روشنائی سے تحریر ہیں۔ اس چیپی کے نیچے جو تحریر بمشکل پڑھے جا سکی ہے وہ قلم زد ہے اور کچھ یوں ہے :-

"اوّل قافیہ کے ساتھ مضمون عاشقانہ، اور سلسلہ اشعار کا آیا جسے غزل کہتے ہیں دوسرے عروض"

مولانا نے اس مختصر اور نیم جامع عبارت کو دوبارہ تحریر کیا تو وہ مفصل بن گئی جو یوں ہے :-

"اوّل مضامین عاشقانہ ہیں وہ سلسلہ اشعار کا ہمارے ہاتھ آیا جسے غزل کہتے ہیں۔ وہی قافیے۔ یا ردیف اور قافیے دونوں کی پابندی۔ اسی طرح اول مطلع یا کئی مطلع۔ پھر چند شعر۔ اخیر میں مقطع اور اس میں تخلص کا آئین۔"

[3] مولانا نے "دوسرے عروض" انتہائی باریک قلم سے دائیں کنارے پر کاغذ کے لکھا ہے جس کو نیلی پنسل سے نمایاں کیا ہے [4] مولانا نے "تیسرے" کو نیلی پنسل سے نمایاں کیا ہے [5] مولانا نے پہلے "چٹخارا" کو "ہ" سے لکھا لیکن بعد میں اُسی "ہ" کو "ا" میں تبدیل کر دیا [6] مولانا نے "اور" قلم زد کر دیا اور باریک قلم سے اصلاح "اسمیں" کی [7] مولانا نے پہلے "کہی" لکھا اور پھر قلم زد کر کے "کی" اصلاح کی [8] مولانا نے "اور" قلم زد کر دیا اور ایک باریک قلم سے "مگر" اصلاح دی۔

[9] مولانا نے یہ نشان جامنی روشنائی سے لگایا اور بعد میں اسی روشنائی سے قلم زد کر دیا۔

[10] یہاں پر مسودے کا باقاعدہ صفحہ نمبر ۴ ختم ہوتا ہے۔

شبان ہجران دراز چون زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ شبیاں[11]

سکھے پیاہ کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیرے رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکین

کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہمارے بتیاں

جو شمع سوزان چو ذرہ حیران ز مہر آں مہ بگشتم آخر

نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو

سپیت منکے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

ابتدائے ایجاد میں ایسا ہوتا ہے۔ پر زمانہ جو کہ تمام مبتدیوں کا اصلاح دینے والا ہے۔ ہر شی کو تراشیں دے کر اعلے درجۂ خوبی و خوش اسلوبی پر پہنچا لیتا ہے۔ مگر اوسوقت[12] اسطرف کے ادرستے ایسے توجہ نہ کے کہ جس سے اِس طرز کا رواج جارے ہوتا۔

کہ مکرنیوں کا انہیں موجد کہنا چاہیے - نمونہ اُسکا یہہ ہے -

رنی - سگری رین موہے سنگ جاگا + بہور بہی تب بچہڑن لاگا +

اسکے بچہڑت پہاٹت ہیا - اے سکھی ساجن؟ نا سکھی دیا +

۲- سندر سلونا سب گن نیکا - واہن سب جگ لاگے پہیکا +

وا کے سر پر ہووے کون - اے سکھی ساجن؟ - نا سکھی لون +

۳- وہ آوے تب شادی ہووے - اُس بن دوجا اور نہ کوئے +

میٹھے لاگیں وا کے بول - اے سکھی ساجن؟ - نا سکھی ڈہول +

ایک کوئیں پر چار عورتیں پانی بہر رہی تہیں امیر خسرو کو رستہ چلتے چلتے پیاس لگی - کوئیں پر جا کر ایک سے پانی مانگا - انہیں سے ایک انہیں پہچانتی تہی - اُسنے اوروں سے کہا کہ دیکھو - خسرو یہی ہے - انہوں نے پوچھا کیا تو وہی خسرو ہی جسکے سب گیت گاتے ہیں - اور پہیلیاں مکرنیاں انمل سنتے ہیں - انہوں نے کہا - ہاں - اسپر ایک انہیں سے بولی کر مجھے - کھیر کی بات کہدے - دوسری نے چرخہ کا نام لیا - تیسری نے ڈہول کا - چوتھی نے کتے کا - انہوں نے کہا مجھے بہت پیاس لگی ہے پہلے پانی تو پلا دو - وہ بولیں جب تک ہمارے بات نہ کہدیگا ہم نہ پلائینگے - انہوں نے جھٹ کہا -

انمل - کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا + آیا کتا کہا گیا تو بیٹھی ڈہول بجا + لا پانی پلا -

آبِ حیات کے قلمی مسودہ کا ایک صفحہ

---

[11] آئندہ صفحے کے شروع کا پہلا لفظ "شبان" حوالے کے طور پر بائیں کونے پر نیچے لکھا ہے۔

[12] مولانا نے "اوس" لکھا ہے جو اب متروک ہے۔

امیر خسروؔ بحیثیت عظیم فنکار

مسرّت رفیق

برصغیر پاک وہند کی سات سو سالہ تاریخ نے کسی بھی ایسے شخص کو جنم نہیں دیا جو حضرت امیر خسروؒ جیسی غیر معمولی ذہین اور ہمہ گیر شخصیت کا مقابلہ کر سکے۔ گو اس دوران شاعر، موسیقار، صوفیائے کرام، مصور، ماہر لسانیات اور فوجی سیاست دان بھی پیدا ہوئے اور انہوں نے مختلف ادوار میں اس خطۂ ارض کی تاریخ پر انتہائی گہرے اور لافانی اثرات بھی چھوڑے لیکن ان تمام حقیقتوں کے باوجود کسی ایک شخصیت کی مثال پیش کرنا قطعی ناممکن ہے جس میں وہ تمام خصوصیات یکجا ہوگئی ہوں جیسی کہ ابوالحسن یمین الدین معروف بہ امیر خسروؒ میں مجتمع ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر خسروؒ کی بے نظیر ہمہ گیری اور مختلف تخلیقی فنون میں حیرت انگیز مہارت اور استعداد نے ان کی شخصیت کو بالحقیقت بے مثال بنا دیا۔

ایٹہ کے نزدیک واقع پٹیالی گاؤں میں ۱۲۵۳ء میں ترک باپ اور ہندوستانی ماں سے تولد ہونے والے اس فقید المثال فنکار نے انتہائی معمولی تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد امیر سیف الدین محمود جو ایک پیشہ ور سپاہی اور ترک لاچینی قبیلہ کے سردار تھے مغل حملہ آوروں کی تباہ کاریوں سے پناہ لینے کی خاطر ایشیائے کوچک سے ہجرت کر کے جنت نظیر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کا فرزند عالم فاضل بنے اور تبحر علمی سے ہر سو روشنی پھیلائے لیکن ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ان کے والد کی اچانک موت نے ہونہار خسروؒ کے سلسلۂ تعلیم کو یکدم موقوف کر دیا۔ اس وقت خسروؒ کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی۔ والد کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کی نگہداشت و تربیت کی کلی ذمہ داری ان کے نانا امیر عماد الملک کے ذمہ ٹھہری جو سلطان نصیر الدین محمود کے دربار میں وزارت کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ وہ خود بھی شعر و نغمہ و رقص و سرود کے انتہائی شائق تھے اور اپنے شوق کی تکمیل و تسکین کے لئے انہوں نے اپنے اردگرد معروف شعراء و موسیقار اکٹھا کر رکھے تھے۔

ایسے فنکارانہ اور جلا بخش ماحول میں پروان پانے والے خسرو کے دل و ذہن نے بڑے گہرے اثرات قبول کئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بچپن سے ہی موسیقی اور شاعری کا ایک خاص ذوق و شوق پیدا ہوا۔ سوائے اس ماحولی تربیت کے انہوں نے نہ شاعری میں اور نہ ہی موسیقی میں کسی کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔ جس زمانے میں حضرت خسروؒ اپنے نانا کی زیرِ نگہداشت تھے، عماد الملک سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے انتہائی عقیدت مند مرید تھے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ وہ بھی سلطان المشائخؒ کے مرید ہوئے اور ان کے حلقۂ خاص میں داخل ہوئے حضرت سلطان المشائخؒ

کی توجہ خاص نے امیر خسروؒ کو ان کے ایام زندگی کے بعد کے دور میں روحانی ترقی کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

اپنی بہتر سالہ زندگی میں حضرت خسروؒ نے گیارہ سلطنتوں کو عروج و زوال پذیر ہوتے دیکھا۔ یہ وہ دور تھا جب درباری ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ہر شخص سماجی اضطراب اور سیاسی ابتلا کا شکار تھا۔ لوگوں کی اس کسمپرسی اور قتلِ عام نے امیر خسروؒ پر جنہوں نے اس دور کا بہ نظرِ غائر مشاہدہ کیا تھا گہرا اثر چھوڑا اور وہ مذہب و تصوف کی جانب جھکتے چلے گئے۔ نتیجتاً اس دور کی مادہ پرستی کے رجحانات سے وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے سازشوں، خوشامدیوں اور خود غرضیوں سے بھری اس دنیا سے بتدریج کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ان کے ذہن میں ان باتوں نے انتہائی مضبوط جڑیں پکڑ لیں کہ یہ دنیا غیر حقیقی ہے اور زندگی کے مقاصد کو اسی صورت حاصل کیا جا سکتا ہے کہ سچائیوں کے متلاشی پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ روحانیت کی گہرائیوں میں صرف مادی سطح سے گزر کر ہی جھانکا جا سکتا ہے۔

حضرت خسروؒ کی زندگی میں بظاہر تضاد کے متعلق سوال ابھرتا ہے۔ کیونکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک جانب صرف دنیاوی مفاد کی خاطر انہوں نے متعدد بادشاہوں اور امیروں کے درباروں میں ملازمت اختیار کی اور ان کی مدح میں صفحات کے صفحات بھر ڈالے اور دوسری جانب جب ان میں تبدیلی آئی تو پلک جھپکتے میں انہوں نے اپنی تمام املاک اور دھن دولت کو خیرباد کہہ دیا۔ موثر جواب کے لئے اس ضمن میں صرف اس دور کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی صورتِ حال پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہوگا۔ مختلف علوم و فنون نے ترقی کے جو مدارج اس زمانے میں طے کئے وہ صرف امراء اور درباری سرپرستی کے ہی مرہونِ منت تھے۔ بایں حالات شعراء اور فنکار ان درباروں سے منسلک رہنے پر مجبور تھے تاکہ وہ انعامات و اکرامات کے ذریعے اپنی دنیاوی ضروریات پوری کر سکیں۔ البتہ اس سرپرستی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ اپنی روزمرہ ضروریات کی فکروں سے بالا ہو کر پورے انہماک اور لگن سے تخلیقی اور دوسرے فنی کاموں میں پوری طرح مصروف رہے اور انہیں ترقی کے عروج تک پہنچایا۔

ایک بلند پایہ شاعر اور موسیقار ہونے کے علاوہ حضرت خسروؒ کو متعدد زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ترکی، فارسی، برج بھاشا (ہندی یا ہندوی) سنسکرت اور دوسری بہت سی زبانوں میں وہ مکمل استعداد اور مہارت سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے تھے۔ گو ان کی مادری زبان برج بھاشا تھی لیکن فارسی زبان انہیں ورثہ میں ملی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سو سے زیادہ کتابیں مختلف علوم و فنون پر تحریر کیں جن میں سے بیشتر تاریخ کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ البتہ ان میں سے قریباً بیس کتب ایسی ہیں جو دنیا کے مختلف علاقوں میں اب بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان کی وہ بے شمار تحریریں جو ابنائے تاریخ کے ملبے میں دفن ہو چکی ہیں ان کی تلاش و جستجو کے لئے ماضیٔ قریب میں کوئی سنجیدہ اور پیہم کوشش نہیں کی گئی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے اصل قلمی مسودات برطانوی عجائب گھر، لندن کی انڈیا آفس لائبریری اور متعدد امریکی عجائب گھر اور کتب خانوں میں موجود ہیں۔

یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے پانچ لاکھ سے زیادہ فارسی میں اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں ہندی میں شعر کہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو مطبوعہ حالت میں یا یادداشتوں کے ذریعے جمع کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے متعلق صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے اور بس۔

ان کی شعوری کوششوں سے جو انہوں نے ترکی، فارسی اور برج بھاشا کی آمیزش سے اپنی شاعری میں کیں حضرت امیر خسروؒ کو بجا طور پر زبان اردو کا خالق تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے اسی تجربے نے اردو کی نشو و نما کی داغ بیل ڈالی۔

ان کی جو تخلیقی کاوش دریائے تاریخ کے دھارے میں بہہ گئیں ان میں ایک درجن کے قریب وہ تخلیقات بھی تھیں جو انہوں نے

موسیقی کے سلسلے میں تحریر کیں۔ لیکن ان کتب کے تلف ہو جانے کے باوجود
اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت خسروؒ نے برصغیر کی
موسیقی کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں ایک عظیم کردار ادا کیا۔ ہندوستان
کی وہ موسیقی جسے دنیا کی قدیم ترین موسیقی تصور کیا جاتا تھا اب بالکل
ناپید ہو چکی ہے۔ موجودہ خدوخال میں جو موسیقی اب مروج ہے
وہ حضرت خسروؒ کی تخلیق کردہ ہے۔ جنہوں نے اس کی تزئین و آرائش
کرکے اس میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ موسیقی میں ان کی جدتوں اور
اصلاحات کی وجہ سے اور بعد میں آنے والے مسلم موسیقاروں مثلاً
حسین شرقی، میاں تانسین اور سدا رنگ کی کوششوں سے پیدا ہونے
والی تبدیلیوں کی وجہ سے ہندوستانی موسیقی اب اپنی اصل شکل و
صورت میں کہیں بھی موجود نہیں۔ حضرت خسروؒ اور دوسرے
موسیقاروں کی شعوری کوششوں سے ایرانی اور عربی موسیقی کے
جو اثرات ہندوستانی موسیقی پر پڑے اس کی بنا پر قدیم ہندوستانی ویدک
موسیقی کی طرح برصغیر کی اس نئی موسیقی نے بھی بالکل جداگانہ حیثیت حاصل
کرلی۔ فی زمانہ ہم جو موسیقی ہندوستان و پاکستان میں سنتے ہیں وہ وہی
موسیقی ہے جو امیر خسروؒ اور دوسرے مسلمان موسیقاروں کی کوشش
سے پچھلے سات سو برسوں میں ترقی کے مختلف مراحل سے گزر کر ہم تک
پہنچی ہے۔

امیر خسروؒ نے نہ صرف نئے راگ اور راگنیاں ترتیب دیں بلکہ
متعدد نئے ساز بھی ایجاد کئے۔ ان کے بے شمار راگوں میں سے
"سازگری"، "ایمن"، "زلف"، "سرپردا"، "زنگولا" اور
"غارا" چند ایسے راگ اور راگنیاں ہیں جنہیں آج بھی موسیقار اور
گائک بڑی آسانی اور خوبصورتی سے گاتے ہیں۔ برصغیر کا مقبول
ترین ساز "ستار" انہی کی ایجاد ہے جو درحقیقت وینا کی ترقی یافتہ
شکل ہے۔ انگلیوں سے بجانے والے سازوں میں ڈھولک اور
طبلہ وہ ساز ہیں جو اپنے وجود کے لئے امیر خسروؒ کی تخلیقی استعداد
کے مرہون منت ہیں جنہوں نے مردنگ اور پکھاوج کی اصلاح
کے بعد ان سازوں کو ایجاد کیا۔ ان سازوں کے لئے انہوں نے مختلف
تالیں بھی ایجاد کیں۔ ایک ایسے موسیقار کی طرح جس میں موسیقی کے
محرکات اور دوسری چیزیں قبول کرنے اور ان میں اصلاح پیدا کرنے
کی صلاحیت ہو امیر خسروؒ نے بھی تمام عالم کی موسیقی سے اثرات
قبول کئے اور انہیں اپنی تخلیقی ذہن کی بھٹی میں ڈال کر ایک نئی
جلا بخشی۔ اس ضمن میں قوالی اور ترانہ دو ایسی مخصوص اصناف ہیں
جو اس نظریہ کی تصدیق کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

مغرب میں جاز کے موسیقار خصوصاً امریکی موسیقار جو ستار
اور طبلہ کی تھاپ سے پیدا ہونے والی موسیقی سے بے حد مسحور ہو
جاتے ہیں شاید اس بات سے قطعی ناآشنا ہیں کہ یہ دونوں ساز
امیر خسروؒ کی ایجاد ہیں جن کی سات سو سالہ برسی دنیا بھر کے بیشتر
ممالک میں اس سال منائی جا رہی ہے۔

موسیقی کے میدان میں امیر خسروؒ کی مسلمہ قابلیت و ذہانت
کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ سلطان علاء الدین
خلجی کے دور حکومت میں جنوبی ہندوستان کا ایک عظیم گائک
نائک گوپال موسیقی کے آسمان پر بڑی آب و تاب سے جگمگا
رہا تھا۔ اسے شہنشاہ ہندوستان نے دہلی بلایا کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ
کرے۔ گوپال جیسے عظمت اور فن دانی کے باعث اس کے بارہ سو
شاگرد پالکی میں بٹھا کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جایا
کرتے تھے حضرت خسروؒ کی فن موسیقی میں مہارت کے متعلق پہلے ہی
سن چکا تھا۔ دربار میں گائکی میں اپنی فنی مہارت کا اندازہ لگانے
کی خاطر اس نے امیر سے درخواست کی کہ وہ پہل کریں۔ لیکن امیر
نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ وہ ہندوستان میں بدیسی ہیں اور ان
میں مکمل خود اعتمادی نہیں کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ اُس سے
پہلے کریں۔ بالآخر گوپال نے متعدد راگ و راگنیاں پیش کیں جن پر
امیر خسروؒ نے اعتراض کیا کہ وہ تمام چیزیں ان کی ترتیب شدہ ہیں۔
امیرؒ کی اس بات نے شہنشاہ اور گوپال کو مکمل طور پر ششدر و حیران

کر دیا۔ انہوں نے امیرؒ سے کہا کہ وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں دلیل پیش کریں۔ اس پر امیر خسروؒ نے گوپال کے انداز میں وہ تمام راگ و راگنیاں اپنی فی البدیہہ اختراعی تراکیب کے ساتھ مکمل اطمینان و سکون سے پیش کر کے تمام سامعین کو مبہوت کر دیا۔ نائک گوپال نے شدید خفت محسوس کرتے ہوئے امیر کی عظمت کا برسرِ عام اعتراف کیا۔

مستقبل میں آنے والی موسیقار نسلوں کی رہبری و ہدایت کے لئے امیر خسروؒ موسیقی کے قطعی قوانین چھوڑ گئے جن کی بعد کے موسیقاروں نے بالکل ویسے ہی پابندی اور پاسداری کی جس طرح وہ ان تک پہنچے تھے۔ موسیقی میں حضرت خسروؒ نے جو لافانی کردار ادا کیا وہ تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ برصغیر کی موسیقی کی نشو و نما کے متعلق کوئی ذکر امیر خسروؒ کے بغیر بالکل بے معنی ہوگا۔ اس لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ تیرھویں صدی کے اس عظیم و بلند پایہ اور ذہین و فطین مسلمان مخترع کی روحانی، ثقافتی اور موسیقی کی میراث کی پوری طرح حفاظت کی جائے۔

شاعری کا سچا عاشق یا صاحب ادراک فرد امیر خسروؒ کی شاعری میں مضمر الفاظ کے معانی اور مطالب سے ان کی بات کی جڑ تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ خسروؒ کی الہامی فطرت اور ان کی بصیرت کے ذریعہ ان کے پیغام میں پوشیدہ معانی کو سمجھ لے گا۔ ان کی شاعری میں عارفانہ اور وجد آفریں رنگوں کی آمیزش ہے۔

خسروؒ اک خورشید

الطاف پرواز

کرن کرن خورشیدِ وفا کی، اُفق اُفق مہتاب،
تعبیروں میں ڈھلتے جائیں کیا کیا اُجلے خواب،
اپنے اپنے عہد کے بانی، خسروؒ اور زریاب
نُور ہنر کا اُس من جاگے، جس من لاگے ٹھیس

رنگ اور خوشبو، ساز اور نغمہ جیسے جسم اور جان
کہیں نہ ٹھہرے سُر کا پنچھی، کہیں نہ ٹوٹے تان
ذہن اور دل پر نقش ابھارے، انساں کی پہچان
علم و ہنر کا سورج چمکے، دیس ہو یا پردیس

پیار، سخن، تنویرِ وفا کے نقش و گل اوراق
غارا، زیلف، قول، ترانہ، سرپردا، عشّاق،
بادۂ عرفان، عالمِ مستی، وجد کریں آفاق
گوری سوئی سیج پر اپنے، مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے تو بھی رین بھئی چو دیس

قاصدِ شیریں بیاں۔ خسروؔ

کنور محمد اعظم علی خاں خسرویؔ

(۱) خسروِ اقلیمِ فکر و شہر یارِ ملکِ فن
ہر زمانے کو پیامِ تازہ تر جس کا سخن
ہر سخن جس کا چمن اندر چمن اندر چمن

(۲) ہر چمن کی اک نئی خوشبو، نویلی ہے بہار
ہر روش پر رنگِ نو، ہر رنگ پر تازہ نکھار
نکہتِ گل بھی انوکھی ہے، نئی بوئے سمن

(۳) لالہ و نرگس کی آنکھوں میں سرورِ نو بنو
سنبل و شمشاد پر ہر دم نرالی اک ضَو
موتیا، جوہی، چنبیلی پر بھی تازہ اک پھبن

(۴) ہر چمن اس کے سخن کا ہے بہاروں کا امیں
فصل ہو کوئی، خزاں جس میں کبھی آتی نہیں
اُس کی جوئے فکر سے سیراب ہیں کوہ و دمن

(۵) کوہ سے مطلب ہے کیا، ذہنِ رسا، طبعِ بلند
اور دمن کیا ہے، بحرِ قلبِ وسیع و دردمند
جوئے فکر اس کی رواں ہے، کوئی وادی ہو کہ بَن

(۶) شمعِ خلوت گاہِ ناز و مُطربِ بزمِ نیاز
کاشفِ سرِّ حقیقت، شارحِ رمزِ مجاز
قاصدِ شیریں بیانِ ملکِ جاں، در شہرِ تن

(۷) نظم میں جس کی بلاغت، نثر بھی جس کی فصیح
قال بھی جس کے ملاحت، حال بھی جس کا صبیح
اور امیری میں بھی جس کی فکر کا اِک بانکپن

(۸) خلعتِ زرکار میں بھی جو گدائے کوئے دوست
طُرۂ دستار خم جس کا سوئے ابروئے دوست
صحبتِ شاہی میں بھی جس کا فقیرانہ چلن

(۹) ساز بھی جس کا نیا، نغمے نئے، لَے بھی نئی
جس کے خُم کورے، اچھوتے جام سب، مے بھی نئی
شمع بھی جس کی نئی ہے اور نیا اُس کا لگن

(۱۰) شمعِ جاں دل کے لگن میں جو جلاتا ہی رہا
گیت ساری عمر چاہت کے جو گاتا ہی رہا
قلبِ انسانی کی ٹھنڈک، جس کے سینے کی جلن

(۱۱) خسرویؔ کی فکر روشن نسبتِ خسروؔ سے ہے
اِس کی کُٹیا کا اُجالا، اُس کے ہی پرتو سے ہے
فکر بھی سچّی تھی جس کی اور سچّا جس کا فن

(۱۲) خسرویؔ کیا اور اس کے فکر و فن کیا، کچھ نہیں
جو کچھ ہذیان ہے سارا، جو لکھّا، کچھ نہیں
فکرِ خسروؔ گر نہ اس کے ذہن پر ہو ضَو فگن

عوامی حکومت کے چار سال

آئین اور خدمتِ اسلام

مولانا کوثر نیازی
(وزیر امورِ مذہبی)

۱- ابتدائیہ

پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین نے ۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء کو اپنے ہم وطنوں سے یہ کہا تھا کہ "وہ اس حسین ملک کو اسلامی مملکت، سب سے بڑی اسلامی مملکت، دلیر ترین اسلامی مملکت اور سب سے ٹھوس اسلامی مملکت بنائیں"، تو انہوں نے باشندگانِ پاکستان کے پُرخلوص جذبات اور امنگوں کا اعادہ کیا تھا کیونکہ پاکستان، اسلام کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔

یہ ملک اس لئے وجود میں آیا کہ برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں نے اپنے لئے ایک ایسا وطن حاصل کرنے کی انتھک جدوجہد کی جہاں وہ اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں، جہاں وہ خوف اور شبہ سے آزاد ہو کر اپنے مذہبی فرائض ادا کر سکیں اور ان کا اظہار کر سکیں، جہاں وہ اسلام کی سربلندی کے لئے کام کر سکیں۔ چونکہ یہ عوام کی خواہش اور مرضی تھی اس لئے قائدِ اعظمؒ نے فروری ۱۹۴۸ء میں اپنی ایک نشری تقریر میں کہا تھا کہ "مجھے نہیں معلوم کہ اس آئین کی قطعی شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ ایک جمہوری طرز کا آئین ہوگا جو اسلام کے لازمی اصولوں کو اپنے اندر سموئے ہوگا۔ وہ اصول آج حقیقی زندگی میں اسی طرح قابلِ عمل ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے تھے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت سکھائی ہے۔ ہمیں مساواتِ انسانی اور ہر ایک کے ساتھ انصاف اور صاف معاملہ کرنا سکھایا ہے۔" یہی سبب ہے کہ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حصولِ آزادی کے وقت سے آئین سازوں نے، جب کبھی انہیں موقع ملا مسلسل کوشش کی کہ اسلامی نظریات کے حصول سے متعلق دفعات متعارف کریں۔

۲- اسلامی نظریہ

جب پاکستان وجود میں آیا تو سب سے پہلا کام جس نے بانیٔ پاکستان اور پہلی آئین ساز اسمبلی کی توجہ اپنی طرف مبذول کی وہ یہ تھا کہ نئی مملکت کے آئین کے لئے رہنما اصول اور مقاصد مرتب کئے جائیں۔ سنہ ۱۹۴۹ء ہی میں پہلی آئین ساز اسمبلی نے قراردادِ مقاصد منظور کی جس میں وہ لازمی اور بنیادی اصول رکھے گئے جن پر آئین مرتب کرنا تھا۔ اس قرارداد میں مندرجہ ذیل اہم نکات رکھے گئے تھے:۔

(الف) حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے جسے پاکستانی عوام اس کی مقدس امانت کے طور پر استعمال کریں گے۔

(ب) پاکستان ایک وفاقی مملکت ہوگی۔

(ج) اسلام کے بتائے ہوئے طریقے پر جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں پر عمل کیا جائے گا۔

(د) مملکت اپنے اختیارات کا استعمال عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ کرے گی۔

(ہ) اقلیتوں کے حقوق کو مناسب تحفظ دیا جائے گا۔

(و) عدلیہ آزاد ہوگی۔

مختصر طور پر یہ اسلامی نظریاتی اصولوں کے نکات تھے جن پر پاکستان
ے لئے ایک آئین کی بنیاد رکھنی تھی۔ تاہم ان اصولوں کا یہ مطلب نہیں
ا کہ پاکستان ایک مذہبی مملکت ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ قائدِ اعظم
ے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ "آپ کوئی غلطی نہ کریں۔ پاکستان کوئی
ہبی یا اس قسم کی کوئی مملکت نہیں ہے۔ اسلام ہم سے دوسرے
ہب کے ساتھ رواداری برتنے کا مطالبہ کرتا ہے۔" بہر حال ایک
ت واضح تھی کہ پاکستان کو کسی حال میں بھی ایک لادینی مملکت نہیں بننا
ا۔ قراردادِ مقاصد میں مندرج اصول، حقیقت میں اسلامی آئینی قانون کے
یادی اصول ہیں کیونکہ اسلام واضح طور پر یہ اعلان کرتا ہے کہ حقیقی
لم صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ سارے انسان معاشرتی
ر پر برابر ہیں، لہٰذا انہیں ترقی اور اظہارِ ذات کے یکساں مواقع ملنے
یں۔ اسلام ہمیں رواداری، معاشرتی انصاف اور قانون کی نظر میں سب
برابری سکھاتا ہے۔ یہ عوام کو یہ حق دیتا ہے کہ ان پر قانون کے مطابق
رانی کی جائے۔ یہ کل بنی نوع انسان کی آزادی، انسانی اخوت، مشورے
سب کے لئے حقِ رائے دہی کے ذریعہ جمہوری حکومت کے نظریات
وضاحت کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ اسلامی معاشرے کے
ادی اصول ہیں اور ایک اسلامی مملکت کے سارے قوانین وضوابط
یں مقاصد کے حصول کے لئے ہونے چاہئیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا
ے کہ پاکستان کا آئین کتنے احسن طریقے پر ان مقاصد کو حاصل کرنا چاہتا
ے اور اس میں وہ کون سے ذرائع اور وسائل رکھے گئے ہیں جن کی
رد سے اہلِ پاکستان، اسلام کی خدمت کر سکتے ہیں اور اس کی
شوکت و عظمت کے لئے کام کر سکتے ہیں۔

۳۔ آئین اور اس کی اسلامی خصوصیات

(الف) تمہید (پیش نامۂ آئین) اسمیں شک نہیں کہ تمہید قانون سازوں کا دماغ کھولنے کی کنجی ہے۔
تمہید پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں نہ صرف قراردادِ مقاصد کی اہم دفعات شامل ہیں بلکہ یہ اسلامی تصور بھی ہے کہ مملکت کے کارندے خدا تعالیٰ اور انسان کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اس میں باشندگانِ پاکستان کا یہ عزم اور عہد بھی نظر آتا ہے کہ وہ انصاف پر مبنی ایک معاشرہ قائم کر کے جمہوریت اور پاکستان کی سالمیت اور استحکام حاصل کریں گے۔ اس میں اسلام کا یہ بنیادی اصول بھی ملتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے قوانین وضع کرنے کا اختیارِ کلی صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مجالس قانون ساز اس معنی میں حاکمِ مطلق اور خود مختار نہیں ہیں کیونکہ انہیں اپنی پسند کے قوانین وضع کرنے کا مکمل اختیار نہیں ہے۔ ان کے اختیارات ان پابندیوں سے محدود ہیں جو اسلام نے قانون سازی پر عائد کر رکھی ہیں اور یہ پابندیاں مستقل ہیں اور انہیں کسی قسم کی قانون سازی کے ذریعہ ہٹایا نہیں جا سکتا۔ چونکہ حقیقی حاکم اللہ ہے اس لئے عوام کے منتخب نمائندوں کو امینوں کی حیثیت سے اور شریعت کے حدود کے اندر رہتے ہوئے قوانین وضع کرنے کے حق کو استعمال کرنا ہے۔ یہاں یہ سمجھ لینا مناسب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کو اختیار تفویض کرنے سے متعلق ایک بنیادی غلطی فہمی جو ماضی میں رہی ہے، اس کی تصحیح کر دی گئی ہے اور آئین نے اب بجا طور پر ان اختیارات کو جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیئے ہیں ان حدود تک محدود کر دیا ہے جو اس نے متعین کر دیئے ہیں۔ تمہید کی دوسری اہم دفعہ، باشندگان پاکستان کی اس خواہش کا اظہار کرتی ہے کہ وہ جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں پر، جیسا کہ اسلام نے بتایا ہے، ایک اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں باشندگان پاکستان، اسلام کی

تعلیمات اور مقتضیات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

(ب) دوسری اسلامی دفعات

آئین میں تمہید کے علاوہ دوسری دفعات ہیں جنکا مقصد اسلام کے مقاصد کو فروغ دینا ہے۔ ان میں سے چند اہم دفعات کا مختصر تذکرہ کرنا بیجا نہ ہوگا جو یہ ہیں:۔

(۱) ہر قسم کے ابہام کو دور کرنے کی غرض سے یہ التزام کیا گیا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہوگا جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک جمہوری مملکت ہوگی جہاں اسلام کے منافی کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا۔

(۲) پہلی مرتبہ اس آئین میں یہ خصوصی دفعہ رکھی گئی ہے کہ اسلام مملکت کا مذہب ہوگا۔

(۳) آئین کے تیسرے جدول میں عہدوں کے جو حلف رکھے گئے ہیں ان سے ہر قسم کا شبہ دور ہو گیا ہے۔ اور یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ سربراہ مملکت اور وفاق کا انتظامی سربراہ سوائے سچے مسلمان کے اور کوئی نہیں ہو سکتا جس کا خدا کی وحدانیت پر، الہامی کتابوں پر، قرآن پاک پر، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری نبی ہونے پر، روز قیامت پر اور قرآن و سنت کی متعین کی ہوئی ساری باتوں پر پختہ ایمان ہوگا۔

(۴) آئین میں ایک حالیہ ترمیم کے ذریعہ یہ دفعہ رکھی گئی ہے کہ جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قطعی اور غیر مشروط آخری نبی ہونے پر ایمان نہیں رکھتا یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا ایسا دعویٰ کرنے والے کو نبی یا مذہبی مصلح مانتا ہے وہ "غیر مسلم" ہے۔

(ج) مملکت کی پالیسی کے اصول

آئین نے باب دوم میں مملکت کی پالیسی کے چند اصول رکھے ہیں جن کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے مسلمان، اسلام کے بنیادی اصولوں اور تصورات کے مطابق انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی بسر کر سکیں۔

اس میں یہ کہا گیا ہے کہ مندرجہ ذیل اقدامات کئے جائیں گے اور مملکت ان کے لئے کوشش کرے گی :۔

(۱) قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم لازمی کی جائے گی۔

(۲) عربی زبان سیکھنے کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔

(۳) قرآن پاک کی صحیح اور ٹھیک ٹھیک طباعت کا انتظام کیا جائے گا۔

(۴) اتحاد اور اسلامی اخلاقی معیاروں پر عمل درآمد کو فروغ دیا جائے گا۔

(۵) زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کی مناسب تنظیم کی جائے گی۔

(۶) اقلیتوں کے جائز حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

(۷) شراب نوشی، قمار بازی وغیرہ جیسی معاشرتی برائیوں کو روکا جائے گا۔

(۸) چند ہاتھوں میں دولت کے ارتکاز کی حوصلہ شکنی کی جائے گی اور ربوٰ کو ختم کیا جائے گا۔

(۹) خارجہ پالیسی کا بنیادی نکتہ، مسلم مملکتوں سے دوستی کے برادرانہ رشتے اور بین الاقوامی امن کا فروغ ہوگا۔

اگرچہ مملکت کی پالیسی کے ان اصولوں کے سلسلہ میں قانونی چارہ جوئی کا حق نہیں دیا گیا ہے تاہم ان سے بلا شبہ آئین کے اس منشا کا اظہار ہوتا ہے کہ مملکت کے انتظامی اعضاء و جوارح کی پالیسی کا رخ ان ہی مقاصد کے حصول کی جانب ہوگا۔ یہ ایسی دفعہ ہے جسے اسلام کے مقصد کو فروغ دینے کی غرض سے مملکت کے کارندوں کا ایک آلہ سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ آئین کے نفاذ سے دو سال کے اندر ان سارے مقاصد کے حصول کے لئے بنائی جانے والی پالیسیوں پر عمل کرنے کی غرض سے اقدامات پہلے ہی کئے جا چکے ہیں۔ بہرحال ان پالیسیوں کے ذریعہ مسلمانان پاکستان

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو (اس وقت کے صدر مملکت) اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی توثیق کر رہے ہیں جسے صدر مملکت فضل الٰہی چوہدری (اس وقت کے اسپیکر) نے ۱۰ اپریل کو پریذیڈنسی میں پیش کیا تھا۔

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو پارلیمنٹ ہاؤس کے ماڈل کا معائنہ کر رہے ہیں

قومی اسمبلی اسلام آباد کا بیرونی منظر

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو (اس وقت کے صدر مملکت)
آئین کی توثیق سے قبل ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو ممبران اسمبلی سے
مخاطب ہیں۔

جناب عبدالحفیظ پیرزادہ کی زیرصدارت قومی اسمبلی میں "آئین کمیٹی" کا اجلاس (۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

جشن آئین کے موقع پر مزدوروں کا جلوس مری روڈ سے گذر رہا ہے۔

کو اسلام کے بنیادی اصولوں اور تصورات کے مطابق زندگی بسر کرنے اور
قرآن پاک اور سنت کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھنے کے قابل بنانے کا
قطعی مقصد حاصل کرنے کے لئے مسلسل کوششوں کی ضرورت ہوگی۔

(د) اسلامی کونسل

پاکستان میں صحیح معنوں میں اسلامی طرز زندگی رائج کرنے کی غرض
سے آئین نے اسلامی نصب العین کی ایک کونسل قائم کرنے کا انتظام کیا ہے
اس کونسل میں ہر مکتب فکر کے جید علماء اور جج اور جیورسٹ ہوں گے۔
اس کونسل کو دو قسم کے فرائض انجام دینے ہیں، سفارشی اور مشاورتی
جو یہ ہیں:

سفارشی فرائض

(الف) اس کونسل کا یہ فرض ہے کہ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے
سامنے ان ذرائع و وسائل کی سفارشات کرے جن سے مسلمانانِ پاکستان
قرآن و سنت میں بتائے ہوئے اسلام کے اصولوں اور تصورات کے
مطابق انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوں۔
یہ اس کونسل کا ابتدائی کام ہے جیسا کہ آئین میں گنجائش رکھی گئی ہے۔
اور اس معاملے میں یہ

(ب) موجودہ قوانین کو اسلام کے احکامات کے مطابق بنانے
کے اقدامات اور ان مراحل کی سفارشات کرے گی جن میں ایسے
اقدامات پر عملدرآمد ہونا چاہیئے اور

(ج) اسلام کے ایسے احکامات کو، جن کا قانونی نفاذ کیا جا سکتا ہے
مناسب شکل میں مرتب کرنا۔

مشاورتی فرائض

صدر، کسی صوبہ کا گورنر یا کوئی ایوان یا صوبائی اسمبلی بشرطیکہ
اس کے کل ارکان کا ⅖ حصہ ایسا چاہے اس سوال پر مشورہ طلب کر
سکتا ہے کہ کوئی مجوزہ قانون اسلام کے احکامات کے منافی نہیں ہے

اس کونسل کا قیام، اسلام کے مقصد کی سب سے بڑی خدمت ہے
اور حقیقی طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نو سال کے
اندر پاکستان کی قانون سازی کا پورے ڈھانچے پر اسلامی رنگ چڑھ جائے گا۔

۴۔ آئینی دفعات پر عملدرآمد

آئین کے پیش نظر مقاصد کے حصول کے لئے جو دفعات رکھی
گئی ہیں ان پر اب تک جتنا عملدرآمد ہوا ہے۔ اس کی تفصیل بتانا
مشکل ہے۔ تاہم بعض اہم کام جو اب تک ہوئے ہیں ان کا مختصر بیان
یہاں نامناسب نہیں ہوگا:۔

(۱) اسلام سے متعلق معاملات اور آئین کی اسلامی دفعات پر عملدرآمد کی نگرانی کرنے کے لئے ایک وزارت مذہبی امور قائم کی گئی ہے۔

(۲) اسلامی نصب العین کی کونسل قائم کی گئی ہے۔

(۳) قرآن پاک کی ٹھیک ٹھیک اور اغلاط سے پاک طباعت کو یقینی بنانے کے لئے ایک وفاقی قانون نافذ کیا گیا ہے۔

(۴) فریضہ حج کی ادائیگی پر سے ساری پابندیاں ہٹالی گئی ہیں اور حج سے متعلق سارے کام کمپیوٹر کے ذریعہ کئے جاتے ہیں۔

(۵) صوبائی حکومتوں کے محکمہ ہائے اوقاف، ٹھوس بنیادوں پر اوقاف کی تنظیم کرنے کے لئے کارروائی کر رہے ہیں۔

(۶) ابتدائی درجہ سے میٹرک کلاس تک اسلامیات کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔

(۷) سارے پاکستان میں عربی زبان کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

(۸) عالم اسلام سے پاکستان کی یکجہتی قائم کرنے کی غرض سے فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں پاکستان نے ایک اسلامی سربراہی کانفرنس کی میزبانی کی۔

(۹) عید کی تقریبات کے موقع پر وجہ اختلاف دور کرنے کے

ایک رویت ہلال کمیٹی قائم کی گئی ہے۔

۵ - خلاصہ

مختصر یہ کہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے آئین کا مقصد، صحیح معنوں میں ایک اسلامی معاشرے کا قیام ہے۔ اس نے حاکمیت کے بنیادی تصورات، اسلامی جمہوریہ، اسلامی مقاصد مملکت کی پالیسی کے اصول کی واضح نشاندہی کر دی ہے اور اسلامی نصب العین کی کونسل جیسے داخلی ادارے کے قیام کا انتظام کر دیا ہے جو باشندگان پاکستان کو بلاشبہ اس قابل بنائیں گے کہ وہ پاکستان میں احیائے اسلام اور نشاۃ ثانیہ کا دیرینہ مقصد حاصل کر سکیں۔ ہم خدائے عزوجل سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اسلام کے مقصد اور اس کی شوکت بڑھانے کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنے کا حوصلہ، قوت اور جذبہ عطا کرے کیونکہ حقیقت میں عوام اور ان کی کوششیں ہی آئین کو کامیاب بنا سکتی ہیں۔

پاکستان کا آئین — کچھ خیالات

پاکستان پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت جس کے سربراہ جناب ذوالفقار علی بھٹو ہیں۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اس وقت مسندِ حکومت پر بیٹھی جبکہ اس وقت کے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل اے۔ ایم یحییٰ خان نے اقتدار منتقل کیا۔

صدر کا عہدہ قبول کرنے کے بعد جناب بھٹو نے ۲۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اعلان کیا کہ حکومت ملک میں جمہوریت بحال کرنے اور ملک کے لئے آئین وضع کرنے کی جانب تیزی سے قدم بڑھائے گی۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے سخت جدوجہد کی گئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے نیشنل عوامی پارٹی اور جمیعت العلماء اسلام کے ساتھ طویل مذاکرات کئے جن کے نتیجے میں ۶ مارچ ۱۹۷۲ء کو ایک معاہدہ ہوا جس میں حسب ذیل اہم امور شامل تھے۔

(۱) مارشل لاء ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کو اٹھا لیا جائے گا۔

(۲) قومی اسمبلی کا ایک تین روزہ اجلاس ۱۴ اپریل کو منعقد کیا جائے گا اور پھر ۱۴ اگست کو دوبارہ قومی اسمبلی کا اجلاس ہوگا۔

(۳) صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس ۲۱ اپریل کو منعقد کئے جائیں گے۔

(۴) عبوری آئین گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء بشمول انڈین انڈیپنڈینس ایکٹ ۱۹۴۷ء اور اس کی ضروری ترمیم کی بنیادوں پر بنایا جائے گا۔

(۵) نیشنل اسمبلی کی ایک کمیٹی قومی آئین کا مسودہ تیار کرے گی اور یکم اگست تک اپنی رپورٹ کو آخری شکل دے دے گی۔

۲۔ قومی اسمبلی کا اجلاس ۱۴ اپریل ۱۹۷۲ء کو اسلام آباد میں طلب کیا گیا۔ اپنے تین روزہ اجلاس کے دوران قومی اسمبلی نے حسب ذیل کام کئے۔

(الف) صدر پر اعتماد کا ووٹ پاس کیا گیا۔

(ب) مارشل لاء کا ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء تک جاری رہنا طے پایا۔

(ج) عبوری آئین منظور کیا گیا، نیز

(د) قومی اسمبلی کی ایک کمیٹی پاکستان کے لئے آئین کا مسودہ تیار کرنے کے لئے مقرر کی گئی جسے اپنا کام یکم اگست ۱۹۷۲ء تک مکمل کر لینا تھا۔

مستقل آئین کا نفاذ

۳۔ قومی اسمبلی کی مقرر کردہ آئین کی کمیٹی کی پہلی میٹنگ ۲۲ اپریل ۱۹۷۲ء کو منعقد ہوئی اور اس کے بعد کمیٹی کے اجلاس ۱۰ مئی ۱۹۷۲ء تا ۱۸ مئی ۱۹۷۲ء اور ۲۹ مئی ۱۹۷۲ء تا ۳ جون ۱۹۷۲ء تک منعقد ہوئے۔ آئینی امور پر پارلیمانی جماعتوں اور گروپوں کے لیڈروں

کے ساتھ صدر کی بات چیت کے پیش نظر کمیٹی کو اپنے اجلاس گفت و شنید کا نتیجہ نکلنے تک روکنے پڑے۔

قومی اسمبلی نے ۱۶ اگست ۱۹۷۲ء کو منعقد ہونے والے اپنے اجلاس میں مسودۂ آئین پیش کرنے کی تاریخ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء تک بڑھا دی۔ پارلیمانی پارٹیوں کے لیڈروں اور مختلف گروپوں سے ۱۷ تا ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء تک گفت و شنید ہوتی رہی اور آخر بنیادی نوعیت کے تمام آئینی مسائل متفقہ طور پر حل کر لئے گئے۔ مختلف جماعتوں کے ساتھ آئین پر سمجھوتے پر ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو دستخط ہوئے اور اس بات نے آئینی کمیٹی کے کام میں بڑی سہولت پیدا کر دی اور اس نے اس سمجھوتے کی شقوں کو مسودۂ آئین میں ہم رشتہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ کمیٹی نے آئین کا مسودہ آئینی سمجھوتے کی روشنی میں تیار کرنے کا کام وزارتِ قانون اور پارلیمانی امور اور قومی اسمبلی کے سیکرٹریٹ کو تفویض کر دیا۔ اس اقدام کے بعد آئینی کمیٹی نے اپنے اجلاس ۲ دسمبر سے شروع کر دیئے اور یہ اجلاس ۱۲ دسمبر ۱۹۷۲ء تک آئینی مسودے اور اس میں مجوزہ ترامیم پر غور و خوض کے لئے منعقد ہوتے رہے۔

۴۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو آئینی کمیٹی کے چیئرمین نے آئینی کمیٹی کی رپورٹ مع مسودہ آئین ایک بل کی صورت میں پیش کیا۔ ۲ فروری ۱۹۷۳ء کو آئینی بل باقاعدہ طور پر قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ آئینی بل پر بات چیت ۱۷ فروری ۱۹۷۳ء سے شروع ہوئی اور ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء تک جس دن بل بغیر کسی اختلافی ووٹ کے پاس کیا گیا جاری رہی۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین ۱۴ اپریل ۱۹۷۳ء کو منظور کر لیا گیا تھا لیکن اس کی بنیادی دفعات ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء سے نافذِ عمل ہوئیں۔

۵۔ آئین میں کہا گیا ہے کہ وفاقی جمہوریہ، اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے نام سے موسوم ہوگی۔ آئین نے پہلی بار اسلام کو مملکت کا مذہب قرار دیا لیکن ساتھ ہی اس نے تمام مذہبی اقلیتوں کے حقوق کو تحفظ فراہم کیا۔ آئین میں ایک وفاقی پارلیمانی طرز کی حکومت جس میں ایک دو ایوانی پارلیمنٹ ایک قومی اسمبلی اور دوسری سینیٹ ہوں قائم کرنے کو کہا گیا ہے۔ آئین بنیادی حقوق کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور ان کا قانونی جواز عطا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ آئین صوبوں کو قومی اتحاد اور سالمیت برقرار رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ حد تک خود مختاری فراہم کرتا ہے۔

معاہدۂ شملہ کی توثیق

۶۔ ۱۰ جولائی ۱۹۷۲ء کو قومی اسمبلی کا خاص اجلاس صدر نے طلب کیا تاکہ پاکستان کے صدر اور ہندوستان کی وزیرِ اعظم کے مابین طے پانے والے معاہدے پر غور و خوض کیا جائے۔ قومی اسمبلی نے ۱۰ جولائی ۱۹۷۲ء تا ۱۵ جولائی ۱۹۷۲ء تک طویل بحث و مباحثہ کے بعد معاہدۂ شملہ کی متفقہ طور پر منظوری دے دی۔

وزیرِ اعظم کا انتخاب

۷۔ آئین کی دفعہ (۲) ۹۱ کے تحت قومی اسمبلی کا ۱۲ اگست ۱۹۷۳ء کو اجلاس ہوا اور اس نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کو پاکستان کا وزیرِ اعظم منتخب کر لیا۔

احمدی غیر مسلم قرار دیئے گئے

۸۔ احمدی فرقہ جس کے بانی آنجہانی مرزا غلام محمد تھے خود کو مسلمان کہتے تھے جبکہ مسلمانوں کے تمام طبقے اس فرقے کو غیر مسلم سمجھتے تھے اور یہ جھگڑا گذشتہ ۹۸ برس سے چل رہا تھا اس دوران میں بہت سے خونی فسادات بھی ہوئے یہ مسئلہ پاکستان کے لوگوں کو مدت سے پریشان کئے ہوئے تھا اس لئے حکومت نے اسے قومی اسمبلی کے سامنے پیش کیا۔ پورے ایوان کی کمیٹی نے حسبِ ذیل

ریزولوشن پاس کیا اور اسے ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو قومی اسمبلی کے سامنے رکھا۔

ریزولوشن

"پوری قومی اسمبلی کی اسپیشل کمیٹی متفقہ طور پر اس فیصلے پر پہنچی ہے کہ درج ذیل سفارشات قومی اسمبلی کو غور و خوض اور منظوری کیلئے بھیجی جائیں۔"

پوری قومی اسمبلی کی اسپیشل کمیٹی جس کی مدد اسٹیرنگ کمیٹی اور سب کمیٹی کر رہی ہے، نے ان قراردادوں کو جو اس کے سامنے ہیں نیز ان دستاویزوں اور گواہوں کو جن میں صدر انجمن احمدیہ ربوہ اور انجمن احمدیہ اشاعتِ اسلام لاہور شامل ہیں، کو دیکھنے اور سننے کے بعد متفقہ طور پر قومی اسمبلی کو حسب ذیل سفارشات کرتی ہے۔

(الف) یہ کہ پاکستان کے آئین میں حسب ذیل ترمیم کی جائے۔

۱۔ یہ کہ آئین کی دفعہ (۳) ۱۰۶ میں ایک حوالہ قادیانی گروپ اور لاہوری (جو خود کو احمدی کہتے ہیں) کے متعلق شامل کیا جائے۔

(۲) ایک غیر مسلم کی تعریف دفعہ ۲۶۰ کی ایک نئی شق سے کی جائے

(ب) اور یہ کہ پاکستان پینل کوڈ کے سیکشن ۲۹۵۔ الف میں حسب ذیل وضاحت شامل کی جائے۔

"وضاحت" ایک مسلمان جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے نظریئے کے منافی عقائد رکھتا ہو، ان کی اشاعت اور ان پر عمل کرنا ہو جیسا کہ آئین کی دفعہ ۲۶۰ کی شق (۳) کے تحت قابل سزا ہے۔

(ج) نیز یہ کہ پاکستان کے تمام شہریوں کی جان و مال، آزادی، جائداد، عزت اور بنیادی حقوق کا بلا امتیاز اس کے کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں تحفظ کیا جائے گا۔

۹۔ اس ریزولوشن کو قومی اسمبلی نے اسی دن اپنے اجلاس میں منظور کیا۔ اس کے بموجب آئین میں ترمیم کا بل قومی اسمبلی اور سینیٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس بل کو دونوں ایوانوں نے متفقہ طور پر پاس کیا اور اس کی توثیق ۱۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو صدر پاکستان نے کی اور اب اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں ترمیم ہو چکی ہے اور متعلقہ قواعد و ضوابط میں ضروری ترمیمیں کی جا رہی ہیں۔

۱۰۔ ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۵ء کے دوران (جولائی ۱۹۷۵ء تک) قومی اسمبلی کے ۱۴ اجلاس ہو چکے ہیں اور قومی اسمبلی نے ۱۰۱ بل علاوہ جنرل بجٹ اور ریلوے بجٹ کے پاس کئے ہیں۔

پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس

۱۱۔ ۱۰ راگست ۱۹۷۳ء کو پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں جناب فضل الٰہی چوہدری کو آئین کی دفعہ (۳) ۴۱ کے تحت پاکستان کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس پھر ۲۶ راگست ۱۹۷۴ء کو ہنگامی صورت حال کا وقفہ ۶ ماہ تک اور بڑھانے کے لئے ہوا۔ اور ۵ ستمبر ۱۹۷۴ء کو پارلیمنٹ کے مشترک اجلاس سے سری لنکا کی وزیر اعظم محترمہ شری ماوو بندرا نائیکے نے خطاب کیا استقبالیہ خطبے قومی اسمبلی کے اسپیکر جناب فاروق علی اور قائد ایوان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پڑھے۔ محترمہ مسز بندرا نائیکے کو خوش آمدید کہتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ پاکستان اور سری لنکا دونوں نے جمہوریت کو اپنے طرز زندگی کے طور پر منتخب کر لیا ہے۔ اور وہ قانون کی حکمرانی اور بین الاقوامی امن اور چھوٹے ملکوں کے ہر خوف سے آزاد زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ سری لنکا کی وزیر اعظم نے اپنی حکومت کی پالیسیوں اور دوست ایشیائی ملکوں سے اچھے پڑوسیوں کے سے تعلقات قائم کرنے کی روش کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کا پاکستان میں جس گرمجوشی

سے استقبال کیا گیا وہ یادرہے گا۔
پارلیمنٹ کا مشترک اجلاس پھر ۸ ارجنوری تا ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء
ہوا اور اس میں تین بل پاس کئے گئے۔

پاکستان کی سینیٹ

۱۲- پاکستان کے مستقل آئین میں ایک دو ایوانی مقننہ کی ہدایت ہے اس لئے پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل ہے ایک ایوان قومی اسمبلی کہلاتا ہے اور دوسرا سینیٹ۔ آئین کی دفعہ ۲۷۲ کی روسے پہلی سینیٹ کے ۴۵ ممبر ہوں گے جن میں سے (۱) ۱۰ ہر صوبے کی اسمبلی منتخب کرے گی۔ (۲) تین ممبر وفاقی حکومت کے زیر انتظام قبائلی علاقوں کے ممبران قومی اسمبلی منتخب کریں گے۔ (۳) ۲ ممبر وفاقی دارالحکومت کے ہوں گے جنہیں ممبران قومی اسمبلی منتخب کریں گے۔

ان ممبروں نے ۶ اگست ۱۹۷۳ء کو سینیٹ کے پہلے اجلاس میں اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ آئین کی دفعہ ۵۹ (۳) کی روسے سینیٹ توڑی نہیں جا سکتی لیکن اس کے ممبران کی مدت ممبری چار برس ہے۔ جن میں سے آدھی تعداد ہر دو سال بعد ریٹائر ہو جائے گی۔

آئین کی دفعہ ۲۷۲ کی روسے پہلی سینیٹ کے ممبران قرعہ اندازی کے تحت دو گروپوں میں منقسم کر دیئے جائیں گے۔ پہلی سینیٹ کا پہلا گروپ جو ہر صوبے سے پانچ ممبروں اور وفاقی حکومت کے زیر انتظام قبائلی علاقوں کے ۲ ممبر اور ایک ممبر وفاقی دارالحکومت کا ۶ اگست ۱۹۷۵ء کو اپنی دو سالہ مدت پوری ہونے پر ریٹائر ہوں گے۔ پہلے گروپ کے ممبروں کے ریٹائر ہونے کے بعد ان کی نشستوں کا انتخاب جولائی ۱۹۷۵ء میں ہوا اور نئے منتخب ہونے والے ممبروں نے ۶ اگست ۱۹۷۵ء کو اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا۔ جناب حبیب اللہ خان اور طاہر محمد خان کو علی الترتیب سینیٹ کا چیئرمین اور نائب چیئرمین منتخب کر لیا گیا۔

۱۳- اب تک سینیٹ کے ۱۱ اجلاس ہو چکے ہیں اور ان اجلاسوں میں سینیٹ نے ۱۲۱ بل پاس کئے یہ بل یا تو قومی اسمبلی نے بھیجے تھے یا سینیٹ نے خود وضع کئے تھے۔

پاکستان اور افروایشیا

اختر عادل رضوی

سیاسی آزادی، معاشی بہتری اور انسانی وقار و عزت کیلئے تیسری دنیا کی جدوجہد سے پاکستان جسطرح کامل طور پر ہم آہنگی رکھتا ہے اور اسے اپنی جدوجہد سمجھتا ہے، وہی اصول اسکی بنیادی خارجہ پالیسیوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے سے پہلے بھی برصغیر کی مسلم قیادت اپنی سیاسی آزادی کی جدوجہد کو ایک وسیع نقطۂ نظر سے دیکھتی تھی۔ اس جدوجہد کو شہنشاہیت اور نوآبادیاتی راج کے خلاف وسیع تر تحریک کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانانِ ہند نے اس وقت بھی جبکہ وہ اپنے سنگین سیاسی مسائل میں الجھے ہوئے تھے، وسیع النظری اور دوسری ترقی پذیر قوموں سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ پاکستان کے قیام کو بھی ایک عظیم تر عالمی مقصد کی طرف پہلا قدم قرار دیا گیا تھا۔

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے ہمیشہ غلامی اور استحصال سے آزادی کے لئے عربوں کی جدوجہد کی حمایت کی ہے جب انگریزوں نے زیادہ سے زیادہ یہودیوں کو باہر سے بلا کر فلسطین میں آباد کرنے کی سازش کی تو عربوں کی طرف سے اس کی مخالفت کی گئی۔ اس معاملہ میں آل انڈیا مسلم لیگ نے جس کے رہنما قائداعظم تھے، عربوں کی بھرپور حمایت کی۔ ۲۶ جولائی ۱۹۴۱ء کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک باقاعدہ قرارداد میں فلسطین کی تقسیم کی صیہونیت پسند تحریک پر گہری تشویش ظاہر کی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے جو اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے اسے ایک سفاکانہ تجویز قرار دیا جس کا مقصد عربوں کو خود اُن کے وطن سے محروم کرنا تھا۔

مسلم لیگ نے جس کے سربراہ قائداعظم تھے عرب لیگ، فلسطینی عربوں کی اعلیٰ کمیٹی اور اس کے سربراہ مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی کو یقین دلایا کہ مسلمان پوری طرح ان کے ساتھ ہیں اور ارض مقدس کو آزادی دلانے میں ان کی پوری حمایت کریں گے۔

اقوام متحدہ میں پاکستان کا موقف

۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ میں فلسطین کے بارے میں بحث کے دوران پاکستانی وفد نے اعلان کیا کہ پاکستان فلسطین کی تقسیم کا شدت سے مخالف ہے اور وہ اس معاملہ میں اپنے موقف میں ذرا سی بھی تبدیلی کرنے کو تیار نہیں ہے۔ پاکستان نے اسرائیل کے قیام کے خلاف ووٹ دیا۔ پاکستانی مندوب نے صیہونی مملکت کے قیام کو ایک ایسا خنجر قرار دیا جو دنیائے عرب کے سینہ میں گھونپ دیا گیا ہے۔ پاکستان نے آج تک اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا۔ اس بارے میں وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کئی بار وضاحت کی ہے کہ اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں انسانوں کی حیثیت سے یہودیوں سے دشمنی ہے بلکہ اس کی وجہ

یہ ہے کہ اسرائیل ایک نو آبادیاتی مملکت ہے جو بین الاقوامی سازش کے تحت عربوں پر مسلط کر دی گئی ہے۔ اس کے قیام کی وجہ سے عربوں کی بڑی تعداد کو بے گھر ہونا پڑا ہے اور انہیں ان کے بنیادی انسانی اور سیاسی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے، یہ ایک بہت بڑا انسانی المیہ ہے۔

عربوں کے ساتھ کامل ہم آہنگی

عربوں کے ساتھ پاکستان کا اتحاد غیر مشروط اور بھرپور ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک جبکہ اقوام متحدہ میں لیبیا، صومالیہ، تیونس، مراکش اور الجزائر کی آزادی کے مسئلے زیر بحث تھے، اقوام متحدہ میں بحث کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان نے اس بات کی پروا کئے بغیر کون سی بڑی طاقت اس سے ناراض ہو جائے گی ان تمام ملکوں کی آزادی کی کھل کر حمایت کی۔ ۱۹۵۳ـ۵۴ء میں پاکستان نے سوئز کے علاقہ سے برطانوی فوجوں کے انخلا کے سوال پر اور پھر ۱۹۵۶ء میں نہر سوئز کو قومی ملکیت میں لینے کے سوال پر مصر کی حمایت کی۔ ۱۹۶۱ء میں پاکستان نے الجزائر کی قومی تحریک آزادی کی قائم کی ہوئی عبوری حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اس موقع پر پاکستان نے اس بات کی مطلق پروا نہیں کی کہ فرانس جو سلامتی کونسل کا ممبر ہے اس سے ناراض ہو جائے گا اور جموں و کشمیر کے معاملے میں اقوام متحدہ میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔

جب سے ۱۹۷۱ء میں عوامی حکومت نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں اقتدار سنبھالا ہے تیسری دنیا کے ساتھ پاکستان کی دوستی اور یگانگت اور بڑھ گئی ہے ان ملکوں کے ساتھ پاکستان کے روایتی رشتے شروع ہی سے قائم ہیں کیونکہ وہ تاریخ کے ایک ہی دور سے گزر رہے ہیں اور ان کے مفادات میں بھی یکسانیت ہے۔

تیسری دنیا کی حمایت

محکومی اور استحصال کے طویل دور کے بعد اب تیسری دنیا اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو رہی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد انسانی معاشروں میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ تیسری دنیا کے دوسرے متقدر رہنماؤں کی طرح جناب ذوالفقار علی بھٹو نے واضح طور پر یہ بات محسوس کی ہے کہ عالمی معیشت اور عالمی سیاست افراتفری کا شکار ہیں۔ ایسی صورت میں ترقی پذیر اور نئے آزاد ملکوں کو چاہیئے کہ وہ بین الاقوامی تعلقات کی غیر یقینی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں۔ دنیا کے غریب ملکوں کو اتحاد اور تعاون کے ذریعہ حوصلہ کے ساتھ سیاسی اور معاشی استحکام اور ایسے عالمی معاشی نظام کی طرف پیشقدمی کرنی چاہیئے جس میں ہر ایک کو ترقی کے فوائد حاصل ہوں اور ایک دوسرے کے انفرادی مقاصد پورے ہو سکیں۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۶۵ء میں جب وہ وزیر خارجہ تھے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "جب تک افریقہ کے باقی ملکوں انگولا، موزمبیق، جنوب مغربی افریقہ (نمیبیا) رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ سے نو آبادیاتی نظام ختم نہیں ہوتا اور ان علاقے کے لوگوں کو اپنا مستقبل آپ طے کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا افریقہ میں امن قائم نہیں ہوگا۔ موجودہ حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے بھی جناب ذوالفقار علی بھٹو نے نو آبادیاتی نظام، نسل پرستی اور نسلی امتیاز کے خلاف افریقی عوام کی جدوجہد کی سرگرمی کے ساتھ حمایت کی ہے۔ یہ حمایت ایک طرف اقوام متحدہ اور اس کے اداروں اور دوسرے بین الاقوامی اداروں میں سفارتی سطح پر اور دوسری طرف مادی امداد دے کر کی گئی ہے۔

پاکستان افریقہ کے دوسرے علاقوں میں آزادی کی زوردار تحریکوں کو قوت پہنچانے کے علاوہ افریقہ میں پرتگال کی نو آبادیاتی شہنشاہیت کے خاتمہ کو گہری دلچسپی سے دیکھتا رہا ہے۔ اس شہنشاہیت کے خاتمہ سے افریقہ کے وسیع علاقے مزید خون خرابے اور اخلاقی انحطاط سے بچ گئے۔ پاکستان نے رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ میں سفید فام آبادکاروں کی اقلیتی حکومتوں کی ہمیشہ مذمت کی ہے۔ اقوام متحدہ نے آزادی کی حمایت میں جو بھی قدم اٹھایا ہے پاکستان نے اس کی ہمیشہ حمایت کی ہے پاکستان نے رہوڈیشیا کے لوگوں کو حق خود ارادیت دلانے کے لئے اقوام متحدہ کے منشور کے تحت ہر اقدام کی حمایت کی ہے اسمیں طاقت کا استعمال بھی شامل ہے۔

وزیراعظم پاکستان سعودی عرب کے
اعلیٰحضرت شاہ خالد سے گفتگو فرما رہے ہیں

مصر کے صدر سادات صدر پاکستان سے بغل گیر ہو رہے ہیں

وزیراعظم شام کے صدر حافظ الاسد کے ساتھ

اعلیحضرت شہنشاہ ایران وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ

لیبیا کے صدر جناب قذافی وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ

سوڈان کے صدر وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ

صدرِ مملکت ملائیشیا کے بادشاہ سے مصافحہ کر رہے ہیں

متحدہ عرب امارات کے صدر الشیخ زید بن سلطان النہیان وزیراعظم پاکستان سے مصافحہ کر رہے ہیں

وزیر اعظم امیر کویت کے ہمراہ

سری لنکا کی وزیر اعظم محترمہ سریماوو بندرا نائکے
وزیر اعظم پاکستان اور بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ

پاکستان افریقی عوام کی سیاسی امنگوں کا بھرپور حامی ہے اس لئے اس نے جنوبی افریقہ سے کسی نوعیت کے سیاسی یا تجارتی تعلقات قائم نہیں کئے جنوبی افریقہ کے ہوائی جہازوں کو پاکستان میں اترنے یا پاکستانی علاقے پر پرواز کرنے اور جنوبی افریقہ کے بحری جہازوں کو پاکستانی بندرگاہوں میں داخلے کی اجازت نہیں ہے یہ تدابیر افریقی عوام کی تحریک آزادی کی حمایت کے لئے اختیار کی گئی ہیں ۔

اسی طرح پاکستان جنوبی افریقہ کے چنگل سے نجات پانے کے لئے نمیبیا کے عوام کی تحریک آزادی کی بھرپور حمایت کر رہا ہے پاکستان نمیبیا کے لئے اقوام متحدہ کی کونسل کا ممبر ہے جس کے کل ۱۸ ممبر ہیں۔ نمیبیا کے لئے اقوام متحدہ کا پہلا ہائی کمشنر ایک پاکستانی تھا۔ پاکستان نمیبیا کے لئے اقوام متحدہ کے فنڈ میں بھی باقاعدگی کے ساتھ چندہ دیتا ہے تاکہ وہاں کے باشندوں کی تحریک کو تقویت پہنچے اور وہاں کے باشندوں کے لئے وطن سے باہر تعلیم کا بندوبست ہو سکے۔ گنی بساؤ کی آزادی کا اعلان ہونے کے بعد ایک ماہ کے اندر پاکستان نے اسے تسلیم کر لیا اور موزمبیق کو آزادی ملنے کے بعد چند گھنٹوں کے اندر اندر اُسے تسلیم کر لیا گیا۔

تیسری دنیا کے ساتھ تعاون

تیسری دنیا کے ملکوں کے ساتھ دوستی اور باہمی تعاون پاکستان کی مملکت کی پالیسی کے اُن اصولوں میں شامل ہے جو آئین میں درج ہیں۔ آئین کی دفعہ ۴۰ کے تحت مملکت پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کے مفادات کی حمایت کرے اور بین الاقوامی امن اور تحفظ کی حوصلہ افزائی کرے۔ اس پالیسی کے تحت پاکستان نے تیسری دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ بامقصد تعاون بڑھایا اور ان کے ساتھ خاص تعلقات پیدا کئے کیونکہ پاکستان بھی تیسری دنیا کا ایک حصہ ہے۔

وزیر اعظم نے یوم پاکستان کے موقع پر اپنے پیغام میں کہا تھا "ہم پاکستان کو استحصال سے پاک کرنے اور جو ہمسایہ ممالک اس کے خیرخواہ ہیں ان کے ساتھ امن و امان سے رہنے کی طویل جدوجہد جاری رکھیں گے طاقتور پاکستان دنیائے اسلام کے لئے استحکام کا ذریعہ اور افریقی ایشیائی برادری کے لئے بڑی نعمت ثابت ہوگا"۔

۱۹۷۱ء میں ایک نیا پاکستان جو اپنی ہیئت اور اپنی امنگوں کے معاملہ میں بالکل نیا تھا منظر عام پر آیا اور صحیح معنی میں عوام کی نمائندہ حکومت نے اقتدار سنبھال لیا۔ ۱۹۷۲ء کے اوائل میں پاکستان نے شمالی ویت نام، شمالی کوریا اور مشرقی جرمنی کو سفارتی طور پر تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد کمبوڈیا کی شاہی حکومت کو جس کے سربراہ شہزادہ سیہانوک تھے اور جو پیکنگ میں کام کر رہی تھی تسلیم کر لیا گیا۔

پاکستان برطانوی دولت مشترکہ سے الگ ہو گیا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ پاکستان فرسودہ نظام کی بجائے عالمی مسائل میں بدلتے ہوئے حالات پر نظر رکھنے کا حامی ہے۔

تیسری دنیا کے ملکوں نے بھی مختلف طریقوں سے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ پاکستان کے اصولی موقف کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں جب پاکستان کو بیرونی جارحیت کا نشانہ بنایا گیا تو ان ملکوں نے پاکستان کی اخلاقی حمایت کا بھرپور اظہار کیا۔ تیسری دنیا کے دوست ملکوں نے ان پاکستانی فوجیوں اور شہریوں کو جو تمام بین الاقوامی قوانین اور اخلاقی اصولوں کے برخلاف ایک سال سے زیادہ عرصے ہندوستان میں نظر بند تھے رہائی دلانے کے لئے بڑا مفید کردار ادا کیا۔

۱۹۷۴ء میں اقوام متحدہ میں تیسری دنیا کی طرف سے پاکستان کی بھرپور حمایت کا واضح اظہار اس وقت ہوا جب جنرل اسمبلی نے پاکستان کی پیش کی ہوئی وہ قرارداد بھاری اکثریت سے منظور کر لی جس میں کہا گیا تھا کہ جنوبی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دیا جائے تاکہ اس علاقے کے ممالک ایٹمی حملے یا ایٹمی بلیک میل سے بے خوف ہو کر اپنے وسائل قومی تعمیر کے لئے کام میں لانے پر توجہ دے سکیں۔ پاکستان پچھلے دنوں ایشیائی نشست پر سلامتی کونسل کا ممبر منتخب ہوا ہے۔ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ اقوام متحدہ میں جہاں افریقی ایشیائی ملکوں کی بھاری اکثریت ہے پاکستان کی بڑی عزت ہے جیسا کہ پاکستان کے وزارت خارجہ کے سیکرٹری مسٹر آغا شاہی نے کہا تھا "پاکستان کی کامیابی اس بات کا ایک اور ثبوت ہے

کہ وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کی عزت اور احترام کو بڑی بلندی تک پہنچا دیا ہے"۔

وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ جہاں ایک طرف انہوں نے عوامی حکومت کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے عوام کی امنگوں کے مطابق قومی زندگی کی مضبوط بنیادوں پر تعمیر نو کی ہے اور جمہوری حکومت کی بنیادیں مستحکم کی ہیں، وہاں دوسری طرف انہوں نے نہ صرف بین الاقوامی معاملات میں ملک کی کھوئی ہوئی عزت بحال کی ہے بلکہ ایک ایسے مستقبل کے حصول کے لئے جو استحصال نسل پرستی اور فوجی استعمار سے پاک ہو تیسری دنیا کی مشترکہ جدوجہد میں بھرپور شرکت کی ہے اور اس شرکت میں جان ڈال دی ہے۔

ستمبر ۱۹۷۵ء میں موزمبیق کے شہر لارنکو مارکوئیس میں افریقی ایشیائی عوام کے اتحاد کی تنظیم کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس کے نام پیغام میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کہا تھا:۔

"افریقی ایشیائی عوام ماضی کے اس نظام کو مسترد کر چکے ہیں جو انصاف پر مبنی نہیں تھا۔ وہ اب تسلط کے نئے طریقوں اور انداز کو تسلیم نہیں کر سکتے اب ان کے تحفظ اور آزادی کو بڑی طاقتوں کی بڑھتی ہوئی رقابت جو دان کے غیر تصفیہ شدہ باہمی جھگڑوں، اسلحہ سازی کی دوڑ اور ایٹمی ہتھیاروں سے خطرہ لاحق ہے۔

بحر ہند میں امن کا علاقہ قائم ہو جانے سے بیشتر افریقی ایشیائی ملکوں کو علاقہ کے اندر اور باہر سے ایٹمی خطرے سے بڑی حد تک نجات مل جائے گی"۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ کانفرنس ایسے نازک وقت میں ہو رہی ہے۔ جبکہ ہمارے عوام ترقی خوشحالی اور اپنی تقدیر کے مالک بننے کی جدوجہد میں فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچ گئے ہیں۔ اس بڑی عالمی برادری کے ممبر کی حیثیت سے جو برسوں تک استحصال کا شکار ہونے کے بعد اب اپنے حقوق حاصل کر رہی ہے، پاکستان اپنا کردار سرگرمی سے ادا کر رہا ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے چھٹے اور ساتویں خاص اجلاسوں میں جن میں ترقی کے مسائل اور ایک نیا بین الاقوامی معاشی نظام زیر بحث آیا تھا پاکستان نے ایک مضبوط موقف اختیار کیا جو اصولوں پر مبنی تھا۔ پاکستان نے ایک طرف تو یہ بات واضح کی کہ تمام ملکوں کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ خود مختار ہوں اور انہیں اپنے قدرتی وسائل پر اختیار حاصل ہو۔ دوسری طرف اس بات کی حمایت کی کہ باہمی تصادم کی بجائے گفت و شنید کے ذریعہ اس معاشی بحران کو دور کیا جائے جو مختلف براعظموں کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے"۔

پاکستان میں ترقیاتی منصوبہ بندی

جناب رانا محمد حنیف

وزیر خزانہ منصوبہ بندی و ترقیات

پاکستان میں معاشی ترقی کی منصوبہ بندی پچھلے بیس سال سے ہوتی رہی ہے۔ اس شعبہ میں کامیابی کی رفتار کبھی تیز کبھی سست رہی ہے۔ پہلے ترقیاتی منصوبے کو (۱۹۵۵-۶۰ء) کافی سیاسی حمایت حاصل نہیں ہو سکی۔ پھر بھی اس سے ملک میں ترقیاتی سرگرمیوں کے مرحلہ کی ابتدا کرنے میں مدد ملی۔ دوسرا ترقیاتی منصوبہ (۱۹۶۰-۶۵ء) ترقی کے روایتی اعداد و شمار کی روشنی میں بظاہر بڑا کامیاب رہا۔ لیکن اس سے بہت سے مسائل بھی پیدا ہو گئے جن کا قوم کو ابھی تک سامنا ہے۔ تیسرا منصوبہ (۱۹۶۵-۷۰ء) غیر ملکی امداد رک جانے اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوا۔ چوتھا منصوبہ (۱۹۷۰-۷۵ء) ایک ایسی حکومت نے تیار کیا تھا جس نے برملا اعتراف کیا تھا کہ اس نے محض اس وقت تک کے لئے عارضی طور پر اقتدار سنبھالا ہے جب تک عوام کے منتخب کئے ہوئے نمائندوں کو اختیار منتقل نہیں کیا جاتا۔ ۱۹۷۱ء کے بعد پاکستان کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا ان کی وجہ سے چوتھا منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ یہ منصوبہ بالکل جداگانہ تاریخی اور جغرافیائی حالات میں تیار کیا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی۔

مجموعی طور پر معاشی منصوبہ بندی کا نمایاں اثر ہوا ہے لیکن ۱۹۷۱ء تک ترقیاتی سرگرمیوں کے لئے جو لائحۂ عمل اختیار کیا گیا اس کا بنیادی مقصد مجموعی قومی پیداوار، برآمدات، بچت اور سرمایہ کاری بڑھانا تھا۔ منصوبہ بندی کی یہ شکل عوام کی ضرورتوں اور امنگوں کے مطابق نہیں تھی۔ خاص طور پر اس سے ترقی کے فوائد کی منصفانہ تقسیم کا تقاضا پورا نہیں ہوتا تھا۔ معاشرتی شعبوں میں سرمایہ کاری کے دُور رس اثرات اور عوام کے حالاتِ زندگی بہتر بنانے پر پوری توجہ نہیں دی گئی تھی۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں جب عوامی حکومت نے اقتدار سنبھالا اس وقت ملک کو بہت بڑے معاشی بحران کا سامنا تھا۔ اس بحران کی بنیاد یہ تھی کہ عوام اس معاشی نظام سے مطمئن نہیں تھے جس کے نتیجہ میں ایک طرف ان کے حالات خراب ہو رہے تھے اور دوسری طرف دولت مندوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ ابھر رہا تھا۔ ترقی کے میدان میں علاقائی اور معاشرتی توازن برقرار رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی جس سے مزید کشیدگی کا ماحول پیدا ہو گیا۔ اس کشیدگی نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ روایتی ترقی بھی ممکن نہیں رہی۔ سرمایہ کاری اتنی کم ہو گئی کہ پرانی مشینوں کی جگہ نئی مشینیں لگانے کے بعد برائے نام ہی رقم باقی بچی۔ بجلی اور ٹرانسپورٹ جیسے اہم شعبوں میں رکاوٹوں اور کارخانہ داروں اور مزدوروں کے تعلقات میں کشیدگی کی وجہ سے

نہ صرف پہلے حاصل کی ہوئی کامیابیوں کا اثر زائل ہو گیا بلکہ انحطاط کا خطرناک رجحان شروع ہو گیا۔ اس کا انسداد نہ کیا جاتا تو لمبی مدت کی معیشت بری طرح متاثر ہوتی۔ اس تیزی اور شدید بحران پر قابو پانے کے لئے حکومت نے سالانہ ترقیاتی پروگراموں کا سلسلہ شروع کیا تاکہ ایسی پالیسیاں اختیار کی جائیں جن سے فوری نتائج حاصل کئے جاسکیں۔ پانچ پانچ سال کے لئے ترقیاتی منصوبہ بندی مفید ثابت نہ ہوتی لیکن اس سے پہلے کہ سالانہ ترقیاتی پروگراموں کا سلسلہ شروع کیا جاتا معیشت کی بنیادی حیثیت بدلنے کے لئے بہت سی معاشی اصلاحات کی گئیں۔ معاشی بحالی سے پہلے معاشی اصلاحات ضروری تھیں، اصلاحات کا پہلا دور جنوری سے مئی ۱۹۷۲ء تک چھ مہینے سے بھی کم مدت میں مکمل کر لیا گیا۔

معیشت کے ڈھانچہ میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کے لئے زراعت، صنعتی تعلقات، صنعت، صحت اور تعلیم کے شعبوں میں اصلاحات کی گئیں۔ حکومت نے بہت سی معاشی سرگرمیوں کا انتظام براہِ راست خود سنبھال لیا۔ صنعتی شعبے میں اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ ملک کی معاشی ترقی میں سرکاری شعبہ زیادہ حصہ لے سکے اور صنعتوں کی ملکیت کی بنیاد وسیع کی جائے۔ لیبر اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کو ان کے بنیادی حقوق، ملازمت کا تحفظ مینجمنٹ میں مناسب حصہ اور مالی فوائد حاصل ہوں۔ زرعی اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ کسانوں کے مفادات کا تحفظ ہو اور زراعت کو جدید بنایا جائے۔ ملک کے وسائل کو اس طرح کام میں لانے کے لئے کہ پہلے سے زیادہ معاشی ترقی ہو سکے اور معاشرتی انصاف بھی حاصل ہو سکے مالیات، بنکاری اور بیمہ کے شعبوں میں اصلاحات کی گئیں۔ صحت اور تعلیم جیسے معاشرتی شعبوں میں اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تعلیم اور علاج معالجے کی سہولتیں حاصل ہوں۔

عارضی آئین اور اگست ۱۹۷۳ء میں اتفاق رائے سے منظور کئے ہوئے مستقل آئین میں معاشی پالیسی اور منصوبہ بندی کے ذریعہ معاشرتی انصاف حاصل کرنے کے بنیادی اصول شامل کئے گئے۔ وہ اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ پسماندہ طبقوں اور علاقوں کے تعلیمی اور معاشرتی مفادات کو خاص توجہ سے تقویت پہنچائی جائے۔

ب۔ ناخواندگی کا خاتمہ اور کم سے کم مدت میں مفت اور لازمی طور پر ثانوی تعلیم کی سہولتوں کی فراہمی۔

ج۔ ملک کے وسائل کے اندر تمام شہریوں کو مناسب آرام اور تفریح کے ساتھ کام اور روزگار کی سہولتیں مہیا کرنا۔

د۔ ایسے تمام شہریوں کو جو ضعیفی، بیماری یا بے روزگاری کی وجہ سے مستقل یا عارضی طور پر روزی کمانے کے قابل نہ رہے ہوں بلا تفریق مرد و زن، ذات، نسل یا مذہب زندگی کی بنیادی ضرورتیں روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج معالجہ کی سہولتیں فراہم کرنا۔

ہ۔ ملک کے تمام افراد جن میں مختلف درجوں کے سرکاری ملازم بھی شامل ہیں کی آمدنیوں اور اجرتوں میں عدم مساوات ختم کرنا۔

و۔ مختلف علاقوں کے لوگوں کو تعلیم، تربیت، زرعی اور صنعتی ترقی اور دوسرے ذریعوں سے تمام قومی سرگرمیوں میں جن میں سرکاری ملازمتیں بھی شامل ہیں پوری طرح شریک ہونے کے مواقع فراہم کرنا۔

ترقیاتی منصوبہ بندی کے شعبے میں موجودہ حکومت نے بہت سی پالیسیاں اور پروگرام اختیار کئے ہیں جنہیں گو پانچ سالہ ترقیاتی منصوبوں کے دائرے میں واضح نہیں کیا گیا ہے لیکن ان کا نئے معاشی اور معاشرتی نظام سے گہرا تعلق ہے۔ سالانہ ترقیاتی منصوبے مرتب کرنے اور ان پر عمل درآمد کے سلسلے میں ان باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔

ا۔ معیارِ زندگی بلند کرنا۔

ب۔ عوامی اداروں کی خدمات کو بہتر بنانا

ج۔ آمدنی اور روزگار کی زیادہ سے زیادہ لوگوں میں بہتر

ارتھ سیٹیلائٹ اسٹیشن
دیہہ مندرو (سندھ)
کا انیٹنا

کیمیکل کمپلیکس کالا شاہ کاکو (پنجاب)

پنجاب کی ایک ٹیکسٹائل مل کا اندرونی منظر

کراچی کی بندرگاہ کو
جدید سے جدید تر بنا دیا گیا ہے

داؤد خیل میں کھاد کا کارخانہ

ملتان میں قدرتی گیس سے چلنے والا کھاد کا کارخانہ

ایک جدید پائپ فیکٹری

نیشنل موٹرز کراچی میں ایک ٹرک کے
پرزے جوڑے جا رہے ہیں

طریقے سے تقسیم۔

د۔ ملک کے پسماندہ علاقوں کی تیز رو ترقی اور ملک کے معاشی نظام سے ان کو مربوط کرنا۔

ہ۔ پیداواری شعبوں کو مضبوط بناکر اور درآمدات کے مقابلے میں برآمدات بڑھاکر خود کفالت کا حصول۔

یہ دور عالمی معیشت میں ایسی اہم تبدیلیوں کے لئے منفرد ہے جنکی وجہ سے ان ترقی پذیر ملکوں میں جہاں تیل پیدا نہیں ہوتا عظیم اقتصادی ہلچل پیدا ہوگئی۔ دنیا میں افراطِ زر میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد تیل پیدا کرنے والے ممالک تیل کی بہتر قیمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کے صنعتی ملکوں میں بڑے پیمانہ پر مندے کا دور شروع ہوگیا۔ ان حالات کی وجہ سے ترقی پذیر ملکوں کو بہت بڑا بوجھ برداشت کرنا پڑا۔ پاکستان پر اس عالمی معاشی بحران کا اثر ۱۹۷۳ء میں سیلاب اور ۱۹۷۴ء میں خشک سالی کی وجہ سے اور بھی بڑھ گیا۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ پاکستان کی معیشت کا بیشتر انحصار غیر ملکی تجارت پر ہے اس لئے بین الاقوامی حالات کا قومی معیشت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ پاکستان نے ۷۵-۱۹۷۴ء میں اندازاً ایک ارب ڈالر کی درآمدات کیں جو مجموعی ملکی پیداوار کے دس فیصد کے برابر ہے۔ جو سامان باہر سے برآمد کیا گیا وہ ملک میں پیدا ہونے والے خدمات اور مال کے بیس فیصد کے برابر تھا۔ اس طرح ایک تہائی مال پر براہِ راست اثر پڑتا ہے جبکہ اس سے کہیں زیادہ چیزیں بالواسطہ متاثر ہوتی ہیں۔ ان حالات میں پاکستان کی برآمدات اور ان سے حاصل ہونے والی آمدنی میں بڑی کمی آگئی۔ دوسری طرف گندم کیمیاوی کھاد کھانے کے تیل اور پیٹرول جیسی ضروری اشیاء کی مانگ کم نہیں کی جاسکتی تھی۔ پاکستان کو ان اشیاء کی کئی گنا زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی۔ درآمدات کی قیمتوں میں اضافہ اور برآمدات کی قیمتوں میں کمی سے ایک سال کے اندر نقصان کا اندازہ اسیّ نوّے کروڑ ڈالر ہے۔ اس طرح وسائل کم ہوگئے اور دوسری طرف سرمایہ کاری میں اضافہ کی ضرورت اور شدید ہوگئی۔ پوری معیشت میں قیمتوں کا اضافہ شدت سے محسوس ہونے لگا۔ حکومت کو ایک طرف تجارت کے غیر مفید حالات کی روک تھام اور دوسری طرف ملکی معیشت میں جمود توڑنے کے لئے مناسب اقدامات کرنے پڑے۔ ان اقدامات کی کامیابی ظاہر ہونے لگی ہے اور معیشت میں جان آنے لگی ہے۔ ظاہر ہے کہ ابھی تک عام آدمی کی زندگی پر اس کا کوئی واضح اثر نہیں پڑا۔ ابھی صرف ابتدا ہوئی ہے اور سمت کا تعین ہوا ہے۔

حکومت نے اس ارادہ سے کہ قیمتوں میں اضافے کے چکر سے عام آدمی کے اخراجات زندگی پر کم سے کم اثر پڑے ایک طرف تو بڑی مقدار میں اشیا درآمد کیں اور دوسری طرف گندم، بناسپتی گھی، شکر اور موٹے کپڑے کی قیمتوں کو مناسب سطح پر رکھنے کے لئے رعایتی قیمتیں مقرر کیں جو مالی اقدامات کئے گئے ان میں خسارے کی سرمایہ کاری کی مکمل روک تھام بھی شامل ہے۔ افراطِ زر کی روک تھام کے لئے بھی زوردار مالی پالیسی اختیار کی گئی۔ اس پالیسی کے تحت بنک اور بچت کی اسکیموں کی شرح میں اضافہ کیا گیا اور پرائیویٹ بچت کے لئے ترغیبات مہیا کی گئیں۔ تجارتی پالیسی کے تحت بھی افراطِ زر کی روک تھام کے لئے غذائی اشیا مثلاً گوشت، مرغی، سبزیوں دالوں وغیرہ کی برآمد یا تو بند کردی گئی یا برآمدی محصول بڑھا دیا گیا۔ زیادہ سے زیادہ غیر ملکی زرِ مبادلہ خرچ کرکے گندم اور بناسپتی درآمد کیا گیا تاکہ یہ اشیا برابر دستیاب ہوتی رہیں اس کے نتیجے میں حکومت کو بھاری رقوم رعائیتی قیمتوں کی مد میں صرف کرنی پڑیں اور تدریجی انداز میں قیمتوں میں کچھ اضافے بھی کرتے پڑے تاکہ توازن قائم ہو۔

ملک کو بڑے پیچیدہ بیرونی اور اندرونی مسائل کا سامنا رہا ہے۔ پھر بھی پچھلے سال میں سالانہ ترقیاتی منصوبوں کے واضح مقاصد متعین کئے گئے وہ مقاصد یہ ہیں:۔

(۱) موجودہ گنجائش کے بھرپور استعمال اور برآمدات میں اضافہ

کے ذریعہ سرمایہ کاری کی سطح بڑھا کر ترقیاتی سرگرمیوں میں اضافہ۔

ب۔ بجلی (پیداوار اور بہم رسانی) اور پانی کی فراہمی جیسے اہم شعبوں میں ترقی کی رفتار میں اضافہ اور زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے سیم اور تھور پر قابو پانے کے پروگرام پر عملدرآمد۔

ج۔ ذرائع آمدورفت اور مواصلات کے نظام کو بہتر بنانا خاص طور پر پسماندہ علاقوں میں ان شعبوں کو درپیش رکاوٹوں کو دور کرنا۔

د۔ تعمیرات عامہ اور مربوط دیہی ترقی کے پروگراموں اور بنیادی اور زرعی صنعتیں قائم کرکے مفید روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کرنا۔

ہ۔ اجرتوں، قیمتوں اور آمدنی میں مناسب توازن برقرار رکھنا اور مناسب قیمتوں پر ضروری اشیا کی فراہمی۔

و۔ تعلیم اور علاج معالجہ کی سہولتوں کو بہتر بنانا، آبادی کی منصوبہ بندی کو اور زیادہ موثر بنانا اور شہروں اور دیہات میں مکان بنانے کی بہتر سہولتیں فراہم کرنا۔

۱۹۷۲-۷۳ء سے اب تک معاشی ترقی

پاکستان کی معاشی تاریخ میں پچھلے چار سال بڑے مشکل لیکن اہم رہے ہیں۔ اس عرصے میں اندرونی اور بین الاقوامی حالات قومی معیشت پر برے اثرات ڈالتے رہے۔ نجی شعبہ میں سرمایہ کاری کی ترغیب ختم ہوگئی تھی۔ زرعی اور صنعتی پیداوار گھٹ گئی تھی۔ جس سے معاشی ترقی کی رفتار کم ہوگئی تھی دوسری طرف بیرونی ملکوں میں افراط زر اور مندے کا زور تھا۔ ان تمام حالات نے پالیسی مرتب کرنے والوں کو بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ لیکن اس صورت حال کے بھی بعض مثبت پہلو قابل ذکر ہیں۔ سرمایہ کاری خاص طور پر سرکاری شعبہ میں سرمایہ کاری میں نمایاں اضافہ ہوا ہے

غلہ اور کپڑے کے فی کس استعمال اور دوسری اشیائے صرف کی دستیابی میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ صحت اور تعلیم جیسی سماجی خدمات بھی پہلے سے بہتر ہوگئی ہیں۔ جب سے عوامی حکومت نے اقتدار سنبھالا ہے پسماندہ علاقوں کی ترقی پر خاصی توجہ دی جارہی ہے۔

توقع ہے کہ زرعی اور صنعتی پیداوار بڑھانے کے معاملہ میں
۱۹۷۵-۷۶ء کا سالانہ ترقیاتی پروگرام ایک اہم موثر ثابت ہوگا
توقع ہے کہ موجودہ مالی سال میں صنعتی پیداوار میں ۱۳ فیصد اضافہ ہوگا جبکہ ۱۹۷۴-۷۵ء میں صرف ۳ فیصد اضافہ ہوا تھا۔ زرعی پیداوار میں بھی پچھلے سال کے مقابلہ میں نمایاں اضافہ ہوگا۔ مجموعی طور پر موجودہ مالی سال میں پیداوار میں ۷ سے ۹ فیصد تک اضافہ کی توقع ہے جبکہ ۱۹۷۴-۷۵ء میں صرف ۳ فیصد اضافہ ہوا تھا۔ اور اس سے پہلے تین سالوں میں اوسطاً ۵ فیصد اضافہ ہوا تھا۔
۱۹۷۱-۷۲ء کے بعد سرکاری شعبہ میں ترقیاتی اخراجات چار گنے بڑھ گئے ہیں۔ ۱۹۷۵-۷۶ء میں ترقیاتی اخراجات کے لئے ۱۳ ارب ۷۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے جبکہ ۱۹۷۱-۷۲ء میں ۲ ارب ۷۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تھی سرکاری شعبہ میں سرمایہ کاری کی شرح جو ۱۹۷۱-۷۲ء میں ۶ فی صد تھی ۱۹۷۴-۷۵ء میں ۱۷ فیصد تک پہنچ گئی۔ مجموعی سرمایہ کاری کی شرح جو ۱۹۷۲-۷۳ء میں ۱۳ فیصد تھی، ۱۹۷۴-۷۵ء میں ۱۷ فیصد تک پہنچ گئی۔ توقع ہے کہ ۱۹۷۵-۷۶ء میں سرمایہ کاری کی یہ شرح ۱۹ فیصد تک پہنچ جائے گی۔

اب عام طور پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ ملک میں زراعت کی بنیاد مضبوط ہے، معدنی دولت سے پوری طرح کام نہیں لیا گیا۔ اور مربوط صنعتی ڈھانچہ تیار ہوچکا ہے۔ ان تمام وسائل سے کام لے کر ملک نہ صرف موجودہ معاشی دشواریوں پر قابو پاسکتا ہے بلکہ مستقبل میں اس کی معاشی ترقی کی رفتار میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

پانچواں پنج سالہ منصوبہ

اب جبکہ اندرونی اور بیرونی معاشی حالات میں نسبتاً استحکام آگیا ہے

یہ دیکھنا ضروری ہوگیا کہ مختلف اصلاحات اور مختلف شعبوں میں ہدف مقرر کرکے جو ذمہ داریاں قبول کی گئی ہیں انہیں دستیاب وسائل سے کس طرح پورا کیا جاسکتا ہے اور اگر مجموعی وسائل ستدراہ ہوں تو کن منصوبوں کو اولیت دی جاسکتی ہے۔

مختلف شعبوں میں سرمایہ کاری میں بھی توازن ضروری ہے تاکہ معاشی ترقی میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ ان حالات میں یہ ضروری ہوگیا کہ پانچ سال کے لئے معاشی سرگرمیوں کا ایک ڈھانچہ تیار کیا جائے جس کے ذریعہ طویل مدت کے لئے ترقی کا لائحۂ عمل تیار کیا جاسکے۔

۱۹۷۵ء - ۸۰ کے لئے ترقیاتی سرگرمیوں کا ایک ہمہ گیر خاکہ ۱۹۷۵ء کے اوائل میں تیار کرلیا گیا تھا لیکن غیر یقینی بین الاقوامی حالات کے پیش نظر پانچ سالہ منصوبہ پر باقاعدہ عملدرآمد ملتوی کردیا گیا تھا۔ اب جبکہ بہتری کے آثار واضح طور پر نظر آنے لگے ہیں منصوبہ بندی ڈویژن کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ۱۹۷۶ء - ۸۱ کے لئے پنج سالہ ترقیاتی منصوبہ تیار کرے۔ اس منصوبہ میں ان باتوں کا خیال رکھا جائے کہ دستیاب وسائل کے اندر پہلے سے زیادہ سرمایہ کاری، پہلے سے زیادہ اشیا کا استعمال ہوسکے۔ اس سلسلے میں مختلف مطالعے مکمل ہوچکے ہیں اور مرکزی اور صوبائی وزارتوں سے تفصیلی مشورے ہورہے ہیں۔ توقع ہے کہ منصوبے کا پہلا مسودہ دسمبر ۱۹۷۵ء تک تیار ہو جائے گا۔ اس منصوبہ میں ترقی کے لئے جو لائحۂ عمل اختیار کیا جائے گا وہ مختصر طور پر درج ذیل ہے۔

ترقیاتی حکمتِ عملی کے عناصر

ترقیاتی حکمت عملی کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ مجموعی آمدنی میں اضافہ کا کس قدر حصہ عام آدمی کی فلاح و بہبود کے کام آتا ہے عام آدمی کی پہلی اور بنیادی ضرورت خوراک ہے۔ پاکستان میں پچھلے تین سال میں فی کس خوراک کی دستیابی میں اضافہ ہوا ہے۔ تاہم آبادی کے ایک معتد بہ حصہ کو مناسب غذا میسر نہیں اور جتنی غذا کھائی جاتی ہے وہ حراروں کے اعتبار سے اس کم از کم مقدار سے کم ہوتی ہے جو جسمانی صحت برقرار رکھنے کیلئے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہ صورتِ حال بجائے خود تشویشناک ہے اس کے علاوہ اس سے افرادی طاقت کو پوری طرح کام میں لانے، کارکردگی میں اضافے صحت کی بہتری اور بچوں کے لئے تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کی راہ میں رکاوٹ پڑتی ہے۔

حکومت کا ایک اولین مقصد یہ ہے کہ غذا سے لحیاتی حراروں کی کمی کم سے کم مدت میں دور کی جائے۔ اس کے لئے محض خوراک کی پیداوار میں اضافہ ہی کافی نہیں بلکہ خوراک کی تقسیم روزگار قیمتوں اور آمدنی کے بارے میں تمام پالیسیاں اس سے متاثر ہوتی ہیں۔ حکومت غذائی پیداوار میں خود کفالت کو پہلے ہی اولین قرار دے چکی ہے۔ اجرتوں کے بارے میں ایسی پالیسی پر عملدرآمد کیا جارہا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کم آمدنی والے طبقوں کے مفادات محفوظ رہیں۔

پاکستان جیسے ملک میں جہاں سرمایہ کم اور افرادی طاقت بہت زیادہ ہے تمام لوگوں کے لئے روزگار فراہم کرنا بہت اہم ہے۔ پیداوار کے ایسے طریقے اختیار کرنے سے جن میں زیادہ سے زیادہ مزدوروں کی ضرورت ہو افرادی طاقت کے بہتر استعمال میں مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک میں غربت کی اصل وجہ بے روزگاری یا روزگار کی غیر مناسب اجرت ہے۔ روزگار میں اضافہ سے انتہائی غربت دور کرنے میں مدد ملے گی۔ حکومت نے روزگار میں اضافہ کے لئے متعدد اقدامات کئے ہیں۔ منصوبہ کے تحت سرمایہ کاری اور پیداوار میں اضافہ سے روزگار میں اضافہ ہوگا۔ زرعی پیداوار کو اہم قرار دینے سے دیہات کے لوگوں کی شہروں میں منتقلی کی رفتار کم ہو جائے گی اور کھیت مزدوروں کو دیہات ہی میں اچھا روزگار مل سکے گا۔ زرِمبادلہ کی غیر منصفانہ شرح کی وجہ سے ایسی ٹیکنالوجی کو غیر ضروری اہمیت حاصل ہوگئی تھی جس میں سرمایہ اور درآمد شدہ مشینوں کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی تھی ان عناصر کی وجہ سے قیمتوں کے نظام میں کئی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ حکومت نے ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ حکومت نے حال ہی میں ایسے اقدامات کئے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ غیر ملکی ٹیکنالوجی کی بجائے ایسی ٹیکنالوجی استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے جس میں

ملکی مہارت اور وسائل سے کام لیا جاسکے۔ حکومت نے نظام تعلیم میں تبدیلیاں کی ہیں۔ اب پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تعلیم پر زیادہ زور دیا جارہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ پڑھے لکھے لوگ آسانی کے ساتھ ملکی معیشت میں کھپائے جاسکیں دیہات میں روزگار فراہم کرنے کے لئے خاص طور پر پیپلز ورکس پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری ختم کرنے کے لئے حکومت نے این ڈی وی پی اور ایسی ہی دوسری اسکیمیں بنائی ہیں۔ تاہم تمام شہریوں کو روزگار فراہم کرنے کا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا۔ مستقبل کے لئے ایسا لائحہ عمل تیار کرنا ضروری ہے کہ پیداوار اور روزگار دونوں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔

ترقی کی رفتار برقرار رکھنے اور غیر ملکی امداد پر انحصار ختم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ ملکی وسائل کو کام میں لایا جائے۔ وسائل کی فراہمی حکومت کی اس پالیسی کے مطابق ہونی چاہیئے کہ مختلف طبقوں کی آمدنی کے درمیان فرق گھٹایا جائے۔ بدقسمتی سے وسائل حاصل کرنے کے وہ ذرائع جو مساوات کے نقطۂ نظر سے موزوں ہیں مثلاً براہ راست ٹیکسوں کا نفاذ وہ ٹیکس ادا نہ کرنے کے رجحان کی وجہ سے بے اثر ہوجاتے ہیں۔ ٹیکس جمع کرنے کے نظام کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ وسائل حاصل کرنے کے لئے ایسا لائحہ عمل اختیار کرنا ضروری ہے کہ اس سے نہ صرف سرمایہ کاری کے لئے زیادہ سے زیادہ وسائل دستیاب ہوں بلکہ حکومت کا زیادہ سے زیادہ معاشرتی انصاف مہیا کرنے کا مقصد بھی پورا ہوسکے۔

حکومت نے جو مالی پالیسیاں بنائی ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ملکی وسائل کی بنیاد کو وسیع کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ٹیکسوں کے نظام کی بنیاد وسیع کی گئی ہے۔ ٹیکس جمع کرنے کے نظام کو بہتر بنایا گیا ہے اور زیادہ سے زیادہ بچت اور سرمایہ کاری کے لئے مناسب ترغیبات فراہم کی گئی ہیں۔

حکومت بار بار اعلان کرچکی ہے کہ وہ ملی جلی معیشت پر یقین رکھتی ہے۔ وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے الفاظ میں معیشت کا یہ نظام اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ "ایسا معاشرتی نظام قائم کیا جائے جو استحصال سے پاک ہو لیکن جس میں اہلیت محنت اور حوصلہ کا مناسب صلہ دیا جاسکے" انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ تیزی کے ساتھ منصفانہ معاشرہ قائم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ قومی تحویل میں لئے ہوئے شعبہ کے ساتھ ساتھ نجی شعبہ بھی موجود ہو۔ وزیراعظم نے ۱۹۷۲ء میں کہا تھا" ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان کی معاشی ترقی میں نجی کاروبار کو بھی ایک کردار ادا کرنا ہے لیکن ہم کبھی ایسی صورت حال برقرار نہیں ہونے دیں گے جس میں تمام معاشی طاقت چند لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے اور انہیں بے شمار لوگوں کے استحصال کا موقع مل جائے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ نجی کاروبار میں قومی اور معاشرتی مفادات کے لئے باقاعدگی پیدا کی جائے۔"

نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے لئے حکومت نے حال ہی میں متعدد اقدامات کئے ہیں۔ نجی شعبہ پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی ہے کہ وہ ملک کے معاشرتی اور معاشی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے سرمایہ کاری کرے۔ پسماندہ علاقوں کی ضرورتوں کو نظرانداز نہ کرے۔ صنعتوں اور کاروبار کے انتظام میں معاشیات اور ٹیکسوں کے قوانین کا پورا احترام کرے اور مزدوروں اور صارفین کے مفادات کا پورا خیال رکھے۔

کسی بھی معاشی لائحہ عمل میں مختصر اور طویل مدت کے مقاصد سامنے رکھنے ضروری ہوتے ہیں۔ بعض حالات میں یہ مقاصد باہم متصادم ہوتے ہیں ایسے حالات میں حکومت کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ لمبی مدت کے منصوبوں میں سرمایہ کاری پر زور دیا جائے یا ان منصوبوں پر توجہ دی جائے جن سے فوری طور پر فوائد حاصل ہوسکتے ہیں فوری طور پر منفعت دینے والے منصوبوں کی کشش کے باوجود کوئی ذمہ دار حکومت ان مسائل کو نظرانداز نہیں کرسکتی جو لمبی مدت میں حل ہوسکتے ہیں۔ خاص طور پر تعلیم، آبادی کی منصوبہ بندی اور بنیادی صنعتوں میں سرمایہ کاری سے آہستہ آہستہ فوائد حاصل ہوتے ہیں لیکن مستقبل کے استحکام اور ملک کی خوشحالی کی ضمانت کے لئے ضروری ہے کہ ان شعبوں میں بھی سرمایہ کاری کی جائے۔

عوامی حکومت کے چار سال

انتظامی اصلاحات پر ایک نظر

کسی جمہوری ملک کو ایسی انتظامیہ کی ضرورت ہوتی ہے جو عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ عوام کے سامنے جواب دہ ہو۔ غیر ملکی حاکموں سے پاکستان کو جو نوکر شاہی ملی وہ اس کی ضروریات کے لئے مناسب نہ تھی۔ اصل میں یہ ایک استعماری نظام تھا جس کا مقصد ایک غیر ملکی حکومت کے مفادات کی خدمت کرنا تھا۔ پرانے نظام کی اصلاح کرنے کی ضرورت عام طور پر محسوس اور تسلیم کی گئی۔ اس معاملہ پر اعلیٰ سطح کے کمیشنوں اور ماہرین نے جن میں بعض مشہور غیر ملکی ماہرین بھی شامل تھے غور کیا اور پاکستان کی مختلف سابقہ حکومتوں نے متعدد کمیٹیاں قائم کی تھیں اور ان کی رپورٹوں نے جدید رجحانات کے مطابق زبردست انتظامی تبدیلیوں اور اصلاحات کا آغاز کرنے کی ضرورت کا یکساں طور پر اظہار کیا تھا تاہم رائج نظام اتنی مضبوطی سے پیوست تھا اور مفاد پرست طبقہ اتنا طاقتور تھا کہ اس نے تبدیلی کے ہر تصور کی مزاحمت کی اور یوں بغیر کسی تبدیلی کے کئی سال گذر گئے یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں موجودہ حکومت نے اقتدار سنبھالا۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو قوم سے اپنے پہلے ہی خطاب میں وزیر اعظم نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا "ہم ایسی نوکر شاہی نہیں چاہتے جس کی پرورش استعماری روایات اور تصورات پر کی گئی ہو۔ ہم ایسی انتظامیہ چاہتے ہیں، جو وسیع النظر ہو، اپنی کارکردگی میں متحرک اور انقلابی جذبے کی حامل ہو اور جو قوم کی خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو۔"

وزیر اعظم نے اس تبدیلی لانے کے لئے عزم مصمم کا اظہار کیا۔ اسی عزم کو پورا کرنے کی غرض سے حکومت نے اپریل ۱۹۷۲ء میں ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی قائم کی جس کے سامنے سرکاری ملازمین کی تنظیم نو تھی۔ انتظامی اصلاحات کی کمیٹی نے مختلف مسائل کا گہرا جائزہ لیا جن میں ملازمت کے ڈھانچے پر نظر ثانی رشوت ستانی کا انسداد، عملے کے انتظام کے لئے مزید سائنسی اور موثر مشینری کا قیام جس میں خالصتاً پیشہ ورانہ اہلیت اور ملازمت کی ضروریات پر تقرریاں ایک ٹھوس اور معقول تربیتی پروگرام کا آغاز اور دوسرے متعلقہ امور شامل تھے۔

وزیر اعظم نے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۳ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے وسیع انتظامی اصلاحات کے ایک پروگرام کا اعلان کیا۔ اس کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں۔ ساری سروسوں اور کیڈروں کا ایک متحدہ درجہ وار ڈھانچے میں انضمام جس میں ان تمام لوگوں کے لئے مساوی مواقع مہیا کئے گئے جو اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر کسی بھی مرحلے میں ملازمت میں داخل ہوں۔ سرکاری ملازموں کے درمیان ساری "کلاسیں" ختم کر دی گئیں اور ان تمام لوگوں کے لئے مساوی مواقع مہیا کئے گئے جو اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر کسی مرحلے میں ملازمت میں داخل ہوں۔ ان اصلاحات نے نجی شعبہ کے ایسے باصلاحیت اشخاص کے لئے بنکاری، بیمہ، صنعت اور تجارت جیسے شعبوں میں سرکاری ملازمت میں داخل ہونے کی گنجائش پیدا کی۔

انتظامی اصلاحات کے متذکرہ بالا مقاصد کے حصول کے لئے مطلوبہ قانونی ڈھانچہ، نئے آئین نے مہیا کیا اور ملازمت کے امور سے متعلق قوانین پاکستان میں پہلی مرتبہ اگست ۱۹۷۳ء میں وضع کئے گئے۔ ملازمت کی شرائط سے متعلق تحفظات بشمول انضباطی کارروائی۔ جو سابقہ دساتیر میں شامل کئے گئے تھے واپس لے لئے گئے۔ آئینی ضمانتوں نے سرکاری ملازمین میں جوابدہی کے احساس کو ختم کر دیا تھا اور یہ ایک غیر تسلی بخش کارکردگی اور تحفظ کے لئے ایک ڈھال بن گیا تھا۔ سرکاری ملازمین کا عظیم طبقہ پہلی مرتبہ پارلیمنٹ کے عوامی قانونی کنٹرول میں آیا جیسا کہ ایک جمہوری نظام میں ہونا چاہیئے۔ اسی کے مطابق ملازمت کے امور سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے۔ سول سرونٹس ایکٹ مجریہ ۱۹۷۳ء نے سول ملازمین کی شرائط متعین کیں۔ سروس ٹربیونلز ایکٹ مجریہ ۱۹۷۳ء نے سروس ٹربیونلز کے قیام کی گنجائش رکھی تاکہ سول ملازمین کی شرائط ملازمت سے متعلق امور پر خالص اختیارات استعمال کرے اور فیڈرل سروس کمیشن ایکٹ مجریہ ۱۹۷۳ء نے پبلک سروس کمیشن کا نظرثانی شدہ کردار مقرر کیا۔ نئی آئینی دفعات اور اس کے ساتھ ان تین ایکٹوں نے حکومت کو اس قابل بنایا کہ وہ قوانین کے ضوابط کے نئے سلسلے وضع کرے ملازمتوں کی تنظیم کرے اور سرکاری ملازمین کی بھرتی اور ترقی کے طریقوں اور تنخواہوں کے ڈھانچوں میں دوررس تبدیلیاں کرے۔

ان اصلاحات کا مقصد اور ان کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کے درمیان مساوات پیدا کی جائے۔ ان میں پیشہ ورانہ جذبہ پیدا کیا جائے اور ان کے اندر جوابدہی کا احساس پیدا کیا جائے ان کا یہ بھی مقصد ہے کہ ملازمتوں میں بدعنوانی اور رشوت ستانی کا قلع قمع کیا جائے سارے عہدے، خواہ وہ پہلے باضابطہ قائم کی ہوئی سروسوں کے کیڈر میں تھے یا نہ تھے، اب ایک متحدہ درجہ دار ڈھانچے میں ضم ہو گئے ہیں۔ وہ پرانا نظام ختم کر دیا گیا ہے جس میں ایک یا دو سروسیں، دوسری سروسوں پر حکومت کرتی تھیں۔ اب تقرریاں سروسوں میں نہیں بلکہ گریڈوں میں کی جاتی ہیں۔ جو عہدے، صوبے کے امور سے منسلک ہیں، ان کا تعلق صوبائی متحدہ گریڈوں سے ہے اور جو وفاقی حکومت سے منسلک ہیں۔ ان کا تعلق وفاقی متحدہ گریڈوں سے ہے۔ مزید برآں، جیسا کہ آئین میں کہا گیا ہے ہمارے پاس کل پاکستان متحدہ گریڈ بھی ہیں جن میں ایسے عہدے آتے ہیں جو صوبوں اور مرکز میں مشترک ہیں۔ آئین نے قومی یکجہتی اور وابستگی کے عظیم مفاد میں مرکز اور صوبوں کے درمیان مشترکہ سروس کا تصور برقرار رکھا ہے مطلوبہ خصوصی مہارت مہیا کرنے اور انتظامی کنٹرول کی آسانی کے لئے حکومت کے تحت مختلف عہدوں کی تنظیم نو اس طرح کی گئی ہے کہ دو گروپ بنا دیئے گئے ہیں ایک عملیاتی (FUNCTIONAL) اور دوسرا پیشہ ورانہ (OCCUPATIONAL) یہ کسی حد تک حکومتی سرگرمی کے اہم محکموں سے ملتے جلتے ہیں یعنی سیکریٹریٹ۔ پولیس۔ امورِ خارجہ۔ ریونیو۔ اکاؤنٹس۔ اقتصادی منصوبہ بندی وغیرہ۔ یہ گروپ کسی طرح بھی علیحدہ خانوں کی نمائندگی نہیں کرتے جیسی کہ سابقہ سروسیں ہوا کرتی تھیں۔ ہر گروپ میں بغلی داخلے کی گنجائش رکھی گئی ہے اور ایک گروپ سے دوسرے گروپ میں جانے کے لئے افقی پیش قدمی کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ حکومت میسر ہونے والے باصلاحیت اور تجربہ کار لوگوں کا بہترین مصرف لے سکے۔

انضباطی طریقوں کو بھی بہتر اور آسان بنایا گیا ہے۔ تاکہ حکومت، بداطواری رشوت ستانی اور نا اہلی کے معاملات کے خلاف تیزی سے موثر کارروائی کر سکے۔ ریٹائرمنٹ کے قوانین میں بھی ترمیم کی گئی ہے تاکہ حکومت سول ملازمت میں ایسے عناصر کو چھانٹ سکے جن کی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ بھرتی اور ترقی کے طریقے کی مرکزیت ختم کر دی گئی ہے سرکاری ملازمین کی شرائط ملازمت کے معاملات میں ان کے محکموں کے حکام کے فیصلوں کے خلاف شکایات کے ازالہ کے لئے سروس ٹربیونل کی صورت میں ایک مشینری قائم کی گئی ہے۔

فیڈرل پبلک سروس کمیشن اب گریڈ ۱۶ اور اس سے اوپر کے سارے عہدوں کے لئے، جو براہ راست بھرتی کے ذریعے پر کئے جاتے ہیں بھرتی کرنے والی ایک ایجنسی ہے۔ خود مختار اداروں اور کارپوریشنوں میں گریڈ ۱۹ اور اس کے اوپر کے سینیئر عہدوں کو بھی، اگر وہ براہ راست بھرتی کے ذریعہ پر کئے جاتے ہیں، کمیشن کے دائرہ اختیار میں دے دیا گیا ہے۔ حکومت نے انتظامی اصلاحات کے جزو کے طور پر جو دوسرے اہم اقدامات کئے ہیں

وہ تنخواہوں کے سیکڑوں اسکیلوں کا ۲۲ قومی اسکیلوں میں انضمام ہے۔ معمول کے مطابق ترقی کے علاوہ، اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ نچلے گریڈوں میں کام کرنے والے سرکاری ملازمین جب نچلے اسکیل کی حد پر پہنچ جائیں تو خود بخود اس سے اوپر کے گریڈ چلے جائیں۔ مزید برآں، تنخواہوں کے اسکیلوں کو اوپر لے جانے کے لئے نظرثانی کرتے وقت کم تنخواہ پانے والے ملازمین کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا گیا اور سینیئر افسروں مثلاً جوائنٹ سیکریٹری اور اس سے اوپر کے عہدیداروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا گیا۔ ان اقدامات کے نتیجہ میں سول سروس میں سب سے کم اور سب سے زیادہ تنخواہ پانے والوں کے درمیان آمدنی کی عدم مساوات بڑی حد تک کم ہوگئی ہے۔

اگست ۱۹۷۳ء میں انتظامی اصلاحات کے نفاذ کے وقت سے وفاقی سیکریٹریٹ میں سینیئر عہدوں پر تقرریاں، بھرتی کے نظرثانی شدہ طریقے کے ذریعہ بھی کی جاتی ہیں جسے بغلی داخلہ (LATERAL ENTRY) کہتے ہیں یہ طریقہ دوہرے مقصد کے لئے جاری کیا گیا یعنی یہ کہ سیکریٹریٹ نظام کی ہر سطح پر باصلاحیت اور تجربہ کار اشخاص کو داخل کیا جائے، باصلاحیت افراد یونیورسیٹوں، صنعت، کاروبار، کارپوریشنوں، پیشوں اور زندگی کے ہر شعبے سے لئے جاتے ہیں تاکہ سرکاری محکموں کے افراد کار کی روز افزوں ضروریات پوری ہوں اور سول سروس طبقہ کے ان لوگوں کو ترقی کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں جو اصلاحات سے پہلے ترقیوں کے ظالمانہ اور امتیازی نظام کا شکار تھے اور جنہیں اہلیت اور صلاحیت کے باوجود ترقی کے سارے مواقع سے محروم کر دیا گیا تھا۔

فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے زیر اہتمام ہونے والے مقابلہ کے امتحانات کے نتائج پر گریڈ ۱۷ میں بھرتی کئے جانے والے سارے پروبیشنرز کو اب مخلوط تربیت اور ایک مشترکہ بنیادی نصاب دیا جاتا ہے اور اس کے بعد فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی طرف سے ایک آخری پاسنگ آؤٹ امتحان ہوتا ہے۔ مجموعی سول سروس کے نظام کے اندر مختلف پیشہ ورانہ گروپوں میں ان کی تخصیص صلاحیت کی بنیاد پر کی جاتی ہے جس کا تعین فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے مذکورہ بالا دو امتحانات کے نتائج پر کیا جاتا ہے۔

جن اقدامات کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہ محض آغاز عمل ہیں۔ ان کی نوعیت اوّلین لازمی اقدامات کی ہے جن کا منشاء قلیل المیعاد مقاصد کی تکمیل اور ان اصلاحات کا ٹھوس اور موثر آغاز کرنا ہے۔ انتظامی اصلاحات بہرحال ایک طویل المیعاد عمل ہے اور ہمارے بعض طویل المیعاد مقاصد یہ ہیں:—

(۱) انتظامیہ میں عمومیت کے اعتقاد کے برخلاف پیشہ واریت کا آغاز کرنا کیونکہ اوّل الذکر نے اتنے طویل عرصہ تک خرابیاں پیدا کیں۔

(۲) پیشہ وارانہ زندگی کے انتظام اور منصوبہ بندی کا ایک سائنسی نظام شروع کرنا۔ اس کے لئے ضرورت یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کی تعلیمی صلاحیتوں اور تجربے کے اعتبار سے سارے موجودہ عہدوں کی درجہ وار تقسیم کی جائے اور ملازمتوں کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے۔ مختلف سرگرمیوں اور پیشوں میں ہونے والی کمی کا پہلے سے اندازہ لگایا جائے اور انہیں مناسب سطحوں پر بھرتی کے ذریعہ اور دوران ملازمت تربیتی پروگرام کا آغاز کر کے پورا کیا جائے۔

(۳) موجودہ دوران ملازمت کی تربیتی سہولتوں کو اتنا وسیع اور مستحکم کیا جائے کہ اس میں سارے گریڈوں کے سارے سول ملازمین آجائیں تاکہ انتظامی مشینری اچھی حالت میں رہے اور تیز معاشرتی، اقتصادی ترقی اور عظیم تر قومی استحکام اور سلامتی کے ضروری تقاضے پورے کرنے کے لئے پوری طرح تیار رہے۔

محنت کشوں کی فلاح و بہبود

جناب عبدالستار گبول
وزیرِ مملکت برائے محنت

پاکستان میں آزادی کے بعد صنعت کے میدان میں بڑی تیزی سے ترقی ہوئی ہے۔ صنعتی ترقی اور محنت کشوں کی فلاح و بہبود کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے اور ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ حکومت کا مطمع نظر یہ ہے کہ جن لوگوں کے پسینے سے صنعتی ترقی کی نئی راہیں کھلتی ہیں انہیں ملک کی خوشحالی میں پورا حصہ ملنا چاہیئے۔ اس لئے قائدِ عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کی فعال قیادت میں عوامی حکومت کی لیبر پالیسی کا سنگِ بنیاد محنت کشوں کی فلاح و بہبود ہے۔

پاکستان اب تک عالمی ادارہ محنت کے تیس اعلانات کی توثیق کر چکا ہے۔ ان میں انجمن سازی کی آزادی کی ضمانت، اجتماعی سودے کاری کا حق اور کام کے صحت مند ماحول کے بارے میں اعلانات بھی شامل ہیں۔

عوامی حکومت دسمبر سنہ ۱۹۷۱ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد اب تک بڑی دُور رس لیبر اصلاحات کر چکی ہے تاکہ عالمی ادارۂ محنت کے اعلانات پر عملدرآمد ہو سکے اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو تمام ممکن سہولتیں، اضافی فوائد اور روزگار کے تحفظات حاصل ہو سکیں۔

لیبر اصلاحات پر عملدرآمد کے لئے بہت سے لیبر قوانین میں ترمیمیں کی گئی ہیں اور نئے لیبر قوانین وضع کئے گئے ہیں۔

لیبر پالیسی سے محنت کشوں کو جو فوائد حاصل ہوئے ہیں وہ مختصر طور پر درج ذیل ہیں۔

صنعتی تعلقات اور صنعتی امن

ملک میں صنعتی تعلقات کے قوانین میں بنیادی اصلاحات کی گئی ہیں۔ ٹریڈ یونینوں کو کام کرنے کی پوری آزادی دے دی گئی ہے۔ ان کے رجسٹریشن پر تمام پابندیاں ختم کر دی گئی ہیں۔

ان کارخانوں میں جہاں مزدوروں کی تعداد ۵۰ یا اس سے زائد ہے فیکٹری کی سطح پر مزدوروں کو مینیجمنٹ میں ۲۰ فیصد حصہ دینے کا بندوبست کیا گیا ہے جب تک مینیجمنٹ کمیٹی میں مزدوروں کے نمائندے تحریری طور پر مشورہ نہ دیں مینیجمنٹ کو نظم و ضبط، ترقی، فیکٹری میں کام کے حالات میں تبدیلی، فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں کی تربیت، اور تفریح اور بہبود کے سہولتوں کے بارے میں ملازمت کے قواعد بنانے یا پالیسی مرتب کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

ان فیکٹریوں میں اجتماعی سودے کاروں کی یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ فیکٹری کا حسابی سال ختم ہونے پر ایک بار فیکٹری کا حساب کتاب جانچ پڑتال کیلئے طلب کریں۔

ٹریڈ یونینوں کو تحفظ دیا گیا ہے۔ جن دنوں رجسٹریشن کے

مزدوروں کی صحت مند رہائش کا اہتمام لیبر کالونی راولپنڈی

ایک کارخانے میں مزدوروں کی کینٹین

کراچی کے کارخانۂ جہاز سازی میں
مزدور ایک جہاز کی تعمیر میں منہمک ہیں

عمارت کی تعمیر میں مرد اور عورتیں
شانہ بشانہ محنت میں مصروف ہیں

کشتی سازی

ویلڈنگ کا کام ہنر اور حوصلے کا کام ہے

لاہور کی ایک سائیکل فیکٹری میں سائیکل کے ریم بنائے جا رہے ہیں

مزدوروں کی اجرتوں کی تقسیم

لئے یونین کی درخواست زیرِ غور ہو ان دنوں میں یونین کے کسی عہدیدار کا تبادلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ٹریڈ یونین کے کسی عہدیدار کو ہراساں کرنے کے لئے اس کا تبادلہ بھی ناجائز اقدام قرار دے دیا گیا ہے۔

لیبر اور مینجمنٹ کے تعلقات میں صنعتی جمہوریت کو فروغ دینے کے لئے کئی ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ شاپ اسٹیورڈز کا ادارہ دوبارہ قائم کر دیا گیا ہے۔ ورک کونسلیں جو ورک کمیٹیوں کی شکل میں پہلے ہی قائم تھیں اب انہیں اور زیادہ فعّال بنا دیا گیا ہے۔ قومی صنعتی تعلقات کا کمیشن قائم کیا گیا ہے جو قومی سطح پر ٹریڈ یونینیں قائم کرنے اور ایک ہی صنعت کی تمام ٹریڈ یونینوں کی قومی فیڈریشن بنانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ایک صنعت کی مختلف ٹریڈ یونینوں کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ کرتا ہے۔ یہ کمیشن ہر صنعت کی ٹریڈ یونین کی رجسٹریشن کرتا ہے اور مزدوروں کے بارے میں ناجائز اقدامات سے نپٹتا ہے۔ کمیشن کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ حکومت یا ٹریڈ یونینوں کی درخواست پر ان بڑے صنعتی اداروں کے بارے میں جو ایک سے زیادہ صوبوں میں پھیلے ہوئے ہوں اجتماعی سودے کار یونٹ کا تعین کرے۔

کارروائی میں تاخیر کو روکنے کے لئے بھی مناسب اقدامات کئے گئے ہیں۔ صنعتی تعلقات کے بارے میں معاملات نپٹانے کی مدتیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ٹریڈ یونین کی طرف سے رجسٹریشن کی درخواست کا تصفیہ ۱۵ دن میں ہو جانا چاہیئے۔ اسی طرح جونیئر لیبر کورٹ میں پیش کی ہوئی شکایت کا تصفیہ سات روز میں اور لیبر کورٹ میں دائر کردہ مقدمہ کا فیصلہ ۳۰ دن کے اندر ہو جانا ضروری ہے۔

صنعتی اور تجارتی اداروں کے ملازمین کے بارے میں احکام کا مغربی پاکستان آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۸ء

اس قانون کا دائرۂ کار بڑھا دیا گیا ہے۔ اب اس قانون کا اطلاق ٹھیکہ داروں اور ان صنعتی اور تجارتی اداروں پر بھی ہوتا ہے جن کے ملازمین کی تعداد ۲۰ یا اس سے زائد ہے۔ ان ملازموں کو بونس، تنخواہ کے ساتھ چھٹی اور ملازمت کے تحفظ کے خاص خاص فوائد دیئے گئے ہیں۔

منافع کی صورت میں مزدوروں کو ایک ماہ کی اجرت یا منافع کا ۳۰ فیصد ان دونوں میں سے جو بھی کم ہو بونس دیا جائے گا۔ یہ بونس اُس بونس کے علاوہ ہوگا جس کے بارے میں کوئی سمجھوتہ تصفیہ یا فیصلہ ہو چکا ہوگا۔

مزدوروں کا ان آفات کے خلاف بیمہ کیا جاتا ہے جن پر مزدوروں کے معاوضہ کے قانون مجریہ ۱۹۲۳ء اور سوشل سیکورٹی آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۵ء کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان آفات میں موت (بہ شمول قدرتی موت)، اور ڈیوٹی کے علاوہ دیگر اوقات میں زخمی ہونا بھی شامل ہے۔ بیمہ کی قسطیں آجر کو ادا کرنی پڑتی ہیں۔ کم سے کم اتنی رقم کا بیمہ ضروری ہے جتنی رقم مزدوروں کے معاوضہ کے قانون مجریہ ۱۹۲۳ء کے تحت واجب الادا ہوتی ہے۔

اس سے پہلے آجروں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ کارخانہ میں آگ لگنے یا قدرتی آفت مثلاً سیلاب کی صورت میں اپنے مزدوروں کو ۱۴ دن تک گھر بٹھا دیں۔ ایسی صورت میں مزدوروں کو کچھ رقم دی جاتی تھی۔ اب یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ مزدوروں کو خواہ کسی وجہ سے گھر بٹھایا جائے انہیں معاوضہ ضرور دیا جائے گا۔ یہ معاوضہ پوری مدت کی پچاس فیصد اجرت کے برابر ہوگا۔ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ پہلے ہفتہ میں نصف اجرت کے برابر اور دوسرے ہفتہ میں تہائی اجرت کے برابر معاوضہ دیا جاتا تھا۔

مستقل کارکنوں کو ہر ایک سال کی ملازمت پر ۱۵ دن کی اجرت کے برابر گریچویٹی دی جاتی تھی۔ اب ہر ایک سال کی ملازمت پر ۲۰ دن کی اجرت کے برابر گریچویٹی دی جاتی ہے۔ غیر مستقل کارکنوں کی صورت میں گریچویٹی ایک سال میں سب سے زیادہ ادا کی ہوئی اجرت کی بنیاد پر متعین کی جاتی ہے۔ دوسرے کارکنوں کے لئے گریچویٹی متعین کرتے وقت پچھلے تین ماہ کی اجرت سامنے رکھی جاتی ہے۔

مزدوروں کی ملازمت کے تحفظ کے بارے میں اہم اصلاحات کی گئی ہیں۔ پہلے کوئی آجر ایک ماہ کا نوٹس یا ایک ماہ کی تنخواہ دے کر کسی مزدور کو ملازمت سے الگ کر سکتا تھا۔ یہ اختیار مزدوروں کو بڑے پیمانے پر ہراساں کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اب آجروں کے لئے لازم ہے کہ وہ تحریری طور پر تقرر، تبادلے اور ترقی کے احکام مزدور کے حوالے کریں۔ اب کسی مزدور کو برطرف کرنے یا اس کی چھانٹی کرنے کے لئے تحریری حکم جاری کرنا ضروری ہے اس حکم میں برطرفی یا چھانٹی کی وجہ بتانا بھی ضروری ہے۔ یہ بھی قانون ہے کہ کوئی آجر لیبر کورٹ سے پیشگی اجازت کے بغیر کارخانہ بند نہیں کر سکتا۔

پہلے آجر مستقل ملازموں کی جگہ بدلی کے کارکن رکھ لیتے تھے۔ ایسے کارکن مہینوں کام کرتے رہتے تھے لیکن انہیں وہ سہولتیں نہیں دی جاتی تھیں جو مستقل ملازموں کو حاصل تھیں۔ اب یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ بدلی کے کارکن تین ماہ تک مسلسل ملازمت یا ایک سال میں ۱۸۳ دن کی حاضری کی صورت میں مستقل ملازم کے برابر حقوق اور حیثیت کے مستحق ہوں گے۔ اسی طرح تعمیرات میں کام کرنے والے مزدوروں کو بھی تحفظ دیا گیا ہے۔ اب چھانٹی کے بعد ایک سال کے اندر دوبارہ ملازمت کی صورت میں ان مزدوروں کو ترجیح دی جائے گی۔ جو مزدور چھانٹی کے بعد ایک ماہ کے اندر دوبارہ ملازم رکھ لئے جائیں گے ان کے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ ان کی ملازمت میں کوئی وقفہ نہیں آیا۔

کانوں کا قانون مجریہ ۱۹۲۳ء

کانوں کا قانون مجریہ ۱۹۲۳ء جو وقت کے تقاضے پورے نہیں کر رہا تھا اس میں ترمیم کر دی گئی ہے۔ اس طرح ایک ہفتہ میں کام کے گھنٹے ۵۴ سے گھٹا کر ۴۸ کر دیئے گئے ہیں۔ کان مزدوروں کی صحت کیلئے بہتر سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اب کانوں کے مالکوں کیلئے یہ لازم قرار دے دیا گیا کہ وہ ہر ایسی بیماری جو ان کے پیشے کے باعث لاحق ہوتی ہو اس کے بارے میں کانوں کے انسپکٹر کو اطلاع دیں اور مقررہ معیار کے مطابق حفاظتی آلات اور ابتدائی طبی امداد کے کمروں کا بندوبست کریں۔ بعض حالات میں ان کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ طبی عملے، ادویات اور دیگر ضروری سہولتوں کا بھی انتظام کریں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کان مزدوروں کے لئے فالتو کام کی اجرت عام اجرت سے دوگنی مقرر کی گئی ہے۔

اب ہر سال تنخواہ کے ساتھ چھٹی دی جاتی ہے۔ چھٹی کی مدت اس طرح متعین کی جاتی ہے کہ کان کے اندر ۱۷ دن تک اور کان سے باہر ۲۰ دن تک کام کرنے پر ایک دن کی چھٹی۔ اس کے علاوہ اب کان مزدوروں کو پوری تنخواہ کے ساتھ دس دن کی اتفاقیہ رخصت، بیماری کی صورت میں آدھی اجرت پر ۱۶ دن کی رخصت اور تہواروں کے موقع پر پوری تنخواہ کے ساتھ چھٹی دی جاتی ہے۔

فیکٹریز ایکٹ مجریہ ۱۹۳۴ء

فیکٹریز ایکٹ مجریہ ۱۹۳۴ء کا اُن فیکٹریوں پر بھی اطلاق کر دیا گیا ہے۔ جن میں دس یا دس سے زائد کارکن کام کرتے ہیں۔ صحت اور تحفظ کے بارے میں اس ایکٹ کی دفعات کو اور زیادہ مؤثر بنا دیا گیا ہے جس سے کارکنوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ اب آجر کے خرچ پر ہر چھ مہینے کے بعد کارکن کا طبی معائنہ اور اسے بیماریوں سے بچاؤ کے لئے ٹیکے لگانا لازم قرار دے دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے اس سلسلہ میں آجر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں تھی۔

پہلے فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور، بیماری کی صورت میں رخصت کے مستحق نہیں تھے۔ سالانہ رخصت بھی زیادہ سے زیادہ دس دن کی ملتی تھی اب فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور مندرجہ ذیل چھٹیوں کے حقدار ہیں:

ا۔ تنخواہ کے ساتھ ۱۴ دن کی سالانہ رخصت۔
ب۔ تنخواہ کے ساتھ دس دن کی اتفاقیہ رخصت۔
ج۔ بیماری کی صورت میں نصف تنخواہ پر ۱۶ دن کی رخصت۔
د۔ سرکاری ملازموں کی طرح تنخواہ کے ساتھ تہواروں کی تعطیل

مزدوروں کے معاوضہ کا قانون مجریہ ۱۹۲۳ء

اس قانون کے تحت مزدوروں کی موت یا کام کے دوران زخمی ہو جانے کی صورت میں معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اب اس کا اطلاق ایک ہزار روپیہ ماہانہ تک اجرت پانے والے تمام کارکنوں پر ہوتا ہے۔ کلرک بھی اس قانون کے دائرے میں آتے ہیں۔ معاوضہ کی شرحیں بھی خاصی بڑھا دی گئی ہیں۔

مغربی پاکستان سوشل سیکورٹی آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۵ء

اس آرڈیننس کے تحت مارچ ۱۹۶۷ء میں معاشرتی تحفظ کی ایک اسکیم نافذ کی گئی۔ اس کا مقصد مزدوروں کو بیماری، زچگی اور کام کے دوران زخمی ہونے کی صورت میں امداد دینا تھا۔ شروع میں یہ اسکیم کراچی، حیدرآباد اور لائلپور میں کپڑے کے کارخانوں میں کام کرنے والے قریباً ایک لاکھ مزدوروں کے لئے تھی۔ بعد میں اسے سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد کے دوسرے علاقوں میں بھی نافذ کر دیا گیا اور اس کا اطلاق ان صنعتی اور تجارتی اداروں کے ملازموں پر بھی ہونے لگا جن میں دس یا دس سے زائد مزدور کام کرتے ہوں۔

پاکستان میں معاشرتی تحفظ کے پروگرام کی ابتدا ۱۹۶۷ء میں ہوئی تھی۔ سات سال کے قلیل عرصہ میں اس اسکیم نے خاصی ترقی کی ہے۔ اب اس سے پنجاب میں ۳۹۵۰ اداروں کے ۲،۳۲،۰۰۰ کارکن سندھ میں ۱۷۶۰ اداروں کے ۱،۹۱،۰۰۰ کارکن اور صوبہ سرحد میں ۱۱۹ اداروں کے ۲۶،۰۰۰ کارکن فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

پنجاب میں معاشرتی تحفظ کے ۱۰۲ یونٹ، سندھ میں ۱۰۷ یونٹ اور صوبہ سرحد میں ۱۵ یونٹ کام کر رہے ہیں۔ سندھ کے معاشرتی تحفظ کے ادارے نے لانڈھی میں ۲۰۰ بستروں کا اور کوٹری میں ۵۰ بستروں کا ہسپتال بنوایا ہے۔ ادارے نے کئی دوسرے ہسپتالوں میں مریضوں کے علاج کا بھی انتظام کیا ہے۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں معاشرتی تحفظ کے اداروں کا اپنا کوئی ہسپتال نہیں ہے لیکن وہاں سرکاری اور پرائیویٹ ہسپتالوں اور شفاخانوں میں مزدوروں کے علاج کا انتظام کیا گیا ہے۔ موجودہ مالی سال میں لاہور میں سینہ کے امراض کا ایک کلینک کھولا گیا ہے۔

معاشرتی تحفظ کی اسکیم کے تحت مزدوروں کو ملنے والے فوائد کی شرح بڑھا دی گئی ہے۔ موت کی صورت میں کفن دفن کے اخراجات کے لئے گرانٹ ۵۰ روپے سے بڑھا کر ۵۰۰ روپیہ مقرر کی گئی ہے۔ بیماری کی صورت میں اب تحفظ یافتہ مزدوروں کو ۱۲۰ دن تک مالی امداد دی جاتی ہے۔ پہلے یہ امداد ۹۱ دن تک دی جاتی تھی۔ تپ دق کی صورت میں یہ مدت ۱۹۱ دن تک بڑھا دی گئی ہے۔

کمپنیوں کے منافع میں مزدوروں کی شرکت کا قانون مجریہ ۱۹۶۸ء

اس قانون کا اطلاق ان صنعتی اداروں پر ہوتا تھا جن میں ایک شفٹ میں ایک سو یا اس سے زائد مزدور کام کرتے ہوں۔ اب اس کا اطلاق ان تمام صنعتی اداروں پر ہوتا ہے جن میں پچاس یا پچاس سے زائد مزدور کام کرتے ہوں۔ منافع میں مزدوروں کا حصہ بڑھا کر خالص منافع کا پانچ فیصد مقرر کیا گیا ہے۔

مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کا آرڈیننس مجریہ ۱۹۷۲ء

اس آرڈیننس کے تحت جس کارخانے میں بیس یا بیس سے زائد مزدور کام کرتے ہوں اس کے آجر پر یہ لازم ہے کہ وہ اس قانون کی روشنی میں ہر مزدور کے ایک بچہ کی میٹرک تک تعلیم کا خرچ اٹھائے۔ اسے ان تمام بچوں کے لئے نصاب کی کتابیں مہیا کرنی ہوں گی اور داخلہ کی فیس، ٹیوشن فیس، امتحان کی فیس اور اسکول کے فنڈ ادا کرنے ہوں گے۔

بڑھاپے میں ملازموں کی پنشن کی اسکیم

۱۹۷۲ء میں بڑھاپے کے لئے مزدوروں کی پنشن کا آرڈیننس نافذ کیا گیا ہے۔ وفاقی حکومت عالمی ادارۂ محنت کے تعاون سے اس آرڈیننس کے تحت پنشن کی اسکیم کو

قطعی شکل دے رہی ہے۔

مزدوروں کے لئے مکان

۱۹۷۱ء میں مزدوروں کی بہبود کے فنڈ کا جو آرڈیننس نافذ کیا گیا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کو مکان اور دوسری سہولتیں مہیا کرنے کے لئے ایک فنڈ قائم کیا جائے۔ آرڈیننس میں یہ دفعہ رکھی گئی تھی کہ ایسا ہر صنعتی ادارہ جس کی سالانہ آمدنی کم سے کم ایک لاکھ روپیہ ہو اپنی آمدنی کا دو فیصد حصہ ٹیکس کے طور پر فنڈ میں دے گا۔ حکومت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ صنعتی اداروں کی مالی حالت اور دیگر حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے مزید رقم بھی وصول کر سکتی ہے۔ یہ ٹیکس جولائی ۱۹۷۲ء میں نافذ ہوا تھا۔ مرکزی حکومت نے اس فنڈ کے لئے ابتدائی طور پر دس کروڑ روپیہ اپنی طرف سے دیا۔ فنڈ کا انتظام ایک گورننگ باڈی کے حوالے کیا گیا اور مرکزی لیبر سکریٹری کو گورننگ باڈی کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔

صوبائی حکومتوں کے لئے ہر صوبے میں مزدوروں کی تعداد کے مطابق ہر سال اس فنڈ میں سے رقم مختص کی جاتی ہے۔ لیکن یہ رقم اسی صورت میں ادا کی جاتی ہے جو پہلے ادا کی ہوئی رقم ان اسکیموں پر خرچ کر دی گئی ہو جو صوبائی حکومت کی طرف سے پیش کی گئی ہوں اور جنہیں مزدوروں کے بہبود فنڈ کی گورننگ باڈی منظور کر چکی ہو۔ اب تک سندھ کو ۲,۶۸,۷۰,۰۰۰ روپے پنجاب کو ۱,۴۹,۰۰,۰۰۰ روپے، صوبہ سرحد کو ۴۵,۹۸,۰۰۰ روپے اور بلوچستان کو ۱۰,۰۰,۰۰۰ روپے دیئے جا چکے ہیں۔ موجودہ مالی سال میں مختلف صوبوں کے لئے جو رقمیں مختص کی گئی ہیں وہ ابھی تک ادا نہیں کی گئیں۔ ۱۹۷۵-۷۶ء کے لئے مندرجہ ذیل رقمیں مختص کی گئی ہیں۔

پنجاب	:	۶۲,۹۰,۰۰۰
سندھ	:	۵۹,۳۰,۰۰۰
صوبہ سرحد	:	۴,۸۲,۰۰۰
بلوچستان	:	۱۸,۲۰,۰۰۰

حکومت سندھ نے مزدوروں کے لئے ۷۰۰ فلیٹ بنوائے ہیں اور ۲۵۰۰ فلیٹ بنوا رہی ہے۔ حکومت پنجاب نے لائلپور میں ۵۱۲ فلیٹ بنوائے ہیں۔

صوبہ سرحد میں مزدوروں کی ایک کالونی کی تعمیر شروع ہو گئی ہے جس میں دو دو کمروں کے ۱۰۱ مکان ہوں گے۔

مہنگائی الاؤنس

قیمتوں میں بین الاقوامی سطح پر اضافہ کی وجہ سے پاکستان میں بھی اخراجات زندگی کا اشاریہ بڑھ گیا ہے۔ حکومت نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ افراطِ زر سے مزدوروں اور بندھی تنخواہ پانے والوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۱۹۷۳ء میں مہنگائی ریلیف ایکٹ منظور کرایا۔ اس کے تحت ۷۰۰ روپیہ ماہانہ تک اجرت اور تنخواہ پانے والوں کو ۳۵ روپیہ فالتو دیا گیا۔ ۷۳۵ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والوں کی شرح تنخواہ میں مناسب رد و بدل کیا گیا۔ قیمتوں میں اضافہ کا اثر زائل کرنے کے لئے ۸ جون ۱۹۷۴ء کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ تک اجرت یا تنخواہ پانے والوں کو اُن کی اجرت یا تنخواہ کے دس فیصد کے برابر مہنگائی الاؤنس دیا گیا۔ ۱۱۰۰ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والوں کی تنخواہ میں مناسب رد و بدل کیا گیا۔ یہ ۲۵ روپیہ ماہانہ کے اس اضافہ کے علاوہ ہے جس کا حکومت نے حال ہی میں اعلان کیا ہے۔

پاکستان میں تعلیم

پاکستان میں عوامی حکومت کے برسر اقتدار آنے سے پہلے تعلیم صوبوں کی ذمہ داری تھی۔ ہر صوبہ اپنے وسائل کے مطابق تعلیمی سہولتیں فراہم کرتا تھا۔ لیکن یہ وسائل طلبا کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کافی نہیں تھے۔ عوامی حکومت نے اس دشواری کو محسوس کیا اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ تعلیمی سہولتیں حاصل کرنا تمام صوبوں کا حق ہے لہٰذا تعلیمی سہولتیں فراہم کرنا اور تعلیم کا معیار برقرار رکھنا وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی مشترکہ ذمہ داری قرار دے دیا گیا۔ اس سلسلہ میں اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے آئین میں مناسب دفعات شامل کی گئیں۔ اب وفاقی حکومت نہ صرف تعلیم کے میدان میں صوبائی حکومتوں کی ذمہ داریوں میں شریک ہو سکتی ہے بلکہ اس نے صوبوں کا کچھ بار خود سنبھال لیا ہے۔

تعلیم سے متعلق بہت سے اہم امور مشترکہ فہرست میں شامل کر دیئے گئے ہیں جن کے بارے میں پارلیمنٹ ضرورت پڑنے پر قانون بنا سکتی ہے۔ ان امور میں تعلیمی پالیسی، منصوبہ بندی، نصاب، کتابیں تعلیم کے میدان میں نمایاں کارکردگی کے ادارے تعلیمی معیار اور اسلامی تعلیمات شامل ہیں۔ وفاقی امور کی فہرست میں جن کے بارے میں صرف پارلیمنٹ ہی قانون بنا سکتی ہے لائبریریاں، عجائب گھر اور ایسے ہی دوسرے ادارے جن کا خرچ وفاقی حکومت اور وفاقی ادارے اٹھاتے ہیں، اور تحقیق پیشہ ورانہ یا ٹیکنیکل ٹریننگ، اور خاص خاص موضوعات کے مطالعہ کے ادارے شامل ہیں۔

تعلیمی پالیسی پر عملدرآمد

تعلیمی پالیسی پر عملدرآمد کے لئے منصوبہ بندی اور ترقی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ایک قومی کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اس میں وفاقی وزارتِ تعلیم اور خزانہ کے صوبائی محکموں کے نامزد نمائندے شامل کئے گئے ہیں۔ یہ کمیٹی تعلیم کے میدان میں پورے ملک میں ترقی سرگرمیوں میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔

بجٹ میں رقوم کی منظوری

تعلیم و تربیت کے میدان میں ترقیاتی اخراجات پورے کرنے کے لئے ۷۶-۱۹۷۵ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں ۶۳۹٫۳۹۱ ملین کی رقم رکھی گئی ہے۔ یہ رقم ۷۵-۱۹۷۴ء میں نظرثانی شدہ اخراجات کے تخمینے سے جو ۵۱۱٫۹۱۵ ملین تھا ۲۴٫۹ فیصد زیادہ ہے۔

تعلیمی پالیسی کے بارے میں تمام سفارشات پر مکمل عمل درآمد کے لئے ۷۶-۱۹۷۵ء میں ایک ارب بیس کروڑ روپے کی رقم درکار ہوتی. لیکن چونکہ وسائل محدود تھے اور افراطِ زر کی روک تھام بھی ضروری تھی۔ اس لئے ۷۶-۱۹۷۵ء کا سالانہ ترقیاتی پروگرام کم دیا گیا۔ بہت سے ضروری پروگراموں میں تخفیف ناگزیر ہوگئی. تعلیم کے لئے مطلوبہ رقم فراہم کرنا ممکن نہیں تھا اس لئے تعلیمی میدان میں ۷۶-۱۹۷۵ء میں صرف ۶۳ کروڑ ۹۰ لاکھ روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے اس سے تعلیمی پروگراموں کو محدود کر دینا پڑا۔ ان پروگراموں میں بیشتر وہ اسکیمیں شامل تھیں جن پر پہلے سے کام ہو رہا تھا، مجموعی طور پر ۴۳ کروڑ ۳۱ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ یا سالانہ ترقیاتی پروگرام کا ۶۹ فیصد حصہ ان سکیموں کے لئے مختص کر دیا گیا ہے جن پر پہلے ہی کام ہو رہا ہے۔ نئے پروگراموں کے لئے جو چار صوبوں اور سات وفاقی ڈویژنوں کی طرف سے شروع ہونے ہیں صرف ۲۰ کروڑ روپیہ کی رقم باقی بچی ہے۔

پرائمری تعلیم

حکومت نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ ۱۹۸۳ء تک تمام بچوں کیلئے مفت ابتدائی تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔ لیکن بین الاقوامی افراطِ زر اور دوسرے عوامل کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہے۔ اب یہ طے کیا گیا ہے کہ سب بچوں کے لئے مفت ابتدائی تعلیم کا بندوبست ۱۹۸۷ء تک کیا جائے۔ وفاقی وزیر تعلیم نے حال ہی میں کہا ہے کہ حکومت سردست پانچ سے دس سال تک کی عمر کے پچاس فیصد بچوں کے لئے اسکولوں کا بندوبست کرنے سے قاصر ہے۔ اس وقت اس عمر کے ۷۰ فیصد لڑکے اور ۳۰ فیصد لڑکیاں اسکولوں میں تعلیم پا رہی ہیں۔ سب کے لئے ابتدائی تعلیم کا بندوبست کرنے کے لئے موجودہ ۵۸ ہزار اسکولوں کے علاوہ قریباً ۴۰ ہزار نئے اسکول کھولنے ہوں گے ۱۹۷۵ء میں ۹ ہزار نئے اسکول کھولے گئے جن سے اسکول جانے والے بچوں کے فیصد تناسب میں برائے نام ہی اضافہ ہو سکا۔

تمام لڑکوں کے لئے ۱۹۸۳ء تک اور تمام لڑکیوں کے لئے ۱۹۸۶ء تک خواندگی کا بندوبست ہو سکے گا۔

ثانوی، اعلیٰ ثانوی (جنرل ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم)

اس سطح پر عام تعلیم کا برسوں پرانا رجحان تبدیل کیا جا رہا ہے اور عام تعلیم کے ساتھ زرعی تکنیکی اور تجارتی تعلیم کو رواج دیا جا رہا ہے، عام تعلیم اور فنی تربیت میں ہم آہنگی کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے تاکہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں کے طلبا اور طالبات کو مفید روزگار کیلئے تیار کیا جا سکے.

ٹیکنیکل، کمرشل اور پیشہ ورانہ نصاب کی افادیت کا جائزہ لینے اس پر نظرثانی کرنے اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کے لئے خاص کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ نصابوں کی افادیت کی جانچ پڑتال اور نظرثانی متواتر ہوتی رہے گی تاکہ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹروں میں صنعتی اور تجارتی اداروں کی ضرورتیں پوری کی جا سکیں۔

وفاقی وزارت تعلیم نے ثانوی درجوں میں تعلیم کے بارے میں اسکیم کا مسودہ شائع کیا تھا اس کے بارے میں پورے ملک سے ماہرین تعلیم، دانشوروں استادوں، طلبا اور عام لوگوں کی طرف سے جو رائیں موصول ہوئیں ان کی روشنی میں ان کلاسوں میں تعلیم کی ایک نئی اسکیم تیار کی گئی ہے اس اسکیم کے تحت زراعت اور ٹیکنالوجی کی بامقصد تعلیم پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ وفاقی وزارت تعلیم نے کمرشل اداروں کے لئے نصاب کی افادیت کا جائزہ لینے اور اس پر نظرثانی کے لئے ماہروں کی جو کمیٹی مقرر کی تھی اس نے انٹرمیڈیٹ سطح پر کمرشل تعلیم کی نئی اسکیم کی منظوری دے دی ہے۔ ماہروں کی ایک اور کمیٹی نے ملک کے نئے تقاضے اور ضرورتیں پوری کرنے کے لئے لڑکوں کے پیشہ ورانہ تربیت کے اداروں کے لئے بھی نئے کورس تیار کئے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم:

موجودہ عام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں برابر توسیع کی جا رہی ہے. ان کے تعلیمی پروگراموں میں بھی توسیع کی جا رہی ہے ملک کے تمام حصوں کو اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے کے پروگرام کے تحت ملتان اور ڈیرہ اسماعیل خان میں نئی یونیورسٹیاں کھولی گئی ہیں. جامعہ اسلامیہ بہاولپور کو مکمل یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا ہے۔

ان یونیورسٹیوں میں زراعت انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کی سہولتوں کو بھی بہتر بنایا گیا ہے اور ان میں توسیع کی گئی ہے۔ ٹنڈو جام کے زراعتی کالج اور جام شورو کے انجینئرنگ کالج کا درجہ بڑھا کر ہر ایک کو یونیورسٹی بنا دیا گیا ہے۔ کراچی کے این ای ڈی انجینئرنگ کالج کو بھی یونیورسٹی بنایا جا رہا ہے۔

ڈگری کی سطح پر بھی عام تعلیم کے رجحان کے مقابلے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر زور دیا جا رہا ہے۔ ۱۹۷۲ء کی ابتدا میں ڈگری کالجوں میں ۷۰ فیصد طلبا نے آرٹس کے مضامین میں داخلہ لیا تھا۔ ڈگری کی سطح پر بھی عام تعلیم اور سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم میں بتدریج رابطہ پیدا کیا جائے گا۔ پروگرام یہ ہے کہ سن ۱۹۸۰ء تک ڈگری کالجوں میں تقریباً ۴۰ فیصد داخلے ٹیکنیکل مضامین میں، ۳۰ فیصد سائنس میں اور باقی ۳۰ فیصد آرٹس میں ہوں۔ جن ڈگری کالجوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کا انتظام نہیں تھا وہاں اب یہ انتظام کیا جا رہا ہے۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن

حکومت نے جون ۱۹۷۳ء میں پارلیمنٹ کے ایک قانون کے تحت یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یونیورسٹیوں کے پروگرام میں ہم آہنگی پیدا کی جائے، ان کی سہولتوں میں اضافہ کیا جائے، یونیورسٹیوں کی ترقی کے لئے فنڈ مہیا کئے جائیں اور اعلیٰ تعلیم سے متعلق معاملات میں وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو مشورے دیئے جائیں۔ کمیشن نے اعلیٰ تعلیم کے بارے میں ایک مربوط قومی پالیسی مرتب کرنے کی غرض سے اساتذہ اور طلبا کے مسائل، امتحانات اور یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم کو بہتر بنانے کیلئے ایسے گروپ تشکیل دیئے جو اعلیٰ تعلیم کیلئے ایک مربوط قومی حکمت عملی تیار کریں۔ وفاقی حکومت ان گروپوں کی سفارشات پر پوری توجہ دے رہی ہے۔

اعلیٰ کارکردگی کے مرکز

قدرتی اور صنعتی وسائل دریافت کرنا اور انہیں پوری طرح کام میں لانا پاکستان کے لئے معاشی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ وفاقی حکومت نے اس مقصد کے لئے مختلف یونیورسٹیوں میں خاص خاص شعبوں میں اعلیٰ کارکردگی کے مرکز قائم کر دیئے ہیں۔ امید ہے کہ ان مرکزوں میں سائنسی مضامین میں بہترین ماہر تیار ہوں گے۔

ایریا اسٹڈی سنٹرز

کئی یونیورسٹیوں میں ہم عصر معاشروں، خاص طور پر ان معاشروں کے بارے میں جن سے پاکستان کو خاص دلچسپی ہے اعلیٰ پیمانے پر مطالعہ اور تحقیق کے لئے ایریا اسٹڈی سنٹرز قائم کئے گئے ہیں۔

اساتذہ کی تربیت

ملک میں ۱۵ ٹیچرز ٹریننگ کالج، ۵۵ پرائمری ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوشن اور ۸۵ ٹیچرز ٹریننگ یونٹ ہیں۔ ۱۹۷۴-۷۵ء میں ان سب اداروں میں توسیع کی گئی تاکہ تربیت یافتہ اساتذہ کی بڑھتی ہوئی ضرورت پوری کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ اساتذہ کو تربیت دی جا سکے۔ اس کے لئے کئی تدریجی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ ان کے تحت نارمل اسکولوں کو سائنس ٹیچروں کی تربیت کے لئے کالج کا درجہ دیا جا رہا ہے، ٹریننگ کالجوں میں سائنس کی تعلیم اور تعلیمی تحقیق کی سہولتیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ ملازمت کے دوران اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیا جا رہا ہے اور یونیورسٹیوں کو ترقیاتی امداد دی جا رہی ہے۔

تیزی سے پھیلتے ہوئے نظام تعلیم کے لئے اساتذہ کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ثانوی اسکولوں اور عام کالجوں میں تعلیم کو مضمون کی حیثیت سے شامل کیا جا رہا ہے جو طلبا اس مضمون کے ساتھ میٹرک انٹرمیڈیٹ یا ڈگری امتحان پاس کریں گے انہیں بالترتیب پرائمری مڈل اور ہائی اسکولوں کے لئے مستند ٹیچر قرار دیا جائے گا۔

ملک میں اساتذہ کی تربیت کی موجودہ سہولتوں کا جائزہ لینے کے لئے کچھ عرصہ پہلے ماہروں کی جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی، اس نے سفارش کی ہے کہ اساتذہ کی تربیت کے لئے اس وقت ایک سال کا جو کورس رائج ہے اس کی جگہ تین سال کا ہمہ گیر کورس رائج کیا جائے۔

پیپلز اوپن یونیورسٹی

پیپلز اوپن یونیورسٹی ان لوگوں کو تعلیم دینے کے لئے قائم کی گئی ہے جو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گھر دفتر یا دکان نہیں چھوڑ سکتے۔ یونیورسٹی کا صدر مقام اسلام آباد میں اور علاقائی دفاتر ملک کے مختلف حصوں میں ہیں۔

سب سے پہلے یونیورسٹی نے فوری نوعیت کا پروگرام شروع کیا ہے اس کے تحت ابتدائی اسکول ٹیچروں کو تربیت دی جا رہی ہے ملازمت کرنے والے اساتذہ، تعلیمی کارکنوں اور سماجی کارکنوں کیلئے ریفرشر کورسیس کا اہتمام کیا جا رہا ہے تاکہ وہ بدلتے ہوئے معاشرے کے تقاضے پورے کر سکیں۔ یونیورسٹی عملی برقیات، ریاضی، غذا اور عربی، اردو اور انگریزی زبانوں کی تعلیم کے منتخب پروگرام بھی شروع کرنے والی ہے۔

نصاب اور نصابی کتابیں

نصاب اور نصابی کتابوں کا قومی بیورو ایک مرکزی تنظیم ہے جو ملک میں تعلیمی نصاب اور نصابی کتابوں کی اصلاح کرتی ہے۔ اس ادارے کی از سر نو تنظیم کی گئی ہے اور اسے مستحکم کر دیا گیا ہے تاکہ نصابوں کا برابر جائزہ لیا جاتا رہے اور تمام نصابوں کو جن میں ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کے نصاب بھی شامل ہیں [illegible] بنایا جائے تاکہ وہ تعلیم کے تمام مراحل پر جن میں فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم بھی شامل ہے پورے اتر سکیں اور وقتاً فوقتاً ان پر نظر ثانی بھی ہوتی رہے گی۔ یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ بنیادی تصورات کے مطالعہ اور مہارتوں کے حصول کو اہمیت دی جائے اور مشاہدے، دریافت، تجربے، عملی کام اور تخلیقی اظہار کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال رکھا جا رہا ہے کہ طلبا پر ضرورت سے زیادہ بوجھ نہ پڑے۔

نصاب کے بارے میں بنیادی تحقیق کی سہولتیں پیدا کرنے کے لئے مختلف مضامین اور خاص خاص مطالعے صوبوں کے حوالہ کئے گئے ہیں اور انہوں نے مختلف مضامین میں نصاب کے مسودے تیار کرنے کے سلسلے میں نمایاں کام کیا ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کے میدان میں انٹرمیڈیٹ اور سیکنڈری ایجوکیشن کے بورڈوں نے اعلیٰ ثانوی درجوں کی تعلیم کے لئے ایک عارضی اسکیم تیار کی ہے ان میں سے کچھ بورڈوں نے حیاتیات، ریاضی، اردو، جغرافیہ اور معاشیات میں نظر ثانی شدہ کورس رائج کئے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی سطح پر مذہبی تعلیم کے نصاب میں تبدیلیاں تجویز کرنے کے لئے اعلیٰ سطح کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک کے لئے اسلامیات کا نصاب علماء کے ایک گروپ نے تیار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں تیسری جماعت سے دسویں جماعت تک نصاب کی کتابیں مصنفوں اور نظر ثانی کرنے والے ماہروں کے ایک گروپ نے تیار کی ہیں۔ جو علماء کے گروپ کے تجویز کئے ہوئے نصاب کے مطابق لکھی گئی ہیں۔ ثانوی درجہ کے طلبا کو تعلیم دینے کے سلسلہ میں اساتذہ کو رہنما کتابیں دی گئی ہیں نصابی کتابوں کے مختلف بورڈوں نے جو نصابی کتابیں تیار کی ہیں قومی جائزہ کمیٹی ان میں سے پہلی سے پانچویں جماعت تک کے لئے تیار کی ہوئی کتابوں کا جائزہ لے چکی ہے اس سال جو نصابی کتابیں پانچویں چھٹی اور نویں جماعتوں کے لئے تیار کی جائیں گی انہیں ۷۷-۱۹۷۶ء کے تعلیمی سال میں کورس میں لگانے سے پہلے ان کا جائزہ مکمل کر لیا جائے گا۔

کتابوں کے مسودوں کا جائزہ لیتے ہوئے کمیٹی اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ ان میں نظریہ پاکستان کے بارے میں کافی مواد شامل کیا گیا ہے اور پورے ملک کیلئے نصابی کتابوں میں جو مواد پیش کیا جا رہا ہے اس میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

طلبا کی بہبود اور وظائف

طلباء کی بہبود اور ان میں وظائف دینے کے لئے کئی اسکیموں پر عملدرآمد کیا گیا ہے جن میں مندرجہ ذیل اسکیمیں بھی شامل ہیں۔

اُجالے کا سفر

دارالحکومت اسلام آباد میں جدید طرز کا پرائمری اسکول

قبائلی بچے سبق یاد کر رہے ہیں

بلوچستان کے دور افتادہ علاقے میں ایک ہائی اسکول

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ایک گوشہ

فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور میں نرسنگ کلاس کی طالبات

کراچی یونیورسٹی کی طالبات لائبریری سے نکل رہی ہیں

گورنمنٹ کالج راولپنڈی کی طالبات لیبارٹری میں

پنجاب یونیورسٹی کا شعبۂ کیمیکل ٹیکنالوجی

خیبر میڈیکل کالج (پشاور)

(ا) طلبا کے لئے قرضے

وزارت تعلیم نے تین سال کے عرصے میں طلبا کو چھ کروڑ روپے بلاسود قرضے دینے کی اسکیم تیار کی اور منصوبہ بندی ڈویژن کو پیش کی۔ اس امید پر کہ یہ اسکیم منظور کرلی جائے گی پاکستانی یونیورسٹیوں کو ۲۵ لاکھ روپیہ دیا گیا تاکہ طلبا کو قرضے دینے کے لئے ہر یونیورسٹی میں فنڈ قائم کیا جائے۔

(ب) طلبا کے مطالعاتی دورے

طلبا کے مطالعاتی دوروں کے لئے ماضی میں بھی بجٹ میں رقمیں مخصوص کی جاتی رہی ہیں۔ ایسے دوروں کی قومی اہمیت کے پیش نظر وزارت تعلیم نے تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کو جن میں قبائلی علاقوں، شمالی علاقوں آزاد جموں وکشمیر اور کچھ دوسرے علاقوں کے کالج بھی شامل ہیں گرانٹ دی ہے تاکہ ان اداروں کے طلبا پاکستان کے اندر مطالعاتی دوروں پر جا سکیں۔

(ج) ایک ہزار صدارتی وظائف

وزارتِ تعلیم میں ایک ہزار صدارتی وظائف کی اسکیم تیار کی گئی اس کے تحت ۱۹۷۵ء تک ۵۸ لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ خرچ کیا جائے گا اور ہر سال نادار لیکن ہونہار طلبا کو ایک ہزار مزید وظائف دیئے جائیں گے۔

(د) نشان حیدر وظائف

حکومت ہر سال نشان حیدر کے نام سے ان طلبا کو وظائف دیتی ہے جو ہر بورڈ کے امتحان میں پہلی دو پوزیشنیں حاصل کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا وظائف کے علاوہ نیشنل بینک آف پاکستان نے برطانیہ میں تعلیم پانے والے طلبا کے لئے غیر ملکی زرمبادلہ کی شکل میں ۱۴ لاکھ روپے کے ۱۵۰ بلاسود قرضے منظور کئے ہیں۔

کھیل

پاکستان اسپورٹس بورڈ وزارت تعلیم کا ایک ادارہ ہے جو پاکستان میں مختلف کھیلوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ان کے انتظامات پر کنٹرول کرتا ہے۔ یہ ادارہ مختلف کھیلوں کی قومی تنظیموں کو مجموعی طور پر ۱۱،۷۵،۴۴،۳۰۰ روپے دیتا ہے تاکہ یہ تنظیمیں اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔

حکومت نے کھیلوں کا شوق پھیلانے کے لئے کھیلوں کا قومی ٹرسٹ بھی قائم کیا ہے۔ ٹرسٹ کا پروگرام یہ ہے کہ صوبائی صدر مقامات پر اسپورٹس کمپلیکس تعمیر کئے جائیں۔ اس کے بعد اہم شہروں میں چھوٹے سپورٹس کمپلیکس بنائے جائیں۔ اس مقصد کے لئے ٹرسٹ کو ابتدائی طور پر ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ دیا گیا ہے۔ یہ رقم وفاقی اور صوبائی حکومتوں سرکاری اور خود مختار اداروں کی طرف سے چندے کی شکل میں حاصل ہوئی ہے۔

آرٹ اور کلچر

وزارتِ تعلیم نے بیرونی ملکوں کے ساتھ ثقافتی تعلقات بڑھانے کے لئے بہت سے اقدامات کئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے پچھلے چند سالوں میں پاکستان اور دوسرے ملکوں کے درمیان متعدد ثقافتی سمجھوتے ہوئے ہیں۔ ان سمجھوتوں پر عملدرآمد میں سہولت پیدا کرنے کے لئے نیشنل کونسل آف دی آرٹس قائم کی گئی ہے۔ کونسل نے پاکستانی طریق زندگی اور روایات کو دوسروں کے سامنے پیش کرکے پاکستان کے بارے میں بہتر تاثر قائم کرنے کے سلسلہ میں کئی پروگرام شروع کئے ہیں۔ پاکستان کی نیشنل کونسل آف دی آرٹس نمائشیں کراتی ہے اور ثقافتی معاہدوں کے تحت جو غیر ملکی ثقافتی طائفے آتے ہیں ملک میں ان کے دوروں کا بندوبست کرتی ہے، نیز ثقافتی طائفے باہر بھیجنے میں وزارتِ تعلیم کی مدد کرتی

ہے۔ کونسل مصوری اور گرافک آرٹ کی نمائشوں کا بھی انتظام کرتی ہے اور ملک میں مختلف یادگاری دنوں پر تقریبات کا بھی اہتمام کرتی ہے۔

مردم شماری اور اسکولوں کے اعداد و شمار

پاکستان میں پچھلی مردم شماری ۱۹۷۲ء میں ہوئی تھی۔ اس کے سوالنامے میں دوسری باتوں کے علاوہ لوگوں کی خواندگی کی بارے میں بھی معلومات مانگی گئی تھیں۔ ابھی تک ۱۹۷۲ء کی مردم شماری کے مکمل اعداد و شمار شائع نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے ۱۹۶۲ء کی مردم شماری کے مطابق پانچ سال اور اس سے زیادہ عمر کی ۳۰.۱۶ فیصد آبادی خواندہ تھی۔ اس وقت خواندگی کا مجموعی تناسب ۴۵ لاکھ تھا۔

حکومت نے ملک سے ناخواندگی ختم کرنے کے لئے ۱۹۷۲ء میں تعلیمی پالیسی بنائی۔ اس پالیسی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ۱۹۷۹-۸۰ء تک تمام لڑکوں کے لئے اور ۱۹۸۴-۸۵ء تک تمام لڑکیوں کے لئے پرائمری تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ تعلیمی پالیسی کے تحت تعلیم بالغاں اور بالغوں کی خواندگی کے وسیع پروگرام مرتب کئے گئے ہیں۔ ان پروگراموں کی ابتدا ہو چکی ہے ٭

پاکستان میں زراعت کی ترقی

پاکستان کی معیشت میں زراعت کی ترقی کو بڑا اہم مقام حاصل ہے حقیقت یہ ہے کہ دیہات میں رہنے والی ۸۰ فیصد آبادی کی بہبود اور بحیثیت مجموعی پوری معیشت کی ترقی بڑی حد تک زراعت کی ترقی پر منحصر ہے۔

پیپلز پارٹی نے اس تہیہ کے ساتھ اقتدار سنبھالا کہ وہ اس ظالمانہ اور غیر منصفانہ زرعی نظام کو بدل دے گی جس کے تحت کسان صدیوں سے خاموشی کے ساتھ ظلم اور زیادتی برداشت کرتا آیا ہے۔ وزیراعظم بھٹو کے الفاظ کے مطابق "پارٹی جاگیرداری کی لعنت اور زمین پر انسان کی ظالمانہ بالادستی کو ختم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے"۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد تین مہینے کے اندر وزیراعظم نے وسیع زرعی اصلاحات کا اعلان کیا تاکہ کسان نئی زندگی شروع کر سکیں۔ وزیراعظم نے اس اعتماد کا اظہار کیا کہ "کسانوں کو جو انقلابی مراعات دی گئی ہیں ان سے ان پر معاشی بہتری کے دروازے کھل جائیں گے"۔

ان زرعی اصلاحات کی بدولت ۸ء۹۲ لاکھ ایکڑ زرعی زمین حاصل کی گئی ہے اس میں سے ۴ء۳۲ لاکھ ایکڑ زمین ۵۲۴۵۸ کاشتکاروں میں تقسیم کر دی گئی ہے، ۷۰۰۰ بے زمین کاشتکاروں کو زمین دے کر انہیں اس کا مالک بنا دیا گیا ہے۔

لیکن چھوٹے کاشتکار زرعی اصلاحات کے بعد بھی مالیہ اور دوسرے ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اس بوجھ کو کم کرنے کے لئے وزیراعظم نے ۱۰ نومبر ۱۹۷۵ء کو بڑے پیمانے پر مالیہ کی معافی کا اعلان کیا اس سے چاروں صوبوں میں ۷۵ لاکھ سے زیادہ چھوٹے چھوٹے زمین کے مالکوں کو فائدہ پہنچے گا۔

ان میں سے ۵۰ لاکھ پنجاب میں، ۱۷ لاکھ صوبہ سرحد میں، ۷ لاکھ سے زیادہ سندھ میں اور ۲½ لاکھ سے زیادہ بلوچستان میں ہیں۔

مالیہ میں معافی کی خاص خاص باتیں یہ ہیں۔

۱۔ ۱۲ ایکڑ تک نہری یا ۲۵ ایکڑ تک بارانی زمین کا مالیہ لوکل ریٹ، ترقیاتی ٹیکس اور مالیہ سے متعلق تمام ٹیکس ربیع ۷۶-۱۹۷۵ء سے بالکل معاف کر دیئے گئے ہیں۔

۲۔ اس رعایت سے ملک کے ۸۵ فیصد سے زیادہ کاشتکاروں کو فائدہ پہنچے گا۔

۳۔ ۲۵ ایکڑ سے زائد نہری اور ۵۰ ایکڑ سے زائد بارانی زمین کے مالکوں کے مالیے لوکل ریٹ اور دوسرے ٹیکسوں میں ۵۰ فیصد اضافہ کر دیا گیا ہے۔

۴۔ ۵۰ ایکڑ سے زائد نہری زمین یا ۱۰۰ ایکڑ سے زائد بارانی زمین کے مالکوں کے مالیے وغیرہ میں سو فیصد اضافہ کر دیا گیا ہے۔

۵ ۔ جن زمینداروں سے انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے ان کا انکم ٹیکس بڑھے ہوئے مالیہ کے حساب سے تشخیص کیا جائے گا۔

۶ ۔ زمینداروں کی ملکیت اور ان کی زمین کے مالیہ کی تشخیص کی تاریخ ۱۰ نومبر ۱۹۷۵ء مقرر کی گئی ہے۔

وزیراعظم نے واضح ہدایت جاری کی ہے کہ تمام صوبے اس اسکیم پر عمل درآمد اور بڑھتے ہوئے مالیے کی ادائیگی سے گریز کی روک تھام کے لئے ایسا نظام قائم کریں جو خامیوں سے پاک ہو۔

حکومت نے دیہی معیشت کی بحالی کے لئے جس پر صدیوں سے کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی ایک جامع پروگرام تیار کیا ہے۔

حکومت نے پیپلز ورکس اور مربوط دیہی ترقی کے جو پروگرام شروع کئے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ کیا جائے اور دیہات کے باشندوں کی زندگی بہتر بنائی جائے۔

سالانہ پروگرام کیلئے رقموں کی تخصیص

۱۹۷۵ ۔ ۷۶ء کا سالانہ منصوبہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے کہ غلہ خاص طور پر گندم کی پیداوار بڑھائی جائے تاکہ ملک غلہ کے معاملہ میں جلد از جلد خود کفیل ہو سکے۔ ساتھ ہی ساتھ غذائی سطح بڑھانے کے لئے لحمیات گوشت والے مویشیوں اور مرغیوں کی افزائش کی حوصلہ افزائی کے لئے بھی مناسب رقمیں رکھی گئی ہیں۔ کپاس، باسمتی اور اری چاول وغیرہ کی پیداوار بڑھانے پر بھی زور دیا گیا ہے تاکہ ایک طرف تو ملکی ضروریات پوری کی جا سکیں اور دوسری طرف برآمدات سے حاصل ہونے والی آمدنی میں اضافہ کیا جا سکے۔ ایسی پالیسی اختیار کی گئی ہے کہ کسانوں کو کیمیاوی کھاد، اچھی قسم کا بیج، کیڑے مار دوائیں وغیرہ وافر مقدار میں مہیا کی جا رہی ہیں۔ دوسری طرف زرعی پیداوار کی ایسی قیمتیں رکھی گئی ہیں جن سے کاشت کاروں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

سیم اور تھور پر قابو پانے، تربیلا بند کو مکمل کرنے (توقع ہے کہ اس بند سے ۱۹۷۵ء کی فصل ربیع کے لئے پچاس لاکھ ایکڑ فٹ اضافی پانی دستیاب ہوگا)، زیر زمین پانی کے وسیلوں کو کام میں لانے اور بجلی اور ٹرانسپورٹ کی ترقی کے منصوبوں کے لئے بھی بڑی بڑی رقمیں رکھی گئی ہیں۔ ان شعبوں میں ترقی کا زراعت کی ترقی پر براہ راست اثر پڑے گا۔ بارانی علاقے کے لئے خاص ٹیکنالوجی سے جو اس علاقے کے لئے موزوں ہے کام لینے کے پروگرام پر ۱۹۷۳ ۔ ۷۴ء سے عملدرآمد ہو رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بارانی علاقے کی زرعی پیداوار میں نمایاں اضافہ کیا جا سکتا ہے اس علاقے کے لئے خاص قسم کا بیج تیار کیا گیا ہے۔ اسے کاشت کاروں میں مقبول بنانے کے لئے بڑے پیمانے پر نمائشی پلاٹ تیار کئے جائیں گے۔ امداد باہمی کی بنیاد پر کاشت کا پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ جس پر موجودہ سال کے دوران عملدرآمد ہوگا۔ توقع ہے کہ اس کی بدولت فی یونٹ پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ اور اس طرح دیہات کے باشندوں خاص طور پر چھوٹے زمینداروں کی معاشرتی اور معاشی حالت بہتر ہو جائے گی۔

۱۹۷۵ ۔ ۷۶ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں زراعت کی مد میں جو رقم رکھی گئی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ مذکورہ بالا لائحہ عمل اختیار کیا جا سکے۔ توقع ہے کہ اس سے زرعی ترقی کی رفتار میں ۱۹۷۴ ۔ ۷۵ء کے مقابلہ میں ۲۲ فیصد اضافہ ہوگا۔ کیمیاوی کھاد، کیڑے مار دواؤں، اچھے بیج اور زمین کو ٹھیک ٹھاک کرنے والی مشینوں کے لئے جو رقم رکھی گئی ہے وہ موجودہ سال کے مقابلہ میں ۳۳ فیصد زائد ہے۔ مچھلیوں اور مویشیوں کی افزائش کے لئے موجودہ سال کے مقابلہ میں ۱۲ فیصد زائد رقم رکھی گئی ہے۔ اسی طرح زرعی اداروں اور اندرونی انتظام کے لئے بھی پہلے سے زائد رقم رکھی گئی ہے۔

۱۹۷۵ ۔ ۷۶ء کے لئے کیمیاوی کھاد کے استعمال کا ہدف پانچ سو ۵۰ ہزار ٹن مقرر کیا گیا ہے جبکہ ۱۹۷۴ ۔ ۷۵ء میں یہ ہدف چار سو ۲۵ ہزار ٹن تھا۔ ۱۹۷۵ ۔ ۷۶ء میں ۹۵ لاکھ ایکڑ رقبے پر کیڑے مار دوائیں چھڑکی جائیں گی اس سے ۴۹۹,۰۰۰ ایکڑ رقبے پر زمین سے اور باقی رقبے پر ہوائی جہاز سے دوائیں چھڑکی جائیں گی ۱۹۷۴ ۔ ۷۵ء میں ۷۵ لاکھ ۳۰ ہزار ایکڑ رقبے پر کیڑے مار دوائیں چھڑکی گئیں اس میں سے ۴۶ لاکھ ۱۰ ہزار ایکڑ رقبے پر زمین سے اور ۲۹ لاکھ ۲۰ ہزار ایکڑ پر ہوائی جہاز سے دوائیں چھڑکی گئیں۔ اس طرح کیڑوں وغیرہ سے محفوظ کئے جانے والے رقبے میں ۲۶ فیصد اضافہ ہوا۔

ایگریکلچرل یونیورسٹی (پشاور)

کاشت کاروں کو موقع پر ہی قرضے دیئے جا رہے ہیں

مشینی آلات سے گندم کاٹا جارہا ہے

زراعت کے لئے ایک نیا ٹیوب ویل

مشینوں کے ذریعے بھوسے سے الگ کیا ہوا
گندم ٹرالی پر لادا جارہا ہے

گلگت کا ایک جفاکش کسان ہل چلا رہا ہے

ایک خوش دل کسان اپنی فصل بیل گاڑی پر لے جا رہا ہے

پنجاب میں ٹریکٹروں کا استعمال عام ہو رہا ہے۔

دھان پھیڑے جا رہے ہیں

پنجاب کے جواں ہمت کسان فصل کاٹ رہے ہیں

گیہوں کی خریداری کی سرکاری قیمت خرید جو ۱۹۷۳-۷۴ء کی فصل کے لئے ۲۵ روپیہ ۵۰ پیسے فی من تھی۔ ۱۹۷۴-۷۵ء کی فصل کے لئے ۳۷ روپیہ فی من مقرر کی گئی، ۱۹۷۴-۷۵ء میں چاول اور گنے کی مختلف قسموں کی سرکاری قیمت خرید میں وقتاً فوقتاً اضافہ کیا جاتا رہا ہے۔

حکومت نے غلہ کی قیمتوں میں استحکام پیدا کرنے کی جو پالیسی اختیار کی ہے اس پر عملدرآمد اور ملک سے باہر بھیجے جانے والے غلہ کا ذخیرہ رکھنے کے لئے سرکاری گوداموں کی ضرورت ہے، جون ۱۹۷۵ء کے آخر تک سرکاری گوداموں کی مجموعی گنجائش قریباً ۱۶ لاکھ ۴۵ ہزار ٹن تھی ۱۹۷۵-۷۶ء کے دوران اس گنجائش میں ۳ لاکھ ۳۵ ہزار ٹن کا اضافہ کیا جائے گا کچھ فالتو گودام بن چکے ہیں، کچھ اور گودام بنائے جا رہے ہیں۔

جون ۱۹۷۳ء میں ۱۰ کروڑ روپیہ کے سرمایہ سے پاکستان اگریکلچرل اسٹوریج اینڈ سروسز کارپوریشن قائم کی گئی تھی۔

مالی تخصیص

۱۹۷۵-۷۶ء میں زراعت کے لئے ۱۲۲۵٫۲ ملین روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے، ۱۹۷۴-۷۵ء کے دوران اس مد میں ۹۹۷٫۹ ملین روپے کی رقم رکھی گئی تھی۔ موجودہ سال کی رقم پچھلے سال کی رقم سے ۲۳ فیصد زائد ہے۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۷۴-۷۵ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں زراعت کے لئے ۹۹۷٫۹۰ ملین روپے کی جو رقم مخصوص کی گئی تھی وہ سب کی سب استعمال کر لی گئی ہے۔

زرعی بستیوں کا ترقیاتی پروگرام

پاکستان پیپلز پارٹی نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ "چھوٹے چھوٹے قصبے بسائیں جائیں گے جن کا آس پاس کے دیہات سے قریبی رابطہ ہوگا۔ شروع میں ایسے ۲۰۰ قصبوں کی ضرورت ہوگی جو زرعی بستیاں کہلائیں گی۔"

پس منظر

پاکستان کی قریباً پچھتر فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے اور وہ ان سہولتوں سے محروم ہے جو شہریوں کو حاصل ہیں۔ دیہات کے باشندوں کی امنگوں میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ وہ اپنے لئے پہلے سے بہتر مواقع کے خواہش مند ہیں۔ دوسری طرف دیہات بہت پسماندہ ہیں ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دیہات کے لوگ شہروں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اس منتقلی سے اس افرادی طاقت میں برابر کمی ہو رہی ہے جو زراعت کے لئے درکار ہے۔ دیہات کی افرادی طاقت کو منفعت بخش طریقے سے کام پر لگانے کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے اور اپنا یہ وعدہ پورا کرنے کے لئے کہ ملک میں مساوات کی بنیاد پر معاشرہ قائم کیا جائے گا عوامی حکومت نے ۱۹۷۲ء میں زرعی بستیوں کی ترقی کا پروگرام شروع کیا۔

۲۰۰۰ء کیلئے کئے ہوئے تخمینہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ صدی کے آخر تک آبادی میں اضافہ کی موجودہ رفتار سے پاکستان کی آبادی ۱۴ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ ان میں سے کوئی ۸ کروڑ ۶۰ لاکھ نفوس یعنی ۶۶ فیصد آبادی شہروں میں آباد ہوگی۔ موجودہ شہروں کو سامنے رکھتے ہوئے بھی اس وقت کراچی کے برابر ۲۰ شہروں کی لاہور کے برابر ۳۰ شہروں کی اور کوئٹہ کے برابر ۴۶۴ شہروں کی ضرورت ہوگی، تاکہ شہری آبادی میں اس اضافہ کو کھپایا جا سکے۔ ملک کے محدود معاشی اور فنی ذرائع کے پیش نظر یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔

اس وقت ملک کے بڑے بڑے شہروں میں ایسے ہزار ہا لوگ دیہات سے آ گئے ہیں جو بے روزگار ہیں اور جنہوں نے کسی کام کی تربیت بھی حاصل نہیں کی۔ جو شہری ادارے چھوٹے شہروں کی محدود ضرورتیں پوری کرنے کے لئے قائم کئے گئے تھے۔ وہ دیہات سے آبادی کی منتقلی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شہروں میں جگہ جگہ گندی بستیاں قائم ہو گئی ہیں۔ شہروں میں ہر جگہ بھیڑ بھاڑ ہو گئی ہے۔ میونسپلٹی کی سہولتیں ناکافی ہو کر رہ گئی ہیں اور بہت سے دوسرے مسئلے پیدا ہو گئے ہیں۔ بڑے شہروں کو آبادی میں ضرورت سے زیادہ اضافہ سے بچانے اور آبادی کو مربوط طریقے پر اس طرح بسانے کے لئے کہ کسی کو دشواری پیش نہ آئے مناسب اقدامات کی ضرورت ہے۔ زرعی بستیاں بسانے کا منصوبہ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔

وسیع معنی میں زرعی بستیاں شہروں اور دیہات کے درمیان رابطہ کی بستیاں ہیں جو ترجیحی طور پر دیہی علاقوں میں بسائی جا رہی ہیں۔ ان بستیوں کا منصوبہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہاں کے رہنے والوں کو متوازن حد تک ضروری پبلک خدمات اور معاشرتی اور ثقافتی سہولتیں میسر آ سکیں۔ زرعی بستیوں میں ترقیاتی سرگرمیوں کا مقصد یہ رکھا گیا ہے کہ ان سے آس پاس کے دیہات کو فائدہ پہنچے، ان کے لئے روزگار کے مواقع فراہم ہوں، زرعی پیداوار منڈیوں میں لانے، اشیائے صرف کی فراہمی،

زراعت پر انحصار کرنے والی صنعتیں قائم کرنے، تعلیم، صحت، پانی کی فراہمی اور مواصلات کی سہولتیں حاصل ہوں۔ زرعی بستیوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ شہروں کی آبادی میں بے تحاشا اضافے کو روکا جائے اور دیہات کی ایسی آبادی کو جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ مفید کاموں میں کھپایا جا سکے۔ مختصراً زرعی بستیاں بسانے سے حسب ذیل مقاصد حاصل ہو سکیں گے۔

(ا) ملک میں شہروں کے پھیلاؤ میں باقاعدگی پیدا کرنا۔

(ب) دیہات کے باشندوں کی شہروں میں منتقلی کے رجحان کو رفتہ رفتہ ختم کرنا۔

(ج) فالتو کھیت مزدوروں کے لئے روزگار فراہم کرنا اور

(د) دیہات کی آبادی کو ان کے علاقے میں شہری سہولتیں فراہم کرنا۔

زرعی بستیاں ایسے مقامات پر بسائی جائیں گی جن میں ترقی کی صلاحیت ہو اور جو معاشی طور پر نئی بستی کا بوجھ برداشت کر سکیں۔ ان بستیوں کے لئے تین قسم کے مقامات پر غور کیا گیا (۱) بالکل نئے مقامات (۲) چھوٹے چھوٹے گاؤں اور (۳) مربوط دیہی ترقی کے مرکز۔ اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے غور کیا گیا۔ یہ سوال زیرِ بحث آیا کہ زرعی بستیاں بالکل نئے مقامات پر بسائی گئیں یا چھوٹے گاؤں کو پوری بستی کا درجہ دے دیا گیا تو کیا آبادی کی تعداد اور بھاری اخراجات کے پیش نظر ایسی بستیاں معاشی طور پر پھول پھل سکیں گی۔ اور اپنی ضرورتیں پوری کر سکیں گی۔ کافی غور و خوض کے بعد اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ صرف موجود چھوٹے چھوٹے قصبے اور مربوط دیہی ترقی کے مرکز جو ترقی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تھوڑی بہت امداد کے ذریعہ معاشی طور پر ترقی پذیر زرعی بستیاں بن سکتے ہیں۔ زرعی بستی کے لئے جگہ صوبائی حکومت تجویز کرتی ہے اور علاقائی حالات کا تفصیلی جائزہ لینے اور اسکیم کے قابلِ عمل ہونے کا اطمینان کرنے کے بعد ماحول اور شہری معاملات کی ڈویژن کے مشورہ سے جگہ کا قطعی انتخاب کیا جاتا ہے۔

کتنا کام ہو چکا ہے

زرعی بستیوں کی ترقی کا پروگرام ۱۹۷۲ء میں شروع کیا گیا تھا چونکہ یہ بالکل نیا پروگرام تھا۔ اس لئے پہلے چھ مہینے اس کے تصور کو واضح کرنے، اس کے لئے سرمایہ فراہم کرنے اور وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تعاون کے طریقے طے کرنے میں صرف ہو گئے۔ پھر صوبائی حکومتوں سے کہا گیا کہ وہ ایسی جگہیں تجویز کریں۔ جہاں زرعی بستیاں بسائی جا سکیں۔

صوبائی حکومتوں نے درج ذیل مقامات تجویز کئے:

پنجاب

(ا) ست راہ ضلع سیالکوٹ

(ب) بھگتاں والا ضلع سرگودھا

(ج) دوتنارہ ضلع راولپنڈی

(د) دھراں والا ضلع بہاولنگر

(ہ) لار ضلع ملتان

صوبہ سرحد

(ا) پبی پشاور

(ب) ٹوپی ضلع مردان

(ج) ٹل ضلع بنوں

(د) تاجوزئی ضلع بنوں

(ہ) درہ بند ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان

(و) بفہ ضلع ہزارہ

سندھ

(ا) بدین ضلع حیدرآباد

(ب) میرو خاں ضلع لاڑکانہ

(ج) گڑھی خیرو ضلع جیکب آباد

بلوچستان

(ا) ٹمپل ڈیرہ ضلع کچھی
(ب) کوہلو، مری بگٹی ایجنسی
(ج) ڈیرہ بگٹی، مری بگٹی ایجنسی
(د) کاہان، مری بگٹی ایجنسی
(ہ) میوند، مری بگٹی ایجنسی
(و) ڈدکی
(ز) گدر/ سوراب ویلی

آزاد کشمیر

(ا) اٹھ مقام ضلع مظفر آباد
(ب) راولاکوٹ ضلع پونچھ
(ج) کوٹلی اور چھمب ضلع میرپور

پھر ان جگہوں کے کارآمد ہونے کا جائزہ شروع کیا گیا تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ وہاں زرعی بستیاں بسانا مفید ہوگا یا نہیں۔ اس مقصد کے لئے ماحول اور شہری معاملات کے ڈویژن کے ماہرین کی جماعتوں نے مختلف صوبوں میں جاکر بہت سی جگہوں کے کارآمد ہونے کا جائزہ لیا۔ اس جائزے کی بنیاد پر آٹھ جگہیں زرعی بستیوں کیلئے قطعی طور پر منتخب کرلی گئیں۔

حکومت پنجاب کی درخواست پر ماحول اور شہری معاملات کی ڈویژن کی ٹیکنیکل ٹیم ضلع سرگودھا گئی جہاں اس نے ھگتان والا میں زرعی بستی بسانے کی اسکیم کے کارآمد ہونے کا جائزہ لینے میں صوبائی عملے کی مدد کی۔ باقی اسکیموں کے جائزے حکومت پنجاب کا ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ کا محکمہ خود مکمل کرے گا۔

مزید مطالعہ اور زرعی بستیوں کے ماسٹر پلان تیار کرنے کے لئے ماحول اور شہری معاملات کی ڈویژن نے مشیروں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ اس کے بعد صوبائی حکومتیں تفصیلی اسکیمیں تیار کریں گی اور متعلقہ حکام سے ان کی منظوری لیں گی۔ اس مقصد کے لئے ماحول اور شہری معاملات کی ڈویژن نے دس لاکھ روپیہ ان مشیروں کے حوالے کیا ہے۔

۷۶ - ۱۹۷۵ء کا پروگرام

۷۶ - ۱۹۷۵ء میں منتخب جگہوں کے لئے زرعی بستیوں کے ماسٹر پلان تیار کئے ہیں گے۔ ۷۶ - ۱۹۷۵ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام کے بجٹ میں زرعی بستیوں کے پروگرام کے لئے ۱۲ء۷۵ لاکھ کی رقم رکھی گئی ہے۔ اس رقم میں سے زرعی بستیوں کے ماسٹر پلان تیار کرنے کے سلسلہ میں مشیروں کے بقایاجات ادا کئے جائیں گے اور صوبائی حکومتوں نے جو مزید جگہیں تجویز کی ہیں ان کے قابل عمل ہونے کا جائزہ لیا جائے گا۔

وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے مالی امداد

زرعی بستیوں کے منصوبے کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس میں وفاقی اور صوبائی حکومتیں اور پرائیویٹ سیکٹر سرگرمی سے حصہ لیں۔ پروگرام کے ابتدائی مرحلے میں ضروری امداد کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ وفاقی حکومت ہر زرعی بستی کی بنیادی ضروریات اور ٹاؤن ہال کے مجموعی اخراجات کا پچاس فیصد حصہ برداشت کرے گی۔ باقی خرچ صوبائی حکومتیں اٹھائیں گی۔ اس سلسلے میں وفاقی حکومت نے سندھ میں بدین کی زرعی بستی کے لئے اپنے حصّہ کا ۲۵ لاکھ روپیہ ادا کر دیا ہے۔

اس پروگرام پر عملدرآمد کے لئے ماحول اور شہری معاملات کی ڈویژن صوبوں کو بھرپور فنی امداد دے رہی ہے۔ اس سلسلے میں ڈویژن کے ماہرین نے صوبوں کی تجویز کی ہوئی جگہوں کے کارآمد ہونے کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ زرعی بستیوں کے ماسٹر پلان تیار کرنے کا پورا خرچ بھی وفاقی حکومت ہی اٹھا رہی ہے۔

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام

دیہات کے باشندوں کے معاشرتی اور معاشی حالات سدھارنے کے مسئلے پر یکے بعد دیگرے پاکستان کی ہر حکومت نے توجہ دی ہے اس مقصد کے لئے دیہی ترقی کے کئی پروگرام شروع کئے گئے۔ اس سلسلے میں ویلیج ایڈ، بنیادی جمہوریتیں اور دیہی تعمیر کے پروگرام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان پروگراموں کی کامیابی محدود تھی اس لئے کہ ان میں ایک ہی پہلو پر توجہ دی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ تمام پروگرام ترک کر دیئے گئے۔ عوامی حکومت دیہات کے باشندوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے اس لئے اس نے اقتدار سنبھالتے ہی مربوط دیہی ترقی کا پروگرام شروع کیا۔ پروگرام کا مقصد یہ رکھا گیا کہ دیہات کے باشندوں کی معاشرتی اور معاشی ترقی کے مسائل بہ حیثیت مجموعی حل کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ ان کی زندگی پہلے سے بہتر اور بامقصد بن جائے۔

جب جولائی ۱۹۷۲ء میں یہ پروگرام شروع کیا گیا تھا تو اس وقت کے صدر مملکت (موجودہ وزیر اعظم) نے اس کی اہمیت ان الفاظ میں واضح کی تھی۔

"غالباً مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام چھوٹے چھوٹے کسانوں کی اکثریت کی معاشی حالت سدھارنے، دیہات میں زندگی کو عام طور پر بہتر بنانے روزگار کے مواقع فراہم کرنے اور دیہات اور شہروں کا فرق کم کرنے کی آخری امید ہے۔ اس طرح دیہات کے باشندے بھی ملک کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی میں اپنے شہری بھائیوں کے شانہ بہ شانہ فخر کے ساتھ بھرپور حصہ لے سکیں گے۔"

پروگرام کا تصوّر

پروگرام کا تصوّر لاہور کے قریب شاداب پائلٹ پراجیکٹ میں حاصل ہونے والے تجربے کی روشنی میں معرضِ وجود میں آیا۔ وہ تصور یہ ہے کہ پچاس، ساٹھ ایسے دیہات کا پیداواری رقبہ منتخب کر لیا جائے جہاں چھوٹے اور درمیانے درجے کے زمیندار رہتے ہوں۔ ان زمینداروں کی معاشرتی اور معاشی حیثیت بہتر بنانے کے لئے سب سے پہلے پیداوار بڑھانے پر زور دیا جائے اس مقصد کے لئے فنی طور پر ان کی رہنمائی کی جائے، قرضے دے کر ان کے استعمال کی نگرانی کی جائے۔ بیج، کھاد وغیرہ فراہم کئے جائیں، مشینیں کرایہ پر دی جائیں اور زرعی پیداوار کا ذخیرہ رکھنے اور اسے منڈی میں لانے

صحت کے نئے پروگرام

سعید خاں قمر

حکومت نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ملک کی ترقی کے لئے اچھے ذہن بڑے ضروری ہیں اور اچھے ذہنوں کے لئے ضروری ہے کہ عام صحت اچھی ہو صحت کا ایک ہمہ گیر پروگرام شروع کیا ہے جس کے تحت آئندہ پانچ سال کے عرصہ میں نہ صرف شہروں بلکہ دور دراز دیہات تک میں لوگوں کو علاج معالجے کی مناسب سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔

صحت کے پروگرام کی خاص خاص باتیں یہ ہیں۔ موجودہ ہسپتالوں سے پوری طرح کام لینے کے علاوہ صحت کے نئے یونٹوں اور نئے مرکزوں کی تعمیر ہر سطح پر صحت کے اداروں میں کام کرنے والوں کے لئے تعلیم و تربیت کی سہولتوں میں اضافہ، متعدی امراض کی روک تھام اور شہروں اور دیہات میں صحتِ عامہ کی بہتری۔

یہ مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں کہ ملک کے وسائل کی حدود میں رہ کر لمبی مدت کے لئے ہمہ گیر منصوبہ بندی کی جائے حکومت نے اس سلسلے میں ۳ طریقے سامنے رکھے ہیں۔ اول پیشہ ورانہ اور اعلیٰ تربیت یافتہ عملے کے ذریعے علاج معالجہ کا روایتی طریقہ، دوم ڈاکٹروں کی رہنمائی میں وسطی حیثیت کے عملہ کے ذریعہ علاج معالجہ اور تیسرے دیہاتی ہیلتھ ورکروں یا ہیلتھ گارڈوں کے ذریعہ صحت کے پروگرام پر عمل درآمد۔

پوری آبادی کے لئے علاج معالجہ کا مکمل انتظام بڑا مشکل کام ہے اور دنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ممالک بھی ابھی تک اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی مشترکہ کوششوں سے اس منزل کی طرف پیش قدمی کی جا رہی ہے۔

وفاقی حکومت نے ۷۶-۱۹۷۵ء کے سالانہ منصوبے میں صحت کے لئے ۴۶ کروڑ ۲۶ لاکھ ۲۳ ہزار اور آبادی کی منصوبہ بندی کے لئے ۱۸ کروڑ ۴۹ لاکھ ۹۰ ہزار روپیہ کی رقم رکھی ہے۔ یہ رقم ۷۵-۱۹۷۴ء کے نظرثانی شدہ تخمینے سے ۸۰ فیصد زائد ہے۔

۷۶-۱۹۷۵ء کے سالانہ پروگرام کے تحت صحت کے ۶۳ دیہی مرکز، ۱۱۴ بنیادی یونٹ اور ۲۳۵ شفاخانے کھولے جائیں گے۔ اس طرح دیہاتوں میں مجموعی طور پر صحت کے ۴۱۲ نئے یونٹ قائم کئے جائیں گے۔ توقع ہے ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک پانچ سال کی مدت میں ہر سال صحت کے ۷۰۰ نئے یونٹ اور مرکز مکمل ہوں گے حکومت دیہی ہیلتھ ورکروں اور ہیلتھ گارڈوں کی خدمات پر خاص توجہ دے رہی ہے۔ ان تمام کوششوں کی بدولت پندرہ فیصد سے بڑھ کر پچاس فیصد آبادی کے علاج معالجے کا بندوبست ہو جائے گا۔

ہیلتھ ورکروں یا ہیلتھ گارڈوں کی اسکیم اپنی نوعیت کی انوکھی

بلوچستان کے قبائلی علاقے کے ایک ہسپتال میں ٹیکے لگائے جارہے ہیں

بلوچستان کے قبائلی علاقے "کوہلو" میں ایک نو تعمیر ہسپتال

زیرتعمیر "میر عباس شہید ہسپتال" (کراچی)

"ڈاکٹر حضرات چاہے سرکاری ہسپتالوں میں ہوں یا
نجی شعبہ میں، انہیں چاہیئے کہ وہ ان منصوبوں کے فوائد کو
ان کے صحیح خدوخال میں سمجھیں اور ان میں متعین کئے گئے
مقاصد کے حصول کے لئے مل جل کر کام کریں۔"

وزیر اعظم — ۲۶ مارچ ۱۹۷۲ء

ایک سرکاری میڈیکل اسٹور میں مریضوں کو
مفت دوائیں تقسیم کی جا رہی ہیں۔

ایک ہسپتال میں خواتین کے وارڈ کا اندرونی منظر

ایک نرسنگ کلاس

اسکیم ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں اس اسکیم کے بڑے حوصلہ افزا نتائج نکلے ہیں، وہاں اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ ڈاکٹروں وغیرہ سے کام نہیں لیا گیا۔ گذشتہ سالوں کے نتائج کو دیکھتے ہوئے حکومت نے اس سال ۶۰ لاکھ روپیہ کی رقم بجٹ میں مخصوص کی ہے۔ اس میں سے چالیس لاکھ روپے صحت کے عام نظام پر اور ۲۰ لاکھ روپے صحت کے دیہی پروگرام پر خرچ کئے جائیں گے۔

ہیلتھ گارڈ چین کے "برہنہ پا ڈاکٹروں" کی طرح ہیں۔ یہ گارڈ ضرورت کے وقت علاج معالجے کے لئے ان دور دراز علاقوں میں پہنچتے ہیں جہاں صحت کی عام سہولتیں فراہم نہیں کی جاسکتیں۔

حکومت ڈاکٹروں کی تربیت پر پوری توجہ دے رہی ہے لیکن میٹرک کے بعد ایک طالب علم کو مستند ڈاکٹر بننے میں کم از کم سات سال لگتے ہیں اور ہر ڈاکٹر کی تربیت پر ۸۰ ہزار روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ میٹرک کے بعد نرس کی تربیت تین سال میں مکمل ہوتی ہے اور ہر نرس کی تربیت پر اوسطاً بیس ہزار روپے لاگت آتی ہے۔

ڈاکٹروں کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیشِ نظر وفاقی اور صوبائی حکومتیں زیادہ سے زیادہ میڈیکل کالج کھول رہی ہیں۔ ان کالجوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

نئے کالجوں کے قیام کے بعد اب ہر سال اندازاً ۱۲۰۰ ڈاکٹر، ۵۰ فزیوتھراپسٹ، دانتوں کے ۶۰ ڈاکٹر، ۵۰۰ نرسیں اور ۲۰۰ ہیلتھ وزیٹرز فارغ التحصیل ہو رہی ہیں۔

ملک میں ڈاکٹروں کی کمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بہت سے ڈاکٹر ملک چلے گئے ہیں یہی وجہ ہے۔ اب حکومت نے ڈاکٹروں کے ملک سے باہر جانے پر پابندی لگادی ہے۔ اب صرف حکومت پاکستان کے ساتھ کسی غیر ملکی حکومت کے معاہدے کی شکل ہی میں پاکستانی ڈاکٹر ملک سے باہر جاسکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی ملک جو ڈاکٹروں کی تربیت پر خطیر رقم خرچ کر رہا ہو، اس بات کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ ڈاکٹر ملک سے باہر چلے جائیں۔

صحت کے پروگرام کی کامیابی بڑی حد تک ملک کے اندر تیار ہونے والی دواؤں کی عمدگی پر بھی منحصر ہے۔ دواؤں کے جنرک ناموں کے رواج کا اب مفید نتیجہ برآمد ہونے لگا ہے۔ اب ملک میں نہ صرف سستی دوائیں تیار ہو رہی ہیں بلکہ ۹۵ فیصد دوائیں ملک کے اندر ہی بن رہی ہیں۔

حکومت اس بات کی کڑی نگرانی کر رہی ہے کہ غیر معیاری اور گھٹیا دوائیں نہ بنائی جائیں۔ ایسی دوائیں بنانے اور بیچنے والے افراد اور فرموں کو سزا دینے کے لئے سخت قوانین بنائے گئے ہیں۔

صحت کا کوئی پروگرام کتنا ہی ہمہ گیر کیوں نہ ہو وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک آبادی میں اضافہ کی شرح کو قابو میں نہ رکھا جائے۔ ۱۹۷۵ء کے وسط تک ملک کی آبادی ۷ کروڑ ۳ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ دوسری طرف شرح پیدائش ۴۵.۵ فی ہزار اور شرح اموات ۱۵.۵ فی ہزار تھی۔ ملک کی آبادی میں ۳ فیصد سالانہ کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر آبادی میں اسی شرح سے اضافہ ہوتا رہا تو ۱۹۸۰ء تک ملک کی آبادی اندازاً ۸ کروڑ ۱۴ لاکھ تک پہنچ جائے گی۔

شرح پیدائش پر قابو پانے کے لئے حکومت نے آبادی کی منصوبہ بندی کی اسکیم شروع کی ہے اور اس کیلئے ۱۹۷۵-۷۶ء کے بجٹ میں ۱۸ کروڑ ۴۹ لاکھ ۹۰ ہزار کی رقم مخصوص کی ہے جبکہ ۱۹۷۴-۷۵ میں یہ رقم ۱۴ کروڑ پچاس لاکھ تھی گویا پچھلے سال کے مقابلے میں ۳۱ فی صد اضافہ کیا گیا ہے۔

سیاحت

پاکستان میں بھی، سیاحت کی اہمیت کو نہ صرف زرِ مبادلہ کمانے کے ایک بڑے ذریعہ کے طور پر بلکہ ملک میں اتحاد و اتفاق اور بین الاقوامی مفاہمت کے آلۂ کار کی حیثیت سے پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے۔ سیاحت کو اب محض روپے کمانے کا کاروبار نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ پاکستان کے اندر اور باہر کہیں زیادہ مفید کردار ادا کرتی ہے جس کی پیمائش فوری طور پر نہیں کی جا سکتی لیکن بہرحال یہ شاندار سرمایہ کاری ہے۔ اس اندازِ فکر کے مطابق حکومت اور سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن کو صورتِ حال کا احساس ہے اور ایسے منصوبوں میں جان ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے جو غیر ممالک کے سیاحوں اور ملکی سیاحت کو فروغ دینے کی ضرورت پوری کریں۔

۲۔ اس مقصد کے پیشِ نظر، حکومت نے مارچ ۱۹۷۰ء میں پاکستان کی سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن قائم کی جس کے مقاصد یہ ہیں:

(۱) ملک کے اندر اور باہر سیاحت کی نشر و اشاعت میں حکومت کے ایجنٹ کے طور پر کام کرنا۔

(۲) ایسے منصوبے قائم کرنا جن میں ہوٹل، موٹل، نقل و حمل اور تفریحی سہولتیں شامل ہوں، اور

(۳) نجی اور سرکاری شعبوں میں سیاحت کو فروغ دینے میں ایک سرگرم رابطہ ایجنٹ کے طور پر کام کرنا۔

۳۔ حکومت اور پاکستان کی سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن نے سہولتوں میں اضافہ کرنے اور سیاحت کو فروغ دینے کے لئے سازگار فضا قائم کرنے کی غرض سے پہلے ہی ایک شاندار پروگرام کا آغاز کیا ہے۔

۴۔ موجودہ سہولتوں کو مزید بہتر بنانے اور انہیں مزید ترقی دینے کی غرض سے جو زبردست کوششیں کی گئی ہیں ان کے نتیجہ میں آخرکار پاکستان کی سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن اور دشمنوں کی املاک کے کسٹوڈین کے درمیان پٹہ کا ایک طویل المیعاد معاہدہ ہوا ہے تاکہ چاروں ایچ پی ہوٹلوں یعنی فلیش مین، فلیٹیز، ڈین اور سیسل کا انتظام سنبھالا جائے۔ وزیرِ اعظم کی ہدایات کے مطابق ان ہوٹلوں کی تجدید و تزئین اور انہیں اوّل درجے کی رہائش گاہیں بنانے کے لئے ایک عملی اسکیم پہلے ہی تیار کر لی گئی ہے۔ اس پروگرام کو بڑی فوقیت دی جا رہی ہے اور اس پر مرحلہ وار عملدرآمد کیا جائے گا۔

۵۔ پاکستان کی سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن کے موجودہ ریسٹ ہاؤسوں اور جملہ تعمیرات کو بہتر شکل و صورت دی جا رہی ہے۔

۶۔ پاکستان کی سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن کا ایک معاون اور ذیلی ادارہ پاکستان ٹورز لمیٹڈ قائم کیا گیا ہے تاکہ طیاروں اور ریلوں کے ذریعہ آنے اور جانے والے سیاحوں کے لئے انتظامات کرے، ان کی رہائش کا سامان کرے اور انہیں معلومات فراہم کرے۔ کراچی، لاہور، راولپنڈی، پشاور اور کوئٹہ میں دس ایرکنڈیشنڈ ٹویوٹا کوسٹرز تقسیم کئے گئے ہیں جنہیں خصوصی مقاصد، نیز شہروں میں گھمانے پھرانے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

۷۔ پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن، پی۔ آئی۔ اے محکمہ شہری پرواز اور دوسری متعلقہ ایجنسیوں کے درمیان بہتر اشتراک و تعاون کے بھی انتظامات کئے گئے ہیں تاکہ میسر وسائل کو زیادہ سے زیادہ مصرف میں لایا جائے اور ترقیاتی پروگراموں پر موثر عملدرآمد کا آغاز کیا جائے۔ وزیرِ اعظم نے وزیرِ سیاحت کی صدارت میں ایک اعلیٰ اختیاراتی بورڈ قائم کیا ہے تاکہ وہ عملدرآمد کی نگرانی کرے اور ان شعبوں میں ہونے والی ترقی کی رپورٹ انہیں باقاعدگی سے دیتا رہے۔ اس بورڈ کے

ممبروں میں خزانہ، سیاحت اور دفاع کے سیکرٹری اور پی۔آئی۔اے سی کے چیئرمین شامل ہیں۔ پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن کے مینجنگ ڈائرکٹر اسکے سیکریٹری ہیں۔

۸۔ سیاحوں کے لئے موجودہ اطلاعاتی مراکز کی تنظیم نو کی گئی ہے تاکہ ان کی کارکردگی بہتر ہو اور وہ سیاحوں کے لئے واقعتاً موثر اطلاعاتی مراکز کی حیثیت سے کام کریں۔ سیاحوں کے لئے نئے اطلاعاتی مراکز اہم جگہوں بشمول داخلہ اور اخراج کے مقامات اور ہوائی اڈوں پر قائم کئے گئے ہیں اور برابر قائم کئے جاتے رہیں گے۔

۹۔ ناران میں حال ہی میں چار ہٹس (جھونپڑے) تعمیر کئے گئے ہیں تاکہ رہائشی سہولتیں بہتر ہوں۔ اس علاقہ کی ترقی کے لئے اور بھی جامع منصوبہ پر اس وقت غور ہو رہا ہے۔

۱۰۔ سیاحوں کیلئے چوکنڈی کے مقبروں پر بنیادی آسائشیں مہیا کی گئی ہیں تاکہ انہیں بارشوں، دھوپ، تیز ہوا اور ریت سے محفوظ رکھا جائے اور ان کے لئے پینے کے پانی اور غسلخانے کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔

۱۱۔ آئندہ پانچ چھ سال کے لئے پاکستان میں سیاحت کی ترقی کے لئے مجوزہ ماسٹر پلان کی تشکیل کی گئی ہے جسے اب قومی پنجسالہ منصوبہ میں ضم کر دیا جائے گا اور وہ اب سے سیاحت کی ترقی کے لئے تصوراتی ڈھانچے کا کام دے گا۔

۱۲۔ سفر کرنے کے لئے اوسط درجے کے پاکستانی سیاح کی حوصلہ افزائی کرنے کی غرض سے ایک اور دو ستارے والے "عوامی ہوٹل" قائم کرنے کے لئے عملی امکانات کی رپورٹ تیار کر لی گئی ہے جس پر اس وقت غور ہو رہا ہے۔

۱۳۔ مزید برآں۔ کراچی کے قریب کینجر جھیل پر سیاحوں اور کھیلوں کی جگہ کراچی میں سینڈز پٹ پر ایک ساحلی ہوٹل، بڑی بڑی سڑکوں کے کنارے کیمپ لگانے کی جگہیں بنانے، تفریح، کھیل اور ثقافت کی سہولتیں اور سروسیں بہتر بنانے کے منصوبوں پر کام ہو رہا ہے۔

۱۴۔ سیاحت کو اب ساری دنیا میں قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور کسی قوم کے طرز زندگی کی غیر ممالک میں عکاسی کرنے کا ایک اہم ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ یہ زرمبادلہ کمانے کا اہم ذریعہ ہے۔

ان کاموں کا آغاز کرنے اور بہترین نتائج حاصل کرنے کی غرض سے پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن بہت سے منصوبوں پر کام کر رہی ہے شمالی علاقوں یعنی وادئ کالاش۔ سوات۔ گلگت۔ ہزارہ اور کاغان کو کھولنے اور انہیں ترقی دینے پر خصوصی زور دیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے ان علاقوں کے بہت سے لوگوں کو روزگار ملے گا اور عام طور پر معیشت کو ترقی دینے میں مدد ملے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں عوام کی زندگی اور شخصیت اور یہاں کے قدرتی مناظر کی نوعیت کی بنیاد پر سیاحت کو ترقی دینے کی بڑی زبردست صلاحیت ہے۔ پاکستان کا عظیم ثقافتی ورثہ تین بڑی تہذیبوں پر مشتمل ہے یعنی وادئ سندھ۔ گندھارا اور اسلامی تہذیبیں اور اگر اس کے شمالی علاقوں کے بے مثال حسن کو عمدہ طریقے سے پیش کیا جائے تو اس سے سیاحت، ملک کی ایک بڑی صنعت بن سکتی ہے۔

۱۵۔ تاریخی یادگاروں کو مناسب طریقے سے پیش کرنے اور انہیں شہرت دینے کی غرض سے پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن، ٹیکسلا جیسے منتخب مقامات کو بجلی سے روشن کرنے کے منصوبوں پر غور کر رہی ہے۔ گلگت، ہنزہ اور چترال میں پچاس کمروں کے ہوٹل اور نالتار۔ گرم چشمہ اور بمبریت میں پانچ تا دس کمروں کے چھوٹے ہوٹل (CHALETS) قائم کرنے کے بھی منصوبے ہیں۔ ملام جبہ منصوبہ کو بھی زندہ کیا گیا ہے تاکہ اسے حکومت آسٹریا کی مدد سے سیاحوں اور کھیلوں کے لئے اول درجے کا مقام بنایا جائے۔ سوات میں موجودہ ریسٹ ہاؤسوں کو بہتر بنایا جا رہا ہے اور بالائی وادئ سوات میں ایک جامع اور ہر موسم کے لئے موزوں سیاحتی مرکز قائم کرنے کے منصوبے بھی زیرِ غور ہیں۔

۱۶۔ موجودہ حکومت کی پالیسی کا اظہار اعداد کی زبان میں یوں ہوتا ہے کہ ۷۵-۱۹۷۴ء کے بجٹ میں سیاحت کے لئے ۲۰ء۱ کروڑ روپے مختص کئے گئے تھے جبکہ ۷۶-۱۹۷۵ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں ۳ کروڑ روپے زیادہ مختص کئے گئے ہیں جس میں نشر و اشاعت اور کھیلوں اور ثقافت کی ترقی، سیاحتی مقامات کی ترقی۔ ہوٹل، ریسٹ ہاؤس، سیاحتی مرکز اور دوسرے متعلقہ شعبے شامل ہیں۔

۱۷۔ پچھلے ایک دو سال کے دوران، پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن نے پاکستان میں دلچسپی کے بہت سے مقامات پر مختلف زبانوں میں انتہائی مفید اور مستند حقائق پر مبنی لٹریچر اور فولڈر شائع کئے ہیں جس میں واقعاتی

اطلاعات کے علاوہ ملک کے طرزِ زندگی اور ثقافت کی رنگا رنگ تصویریں دی گئی ہیں۔ ان میں ٹیکسیلا، ٹھٹھہ، کاغان، ہوٹل گائڈ راولپنڈی/اسلام آباد، گلگت/ہنزہ۔ اسکردو۔ ہزارہ۔ سوات۔ حیدر آباد۔ چترال اور پاکستان کا گائڈ میپ۔ کراچی۔ حیوانات۔ ہالیجی جھیل۔ پاکستان ٹورز لمیٹڈ کی رہنمائی میں شہروں کے دورے شامل ہیں۔ دوسرے بہت سے فولڈروں پر کام ہو رہا ہے اور وہ مستقبل قریب میں منظرِ عام پر آ جائیں گے انتہائی چیدہ بامقصد نشر و اشاعت اور پاکستان کی جانب زیادہ سے زیادہ سیاحوں کو متوجہ کرنے کے لئے سرگرمیاں تیز کرنے کی غرض سے دوسرے ذرائع استعمال کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، جن میں ٹیلی ویژن۔ فلمیں، اخبارات رسائل وغیرہ شامل ہیں۔ ہم کھیلوں۔ ثقافتی تقریبات، عوامی جشنوں، میلوں درگاہوں پر خصوصی تقریبات اور ایسی دوسری بڑی سرگرمیوں میں نیز سیاح بھیجنے والے بڑے غیر ممالک میں ہونے والی اہم کانفرنسوں اور نمائشوں میں موثر طریقے پر حصہ بھی لیتے رہے ہیں۔ ہم بہت اہم شخصیتوں نمایاں مصنفوں، صحافیوں اور فوٹوگرافروں کی بھی میزبانی کرتے رہے ہیں جو وقتاً فوقتاً پاکستان آتے رہتے ہیں۔

۱۸۔ پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن، نشر و اشاعت کے ان مشترکہ منصوبوں میں جان ڈال رہا ہے جن کا آغاز ایس اے آر ٹی سی اور ایس اے ٹی وائی (جنوبی ایشیا کا سال سیاحت) کے زیرِ اہتمام کیا جا رہا ہے۔ پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن نے ایس اے آر ٹی سی کے زیرِ نگرانی، جنوبی ایشیا کا سال سیاحت منانے کے لئے فرینکفرٹ اور ٹوکیو میں نسام کو منعقد ہونے والی سیاحتی فروغ کی مشترکہ محفلوں میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۱۹۔ دنیا کے سیاح بھیجنے والے بڑے ممالک سے سیاحوں کی آمد بڑھانے کی غرض سے ہم نے ایک فرانسیسی فرم (ایس اے سی اے) سے معاہدہ کیا ہے تاکہ فرانس اور یورپی مشترکہ منڈی کے دیگر ممالک سے پاکستان میں سیاحوں کی آمد تیز تر ہو جائے۔ دنیا کے سیاح بھیجنے والے بڑے ممالک یعنی لندن، نیویارک، فرینکفرٹ اور ٹوکیو میں سیاحوں کے دفاتر قائم کرنے کے منصوبے بھی حکومت نے بنائے ہیں۔

۲۰۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن میں اور اندرون ملک اور بیرون ملک دوسرے اداروں میں اپنے عملے کو باقاعدہ تربیت دینے اور اپنے ٹورسٹ افسروں کو سیاحوں کیلئے گائڈ رہنما بنانے کی تربیت دینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

۲۱۔ پاکستان کے آئین میں سیاحت کو موثر بنانے کیلئے سیاحت کو وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان ایک مشترکہ مد بنایا گیا ہے اس پر عملدرآمد کی خاطر سیاحوں کے لئے صوبائی مشاورتی کمیٹیوں کو سرگرم بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے تاکہ وہ صوبوں میں اپنا بنیادی ڈھانچہ اور دوسری سہولتیں اور سروسیں بہتر بنائیں۔ اسی طرح (۱) سیاحوں کی ایجنسیوں (۲) ہوٹلوں اور ریستورانوں اور (۳) سیاحوں کے گائڈز کو باقاعدہ بنانے کیلئے ایک قانون حکومت کے زیرِ غور ہے۔

۲۲۔ ہوٹل والوں، سفری ایجنٹوں اور دوسروں سے باقاعدہ ملاقاتیں، تبادلہ خیالات اور مشورے ہمیشہ کئے گئے تاکہ ان کے مسائل پر غور کیا جائے، ان کی ضرورتوں کا اندازہ لگایا جائے اور انہیں متعلقہ ذرائع یا نجی اور سرکاری شعبوں کے ذریعہ جلد حل کرنے میں مدد دی جائے۔

۲۳۔ اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کے بڑھتے پھیلتے سیاحتی کاروبار میں پاکستان کو مناسب حصہ حاصل ہو سکے اس مقصد کے ضمن میں پاکستان میں سیاحوں کے لئے کشش پیدا کرنے اور انہیں پاکستانی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرانے کے اقدامات کئے گئے ہیں اور ان کوششوں ہی کے نتیجے میں سیاحوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافے کے آثار پیدا ہوئے اور ۱۹۷۴ میں انکی تعداد میں ۸ء۸ فیصد کا اضافہ ہوا اور ان کی تعداد (۱۹۷۴) میں ۱۳۳۱۵۳ رہی تھی جبکہ ۱۹۷۳ میں انکی ۱۰۴۸۹۸ تھی، ۱۹۷۴ء میں سیاحت کی تجارت میں اضافہ کی وجہ سے ۲۰۷۴۹۰۰۰ امریکی ڈالر کا زرِمبادلہ حاصل ہوا اس طرح ۱۹۷۳ء کی آمدنی کے مقابلہ میں ۱۰۱ء فیصد اضافہ ہوا، جنوری ۱۹۷۵ء میں ۳۶۷۴۰۰۰ امریکی ڈالر کی آمدنی ہوئی جبکہ جنوری ۱۹۷۴ء میں ۱۳۴۹۰۰۰ امریکی ڈالر کی آمدنی ہوئی تھی جس سے ۱۷۲ء۳ فیصد کا اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ سیاحتی عملے کو اعلیٰ درجے کی فنی تربیت فراہم کرنے کے لئے نیشنل انسٹیٹوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن اور دیگر ملکی مراکز میں تربیت دلوانے کے اقدام کئے جا رہے ہیں۔

خیاباں خیاباں — ارم

ساہیوال کے قریب ہڑپا کے آثار قدیمہ

سندھ میں بھنبھور کے مقام پر حالیہ
کھدائی میں برآمد ہونے والے آثار

موئنجو دارو کے عالمگیر شہرت کے حامل آثار

سوات کا خوبصورت مقام کالام جو سیاحوں کے لئے بڑی دلکشی رکھتا ہے

وادی سوات میں بل کھاتی ہوئی جوئے آب

گلگت کا ایک منظر

کاغان میں حسین سیف الملوک جھیل

وادیٔ کاغان میں بھیڑوں کا ایک گلہ

نانگا پربت کا ایک حسین منظر

چترال کے کالاش قبیلے کی عورتیں رقص کے لئے تیار ہیں

پاکستان میں شہری پرواز

دسمبر ۱۹۷۱ء کے واقعہ کے بعد پاکستان میں شہری پرواز کی تنظیم اس نئی کسوٹی پر کرنی پڑی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اپنی سروس نہ رکھی جائے بلکہ نئے پاکستان کے اندر ملکی اور بین الاقوامی راہوں کی تعمیر کی جائے۔ عوامی حکومت نے قومی مسافر بردار طیاروں کے لئے بین الاقوامی راہیں تلاش کرنے کے امکانات فراہم کئے اور ملک کے اندر پرواز کی سرگرمیوں کو بہتر بنایا۔ ملک کے بہتر معاشرتی و اقتصادی حالات اور فی کس آمدنی بڑھانے کی تگ و دو کرنے کے ساتھ ہی صرفہ کی منصوبہ بندی پر حکومت کے زور دینے نے ٹریفک بڑھانے میں ایک بڑا اور فیصلہ کن کردار ادا کیا جس کا مقصد فضائی نقل و حمل کا نسبتاً چھوٹا لیکن بھرپور نظام قائم کرنا تھا۔

حکومت نے پسماندہ علاقوں کے سدھار اور بہتری پر جسے سابقہ حکومتوں نے نظر انداز کیا تھا، خصوصی توجہ دی۔ اس سلسلہ میں بعض نمایاں کام یہ ہیں۔ صوبہ بلوچستان میں گوادر، پسنی اور پنج گور کے مقامات پر اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں چترال کے مقام پر موجودہ ہوائی اڈوں اور ہوائی میدانوں کی ترقی۔ غیر سمتی بیکنوں کی تنصیب۔ بہت اونچی فریکوئنسی کی ریڈیو ٹیلیفونی کا قیام۔ سندھ میں موہنجو دڑو کے مقام پر ہوائی اڈے کے ٹرمینل کی عمارت کی تعمیر اور رن وے کی دوبارہ پختگی۔ سیدو شریف (چک درہ) میں ایک ہوائی میدان بنانے کا منصوبہ پر بھی کام ہو رہا ہے۔ کوئٹہ، پشاور اور لائلپور کے ہوائی اڈوں کی جو بہتری کی جا رہی ہے اس سے عوامی حکومت کے اس دلی خواہش کا مزید اظہار ہوتا ہے کہ وہ ان علاقوں کے باشندوں کو نقل و حمل کا تیز تر وسیلہ مہیا کرنا چاہتی ہے۔ لاہور، اسلام آباد اور کراچی کے ہوائی اڈوں کے حسن میں اضافہ کرنے اور ان کی توسیع کرنے کے لیے جو کام ہو رہا ہے وہ نہ صرف بہتر جمالیاتی احساس اور دور اندیشی کی شہادت مہیا کرتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے ٹریفک کی کشش اور گنجائش میں اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۷۲ء سے پرواز کی سہولتوں میں جو بہتری ہوئی ہے اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔ انسٹرومنٹ لینڈنگ سسٹم کی تنصیب اور کام کا آغاز۔ اسلام آباد میں ٹرمینل کی سہولتوں میں توسیع۔ والٹن میں دور کے پیغامات موصول کرنے والے اسٹیشن کی تعمیر تاکہ لاہور کے بین الاقوامی اڈے کو مداخلت سے آزاد ریڈیائی پیغامات موصول ہوں اور کراچی سے پیکنگ تک ریڈیو ٹیلیفونی رابطے کا قیام۔

اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر ایک سیکنڈ سے بھی کم کے اوقات اور بہت ہی کم وقت میں بڑی ہی اہم شخصیتوں کے لئے

متعدد پروازوں کا ٹھیک ٹھیک اور عمدہ انتظام، شاندار کارنامہ تھا جس کا تقابل پرواز کی دنیا میں ایسے کسی موقع سے باآسانی کیا جا سکتا ہے۔

فضائی نقل و حمل پر بہتر بین الاقوامی تعلقات کے اثرات

صنعتی پیداوار بڑھا کر برآمدات میں انتہائی حد تک اضافہ کرنے کی غرض سے حکومت کی پالیسی اور توازن ادائیگی کی بہتر پوزیشن نے ہمارے مال بردار قومی جہازوں کے لئے بحالی کی راہ ہموار کی جنہوں نے وقت ضائع کئے بغیر مال برداری کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کو حسن و خوبی سے سرانجام دیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی فاضل گنجائش کا مصرف پیدا کیا۔ پاکستان انٹرنیشنل ایر لائنز کے لئے بین الاقوامی راہوں کی تلاش میں اس بات کی تمام تر کوششیں کی گئیں کہ شہری پرواز کے بین الاقوامی ادارہ کے کنونشنوں کی روشنی میں معاہدہ کرنے والی دوسری مملکتوں سے فضائی سروس کے دوطرفہ معاہدے کئے جائیں۔ پاکستان اب تک کل ۵۷ ملکوں سے ایسے معاہدے کرنے میں کامیاب ہوا ہے جن میں سے ۲۲ معاہدے موجودہ حکومت کے چار سال کی مختصر مدت میں کئے گئے جن کے مفید نتائج برآمد ہوئے اور ہمارے قومی مال بردار جہازوں کو بڑا فائدہ ہوا۔ یہاں تک کہ پی آئی اے ایشیا کا پہلا فضائی ادارہ بن گیا ہے جس کے طیارے مغرب کی مملکتوں تک جاتے ہیں اور لیبیا (نیز مستقبل قریب میں الجیریا) وہ زینہ ہے جہاں سے اس کی پروازیں شمالی افریقہ سے بحر اوقیانوس کے پار ریاست ہائے متحدہ امریکہ تک جائیں گی۔ پی۔ آئی۔ اے کی بین الاقوامی کارروائیوں کا تناسب جو مشرقی پاکستان کی سروسوں کے معطل ہونے سے پہلے ۲۰۰۲ فیصد اور ۷۲-۱۹۷۱ء میں ۶۲ فیصد تھا، ۷۴-۱۹۷۳ء میں بڑھ کر ۸۶ فیصد ہو گیا۔ اب پی۔ آئی اے کے طیاروں میں ۴ ڈی سی ۱۰ طیارے ہیں اور وہ بڑھتی ہوئی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اپنے طیاروں میں بوئنگ ۷۴۷ شامل کر کے اپنی شاندار کامیابیوں میں ایک اور اضافہ کرنے کے امکانات پر غور کر رہی ہے۔ پی۔ آئی۔ اے نے ۷۵-۱۹۷۴ء میں ۱۴۹ کروڑ روپے کی اصل مطلوبہ آمدنی حاصل کر لی ہے جو ۷۹-۱۹۷۸ء کے مجوزہ منصوبے کے ۱۵۰ کروڑ روپے کے ہدف کے برابر ہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ء کے لئے مسافروں کی مجموعی ٹریفک کا جو منصوبہ تھا وہ ابتدائی تخمینوں سے پانچ سال پہلے ہی حاصل کر لیا گیا ہے جس کا اصل سبب یہ ہے کہ پاکستان میں آنے والے اور پاکستان سے باہر جانے والے مسافروں کی مارکیٹ میں پی۔ آئی۔ اے کا حصہ ۱۹۷۳ء میں ۲ء۴۴ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۷۵ء میں ۱ء۵۱ فیصد ہو گیا۔

انتظامی اصلاحات کا اثر

انتظامی اصلاحات نے فنّی اور غیر فنّی دونوں قسم کے عملے کی تربیت کو اولین ترجیح دی اور یہ بات تسلیم کی کہ افراد کے لئے اپنے متعلقہ شعبوں میں کارکردگی کا مسلسل اعلیٰ معیار یقینی بنانے کے لئے تربیت سب سے اہم اور بڑا ذریعہ ہے۔ جدید پرواز کی خواہشوں کا یہ تقاضا ہے کہ متعلقہ شعبوں میں اعلیٰ ترین پیشہ ورانہ اور خصوصی مہارت کی تربیت دی جائے جس میں ہم اب تک بہت پیچھے ہیں۔ اس صورتحال کو محسوس کرتے ہوئے ہماری حکومت نے ۸۲ء۴ ملین روپے کے کل تخمینہ شدہ خرچ پر حیدرآباد سول ایوی ایشن انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی مستعدی کے ساتھ منظوری دے دی۔ اس خرچ میں ۲۷ء۹ ملین روپے کا زرمبادلہ شامل ہے۔ توقع ہے کہ یہ انسٹی ٹیوٹ، فضائی ٹریفک کی سروسوں، مواصلاتی کارروائیوں، مواصلاتی انجینئرنگ، ہوائی اڈوں کے انتظام، بچاؤ اور آگ بجھانے اور نظم و نسق کے شعبوں میں بین الاقوامی معیار کے تربیت یافتہ افراد کار مہیا کرے گا۔ پاکستانی شہریوں کو تربیت دینے کے علاوہ، تربیتی سہولتیں ہماری حکومت کی پالیسی کے مطابق، دوست ممالک کو بھی فراہم کی جائیں گی۔ عوامی حکومت نے پرواز کی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور ملک کے مختلف فلائنگ کلبوں میں پائلٹوں کو تربیت دینے کے لئے امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ امداد و اعانت فراہم کی۔ تربیت یافتہ پائلٹوں کے مسلسل فقدان پر قابو پانے کے لئے رواں فلائنگ اسکیموں میں مزید توسیع کی گئی۔

آئندہ رجحان

حکومت پاکستان، اسلام آباد ایرپورٹ کو مکمل بین الاقوامی درجہ دینے اور اسے غیرملکی فضائی کمپنیوں کے لئے کھولنے پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ یہ ہوائی اڈہ، شمالی راہ کے ذریعہ چین جانے کے لئے پھاٹک کا کام دے گا کیونکہ یہ شمالی راہ، ٹرانس سائبرین روٹ کے بعد، جو چند منتخب فضائی اداروں کو میسّر ہے، فاصلہ کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہے۔ دنیا کی بہت سی فضائی کمپنیوں نے عوامی جمہوریہ چین تک اپنی سروسیں چلانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے امکان ہے کہ یہ راہ مستقبل قریب میں بہت مقبول ہو جائے گی اور اسلام آباد ایرپورٹ اپنے اہم جغرافیائی محل وتوع کی وجہ سے یقیناً وسعت پائے گا۔ پھر اس کی وجہ سے پاکستان میں پرواز کی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہوگا۔

مزید برآں، حکومت کی بڑی خواہش ہے کہ دیہی آبادی، جو اس کی معیشت اور ثقافت کا مغز ہے، فضائی دور کے فوائد سے مستفیض ہو۔ اس خواہش کی تکمیل کی غرض سے فضائی نقل وحمل کی ایک نئی پالیسی تیار ہو رہی ہے۔ تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور افراطِ زر کے باوجود، حکومت اس امکان کا جائزہ لے رہی ہے کہ ملک کے دور افتادہ گوشوں کے باشندوں کو فضائی ٹیکسی چارٹر سروس مہیا کرے۔ ایسی پبلک فضائی نقل وحمل کا اہتمام بہت سستا اور عوام کے ایک بڑے طبقہ کی رسائی کے اندر ہوگا۔ اس طرح انہیں ملک کے ترقی یافتہ علاقوں سے قریب تر تعلق پیدا کرنے اور اقتصادی سرگرمیاں بڑھانے میں مدد دینے کا بھی موقع ملے گا۔ دور دراز علاقوں تک آسانی سے پہنچنے کی وجہ سے نہ صرف ان کا معیار زندگی بڑھانے میں مدد ملے گی بلکہ معیشت کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔

آج پرواز کی دنیا کو جو سب سے بڑا چیلنج درپیش ہے وہ طیاروں کی کارروائیوں میں غیر قانونی مداخلت کی حرکت یا خطرے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اسے بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے شہری پرواز کی بین الاقوامی تنظیم نے اس موضوع کا پہلے ہی گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی روک تھام کے لئے ایک قرارداد منظور کی ہے۔ معیارات اور سفارش کئے گئے طریقوں کو مذکورہ تنظیم کے کنونشن کے منسلکہ ۱۷ میں شائع کیا گیا ہے جسے حکومت پاکستان نے پوری طرح قبول کیا ہے۔

منسلکہ ۱۷ میں مندرج دفعات پر مناسب عملدرآمد کو یقینی بنانے کی غرض سے ایئرپورٹ سیکیورٹی فورس کی تشکیل اور قیام کے لئے ایک آرڈیننس حال ہی میں جاری کیا گیا ہے۔ محکمہ شہری پرواز اس نئے آرڈیننس کو جہاں تک جلد ممکن ہو لفظی ومعنوی طور پر نافذ کرنے کی زبردست کوششیں کر رہا ہے۔ ایئرپورٹ سیکیورٹی فورس ملک میں شہری فضائی نقل وحمل کو محفوظ اور مداخلت سے آزاد بنانے میں بڑا معاون ثابت ہوگا۔

تیل کے بحران، افراطِ زر کے رجحانات اور کرایہ میں ناگزیر اضافوں نے بلاشبہ دنیا میں فضائی ٹریفک کی معمول کے مطابق ترقی میں رکاوٹ ڈالی ہے۔ پچھلے دو سال کے اعداد و شمار اس بات کا ثبوت ہیں کہ بہت سی فضائی کمپنیوں کی آمدنی میں کمی ہو رہی ہے، اور وہ اپنی پروازوں میں کمی کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کا اثر پی آئی اے پر بھی پڑا ہے کیونکہ اس کی کارگزاریوں پر اخراجات میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اس کے منافع کا فیصد متاثر ہوا ہے۔ ایسی صورتِ حال کے باوجود پی۔ آئی۔ اے اپنے مستقبل سے پُرامید ہے۔

پاکستان میں تیل کی قیمت میں اضافہ کا اثر ان غیرملکی فضائی کمپنیوں کی کارگزاری پر پڑا ہے جن کے طیارے پاکستان آتے ہیں یا یہاں سے گزرتے ہیں جس کا اصل سبب یہ ہے کہ فضائی کمپنیوں نے منصوبہ بنایا ہے کہ ان کے طیارے ایسے ہوائی اڈوں سے گزریں گے جہاں تیل نسبتاً سستا ہے۔ حکومت اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے اور پروازوں کی صنعت مستقبل کی جانب پُرامید نظروں سے دیکھ رہی ہے کیونکہ ہمارا مقولہ ہے کہ "کاملیت حاصل کرنا ناممکن ہے لیکن یہ کہنے کا موقع نہ دیا جائے کہ ہم نے کوشش نہیں کی"۔

پاکستان کی اقلیتیں

قیامِ پاکستان کے وقت قائدِ اعظم نے ان الفاظ میں اقلیتوں کو یقین دہانی کرائی تھی:۔

"آپ آزاد ہیں۔ آپ کو اپنی عبادت گاہوں میں جانے کی پوری آزادی ہے ...... ہم اس بنیادی اصول پر نئی مملکت کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک ہی مملکت کے شہری ہیں۔"

قائدِ اعظم کی یہ یقین دہانی اقلیتوں کے بارے میں حکومت کی پالیسی کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس بات کی ضمانت دینا کہ اقلیتوں کو اپنے حقوق کا تحفظ حاصل ہے اور انہیں اپنی ترقی کے تمام مواقع میسر ہیں حکومت کا اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور آئینی فریضہ ہے۔

پاکستان میں غیر مسلموں کی مجموعی تعداد پوری آبادی کی ۳ فیصد ہے۔ لفظ اقلیت کی حقیقت نام کے سوا کچھ نہیں ہے، اس لئے کہ اقلیتوں کو ٹیکنیکل اعتبار سے کوئی جداگانہ حیثیت نہیں دی گئی۔ درحقیقت ان کے ساتھ معاشی، معاشرتی، مذہبی یا سیاسی معاملے میں کبھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔ البتہ ان کے جداگانہ وجود سے حکومت کو اس مختصر گروپ کے مخصوص مسائل پر خاص طور سے توجہ دینے میں مدد ملی ہے۔

وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے زیرِ قیادت عوامی حکومت نے اقلیتوں کے تحفظ اور بہبود کے لئے باقاعدہ ادارے قائم کئے ہیں۔ ان اداروں میں تنظیم و نسق، نمائندگی، مالی امداد اور فلاح و بہبود کے انتظامات شامل ہیں تاکہ اس گروپ کو آئین میں دی ہوئی ضمانتوں کو عملی شکل دی جا سکے اور اس کی فلاح و بہبود کا بندوبست کیا جا سکے۔ عام طور پر ایک بڑے معاشرے میں چھوٹا سا گروپ بے حوصلگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کمزوری کا بھی ازالہ کیا جا رہا ہے تاکہ اقلیتیں پوری قوم کی معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے سکیں۔

عوامی حکومت نے اقلیتوں کی شکایتوں کے ازالے اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے سب سے پہلے جو اقدامات کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں اقلیتی امور کی ایک وزارت قائم کی۔ اس انتظام کو مستحکم کرنے کے لئے نچلی سطح پر بھی مناسب ادارے قائم کئے گئے۔

ہر ضلع میں ایڈیشنل ڈپٹی کمشنروں کو اقلیتی امور کے افسر کی حیثیت دے دی گئی ہے اور ان پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ ان کے سامنے اقلیتی فرقے کے کسی فرد یا گروپ کی طرف سے جو شکایات

پیش کی جائے اس کے ازالہ کی طرف فوری توجہ دی جائے۔ ڈپٹی کمشنروں اور ان سے نچلے درجے کے افسروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اقلیتی فرقوں کے سربرآوردہ لوگوں سے وقتاً فوقتاً ملتے رہیں۔ تاکہ ان کی مشکلات معلوم ہوتی رہیں۔ پھر ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے مقامی اور صوبائی سطح پر کوشش کی جائے۔

اس طریقِ کار کی بدولت اقلیتی فرقوں کے لوگوں اور مقامی انتظامیہ میں براہِ راست رابطہ پیدا ہوگیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کچھ مسائل اقلیتی امور کی وزارت کو بھیجنے کی بجائے مقامی طور پر حل کر دیئے جاتے ہیں جس سے وقت بھی بچتا ہے اور اخراجات بھی۔ مقامی سطح پر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے اپریل ۱۹۸۵ء میں راولپنڈی میں قومی سطح پر اقلیتوں کی کانفرنس بلائی گئی۔ کانفرنس کا اہتمام اقلیتی امور کی وزارت نے کیا تھا اور وزیرِ اعظم پاکستان نے اس کا افتتاح کیا تھا۔

وزیرِ اعظم نے اپنی افتتاحی تقریر میں اقلیتوں کو یقین دلایا تھا کہ حکومت ان کے جائز حقوق اور مفادات کے تحفظ کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ وزیرِ اعظم نے یہ بھی بتایا تھا کہ پاکستان کے آئین میں اقلیتوں کو کون کون سے تحفظات دیئے گئے ہیں۔

اس کانفرنس سے جس میں مختلف اقلیتی فرقوں کے تقریباً ۲۰۰ نمائندے شریک ہوئے ان شعبوں کی نشاندہی میں بڑی مدد ملی جن میں اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت کی طرف سے اقدامات درکار ہوں گے۔

آئین میں اقلیتوں کو خاص ضمانتیں دی گئی ہیں، آئین کی متعلقہ دفعات یہ ہیں:-

دفعہ ۲۰

قانون امن و امان اور اخلاقی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے:-

(ا) ہر شہری کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے مذہب کی پابندی کرے، اس مذہب کے بتائے ہوئے طور طریقے اختیار کرے اور اس مذہب کی تبلیغ کرے، اور

(ب) ہر مذہب اور اس کے ہر فرقہ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے مذہبی ادارے قائم کرے، ان کی دیکھ بھال کرے اور ان کا بندوبست کرے۔

دفعہ ۲۱

کسی شخص کو ایسا خاص ٹیکس ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جس کی رقم اس شخص کے اپنے مذہب کے سوا کسی اور مذہب کو برقرار رکھنے یا اس کی تبلیغ پر خرچ کی جاتی ہو۔

دفعہ ۲۲

(۱) کسی تعلیم گاہ میں تعلیم پانے والے کے لئے یہ ضروری نہیں سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے مذہب کے سوا کسی اور مذہب کی تعلیم حاصل کرے یا کسی اور مذہب کی عبادت یا رسوم میں شریک ہو۔

(۲) مذہبی اداروں کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دینے یا انہیں رعایت دینے کے معاملے میں کسی فرقے سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

(۳) قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے،

(ا) کسی فرقے کو مکمل طور پر اپنے ہی قائم کئے ہوئے تعلیمی اداروں میں اس فرقے کے افراد کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے سے نہیں روکا جائے گا۔

(ب) کسی ایسے تعلیمی ادارے میں جسے سرکاری خزانے سے مالی امداد ملتی ہو کسی شہری کو نسل، مذہب، ذات یا جائے پیدائش کی بنیاد پر داخلے سے نہیں روکا جائے گا۔

(۴) اس دفعہ کے نفس مضمون کی بنیاد پر کسی پبلک اتھارٹی کیلئے یہ ممانعت نہیں ہوگی کہ وہ معاشرتی یا تعلیمی لحاظ سے پسماندہ کسی

گروپ کی ترقی کے لئے ضروری کارروائی نہ کرے۔

دفعہ ۲۵

قانون کی نظر میں تمام شہری مساوی ہیں اور تمام شہری مساوی قانونی تحفظ کے حقدار ہیں۔

دفعہ ۲۶

ایسے مقامات کے سوا جنہیں مذہبی حیثیت حاصل ہے باقی تمام پبلک مقامات اور تفریح گاہوں میں داخلے کے معاملے میں، نسل، مذہب، ذات، جنس، سکونت یا جائے پیدائش کی بنیاد پر امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔

دفعہ ۲۷

کوئی شہری جو دیگر اعتبار سے سرکاری ملازمت میں لئے جانے کا مستحق ہوگا محض نسل، مذہب، ذات، جنس، سکونت یا جائے پیدائش کی بنیاد پر اسے ملازمت میں لئے جانے سے نہیں روکا جائیگا۔

دفعہ ۲۸

دفعہ نمبر ۲۵۱ کے دائرے میں رہتے ہوئے شہریوں کے کسی گروپ کی جداگانہ زبان، رسم الخط یا ثقافت ہو تو اس گروپ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اس زبان، رسم الخط اور ثقافت کے تحفظ اور ترقی کی کوشش کرے اور اس مقصد کے لئے ادارے قائم کرے۔

دفعہ ۳۶

مملکت اقلیتوں کے تمام جائز حقوق اور مفادات کا تحفظ کرے گی۔ ان حقوق میں وفاقی اور صوبائی ملازمتوں میں اقلیتوں کی مناسب نمائندگی بھی شامل ہے۔

دفعہ ۱۰۶

(۳) اس دفعہ کی شق ۱ میں بلوچستان، پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ کی صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں کی جو تعداد بتائی گئی ہے اس کے علاوہ ان اسمبلیوں میں کچھ فالتو نشستیں ہوں گی جن کی تعداد درج ذیل ہے۔ یہ فالتو نشستیں عیسائیوں، ہندوؤں، یہودیوں، پارسیوں، شیڈول کاسٹ قادیانی اور لاہوری فرقے کے لئے جو احمدی کہلاتے ہیں مخصوص ہوں گے۔

بلوچستان	۱
صوبہ سرحد	۱
پنجاب	۳
سندھ	۲

حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ قومی اسمبلی کی ۶ نشستیں اقلیتوں کے لئے مخصوص کر دی جائیں اور پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں ان کے لئے مخصوص نشستوں کی تعداد ۳ سے بڑھا کر ۵ کر دی جائے۔ اس کے لئے قومی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں بل پیش ہونے والا ہے۔ آئین میں ایک اور ترمیم کی جارہی ہے جس سے بہائیوں اور کچھ دوسرے فرقوں کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کے لئے مخصوص کی ہوئی نشستوں پر نمائندگی کا حق مل جائے گا۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کے لئے نشستیں مخصوص کرنے کے علاوہ حکومت نے عوامی لوکل کونسلوں میں بھی ان کی نمائندگی کیلئے مناسب اقدامات کئے ہیں۔ کسی بھی لوکل کونسل میں اقلیتی فرقے کے لوگوں کی تعداد دیکھتے ہوئے ان کے لئے فالتو نشستیں مخصوص کی جائیں گی یہ نشستیں اقلیتی فرقے کے ایسے امیدواروں سے پُر کی جائیں گی۔ جو لوکل کونسلوں کے عام انتخابات میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ لیکن اپنے فرقے کے امیدواروں میں سے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کریں گے انتخابی حلقہ بندی میں یہ خیال رکھا جائے گا کہ کسی ایک حلقہ میں اقلیتی

زقے کے بہت سے لوگ ایک ہی جگہ آباد ہوں تو انہیں مختلف حلقوں میں تقسیم نہ کیا جائے نشستیں فراخ دلی کے ساتھ مخصوص کی جائیں گی اور اس معاملہ میں آبادی کے اصول کی سختی کے ساتھ پابندی نہیں کی جائے گی۔ ان انتظامات پر عملدرآمد کے لئے صوبائی حکومتیں لوکل گورنمنٹ ایکٹس اور آرڈیننس میں مناسب ترمیمیں کر رہی ہیں۔

اقلیتوں کو متروکہ وقف املاک کے بورڈ میں بھی نمائندگی حاصل ہے۔ یہ بورڈ پاکستان میں متروکہ املاک کی دیکھ بھال کرتا ہے اور ان پر کنڑول کرتا ہے۔ انہیں پنجاب سوشل سروسز بورڈ میں بھی نمائندگی دی گئی ہے۔ اقلیتی فرقوں کے لوگوں کو اہم سیاسی ذمہ داریاں تفویض کی گئی ہیں اور جو وفود اور ثقافتی طائفے ملک سے باہر بھیجے جاتے ہیں ان میں اقلیتی فرقوں کے لوگوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔

اقلیتی فرقوں کے ضرورت مند اور نادار افراد کی فلاح و بہبود کے لئے اقلیتی امور کی وزارت میں وفاقی حکومت کی طرف سے ۲۰ لاکھ روپے کا ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ اس فنڈ کو خرچ کرنے کی کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی۔ اسکیم میں یہ بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ نادار افراد کے علاوہ ان اداروں کو بھی مالی امداد دی جائے جو اقلیتی فرقوں کے لوگوں کو تربیت دیتے ہیں اور روزگار حاصل کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ اب تک بہ حیثیت مجموعی ۲۲۴ مستحق افراد کو ۱،۲۲۳۰۲۵۰ روپے کی مالی امداد دی جا چکی ہے۔ اس وقت مختلف اضلاع میں اقلیتی فرقوں کے افراد اور انجمنوں کی بہت سی درخواستوں پر غور کیا جا رہا ہے۔ اقلیتی امور کی وزارت میں اس مقصد کے لئے ایک خاص کمیٹی بنائی گئی ہے جو صرف ان درخواستوں پر غور کرتی ہے جو افسران ضلع کی سفارش کے ساتھ موصول ہوتی ہیں۔

وزیراعظم نے ضلع چترال کے کافرستان کی وادیوں میں رہنے والے کلاش قبیلوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔ اقلیتوں کے لئے خیر سگالی کے اظہار کے طور پر وفاقی حکومت نے کراچی میں بودھوں کے لئے عبادت گاہ اور ثقافتی مرکز کی تعمیر کے لئے تین لاکھ روپیہ کی گرانٹ دی ہے۔

حکومت نے کراچی میں بودھوں کی عبادت گاہ اور ثقافتی مرکز کی تعمیر کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے جس کے چیئرمین اقلیتی امور اور سیاحت کے وزیر مملکت ہیں۔ پاکستان میں بودھوں کا عظیم ثقافتی ورثہ ہے۔ لیکن بودھوں کی اپنی کوئی عبادت گاہ نہیں ہے۔ بودھوں کی مجوزہ عبادت گاہ ان کی روایتی عبادت گاہوں کے نمونے کی ہوگی اس لئے جاپان کی حکومت سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس عبادت گاہ کا عمارتی ڈیزائن تیار کرنے کے لئے کسی معروف جاپانی ماہر تعمیرات کی خدمات کولمبو منصوبے کے تحت پاکستان کو فراہم کرے۔ عمارتی ڈیزائن ملتے ہی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔ پوری عمارت پر ۲۵ لاکھ روپیہ لاگت آئے گی۔

اس بات کا احساس کرتے ہوئے کہ کچھ ایسے اقلیتی فرقے جو تعلیم کے میدان میں پسماندہ ہیں ان کے افراد محض قابلیت کی بنیاد پر تعلیمی وظائف حاصل نہیں کر سکتے ان کے لئے وظیفوں کا ایک بندوبست کیا گیا ہے۔ ایک ہزار صدارتی وظائف کی اسکیم کے تحت پچھلے تعلیمی سال میں اقلیتی فرقوں کے طلبا کو ۷۸ وظائف دیئے گئے۔ صوبائی حکومتوں نے بھی اقلیتی فرقوں کے طلبا کو وظائف دینے کا علیحدہ بندوبست کیا ہے۔

مختلف پیشہ ورانہ کالجوں میں اقلیتوں کے لئے متعدد نشستیں رکھی گئی ہیں۔ ان اداروں میں جہاں اقلیتوں کے لئے الگ نشستیں مخصوص ہیں اقلیتی فرقوں کے طلبا قابلیت کی بنیاد پر عام نشستوں کے لئے بھی داخلہ لے سکتے ہیں۔

اقلیتی فرقوں کے اہم تہواروں اور برسیوں کے موقعوں پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اقلیتوں کے لئے خاص پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ ہندوؤں کے اہم تہواروں پر ریڈیو پاکستان سے بھگوت گیتا کے پاٹھ کا انتظام کیا گیا ہے اور پشاور اسٹیشن سے نشر ہونے والے عیسائیوں کے پروگرام کا وقت بڑھا دیا گیا ہے۔ بالمیک سوامی جی کے جنم دن کے موقع پر ریڈیو پاکستان کے پشاور، ملتان اور حیدرآباد اسٹیشنوں سے خاص پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔

وفاقی حکومت کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں کی ترقی

وفاقی حکومت کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں کا رقبہ ۱۰۵۱۰ مربع میل اور آبادی ۲۵ لاکھ ہے۔ ان علاقوں کا شمار پاکستان کے انتہائی پس ماندہ علاقوں میں ہوتا ہے اس لئے عوامی حکومت ان کی تیز رفتار معاشرتی اور معاشی ترقی پر خاص توجہ دے رہی ہے تاکہ یہاں کے لوگوں کو بھی وہی بنیادی معاشرتی سہولتیں حاصل ہوں جو پاکستان کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کو حاصل ہیں۔ اس علاقے کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے یہاں کے لوگوں کے ساتھ بزرگوں کے ذریعہ رابطہ پیدا کرنے کی بجائے براہ راست عوام کے ساتھ بات چیت کی۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کی کہ اب قبائلی علاقوں کے عوام پر پوری توجہ دی جائے گی اور ترقی کے فوائد گھر گھر پہنچانے میں کسی کوشش اور بڑے سے بڑے خرچ سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔ پچھلے چار سال میں اس پالیسی پر ثابت قدمی کے ساتھ عمل ہوتا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ۷۶-۱۹۷۵ء کے بجٹ میں ان علاقوں کے لئے ۲۱ کروڑ ۹۲ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ کی رقم مختص کی گئی ہے۔ جب کہ ۷۲-۱۹۷۱ء کے بجٹ میں صرف [illegible] روپیہ کی رقم مختص کی گئی تھی۔ موجودہ مالی سال کی رقم ۷۵-۱۹۷۰ء کے پانچ سالہ منصوبے میں اس علاقے کے لئے مختص کی ہوئی رقم بارہ کروڑ روپیہ سے قریب دوگنی ہے۔ ۷۲-۱۹۷۱ء سے ۷۵-۱۹۷۴ء تک ان علاقوں کی ترقی پر ۲۴ کروڑ ۸۳ لاکھ ۵۰ ہزار روپے خرچ کئے جا چکے ہیں۔ اس خرچ کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے۔

تعلیم

تعلیم کے شعبے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ جولائی ۱۹۷۱ء سے جون ۱۹۷۵ء تک تعلیمی پروگرام کے لئے جو ایک طرح سے ہنگامی پروگرام تھا ۵ کروڑ ۱۱ لاکھ روپے کی خطیر رقم مختص کی گئی تھی۔ ۷۶-۱۹۷۵ء کے بجٹ میں تعلیم کے لئے دو کروڑ ۲۷ لاکھ ۶۰ ہزار روپے رکھے گئے جب کہ ۷۲-۱۹۷۱ء کے بجٹ میں اس مد میں صرف دس لاکھ ۸۰ ہزار روپے رکھے گئے تھے۔ اب ان علاقوں میں دو ڈگری کالج ۶ انٹرمیڈیٹ کالج، دو اساتذہ کے تربیتی ادارے، ۵۶ ہائی اسکول، ۸۹ مڈل اسکول اور ۷۰۴ پرائمری سکول ہیں۔ اس کے مقابلے میں ۱۹۷۱ء تک ان علاقوں میں صرف دو انٹرمیڈیٹ کالج، ۱۴ ہائی اسکول، ۲۷ مڈل اسکول اور ۳۲۹ پرائمری اسکول تھے۔

۷۶-۱۹۷۵ء کا پروگرام یہ ہے کہ ۱۱۰ پرائمری سکولوں

کو [illegible] کالج اور [illegible] مڈل اسکولوں اور ہائی اسکولوں کا درجہ دے دیا جا[ئے گا] ۳۰۰ نئے پرائمری، ۵۵ مڈل اور [illegible] ہائی اسکول کھولے جا[ئیں گے] اور پانچ ٹیکنیکل ورکشاپ قائم کئے جائیں [گے]۔ اس کے علاوہ ملک کے اندر اور ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنے کے لئے قبائلی طلباء کو فراخ دلانہ گرانٹ دی گئی ہے۔ وزیرِ اعظم کی ذاتی ہدایت پر ملک کے پیشہ ورانہ کالجوں میں قبائلی طلباء کے لئے اور زیادہ نشستیں مخصوص کی گئی ہیں۔ ۱۹۷۲-۷۳ء میں قبائلی طلبا کے لئے میڈیکل کالجوں میں ۲۹ اور ٹیکنیکل کالجوں میں ۴۳ نشستیں یعنی کل ۷۲ نشستیں مخصوص کی گئیں۔ اب قبائلی طلباء کے لئے کل ۱۲۹ نشستیں مخصوص ہیں۔ ان میں سے ۵۹ میڈیکل کالجوں میں اور ۷۰ ٹیکنیکل کالجوں میں ہیں۔

صحت

۱۹۷۱ء تک قبائلی علاقوں میں علاج معالجے کی سہولتیں برائے نام تھیں۔ فرنٹیئر کور کے کچھ ہسپتال اور ڈسپنسریاں تھیں۔ لیکن وہاں عام طور پر کور کے آدمیوں ہی کا علاج ہوتا تھا۔ اب فرنٹیئر کور کے ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کے علاوہ ۱۳۳ ڈسپنسریاں اور ۴۴ ہسپتال ہیں جو پورے سامان سے لیس ہیں اور وہاں پورا عملہ کام کر رہا ہے۔ ۱۹۷۴-۷۵ء میں ہسپتال اور ڈسپنسریاں کھولنے اور ان کی عمارتیں بنانے پر ۴ ۳۴ء ۳۱ ملین روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ جن اسکیموں پر یہ رقم خرچ ہوئی ہے ان میں آٹھ آٹھ بستروں کے ۹ نئے ہسپتال، ۱۸ نئی ڈسپنسریاں لنڈی کوتل میں، ایک نیا ایجنسی ہیڈ کوارٹر ہسپتال اور صحت کے دس بنیادی دیہی مرکز شامل ہیں۔ ان کے علاوہ چار سول ہسپتالوں کا درجہ بڑھا کر انہیں ایجنسی ہیڈ کوارٹر ہسپتال بنا دیا گیا ہے ان ہسپتالوں میں علاج معالجے اور سرجری کا خصوصی انتظام ہے۔

مواصلات

عوامی حکومت کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ عوام کے لئے مواصلات کا وسیع سلسلہ مہیا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ پچھلے چار سال میں سڑکوں کی مختلف سکیموں پر دس کروڑ ۷۹ لاکھ روپے خرچ کئے گئے [illegible] اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پختہ سڑکوں کی مجموعی لمبائی جو ۱۹۷۱ء میں [illegible] تھی ۴۰۲۳ میل تک جا پہنچی ہے۔ بجری کی سڑکوں کی مجموعی لمبائی جو ۱۹۷۱ء میں ۶۸۱ میل تھی اب ۸۲۱ میل تک اور کچی سڑکوں کی لمبائی ۲۶۷ میل سے ۵۱۶ میل ہو گئی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ہر طرح کی سڑکوں کی مجموعی لمبائی ۱۲۷۹ میل تھی جو ۱۹۷۵ء میں ۱۹۹۹ میل ہو گئی۔ سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کے لئے ۱۹۷۵-۷۶ء میں سالانہ ترقیاتی پروگرام کے لئے ۶ کروڑ ۱۸ لاکھ ۸۰ ہزار روپے کی رقم رکھی گئی ہے [illegible] سی چھوٹی سکیموں پر پیپلز ورکس پروگرام کے تحت عملدرآمد ہو رہا ہے۔ ان سکیموں کے تحت جون ۱۹۷۵ء کے آخر تک پچاس میل لمبی کچی سڑکیں بنائی جا چکی تھیں۔

زراعت

قبائلی علاقوں میں پچھتر فی صد مزدور زراعت کے ذریعے روزی کماتے ہیں۔ پچھلے چار سال میں ایک کروڑ ۳ لاکھ ۹۰ ہزار روپے کے خرچ سے تقریباً ایک ہزار ایکڑ رقبے کو قابلِ کاشت بنا[یا گیا]۔ بحالیٔ زمین کیلئے ۱۹۷۵-۷۶ء کے سالانہ منصوبے میں ۴۵ لاکھ روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے اس کے علاوہ قبائلی علاقوں کی ترقیاتی کارپوریشن دریائے باڑہ کی نہروں سے سیراب ہونے والے علاقے میں ۲ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے کے خرچ سے ۳۸ ہزار ایکڑ رقبے کو قابلِ کاشت بنائے گی۔

زرعی زمین سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے کسانوں کو عمدہ قسم کا بیج اور رعایتی نرخوں پر کیمیاوی کھاد مہیا کرنے، کیڑے مکوڑوں اور فصلوں کی بیماریوں پر قابو پانے اور آب پاشی

لیے پانی باقاعدگی کے ساتھ فراہم کرنے کی اسکیمیں بھی تیار کی گئی ہیں۔

دریائے باڑہ کی نہروں کی اسکیم کے تحت خیبر ایجنسی میں ۸ ہزار ایکڑ اور ضلع پشاور میں ۱۱ ہزار ایکڑ رقبے کو ہر موسم میں پانی ملتا رہے گا۔ اس اسکیم کے تحت دریا کے دائیں اور بائیں کناروں سے نکلنے والی نہروں میں پانی آنے لگا ہے۔ شمالی وزیرستان میں ٹیوب ویلوں کی اسکیم کے تحت عیدک اور کھجوری کے میدان میں ۴ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا۔ اس اسکیم کے تحت ۶ ٹیوب ویل کام کرنے لگے ہیں۔ اس وقت زرداں، شلوزان (کرم ایجنسی) اور اسپین میدان (جنوبی وزیرستان ایجنسی) کی آب پاشی کی اسکیموں پر کام ہو رہا ہے۔ ان کے مکمل ہونے پر ۱۸،۷۰۰ ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا۔ قبائلی علاقوں میں زیرِ زمین پانی کے ذخیروں کو کام میں لانے کے لیے قبائلی علاقوں کی ترقیاتی کارپوریشن نے امریکہ سے دو INGERSOL RAND رگ منگائے ہیں۔ آسٹریلیا سے چھ CABLE TOOL DRILLING RIGS منگائے جا رہے ہیں۔ ان میں سے تین رگ پاکستان پہنچ چکے ہیں۔

مویشیوں کی افزائش اور علاج

۱۹۷۱ء میں قبائلی علاقوں میں مویشیوں کے علاج کے لیے ۳۶ ہسپتال اور ڈسپنسریاں تھیں۔ اب وہاں ۵۶ ہسپتال اور ڈسپنسریاں ہیں جہاں مویشیوں کا علاج مفت ہوتا ہے۔ وزیری بھیڑوں کی نسل بڑھانے اور مویشیوں کی افزائش کے لیے برابر کوشش کی جا رہی ہے۔ قبائلی طلباء کو اس بات کی ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ مویشیوں کے بارے میں مختلف علوم کا مطالعہ کریں۔ بی۔ ایس۔ سی (اینیمل ہزبینڈری) کے طلباء کو وظیفے دیئے جا رہے ہیں۔ جو لوگ وٹرنری کمپاونڈروں اور اسٹاک اسسٹنٹ کی حیثیت سے تربیت پاتے ہیں انہیں بھی وظیفے دیئے جاتے ہیں۔

صنعت

۱۹۷۱ء تک صنعتی شعبے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی تلافی کے لیے قبائلی علاقوں کی ترقیاتی کارپوریشن قائم کی گئی۔ ان دنوں یہ کارپوریشن قبائلی علاقوں میں ماچس، سگریٹ، پھلوں اور سبزیوں، چمڑا رنگنے، جوتے اور چمڑے کا دوسرا سامان بنانے، قالین کے دھاگے، شیشے اور بناسپتی گھی کے کارخانے لگا رہی ہے۔ ان اسکیموں پر مجموعی طور پر ۵ کروڑ ۲۱ لاکھ ۴۷ ہزار روپے لاگت آئے گی۔ ماچس اور سگریٹ کے کارخانوں پر کافی کام ہو چکا ہے اور توقع ہے کہ ان میں اسی سال مال تیار ہونے لگے گا۔ دوسرے کارخانوں میں ۱۹۷۵-۷۶ء کے آخر تک مال تیار ہونے لگے گا۔

ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹر

تربیت یافتہ اور نیم تربیت یافتہ کارکنوں کی بڑھتی ہوئی [illegible] کرنے کے لیے صنعتی تربیت اور پیداوار کے پانچ مرکز قائم کئے گئے ہیں۔ دستی صنعتوں کا ایک ایک مرکز درہ آدم خیل اور میران شاہ میں، اون کی صنعت کا ایک ایک مرکز میران شاہ اور وانا میں، مزری کی صنعت کا مرکز علی زئی میں قائم کیا گیا ہے۔

ان دنوں ان مرکزوں کی از سرِ نو تنظیم کی جا رہی ہے تاکہ یہ پہلے سے زیادہ مفید طریقے پر کام کر سکیں۔ پچھلے چار سال میں ان مرکزوں میں ۴۳۵ افراد نے تربیت پائی۔ ۱۹۷۵-۷۶ء میں ان مرکزوں کے لیے ۲۸ لاکھ ۷۰ ہزار روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے۔

پبلک ہیلتھ انجینئرنگ

وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جب قبائلی علاقوں کا دورہ کیا تھا تو انہوں نے ہدایت کی تھی کہ ان علاقوں میں پانی کی فراہمی کی

متعدد اسکیمیں فوری طور پر تیار کی جائیں تاکہ قبائلی باشندوں کو پینے کے لئے صاف ستھرا پانی مل سکے۔ پچھلے چار سال میں ان اسکیموں پر ۲ کروڑ ۳۴ لاکھ روپے سے زیادہ رقم خرچ کی جا چکی ہے۔ درّہ خیبر، جمرود، میران شاہ اور درتہ خیل کے لئے پانی کی اسکیمیں مکمل ہو چکی ہیں۔ دوسری سکیموں پر کام ہو رہا ہے اور یہ اسکیمیں بھی مکمل ہونے والی ہیں۔

۱۹۷۵-۷۶ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں پینے کے پانی کی اسکیموں کے لئے ایک کروڑ ۷ لاکھ ۳۰ ہزار روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ یہ اسکیمیں مختلف قبائلی علاقوں کے لئے ہیں

بجلی کی فراہمی

عوامی حکومت ترقی کے ہنگامی پروگرام کے تحت تمام قبائلی علاقوں میں بجلی کی فراہمی پر عمل درآمد کر رہی ہے۔ پچھلے چار سال میں اس پروگرام پر دو کروڑ ایک لاکھ ۹۰ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں اور ۱۱۶ دیہات میں بجلی پہنچائی گئی ہے۔ باجوڑ کے علاقے میں بجلی کی فراہمی کی اسکیم مکمل ہو گئی ہے۔ وہاں ۲۰ دیہات میں بجلی پہنچی ہے جس سے تقریباً چالیس ہزار صارفین نے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح مہمند ایجنسی میں یوسف خیل اور دوسرے ۲۲ دیہات میں بجلی پہنچ گئی ہے۔ ۱۹۷۵-۷۶ء کے بجٹ میں قبائلی علاقوں میں بجلی پہنچانے کے لئے ایک کروڑ ۱۶ لاکھ ۴۰ ہزار روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ ۱۹۷۱ء تک صرف ۳۵ دیہات میں بجلی پہنچی تھی۔ اب ۱۵۱ دیہات میں بجلی پہنچ چکی ہے۔

پیپلز ورکس پروگرام

دور دراز علاقوں کی مقامی ترقی کے لئے پیپلز ورکس پروگرام بڑا مؤثر ثابت ہوا ہے۔ اس پروگرام پر عملدرآمد میں قبائلی باشندوں کو شریک کرنے کے لئے حکومت نے ایجنسی ترقیاتی کمیٹیاں، حلقہ ترقیاتی کمیٹیاں اور دیہی ترقیاتی کمیٹیاں (جرگے) قائم کرنے کی منظوری دی ہے۔ تمام کمیٹیاں، وفاقی حکومت کے زیر انتظام قبائلی علاقوں کی دیہی ترقیاتی کونسل کی نگرانی میں کام کریں گی۔ حکومت نے اس پروگرام کے لئے فراخ دلانہ گرانٹ منظور کی ہے۔ اس کے تحت سڑکیں بنانے، آب پاشی، سیلاب پر قابو پانے، اجتماعی مراکز اور اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر اور پینے کے پانی کی فراہمی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی اسکیموں پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ پچھلے چار سال سے اس پروگرام پر دو کروڑ ۶۲ لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ ۱۹۷۵-۷۶ء کے بجٹ میں اس کے لئے ۷۵ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ یہ پروگرام قبائلی علاقوں کی معاشی ترقی کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔

مربوط دیہی ترقی کا پروگرام

مربوط دیہی ترقی کے پروگرام کے تحت خار (باجوڑ ایجنسی) پاراچنار (کرم ایجنسی) اور محمد خیل (شمالی وزیرستان) میں ایک ایک مرکز کھولا جا رہا ہے۔ ۱۹۷۵-۷۶ء کے قبائلی علاقوں کی ترقی کے سالانہ پروگرام کے لئے اس مد میں ۱۵ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔

اردو ادب

ایم اے صدیقی

پاکستان میں ادب بڑی حد تک شہروں کی پیداوار ہے اسی لئے یہ معاشرتی اور معاشی تقاضوں اور عوامل سے گہرا اثر لیتا ہے۔ جب جناب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے اقتدار سنبھالا تو صحیح طور پر یہ توقع کی جاتی تھی کہ اب ملک کے ادبی میدان میں رونق آجائے گی اور ادیب اور ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنانے کی ذمہ داری قبول کریں گے۔ آزادیِ فکر نہ صرف جمہوری اداروں کی ترقی بلکہ فن اور ادب کی ترقی کے لئے بھی ضروری ہے اس لئے ملک میں جمہوریت کی بحالی سے تعمیری ادب کی تخلیق کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

قیامِ پاکستان کے وقت اردو ادب پنجاب، صوبہ سرحد اور ملک کے کچھ دوسرے حصوں میں خاصا مقبول تھا۔ اس وقت نئے دور کے ادیب جن موضوعات پر خاص طور سے توجہ دے رہے تھے ان میں آزادی، مساوات، قومی پیداوار اور بین الاقوامیت شامل تھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادب کے روایتی موضوعات جن میں استعارے اور علامات بکثرت استعمال ہوتے تھے ناپید ہو گئے تھے۔ البتہ ادب کا یہ رجحان زوال پذیر تھا۔ گل و بلبل کی شاعری کو نئے قالب میں ڈھالنا ضروری تھا اور کچھ جدت پسندوں نے کام بھی کر دکھایا اور ثابت کر دیا کہ وہ اس کے اہل ہیں۔

برصغیر میں تمام زبانوں کے ترقی پسند ادیب ادب میں رجعت و قدامت پسندی کے مخالف تھے۔ روایتی ادب کے بارے میں بجا طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ انسان کے دکھوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ بہت سے جدید ادب کے حامی بھی جو انیسویں صدی کے ساتویں عشرے کے دورِ انحطاط کے فرانسیسی ادیبوں کی طرح ادب کی موضوعاتی تقدیس کے قائل تھے، درحقیقت قدامت پسند تھے جو ادب میں اپنے وقت کی معاشرتی اور معاشی حقیقتوں کو روشناس کرانے کو بدعت سمجھتے تھے۔ یہ بڑی مضحکہ خیز صورتِ حال تھی اور ادب کی موضوعاتی تقدیس کی تحریک کا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو طبقے ہائے [illegible] کسی بھی قسم کی معاشرتی تبدیلی کے مخالف ہیں ان کے لئے ذہنی ڈھال مہیا کی جائے یہ لوگ ادب برائے ادب کا نعرہ لگاتے تھے۔

راجر فرائی (ROGER FRY) نے بالکل صحیح کہا تھا کہ ۱۸۷۰ء سے آج تک جدت پرستی کی تمام تحریکیں اپنے مزاج کے اعتبار سے رجعت پسند تھیں۔ آج بھی صورتِ حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بودلیئر (BAUDELAIRE) کی طرح گھر بیٹھ کر اپنی تحریروں کے ذریعہ معاشرتی برائیوں اور معاشی ناہمواریوں کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ

جو ادیب مقصدیت کے قائل نہیں ہوتے وہ بڑا اچھا ادب تخلیق کرتے ہیں کیونکہ ان پر مقصدیت اور معاشی اخلاق کے تقاضے پورے کرنے کا جنون سوار نہیں ہوتا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو جدت پسند ادب کا مطالعہ روایتی انشائی ادب کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور ضروری ہو جاتا ہے۔ اب بہت سے ادیبوں کی تخلیقات خالص انسانی مسائل کا احاطہ کرتی نظر آنے لگیں کیونکہ بہرحال ان مسائل سے کسی نہ کسی طرح نپٹنا ضروری تھا۔ ایسے وقت میں جبکہ چاروں طرف بے چینی پھیلی ہوئی ہو خیالوں کی دنیا میں پناہ لینے سے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

اگر ہم سرسید کی اصلاحی تحریک کی روشنی میں جس میں ادب کے ساتھ خیالات کی اصلاح بھی شامل تھی کچھ اہم ترقی پسند ادیبوں کے رشحات قلم پر نظر ڈالیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ ترقی پسندی کے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت شروع ہی سے رکھتا تھا۔ یہ معاشرہ کب تک حقائق کی طرف سے آنکھیں بند رکھ سکتا تھا جو قوم حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتی ہے وہ صورتِ حال سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی اور ان مسائل کے حل کے لئے ضروری قدم نہیں اٹھا سکتی۔

آزادی کے بعد چار سال تک ہمارے ادبی میدان میں دو طاقتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں۔ ایک طرف ترقی کے جویا ادیب تھے اور دوسری طرف ادب برائے ادب کے حامی۔ موخر الذکر ادیب ایسی زبان استعمال کرنے کے عادی تھے جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ دوسرا گروپ ماضی کے مقابلے میں صرف حال سے سروکار رکھنا چاہتا تھا۔ پاکستان حق خود ارادیت کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے لاکھوں آدمیوں کو گھر بار چھوڑنا پڑا تھا۔ کچھ ادیبوں نے اس دور کے واقعات کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ اس دور انسان دوستی کا جذبہ کارفرما تھا۔ ان دنوں لٹے پٹے قافلے سرحد پار سے پاکستان آ رہے تھے اور اپنے آپ پر وحشیانہ مظالم کی داستانیں سنا رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

بنیادی طور پر اس دور میں انسانیت پرستی کا جذبہ ادیبوں پر حاوی تھا۔

معاشرتی تاریخ کے طالب علم کے لئے اس پس منظر میں احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، ظہیر کشمیری، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قدرت اللہ شہاب، ابراہیم جلیس، رئیس امروہوی اور بہت سے دوسرے ادیبوں کے اشعار اور افسانوں کا مطالعہ بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۹۵۴ء کے بعد ترقی پسندی کچھ مضمحل سی ہو گئی اور اچانک غزل گوئی کا رواج بڑھ گیا البتہ غزل میں ترقی پسند اور وجودی خیالات کا اظہار ہونے لگا۔ میر تقی میر سے فراق تک غزل کی جو روایت چلی آ رہی تھی اُسے ناصر کاظمی اور منیر نیازی جیسے ترجمان مل گئے جن کے کلام سے قطعیت کی تلاش کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ محض غنائیت کا احیا نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بربط شکستہ کے تار خود بخود جُڑ گئے ہوں اور اس کے نغمے روح کی گہرائی کو چھونے لگے ہوں۔ ناصر کاظمی، مجید امجد، منیر نیازی، ابن انشا، شکیب جلالی، باقی صدیقی، سلیم احمد، اطہر نفیس، جون ایلیا، احمد مشتاق، شہزاد احمد اور کچھ دوسرے شاعروں کی شاعری اسی دور کی پیداوار ہے۔

ترقی پسندی کی تحریک ختم ہونے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ترقی پسندانہ اندازِ فکر بھی ختم ہو گیا۔ فیض، قاسمی، ممتاز حسین، عبادت بریلوی، مجتبیٰ حسین، عزیز حامد مدنی، شوکت صدیقی، عارف عبدالمتین، فارغ بخاری، ظہیر کاشمیری، ابراہیم جلیس، ہاجرہ مسرور، قمر ہاشمی، مسلم ضیائی اور حمایت علی شاعر اپنے قارئین کو حال کی طرف متوجہ کرتے رہے۔

جمالیاتی گروپ میں قیوم نظر، ضیا جالندھری، حمید نسیم، مختار صدیقی، ن۔ م۔ راشد، حفیظ ہوشیارپوری، مجید امجد، اعجاز بٹالوی، محمد حسن عسکری، شاہد احمد دہلوی، یوسف ظفر، غلام عباس، ممتاز شیریں جیسے انفرادیت پسند ادیب شامل ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس گروپ میں بڑے اچھے اچھے ادیب شامل ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں سے کچھ

ادیبوں کے خیالات نئی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہوگئے۔ ان کا تقاضا یہ تھا کہ زندگی سے فن کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

لگ بھگ ۱۹۶۰ء میں وجودیت ہمارے ادب کے میدان میں خیمہ زن ہوئی۔ اس وقت تک سارتر اور کیمس کافی مشہور ہو چکے تھے ہمارے کچھ ادیبوں کی تحریروں میں ان کے خیالات کی گونج سنائی دینے لگی۔ لیکن وجودیت اور جدیدیت کی باقاعدہ تحریک بعد میں ہمارے ادب میں آئی۔

غالباً جدید خیالات کی اسی یلغار کی وجہ سے ڈاکٹر وزیر آغا کے گروپ نے جو سرگودھا مکتبۂ ادب کے نام سے مشہور رہے زمین کے ساتھ رشتوں پر زور دیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک نیا جمالیاتی نظام پیش کیا یا اسے از سرِ نو مرتب کیا جس میں آسمان کے ساتھ زمین کے رشتے واضح کئے گئے تھے۔ بہت سے ادیبوں نے ان کی تقلید کی کوشش کی۔ ان میں غلام الثقلین نقوی، انور سدید، غلام جیلانی، اصغر، سجاد نقوی اور غلام اظہر شامل ہیں۔

شروع میں اس مکتبۂ فکر کے ادیب یورپ کے ان جمالیاتی ادیبوں کے خیالات پیش کرتے رہے جو اس بات کے خلاف تھے کہ ادب سے معاشرتی برائیوں کے علاج کا کام لیا جائے۔ ان ادیبوں کا بھی یہی خیال تھا کہ معاشی اور معاشرتی مسائل ادب میں داخل نہ ہونے دیئے جائیں۔ لیکن بعد میں اس گروپ نے اپنے آپ پر تنقید کے زیرِ اثر اپنے خیالات میں تبدیلی کر لی۔ اب اس گروپ کا سب سے بڑا ترجمان یہ اعتراف کرنے لگا ہے کہ ادب کا معاشرتی اور سیاسی پہلو بھی ہوتا ہے لیکن ادب کو پروپیگنڈے کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔

لگ بھگ ۱۹۶۰ء ہی میں لاہور میں شاعری کا ایک نیا اسکول منظرِ عام پر آیا جو نئی شاعری کا اسکول کہلاتا ہے۔ یہ گروپ ہر قسم کی پابندی یہاں تک کہ زبان کی پابندی کو بھی زبان بندی کے مترادف سمجھتا ہے۔ اس گروپ نے ایسی زبان استعمال کرنے کی کوشش کی ہے جسے سب سمجھ سکیں، ان ادیبوں نے کبھی اس کا اعتراف نہیں کیا لیکن اس اسکول پر وینیل جنسٹین کے گہرے اثر کا کوئی اور مطلب نہیں ہو سکتا۔ یہ اسکول اعلیٰ اور جذباتی زبان استعمال کرنے کا مخالف ہے۔ اس کے نزدیک پرائیویٹ زبان بے معنی فقرہ ہے۔ شاعری کی زبان صدیوں تک استعمال میں رہنے کی وجہ سے اپنی صداقت اور صحیح مفہوم کھو چکی ہے۔ یہ زبان گھسے ہوئے سکے کی طرح ہے افتخار جالب اور انیس ناگی اس مکتبہ کے رہنما تھے اور انہوں نے بڑا اچھا آغاز کیا تھا۔ منیر نیازی، عباس اطہر، تبسم کشمیری، شاہد ڈار، یوسف کامران، محمد سلیم الرحمٰن اسی مکتبے کے ادیب ہیں۔ نوجوان ادیبوں کے اس گروپ میں سعادت سعید، فہیم جوزی، سرمد صہبائی اور نسرین انجم بھٹی بھی شامل ہو گئے ہیں۔

اردو ادب کے لئے پچھلے چار سال بڑے اہم تھے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ عوامی حکومت کا برسرِ اقتدار آنا بجائے خود ایک داستان ہے۔ جو پارٹی اب برسرِ اقتدار ہے، ادب کے بارے میں اس کا نظریہ شروع ہی سے صاف اور واضح رہا ہے۔ وہ یہ کہ ادیبوں کو اپنی معاشرتی ذمہ داری پوری کرنی ہے۔ ترقی پسند ادیب بھی یہی کہتے آئے ہیں۔ جب تک ملک کے معاشرتی اور معاشی ڈھانچے کی بنیاد مساوات کی سیاست پر نہ رکھی جائے قومی زندگی کے کسی شعبہ میں ترقی ممکن نہیں ہے۔ ادیب اور دانشور برسرِ اقتدار پارٹی کے پُر زور حامی تھے اور وہ بجا طور پر یہ سوچتے تھے کہ معاشرتی مسائل کو عوام کی سب سے نچلی سطح پر حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کے مایوس کن ایام میں جب موجودہ حکومت نے اقتدار سنبھالا تو بہت سی علمی اور ادبی بحثیں منظرِ عام پر آگئیں گویا اس کے لئے اسی وقت کا انتظار ہو رہا تھا۔ جو معاشرہ اپنے دانشوروں کی بنیادی نوعیت کے معاشرتی اور عقلی مسائل پر کھل کر بحث کرنے کی اجازت نہیں دیتا وہ کسی بھی سمت سے غیر متوقع طور پر طوفان اٹھنے سے غافل رہتا ہے۔ ذہنی طور پر چوکس رہنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا دفاعی طور پر چوکس رہنا۔ جس طرح

دفاع کے معاملے میں چوکس رہنے سے ملک کے جغرافیائی وجود کی بخوبی حفاظت ہوسکتی ہے اسی طرح ذہنی طور پر چوکس رہنا قومی ذہن کو تباہی سے بچا لیتا ہے ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے غفلت کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جب ملک کے مقتدر اعلیٰ کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ رجعت پسندی اور مجہولیت جو قرونِ وسطیٰ میں مسلط ہوئی عدم مساوات کی یادگار رہے بالکل ختم کر دی جائے گی تو دانشوروں کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے تھا۔

ادب کو تنیست و نابود ہونے سے بچانے کے لئے ضروری تھا کہ قومی تعمیرِ نو اور ترقی کے لئے قومی سطح پر جو کوششیں ہو رہی ہیں ادب کو ان سے ہم آہنگ کیا جائے۔

اب میں مختصر طور پر بتاؤں گا کہ پچھلے چار سال میں ادب کی مختلف اصناف میں کیا کچھ لکھا گیا ہے۔

ناول اور افسانے

زیرِ تبصرہ مدت میں افسانے بکثرت لکھے گئے۔ اس عرصہ میں شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد سے افسانے کی ترقی کا ٹھیک اندازہ نہیں ہوتا لیکن عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ افسانے نے ترقی کی ہے۔ افسانے کی تکنیک میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اختر جمال کی انگلیاں فگار اپنی، اکرام اللہ کا جنگل، جمیلہ ہاشمی کا اپنا اپنا جہنم، رشید امجد کا بے زار آدم کے بیٹے قاسمی کا کپاس کے پھول، محمد منشا یاد کا بند مٹھی میں جگنو اور قمر عباس ندیم کی شیشے کی آبرو قابلِ ذکر ہیں۔ شیشے کی آبرو ایک نوجوان کی تصنیف ہے اس میں روایتی اور جدید افسانہ نگاری کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ قاری تک ابلاغ کو قربان نہیں کیا گیا — ناصر عزیز بٹ کا ناول "نے چراغے نے گلے" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی بعض بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔

پچھلے چار سال میں سفرناموں نے بڑا رواج پایا۔ بیگم اختر ریاض الدین ابن انشاء، جمیل الدین عالی اور پیر علی محمد راشدی ۱۹۷۱ء سے پہلے ہی اس میدان میں اپنا لوہا منوا چکے تھے لیکن عبدالحق، مستنصر حسین تارڑ نے اس عرصے میں بڑے اچھے سفرنامے لکھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مستنصر حسین تارڑ کی "نکلے تیری تلاش میں" دورِ جدید کے ادب العالیہ میں شامل ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے جس بے تکلفی اور شگفتہ انداز میں سفرنامہ لکھا ہے وہ اپنی دنیا آپ ہے۔

شاعری:-

زیرِ تبصرہ مدت میں بھی پہلے کی طرح شاعری کا بڑا چرچا رہا۔ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ شاعری کے نمونے پیش کئے بغیر محض اچھے شاعروں کے نام شمار کرنا ایک طویل اور اکتا دینے والا کام ہے۔ شاعروں کی صف میں جدید شعرا بھی ہیں، ترقی پسند بھی، جدید ترقی پسند بھی۔ اور روایت پرست بھی۔ اب روایت پرستی کا دور ختم ہو رہا ہے۔ اب جدید شاعر جو کبھی ترقی پسند اور کبھی جدید ترقی پسند کہلاتا ہے۔ اہمیت کا حامل ہے۔ عزیز حامد مدنی، انجم اعظمی، جون ایلیا مبارک احمد، افتخار جالب، انیس ناگی، زاہد ڈار، کشور ناہید صلاح الدین محمود، یوسف کامران، امجد اسلام امجد اور سہیل احمد بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔ صابر ظفر، خالد احمد، مسعود منور، نسرین انجم بھٹی، شائستہ حبیب، فاطمہ حسن، رشید مفتی، اور خورشید الحسنین بھی اظہار کے نئے اسلوب آزما رہے ہیں۔

اچھی تحریروں کے سلسلے میں شکیب جلالی کی روشنی اے روشنی مصطفےٰ زیدی کی کوہ ندا ادا جعفری کی غزالاں تم تو واقف ہو وزیر آغا کی غزلیں اور نظمیں انیس ناگی کی غیر ممنوعہ نظمیں حفیظ ہوشیار پوری کی مقاماتِ غزل، حمایت علی شاعر کی مٹی کا قرض، منیر نیازی کی ماہ منیر عبید اللہ علیم کی چاند چہرہ ستارہ آنکھیں، رشید قیصرانی کی فصیلِ لب سرور بارہ بنکوی کی سنگِ آفتاب اور اطہر نفیس کا کلام اچھے اضافے ہیں فیض احمد فیض کی سرِ وادیٔ سینا اور منیر نیازی کی ماہ منیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ منیر کی غزلوں میں بہت ہی صاف ستھرا اندازِ بیان اور تازگی پائی جاتی ہے ان اشعار سے حسن و رعنائی اور توازن کے لئے روح کی تشنگی جھلکتی ہے۔

تنقید اور نثر

علی عباس جلال پوری کی مقامات وارث شاہ، ڈاکٹر فرمان

اردو کی منظوم داستانیں، پروفیسر حمید احمد خان مرحوم کی ارمغانِ حالی، ایس ایم اکرام مرحوم کی آثارِ شبلی، سلیم اختر کی اردو کی مختصر ترین تاریخ، وزیر آغا کی تخلیقی عمل، شان الحق حقی کی نکتۂ راز، ممتاز مسعود کی آوازِ دوست، فتح محمد ملک کی تعصبات، انور سدید کی فکر و خیال اور اختلافات، صہبا لکھنوی کی اقبال اور بھوپال، قاسمی کی تہذیب و فن، مجنوں گورکھپوری کی غالب شخص اور شاعر، شمسون میانر کے نام سے ملٹن کی سیمسن ایگنسٹنز کا ترجمہ، سید محمد تقی کی تاریخ وکائنات میرا نظریہ، افسر صدیقی کی مصحفی اور جمیل جالبی کی ارسطو سے ایلیٹ تک کچھ اہم کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی مثنوی کرم راؤ پدم راؤ پچھلے چار سال میں ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔

مجھے یہ احساس ہے کہ پچھلے چار سال میں اردو اور انگریزی میں مذہب اور تاریخ کی اتنی کتابیں شائع اور دوبارہ شائع ہوئی ہیں کہ ان سب کا شمار مشکل ہے اس لئے میں نے صرف ان کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جن پر ادبی حلقوں میں بحثیں ہوئی ہیں۔ اور بھی ایسی کتابیں ضرور ہوں گی جو اس فہرست میں شامل ہونے کے قابل تھیں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔

اردو ادب کے حالات بڑے امید افزا ہیں۔ امریکی پروفیسر میر یوپی نے پاکستان کی قومی زبان کو دورِ جدید کا معجزہ قرار دیا ہے۔ اردو اتنی تیزی سے مقبول ہو رہی ہے کہ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تھوڑے ہی دنوں میں پاکستان کے اردو ادب میں علاقائی زبانوں جیسا زور پیدا ہو جائے گا۔ اردو ادب اور بھی ترقی کرے گا۔ لیکن پچھلے چار سال میں اس نے جو ترقی کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ یہ ادبی بحث کی آزادی اور ادب کو معاشرے کے سامنے جواب دہ بنانے کا نتیجہ ہے کہ حال ہی میں جو بیج بوئے گئے تھے ان سے نئے نئے شگوفے پھوٹے ہیں اور ان کی مہک ہر طرف پھیل گئی ہے ٭

تاج سعید

دھرتی میں جو بیج تھا بویا وہ اب پھل لے آیا ہے
دیکھ رب کی شان کہ جس نے قسمت کو چمکایا ہے

اپنی دھرتی کے ہم ہیں مالک، دانہ دانہ اپنا ہے
پیار کا موسم اپنا موسم، دُکھ کا موسم سپنا ہے
دھرتی کے چہرے پر ہم نے خونِ جگر ٹپکایا ہے
دھرتی میں جو بیج تھا بویا، وہ اب پھل لے آیا ہے

پربت کی چوٹی کا جھومر تاج بنا ہے دھرتی کا!
ذرّہ ذرّہ، سونا چاندی، اپنی بستی بستی کا
اپنی سوہنی دھرتی نے محنت کا پھول کھلایا ہے
دھرتی نے جو بیج تھا بویا وہ اب پھل لے آیا ہے

گھاٹ گھاٹ، ڈیرے ڈیرے دکھ سکھ سارے اپنے ہیں
خوشیوں بھری اس سیج پہ ساتھی پھیلے سندر سپنے ہیں
سپنوں کی بارات میں کوئی چھم چھم کرتا آیا ہے
دیکھو رب کی شان کہ جس نے قسمت کو چمکایا ہے

ماہِ نو

مدیر اعلیٰ: بیگم مسرت برکی
مدیر: فضل قدیر
نائب مدیر: سید علی محمد حسینی

جنوری ۔ فروری ۔ ۱۹۷۶ء
جلد: ۲۹ —— شمارہ: ۱

اس شمارے میں

ماہ نو کی قدیم روایت یہ رہی ہے کہ اس کا فروری کا شمارہ یادِ غالب کے لئے وقف ہوتا آیا۔ گزشتہ تقریباً ۲۸ برس کے طویل عرصہ میں ہم نے غالب کے متاعِ ہنر کو دلپذیر تر بنانے کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف علمائے ادب اور غالب شناسوں نے بارہا کیا ہے۔ غالب کی صد سالہ برسی کا خیال بھی سب سے پہلے ماہ نو ہی نے ادب نوازوں کے کان میں پھونکا تھا۔ اور فروری ۱۹۶۹ء میں صد سالہ برسی کے موقع پر ایک شاندار غالب نمبر پیش کر کے ادبی انجمنوں اور اداروں کے لئے اس راہ کو کھولا تھا۔ خدا کا شکر کہ ہماری سعی مشکور رہی اور غالب کی صد سالہ برسی جس تزک و احتشام سے تمام دنیا میں منائی گئی اس سے ہمارے ادب کو اور تاریخ و ثقافت کو بڑی تقویت پہنچی۔ غالب نمبر نکالنے کے بعد ہم نے اس چراغ کو بجھنے نہیں دیا اور آنے والے سالوں میں بھی ہمارے فروری کے شماروں میں ایسے گراں بہا مقالات و مضامین غالب کے فکر و فن پر شائع ہوتے رہے جن سے ادب نوازوں اور غالب پر تحقیق کرنے والوں نے بہت کچھ استفادہ کیا۔ اس سلسلے میں ہم اپنے قارئین کی توجہ ان طویل بحثوں کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو غالب کی صحیح تاریخ پیدائش کے متعلق ماہ نو کے صفحات میں اہل علم و ہیئت و نجوم کے ماہرین کے مابین ہوتی رہی تھیں اور بالآخر فروری ۱۹۷۰ء کے شمارے میں نامور ادیب و ہیئت داں جناب سید صمد حسین رضوی نے اپنے گرانقدر مضمون میں اس بحث کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور غالب کی صحیح تاریخ پیدائش ۸ جنوری ۱۷۹۷ء بروز یکشنبہ سیاروں اور قمر کے مواضع سے دقیق زائچوں اور حساب سے ثابت کر دی۔ یہ ایک ایسا فاضلانہ فیصلہ تھا جسے بڑے بڑے ہیئت دانوں نے تسلیم کر لیا۔ یہ سب بحثیں ماہ نو کے صفحات میں بکھری پڑی ہیں۔ ہمیں داد کی طلب نہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہمارے کرم فرماؤں کو ہمیشہ کی طرح فروری کے ماہ میں غالب پر اپنے گرانقدر مضامین بھیجنا یاد رکھنا چاہیئے۔

ہم اپنے گزشتہ شماروں میں بار بار اہل قلم کی توجہ قائد اعظم صدی کے لئے ماہ نو کے خاص نمبر کی طرف دلا چکے ہیں۔ کچھ لوگوں نے بڑی مہربانی سے دستِ تعاون بڑھایا ہے مگر بہت سے احباب نے ابھی توجہ نہیں دی۔ ہماری درخواست اپنے قلمی معاونین سے مکرر یہ ہے کہ وہ بابائے قوم کے شایانِ شان نمبر نکالنے کے لئے جلد تعاون پر کمربستہ ہو جائیں۔

اس شمارے کی ابتداء ایک نعتیہ گیت سے کی گئی ہے۔ نعتیہ گیت، ہمارے ادب کا بڑا متبرک سرمایہ ہیں اور ان سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک سے والہانہ محبت کے جذبات پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ مختلف بولیوں اور علاقائی زبانوں کے نعتیہ گیتوں کو جمع کر لیا جائے اور ہمارے ملک میں عنقریب جو بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اس موقع پر اسے شائع کیا جائے۔ ان نعتیہ گیتوں میں بعض بڑے اہم اور نامور شعراء حسرت موہانی، مضطر خیرآبادی اور بیدم وارثی وغیرہ کا وہ کلام بھی آ جائے گا جس سے نئی نسل کے کان ناآشنا ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ماہ نو کا دسمبر نمبر سابقہ روایات کے مطابق رہا اور بعض اہل علم نے اس کی بڑی تعریف کی ہے ہم ان سب حضرات کے بہت ممنون ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کی طرح ہماری اعانت جاری رکھیں گے۔

خدا کرے یہ شمارہ بھی مرغوب قارئین ہو۔

ف ۔ ق

جذباتِ عقیدت

(نعتیہ گیت)

پروین اختر

لیلی واللیل زلفاں کاری
جنہن کی چھایا تلے جگتا ساری
کیسی سہانی رے بدریا کاری
گیسوؤں والے میں تورے بلہاری

شمس والضحیٰ ہے مکھ کی لالی
سورج صدقے چندرما واری
واری گگن تارے واری کہکشاں ساری
روپ والے میں تورے بلہاری

خلق جہکے تراپن کے پھلواری
فقر کی کلیا کرم پھولوں کی ڈاری
صورت موہنی بات شہد کی پچکاری
پیاری بتیوں والے میں تورے بلہاری

نینن کی لاج امرت رس دھاری
انگ انگ نور پوروں جل جاری
صلِ علیٰ صلِ علیٰ لو ہٹ گئی رین اندھیاری
پریم برکھا والے میں تورے بلہاری

اختر کالوں کیسے جیون کی دوپہریا بھاری
درسا کو ترسیت میں اوگن ہاری
پھیر دو نجریا ہمری اور محبوب باری
لاج بھرے نینن والے میں تورے بلہاری

سلام بحضور شہید کربلاؑ

نیساں اکبرآبادی

ایسے بھی ہیں راہ حق میں جری رُخ جانب طوفاں کرتے ہیں
جب وقت پڑے تو ساماں کیا وہ نذرِ دل و جاں کرتے ہیں

شبیرؑ کا لشکر دیکھو تو بچے بھی ہیں ان میں بوڑھے بھی
کیا جنگ کی یہ ہی صورت ہے یوں جنگ کا ساماں کرتے ہیں

اسلام کا تھا اک نقش مگر کچھ مدھم سا کچھ سادہ سا
شبیرؑ خود اپنے خوں سے اُسے رنگین و نمایاں کرتے ہیں

باطل کی بھیانک آندھی بھی گُل کر نہ سکی شمع دیں کو
ہے نور زمانے میں پھیلا اس طرح فروزاں کرتے ہیں

ایک ایک ستارہ ڈوب گیا گردونِ امامت کا پھر بھی
اسلام کی دنیا روشن ہے اس طرح چراغاں کرتے ہیں

اس گھر کے تو چھوٹے بچے بھی کچھ کم نہیں ہمت میں نیساں
ساحل کے سکوں کو ٹھکرا کر رخ جانب طوفاں کرتے ہیں

زمزمۂ شاعری کی نئی آواز

ڈاکٹر اسد اریب

شاعری کی بنیاد اگلے زمانے کے عالموں نے اُس جذبے پر رکھی تھی، جسے وجدان کہتے ہیں۔ مگر اعلیٰ درجے کی شاعری کے لئے علم اور علم کے لئے تدبیر اظہار کی بھی ضرورت ہے۔ شاعری لڑکوں کا کھیل نہیں۔ اور نہ ہی اُس کم ظرف بڑھیا کا کاتن ہے، جو کاتا اور لے دوڑی۔ یہ مراحل صرف وہی لوگ طے کر سکتے ہیں، جو موضوعہ شاعری کے بنیادی خیالات اور اس کے فکری پس منظر سے بخوبی آگاہ ہوں۔ اور اس فلسفۂ علم کے کامل منتہی بھی ہوں۔ ایک گذشتہ اور دوسری یہ گذشتنی، ان دو صدیوں میں اُردو کے تین بڑے شاعر: غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ گزرے ہیں۔ ان تینوں کی کہانی، عظمت و انفرادیت کے اعتبار سے کم و بیش یکساں ہے۔ ان تینوں نے اپنے عہد کے پرانے سانچوں کو، کاری ضربیں لگا کر اپنی جدت پسند طبیعت کے مطابق ڈھال لیا۔

غالب کا ذہن بھی ان فنی تقاضوں کی آماجگاہ رہا۔ انہوں نے اپنی عقلی برتری اور اپنے حکیمانہ شعور کی بدولت، اپنے عہد پر فتح حاصل کی۔ وہ غالب رہے اور ان کا زمانہ مغلوب۔ انیسویں صدی سے لے کر آج تک جب کہ بیسویں صدی نے شعری ارتقا کے کئی مدارج طے کر لئے ہیں، غالب کو بلا اختلاف اور بے شک و شبہہ ایک بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس بڑائی میں اُس کی فرزانگی کا بھی ہاتھ ہے۔ اور اُس کی تجدد پسند طبیعت کا بھی۔

غالب اُردو کا پہلا شاعر ہے جس نے اُردو غزل میں خیالات کی وحدت اور شعور کی رَو کو برقرار رکھنے کی سعی کی۔ یہ تجربہ اس دَور کے مصحفیؔ اور آتشؔ کے ہاں بھی ہے۔ مگر محدود ہے، مستقل اور مسلسل نہیں۔

غالب کو اپنے معاصر فنکاروں پر جو عقلی برتری حاصل تھی، اس کا منطقی لازمہ بھی یہی تھا کہ وہ حسرتِ تعمیر سے ہاتھ نہ کھینچیں۔ غالب سے پہلے اُردو غزل نے کئی مرحلے طے کر لئے تھے، مسلسل سفر اور سفر کی یکساں کیفیتوں نے اس کے چہرے پر تھکن کے آثار پیدا کر دیئے تھے، جیسے کسی درماندہ رہرو کے چہرے پر زندگی کی توانائی اور بھرپور لذت نہیں آتی۔ اردو غزل کے چہرے پر بھی اضمحلال کے یہی آثار نمایاں تھے۔ غالب نے اپنی آسمانی فراست اور حکمت سے شاعری کے اس انفعال کو دُور کیا۔ اُردو غزل میں انہوں نے جو تجربے کئے وہ تجربے اسی احساس کا حاصل ہیں۔ غزل تو پھر غزل ہے: اس عہد کے زمزمۂ شعر کی سب سے زیادہ دلنشیں آواز، غالب نے تو اُردو قصیدے کو بھی سنبھالا دیا۔ سوداؔ اور ذوقؔ نے قصیدے کے چہرے کو، غیر منطقی اور مصنوعی خیالات کی جس ضرب سے بگاڑ رکھا تھا، غالبؔ نے اس کا بھرپور علاج کیا۔ تمثیل کے طور پر ایک ایسا قصیدہ لکھا، جس کی تشبیب (چہرہ) کو

اردو شاعری کا فکری سرمایہ کہنا چاہیئے۔ یہ قصیدہ (دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں) اردو کے آفاق میں خیالات کی ایک نئی دنیا ہے۔

غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے غزل کے قریب تر رہ کر، اظہار کے تسلسل کا خاص اہتمام کیا، اور اس خوبی کے تعین میں بعض معروضی رابطے بھی استعمال کئے۔ ردیف و قوافی کو ایک ایسے ڈھنگ سے چنا جو موضوعِ خیال کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہوا، اور اظہار کے معاملے میں نفسِ مضمون کی پیشوائی کی۔ اس خوبی کی بہترین مثال وہ غزل ہے جس میں عظمتِ بشر کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو اُس عظمت کا مظہرِ خاص قرار دیا ہے اور کہا ہے: اصلِ ہستی میں ہوں مخلوق ہیں میرے آگے کسی کی پیش نہیں جا سکتی

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اِک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جُز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھِستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

نفسیاتی رجحان کے تسلسل کو برقرار رکھنے اور فکری سلیقے کو ہموار و یکساں کرنے والی غزلیں وہ ہیں، جن میں غالب کی شاعرانہ عظمت کا سراغ ملتا ہے۔ ان غزلوں کو ملاحظہ کیجئے تو ایک عظیم تر غالب ہاتھ آتا ہے۔ ایسی چند غزلیں وہ ہیں، جن کی ابتداء درج ذیل مطلعوں سے ہوتی ہے۔

مط — دردِ سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

مط — رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

مط — مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

مط — ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

مط — عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

یہ وہ غزلیں ہیں جن میں طبیعت کے یکساں رجحان کو غلبہ حاصل ہے ان میں خیالات کی بے ربطی اور ذہنی تلوّن کی کوئی کیفیت نہیں۔ نہ ان میں کوئی فکری ژولیدگی ہے۔ نہ خیالات کا کوئی تصادم ہے۔ ہر غزل واقعاتِ واردات کے کسے ہوئے سانچے میں ملتی ہے۔ شعور کی سطح ہموار رکھنے کے لئے تخاطب کی ضمیریں بھی ان میں یکساں ہیں۔ اظہارِ مضمون میں لہجے کی نثری خصوصیات کو قائم رکھنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ایسے لفظوں کا بندوبست کیا گیا ہے جو عام طور پر جملوں کی نثری ساخت میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ لفظ صرف لفظ ہی نہیں، مکمل کلمے کی صورت میں، لہجے کے مختلف وقفوں میں رابطے کا کام بھی سرانجام دیتے ہیں۔ "کیوں ہو"! "کیوں نہ ہو"! "اچھا۔ نہ جانیں"۔ "تھا کیا"۔ "ہو کیوں"؟ "سہی"۔ اسی قبیل کے کلمات ہیں۔

درج ذیل مثالوں میں لہجے کی ان خصوصیات کو ملاحظہ کیجئے:

نکالا چاہتا ہے کام، کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

اُس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ، قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے، نوا سنجانِ گلشن کو

گھر میں تھا کیا؟ کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم، اِک حسرتِ تعمیر سو ہے

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے

بعض غزلیں تو خیالات کے ایسے ربط و ضبط اور بیان کے ایسے تسلسل سے لکھی گئی ہیں جن میں زمانے کی ایک بھرپور وحدت کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے یہ غزل:

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمک داں کئے ہوئے

ان غزلوں کا جو لسانی سانچہ ڈھالا گیا ہے۔ اُس میں جذبات کی مکمل کہانی ملتی ہے اور اس کہانی کو جس طرح کہا گیا ہے وہ نثری لب و لہجے کا خوبصورت اسلوب معلوم ہوتا ہے۔

غزل کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ اپنے جذبے کو براہ راست اپنی زبان سے ادا نہ کیا جائے۔ اس اظہار کے کئی تمثیلی پردے تھے۔ یہ حجاب دراصل تہذیبی حجاب تھا جس نے عشق کی ہوس اور شاعرانہ رندی کو علی الاعلان ہونے سے روکا۔ اسی تہذیب نے محبوب کا تشخص بھی قائم نہیں ہونے دیا۔ لیکن غالب نے ان تشخص کو قائم رکھا۔ براہ راست اظہار بھی کیا۔ بعض غزلیں تو اس حد تک راست اظہار کا ذریعہ بن گئی ہیں کہ ان کو متکلم حاضر کے لہجے میں لکھا گیا، جیسے یہ غزلیں:

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں۔ نے دامِ چیدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہوں

اہلِ وَرَع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے حلقے میں میں برگزیدہ ہوں

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

اشعارِ غزل کی ایک معروضی صورت یہ بھی ہے کہ وہ باہم معنوی مشابہت نہ رکھتے ہوں۔ غزل کے شعروں کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ وہ مربوط نہ ہوں اور طشتِ غزل میں وہ لخت لخت دکھائی دیں۔ لیکن غزل میں امکانی وحدتوں کے برقرار رکھنے کا جو تجربہ غالب نے کیا تھا وہ اتنا مقبول اور کامیاب ہوا کہ اردو شاعری اپنا مزاج تبدیل کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ چنانچہ آج کی نئی غزل کلاسیکی غزل سے بالکل علیحدہ دکھائی دینے لگی۔ اس امتیاز و انفرادیت کو وحدتِ افکار کے عمل نے تعمیر کیا۔ غالب کے بعد، فانی اور پھر فانی کے بعد اقبال کے ہاں اس حسن کی جلوہ سامانی عام ہے۔ ان شاعروں کی بعض غزلیں تو اس حد تک افسانوی تسلسل۔ واقعات کا ربط، تخیل کی یک رنگی اور تاثر کی وحدت لئے ہوئے ہیں، جیسے نظم کے تقاضوں کا حاصل ہونا چاہیئے۔ غالب کے دور میں اس تجربے کی ایک صورت کا نام قطعہ بند (ق) بھی تھا۔ اگر خیال غزل سے باہر، ایک الگ اکائی کی صورت میں ہوتا تو قطعہ کہلاتا اور اگر غزل کے اندر واقع ہوتا تو قطعہ بند کہا جاتا۔ دیوانِ غالب میں ایسے کئی تجربے ملتے ہیں، غزلوں میں بھی اور غزلوں سے باہر بھی۔

اس تجربے کی نشان دہی کا سب سے بہتر مقام وہ ہے جہاں قیدِ ہستی کے ذکر کو بنیاد بنا کر یہ کہا گیا ہے:

دل۔ حسرتِ آرزو کا گہوارہ، روح کا سرچشمہ ہے۔ جسم نے اسے اپنا قیدی بنا رکھا ہے۔ یہ روح کے باغِ رضواں کا طائرِ خوش نصیب ہے، قیدِ ہستی میں ناحق گرفتار ہو گیا۔ اس کی آزادی، پرواز میں ہے جس دن اسے سوزِ ہستی جلا دے اور یہ جل جائے، اس طائر کے نئے پَر و بال نکل آئیں گے اور یہ طوبیٰ کی طرف پرواز کر جائے گا۔

مکمل اشعار یہ ہیں:

اٹھا اک دن بگولا سا جو میں کچھ جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا، جی بیاباں سے
نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح و پربستہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ، دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ او ناکام، آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے
ہنسا کچھ کھل کھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یوں رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا میں صید ہوں اس کا، کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغِ رضواں سے
اسی کی زلف و رخ کا دھیان ہے، شام و سحر مجھ کو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ کچھ کام ایماں سے
بچشمِ غور جو دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا....
کہ جل کر ہو گیا تھا خاک، اپنی آہِ سوزاں سے

"از نسخۂ طاہر"

یہی وہ فکری اور فنی راہیں ہیں جہاں غالبؔ کے قدموں کے نشاں الگ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ شاعری کے نگار خانے میں نئی تصویر اور شاعری کے زمزمے کی نئی آواز ہے۔

غزل

جلیل عالی

جو اعتبارِ دلِ دوستاں گنوا بیٹھے
گریزِ ربط میں خود سے بھی دور جا بیٹھے

کماں بدست ہیں سوئے ہمائے وقت سبھی
کہ جانے تیر نشانے پہ کون سا بیٹھے

کشیدہ سر ہیں اب اپنے بھی روبرو کہ بہت
بہ پیشِ خلق ستمگر جبیں جھکا بیٹھے

وہ بات کہتا ہے کچھ ایسے اہتمام کے ساتھ
کہ نقش سب کے دلوں پر جدا جدا بیٹھے

خود اپنا ہاتھ پکڑ کر نکل پڑو عالی
نہ یہ کہ کرتے رہو خضر کا گلا بیٹھے

★

غالب اور تقلیدِ عرفی

ڈاکٹر محمد ریاض

شمس العلماء مولانا حالی کی "یادگارِ غالب" اب بھی مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ایک اہم تالیف ہے۔ مرزا غالب کے فارسی کلام پر تبصرہ کرنے کے بعد حالی لکھتے ہیں:

ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا، مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے۔[1]

حالی کے اس محاکمے اور تبصرے پر اظہارِ نظر کرنے سے پہلے مولانا کے فراہم کردہ موازنے کو ملاحظہ کرنا چاہیے مگر وہ "ندارد" کے مصداق ہے، اور اس کی بڑی وجہ ذوقِ زمانہ کا خیال رکھنا ہے۔ غالب کی فارسی غزل کے ذکر میں ہے:

"مرزا کی غزل شعرائے ایران کے کون سے طبقے کی غزل سے مناسبت رکھتی ہے اور ان شعرا اور مرزا کی غزل میں کیا نسبت پائی جاتی ہے۔"

حالی نے نظیری نیشاپوری (م ۱۰۲۱ھ) اور ظہوری ترشیزی (م ۱۰۲۵ھ) کی ایک ایک غزل سے غالب کی غزل کا موازنہ کیا اور عرفی اور دیگر شعرا کا موازنہ اس لئے نہ پیش کیا کہ ان کے دواوین دستیاب نہ تھے۔ لکھتے ہیں:

"اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ ان سب لوگوں کی غزل کے ساتھ کیا جاتا جن کی غزل پر مرزا نے اپنی غزل، بلکہ اپنی شاعری کی بنیاد رکھی ہے یعنی عرفی نظیری ظہوری اور طالب آملی وغیرہ مگر..... طبائع کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دلچسپی بھی نہیں معلوم ہوتی ہے۔"[2]

ظاہر ہے کہ اس زمانے میں صورتِ حال بدل چکی ہے۔ دواوینِ شعرا دستیاب ہیں اور ایسی تدقیقات سے دلچسپی ایک عام بات ہے۔ اس فرصت میں ہم مختصراً دیکھیں گے کہ سید محمد جمال الدین عرفی شیرازی (م ۹۹۹ھ) نے غالب کی فارسی شاعری پر کیا اثر ڈالا ہے۔

غالب نے فارسی زبان اور ایرانی نژاد شعرا کا کافی تتبع کیا اور اپنی غزلیات کے مقطعوں میں ایسے شعرا کا ذکر بھی کر دیا ہے: شیخ سعدی، حافظ شیرازی، عرفی، نظیری، ظہوری، صائب تبریزی اور ... لاہیجی کا ان کے ہاں خصوصی ذکر ملتا ہے۔ عرفی کے ذکر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

---

[1] یادگارِ غالب مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور صفحہ ۵۸۸　[2] ایضاً صفحہ ۳۰۶

قافیہ غالب چو نیست، بپرس ز عرفی
گر من فرہنگ بود می چہ غمستی[1]

کلیاتِ فارسی کے خاتمے میں غالب نے لکھا ہے: "شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی۔ عرفی شیرازی اور طالب آملی کی غضب آلود نگاہ نے، آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا، اس کو فنا کر دیا۔" ایک جگہ کلیات فارسی کے دیباچے میں، البتہ عرفی اور زلالی خوانساری کو خاطر میں نہیں لاتے:

مسنج شوکت عرفی کہ بود شیرازی
مشو اسیر زلالی کہ بود خوانساری
بہ سومنات خیالم در آی تا بینی
روان فروش بر دوشہای زناری

بہر حال یہ امر واضح ہے کہ عرفی شیرازی، غالب کے محبوب شعرا میں سے ہے اور اس کے قصائد و غزلیات نے مرزا کے اسلوب پر اثر ڈالا ہے۔ نثر میں عرفی نے بظاہر صرف رسالہ "نفسیہ"[2] لکھا ہے۔ غالب کی نثری تحریریں کمیت اور کیفیت دونوں کے اعتبار سے یقیناً عرفی کے اس رسالے پر فائق ہیں۔ ہمیں اشعار سے البتہ موازنے پیش کرنے ہیں:

کلیات عرفی کا ابتدائیہ (ضمناً عبدالرحیم خانخانان کی مدح) ہے۔

ای داشتہ در سایہ ہم تیغ و قلم را
وی ساختہ آرایش ہم حلم و کرم را
جم مرتبہ خانخانان کز اثر نطق
چون گل ہمگی گوش کند جذر اصم را
انصاف بدہ بوالفرج و انوری امروز
بہر چہ غنیمت نشمارند عدم را

عرفی ہمہ لافی، بدعا نیز قلم شو
بشتاب کہ میدان نشود تنگ رقم را[3]

اسی زمین میں عرفی کی ایک معروف نعت ہے:

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را
ہر چند کہ در کشمکش جاہ و مناصب
گمنام نبودند ہمہ دودۂ ہم را
از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را
با گوہر آدم نسبم باز نہ استند
ز آبای خود بہ شمرم اصحاب کرم را
دوران کہ بود تا کند آرایش مسند
مداح شہنشاہ عرب را و عجم را
آرایش ایوان نبوت کہ ز تعظیم
خاک در او تاج شرف داد قسم را[4]

میرزا غالب نے بھی بتقلید عرفی دو مختلف قصیدے لکھے ہیں۔ حضرت عباسؑ بن حضرت علیؑ کی منقبت میں ایک قصیدہ کے چند ابیات مندرجہ ذیل ہیں:

آوارۂ غربت نتوان دید صنم را
خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را
نازم بہ صنمخانہ کہ شاہان جہان جوی
ہم بر در آن خانہ گذارند حشم را
سیم و زر و لعل و گہر آن بہ کہ ازین چار
دوتا دلو دطالع توفیق کرم را

---

[1] کلیات فارسی غالب مطبوعہ مجلس ترقی ادب جلد سوم صفحہ ۳۵۰۔ [2] دیکھیے کلیات عرفی مرتبہ غلام حسین جواہری مطبوعہ تہران [3] کلیات عرفی صفحہ ۵۔ ۸۔
[4] ایضاً صفحہ ۹۔ ۱۰

رو بہت از آن تشنہ جگر جوی کہ از مہر
بر تشنگی شاہ فدا ساختہ دم را
عباسؓ علمدار، کہ فرجام شکوہش
بازیچۂ طفلان شمر شوکت جم[1] را

غالب کا دوسرا قصیدہ، نواب وزیر محمد خان بہادر کی مدح میں ہے۔ اس طویل قصیدہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ای ذات تو جامع صفت عدل و کرم را
دی بر شرف ذات تو اجماع امم را
صد غوطہ بہ زمزم زدہ از بہر طہارت
تا رخصت پابوس تو دادند قسم را
وقت است کہ این جمع بہر کوچہ و بازار
پرسند ز ہم منشا رسوای ہم را
در خشم سخاوت نکنی قطع کہ زابر
بیرون نبود برق تقاضای کرم را
آہنگ دعا چنگ و نی و عود نخواہد
ابریشم این ساز کنم نال قلم را
تا چرخ کشد محمل برجیس، بقا باد
نواب فلک محمل برجیس شیم[2] را

"حسب حال از خویشتن" کے عنوان سے عرفی کا ایک ذو مطلع قصیدہ بڑا معروف ہے۔ اس کے انتخابات ہماری بعض یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ اس قصیدہ میں عرفی نے بڑی قادر کلامی کا ثبوت دے کر خود ستائی کے علاوہ بعض حقائق و معارف جمع کر دیے ہیں۔ چند ابیات ملاحظہ فرمائیں۔

رفتم ای غم ز پی عمر شتابان رفتم
بشتاب ار طلبت ہست ز منی بان رفتم
مشتاب ای غم دنیا کہ بگردم نرسی
بکن از دور رو داغم کہ شتابان رفتم
ایہا الناس بگوئید مبارک بادم
کز صنم خانۂ تن، در حرم جان رفتم
الوداع ای من و رہ دو کش بیہوشی دوست
کاینک از خویش بہ بوی می رہبان رفتم

تجدید مطلع

از در دوست چگویم بچہ عنوان رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم، ہمہ حرمان رفتم
این ہمہ رفتم و رستم کہ شمردم عرفی
بتقاضای ردیف از پی بہتان رفتم
داور داد دش بد دشا قدر اندر رہ عمر
با ثنای تو و نفرین حسودان رفتم
راہ جید ثنای تو سپردم این راہ
نیست راہی کہ توان گفت بہ پایان رفتم
رہ نفرین حسودان تو رفتم لیکن
آن نبر زد کہ بگویم بچہ عنوان رفتم[3]

اس قصیدہ کے تتبع میں غالب کا ایک زوردار قصیدہ ہے جس میں بادشاہ اودھ، نصیر الدین حیدر کی مدح کی گئی ہے: "در مدح شاہ جنت مکان، نصیر الدین حیدر، سلیمان جاہ بادشاہ اودھ"۔ غالب نے تجدید مطلع تو نہیں کیا مگر عرفی کی زمین پر خوب طبع آزمائی فرمائی ہے منتخب ابیات ہیں:

گر نہ سنبل کدۂ روضۂ رضوان رفتم
ہوس زلف ترا سلسلہ جنبان رفتم

---

[1] کلیات فارسی غالب جلد دوم صفحہ ۱۷، [2] ایضاً صفحہ ۱۷۰

[3] کلیات عرفی صفحہ ۱۲۳ بہ بعد

کار فرمائی شوقت توقیامت آورد
مردم و بازِ بایجاد دل و جان رفتم

عالم از کثرت خونابہ فشانی دریاب
کہ بتاراج جگر کاوی مژگان رفتم

نتوان منتِ جانہ بہ گوارا کردن
ہمچنان تشنہ ز سرچشمۂ حیوان رفتم

پای پر آبلہ ذوقِ سفر افزود مرا
راہ بیداری بلا از پی زندان رفتم

حالِ من بنگر و از عاقبت کار مپرس
عمر خود گشتم و در غصہ بہ پایان رفتم

سعی در بابِ رہائی بنود غیر فنا
دود آہی شدم، از روزنِ زندان رفتم

چہرہ اندودہ بگرد و قرہ آغشتہ بخون
خود گواہم کہ ز دعلی بچہ عنوان رفتم

گاہ از ولولۂ نازش جادو رقمی
سخن خود شدم و تا بہ صفاہان رفتم

از جفای فلک آہنگ تظلم کردم
بدر بارگہِ خسرو کیہان رفتم

شاہ جمجاہ کہ دولت بدرش ناصیہ سائیست
ہمچو دولت بدرش ناصیہ سایان رفتم[1]

حکیم خاقانی شروانی (م ۵۹۵ ھ) کے ایک معروف قصیدہ (جزوی طور پر نعتیہ) کا مطلع ہے:

صبح دم چون کلہ بندد آہ دود آسای من
چون شفق در خون نشیند چشم شب پالای من

کئی متاخر شعرا نے اس وزن اور زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ عرفی شیرازی نے ایک قصیدہ میں خاقانی کی تقلید کی داد دی ہے مگر یہاں ہم مقابلے اور موازنے کی خاطر اشعار نقل نہیں کر سکتے۔ عرفی باندازِ فخریہ فرماتے ہیں:

دور عشق را از من گرامی تر نزاد
جوہر من کرد در دوشش گوہر آبای من

نازش سعدی بمشت خاک شیراز از چہ بود
گر نبود آگہ کہ گردد مولد و ماوای من[2]

غالب کا ایک قصیدہ عرفی کی تقلید و تتبع میں کہا گیا ہے دو شعر ملاحظہ ہوں:

زان کمی ترسم کہ گردد قعر دوزخ جای من
وای گر باشد ہمین امروز من فردای من

رند دردآشام غالب نام در ساقی گری
پارۂ مشک و گلاب افزود در صہبای من[3]

قصائد کی تقلید میں اب ہم آخری مثال پر آتے ہیں۔ عرفی کا "حکم و نصائح و پند یات" کا حامل ایک قصیدہ بے حد مشہور رہا ہے اور کئی شعرا نے اس کی تقلید کی ہے۔ اس ذو مطلع قصیدہ کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:

ز خود گر دیدہ بر بندی بر آنم کام جان بینی
ہمان کز اشتیاق دیدنش، زاری ہمان بینی

خرد در آدمی و آنگہ تو شان قدر و رخ سنجی
ہما در آشیان و آنگہ تو فر آشیان بینی

سر روحانیان داری دل خود را ندیدستی
بخواب خود در آ تا قبلۂ روحانیان بینی

غزل پردازم اینک از دو بیت خود دو مصرع را
کنم مطلع کہ حسن آفتاب از فرقدان بینی

---

[1] کلیات فارسی غالب جلد دوم صفحہ ۱۱۲ [2] کلیات عرفی صفحہ ۱۷۱

[3] کلیات فارسی غالب ج ۲ صفحہ ۱۷۷

بخواب خود در آئی قبلۂ روحانیان بینی
ببین در آئینہ تا آتش صد خانمان بینی
بوعظ اندر شو از راہ غزل عرفی ترنم بس
در تشبیب زن آخر مردن خود چون حیان بینی
شعار ملت اسلامیاں بگذار اگر خواہی
کہ در دیر مغان آئی و اسرار نہان بینی
بدام اندر کشیدند اہل معنی طاہر دولت
تو در زیر درختان ہمچو طفلاں آشیان بینی
تو خیر اندیش خلقی پس چنین باید دعای تو
کہ یا رب آنچہ بہر خلق اندیشی، ہمان بینی
نوا از تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خوان چو محمل را گران بینی[1]

اس کی تقلید میں غالب کا مذہبی قصیدہ ہے جس کا مطلع واحد ہے۔ یہ قصیدہ غالب کی مہارتِ فن اور ان کے لطیف مذہبی احساسات کا مظہر ہے۔ ہم بغرض مقائسہ، عرفی کے منقولہ اشعار کے مقابل میں مثالیں نقل کرتے ہیں:

بیا در کربلا تا آں ستمکش کاروان بینی
کہ در روی آدم آلِ عبا را ساربان بینی
بنا شد کاروان را بعد غارت رخت و کالای
ز بار غم بود گر ناقہ را محمل گران بینی
زمینی کش چو فرسائی قدم بر آسمان سائی
زمینی کش چو گردی پا بفرق فرقدان بینی
علم بنگر بخاک رہگذار افتادہ گر خواہی
کہ بر روی زمیں پیدا نشان کہکشان بینی
چہ دندان در جگر افشردہ باشی کاندران وادی
حسینؑ بن علیؑ را در شمار کشتگان بینی
نیاری گر در آن کوشی کہ پایش در رکاب آری
نہ بینی گر خود آن خواہی کہ دستش بر عنان بینی
گر از آہن بود گو باش غم بگدازد آہن را
سنان را ہم ز بیتابی چو مژگان خونچکان بینی
بود تا تکیہ گاہ ناز آمرزش پژوہان را
ضریحی سوی ہند از خاک آن مشہد روان بینی
تعالی اللہ ضریح فرخ فرخندہ فرجامی
کہ فر تاب فروغ فرخی از وی عیان بینی
ضیای زان زیارتگاہ بر روی زمیں بارد
کہ خاک لکھنؤ را مردم چشم جہان بینی[2]

قصیدہ کے بعد اب غزل کی باری ہے۔

عرفی کی ایک غزل کا مطلع ہے:

مدار صحبت ما بر حدیث زیر لبی است
کہ اہل ہوس عوام اند و گفتگو عربی است

یہ غزل خواجہ حافظ کی ایک دلپذیر غزل کے جواب میں ہے اور دیگر شعرا نے بھی اس کے جوابات لکھے ہیں۔ قابلِ نظر نکتہ یہ ہے کہ غالب کا جواب عرفی سے اقرب اور بظاہر اسی کی غزل کے جواب میں ہے:

عرفی

کہ لاف حسن ادب زد بگو بہ بزم مغان
بیا کہ آئینہ در دست شیشہ حلبی است
اگر بہ دختر رز دین و دل برافشانم
ملامتم نکند کس، جوانی و عذبی است
بآسمان و زمین چشم ناز کودکی است
صلاح کار ہمیں ترک مدعا طلبی است
قدم بیرون منہ از جہل نہ افلاطون شو
کہ گر میانہ گزینی، سراب تشنہ لبی است[3]

---

[1] کلیات عرفی صفحہ ۲۱۱ [2] کلیات فارسی غالب جلد دوم صفحہ ۳۲۷
[3] کلیات عرفی صفحہ ۲۹۴

قبولِ خاطرِ معشوق شرطِ دیدار ست
بحکمِ شوق تماشا مکن کہ بی ادبی است
نگوییت بکرو عشا میانہ بگوییم
بہوش باش کہ انکار کیش بوالہبی است

غالب

ظہورِ بخشش حق را ذریعہ بی سببی است
وگرنہ شرم گنہ در شمارِ بی ادبی است
زگیرودار چہ غم چون بعالمیکہ منم
ہنوز قصۂ حلاج حرفِ زیر لبی است
بود بطالع ما آفتاب تحت الارض
فروغ صبحِ ازل در شراب نیم شبی است
عبودیت نہ کند اقتضای خواہش کام
دعا بصیغۂ امر است وامر بی ادبی است
بالتفات نیرزم در آرزو چہ نزاع
نشاط خاطر مفلس زکیمیا طلبی است[1]

آخر میں ایک ایک غزل کا انتخاب موازنے کی خاطر درج کیا جا رہا ہے۔ ہمارے خیال میں ان ہی دو غزلوں میں غالب نے عرفی کا اثر قبول کیا ہے اور بس:

عرفی

آن شیوہ کہ غارتگر صد قافلہ جان نیست
در سلسلۂ حسن تراش، نام و نشان نیست
بی لطفیش از ترک ستم کشتہ یقینیم
این تلخی جان کندنم از تیر و کمان نیست
در روز جزا دست شہیدان محبت
دستی است کہ گیرندۂ دامانِ عنان نیست
دل صاحب دردی است کہ وقت شیون
با آہ خراشیدہ، دلِ مایمیان نیست
زنہار مکن گر ہمہ سنگی بفروشند
آن گوہر نایاب کہ در ہیچ دکان نیست
نومید مشو عرفی و افگندہ عنان باش
ہرچند کہ از کعبۂ مقصود نشان نیست[2]

غالب

دل بردن از ین شیوہ عیانست و عیان نیست
دانی کہ مرا بر تو گمان است و گمان نیست
فرمان تو بر جان من و کار من از تو
بی پردہ بہر پردہ روانست و روان نیست
داغیم زگلشن کہ بہارست و بقا ہیچ
شادیم بگلخن کہ خزانست و خزان نیست
پہلو بشگافید و بہ بینید دلم را
تا چند بگوییم کہ چیانست و چیان نیست
غالب ہلہ نظارگی خویش توان بود
زین پردہ برون آ کہ چنانست و چنان نیست[3]

آخری غزل میں جزوی مماثلت پائی جاتی ہے۔ غالب کی مثنویاں اور ذکار نثر، عرفی کی مثنویوں اور نثر فارسی کے واحد رسالے کے سبک سے متاثر نظر نہیں آتی۔ مولانا حالی نے فرمایا تھا کہ قصیدہ اور غزل میں غالب، عرفی کے لگ بھگ ہیں۔ جن قصائد اور غزلیات کے تتبعات کے مختصر نمونے پیش کئے گئے، ان کے مطابق مولانا کی اس رائے سے اختلاف کرنا مشکل ہے۔ امید ہے کہ قارئین کرام عرفی اور غالب کے دواوین سے ان پورے نمونوں کو مقائسہ و مقابلہ کر کے ہمارے ہمنوا ہو جائیں گے کیونکہ بقول بیدل:

ہر کس اینجا از مقام و حالِ خود گوید خبر
از زبانم حرف او گر بشنوی، باور مکن

---

۱ کلیات غالب جلد۳ فارسی صفحہ ۱۱۱ — ۲ کلیات عرفی صفحہ ۳۱۸۔
۳ کلیات غالب فارسی جلد۳ صفحہ ۹۱۔

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ

اعجاز الحق قدوسی

حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمۃ گلشن سہروردیہ کے وہ گل سرسبد ہیں کہ جن کی خوشبو سے عرفان و تصوف کی وادیاں ہمیشہ مہکتی رہیں گی۔ برصغیر پاک و ہند میں تصوف کے جو سلسلے سب سے پہلے آئے ان میں سلسلہ چشتیہ اور سلسلۂ سہروردیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس برصغیر میں سلسلۂ چشتیہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین اجمیری علیہ الرحمۃ ہیں جنہوں نے پاک ہند میں سلسلۂ چشتیہ کے فیوض و برکات کو عام کیا، حضرت خواجہ معین الدین پرتھوی راج کے عہد میں تشریف لائے، اور اجمیر کو اپنا مستقر بنا کر سلسلے کا کام شروع کر دیا، چنانچہ بتدریج سلسلۂ چشتیہ کا نظام پاک پٹن سے لے کر لکھنوتی اور دہلی سے لے کر دیوگیر تک قائم ہوا۔

اس کے بعد اس برصغیر میں سلسلۂ سہروردیہ کے بانی حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی ہیں، اگرچہ اُن سے قبل اس سلسلے کے پہلے بزرگ حضرت نوح بکھری سندھ تشریف لا چکے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلسلۂ سہروردیہ کو اس برصغیر میں جاری کرنے کا شرف حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی کو حاصل ہوا، وہ اس وقت سندھ پہنچے جبکہ حضرت نوح بکھری کا وصال ہو چکا تھا، حضرت شیخ نوح بکھری کی عظمت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب حضرت خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کو ان کے مرشد حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی نے خرقۂ خلافت سے سرفراز فرما کر رخصت کیا تو اُن سے فرمایا کہ ہمارے بہترین مریدوں میں سے سندھ میں ایک ہمارا مرید نوح بکھری ہے، اُن سے ضرور ملنا، چنانچہ آپ اپنے شیخ کے ارشاد کے مطابق حضرت نوح بکھری کی ملاقات کے لئے بکھر حاضر ہوئے، مگر یہ اُس وقت بکھر پہنچے، جب حضرتؒ نوح بکھری واصل الی اللہ ہو چکے تھے۔

سلسلۂ سہروردیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (متوفی ۱۲۳۴ء) ہیں، چونکہ یہ خود اور ان کے پیر شیخ ضیاء الدین ابو نجیب اور اُن کے مرشد شیخ وجیہہ الدین سہرورد کے رہنے والے تھے، جو عراق عجم کے اندر ہمدان و زنجان کے درمیان واقع تھا، اس لئے اس مقام کی نسبت سے اس سلسلے کو سہروردیہ کہتے ہیں۔ حضرت شیخ سہروردی کی تصنیف عوارف المعارف تصوف کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی نے سلسلۂ سہروردیہ کی نشر و اشاعت میں غیر معمولی جد و جہد کی، اُن کے بہت سے مرید اس برصغیر میں آئے تھے خود انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ہندوستان میں میرے کثیر خلفاء ہیں حضرت شیخ نور الدین مبارک غزنوی، مولانا مجد الدین حاجی، شیخ ضیاء الدین رومی، قاضی حمید الدین ناگوری یہ سب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلفاء میں ہیں جو ہمیں غیر منقسم ہندوستان میں جلوہ افروز نظر آتے ہیں، مگر سلسلۂ سہروردیہ کو اس برصغیر میں جس نے غیر معمولی فروغ بخشا

وہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی ہیں جنہوں نے سلسلۂ سہروردیہ کی خانقاہیں سندھ، ملتان، اُچ اور دوسرے مقامات پر قائم کر کے اس برصغیر میں اس سلسلے کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔

آپ کا اسم گرامی شیخ بہاء الدین زکریا، آپ کی کنیت ابو محمد اور ابو البرکات ہے آپ کے دادا کمال الدین علی شاہ خوارزم سے ملتان آئے، اور کوٹ کروڑ نواحِ ملتان میں سکونت پذیر ہوئے۔

یہیں ۵۶۶ء میں حضرت بہاء الدین زکریا کی ولادت باسعادت ہوئی، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی نے علوم ظاہری کی تکمیل خراسان و بخارا میں کی، حدیث کی تعلیم مولانا کمال الدین محمد سے مدینۂ منورہ میں حاصل کی، روضۂ اقدس نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تزکیۂ قلب اور تصفیۂ باطن کے لئے مجاہدہ کیا، وہاں سے بیت المقدس آئے پھر وہاں سے بغداد پہنچے، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے دست حق پرست پر بیعت ہو کر خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے

حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کا بیان ہے کہ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی اپنے مرشد کی خدمت میں صرف سترہ روز رہے اور روحانی نعمتوں سے مالا مال ہوئے، بعض مریدوں کے دل میں رشک پیدا ہوا، اور شیخ سے عرض کیا کہ ہم اتنے دنوں سے آپ کی خدمت میں ہیں لیکن ہم ابھی تک خلافت سے سرفراز نہیں ہوئے مگر یہ ہندوستانی آیا اور تھوڑی ہی مدت میں شیخ ہو گیا حضرت شیخ شہاب الدین نے اپنے ان مریدوں سے فرمایا کہ تم گیلی لکڑیوں کے مانند ہو جن میں آگ دیر سے لگتی ہے، بہاء الدین زکریا خشک لکڑی کی طرح تھے، جس میں آگ جلد اثر کرتی ہے۔

خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد آپ کے مرشد نے آپ کو حکم دیا کہ وہ ملتان جائیں اور وہاں سلسلۂ سہروردیہ کے فیوض و برکات کو عام کریں، چنانچہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اپنے شیخ کے ارشاد کے مطابق ملتان تشریف لائے اور اسی شہر میں آپ نے علم و عرفان، رشد و ہدایت کی شمع روشن کی، آپ کے فیوض و برکات سے سارا ہندوستان منور ہو گیا۔ ملتان، سندھ اور بلوچستان کے علاقے کو تو آپ کی روحانی سلطنت کہا جاتا تھا۔

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

> "حضرت شیخ الشیوخ سے رخصت ہو کر ملتان آئے اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے، اور رشد و ہدایت کے چراغ کو روشن کیا، بہت سے لوگوں نے آپ کی ہدایت سے برکت پائی، اور اس دیار کے تمام لوگ آپ کے مرید و معتقد ہو گئے، اس دیار میں تمام مرید آپ ہی کے ہیں"

شیخ نور محمد بخش نے اپنی کتاب سلسلۃ الذہب میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی تبلیغی اور اصلاحی کوششوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> "حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ہندوستان میں رئیس الاولیاء تھے انہوں نے لوگوں کو رشد و ہدایت فرمائی، اور ان کو کفر سے ایمان کی طرف، معصیت سے اطاعت اور نفسانیت سے روحانیت کی طرف لائے۔ ان کی شان بڑی تھی"

انوار غوثیہ میں ہے کہ:

> "حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے وعظ سن کر سندھ اور علاقۂ ملتان اور لاہور میں اہل ہنود میں سے بھی بے شمار لوگوں نے جس میں بہت سے متمول تاجر اور بعض والیانِ ملک بھی تھے، دین اسلام اختیار کیا اور حضور کے مرید ہوئے، اس کے علاوہ حضرت نے عامۂ خلائق کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے زراعت اور تجارت کے کام کو بڑھایا، اطراف ملتان میں جہاں کہیں اچھا موقع ہوا افتادہ جنگلوں کو آباد کرایا۔

اور تجارت کی طرف بھی حضرت نے توجہ دی"۔

دینی اور دنیاوی امور میں عوام کی اصلاح و تربیت کی طرف خصوصیت سے توجہ فرماتے تھے۔ فوائد الفواد میں ہے کہ ایک روز خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی نے دینی اصلاح و تربیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ملتان میں ایک شخص سلیمان نامی بڑا عابد و زاہد تھا، ایک روز حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اسکے پاس گئے اور کہا اٹھو اور دو رکعت نماز پڑھو، تاکہ میں بھی دیکھوں کہ تم کس طرح نماز پڑھتے ہو؟ وہ شخص اٹھا، اور اُس نے نماز شروع کی لیکن اُس نے نماز میں حالت قیام میں دونوں قدموں کے درمیان مسنونہ فاصلہ نہ چھوڑا حضرت شیخ نے فرمایا کہ نماز میں اپنے دونوں پاؤں کے درمیان اس قدر فاصلہ نہ رکھو، جتنا مسنون ہے، لیکن وہ دوبارہ بھی اپنے قدموں کے درمیان مسنونہ فاصلہ نہ رکھ سکا، اور نماز شروع کر دی، حضرت شیخ نے اس سے فرمایا جاؤ اور اُچ میں مقیم رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کرو، چنانچہ وہ اُچ چلا گیا۔

حضرت شیخ بہاو الدین اپنے مریدوں میں صحیح جذبہ پیدا کرتے اور اُن کی صلاحیتوں کو صحیح طور پر برسرِ کار لانے کے لئے ساعی رہتے تھے، آپ کی نگاہ دور رس زندگی کے ہر شعبے تک پہنچتی، اور آپ کا اصلاحی ہاتھ زندگی کے ہر شعبے میں محسوس کیا جاتا تھا۔

ایک دفعہ ایک بہت بڑا عالم و دانشور بخارا سے دہلی آیا، جب وہ ملتان پہنچا تو اپنے علمی پندار کی وجہ سے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ملنے نہیں گیا، اُس کے ساتھیوں نے اُس سے کہا کہ نہیں حضرت شیخ سے ضرور ملنا چاہیئے، وہ اپنے ساتھیوں کے اصرار پر آپ سے ملنے گیا تو اِس شان سے کہ رعونت کی وجہ سے دستار کا شملہ نیچے تک لٹکا ہوا تھا، اور لمبے لمبے بال شانوں پر پڑے ہوئے تھے، آپ نے اُسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا دو دو سانپ لے کر آئے ہو، اس ارشاد کے ساتھ ہی اُس کی رعونت انکسار میں بدل گئی، اور اُس نے اٹھ کر سر منڈایا اور دستار کے شملے کو چھوٹا کیا، اور آپ سے بیعت ہو کر ایک مدت تک آپ کی خدمت میں رہا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے آئینۂ اخلاق میں عبادت و ریاضت تواضع اور انکسار، استغنا و بے نیازی، حلم و بردباری کا عکس نمایاں نظر آتا ہے تلاوت قرآن مجید سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے۔

حضرت شیخ نظام الدین محبوب الٰہی کا بیان ہے کہ بابا فرید گنج شکر کثرت سے روزے رکھتے تھے، اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی نفل روزے اس کثرت سے نہیں رکھتے تھے، لیکن طاعت و عبادت بہت کرتے تھے۔

تواضع اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ اپنی تعظیم و تکریم سخت ناپسند فرماتے تھے ایک مرتبہ خانقاہ میں کچھ مرید وضو کر رہے تھے اتفاق سے آپ وہاں تشریف لے آئے، سب مرید وضو نامکمل چھوڑ کر آپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے، اور سلام کیا، صرف ایک مرید وضو مکمل کر کے کھڑا ہوا، اور تعظیم بجالایا۔ آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا تم سب درویشوں میں افضل اور زاہد ہو۔

مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ہمیشہ مسافروں، مہمانوں، اور درویشوں کے ساتھ ملکر کھاتے تھے۔

حلم و بردباری حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا امتیازی وصف تھا، ایک دفعہ قلندروں کی ایک جماعت نے آپ کے پاس آکر مالی امداد چاہی، آپ نے اس جماعت سے بیزاری کا اظہار کیا، قلندروں کی اس جماعت نے گستاخی شروع کی، اور اینٹ پتھر برسانے لگے۔ فرمایا خانقاہ کا دروازہ بند کر دو۔ قلندروں نے دروازے پر پتھر مارنے شروع کئے آپ نے فرمایا دروازہ کھول دو، میں اس جگہ شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی کا بٹھایا ہوا ہوں، خود آکر نہیں بیٹھا، خادم نے دروازہ کھول دیا۔ قلندر اپنے قصور پر نادم ہوئے، اور آپ سے معافی چاہی۔

آپ کی ذات ستودہ صفات میں بڑی کشش تھی، مشہور شاعر عراقی، جو آپ کے مرید و خلیفہ ہیں، آپ سے اس قدر متاثر تھے کہ کہا کرتے تھے:

"مقناطیس کی طرح کہ جس طرح وہ لوہے کو کھینچتا ہے، شیخ مجھ کو کھینچتے ہیں۔"

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی نے، صفر ۶۶۱ھ کو وصال فرمایا
ایک دفعہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی مجلس میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی
کی وفات کا ذکر چھڑا، حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ ایک دن ایک بزرگ
صورت شخص ظاہر ہوئے اور ایک لفافہ آپ کے صاحبزادے حضرت
شیخ صدر الدین کو دیا اور کہا کہ یہ خط ایک صاحب نے دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ شیخ
بہاؤالدین کو پہنچا دو، شیخ صدرالدین اس کا عنوان پڑھ کر بے حد متحیر
ہوئے، اور اپنے والد کی خدمت میں وہ خط پیش کر کے باہر آئے، پھر
آکر دیکھا کہ قاصد جا چکا تھا۔ خط کے پڑھنے کے ساتھ ہی حضرت شیخ
بہاؤالدین زکریا ملتانی واصل الی اللہ ہوئے، اور آواز بلند ہوئی: "دوست
بہ دوست رسید" (دوست، دوست کے پاس پہنچ گیا) یہ آواز سنتے
ہی شیخ صدرالدین حجرے میں گئے، دیکھا کہ آپ وصال فرما چکے تھے
اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی نے
فرمایا وہ بھی کتنا اچھا زمانہ تھا جس میں پانچ بزرگ، حضرت بہاء الدین
زکریا ملتانی، شیخ ابوالغیث یمنی، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ سعدالدین
حمویہ، اور شیخ الاسلام شیخ فرید الدین قدس اللہ سرہم زندہ تھے۔

حضرت بابا فرید گنج شکر کے ملفوظات راحت القلوب میں مذکور
ہے کہ جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی نے وفات پائی، اسی وقت
اجودھن میں حضرت بابا فرید گنج شکر بے ہوش ہو گئے، جب ہوش آیا
تو فرمایا:

"برادرم بہاء الدین زکریا کو اس بیابانِ فنا سے شہرِ بقا
کی طرف لے گئے۔"

پھر آپ نے اُٹھ کر اپنے مریدوں کے ساتھ غائبانہ نماز جنازہ
پڑھی۔ آپ کا مزار مبارک ملتان میں زیارت گاہ خواص و عوام ہے۔
اگرچہ تذکروں سے آپ کی کسی تالیف و تصنیف کا پتہ نہیں چلتا
لیکن بعض تذکروں میں آپ کے بعض وہ نصائح اور تعلیمات ملتی ہیں
جو آپ نے اپنے مریدوں کو فرمائی ہیں، آپ کے یہ نصائح اور تعلیمات
حکمت و موعظت، رشد و ہدایت، اثر و تاثیر کا ایک بیش بہا خزانہ
ہیں اس لئے ہم اُن میں سے چند کو یہاں نقل کرتے ہیں:

اخبار الاخیار میں ہے کہ آپ نے اپنے بعض مریدوں کو وصیت
فرمائی کہ:

"ذکرِ الٰہی کو اپنے اوپر لازم کر لو، کہ ذکر کی بدولت ہی طالب
مطلوب تک پہنچتا ہے، محبت وہ آگ ہے جو تمام
میل کچیل کو جلا ڈالتی ہے، جب محبت راسخ ہو جاتی
ہے تو اس کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کے مشاہدے کے
ساتھ ذکرِ حقیقت میں ذکر ہوتا ہے، جس کے متعلق
اللہ تعالیٰ کی جانب سے فلاح کا وعدہ کیا گیا ہے۔"

فرمایا مرید کو چاہئیے کہ:

"مراقبہ کرنے والا ہو اور اپنے اوقات کا محاسبہ کرتے والا
ہو، اور حق کے سوا ہر چیز کو اپنے دل سے نکال دے
اور اہلِ دنیا کی محبت کو اپنے اوپر حرام کرے اور اللہ کی
کی یاد میں مشغول رہے، اگر اس کو حق تعالیٰ کے ذکر
سے موانست نہ ہوگی تو وہ خدائے تعالیٰ کی محبت کی
بُو بھی نہ پا سکے گا۔"

ایک دفعہ اپنے مریدوں کو لکھا کہ:

"جسم کی سلامتی کم کھانے میں ہے، اور روح کی سلامتی
ترکِ گناہ میں ہے اور دین کی سلامتی حضرت
خیر الانام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر درود بھیجنے میں ہے۔"

آپ کے خلفاء کی تعداد کثیر ہے، مشہور خلفاء میں آپ کے
صاحبزادے شیخ صدر الدین عارف، حضرت حسن افغان، شیخ جمال خنداں
حضرت جلال سرخ بخاری، شیخ رکن الدین ابوالفتح وغیرہ ہیں، جنہوں نے آپ کے
بعد سلسلۂ سہروردیہ کو اس برصغیر میں بام عروج تک پہنچایا۔

غزل

سید مظفر حسین رزمی

تمام عمر کسی آگ میں جلا ہوں میں
کہاں سے آئے دھواں جل کے بجھ چکا ہوں میں

بہت مہیب ہے دشتِ وفا کی تنہائی
خود اپنے سائے کو مڑ مڑ کے ڈھونڈتا ہوں میں

وہ سخت لمحے جو اہلِ وفا پہ گذرے ہیں
سنو سنو انہیں لمحات کی صدا ہوں میں

کھلی کتاب ہوں پڑھ لو جہاں سے جی چاہے
ہوا وہ تیز چلی ہے کہ کھل گیا ہوں میں

فقیرِ شہر ہوں در در صدا لگاتا ہوں
اندھیری رات میں درویش کی دعا ہوں میں

غریبِ شہر کی آواز کون سنتا ہے
جو اپنی گونج میں خود گم ہو وہ صدا ہوں میں

صلائے عام ہے جو چاہے اپنا منہ دیکھے
بہ فیضِ وقت سراپا اک آئینہ ہوں میں

تو اس جہاں میں کچھ ایسی خوبرو بھی نہیں
تو کیا بتاؤں کہ کیوں تجھ کو چاہتا ہوں میں

وہی ہوں میں کہ جو کل انجمن سجاتا تھا
وہی ہوں آج کہ خود ہی بکھر رہا ہوں میں

میں روشنی کا پجاری تھا کیا ہوا اندھیر
کہ ظلمتوں کے طلسمات میں گھرا ہوں میں

بہت طویل ہے افسانۂ وفا رزمی
خلاصہ یہ ہے کہ اک آہِ نارسا ہوں میں

سیم و تھور کے خلاف جنگ

(ادارہ)

پاکستان کسی زمانے میں جنوبی ایشیا کا زرخیز ترین خطہ تصوّر ہوتا تھا اور اس علاقہ کی گندم برصغیر کے دور دراز علاقوں تک پہنچتی تھی۔ لیکن ادھر کچھ سالوں سے پنجاب کے نہری علاقوں میں سیم تھور کی شدت کے باعث اس علاقے میں غذائی اجناس کی پیداوار بُری طرح متاثر ہوئی ہے اور اس کے نتیجے میں باہر سے گندم درآمد کی جاتی رہی ہے۔ زمینیں جس تیزی سے سیم زدہ ہو رہی تھیں اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دور ایسا بھی تھا کہ تقریباً ہر سال ایک لاکھ ایکڑ قابل کاشت اراضی ناکارہ ہو رہی تھی اور فی ایکڑ زرعی پیداوار اس حد تک گر گئی تھی کہ یہ دنیا کی اوسط فی ایکڑ پیداوار کی ۱/۲ رہ گئی تھی اور اس خوفناک صورت حال نے زرعی شعبے میں ایک قیامت صغرا برپا کر دی تھی اور اس سے ہر سال تقریباً ۲۵۰ کروڑ روپے کا ملک کو نقصان ہو رہا تھا۔

جب عوامی حکومت ۱۹۷۱ء میں برسر اقتدار آئی تو اس وقت واپڈا کے اپنی ترقیاتی پروگرام میں ۳۳ فیصد کمی کی جا چکی تھی۔ اپریل ۱۹۷۲ء میں حکومت نے اراضیات کی بحالی کے پروگرام کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس منعقد کی۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو (جو اس وقت صدر مملکت تھے) نے یہ احکامات دیئے کہ "سالانہ ترقیاتی منصوبے میں اوّلین اہمیت زرعی شعبے کو دی جائے" اور اسی کے تحت یہ ہدایت کی گئی کہ سیم اور تھور کی لعنت کا مقابلہ ترجیحی اور ہنگامی انداز میں کیا جائے۔ چنانچہ زراعت کے مشیر خاص نے واپڈا اور صوبائی حکومتوں سے اراضیات کی بحالی کے متعلق متعدد میٹنگوں میں بات چیت کی اور اس شعبے میں کام کا بھرپور جائزہ لیا اور واپڈا کو ٹیوب ویلوں کو برقی قوت فراہم کرنے اور دیگر کاموں کے لئے چھ کروڑ روپے کی اضافی گرانٹ دی گئی اور اسی کے باعث واپڈا نے ۲۴۰۹ ٹیوب ویلوں کو برقی قوت فراہم کی۔

واپڈا نے زرعی زمینوں کو بحال کرنے اور ان کے مختلف نوعیتوں کے مسائل حل کرنے کے لئے سات منصوبے بنائے ہیں جنمیں تقریباً ۱۱٫۸۴ ملین ایکڑ رقبے کی بحالی کا کام پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان میں سے ۴ منصوبے یعنی سکارپ نمبر ۱ (وسطی رچنا دوآب) سکارپ نمبر ۲ (چج دوآب) سکارپ نمبر ۳ (زیریں تھل دوآب) سکارپ نمبر ۴ (بالائی رچنا دوآب) مکمل ہو چکے ہیں اور ان میں تقریباً ۵٫۵ ملین ایکڑ رقبہ گوجرانوالہ، سیالکوٹ، لائلپور، گجرات، سرگودھا، مظفر گڑھ اور جھنگ کے ضلعوں میں درست ہو چکا ہے۔

محولہ بالا بحال شدہ علاقوں یعنی اسکارپ نمبر ۱ میں واپڈا نے ۲۰۵۸ ٹیوب ویلوں کی تنصیب اور برقابی وغیرہ کا کام سرانجام دے دیا ہے اور اسی طرح اس نے اسکارپ نمبر ۲ میں ۲۲۰۵ اور اسکارپ نمبر ۳ میں ۲۶۳۵ اور اسکارپ نمبر ۴ میں ۹۳۵ ٹیوب ویلوں کی تنصیب و برقابی وغیرہ کے مرحلے مکمل کر دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ سیم نالیوں اور دیگر زمینی طریقوں سے ۵۲۵ میل لمبے علاقے کو کارآمد بنانے کے اقدامات کئے جا چکے ہیں۔ موجودہ مالی سال کے دوران کھاری پانی خارج کرنے کے لئے ۵۶۰ ٹیوب ویل لگائے جا چکے ہیں۔ واپڈا نے جو ۶۸۳۳ ٹیوب ویل لگائے ہیں اندازہ ہے کہ ان سے ۸٫۳ ملین ایکڑ فٹ زمینی پانی آبپاشی کے لئے فراہم ہوگا۔

اسکارپ کے علاقوں میں واپڈا کی سیم زدہ زمین کو بحال کرنے کی ان کوششوں کے بڑے اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور اندازہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں سالانہ پچاس کروڑ روپے کی مالیت کی زرعی پیداوار کا اضافہ ہو رہا ہے۔

لاہور میں واپڈا کی شاندار بلڈنگ

زراعت کی ترقی کیلئے عوامی حکومت نے کثیر تعداد میں ٹریکٹر فراہم کئے ہیں

شمال مغربی سرحدی صوبہ میں دھان کی کاشت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے

گنے کا رس نکالا جا رہا ہے ہمارے دیہاتوں میں گڑ سازی ایک مفید گھریلو صنعت ہے

عوامی حکومت کی ہدایت پر سیم زدہ علاقوں میں ٹیوب ویلوں کی تنصیب سے اصلاح اراضی کا کام کیا جا رہا ہے

واپڈا کے لگائے ہوئے ٹیوب ویل آبپاشی کے لئے بھی نعمت ثابت ہو رہے ہیں

روئی کی فصل زر مبادلہ کمانے کا اہم ذریعہ ہے

آبپاشی کی بہتر سہولتوں نے اصلاح شدہ زمینوں کی صورت بدل دی ہے

واپڈا نے عوامی حکومت کی ہدایت کے مطابق اب تین نئے منصوبے بنائے ہیں یہ اسکارپ ۵ (زیریں رچنا دوآب) اسکارپ ۶ (پنجند اور عباسیہ کنال سے سیراب ہونے والا علاقہ) اسکارپ ۸ (بالائی باری دوآب) ہیں ان پر کام جلد شروع کر دیا جائے گا۔

واپڈا نے صوبہ سندھ کے لئے آٹھ اسکارپوں کی منصوبہ بندی مکمل کر لی ہے جن میں اسی لاکھ ایکڑ رقبہ کی اصلاح کی جائے گی ان منصوبوں میں تین منصوبے یعنی خیرپور پراجیکٹ میں ۴۰۵ ٹیوب ویلوں کی تنصیب۔ اور لاڑکانہ شکارپور ڈرینیج اسکیم ۱ میں ۱۴۱۵ میل لمبے علاقے میں سیم نالیوں اور دیگر ذرائع سے زمین کی اصلاح کا کام اور شمالی روہڑی کے علاقے میں ۶۶۵ ٹیوب ویلوں کی تنصیب کا کام انجام پا چکا ہے۔ اسکارپ شمالی روہڑی کا دوسرا مرحلہ جس میں مورو یونٹ میں ۴، ٹیوب ویلوں کی تنصیب شامل تھی، بھی مکمل ہو چکا ہے دوسرے دو یونٹوں پر جن میں ۱۵۰ اور ۲۰۰ ٹیوب ویلوں کی تنصیب شامل تھی پر کام ہو رہا تھا اور یقین ہے۔ اب تکمیلی مراحل پر پہنچ گیا ہوگا۔

اسی طرح لاڑکانہ شکارپور ڈرینیج اسکیم ۲ پر اس سال کے اختتام تک کام تکمیل پا جائے گا۔

لیفٹ بینک آؤٹ فال ڈرین

اس منصوبے کے پہلے مرحلے پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔

کوٹری سرفیس ڈرینیج

اس منصوبے کو عملی جامہ حکومت سندھ کا محکمۂ آبپاشی و برقابی پہنا رہا ہے اس منصوبے کے تحت غلام محمد بیراج کے بائیں کنارے کے علاقے کی اراضیات کی اصلاح کا کام ہوگا۔ تقریباً ۱۲۱۶ میل لمبے علاقے میں سیم نالیاں بنائی جا چکی ہیں۔

نئی اسکیمیں

خیرپور ٹائل ڈرینیج اسکیم زیر غور ہے اور توقع ہے کہ ماہرین کی رپورٹ کی وصولی کی بعد اس منصوبے پر کام شروع کر دیا جائے گا۔

سکھر پائلٹ پراجیکٹ میں ۱۵ ٹیوب ویلوں کی تنصیب تکمیل پا چکی ہے۔

صوبہ سرحد میں بحالیات اراضی

۷۲-۱۹۷۱ء میں صوبہ سرحد میں اسکارپ کا کام شروع کیا گیا تھا۔ اور پتی پائلٹ پراجیکٹ پشاور سٹی اینٹی واٹر لاگنگ پراجیکٹ پر کام شروع کیا گیا تھا۔ اس منصوبے میں ۲۸ ٹیوب ویل-۱۶ عام کنوئیں اور...، فیلڈ ٹائل ڈرینز کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ اور اب کا فرڈھیری جو شبقدر بتی مرحلہ ۲ اور اسکارپ مردان اور اسکارپ بنوں پر کام ہو رہا ہے۔

وزیراعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ہدایت پر سیم اور تھور کی آفت پر قابو پانے کے لئے اور زیادہ کام شروع کر دیا گیا ہے۔

۶ اور ۷ مارچ ۱۹۷۳ء میں گورنروں کی کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ سیم و تھور کی زمینی دریا پر قابو پانے کا کام صوبائی حکومتیں ترجیحی بنیادوں پر کریں نیز حکومت پنجاب سیم و تھور پر قابو پانے کے لئے اپنے آئندہ کے منصوبوں پر ایندھن برقی قوت اور قدرتی وسائل کی مرکزی وزارت پلاننگ کمیشن اور واپڈا سے مشوروں کے بعد نظرثانی کرے۔

وزیراعظم کی ہدایت کے مطابق واپڈا نے ملک میں سیم و تھور پر قابو پانے کے لئے ایک جامع منصوبہ ۱۹۷۳ء میں تشکیل دیا۔ اس منصوبہ کا پہلا مرحلہ ۱۱ سال کی مدت پر پھیلا ہوگا۔ اور اس سے بڑے وسیع اور عریض رقبے کو فائدہ پہنچے گا۔ اس تیز رو ہنگامی پروگرام کے تحت ملک کی زرعی پیداوار میں شاندار ترقی ہوگی اور یقین ہے کہ زرعی شعبے میں قرضوں، بہتر بیج، کھاد اور زرعی آلات کی فراہمی کے ساتھ مل کر اس منصوبے سے ملک غذائی اجناس میں خود کفیل ہو جائے گا۔

نیسا - پاکستان کا چھ ہزار سالہ قدیم تاریخی شہر

عبدالحلیم اثر

حسن الزیات مصری نے اپنی تالیف "الادب العربی" میں لکھا[1] ہے کہ مواضع اور مقامات و ممالک کے نام درحقیقت "تہذیبی اور ثقافتی آثار قدیمہ" ہیں۔ کسی بھی مقام کا کوئی بھی نام ہو اور خواہ کسی بھی زبان کا ہو۔ یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ یہ نام جس زبان کا بھی ہے اس کا نام رکھنے والے تاریخ کے کسی دور میں اس نام کے رکھنے سے پہلے اس زبان، تمدن اور ثقافت کے ساتھ اسی مقام پر موجود رہے تھے۔ (یعنے وہ خود اپنی مخصوص زبان کے ساتھ تاریخ کے دبیز پردوں کی تاریکیوں میں گم ہو گئے۔ لیکن ان کے ثقافتی آثارِ قدیمہ، ان کا رکھا ہوا نام باقی رہ گیا ہے اور کئی جگہ ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ کسی قوم کے تمدنی اور تہذیبی مادی آثار مٹ گئے لیکن ان جغرافیائی خطوں میں ان کے مٹے ہوئے آثار کے نام بطور ثقافتی آثار کے ابھی تک باقی ہیں)

حضرت داؤد علیہ السلام کے صحیفہ (زبور) سورت ۴۹ آیت ۱۱ (اصل زبان مغربی آرامی جو عبرانی کا ایک لہجہ ہے) کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے "لوگوں نے خیال کر رکھا ہے کہ ہماری آبادیاں اور بستیاں ابد تک باقی رہنے والیاں ہیں۔ ہمارا تعلق اور آبادی نسلوں کی نسل تک رہ جائے گی۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے نام اپنے مقامات پر رکھتے ہیں۔[2]

ایک عرب شاعر نے کہا ہے؛

تلک آثارنا تدل علینا فاسئلوا احالنا عن الآثار

(یہ ہمارے آثارِ قدیمہ ہیں جو ہماری عظمت اور شوکت پر دلالت کرتے ہیں۔ ہمارے حالات ہمارے ان آثارِ قدیمہ سے دریافت کیجیے)[3]

جب آثارِ قدیمہ کی دو قسمیں ٹھہریں مادی جیسے تعمیرات اور ان کے کھنڈرات اور ثقافتی جیسے "پرانے نام" اور ہر دور کے علمائے تاریخ۔ علمائے آثارِ قدیمہ، علمائے علم الالسنہ و علم الاصنام و علم الایام نے اس موضوع پر قابلِ قدر تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ اس لئے ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ اس اپنی مملکت پاکستان کے آثار قدیمہ پر خصوصاً ان کے پرانے تاریخی ناموں پر متذکرہ بالا علوم اور علم تاریخ وجغرافیہ کی معلومات کو سامنے رکھ کر ایک مختصر تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالیں اور اس کے نتائج مزید غور و خوض کے لئے اپنے ہمعصر پاکستانی علمائے تاریخ کے سامنے پیش کر دیں۔ وجہ یہ کہ اس موضوع پر غیر ملکیوں نے تو کافی کام کیا ہے۔ جبکہ عرب مورخین کا عقیدہ ہے صاحب البیت ادری بما فیہ "گھر کے بھید گھر والا ہی جانے"

[1] تاریخ الادب العربی طبع مصر ص۱ [2] مجلہ ماہِ نو اشاعت ۱۹۵۶ء ص۴۹

[3] مجلہ الہلال کلکتہ بابت ۱۹۲۶ء - (اثر)

شمال مغربی پاکستان میں ایک قوم کا نام ارمڑ ہے۔ یہ درحقیقت بین[۲] مختلف اقوام اور قبائل کے مجموعہ کا جغرافیائی نام ہے۔ جن میں سے ایک کا نام دائیؔ اور دوسرے کا برکی ہے۔ دائیؔ قوم کے تذکرہ میں ان کے ایک شہر نیسا کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس تاریخی شہر کا اپنا پرانا چھ ہزار سالہ نام نیخا ہے جسے نیکا بھی پڑھا گیا ہے۔ یورپ کے مستشرقین نے اپنی غلطی سے یہ نام نیسا پڑھا ہے اور ہم بھی اس غلط العوام قسم کے نام نیسا سے اس کا تاریخی جائزہ لے رہے ہیں دائیؔ کے تاریخی پس منظر اور اس کے ساتھ بکو (بکواس) پر اس کے بعد بحث کی جائے گی۔ اسے تاریخ گم گشتہ کا ایک ورق سمجھئے۔

اُرمُڑ

شمال مغربی پاکستان کے ضلع پشاور اور جنوبی وزیرستان میں ایک قوم کا نام ارمڑ ہے۔ پنجاب کے جالندھر دوآب میں بھی اُرمُڑ کے نام سے ایک مشہور اور آباد قصبہ موجود ہے۔ جہاں ایک پختہ گنبد میں ایک پتھر رکھا ہے جس پر نقش قدم حضرت شیرِ خدا علی المرتضیٰؓ موجود ہے[۱]۔ ارمڑ درحقیقت بینؔ مختلف اقوام اور قبائل کا مجموعہ ہے۔ جو بنیادی طور پر عربی النسل ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ سطور میں کہا گیا ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ کا نام دائیؔ ہے اس قوم کی حقیقت جاننے کیلئے ہمیں ۶۰۰ ق م کے تاریخی زمانہ کی طرف لوٹ کر اپنی تاریخی تحقیق کا آغاز کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں ہم ۶۰۰ ق م اور اس کے بعد ۲۳۰ ق م کی بھی بات کریں گے۔ اور تاریخی روایات ۳۲۷ ق م کے عہد کی بیان کریں گے۔ چونکہ اس تاریخی تحقیق میں ہمیں یونانی مؤرخین کے حوالوں سے بھی استفادہ اور استناد کرنا ہے۔ اس لئے اس سے پہلے یہ چند نکات ذہن نشین ہونا ضروری ہیں۔

۱۔ یونانی زبان کے گرامر کے مطابق اسماء اور کلمات کے آخر میں زائد کے لاحقہ کے طور پر حرف (س) غیر منقوط کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

یونانی مؤرخین اس قاعدہ کے تحت ارشمیدؔ، افلاطون، ارسطو، ھیرودوت کی جگہ یہ نام اس طرح تحریر میں لائے ہیں۔ ارشمیدیس افلاطونس، ارسطوس، ھیروڈوٹس اور اسی قاعدے کے تحت انہوں نے چند ایک عہد قدیم کے پاکستانی مشاہیر کے نام دائی میں کی جگہ دائی نےسس، بکو کی جگہ بکوس، میرو کی جگہ میروس کورو کی جگہ کوروس (کوروش، خوروش) اور ڈوڈا (ڈوڈا) کی جگہ ددداس تحریر کیا ہے۔ ہمیں یونانی مؤرخین کے بیانات پڑھتے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

۲۔ یونانی مؤرخین نے ہمارے اس ملک کے تاریخی نام اپنے لہجے اور اپنے قدیم یونانی حروف ابجد میں تحریر کئے ہیں۔ یہ کوئی خلافِ توقع بات نہیں ہے۔ ایک قوم ایک ملک میں ایک جگہ کا نام اپنی زبان اور اپنے مخصوص لہجہ میں رکھتی ہے۔ زمانہ گذرنے کے بعد دوسری قوم وہاں آکر آباد ہو جاتی ہے۔ یہ نووارد قوم اس ملک کے مقامات کے تاریخی ناموں کا تلفظ اپنے لہجہ میں کرتی ہے۔ مثال کے طور پر ھیروڈوٹس اور بطلیموس دونوں نے درج ذیل نام اس طرح لکھے ہیں۔ پکت، پکتین، پکتیکا۔ جبکہ قدیم اور موجودہ پشتو بولنے والے لوگ ناموں کا تلفظ حرف (ک: K) کی جگہ عربی حرف (خ) اور پشتو کے مخصوص حرف (ښ: خ) اور حرف (ش) منقوط سے کرتے ہیں اور مندرجہ بالا نام علی الترتیب اس طرح پڑھتے ہیں (پکت: پخت، پښت، پشت) (۲) پکتین کو پختین، پښتین، پشتین) (۳) پکتیکا کو پختیکا، پښتیکا نہیں پڑھتے بلکہ پکتیکا کے دونوں حروف (ک) کی جگہ حرف (خ، ښ، ش) پڑھ کر پختیخا، پښتین خا اور لفظ پښتین کی حرف (ی) حرف (و) سے بدل کر پشتون خا، پشتون خوا پڑھتے ہیں۔

یونانی مورخین نے اپنی یادداشتوں میں ہمارے اس ملک کے

---

[۱] تاریخ مخزن پنجاب جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۱۹۴ (طبع نولکشور ۱۸۷۷ء)

اکثر ناموں کو اسی طرح اپنے علاقائی لہجہ اور تلفظ میں لکھا ہے۔ مندرجہ بالا مثال سے واضح ہو جاتا ہے کہ اصل لفظ تھا بخت یونانیوں نے حرف (خ) کی جگہ اپنے علاقائی لہجہ کے مطابق اسے حرف (ک) کے ساتھ وصل کرتے ہوئے اسے پکت بنا دیا ہے اور جیسا کہ آگے چل کر وضاحت کی جائے گی یہی سلوک انہوں نے ایک تاریخی مقام نیسا کے نام کے ساتھ کیا ہے۔ جس نے بعد کے آنے والے مؤرخین کو الجھن میں ڈال دیا۔

اس لسانیاتی تاریخی پس منظر کی وجہ سے ہمارے لئے یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ یونانی مؤرخین نے جن ناموں کا ذکر کیا ہے۔ ان کا تلفظ ہمارے اپنے لہجہ میں کیا تھا اور اب کیا ہے؟ قدیم اور جدید یونانی ابجد حروف میں فرق موجود ہے اس کے علاوہ یونانی زبان میں ایک نام جن ابجدی حروف میں لکھا جاتا ہے۔ انگریزی زبان بولنے والے اسی نام کو اپنے علاقائی لہجہ اور تلفظ کے مطابق دوسرے حروف میں منضبط کر لیتے ہیں اور اس سے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں راقم الحروف کے نقطۂ نظر سے فلالوجی میں سب سے اہم چیز ایک لفظ کا تلفظ ہے کہ وہ کن ابجدی حروف اور کن حرکات و سکنات سے کیا جاتا ہے۔ اگر اس میں تبدیلی کی جائے تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس قوم کے لغات کا لفظ اور نام ہے۔ مثال کے طور پر ارمڑی زبان کا ایک نام ہے (مَرزا) حرف اول پر حرکت فتحہ ہے اس کے معنی ہیں بھائی برصغیر پاک و ہند کے لوگ اسے (مِیرزا) حرکت کسرہ سے پڑھتے ہیں۔ اس سے پتہ نہیں چلتا کہ یہ ارمڑی زبان کی لغت سے ہے وجہ یہ کہ مرزا جب حرکت کسرہ سے پڑھا جاتا ہے تو اس سے وہ معنی مراد نہیں لئے جاتے جو لغت مَرزا: ماں جایا) کے تھے۔

بدقسمتی سے یورپ کے مستشرقین نے برصغیر پاک و ہند کے حالات بیان کرنے میں مندرجہ بالا قواعد اور اس قسم کے بہت سے دوسرے بنیادی قاعدوں کو نظر انداز کر دیا ہے اور نتیجہ میں اکثر تاریخی مقامات کو صحیح طور پر متعین نہیں کر سکے ہیں۔ ان چند ضروری نکات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ ہسٹری آف انڈیا کا بیان ہے :-

"سکندر اعظم کی فتوحات کا بیان کرتے ہوئے مشہور یونانی مؤرخ ایرین اپنی تالیف انڈیکا میں لکھتا ہے اب سکندر کو ایک ایسی آبادی سے سابقہ پڑا جو اپنے آپ کو یونانی الاصل ظاہر کرتی تھی۔ اس آبادی کو نیسا (NYSA) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔"

مؤرخ مذکور آگے چل کر لکھتا ہے :-

"یہ شہر (نیسا) ڈائی نیسس (دائی نیس) نے ہندوستان کو فتح کرنے کے وقت آباد کیا تھا لیکن یہ سوال کہ بکوس (بکو)، کون تھا؟ کس وقت یا کہاں سے چل کر اس نے ہندوستان کو فتح کیا۔ ایسا مشکل سوال ہے کہ اس کا آسانی کے ساتھ کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔" ....

..... سکندر کے اس مذکورہ نیسا پہنچنے پر اس علاقے کے اکل پیس[1] (AKULPHIS) نامی کسی سردار یا حکمران کی قیادت میں اس جگہ کے باشندوں نے شرف باریابی حاصل کی اور یوں درخواست گذاری کہ :

"اے شاہ! نیسا کے باشندے مؤدبانہ عرض گذار ہیں کہ اس احترام کے پیشِ نظر جو کہ تو ان کے معبود ڈائی نے سس[2] کے لئے (اپنے دل میں) رکھتا ہے۔ اس شہر کو صحیح و سلامت چھوڑ دے .... کیونکہ بکوس[3] نے اس شہر کو اپنے ان سپاہیوں کے رہتے

[1] [2] [3] یہ تینوں نام ہماری وضاحت کے مطابق اکل پی۔ دائی نیس اور بکو پڑھے جائیں گے۔ اکل اور ہیکل دونوں مرادف الفاظ ہیں۔ لغت پی کے معنی ہیں خادم پجاری مہنت۔ اکل پی سے مراد ہے بکو کے معبد کا مہا پجاری اس معنی میں اسے سردار یا روحانی با اقتدار حکمران شخصیت کہا جا سکتا ہے لغت پی کا تلفظ (پا) بھی کیا گیا ہے جیسے ساسانی حکمرانوں کے مورث اعلیٰ کا نام ہے (پا بغ: پا × بغ) یعنی معبود (بغ) کے معبد کا (پا: پجاری) صوبہ سرحد کی مشہور شخصیت جس نے سنسکرت زبان کی حرف و نحو کی پہلی کتاب لکھی ہے اس کا نام (پانینی: پا + نینی: عطارد) یعنی (معبد عطارد = انیارہ بنیتو کا پجاری) اس اعتبار سے اکل پی سے صرف حکمران مراد نہیں لینا چاہیئے (د۔ ش)

کے لئے کہ جو عمر یا حادثوں کی وجہ سے فوجی ملازمت کے قابل نہ رہے تھے، آباد کیا تھا، وہ اس شہر کو اپنی دایا (نرس) کے نام کی مناسبت سے نیسا (نوسن) پکارتا تھا...... ساتھ ہی اس پہاڑی کو بھی جو ہمارے قریب ہی ہے۔ اس نے مشتری سے پیدائش کی وجہ سے میرون کے نام سے پکارا تھا۔۔۔اور اس شہر کی بکوس کے ہاتھوں بنیاد رکھنے کی وجہ اور واضح ثبوت یہ ہے کہ سدا سبز ولایتی بیل (پودا) جو ہندوستان بھر میں کہیں بھی دستیاب نہیں ہوتی۔ ہمارے اس علاقے میں پھلتی پھولتی ہے[1]۔"

مؤرخ مذکور نے اس سے پہلے لکھا ہے کہ:

وادی کنڑ[2] سے نکل کر سکندر نے باجوڑ[3] میں قدم رکھا یہاں کے باشندے جو تاریخ میں اسپاسین[4] (ASPASIANS) کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ مقابلہ کے لئے موجود تھے اریگائن[5] (ARIGAION) کے مقام پر شدت کی لڑائی لڑی گئی تھی اور مؤرخین کے بیان کے مطابق سکندر کو باجوڑ کی سرزمین پر پہلی عظیم لڑائی لڑنی پڑی تھی۔ سکندر کے سازوسامان، اس کے نظم و نسق، سامانِ حرب کی فراوانی اور سپاہیانہ تربیت و قابلیت کے سامنے یہ مقامی باشندے (اسپاسی) ٹھہر نہ سکے تو انہوں نے اریگاین کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔ سکندر کے افسر اطلاعات بطلیموس کے بیان کے مطابق سکندر نے اس جگہ کے چالیس ہزار باشندوں کو قیدی بنایا تھا اور دو لاکھ تیس ہزار (۲۳۰۰۰۰) بیل اپنے قبضہ میں لئے تھے، جن میں چیدہ چیدہ تعداد کو افزائشِ نسل کی غرض سے یونان بھیج دیا گیا تھا۔ اریگاین کے محل وقوع کے پیشِ نظر سکندر نے اسے دوبارہ تعمیر کرنے کی ہدایت کی اور اپنے لشکر کے ان افراد کو جو مستقبل میں فوجی خدمات کے سرانجام دینے کے قابل نہیں تھے۔ اس جگہ آباد کر دیا تھا[6]۔

تحقیقی جائزہ

یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہم اس کا تحقیقی جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس تاریخی حوالہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سکندرِ اعظم جب وادی کنڑ (موجودہ سمت مشرقی افغانستان) سے چل کر (موجودہ پاکستان کے انتہائی شمال مغربی علاقہ) باجوڑ میں داخل ہوا تھا تو اسے سب سے پہلے اریگائن کے مقام پر لڑائی لڑنی پڑی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ کہا جاتا ہے کہ اریگائن کے جلائے جانے کے بعد اس کی جغرافیائی اہمیت کے پیشِ نظر سکندر نے اس کے دوبارہ آباد کرنے کا حکم دیا تھا تو ہم سمجھتے ہیں کہ صحیح حالات یورپ کے مستشرقین کے علم میں نہیں ہیں۔ وجہ یہ کہ اریگائن اپنی تباہی کے بعد آباد نہیں کیا گیا تھا اور اس عدمِ واقفیت کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اریگاین کا محلِ وقوع ہی غلط بتایا ہے۔ اس سلسلہ میں میرے مشفق دوست مرحوم اللہ بخش یوسفی نے اپنی تالیف تاریخ یوسفزائے (طبع کراچی) صفحہ ۱۷۱ پر اریگاین کے لفظ کے متعلق گیٹس آف انڈیا سے یہ حاشیہ درج کیا ہے۔

"اریگاین کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ نواگئی کے قریب کوئی آبادی تھی۔" حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے جو جناب یوسفی نے بیان کی ہے اسی طرح اسی کتاب کے حوالہ سے نیسا کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ یہ شہر باجوڑ میں ہے۔ لیکن یہ فاضل مستشرق جب اس شہر کی جگہ متعین کرتے ہیں تو اس میں غلطی کر جاتے ہیں اور اسے بجائے

---

[1] سٹرابو نے لکھا ہے کہ نیسا کے اوپر والی پہاڑیوں کو اس وجہ سے میرون کہا جاتا ہے کہ یہاں سدا سبز ولایتی بیل اگتی ہے۔ اگرچہ ان کا میوہ پوری طرح پک نہیں سکتا اور بحوشیہ بارش کی بہتات کی وجہ سے پکنے سے قبل ہی درخت سے گر جاتے ہیں"۔ ہم کہتے ہیں جہاں تک نیسا کے جنوب میں واقع اونچے پہاڑ کا تعلق ہے اس کو میرون کی جگہ آج کل کے مور کہا جاتا ہے پشتو زبان کے ایک لہجہ میں حرف (د)، کی جگہ حرف (ی) کا تلفظ کرتے ہوئے (مور، ماں) کو میر کہتے ہیں۔ اس کا ایک دیو مالائی تصور ہے کیونکہ پشتو میں سورج کو بھی میر کہا جاتا ہے اور اس دیو مالائی تصور سے بکوس کی قومیت پر بھی روشنی پڑتی ہے [2] افغانستان [3] پاکستان [4] پشاور کے یوسفزائے قوم کا قدیم تاریخی نام [5] وضاحت آجاتی ہے [6] تاریخ یوسفزائے صفحہ ۱۷۱ بحوالہ انڈیکا اتر ایرین۔ ایضاً بحوالہ گیٹس آف انڈیا (راشد)

باجوڑ کے وادی سوات میں ظاہر کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں جہاں تک واقعات کا تعلق ہے۔ یہ بیان اریگائین کے صحیح جغرافیائی محل وقوع سے عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ تاریخی مقام اریگائین اپنے جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے نواگئی کے پاس نہیں ہے۔ بلکہ نواگئی جو وادی چارمنگ میں واقع ہے، اس کے شمال مشرق میں ایک دوسری وادی ہے جس کا قدیم نام وادیٔ پشت اور وادیٔ کراغا ہے اور موجودہ نام ہے وادیٔ باجوقرا اس وادی کے شمال میں جب میدانی علاقہ کی سرحد مشہور تاریخی مقام پشت پر آکر ختم ہو جاتی ہے تو یہاں سے وادی ایک تنگنائے کی صورت میں شمال مغرب کی طرف مڑ جاتی ہے۔ یہاں مقام پشت سے کچھ ہی فاصلہ پر بجانب شمال مشرق اور سلسلہ کوہ شنگس کی مغربی ترائی میں دو تاریخی مقامات لبگل[1] اور لکتہ کے درمیان یہ تاریخی مقام اریگائین واقع ہے۔ نواگئی اور اریگائین کے درمیان چالیس میل سے زیادہ فاصلہ ہے۔ باجوڑ کے نقشہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ اریگائین کسی بھی صورت میں نواگئی کے قریب کی آبادی نہیں ہے۔ یہ نقشہ ہم نے ترتیب دیا ہے یورپ کے مستشرقین کے نقشہ میں اریگائین نہیں ہے۔

لکتہ

شنگس کے ہشت پہلو چوٹی کے شمال مغرب میں ملکہ اسکینی کے دارالحکومت اور شاہی محلات پر مشتمل شاہی قلعے سے جنوب مغرب پشت سے شمال اور مشرق میں واقع لکتہ[2] اس عہد کے مملکت باجوڑ کے حکمران کی راجدھانی تھی جس کے آثار قدیمہ گبر کے نام سے آج بھی موجود ہیں۔ لکتہ کے شمال میں اریگائین فوجی قلعہ اور پشت چھ ہزار سال کا قدیم ترین مقدس شہر تھا۔ دراصل گیٹس آف انڈیا، ہسٹری آف انڈیا، انسائیکلوپیڈیا آف انڈیا، ایڈوانس ہسٹری آف انڈیا (موجمدار)

اوریئنٹ بائیوگرافیکل ڈکشنری (انڈبیل) وغیرہ میں باجوڑ (پاکستان) میں سکندر اعظم کے داخلہ کا راستہ صحیح طور پر متعین نہیں کیا گیا ہے۔ اور اسی نے مشکلات پیدا کی ہیں۔ انہوں نے باجوڑ میں سکندر کی آمد کا اور اس کے اقدامات کے راستے کا جو نقشہ دیا ہے وہ باجوڑ کے مقام نواگئی سے ہو کر گزرتا ہے[3] دوسری طرف ایرین نے ذکر کیا تھا کہ سکندر کو اریگائین پر عظیم لڑائی لڑنی پڑی تھی تو انہوں نے اریگائین کے صحیح محل وقوع کو جاننے کی کوشش کئے بغیر اریگائین کو نواگئی کے قریب ایک مقام قرار دے دیا۔

دو مقامات

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "نقل را عقل باید" یہ بات یورپ کے ان مستشرقین کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ مملکت اسپین (ہسپانیہ) کے جغرافیائی نقشہ کو ملاحظہ کیجئے وہاں لکتہ اور اریگائین کے نام سے دو مقامات موجود ہیں۔ لکتہ اور اریگائین باجوڑ میں بھی ہیں۔ مملکت مصر میں قاہرہ سے اسی میل کے فاصلہ پر ایک علاقہ کا نام باجوڑ ہے اور اسی قاہرہ سے چالیس میل کے فاصلہ پر پشت (مورث اعلیٰ) کے نام کی طرف منسوب ایک معبد (بل پشت) کے نام سے موجود ہے۔ جو سنہ ۳۲۰۰ ق م میں اس پشت کے نسل کے لوگوں نے وہاں جا کر بنایا تھا (تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں موسیو جارج ایبرس جرمنی کی تالیف دختر فرعون۔ اردو ترجمہ از لطافت حسین مرزا طبع آگرہ پریس آگرہ) صور اور صیدا مملکت مصر میں دو علاقوں کے نام ہیں اور ان دونوں ناموں سے باجوڑ میں دو علاقے موجود ہیں۔ لیکن جس طرح ہم ایرین کا یہ بیان کہ سکندر نے اریگائن کے مقام پر لڑائی لڑی تھی) پڑھ کر یہ نہیں کہتے کہ سکندر نے اسپین کے اریگائین پر لڑائی لڑی تھی اور یہ لڑائی اسے اس وقت لڑنی پڑی تھی جب وہ مصر کے علاقہ باجوڑ پر حملہ آور ہوا تھا۔ ٹھیک اسی طرح ہم ایرین کا یہ بیان پڑھ کر کہ سکندر نے نواگئی کے قریب سے ہو کر اریگائین پر حملہ

---

[1] یہ لبگل وہی تاریخی مقام ہے جہاں سید امیر کبیر علی ہمدانی نے کشمیر سے سمرقند جاتے ہوئے وفات پائی تھی۔ یہ واقعہ ۷۸۶ھ ۱۳۸۵ء کا ہے۔

[2] لکتہ اور اریگائین کے نام سے دو مقامات اسپین میں ہے (راش سے

یا تھا۔ اس سے باجور کا نواگئی مراد نہیں لیتے۔ وجہ یہ کہ اگر سکندر
راستہ باجور کے نواگئی کے پاس ہوتا تو اسے اریگاین سے پہلے نیسا
پہنچنا چاہیئے تھا جو نواگئی کے قریب واقع تھا اور اس کے بعد اریگاین
پہنچتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایرین نے جس نواگئی کا ذکر کیا تھا وہ
جور میں نہیں بلکہ کُنڑ میں واقع ہے۔ واقعات یہ ہیں کہ نواگئی کے
ام سے دو مقامات ہیں۔

نواگئی

ایک نواگئی سمت مشرقی افغانستان کے وادیٔ کنڑ میں ہے
در ایرین نے جس نواگئی کا ذکر کیا تھا وہ یہی ہے کوہ ہمالیہ کی ایک شاخ
ملکہ آسکینی کے شاہی قلعہ کے بلند ترین اور وسیع مسطح چوٹی سے
جو سات ہزار فٹ کی بلندی پر ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتی ہے
در بطلیموس کے بیان کے مطابق اس کی سطح اتنی وسیع ہے کہ اس کے سرسبز
میدان میں ایک ہزار فوجیوں کے لئے غلہ کی پیداوار ہو سکتی ہے اور
اس کے پھل اور پھول اپنی مثال آپ ہیں۔ اس اونچی چوٹی سے ایک شاخ
مغرب کی طرف آسمار تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ اس درمیان میں اس کے شمال میں
نورمات۔ بیلم[1] اور درۂ دالگام واقع ہیں۔ اس کے جنوب کی طرف باجور
آنے کے لئے کوتل گبرے اور کوتل چمرتلی کے علاوہ جنوبی پہلو میں مشہور
تاریخی شہر چمرکنڈ (شمرکند: سمرقند) واقع ہیں۔ یہ پہاڑی سلسلہ آسمار
کے قریب جنوب کی طرف مڑ جاتا ہے اور مٹائی کے قریب جنوب مغرب
کی طرف مڑ جاتا ہے۔ آسمار سے مٹائی تک پہاڑی کے اس حصہ میں
کوتل لکڑی، شونکڑی واقع ہے۔ اس کے کوتل کے مشرق میں
باجور کا وادی چارمنگ، وادی صید امائل بہ جنوب مشرق
وادی صور، وادی انبار اور اس کوتل کے مغرب کی طرف
ڈھلان اور دریائے کنڑ کے مشرقی کنارے پر نواگئی واقع ہے۔
نواگئی اور آسمار کے درمیان سلسلہ کوہ لکڑی کے مغربی ڈھلان
پر شال اور شنگر کے درّے ہیں اور دریائے کنڑ کے کنارے
پر دو تاریخی مقامات چگان سرائے اور پشت واقع ہیں۔ اس
پہاڑی سلسلہ کا وہ بازو جو مٹھائی (مہتہ) سے جنوب مغرب
کی طرف گھوم جاتا ہے۔ اس کا نام ایلا زائی[1] اور اس کے
جنوب مغربی سرے پر مشہور پہاڑی چوٹی شمشا[2] واقع ہے۔ ایران
کے ادب و تاریخ کے مشہور تاریخی شخصیت درفش کاویانی
کے مورث اعلیٰ شمشاھد اکے نام کی مناسبت سے یہ پہاڑی
چوٹی شمشا کہلاتی ہے۔

سکندر کا باجور میں داخلہ

سکندر نے باجور میں داخلہ کے لئے دریائے کنڑ کے کنارے
کا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس نے کنڑ کے نواگئی پشت، چگان
سرائے سے ہو کر آسمار کے مقام پر دریائے کنڑ عبور کرنے کے
بعد افغانستان کے انتہائی شمال مشرقی علاقہ دریائے دالگام میں
آگے بڑھ کر باجور کے اس عہد کے دارالحکومت لکہ (گبرے)
پر حملہ آور ہونے کا پروگرام بنایا تھا۔ دالگام کے مشرقی سرحد
کے اختتام پر خود سکندر نے کوتل گبرے سے باجور میں داخل
ہونے کی تدبیر کی۔ اس کا راستہ شمال سے جنوب کی طرف جانے
کا تھا اور یہاں پر اس کے جرنیل بطلیموس نے دالگام کے مشرق میں
واقع کوتل دھلی کا راستہ لیا تاکہ اس کوتل پر پہنچ کر اس کے
جنوب میں واقع عظیم ترین چوٹی پر واقع ملکہ اسکینی کے
شاہی قلعہ کو فتح کر سکے۔ بطلیموس نے اس قلعہ کے فتح کئے جانے
کے جو واقعات لکھے ہیں وہ پڑھنے کے ہیں اور یہی وہ تاریخی قلعہ
تھا جس کے نام پر آج بھی یہ پہاڑی چوٹی "مشاھی" کے نام سے

---

[1] مملکت اسپین (ہسپانیہ) میں ایک جگہ کا نام بیلم ہے (ا ش) [1] و [2] مٹائی (مہتہ) اور ایلا زائی کے حکمرانوں کے شجرہ جات پر ہم نے بحث کی ہے (ا ش)
[2] شمشا پر ہم نے ایک الگ مقالہ میں بحث کی ہے (ا ش)

یاد کی جاتی ہے۔ ملکہ اسکینی نے سکندر کو لکھا کہ میرے شاہی قلعہ کو فتح کرنے کے لئے عقاب کے پر لگا کر آنے کی ضرورت ہوگی۔ اس قسم کے ناقابلِ تسخیر قلعہ کے فتح کرنے کے لئے پٹولمی نے غالباً عقاب کے پَر لگائے ہوں گے۔ آج اس تاریخی قلعہ شاہی پر پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہرا رہا ہے۔

سکندر نے کوتل گبرے سے نیچے اتر کر جنوب مشرق میں واقع مقامات گبرے دارالحکومت ملکہ تک پہنچنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ مقامات لی ٹائی، اوکاشین، ہوڈی گرام، لوئی گرام، شنگرگل، بات صالی سے ہو کر گزرتا تھا۔ یہاں سے سکندر پشت کے مقام پر آ نکلا اور فوجی قلعہ اریگاین پر حملہ آور ہوا اور جیسا کہ کہا گیا ہے لڑائی رن بٹ، پشت، اریگاین، بگل، لکنہ اور تنگی کے درمیان میں لڑی گئی تھی۔ مقامی لوگ عظیم تباہی کے شکار ہو گئے تھے کہ پشت اور اریگاین کے درمیان واقع میدان جنگ کو آج بھی اس عظیم تباہی کے یادگار کے طور (طوفان شا) = (تباہی کی سطح مرتفع) اور (رن بٹ) کہا جاتا ہے۔

ہم نے جو نقشہ شامل کر دیا ہے۔ اس میں اریگاین سے بخط مستقیم شمال مشرق کی طرف سلسلہ کوہ شنگس کے انتہا پر واقع چوٹی کے اوپر ملکہ اسکینی کے قلعہ شاہی، کوتل گبرے اور اریگاین کی نشاندہی کر دی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ گیٹس آف انڈیا کے نقشہ میں سکندر کی آمد کا جو راستہ بنایا گیا ہے، وہ اریگاین لکنہ، پشت، رن بٹ سے ہو کر نہیں گذرتا اور اسی سے اس نقشہ کی غلطی ظاہر ہے کہ اس میں سکندر کی اریگاین میں آمد ظاہر نہیں کی گئی ہے اریگاین کے فتح کئے جانے کے بعد سکندر اعظم سلسلہ کوہ شنگس کے مغربی کنارے پر وادی بابوقرا کے میدانی علاقہ میں سے ہو کر شنگس کے "ہشت پہلو چوٹی" کے مغربی گوشہ میں واقع مقام راغنا تک پہنچ گیا تھا۔ مقدس کتاب اوستا میں جن سولہ(۱۶) جغرافیائی مقامات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک راغنا ہے اور ملکت باجور کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے یہاں سے سکندر نے میدان لاشورا میں مغرب کی طرف آگے بڑھ کر وادی مانڈل (منڈل) کے بالمقابل جنوب کی طرف چل کر دریائے گنگ کو عبور کرتا ہوا شہر نیسا جا پہنچا تھا۔

نواگئی دوئم

گیٹس آف انڈیا میں جس نواگئی کا ذکر کیا گیا ہے کہ سکندر کی آمد کا راستہ اس سے قریب ہو کر گذرتا ہے (جبکہ ہماری وضاحت کے مطابق سکندر اس کے قریب سے ہو کر نہیں گذرا اور نہ یہ سکندر کی آمد کا راستہ ہے) اس کا جغرافیائی محل وقوع ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

کوہ لکڑی سے مشرق کی طرف پہاڑی کا ایک دوسرا سلسلہ کوہ چمرتلی اور انبار کا واقع ہے جو وادی صیدا اور وادی مور کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ اس پہاڑی سلسلہ کے ایک کوتل کے مشرقی ڈھلان میں شہر نواگئی نمبر دوئم واقع ہے۔ اس سے کچھ ہی فاصلہ پر دریائے گنگ کے جنوبی کنارے پر شہر ڈوڈا اور اسی کنارے پر ڈوڈا سے جنوب مشرق کی طرف درۂ منڈل کے مشرقی گوشہ اور کے مور پہاڑی کی شمالی ڈھلان میں شہر نیسا کے آثار قدیمہ ہیں۔ اس نواگئی ۲ کے شمال مشرق میں عظیم ترین تاریخی شہر گنگ کے آثار قدیمہ ہیں جس کا ذکر سنہ ۲۳۰ ق م کی تاریخی یادداشتوں اور سنہ ۱۷۰ ق م کے ریگ وید منڈل ۵ کے سوکتوں میں کیا گیا ہے۔ اس کے قریب ہی وادی چارمنگ میں تاریخی مقام صیدا اس سے شمال مغرب میں وادی اوتلی ہے۔ جس میں سنہ ۳۲۰ ق م کے عہد کے تاریخی مقامات چمرتلی اور چمرکنڈ (ثمرکند = سمرقند) واقع ہیں۔

اس نواگئی ۲ کے جنوب مغرب کی طرف کوہ ایلازائی کے جنوب مشرق کے ایک درہ کا نام بیدمنی ہے۔ اور اس نواگئی ۲

کے مشرق میں وادیٔ لاشورا کا وسیع میدانی علاقہ ہے جو رود بار باجور کہلاتا ہے۔

نیسا

اجمالی طور پر نیسا کے محل وقوع کی نشاندہی کے بعد اس کی مزید وضاحت کی جاتی ہے اس کے شمال میں میدان لاشورا، شمال اور مغرب کے کون میں ڈوڈا، جنوب میں کے مور (میرون) کی پہاڑی، جنوب مشرق کی طرف ترسونہ[1] اور راس ترسونہ کے مشرق میں ارنگ کی پہاڑی جس کے جنوب ڈھلان میں عہد قدیم کے ایک پیغمبر علیہ السلام کا مزار ہے۔ جس کے متعلق مقامی روایت یہ ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کے والد حضرت مہترلام (لامک علیہ السلام جن کا مزار سمت مشرقی افغانستان کے وادی لمغان میں ہے) کے بھائی ہیں۔

نیسا کے آثار قدیمہ رود گنگ کے جنوبی کنارے سے شروع ہوکر کے مور (میرون) کی نصف شمالی ترائی میں ڈھائی میل چوڑائی اور ساڑھے تین میل لمبائی میں کے مور کے نصف دامن تک چلے گئے ہیں اس شہر کی آبادی کے مور کی چوٹی کے گرد گھوم کر مشرق تک چلی گئی تھی۔ یہاں ایک پُر فضا مقام کا نام تخت ہے جس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ شاہی محلات کی جگہ تھی کوتل تخت سے جنوب کی طرف آگے جاکر ایک عظیم الشان شہر کے آثار قدیمہ ملتے ہیں جو سنگ مرمر سے بنے ہوئے شاندار محلات کے کھنڈرات کی صورت میں داستان عبرت سنا رہے ہیں۔

یورپ کے مستشرقین شہر نیسا کے محل و قوع کو متعین نہیں کر سکے ہیں، اس کے دو وجہیں ہیں۔

الف : یہ کہ ایرین کی تالیف انڈیکا میں یہ نام جن یونانی حروف میں تحریر میں لایا گیا تھا۔ رومن اور انگریزی ابجدی حروف میں اسے صحیح شکل میں نقل نہیں کیا گیا۔ اس وجہ سے نام کا تلفظ غلط کیا جاتا ہے۔

ب : یورپ کے مستشرقین اسے نیسا کے نام سے یاد کرتے ہیں حالانکہ درحقیقت اس کا نام نہ اس وقت نیسا تھا اور نہ آج ہے اور نہ ایرین نے اس کا نام نیسا لکھا تھا۔

ایرین نے اس قدیم تاریخی شہر کا جو نام لکھا تھا وہی نام آج بھی مقامی لوگوں میں متعارف ہے۔ مقامی لوگ اپنے علاقائی لہجہ میں جن ابجدی حروف میں اس کا تلفظ کرتے ہیں۔ ایرین نے اپنے یونانی لہجہ کے مطابق مقامی ابجدی حروف کی جگہ ان کے مترادف یونانی حروف میں یہ نام لکھا۔ یورپ کے مستشرقین نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا اصل نام کو رومن حروف میں منتقل کرتے وقت یونانی حروف کی جگہ ایسے رومن حروف لائے جن سے اس نام کا تلفظ غلط طور پر نیسا کیا گیا اور اب شہر نیسا کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور وہ ملتا نہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مؤرخ آج تک یورپ کے مستشرقین کی پیروی میں اسے نیسا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ افغانستان کے شعبۂ تاریخ کے چیئرمین شاہ علی احمد علی خان کہزاد نے اپنے مقالہ "مدنیت اوستائی" میں اور کتاب "تاریخ اجمالی افغانستان" میں اس سے شہر میمنہ مراد لیا ہے اور یورپ کے ایک مستشرق نے اسے سوات کے منگلور کے قریب بتایا ہے اور ہمارے ایک ہمعصر مؤرخ جناب یوسفی مرحوم نے بھی باجور میں کسی جگہ اس کا محل وقوع بتایا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتا سکے کہ وہ جگہ کونسی ہے۔ آگے چل کر اس کی مزید وضاحت کی جاتی ہے۔

گیٹس آف انڈیا کے متذکرہ بالا بیان میں دوسری غلطی یہ ہے کہ سکندر اعظم نے اریگان کو دوبارہ آباد نہیں کیا تھا بلکہ جب اریگاین کے فتح کئے جانے کے بعد وہ جنوب کی طرف جا نکلا تو کوہ ننگس کے جنوب مغربی پہلو میں راغا سے کچھ فاصلہ اور اریگاین سے تقریباً سولہ میل کے فاصلہ پر سکندر رونہ کے نام سے ایک قلعہ آباد کیا تھا اور یہ جگہ آج بھی سکندر رونہ کے نام سے یاد کی جاتی ہے جو دریائے گنگ کے شمالی کنارے ترسونہ کے بالمقابل راغا کے جنوب مشرق وادی گوسم کے مغرب اور

---

[1] اسپین میں ایک علاقہ کا نام ترسونہ ہے اور وہ بھی باجور کے ترسونہ کے متساوی الاضلاع مثلث علاقہ ہے۔ (ناشر)

جندول کے جنوب مغرب۔ نیسا کے شمال مشرق اور رود بار باجور کے مشرق میں ایسے جغرافیائی محل وقوع میں واقع ہے۔ جہاں سے ان تمام علاقوں پر نظر رکھی جاتی ہے اور ان کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

مشہور کتاب ژند اوستا میں جن سولہ[۶] جغرافیائی ملکوں کا نام ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک کا نام راغا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ [illegible] ق م میں مملکت باجور کا دار الحکومت راغا تھا اور اسی کے نام سے یہ ملک یاد کیا گیا تھا راغا اپنے محل وقوع کے لحاظ سے کچھ ہی فاصلہ پر بجانب شمال مغرب واقع ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے سنہ [illegible]ھ میں جب کنڑ باجور، سوات، اسکردو کے راستے چل کر ریاست نیپال کے مغربی دروں سے ہو کر وسط ہند پر حملہ کیا تھا، تو اس نے باجور پہنچ کر قلعہ سکندرونہ سے کچھ ہی فاصلہ پر بجانب جنوب مغرب ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کیا تھا۔ جس کے چاروں برج اپنی جگہ قلعہ کی حیثیت رکھتے تھے اس وجہ سے چار قلعہ کہلائے اور آج کل چار کہلاتا ہے۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر شہنشاہ دہلی کے جرنیل زین خان کوکہ جب باجور پہنچے تو اس نے مشرق کی طرف ہٹ کر قلعہ سکندرونہ سے چار پانچ میل نیچے کوہ شنگس کے جنوب مشرقی تلہیٹی میں دریائے گنگ کے شمال، وادیٔ جندول کے جنوب اور قلعہ شال کنڈ کے جنوب مغرب میں قلعہ تعمیر کیا تھا۔ اس تفصیل پیش کرنے سے مقصد یہ ہے کہ سکندر نے اپنے نام سے قلعہ سکندرونہ ایک ایسی جگہ تعمیر کیا تھا جو فوجی نقطہ نگاہ سے اریگاین اور نیسا سے زیادہ اہمیت کی حامل جگہ تھی۔ اریگاین کو تعمیر نہیں کیا تھا۔

نیکا

ہم اب اپنے پہلے بیان کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ اریگاین سے چل کر سکندر نے راغا کے مقام پر پہنچ کر کوہ شنگس کی جنوبی تلہیٹی میں سکندرونہ کے نام سے فوجی قلعہ تعمیر کرنے کے بعد دریائے گنگ کے شمالی کنارے پر رود بار باجور کے علاقہ میں مغرب کی طرف پیش قدمی جاری رکھی اور میدان لاشورا میں سے وادی ماندل (مندل) جو تاریخی پہاڑی "کے مور" کے شمالی تلہیٹی میں واقع ہے۔ اس وادی کے مشہور شہر نیسا کی طرف رخ کیا تھا اور جیسا کہ ذکر کیا گیا یہی وہ تاریخی شہر ہے جو بعد کے مؤرخین کے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے اور اس کا محل وقوع متعین نہیں کر سکے ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے اس شہر کے قریب واقع پہاڑ کا نام میرون نہیں ہے جیسا کہ سٹرہبو نے بیان کیا ہے۔ بلکہ اس کا نام کیمور ہے اور نیسا اس کے شمالی تلہیٹی میں واقع ہے۔

مؤرخین کو شہر نیسا کے محل وقوع متعین کرنے میں اس لئے مشکلات پیش آ رہی ہیں کہ ایرین نے اس شہر کا نام حرف (ک) سے (NYCA) تحریر نہیں کیا تھا کہ اسے نیسا پڑھا جاتا بلکہ اس نے یہ نام حرف (c) سے (NYCA) ضبط کیا تھا اور اس میں بھی حرف (c) سے حرف (س) کی آواز نہیں لی گئی تھی۔ غور کیا جائے تو لاطینی خصوصاً اٹلی کی زبان اور یونانی زبان میں حرف (c) تین آوازیں دیتا ہے (س۔ک۔ح) ایرین نے اس جگہ کے نام (NYCA) میں حرف (ک) کی آواز اختیار کی تھی یعنی حرف (ک) کے لئے اسے استعمال کیا تھا۔ باجور کے قدیم یونانی باشندوں کے لہجہ میں اس شہر کا اصلی نام (نیکا) ہے۔ اس عہد میں جب سکندر نے حملہ کیا تھا۔ مقامی لوگ اسے نیکا کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں۔ بعد کے مؤرخین جن کو اس تاریخی شہر کے لوگوں کے لہجہ اور تلفظ کا علم نہیں تھا اپنی ناسمجھی سے ایرین کے تحریر کردہ نام (NYCA) کو حرف (c) کی جگہ حرف (S) سے (NYSA) نیسا لکھ کر ایک صحیح نام کو غلط بنا دیا اور چونکہ اس جغرافیائی خطہ میں نیسا کے نام سے کسی بھی جگہ آثارِ قدیمہ کا وجود نہیں تھا۔ اس لئے اپنے ہی ہاتھوں اس تاریخی شہر کے تعین کے امکانات کو ختم کر دیا۔

آج یہاں پٹھانوں کی جن ذیلی شاخوں کے لوگ آباد ہیں وہ حرف (ک) کی جگہ حرف (خ) کا تلفظ کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ سرزمین جن قبائل سے قبضہ میں لی تھی باجور کے وہ قدیم رہنے والے آج باجور کے شمال میں واقع کوہستانی علاقے میں آباد ہیں۔ باجور کا ایک پشتو جملہ ہے، خان پخیر راغلے (خان اخیر سے

آئے) جبکہ یہی جملہ باجور کے یہ قدیم یونانی باشندے یوں ادا کرتے ہیں۔ کان پیکیر راگلے۔ اس علاقے لہجہ کے اختلاف کے مطابق شہر نیسا = (نیکا) کے موجودہ پشتو بولنے والے اسے (نیخا) کہتے ہیں۔ جبکہ درحقیقت نیخا ہی اس جگہ کا قدیم ترین اور چھ ہزار سال کا پرانا نام ہے۔ ہم اس نام کے پس منظر کی تفصیل میں نہیں جا سکتے۔ مختصراً یہ کہ پشتو حروف تہجی میں حرف (ح) غیر منقوطہ کی آواز نہیں ہے۔ یہ لوگ رحمن کو رخمن اور نوح کو نوخ کہتے ہیں۔ یہ لوگ حروف (و۔ی) ایک دوسرے کی جگہ تبدیل کرتے ہیں۔ (مور = ماں) کو (میر) کہتے ہیں۔ تور، تیر کور = کیر۔ پشتون، پشتین، اس کی مثالیں ہیں۔ اس کے پیش نظر نوح۔ نیخ۔ نوحا = نیحا۔ نیحا = نیخا = نیکا کے الفاظ سمجھ میں آجائیں گے۔ پشتو زبان میں جد اعلیٰ کو نیکا = نیکہ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نوح = نیخ = نیحا = نیخا۔ نیکا موجودہ بنی نوع انسان کے جد اعلیٰ ہیں۔ جنہیں ابو البشر ثانی کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے انہیں نیخا = نیکا کہنا حقیقت کا اظہار ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ نیسا کی آبادی قبل از طوفان نوح کی آبادی ہے اور اس بات کو اس سے تقویت ملتی ہے کہ نیسا سے کچھ ہی فاصلہ پر ایک پیغمبرؑ کا مزار پُر انوار ہے جس کے متعلق پورے تاریخی استناد سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کے والد ماجد مہتر لام (لامک) کے بھائی کا مزار ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے ایک فرزند کا نام تھا سام اس کے ایک فرزند کا نام تھا پشت جو پٹھانوں کا مورث اعلیٰ ہے اور جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے نیکا کے شمال مشرق میں پشت نام کے ثقافتی آثارِ قدیمہ موجود ہیں۔ اوپر دو لہجوں مور = میر کا ذکر کیا گیا اس کے پیش نظر نیسا کے جنوب میں واقع پہاڑ کے نام (کے مورہ میرون) کی یکسانیت سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس تاریخی نکتہ کے بیان کرنے سے ہمارا مقصد اس تاریخی شہر کی قدامت کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ جبکہ ہم اس سلسلہ میں تفصیلی معلومات رکھتے ہیں۔

شہر نیسا کی آبادی کی شمالی دیواریں دریائے گنگ کے جنوبی کنارے تک پہنچی ہوئی ہیں۔ جس کی بارہ دریاں، سیڑھیاں اور اشنان کے گھاٹ ابھی تک موجود ہیں۔ تاریخی قدامت کے لحاظ سے اگر ہم اسے برصغیر پاک و ہند کا سب سے قدیم ترین شہر قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی نیسا کے شمال مشرق کی ایک وادی میں دو قدیم شہروں کے آثار قدیمہ موجود ہیں ایک کا نام ہے موہنجو اور دوسرے کا نام ہے دارو۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۲۵۰۰ ق م وادی سندھ کے شہر موہنجو دارو کے بسانے والے یہاں کے دو شہروں موہنجو اور دارو سے جانے والے لوگ تھے تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ جبکہ کتاب رگ وید کے پانچویں منڈل میں جن مقامات کا ذکر کیا گیا ہے وہ اسی نیسا کی سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں۔

محلِ وقوع

میرے گرامی قدر محترم دوست مرحوم اللہ بخش یوسفی نے اپنی تالیف "تاریخ یوسفزائی" کے صفحہ ۱۶۶ پر ایک نقشہ دے دیا ہے جس میں برصغیر پاک و ہند کے انتہائی شمال مغربی علاقہ باجور میں سکندر کے داخلہ اور وادئ پشاور میں اس کے جرنیل کے داخلہ کے راستوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مرحوم نے یہ نقشہ کتاب "گیلس آف انڈیا" سے یا کتاب "انسائیکلو پیڈیا آف انڈیا" یا مسٹر مارٹن کی تالیف "پاک و ہند کے شمال مغرب کے جغرافیہ کی مطالعات" میں سے کس سے لیا ہے۔ وجہ یہ کہ انہوں نے اپنا ماخذ نہیں بتلایا۔ بہرحال یہ نقشہ کئی اعتبار سے غلط ہے اور ہم اس کی غلط بیانیوں کی تصحیح اس طرح سے کرنا چاہتے ہیں کہ دوسری ضروری معلومات بھی علم میں آسکیں خصوصاً اس دوران میں مصر کی ملکہ قلوپطرہ کے جدِ امجد پٹولمی نے جو سکندر کے افواج کے نامی گرامی جرنیل تھے، نے "ملکہ اسکینی" کے جس دار الخلافہ پر حملہ کیا تھا اس کا محل وقوع بھی متعین ہو سکے اور اس سلسلہ میں سب سے اہم فوجی قلعہ اریان کا محل وقوع بھی متعین ہو سکے۔ متعلقہ

---

[1] ہم نے اپنے ترتیب دیئے ہوئے نقشہ میں ان دونوں تاریخی مقامات کا محل وقوع متعین کر دیا ہے (ش)

نقشہ میں قابلِ ملاحظہ باتیں درج ذیل ہیں۔

الف : یہ کہ اس نقشہ میں سکندر کا موجودہ افغانستان کے سمت مشرق کے وادی کنڑ میں دریائے کنڑ کو پشت اور جلال آباد (کامہ) کے درمیان کوہ لکڑائی کے مغربی ترائی میں واقع موضع نواگئی کے پاس عبور کرنا ظاہر کیا گیا ہے۔ حالانکہ سکندر نے وادی کنڑ میں دریائے کنڑ کے کنارے آگے بڑھ کر اسمار کے مقام پہ دریائے کنڑ کو عبور کیا تھا اور وہاں سے مشرق کی طرف درۂ دانگام میں داخل ہو کر اس وقت کے باجور کے دار الحکومت پشت اور اریگائیون تک پہنچنے کے لئے اقدام کیا تھا۔ دو پشت ہیں ایک پشت کنڑ میں اور ایک پشت باجور میں۔

ب : اس نقشہ میں سکندر کا باجور میں داخلہ نواگئی ؀۲ واقع وادی چارمنگ کے مغرب کی طرف سے ظاہر کیا گیا ہے۔ جبکہ سکندر نے نواگئی (؀۱) کی طرف سے باجور کے شمال میں واقع کوتل گبری سے ہو کر حملہ کیا تھا۔ خود سکندر نے اس کوتل سے جنوب مشرق کی طرف چل کر گبر۔ قلعہ اریگائیون، پشت پر میدانِ کارزار گرم کیا اور اس کا جرنیل پٹولمی کوتل گبری کے مقام پر اس سے الگ ہو کر بجانب مشرق چلتا ہوا کوتل دڈھلی (دھلی) سے ہو کر جنوب کی طرف چڑھائی چڑھتا ہوا ملکہ اسکیفی کے شاہی قلعہ پر (جو آج کل حرف شاہی کے نام سے موسوم ہے) پر حملہ آور ہوا تھا اور اس کے بعد اسے قلعہ اریان پر خونریز لڑائی لڑنے کا سامنا کرنا پڑا تھا اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے فتح اریگائیون کے بعد سکندر نے سلسلہ کوہ شنگس کے مغربی پہلو میں اور پٹولمی نے اس سلسلہ کوہ کے مشرقی پہلو میں آگے بڑھ کر ان دونوں کی فوج ھشت[۵] پہلو چوٹی شنگس کے جنوبی ڈھلوانوں اور دریائے گنگ کے شمالی کنارے پہ ایک دوسرے سے مل گئی تھی اور یہاں سکندرونہ نام کے قلعہ کی تعمیر کے بعد جنوب مغرب کی طرف بڑھ کر نیسا پہنچ گئی اور پھر وہاں سے فراغت کے بعد پھر ایک دفعہ بجانب مشرق چل کر وادئ جندول کے جنوب مشرق میں گوسم اور جندول کے تکون میں واقع اس عہد کے عظیم الشان قلعہ اور عظیم الشان معبد متا کا سے انہیں نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ ہم ذیل میں یہ نقشہ ضروری اضافہ اور تصحیح کے ساتھ درج کر رہے ہیں۔

تاریخی نکتہ

ذیل میں نیسا کا جو نقشہ درج کیا جا رہا ہے اس جغرافیائی خطہ کے صرف چند نام ہی ہم درج کر سکے ہیں۔ لاتعداد نام ایسے ہیں جو ثقافتی آثار قدیمہ کی نوعیت رکھتے ہیں اور جن کا ذکر دو مشہور کتابوں ریگ وید (منڈل ۵) زمانہ سنہ ۱۵۰۰ ق م اور کتاب اوستا زمانہ سنہ ۱۴۰۰ ق م اور کتاب الاحبار اور کتاب السلاطین (توراۃ کے دو صحیفے) زمانہ سنہ ۱۲۰۰ ق م میں آچکا ہے۔ یہ تمام اس قسم کے تاریخی نکتے ہیں جو پاکستانی مؤرخین کے لئے قابل غور ہیں۔ سکندر کے حملہ کے وقت (۳۲۷ ق م) یہاں دو قوموں کا ذکر ملتا ہے۔ کینی (قینی[۱]) اور اسپاسینی ان میں سے اسپاسینی وہی لوگ ہیں جن کے نام کی نسبت سے یورپ کے ایک مملکت کا نام اسپین یاد کیا گیا ہے قابل غور بات یہ ہے کہ مملکت سپین کے موجودہ جغرافیائی نقشہ کے دریاؤں ندیوں، نالوں، پہاڑوں، میدانوں اور مقامات کے لاتعداد نام پیش نظر جغرافیائی نقشہ کے علاقوں میں جوں کے توں موجود ہیں۔ دور دراز کے دو ملکوں میں ناموں کی یگانگت نظر انداز کرنے کی نہیں ہے۔

---

[۱] کینی (قینی) کا ذکر کتاب الاحبار (قاضیون) اور کتاب السلاطین دونوں میں ہے اور اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس قوم کے لوگ سنہ ۱۲۰۰ ق م میں ہمارے اس شجرہ اور نقشہ کے متعلقہ جغرافیائی خطہ میں آگئے تھے (راش)

ـــ سکندر کا موجودہ پاکستانی سرزمین میں داخلے کا راستہ جو یورپ کے مستشرقین نے نواگئی ۱ اور ۲ میں التباس کی وجہ سے متعین کی ہے۔

= ڈبل لکیروں سے سکندر کی آمد کے راستے کی تصحیح جو ہم نے کی ہے۔

... سکندر کے جرنیل کا راستہ جو اس وقت کے وادیٔ پشاور کے دارالحکومت پشکلاوتی تک پہنچتا ہے۔

(۱) سکندر وادی کنتر　　　نواگئی ۱ پشت، چگان سرائے، اسمار سے ہوکر وادی دالگام کے مشرق میں کوتل گبرے سے ہوکر وادی باجوڑ کے گبرا اریگا ئین، پشت پہنچے۔ اور اس کے جرنیل پٹولمی نے دہلی، شاہی، اریان فتح کرنے کے بعد وادی جندول میں جنوب کی طرف مڑکر قلعہ ٹھاکر کو فتح کرتے ہوئے کوہ شنگس کے جنوب میں بمقام سکندر دنہ.. سکندر سے آملا تھا اور بمقام راحنا قیام کیا تھا۔

(۲) نیسا کے جنوب میں کے موہر (میرون) کی پہاڑی ہے۔ شہر گنگ دریائے اوتلی کے مشرقی کنارے پر واقع ہے اور اس شہر کے نیچے یہ دریا نئے نام دریائے گنگ سے موسوم ہے۔

★ شاہی دارالحکومت منکلہ، سکینی، مناکینی، شالا قوم کی دارالحکومت پنجاب کا شہر سیالکوٹ اس قوم نے بسایا ہے۔

□ بابر نامہ اور "تاریخ آئینہ حقیقت نما" (طبع کراچی) کر لمغان میں نوح علیہ السلام کے والد کا مزار ہے (اثر)

پشتو کہاوتیں

حسین احمد مدنی

عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے کہ "المثل فی الکلام کالملح فی الطعام" یعنی بات چیت میں کہاوت ایسی ہوتی ہے جس طرح کھانے میں نمک۔ اگر کھانے میں نمک نہ ہو تو وہ بے مزہ اور پھیکا ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر گفتگو میں مقولے اور ضرب الامثال نہ ہوں تو وہ پھیکی اور بے مزہ ہوتی ہے۔

ضرب الامثال کی تعریف کرتے ہوئے مشہور یورپین ادیب چارلس انڈیل کہتے ہیں:-

> "ضرب الامثال ایسے چھوٹے چھوٹے جامع مگر تیز اور چبھنے والے جملے ہوتے ہیں جن میں انسانی تجربے اور مشاہدے ظریفانہ انداز میں بیان کئے جاتے ہیں۔"

ایک دوسرے ادیب کے خیال میں یہ ایسے مختصر اور جامع جملے ہوتے ہیں جو قوم کے احساسات و جذبات، تہذیب و تمدن، اور فہم و ذکا کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ایک اور صاحب ان کہاوتوں میں معانی کے ساتھ ساتھ نمکینی اور مزاح کی آمیزش ضروری سمجھتے ہیں۔

ارل رسل کا کہنا ہے کہ کہاوت یا مثل میں بہت سے لوگوں کی ذہانت اور ایک آدمی کا جوہرِ تمیز کام کرتا ہے۔ ان کہاوتوں کے ذریعے ہم اُس زبان کی تاریخی قدامت اور وسعت کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

پشتو دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس کا لٹریچر بہت پرانا اور اچھا خاصا وسیع ہے۔ اس کے الفاظ کا ذخیرہ بھی بڑا ہے۔ چنانچہ اس زبان میں ضرب الامثال بھی بہت زیادہ ہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ پشتو میں تو کوئی بات بغیر مثل یا کہاوت کے نہیں کہی جاتی۔ پشاور یونیورسٹی کی پشتو اکیڈمی پچھلے چند سالوں میں بارہ ہزار سے زیادہ کہاوتیں فراہم کر چکی ہے اور ابھی تلاش جاری ہے۔

پشتو زبان اور پشتون کلچر میں کہاوتوں کو ایک اہم مقام حاصل ہے جو شاید دوسری مشرقی زبانوں کو نہ ہو۔ یہ کہاوتیں پٹھانوں کی قومی خصوصیات کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ ایک پختہ اور عمر رسیدہ ملّی گروہ ہے۔ اس کا معاشرہ مکمل اور ہمہ گیر ہے۔ اس کے افراد زمانے کے گرم و سرد کا تجربہ رکھتے ہیں اور ان کے کلچر میں بڑی وسعت ہے۔

پشتو زبان میں ضرب الامثال کی کثرت کا بڑا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ پٹھان شروع ہی سے کٹھن اور دشوار گزار منزلوں سے گزرتے آئے ہیں۔ وہ زندگی کی بوقلمونی اور مد و جزر سے

واقف ہیں۔

پشتو کی کہاوتیں بھی عوامی ادب کا حصہ ہیں بلکہ یہ بیشتر عوام کی ساختہ پرداختہ ہیں اور سینہ بسینہ منتقل ہوتی آئی ہیں۔ یہ زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کئے ہوتے ہیں۔ ان میں ایسی بھی ہیں جن کو ضبطِ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ یہ مختلف نوعیتوں کی ہیں ایک وہ جو بعض تاریخی واقعات پر مبنی ہیں دوسری وہ جو چند مذہبی عقائد، رسوم و روایات اور توہمات کی بناء پر بنائی گئی ہیں۔ تیسری بعض ایسی فرضی باتوں سے متعلق ہیں جو عوام میں مانی جاتی ہیں۔ چوتھی وہ کہاوتیں ہیں جن کا تعلق قومی یا علاقائی تفاخر سے ہے۔

پانچویں وہ کہاوتیں جو ایک مخصوص طبقے میں مستعمل ہیں اور کسی ماحول سے متعلق ہیں اور چھٹی قسم میں ٹپے، مصرعے یا شعر بطور کہاوت کے استعمال کئے جاتے ہیں مگر عموماً یہ ضرب الامثال ایسے واقعات یا حالات کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو عام ہوں مثلاً خوک اُولولی ملا شی۔ اُڈخوک اُولولی بلا شی یعنی بعض لوگ پڑھ کر عالم بن جاتے ہیں اور بعض لوگ پڑھ کر مصیبت بن جاتے ہیں۔

اسی طرح کہتے ہیں کہ "لور پہ لوتہ تیرہ وَل" یعنی درانتی مٹی کے ڈھیلے پر تیز کرنا۔

یہ مثل کام چور اور کاہل کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

چند تاریخی کہاوتیں مندرجہ ذیل ہیں

(۱) "دَ سِکھ نہ ئے تبلیا بَدوی"۔ یعنی سِکھ سے اس کا نوکر بُرا ہوتا ہے۔

(۲) "پیشو زبرگہ شوہ منږک نہ نیسی"۔ یعنی بلی بزرگ بن گئی اور اب چوہوں کو نہیں پکڑتی۔

(۳) "خَرکہ ترمکے لاړ شی۔ چہ بیرتہ شی ھغا خَر دے"۔ گدھے کو اگر کوئی شخص شہر مکہ بھی لے جائے۔ پھر بھی واپسی پر وہ گدھا ہی رہے گا۔

بعض ضرب الامثال عوام کے عقائد اور توہمات سے تعلق رکھتی ہیں۔

مثلاً:۔

(۱) "کارغہ پہ بنیرہ چغے وھی۔ جو رمیلمہ راځی"

یعنی کوّا کائیں کائیں کر رہا ہے شاید کوئی مہمان آئے گا۔

(۲) "ھغہ سرہ گیدړ سنگے دَہ ځکہ وَر لہ ھدسرے کار کوی"

یعنی اس کے پاس گیدڑ سنگی ہے جس کی مدد سے وہ دوسروں کو مسخر کرتا ہے۔

بعض کہاوتوں میں قومی کردار اور ملی شعار کا اظہار ہوتا ہے مثلاً:

(۱) "پُہ سخت وخت کښی تربُور هم پکار راځی"

یعنی چچیرا بھائی بھی سخت وقت پر کام آتا ہے۔ پٹھانوں میں چچا زاد بھائی عموماً دشمن سمجھا جاتا ہے مگر آڑے وقت میں وہ بھی کام آجاتا ہے۔

(۲) "پیر ئے مَنو کوتک ئے نہ منو"

یعنی ہم پیر صاحب کو تو مانتے ہیں مگر اُن کے ڈنڈے کو نہیں مانتے۔

(۳) "چہ اوغوارے پہ دِخولہ نوخورے بہ یئے پہ کمہ خولہ"

یعنی جب مانگوگے اس مُنہ سے تو کھاؤگے کس مُنہ سے۔

(۴) "چہ دَگیدړ ښکار لہ ځئ تو تابیہ ورتہ دَ اَمزری کوہ"

گیدڑ کے شکار پر جاتے وقت تیاری شیر کے شکار کی کیا کرو۔

(۵) "ختک وائی خدایہ یو خر کے او یو تبر کے راله راکے بیا مے تہ دَ هرخہ نہ خلاص ئے"۔

ختک کہتا ہے کہ اے خداوند ایک گدھا اور ایک کلہاڑی مجھے دے دے پھر تو میرے رزق سے بے فکر ہو جا۔

بعض کہاوتیں فرضی باتوں پر مبنی ہوتی ہیں اُن میں عموماً تمثیلی باتوں

خیالی قصوں اور افسانوں کے حوالے ہوتے ہیں مثلاً

(۱) "ژوندي مېږکان په تله کښې تلل" یعنی زندہ چوہوں کو ترازو میں تولنا۔

(۲) "د مېږي په کور کښې هر وخت غم وي" چیونٹی کے گھر میں ہر وقت ماتم ہوتا ہے۔

(۳) "د خر مرګ د سپو اختر وي" گدھے کی موت کتوں کی عید ہوتی ہے۔

(۴) "چیندخ په لوټه اوختو کشمیر ئے اولیدو" مینڈک ایک ڈھیلے پر چڑھ کر کہتا ہے کہ اس نے کشمیر کو دیکھا ہے۔

(۵) "که یې وي نو اوخوره کنې نهرا وسه" اگر ہے تو کھاؤ ورنہ بھوکے رہو۔

(۶) "د ننګ کار ګوره قد ئے مه ګوره" بہادر آدمی کے کارناموں کو دیکھو اس کے قد کو نہ ناپو۔

(۷) "څپلئ په خپه کښې معلومیږي او سړے په میدان کښې" جوتوں کی اچھائی اور برائی کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب ان کو پہنا جائے اور مرد کی مردانگی میدانِ جنگ میں معلوم ہوتی ہے۔

ہندوؤں اور سکھوں کے بارے میں چند مشہور کہاوتیں ملاحظہ ہوں۔ ان سے پٹھانوں اور اُن غیر مسلموں کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے جیسے:۔

(۸) "د هندو ګډا د لاس پرانستل او بندول دي" ہندوؤں کا ناچ ہاتھوں کا کھولنا اور بند کرنا ہے۔

(۹) "هندو وژړل او پیاز ئے خوړل" ہندو رو رہا تھا اور پیاز کھا رہا تھا۔

(۱۰) "د هندو ږیره دولت دے" دولت ہندو کی داڑھی ہے۔

(۱۱) "د سکھ حقیقت د هغه په ږیره کښې دے" سکھ کی حقیقت اس کی داڑھی میں ہے۔

عورتوں کے بارے میں بھی پٹھانوں کی کہاوتیں قابلِ سماعت ہیں مثلاً:۔

(۱۲) "د ډمې نه چا تپوس اوکړو۔ دِ یار دِ مړ شو۔ هغې وے د کمې کوسے" کسی نے طوائف سے کہا: تیرا یار مر گیا۔ اس نے کہا کون سی گلی کا۔

(۱۳) "ښځې له یا کور دے او یا ګور" یعنی عورت کے لئے یا گھر ہے اور یا قبر۔

(۱۴) "د ښځې عقل په پونده کښې وي" عورت کی عقل اس کی ایڑی میں ہوتی ہے۔

مندرجہ ذیل ضرب الامثال سے پٹھانوں کی فراست اور سماجی شعور کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ جیسے:۔

(۱۵) "مړه خیټه فارسي وائي" بھرا ہوا پیٹ فارسی بولتا ہے۔

(۱۶) "دوست هغه دے چه په سختئ کښې د پکار راشي" یعنی دوست وہی ہے جو مصیبت کے وقت کسی کام آئے۔

(۱۷) "د کم عقل دوست نه هوښیار دشمن ښه دے" بیوقوف دوست سے ہوشیار دشمن اچھا ہوتا ہے۔

(۱۸) "د مزدور په شان ئے اوګټه او د خان په شان ئے اوخوره" مزدور کی طرح کماؤ اور رئیسوں کی طرح کھاؤ۔

ر کاموں سے لوٹتے ہوئے

جفاکشی اور خوشدلی قبائلی جوانوں کا طرۂ امتیاز ہے

قبائلی بچے

قبائلی جوان علاقائی رقص پیش کر رہے ہیں

قبائلی علاقے کا ایک مکان

قلعہ جمرود کا ایک منظر

(۱۹) "سَر دِ حیات وی پگڑے ڈیرے"
اللہ سے سَر کی سلامتی مانگو تو پگڑیاں بہت ہیں۔

(۲۰) "یو خوا ڈانگ دے او بل خوا پرانگ دے"
ایک طرف ڈنڈا ہے اور دوسری طرف چیتا ہے۔

(۲۱) "کُم ڈیلے دِ فتح کہ راغلے"
کونسی دِلی فتح کر کے آرہے ہو۔

(۲۲) "هغه موچئے نورنے وی چې غلَ ئے شات وی"
وہ مکھیاں اور ہوتی ہیں جن کا فضلہ شہد ہوتا ہے۔

(۲۳) "آسونو لہ ئے نالونہ وهل، چنگښو هم پښے اوچتے کرے"
گھوڑوں کے نعل لگاتے وقت مینڈکوں نے بھی پاؤں اٹھائے۔

(۲۴) "پہ زور گلی نہ کیبږی"
دوستی اور آپس میں تعاون زور سے نہیں ہو سکتی۔

(۲۵) "چہ پہ سینہ مِ نہ راځی ـــ نام ئے نہ راځی"
جو کسی کے کام نہ آئے اس کا نام یاد رکھنا فضول ہے۔

(۲۶) "دریاب دَ سپی پہ خولہ نہ پلیتیږی"
دریا سے اگر کتا پانی پیئے تو اس سے وہ ناپاک نہیں ہوتا۔

(۲۷) "دَ چیند خانو تول دے چہ دوہ پہ تلہ کنبی اچئے نو څلور ترے دانگی"
یہ مینڈکوں کا تول یا وزن ہے دو کو اگر ترازو میں ڈالا جائے تو چار اس سے باہر کو دتے ہیں۔

(۲۸) "آخرہ زمانہ شوہ ـ دَ چرگ کانو یارانہ شوہ"
مرغوں کا آپس میں دوستی کرنا قیامت کی علامت ہے۔

(۲۹) "چہ اوښان ساتے نو دروازہ لوبہ جوړہ کرہ"
اگر اونٹوں کو پالنا ہو تو ان کے لئے پھر بہت بڑا دروازہ بنانا ہوگا۔

(۳۰) "دَ زور وَرو اوبہ پہ لوړه خیږی"
طاقت ور اور اثر و رسوخ والوں کی بات ہر جگہ مانی جاتی ہے۔

(۳۱) "څوک وائی څه او کو او څوک وائی څه ئے کوو"
بعض لوگ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ کھانے کو انہیں کچھ نہیں ملتا اور بعض لوگ اتنے مالدار کہ مسلسل خرچ کر کے بھی ان کی دولت ختم نہیں ہوتی۔

(۳۲) "اوږی نہ چا وے دوه او دوه څو کیږی۔ هغه وے څلور ړوټئ"
ایک بھوکے آدمی سے کسی نے پوچھا دو اور دو کتنے ہوتے ہیں اس نے کہا چار روٹیاں۔

(۳۳) "خر پلار کہ او مطلب پورے بار کہ"
یعنی مطلب کے وقت گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔

(انشائیہ)

داستان اپنے پروفیسر بننے کی

محمد احمد شمسی

جیسے عشاقِ وفا پیشہ یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کا عشق کس لمحہ کس گھڑی، کس دن شروع ہوا تھا اور وہ اس ضمن میں روزِ اوّل کا ذکر لے کر بیٹھے ہیں یا جس طرح بعض لوگ اپنی خوبیوں اور دوسروں کی خامیوں کو اپنی اور ان کی سرشت کا حصہ سمجھتے ہیں، اسی طرح ہمیں بھی اس وقت کچھ صحیح یاد نہیں آرہا ہے کہ ہمارے دلِ نادان میں پروفیسر بننے کا ارمان کب، کیسے اور کیوں پیدا ہوا۔ عین ممکن ہے یہ بھی افتادِ طبع قسم کی کوئی بات ہو اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب سے ہمیں حروفِ تہجی کی پہچان ہوئی تو ہم نے الفاظ، اوراق، کتب اسباق اور قلم دوات کو مولانا کے ڈنڈوں اور اللہ کے بندوں کے مقابلہ میں، بے آزار، باوقار، دلنواز، مستند و معتبر پایا ہوا اور یوں اولاً ہمیں کتابوں سے دلچسپی ہوئی ہوا اور بعد میں جس طرح بہ روایتِ دیگراں، عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی میں بدل جاتا ہے اسی طرح کتابوں کے ساتھ ہماری یہ معصوم سی دلچسپی، اس پیشہ میں دلچسپی سے بدل گئی ہو جس میں ہمیں، اپنے خیالِ خام کے مطابق صرف کتابوں، ان کے شائقوں علم کے طالبوں اور صاحبِ علم، علم نواز اساتذہ سے واسطہ پڑنا چاہیئے تھا۔

اب آپ سے کیا پردہ، ہم ابتدا ہی سے ان لوگوں میں ہیں جنہیں کتاب سے فراغ ممکن نہیں ہوتا کیونکہ وہ کتاب خواں ہوتے ہیں، صاحبِ کتاب نہیں ہوتے۔ چنانچہ جلد ہی ہماری کتاب خوانی ایک اہم خاندانی مسئلہ بن گئی۔ اور یہ مسئلہ جب ہماری تائی اماں کے زیرِ غور آیا یا لایا گیا تو بزرگانہ "عفو و درگذر سے کام لے کر فرمانے لگیں"۔ میاں صاحبزادہ! آپ کی یہ "کتاب بازی" بھی بٹیر بازی، پتنگ بازی، پٹے بازی کی طرح ایک لت ہے واہیات اور فضول مگر خیر، چند روز آپ اپنا شوق پورا کرلیں، ذرا فہم میں بلوغت آئے گی تو آپ سے آپ یہ لت چھوٹ جائے گی۔ آخر آپ رزق کا کیڑا ہیں کتابوں کا کیڑا کب تک بنے رہیں گے۔

ان دنوں ہمارے شہر میں مسلمانوں کا ایک ہی اینگلو ورنا کیولر اسکول تھا اور وہ بھی مڈل، ہم نے آٹھویں تک اسی اسکول میں پڑھا۔ اس کے ناظم اور ہیڈ ماسٹر دونوں حضرات نے نہیں معلوم کیسے ہمیں باور کرایا کہ ہم اور صرف ہم ملتِ اسلامیہ کے مقدر کا ستارا ہیں چنانچہ نظامتِ تعلیم کے زیرِ اہتمام ہونے والا یہ امتحان ہم جس قدر امتیاز کے ساتھ پاس کریں گے، اسی قدر اسلامیانِ ہند کا وقار اقوامِ عالم میں بلند ہو جائے گا۔ ان بزرگوں کی تلقین سے قطعِ نظر، ہمیں خود بھی "مسدس حالی" اور "بانگِ درا" کے چیدہ چیدہ اقتباسات سے ذاتی قسم کا علم ہوچکا تھا کہ ہم اس قوم کے نوجوان ہیں جو کبھی "جہانگیر و جہاندار و جہاں بان و جہاں آرا" تھی مگر آج قعرِ مذلت میں گری

ہوئی ہے اِس لئے ہم نے بھی یہ سوچا کہ ہماری انفرادی کوشش سے پوری ملت کا بول بالا ہوتا ہے تو یہ تو "ہم خرما و ہم ثواب" والی بات ہوگی، کیا عجب ہم بھی تاریخی کردار ادا کرنے کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہوں!

چنانچہ ہم دل وجان سے مطالعہ میں منہمک ہو گئے اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مڈل کا یہ امتحان ہم نے اعلیٰ ترین امتیاز سے پاس بھی کر لیا مگر یہ دیکھ کر ہمیں سخت حیرت اور مایوسی ہوئی کہ جس ملت کی ناموری کے لئے ہم نے آدھی آدھی رات تک چراغ کا تیل جلایا تھا دماغ سوزی کی تھی، جسے سربلند دیکھنے کے ارمان میں ہماری آنکھیں عینک آشنا اور کمر خم آشنا ہو گئی تھی، ہماری کامیابی کے بعد بھی اس کی حالت جوں کی توں رہی، انتقاماً ہم نے بھی اپنی جگہ مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ ہم ملت کی فکر کو مطالعہ کی لذت پر شبخون مارنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

اب ہم جس ریاستی ہائی سکول میں داخل ہوئے اس کے اساتذہ کو بھی مسلم اسکول کے اساتذہ کی طرح ہمہ وقت مصروف ومستعد، ہمہ طور مطمئن وخوش دل، ہمہ جہت لائق وقابل اور ہمہ لحاظ مشفق ومہربان پایا۔ چنانچہ مدرسی کے پیشہ کا ہم ایسا ہی احترام کرنے لگے جیسے آپ اور ہم دور سے مسجد کا احترام کرتے ہیں کہ اس میں داخل ہونے کا خیال بھی کبھی ہمارے دل میں نہیں آتا۔ ان اساتذہ میں تقریباً سبھی پوشاک میں اتنے سادہ، طور طریق میں اتنے متحمل مزاج اور برتاؤ میں اتنے ہمدرد تھے کہ زبان، مذہب اور لباس کے اختلاف کے باوجود، ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ ریاضی کے استاد کے سامنے جب کسی طالب علم کا دماغ لڑکھڑانے لگتا تھا یا زبان ڈگمگا جاتی تھی یا اس کا ہاتھ سیاہ تختہ پر کسی غلط بیانی کا مرتکب ہوتا تھا تو وہ بڑے ہی شگفتہ اور مربیانہ لہجہ میں اصلاحِ حال کا آغاز ہمیشہ اِس مصرعہ سے کرتے تھے کہ:

"سہارا مل گیا دیوار کا، اندھے عصا سمجھے"

اور پھر عجیب کرشمہ یہ ہوتا کہ اس مصرعہ کی اوّلین سرسراہٹ پر اس اندھے کی آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں اور دیوار کے غلط سہارے پر متنبہ ہو کر وہ اپنا عصا فوری تلاش کر لیتا تھا۔

اکبر الٰہ آبادی کا خیال ہے کہ زمانے کی نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں اور پھول پتوں میں نہاں ہو کر بھی چھپا نہیں رہتا مگر ہمارا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ پھولوں کے درمیان پتہ بھی چھپتا نہیں ہے اور استاد کی نظر ناقصوں پر سب سے پہلے پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں ہمارے اردو کے محترم و شفیق استاد کی نگاہ ہم پر ایسی اٹھی کہ ہم اردو کی بہت بہترین کتابوں اور مصنفوں سے متعارف ہو گئے وہ ہمیں بعض کتابیں پڑھنے کی تاکید کرتے اور ان پر کبھی کبھی ایک آدھ سوال بھی کر بیٹھتے۔ ایک دن بغیر کسی تمہید کے ہم سے استفسار فرمایا "آپ نے لیلیٰ کے خطوط" بھی پڑھے ہیں یا نہیں؟

یہ سوال نہیں تھا ایک بجلی تھی جو ہمارے سر پر اچانک یوں گری کہ ہمارے حواس جاتے رہے اور ہم ایک سہمی سی دبی دبی سی "جی" کے سوا کچھ نہ کہہ سکے چنانچہ استاد محترم نے پھر وہی سوال دہرایا۔ اس بار ہم نے نفی میں سر ہلایا اور پھر مزید وضاحت کے لئے عرض کیا: "جی وہ کتاب کا نام ذرا غیر اخلاقی سا ہے اس لئے پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی!"

دراصل اس سوال وجواب سے چند روز پہلے ہم حسب عادت اسکول کے مختصر سے کتب خانہ میں "انڈکس کارڈس" کی گردان سے اپنے علم میں اضافہ کر رہے تھے کہ اچانک ہماری نگاہ "لیلیٰ کے خطوط" از "قاضی عبد الغفار" پر ایک ثانیہ کے لئے پڑی تھی مگر جیسے صالح نوجوان نامحرم کے چہرہ سے فوراً نظریں ہٹا لیتا ہے ہم نے بھی اس کارڈ سے اپنی انگلیوں کو آلودہ نہیں ہونے دیا تھا اور جب ایک عجیب سے ردعمل نے ہمیں اگلے والے کارڈ کی طرف ڈھکیلا تو ہم یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہے تھے کہ ایسے قابل اعتراض نام کی کتاب یہاں آئی کیسے؟ وہ تو خیر گذری ہم اس اسکول میں نووارد تھے اور نویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ اگر خدا بھی سینئر یا دیرینہ طلبہ میں سے ہوتے تو اس کتاب کو، اسے اسکول لائبریری کے لئے خریدنے والے کو، اور اس کا انڈکس کارڈ بنانے والے کو ملازمت سے برطرف کرنے کی تحریک چلا دیتے خواہ اس میں خود ہمارا ہی اخراج کیوں نہ عمل میں آ جاتا۔

جس کتاب کے نام پر ہمیں ایسا شدید اخلاقی طارہ آیا تھا۔ اب اسی کے متعلق ہم سے پوری کلاس کی موجودگی میں دریافت کیا جا رہا تھا کہ ہم نے اسے پڑھا ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے اس صورت حال میں "نہیں" پر اکتفا نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے ہم استادِ محترم کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی جسارت کر رہے تھے کہ ہم اس کتاب کے وجود سے بے خبر نہیں مگر لاتعلق ضرور تھے اور اس میں سارا قصور اور فتور کتاب کے نام کا تھا۔

ہمارا مافی الضمیر پاکر استاد محترم نے تبسم فرمایا اور کہنے لگے "اول تو کتاب کے نام کے سلسلہ میں کوئی مصنف قارئین سے مشورہ نہیں کرتا، دوسرے صرف نام سے، خواہ وہ مصنف کا ہو، یا کتاب کا کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ نام کے پھیر میں نہ پڑیئے بلکہ کتاب پڑھ کر مجھے بتائیے کہ موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے یہ منفرد ہے یا نہیں، اگر آپ نے اسے سمجھ کر پڑھا تو شاید عمر بھر اسے فراموش نہیں کر سکیں گے۔"

ہمارے دور کے طلبہ ایسے سادہ ہوتے تھے کہ ان کیلئے حکم استاد مرگ مفاجات ہوا کرتا تھا اس لئے اب اس کتاب کا پڑھنا لازم ہو گیا تھا مگر تشویش یہ لاحق تھی کہ اسے اپنے کارڈ پر جاری کرا کے گھر تک کیسے لے جائیں؟ پھر اسے پڑھیں گے کن اوقات میں؟ کس تاریک کونے میں یا کس خالی کوٹھے پر؟ ان خطوط کا مطالعہ بزرگوں سے کیسے پوشیدہ رہ سکے گا؟ یہ الجھے ہوئے سوال کسی طرح سلجھائے نہیں سلجھ رہے تھے کہ چھٹی کی گھنٹی بجی اور "لیلیٰ کے خطوط" نصابی کتابوں کے بیچ میں رکھ کر اور بستہ کو بغل میں دبا کر ہم یوں اسکول سے باہر نکلے گویا یہ لیلیٰ کے خطوط نہیں تھے بلکہ خود لیلیٰ تھی جسے ہم بغل میں دبائے لئے جا رہے تھے اسکول سے گھر تک یہ خوف طاری رہا کہ اگر کسی بزرگ نے راستہ کاٹا اور بغل میں چھپی یہ لیلیٰ ان کو نظر آ گئی تو..... ہم اس خیال سے اتنے دہشت زدہ تھے کہ بیسیوں بار یہ خیال آیا مگر ایک بار بھی "تو....." سے آگے نہ بڑھ سکا جیسے "تو" سے آگے دونوں جہان کی روسیاہی کے سوا کچھ نہیں تھا، حقیقت یہ ہے کہ ہماری یہ دہشت زدگی بے وجہ اور بے بنیاد تھی چونکہ آج تک کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا کہ سر راہے کسی بزرگ نے ہمارے بستہ کی تلاشی لی ہو، اپنے دل مضطر کو ہم نے بارہا یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تھا کہ زور زور سے دھڑکے جا رہا تھا کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی، یہ افتاد ہم پر، صرف ہم پر، پڑی ہے کہ پوری کلاس میں ہمیں ایسی کتاب پڑھنے کو کہا گیا تو اس کے ساتھ ابھی اور بھی بہت سی پریشانیاں سامنے آئیں گی اور خفتیں اٹھانا پڑیں گی۔

کچھ ہمارا ہی جی جانتا ہے کہ یہ راستہ کیسے طے ہوا اور کیونکر ہم گھر تک پہنچے۔ دروازہ میں داخل ہوتے ہی ہم نے سیدھے اپنے کمرے کا رخ کیا اور وہاں مناسب موقع پر "لیلیٰ" کو اپنے کپڑوں کے صندوق میں چھپا دیا۔ پھر جب جہاں اور جیسا بھی موقع ملا ہم اسے غسل خانہ، گھر کی چھت اور دیگر مقامات محفوظ کی سیر کراتے اور اس کی "سطر چینی" کرتے رہے۔ چوری چھپے کا یہ مطالعہ ہمار　زور بینائی کے لئے چنداں مفید ثابت نہیں ہوا۔ اس دوران سبھی اہل خانہ نے ہمیں بار بار ٹوکا کہ یہ وقت بے وقت غسل خانے جاتے کیوں نظر آتے ہیں؟ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب کے بعد چھت پر کیوں جا دھمکتے ہیں اور تنہائی کے اتنے شوقین کیوں ہو گئے ہیں ان اعتراضات کی اپنی طرف سے ہم نے یہ صفائی پیش کی کہ ان دنوں ہمیں گرمی بہت لگنے لگی ہے۔ انیس کے مرثیے پڑھ پڑھ کر ہم مناظر قدرت بالخصوص طلوع و غروب آفتاب کے گرویدہ ہو گئے ہیں اور تنہائی اس لئے ضروری ہو گئی ہے کہ ہم نے ایک مباحثہ میں شرکت کی تیاری شروع کر رکھی ہے اور اس مباحثہ کا موضوع ہے "مظلومی نسواں"

"مظلومیٔ نسواں" کا یہ موضوع ہمیں "لیلیٰ کے خطوط" ہی سے ملا تھا، پوری کتاب میں نام کے علاوہ ایک نقطہ بھی ہمیں قابلِ اعتراض نظر نہیں آیا بلکہ ہمارا دل "لیلاؤں" کے حال زار پر اتنا کڑھا کہ ہم نے اپنی احتجاجی آواز کو بھی قاضی عبدالغفار کے قلم کے ساتھ ملانے کا ارادہ کر لیا۔ پھر خیال آیا ہم ابھی زیرِ تعلیم ہیں، ہو سکتا ہے ہمارا پرخلوص احتجاج، صرف ہماری نوعمری کی وجہ سے بعض حلقوں میں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جائے۔ "لیلاؤں" کے حقوق بھی ان کو نہ ملیں اور ہمارا حق خودارادیت بھی ہم سے چھین لیا جائے۔ چنانچہ مآل اندیش کے اس مشورہ پر ہم نے اپنے احتجاج کو

وع کر دیا اور پھر مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔

ہائی اسکول سے جو کالج پہنچے تو دل باغ باغ ہو گیا، اختیاری مضامین، درسی کتابیں، روزانہ کا تدریسی وقت سب ایک دم سے کم ہو گئے۔ گھر پر کرنے کے لئے کام بند ہو گیا اساتذہ کی شخصی نگرانی ختم ہو گئی اور بزرگانہ سرزنش کا خطرہ بھی جاتا رہا۔ پھر سونے پر سہاگا یہ کہ لائبریری بھری پڑی تھی اور فرصت کا خزانہ ہاتھ آیا چنانچہ اس خزانہ کو ہم نے بڑی دریا دلی سے غیر نصابی کتابوں کے مطالعہ پر لٹانا شروع کر دیا۔ پروفیسروں سے جو کبھی کسی ایک آدھ جملے، مضمون، خیال کی داد ملی تو ہمارا عام مطالعہ دوچند ہو گیا اور نصاب کی طرف توجہ آدھی رہ گئی مگر "رکھ لی مرے خدا نے مری بے نوا خود سری" کی شرم "۔ اس بے لگام و بے سمت مطالعہ کا حشر اتنا عبرت انگیز نہیں ہوا، جتنا ہونا چاہیئے تھا اور ہم بآسانی یونیورسٹی پہنچ گئے اور اس عزم بالجزم کے ساتھ پہنچے کہ یہاں سے جو نکلیں گے تو پھر کسی کالج یا یونیورسٹی ہی میں "پروفیسری" کریں گے۔

مقام فیض نظر میں کوئی جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

یونیورسٹی سے جو امتحانات پاس کر کے نکلے تو پاکستان بن چکا تھا، پاکستان آئے تو معلوم ہوا کہ یہاں سردست ادب سے واقفیت اتنی ضروری نہیں ہے جتنی افسروں سے اور یہ بھی کہ پروفیسروں کے مقابلہ میں بنکاری کی ضرورت زیادہ ہے چنانچہ یہاں کے حالات کا جائزہ لے کر ہمارے کالج اور ہماری یونیورسٹی کے ایک خاصے سینیئر اور بے تحاشا لائق فائق "اولڈ بوائے" نے اعلیٰ سے اعلیٰ اسناد کو "ایں دفتر بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ" کہہ کر ایک طرف پھینک دیا اور جھٹ سے اک بنک میں ملازمت کر لی، ہمیں جونہی اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ملی ہم اظہار تعزیت کے لئے ان کے ہاں حاضر ہوئے اور بڑے ہی سوگوار لہجہ میں ان سے دریافت کیا کہ "حضرت یہ کیا آپ کے سارے پروفیسر اور ہم سبق تو یہ امید کر رہے تھے کہ آپ درس و تدریس کا فریضہ انجام دیں گے، علم و ادب کی روشنی پھیلائیں گے، پروفیسر اے ایس بخاری، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور اے بس بریڈلے کا نام روشن کریں گے۔ مگر آپ نے تو ان کی امیدوں اور اپنے حقیقی جوہر کا خون کر دیا۔ آخر یہ آپ کو سوجھی کیا جو آپ روپیہ آنہ پائی کے اندراجات میں یوں کھو گئے جیسے کبھی دیوانِ غالب اور شیکسپیئر کے عظیم المیہ ڈراموں میں کھوئے رہتے تھے؟ آپ نے تو انتظارِ ساغر کھینچنے کی بجائے انجمن آرزو سے قدم ہی باہر کھینچ لیا۔ آخر ایسا آپ نے کس مجبوری کے تحت کیا؟"

ہماری یہ معروضات سن کر ان کے چہرہ پر اس خفیف تبسم کی ایک لہر سی دوڑ گئی جو مہاتما بدھ کی مورتیوں میں نظر آتی ہے اور جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے دکھ سکھ اور نیک و بد سے ماورا گیان دھیان اور تردان کی حدیں پار کر گئے ہیں۔ پھر وہ بڑے مطمئن لہجہ میں یوں گویا ہوئے "صاحب من۔ عینیت پرستی، ایام طالب علمی کا زیور ہے مگر عملی زندگی کے لئے زنجیر بن جاتی ہے روزانہ کی زندگی میں راحت مطلوب ہے تو آدمی کو حقیقت پرست ہو جانا چاہیئے ورنہ اس کے متعلقین کی دنیا اور خود اس کی عقبیٰ دونوں خراب و خوار ہو جاتی ہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس وقت کل پاکستان میں کل گنی چنی دو تین یونیورسٹیاں اور لے دے کے بیس بائیس رواں دواں کالج ہیں جن میں فی الحال کہیں بھی کسی بھی تو وارد کی ضرورت یا گنجائش نہیں ہے اس لئے میرا تو آپ کو بھی یہی مشورہ ہے کہ آپ بھی ادھر بنک ہی میں آجائیے البتہ اس کے لئے پانچ ہزار زر ضمانت نقد بنک میں جمع کرانا ہو گا اور اتنی ہی رقم کی شخصی ضمانت دینی پڑے گی۔"

ہمارے سینیئر کرم فرما کا مشورہ بہت صائب تھا مگر بقول شخصے:

درم و دام اپنے پاس کہاں   چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

چنانچہ ہماری بے زری نے ہمیں بنک کی ملازمت سے محفوظ یا محروم رکھا اور ہم بہ امر مجبوری ایک تیل کمپنی کے صدر دفتر میں ملازم ہو گئے۔ یہاں تنخواہ معقول تھی اور آئندہ ترقی کے امکانات بھی روشن تھے مگر یہاں ہمارا دماغی نان نفقہ بند ہو گیا یعنی مطالعہ کے لئے نہ وقت ملتا تھا نہ کتابیں۔ شہر میں لائبریریوں کا کال تھا اور ہمارے پاس وقت کا

اس لئے اس پوری ملازمت کے دوران ایک تو ہم خود ذہنی طور پر بہت
نا آسودہ رہے، دوسرے احباب نے ہمیں چین نہیں لینے دیا۔ تقریباً
سبھی نے ہمیں اپنے فقروں کا نشانہ بنایا اور جی کھول کے پھبتیاں کسیں۔ ایک
صاحب فرما رہے ہیں "بھئی پرانے زمانہ میں تو غالباً صرف فارسی پڑھنے
والے تیل بیچتے تھے مگر آپ نے تو غالباً انگریزی ادب میں ایم اے کیا
ہے؟ پھر تیل کمپنی میں کیسے ورود مسعود فرمایا؟"

دوسرے صاحب اسکی توجیہہ فرماتے ہیں "بھائیو۔ یہ "پڑھو فارسی
بیچو تیل" کی جو کہاوت ہے اس میں فارسی سے دراصل ادب مراد ہے جو
کسی زمانہ میں بہت بلند پایہ ہوا کرتا تھا یا سمجھا جاتا تھا۔ آج اس جگہ
پر انگریزی ادب فائق ہے اس لئے مضمون کے ایم اے تیل بیچتے اور
قدرت کا تماشا دکھانے لگے ہیں۔ دراصل یہ اس کہاوت کے سچ ہونے کا
جیتا جاگتا، چلتا پھرتا بلکہ اٹھتا بیٹھتا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔"

تیسرے مہربان ان دونوں کو تمسخرانہ انداز میں سرزنش کرتے
ہیں اور ہماری طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں "حضرات! یہ آپ کی
سراسر زیادتی ہے کیا آپ نے ان جناب کو اتنا گیا گزرا سمجھا تھا کہ یہ
کبھی راست پر آئیں گے ہی نہیں؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بالآخر دنیا نے
ان کا مزاج درست کر دیا ہے ہائے سیماب اکبر آبادی۔ ساری کلیات میں
میں استاد نے ایک ہی شعر کہا ہے۔ کیا خوب کہا ہے کہ:

مبارک ہو تجھے یہ خود روی لیکن یہ سنتا جا
کہ دنیا اپنے رستہ پر لگا لیتی ہے انساں کو"

اس پر چوتھے صاحب چہکتے ہیں "اچھا! اس طرح تو واقعی ان کا
انسان ہونا ثابت ہو رہا ہے ہم تو اب تک انہیں کرم کتابی ہی سمجھ رہے
تھے، بہرحال یہ نئی دریافت ہمارے لئے نہ سہی خود ان کے لئے بہت
دل خوش کن ہونی چاہیئے۔"

ہم نے "پروفیسری" کے انتظار میں، اس کی خاطر یہ سب کچھ سنا،
سہا اور خاموش رہے۔ پھر ایک دن ایک دور افتادہ کالج کے لئے جو
بقول ایک دوست کے "اللہ میاں کے پچھواڑے واقع تھا" جونیئر لیکچرر
کی خالی اسامی کا ایک اشتہار نظر آیا اب ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ کالجوں میں
سبھی "پروفیسر" نہیں ہوتے، کچھ لیکچرر بلکہ جونیئر لیکچرر بھی ہوتے ہیں۔ اس
پر ہمیں کچھ غصہ بھی آیا کہ ہم اب تک کالج اور یونیورسٹی کے ہر استاد کو
خواہ مخواہ پروفیسر کیوں سمجھتے اور کہتے رہے تھے اور اسی نادانی میں اب
تک پروفیسری کے خواب یا خبط میں مبتلا تھے۔

اس انکشاف حقیقت کے بعد ہم نے انگریزی محاورہ کے مطابق
خود کو قدرے عقلمند مگر افسردہ محسوس کیا درخواست بھی بھیجنے کو بھیج دی
مگر دل پر ایک بوجھ سا رہا کہ یہ اسامی ہمیں مل بھی گئی تو کیا؟ ہم پروفیسر تو
بننے سے رہے۔ جب اپنی یہ الجھن ہم نے اپنے بنک کے سینیئر رفیق کار سے بیان
کی تو انہوں نے ہمیں سمجھایا "بھائی میرے ہر ملازمت میں مختلف درجے
مختلف مراتب ہوتے ہیں اور ہر آدمی درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہے۔ آپ بھی
ایک نہ ایک دن پروفیسر بن جائیں گے مگر....."

"مگر کیا؟" ہم نے بے صبری سے دریافت کیا

اس مرتبہ وہ باقاعدہ مسکرائے اور بولے "مگر یہ کہ اور ملازمتوں کے
مقابلہ میں شعبۂ تعلیم میں ترقی ذرا سست رفتار ہوتی ہے۔ تاہم آپ کو
اس پیشہ سے چونکہ طبعی مناسبت ہے اس لئے شاید آپ اس میں زیادہ
خوش رہیں گے مگر اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے۔ میرے نزدیک مادی
فائدہ اور آئندہ ترقی آپ کی موجودہ ملازمت میں زیادہ ہے تاہم آپ
اقبال کے بہکائے ہوئے ہیں من کے سوز و مستی، جذب و شوق کے قائل
ہیں اس لئے آپ کی قسمت یعنی آپ کا ٹھکانہ مجھے پہلے ہی معلوم ہے اور
وہ ہے کالج کی ملازمت!"

ان کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی اور انٹرویو کے فوری بعد ہمیں
تقرر نامہ مل گیا اور ہم اپنے نئے کالج پہنچ گئے۔ کالج کیا تھا تین اکائیوں
پر مشتمل ایک کھنڈر تھا۔ ایک اکائی اسٹاف روم کی جو وقتِ ضرورت
کلاس روم کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ دوسری اکائی ایک کشادہ ہال
کی جس سے کالج کے اچھے دنوں کا تھوڑا بہت اندازہ لگایا جا سکتا تھا
اور تیسری اکائی لیبارٹری اور پرنسپل کے دفتر کی۔ ہمیں بتایا گیا کہ تقسیم

سے پہلے یہ بیٹے کرو فر کا غیر مسلم کالج تھا اور اس کی ایک شاندار لائبریری بھی تھی مگر آزادی کی افراتفری میں کسی دل جلے نے اس کے بیشتر حصہ اور کتب خانہ کو نذر آتش کر کے چراغاں کا اہتمام کیا تھا اس لئے اب یہاں، یادگارِ رونق محفل، پس خوردۂ آتش بھی تین عمارتی ڈھانچے باقی رہ گئے تھے۔ لائبریری کا تھوڑا بہت سراغ سرکاری کاغذات میں ملتا تھا اور امید تھی کہ اگلے بجٹ میں کتابوں کی خریداری کی مد پر کچھ رقم مقرر کی جا سکے گی۔

یہ مشاہدات و معلومات حوصلہ شکن تھیں اس لئے ان سے صرفِ نظر کر کے ہم نے بڑی تندہی سے بی اے سال اوّل کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اس میں صرف تین طلبہ تھے۔ تعلیمی سال ختم ہونے والا تھا مگر انہوں نے نصاب کی پانچ کتابوں میں سے ایک کتاب ابھی چند دن پہلے شروع کی تھی چونکہ پرنسپل صاحب ہی سائنس کے مضامین کے علاوہ انہیں انگریزی بھی پڑھاتے تھے اور یہ سارا تدریسی کام وہ اپنے فرائضِ منصبی سے سوا انجام دے رہے تھے اس لئے ظاہر ہے انہیں انگریزی کے لئے کم وقت ملتا تھا۔

طلبا نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے اُردو بطور OPTIONAL مضمون لی ہے اور اس میں غالب کی ردیف الف کی تمام غزلیں شامل ہیں مگر کلاس میں ابھی پہلی غزل بھی نہیں شروع ہوئی ہے بلکہ سرے سے اس کا ایک پیریڈ بھی اب تک نہیں لگا ہے کیونکہ متعلقہ "پروفیسر" صاحب کا سارا وقت پرنسپل صاحب کے کمرہ میں صلاح مشورہ منصوبہ بندی اور طلباء کی فکر میں گذر جاتا ہے۔ ہم چونکہ ذرا زیادہ ہی مستعد۔ اور قدرے فارغ تھے اس لئے ہم نے ان کی درخواست پر انہیں غالب بھی پڑھانا شروع کر دیا۔

ابھی درسِ غالب کو دو ایک دن ہی گذرے ہوں گے کہ وائس پرنسپل صاحب ہمیں اسٹاف روم سے اٹھا کر، باہر ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے: "پروفیسر صاحب یہاں آپ کا تقرر انگریزی کے شعبہ میں ہوا ہے یا اُردو کے شعبہ میں؟"

اس کالج میں ہمیں پہلے دن ہی سے "پروفیسر" کہا جانے لگا تھا شروع میں تو ہم نے ایک دو بار اپنے رفقاء اور اہالیانِ شہر کی تصحیح کی کوشش کی انہیں صاف صاف بتلا دیا کہ ہم "پروفیسر" نہیں محض "جونیئر لیکچرر" ہیں مگر ہماری اس تشریح یا تصریح کو کسی نے بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور جب ہر کہ و مہ بااصرار و بہ تکرار "پروفیسر" ہی کہے گیا تو ہم خود کو مجرم سا محسوس کرنے لگے کہ ہمیں خواہ مخواہ "پروفیسر" کے لقب سے ملقب کیا جا رہا ہے حالانکہ ہم اس کے مستحق نہیں ہیں پھر ایک بزرگ نے ہمارے لئے یہ عقدہ یوں وا کیا کہ یہاں کالج کا ہر استاد عرفِ عام میں "پروفیسر" کہلاتا ہے۔

اس لئے "پروفیسر" کے استعمال کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم نے انہیں مختصر جواب دیا "انگریزی میں"

"تو پھر آپ غالب کیوں پڑھا رہے ہیں؟" انہوں نے سوال کیا

"اس لئے کہ طلبا کا نقصان ہو رہا تھا اور انہوں نے ہم سے درخواست کی تھی کہ ہم انہیں غالب بھی پڑھائیں"

"آپ نے اردو کے پروفیسر صاحب سے اس کی اجازت لے لی ہے؟" انہوں نے ہم پر ایک اور سوال داغ دیا۔

کیا طلبہ کو مطالعہ میں مدد دینے کے لئے بھی اجازت لینا پڑتی ہے؟" ہم نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

اب انہیں ہماری جہالت کا یقین ہو گیا اور انہوں نے سوال و جواب کا یہ پیچیدہ طریقہ چھوڑ کر ہمیں غیر مبہم الفاظ میں یہ جتا دیا کہ ہم نے غالب کی دو غزلیں پڑھا کر ایک بہت ہی سنگین غلطی کی ہے جسے "پروفیسر صاحبان" کے ضابطۂ اخلاق میں دخل در معقولات کہا جاتا ہے۔ خیر گذشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط اب ہمارے حق میں یہی بہتر ہے درسِ غالب کو "نقش و نگارِ طاقِ نسیاں" بنا دیں۔ آئندہ اپنے کام سے کام رکھیں اور پھر کبھی اپنے مضمون کے علاوہ کسی کی طرف نہ آنکھ اٹھائیں نہ انگلی۔ یہ پرنسپل اور متعلقہ پروفیسر کا کام ہے کہ وہ دیکھیں یا نہ دیکھیں کہ کونسا کورس، کتنا، کب اور کیسے ختم ہو گا یا نہیں ہو گا۔

ہم نے بڑی سعادت مندی سے پیرو اتا کی نصیحت سنی، اور اس

پر فوراً عمل شروع کر دیا خدا کا شکر ہے اس کے بعد اس کالج میں ہمارا بڑا اچھا وقت گذرا اور جتنے بھی پرنسپل آئے گئے وہ ہم سے اور ان سے ہم خوش گمان رہے مگر ایک دن ہماری آنکھ نے ایک ایسا منظرِ وحشت اثر دیکھا کہ ہمارا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا اور ہم یہاں سے تبادلہ کی فکر کرنے لگے۔

ہوا یہ کہ ایک دن جونہی ہم پرنسپل کے کمرہ میں داخل ہوئے ہم نے اپنے ایک رفیق کار کو ان کے سامنے یوں کھڑے دیکھا جیسے مفرور تھانیدار کے سامنے کھڑا ہو۔ ہم الٹے پاؤں واپس ہونا چاہتے تھے کہ پرنسپل نے ہمیں ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور ہم فوراً بیٹھ گئے مگر ہمارے وہ رفیق بدستور کھڑے رہے اور ہم دل ہی دل میں حیران کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے اتنے میں پرنسپل صاحب نے ان کی طرف بڑی خشم آلود نگاہوں سے دیکھا اور گرجے "تم روزانہ لیٹ آتے ہو؟"

وہ منہ ہی منہ میں منمنائے "جی۔ میں تو بس آج ہی ذرا "لیٹ" ہو گیا تھا جی۔ وہ کچھ گھر میں عین وقت پر طبیعت خراب ہو گئی تھی جی۔ تو وہ ذرا ان کو ڈاکٹر کے ہاں لے گیا تھا جی"۔

اس عذر پر پرنسپل کا پارہ اور بھی اوپر چڑھ گیا "ایک تو روزانہ دیر سے آتے ہو، دوسرے جھوٹ بولتے ہو۔ نکل جاؤ میرے کمرہ سے آئندہ ایک منٹ بھی "لیٹ" آئے تو غفور تمہیں گردن سے پکڑ کر کالج کی دیوار سے ادھر پھینک دے گا۔" غفور پرنسپل کے چپراسی کا نام تھا۔

یہ رفیق کار تو وہاں سے بے آبرو ہو کر نکل آئے مگر ہم اپنے دل کا پیچ و تاب دبائے وہاں بیٹھے رہے کہ پرنسپل کا مزاج ذرا اعتدال پر آئے تو ہم عرض مدعا کر کے اجازت طلب کریں۔ بارے وہ ذرا خاموش ہوئے تو ہم نے شعبہ کی ایک دو باتیں ان سے کیں اور ان سے رخصت لے کر اسٹاف روم کی طرف چل دیئے۔ اس کے قریب پہنچے تو اندر سے بڑی گرجدار آوازیں آتی سنائی دیں جیسے دو شیر بیک وقت دھاڑ رہے ہوں۔

اندر داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرنسپل کے دفتر کی بھیگی بلی شیرِ ببر بنی تنی کھڑی ہے اور ہمارے ناصح مشفق وائس پرنسپل صاحب پر پے در پے زبانی حملے کر رہی ہے اور وہ بھی خاصے جارحانہ موڈ میں ہیں اور ترکی بہ ترکی جواب دے رہے ہیں یا یوں سمجھئے کہ انگریزی محاورہ کے مطابق دونوں اپنے اپنے گندے کپڑے کھلے عام دھو رہے ہیں اور اس کا سارا گندا پانی ایک دوسرے پر اچھال رہے ہیں انہیں اصرار ہے کہ پہلے کی طرح آج بھی پرنسپل سے ان کی شکایت ہمارے ناصح مشفق ہی نے کی ہے مگر انہیں اس سے انکار ہے کہ وہ کبھی بھی کسی کے پھٹے میں اپنی کوئی ٹانگ ڈالنے کے کبھی مرتکب ہوئے ہیں۔ اس پس منظر میں یہ دونوں ایک دوسرے کے پورے خاندان، سارے اہل خانہ، شجرۂ نسب علم و عمل، غرض ہر بارے میں بہت مشکوک تھے اور اپنے اپنے شکوک و شبہات بہ بانگ دہل بیان کر رہے تھے، اس کے ساتھ ہی ساتھ نشست و برخاست کے ایسے کچھ طور طریق کی طرف بھی واضح اشارے کرتے جاتے تھے جو کچی عمر کے طلبہ کو بھی زیب نہیں دیتے۔

جب یہاں سے ہمارا تبادلہ صدر مقام کے ایک مشہور کالج میں ہو گیا تو ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ جب اس کالج کی عظیم لائبریری دیکھی تو اور بھی خوش ہوئے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ واقعی اب ٹھکانے لگے تھے رفقاء نے اس نئے تبادلہ پر ہماری نمایاں مسرت کی وجہ پوچھی تو ہم نے انہیں بڑی سادگی اور صفائی سے بتا دیا کہ اور باتوں کے علاوہ سابق کالج میں لائبریری نہ ہونے کے برابر تھی مگر یہاں چونکہ لائبریری بہت بڑی اور اچھی ہے اس لئے ہم خوش ہیں کہ یہاں جی بھر کے مطالعہ کر سکیں گے۔ ہمارے اس اعتراف تما پندار پر ہمارے ایک معمر رفیق نے ہمیں یوں دیکھا جیسے ایک آزمودہ کار ساٹھ سالہ پہلوان ایک سولہ سال کے پٹھے کی طرف دیکھتا ہے جس نے ابھی ایک کشتی بھی نہ جیتی ہو اور ہمارے حق میں یہ دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے "خدا آپ کے اس شوقِ مطالعہ کو قائم دائم رکھے"

ہمیں بے سوچے سمجھے بھی ہر دعا پر "آمین" کہنے کی عادت ہے مگر اس مرتبہ ہم چپ رہے، شاید ہمیں اپنے شوقِ مطالعہ پر اتنا ناز تھا کہ ہمیں "آمین" کہنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مگر اب سوچتے ہیں اس وقت ہم صدقِ دل سے اس پر "آمین" کہہ لیتے تو اچھا تھا۔

یہاں گذشتہ بیس بائیس سال میں ہم نے بہت سی تبدیلیاں

دیکھی ہیں اور خود بھی بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ کئی انسروں کو جگتا ہے، متعدد تعلیمی پالیسیوں کو جنم لیتے اور دم توڑتے دیکھا تعلیم کا سیاست کی باندی بننا۔ طلبہ کا لیڈروں کے لاوڈ اسپیکر کی شکل اختیار کرنا اور ان کے ہراول دستہ کے طور پر حرکت میں آنا، یہی ہمارے سامنے کی بات ہے یہ سب دیکھ کر ہم اپنے مورکھ من سے یہی ایک سوال بار بار کرتے ہیں کہ

وہ "شہرِ علم" ہے یہ جس کی آرزو لے کر
چلے تھے "آپ" کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
"کتب" کے دشت میں "عرفاں" کی آخری منزل
کوئی تو ہوگا "مطالعہ کی موج کا ساحل"
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غم "علم"

ایک زمانہ تھا جب طلباء اساتذہ کا احترام کرتے تھے۔ اب اساتذہ کرام طلبہ کا ادب ملحوظ رکھتے ہیں "انقلابات ہیں زمانہ کے"، پہلے طلبہ درسگاہوں میں تحصیلِ علم کے لئے آتے تھے اب "تحصیلِ وظائف" کے لئے آتے ہیں "نخل مقصد بغیر آب زر کبھی پھلتا نہیں" کل تک طلبہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھیل بھی لیتے تھے۔ آج کے طلبہ کے پاس جلسے کرنے جلوس نکالنے، نعرے لگانے اور ہلڑ بازی کرنے کے بعد بھی اگر وقت بچ رہتا ہے تو وہ اتفاقاً کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں۔ "ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا" کبھی ان کے دماغ روشن، دل مخلص، نظر حیا آمیز ہوتی تھی اب بہ ادنیٰ تبدیل اقبال کا یہ مصرعہ ان پر صادق آتا ہے کہ

"دماغ غائب و دل تیرہ و نظر بے باک"

خود اساتذہ کا احوال بھی متغیر ہے۔ اب یہ اپنے مضمون پر حاوی ہونے کی بجائے کالج، یونیورسٹی اور ملک کی سیاست پر عبور حاصل کرنا اور زبان چلانا زیادہ ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ طلباء سے مساوات اور رفقاء سے تفریق برتتے ہیں۔ ترقی علم کی بجائے ترقی منصب کی فکر میں غرق ہیں کتابوں سے دور افسروں سے قریب رہتے ہیں۔ صرف استاد کو اپنے علم کا ضامن اور اپنے منصب کو اپنی سیاست گری کا ثمر قرار دیتے ہیں اور ہم حیران ہیں کہ روانہ ہوئے تھے کعبۂ علم کی طرف اور آنکلے ترکستان ہنر منداں ملیں ؟

غزل

محسن احسان

درد سے آنکھ ملا، دکھ سے شناسائی کر
ہر بدلتی ہوئی رُت کی نہ پذیرائی کر

اپنے ہر جھوٹ کو میزانِ فراست میں نہ تول
مصلحت بینی سے یوں قتل نہ دانائی کر

آسماں طرح کبھی تو بھی سمندر میں اتر
یوں کنارے سے نہ معلوم یہ گہرائی کر

میں ہوں بے چہرہ تو کیوں رنگ ترا اڑتا ہے
تیرا چہرہ ہے تو پھر اپنی نہ رسوائی کر

ہر دھڑکتے ہوئے لمحے سے یہ آواز آئی
اپنے احساس کو شائستۂ تنہائی کر

آسمانوں پہ ہے تو، پھر بھی تجھے پوجتا ہوں
میں زمیں پر ہوں مری حوصلہ افزائی کر

محسن کی صورت یہ تسبب تجھے کھا جائے گا
اپنی ہر سوچ کو محسن نہ علاقائی کر

★

نقد و نظر

داستانِ صحافت از پروفیسر عبدالسلام خورشید

تبصرہ نگار: ڈاکٹر وزیر آغا

"داستانِ صحافت" کے مقاصد کا تعین کرتے ہوئے، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب نے لکھا ہے کہ "اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ عام پڑھنے والوں کو اختصار کے ساتھ صحافت کی ابتدا اور انتہا کے بارے میں معلومات مہیا کی جائیں۔ بالخصوص برعظیم میں صحافت کے ارتقا سے روشناس کرایا جائے" دوسرا مقصد انہوں نے یہ بتایا ہے کہ "بی۔ اے (صحافت) کے پرچۂ اوّل کے لئے ایک درسی کتاب مہیا کی جائے۔" ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب "داستانِ صحافت" کے کسی تیسرے مقصد کا ذکر نہیں کیا لیکن اگر وہ اس سلسلے میں فقط یہ اعلان کر دیتے کہ اس کتاب کا مقصد صحافتی استدلال کا ایک مثالی نمونہ پیش کرنا بھی ہے تو اس سے نہ صرف کتاب کا سب سے بڑا مقصد بیان ہو جاتا بلکہ صحافت کے اصل مزاج کا سراغ بھی مل جاتا۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ یہ اعلان نہیں کر سکتے تھے۔

ہر چند ڈاکٹر صاحب نے یہ اعلان نہیں کیا لیکن جس متوازن اور ٹھنڈے میٹھے انداز میں انہوں نے صحافت کے ارتقا کا جائزہ لیا ہے، اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ انہوں نے ایک صاحبِ بصیرت محقق کی طرح داستانِ صحافت کا سراغ لگا کر معیارِ صحافت کی نشاندہی کی ہے اور یہ احساس دلایا ہے کہ طوفانی موضوع پر کتاب لکھتے ہوئے مصنف کا جذباتیت سے محفوظ رہنا کس قدر ضروری ہے۔ یوں بھی صحافت تجزیے اور تحلیل کے اس عمل کا نام ہے کہ صحافی جذباتی خروش سے بے نیاز ہو کر حقائق اور واقعات کو پرکھتا ہے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کے عمل میں ایک جج کی سی بصیرت اور خنک مزاجی کو بروئے کار لاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں مصنف کے اس غیر جانبدارانہ عمل کا اعادہ کیا ہے اور یہی اس کتاب کا روشن ترین پہلو ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کا جو متوازن رویہ اخبار اور اخبار نویس کے بارے میں ہے وہی صحافت کے مختلف ادوار کے ضمن میں بھی ہے۔ مثلاً "پاکستان صحافت کے سلسلے میں انہوں نے یہ تو بتایا ہے کہ کس دور میں زباں بندی کا رواج تھا اور کس دور میں زباں درازی کا۔ لیکن انہوں نے زباں بندی کی مذمت اور زباں درازی کی حمایت میں کوئی جذباتی رویہ اختیار کر کے ان سے منسلک سیاسی ادوار اور ان کی شخصیتوں کو رد کرنے یا ان کا جلوس نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے تو صرف مختلف ادوار میں صحافت کے بارے میں جملہ معلومات کو اس انداز میں پیش کر دیا ہے کہ ہر دور کا سیاسی افق واضح طور پر نظر آنے لگا ہے یوں ڈاکٹر صاحب نے نتائج کا استخراج قاری پر چھوڑ دیا ہے اور اپنی رائے کو قاری پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ اس لئے بھی مستحسن تھا کہ انہوں نے کتاب درسی مقاصد

۱۔ مصنف ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

کے لئے بھی لکھی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ مصنف اپنے سیاسی نظریات کو طلبا کے کورے اذہان پر نقش کرنے لگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دیانتداری کی اچھی مثال ہے ورنہ آج کے نام نہاد دانشوروں میں سے اگر کسی کو "داستانِ صحافت" ایسی کتاب لکھنے کی توفیق ہوتی تو اس کا سہارا لے کر اپنے سیاسی نظریات کی تبلیغ ضرور کرتا اور یوں کتاب کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

"داستانِ صحافت" کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر صاحب نے صحافت کو مرکزی نقطہ مان کر اور اس نقطے پر پرکار کی نوک رکھ کر، اس کے دوسرے بازو کو اس طور گھمایا ہے کہ کاغذ پر ایک وسیع تر دائرہ ابھر آیا ہے۔ جس میں اخباری صحافت کے علاوہ ریڈیو ٹیلی ویژن، ادبی رسائل اور ڈائجسٹ رسائل تک مقید نظر آتے ہیں۔ یوں صحافت محض چند اخباروں یا اخبار نویسوں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس میں خبر کو پھیلانے والے تمام ادارے شامل ہو گئے ہیں اور اس طرح بین السطور میں یہ سوال ابھر آیا ہے کہ جب صحافت کی آزادی کا ذکر آئے تو کیا اس میں ابلاغ اور ترسیل کے دوسرے ذرائع کی آزادی کا مسئلہ بھی شامل کیا جائے گا یا نہیں؟ آج کل زمانہ لفظی خبر سے کہیں زیادہ تصویری خبر متاثر کرتی ہے۔ لہٰذا اگر تصویری خبر یکطرفہ، جانبدار یا گھٹیا ہو گی تو لامحالہ ملکی صحافت بھی از خود یا بدیر اس سے ضرور متاثر ہو گی۔

"داستانِ صحافت" کے مطالعہ سے ایک یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ ہماری صحافت شروع ہی سے سیاسی جزر و مد کے تابع رہی ہے۔ یعنی جب افق پر کوئی سیاسی طوفان اٹھا ہے تو صحافت نے بھی اس طوفان کی نسبت سے ایک طوفانی رنگ اختیار کیا ہے اور جب مطلع صاف ہوا ہے صحافت بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی ہے گویا (CONSISTENCY) کا عمل ہماری صحافت میں ابھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوا اور نہ ابھی ہمارے ہاں خبر کی حرمت کو قائم رکھنے کی کوئی پرخلوص کوشش سامنے آئی ہے۔ آج بھی جب اخبارات میں کوئی خبر شائع ہوتی ہے تو اس کے ساتھ بالعموم اخبار کا جذباتی ردِ عمل بھی منسلک ہو جاتا ہے حالانکہ اخبار کا کام خبر مہیا کرنا ہے نہ کہ واقعہ کے بارے میں اشتعال پھیلانا۔ مثال کے طور پر جب اس قسم کی خبر شائع ہوتی ہے کہ "غیرت مند شوہر نے بد چلن بیوی کو ٹوکے کے ایک ہی وار سے موت کے گھاٹ اتار دیا" تو عدالت کے فیصلے کا انتظار کئے بغیر ایک یکطرفہ جذباتی ردِ عمل کے اظہار سے نہ صرف خبر کی حرمت مجروح ہوتی ہے بلکہ شکی مزاج شوہروں کو اپنی مردانگی کا جوہر دکھانے کی تحریک بھی مل جاتی ہے جو غور کیجئے تو آئین جوانمردی کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ ایک اخبار کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ جذباتی طور پر ملوث ہوئے بغیر خبر کو قارئین تک پہنچائے۔ دوسرے جب خبر پر تبصرہ کرے تو ملکی اور قومی مفاد پر جماعتی مفاد کو حاوی نہ ہونے دے۔ تیسرے خبر کو شخصی سطح پر اتار کر پاسداری یا تعصب سے داغدار نہ کرے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے پاکستانی صحافت کے طویل جذباتی جزر و مد کا کوئی تفصیلی جائزہ تو نہیں لیا لیکن صحافت کی داستان لکھتے ہوئے انہوں نے جا بجا، چھوٹے چھوٹے معنی خیز فقروں میں اتنے اشارات بکھیر دیئے ہیں کہ ان کی روشنی میں صحافت کے اعلیٰ معیار کا تعین کچھ ایسا مشکل نظر نہیں آتا اور یہ کتاب کی ایک اضافی خوبی ہے۔

آخر میں مجھے ڈاکٹر صاحب سے ایک شکایت بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ جب انہوں نے پرکار کے بازو کو پھیلا کر اس میں ادبی رسائل کو سمیٹا تو ان کی مثالی غیر جانبداری محفوظ نہ رہ سکی اور انہوں نے بعض زیادہ حجم والے رسائل کی طرف، خانہ برانداز چمن کی روایت کے احترام میں، گل کے علاوہ ثمر بھی پھینک دیئے جبکہ ان کے مقابلے میں نسبتاً کم ضخامت والے زندہ رسائل کو (قاضی کے چھواروں) سے بھی محروم رکھا۔ میں نام نہیں لوں گا۔ مگر ڈاکٹر صاحب میری بات کو خوب سمجھتے ہیں اور فی الحال یہی کافی ہے۔

لوک گیت ہمارا ثقافتی ورثہ

زیتون بانو

شکسپیئر نے کہا ہے کہ "جو شخص نغمے پر جھوم نہیں جاتا اور دلکش آوازوں کی ہم آہنگی سے پیدا ہونے والے روح پرور حسن سے لطف اٹھانے کا اہل نہیں، اس قابل ہے کہ اُسے مردود قرار دیا جائے۔ اس پر کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیئے"۔

اس بات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ گیت اور موسیقی انسان کے لئے کتنی ضروری چیزیں ہیں۔ گیت کے ابتدائی بولوں کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کا جنم پہلے انسان کی پیدائش کے ساتھ ہوا ہے لوک گیت انسان کی اسی پہلی سوچ اور فکر کا نتیجہ ہے، پہلا انسان علم و فضل کا مالک نہیں تھا، اس لئے گیت کے ان بولوں میں اکھڑ بے ساختگی تھی اور یہی بول سینہ بہ سینہ چل کر ہم تک جوں کے توں پہنچتے رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہیں خودرو پھولوں سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔

لوک گیتوں کا ایک قوم کے تمدن میں وہی مقام ہوتا ہے جو کسی ملک کے قدرتی مناظر میں خود رو پھولوں کا۔ خود رو پھولوں کی طرح لوک گیت بھی خود بخود وجود میں آتے ہیں۔ ان کا خالق کون ہوتا ہے؟ یہ کس کے تخیّل اور کس کی قوّتِ فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں؟ ان سوالات کا یہی جواب ہے کہ لوک گیت مجموعی طور پر پوری قوم کے ذہن کی پیداوار ہوتے ہیں، اس لحاظ سے لوک گیت کی مثال ایک ایسے آئینے کی سی ہے، جس میں قوم کی نفسیات، اور زندگی کے بارے میں ان کا نظریہ، ان کا قنوطی یا رجائی نقطۂ نظر ملتا ہے۔ قومی کردار کا تعین کرنے کے لئے لوک گیت بہترین سرمایہ ثابت ہوتے ہیں، کیونکہ قومی فکر کے خدوخال اور اجتماعی نفسیات کے خطوط اس میں زیادہ صفائی سے ابھرتے ہیں لوک گیت اپنی سادگی، والہانہ کیفیت اور مقامی رنگ کے باعث نہایت دلپذیر اور کیف آور ہوتے ہیں ان میں اپنے علاقے کے رسم و رواج میلے ٹھیلے اور وارداتِ عشق و محبت کا ذکر بے ساختگی اور حقیقت پسندی سے کیا جاتا ہے بالکل اس طرح کہ اس علاقے کی ایک بھرپور تصویر ہماری نظروں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ ان گیتوں میں عوام کے دکھ سکھ، نفرتیں، سچائیاں اور بے لوث محبت کی جھلکیاں یوں بکھری ہوتی ہیں، جیسے آسمان پر ستارے غرضیکہ ان میں زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بیان کردہ جذبات براہ راست دل پر اثر کرتے ہیں اور ان کا اثر دیرپا ہوتا ہے، یہی نہیں ان میں اپنے ماحول اور جغرافیائی حد بندیوں کی تصویر کشی بھی ملتی ہے جن سے ہمیں نہ صرف کسی ملک کے باشندوں کے رہن سہن کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہے بلکہ وہاں کے موسموں، پھلوں پھولوں اور رسم و رواج کے بارے میں بہت کچھ جانتے اور سمجھنے میں

مددملتی ہے۔

لوک گیت زندگی کی مثبت اور منفی قوتوں کا ایسا مرقع ہے جسے اگر یکجا کرلیا جائے تو اس گلدستے میں رنگ رنگ کے پھولوں کی بہار نہ صرف دل و دماغ کو معطر کرنے کا سبب بنتی ہے بلکہ اس سے تہذیب و ثقافت کی دریافت کی راہیں بھی کھلتی ہیں۔ ایسی راہیں جن پر چل کر ہمیں ماضی کے نہاں خانوں میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے اور انہیں کی وساطت سے ہم اپنے گم شدہ خزانوں کا کھوج لگاتے ہیں۔ وہ خزانے۔ جن کی دریافت ہماری اپنی دریافت ہے۔ ماضی کے ان جھروکوں ہی سے ہمیں ان نوادر تک رسائی حاصل ہوتی ہے جن کے بغیر ہم اپنے آپ کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اس قیمتی ذخیرے کو جلد از جلد محفوظ کرلیں کہ آنے والی نسلیں انہی نوادر کو اپنی تاریخ کی بنیاد بنائیں کہ اس طرح نہ صرف انہیں اپنی شخصیت کا صحیح معلوم کرنے میں آسانی ہوگی بلکہ ان کو ہماری فکر و دانش، علم و ادب، تاریخ و سیاست، مذہب و ملت احساسات و جذبات اور عدل و انصاف کی میزان کے پلڑوں کو پرکھنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں ہوگی۔

یہاں میں آپ کی خدمت میں چند گیتوں کے تراجم بطور نمونہ پیش کرتی ہوں اس سے آپ کو لوک گیتوں کے سحر اور ان کے گوناگوں موضوعات کا اندازہ لگانے میں مدد ملے گی۔ ایک کشمیری لوک گیت سنیئے۔ اس میں کشمیر کے نچلے طبقے کی مظلومی، اقتصادی بدحالی اور ناآسودگی واضح ہے برف بیچنے والا ہانک لگاتا ہے:

"سربفلک پہاڑوں کی چوٹیوں سے میں تمہیں اتار لایا ہوں، میں کتنا کٹھور ہوں۔ تم سرو و شمشاد کی چھاؤں میں سورج کی نکیلی کرنوں سے محفوظ تھیں۔ اب میں تمہیں اپنے ساتھ گلی گلی رسوا کرتا ہوں۔ دھوپ تمہارے حسن کی دشمن ہے اور تم لحظہ بلحظہ پگھل رہی ہو۔ لیکن اے پہاڑوں کی حسین شہزادی۔ تیرے ساتھ میں پگھل رہا ہوں۔ تو سورج کی آگ سے پگھل رہی ہے اور میں اپنے پیٹ کی آگ سے۔"

ذیل کے بنگالی لوک گیت کو سن کر آپ کی آنکھوں میں وہاں کا سارا کرب گھوم جائے گا۔ "جاڑا آگیا ہے، کھیتوں میں دھان کے سنہری خوشے جاڑے کی خشک ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ پٹ سن کے کھیتوں میں کٹنی لگی ہوئی ہے۔ پردیسی اپنے گھر لوٹ رہے ہیں۔ اب تم بھی آجاؤ میرے محبوب، انتظار سے میری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔"

"میرا باپ بوڑھا ہو چکا ہے۔ بھائی کو وبا کھا گئی ہے اور میرے کھیت بھی میرے دل کی طرح اجاڑ و ویران پڑے ہیں۔ اب تم واپس آجاؤ میرے ساتھی۔" اور پنجاب کے اس لوک گیت میں ایک دلہن کی بیچارگی کی عکاسی کس قدر خوبصورتی سے کی گئی ہے: —

"میرے ماں باپ نے مجھے لاڈ سے پالا تھا اور سسرال والوں نے مجھے کام پر لگا دیا، میرا گلابی رنگ اڑ گیا ہے، مجھ پر ترس کھاؤ۔" یا "میرے ماں باپ نے مجھے لاڈ سے پالا تھا۔ سسرال والوں نے مجھے چکی کے کام پر لگا دیا، میری پسلیوں میں سو سو بل پڑتے ہیں۔ مجھ پر رحم کرو۔" پشتو کے ایک لوک گیت میں یہاں کے مخصوص مزاج کی جھلک اس طرح بیان کی ہے: "دشمن کو سرخ گولیوں میں دفن کردو کارتوس ختم ہو جائیں تو میں لونگین (زیور) رہن رکھ کر مزید کارتوس لا دوں گی۔"

اس سلسلے کو اور بھی بڑھایا جا سکتا ہے لیکن اس تقریب میں مزید تفصیل پیش کرنے سے معذور ہوں صرف اتنا کہوں گی کہ برصغیر میں سب سے پہلے دیویندر ستیارتھی کے ذہن میں لوک گیتوں کو جمع کرنے کا خیال آیا تھا چنانچہ اس نے اپنے اس ارادے کو عملی صورت دینے کیلئے سارے برصغیر کا دورہ کیا تھا اور لوک گیتوں کی

تلاش میں قریہ، قریہ بستی بستی ایک خانہ بدوش کی طرح گھوما پھرا اور اس تلاش اور جستجو کا نتیجہ اس کی دو کتابوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہے ستیارتھی کی دونوں کتابیں "گائے جا ہندوستان" اور "میں ہوں خانہ بدوش" اب تک اس موضوع پر کسی حد تک مکمل اور کارآمد کتابیں تھیں۔ ستیارتھی کے بعد دوسرے ادباء نے بھی اس ادبی ذخیرے کو حاصل کرنے اور اس میں پوشیدہ معنی مفہوم کو پانے کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں

کی تہذیب و ثقافت کو اُجاگر کرنے کی کوششیں کیں اور اس کے نتیجے میں بہت سی مفید اور کارآمد مضامین اور کتب مطالعے کے لئے ملیں۔

قیام پاکستان کے بعد فارغ بخاری صاحب نے پشتو لوک گیتوں کو جمع کرکے اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی سعی کی تھی۔

لوک ادب کی اس افادیت کو اس سے قبل ہماری کسی حکومت نے قابل توجہ نہیں سمجھا۔ مقام شکر ہے کہ ہماری عوامی حکومت نے لوک ادب کی ترویج و ترقی کے لئے سنجیدگی سے توجہ دی ہے۔ اور اس اہم کام کے لئے ثقافتی ورثے کا قومی ادارہ تشکیل دیا ہے۔ جس کی زیر نگرانی پاکستان کے گوشے گوشے سے لوک ادب اور ثقافت کے ذخیروں کو تلاش کرکے جمع کیا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ عوامی فنکاروں کے سینوں میں لوک گیتوں اور داستانوں کا جو ذخیرہ محفوظ ہے اُسے قلم بند اور ریکارڈ کرنے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس ادارے کی زیر سرپرستی "بن پھلواری" کے نام سے افضل پرویز کی کتاب اور "سرحد کے لوک گیت" کے نام سے فارغ بخاری کی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ "بن پھلواری" میں صرف پنجابی اور پوٹھوہاری لوک گیت جمع ہیں جبکہ "سرحد کے لوک گیت" میں پشتو، ہندکو، چترالی اور کوہستانی لوک گیتوں اور ان کے مختلف لہجوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

غزل

ماجد خلیل

ظرفِ احساس میں ڈھلتے رہیے
رنگ اچھا نہ بدلتے رہیے

زندگی کوئی نیا زخم نہ دے
ہر تبسم پہ سنبھلتے رہیے

مل ہی جائے گی گھنی چھاؤں کبھی
پیار کی دھوپ میں جلتے رہیے

جوششِ فکر ہے دریا دریا
موج در موج اُبلتے رہیے

خود شناسی کی جبیں آنچ لئے
صورتِ برف پگھلتے رہیے

ایک منزل کا تعین کرکے
ایک رفتار سے چلتے رہیے

مثلِ تحریکِ تغیر ماجد
ذہن بیدار میں پلتے رہیے

افسانہ

بزدِل

فضل قدیر

بس میں معرکۂ کارزار کا سا سماں تھا۔ کچھ لوگ چیخ رہے تھے۔ "اُسے اترنے دو۔ اترنے دو"۔ کچھ کندھوں سے کندھے جوڑے۔ بس کے اندر خروج کرنے کے لئے سامنے تنا شخص ہجوم کو سروں اور کندھوں سے دھکیل کر زندہ رہنے کے لئے اپنے ڈھٹائی واضح کرتے ہوئے خود کو اندر کی طرف ریل رہے تھے۔ سکسنھ روڈ کے اسٹاپ پر میدان حشر کی اس بھیڑ کو چیرتی پھاڑتی وہ زنانہ دروازے سے کتابوں کا بوجھ بغل میں دبائے، بس کے اندر دھنسنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کا دوپٹہ اس کے سر سے ڈھلک کر ایک دھجی کی طرح اس کے کندھوں پہ لپٹ گیا۔ اس کے لمبے بالوں والی چوٹی نہ معلوم کس طرح ناگ کی طرح رینگ کر درشلنے کا پل عبور کرتے ہوئے اس کے سینے پر آگری۔ زنانہ سیٹوں پر نیلے کوٹ اور سرخ ٹائیاں لگائے کچھ مردانے حسب دستور ڈٹے ہوئے تھے۔

پیچھے سے ایک چیختی ہوئی آواز نے کہا۔۔۔۔ "لیڈیز فرسٹ پلیز۔ صنف نازک کے لئے جگہ خالی کرو"۔۔۔

بس کنڈیکٹر اس طرف متوجہ ہوا۔۔۔

"لیڈی سیٹ چھوڑیں جناب۔ لیڈی سیٹ"، ایک مسخرے نے نعرہ لگایا۔۔۔۔۔

"صنف نازک کو سامنے لایئے صاحب۔۔۔"

لیڈیز سیٹ خالی کر کے یہ زندہ دل چھبیلے اس سے پچھلی زنانہ سیٹ پر براجمان ہوگئے۔۔۔۔

فرخندہ ایک طویل سانس کھینچ کر اب اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔۔۔ اس نے اپنی کتابیں گھٹنوں پہ ٹکائیں۔ دوپٹہ درست کیا۔ پریشان لٹیں کنپٹیوں کے پیچھے دبائیں اور دوپٹہ سر پر منڈھ کر کانوں کی کڑیوں میں اڑس لیا۔

پیچھے سے ایک لہراتا ہوا سُر ابھرا۔

"ہولی [illegible]"

اور دو گد بدے چھوکروں نے۔ "او جوگی تری مری۔۔۔۔۔

تان کو بڑے لہرا کر کورس کے انداز میں اٹھایا۔۔۔

ایک آواز نے چیخ کر پوچھا۔۔۔ "اچھا جی راجہ لہراسپ خاں اکیلے ہی اکیلے ہمارے لڈو کہاں ہیں؟"

راجہ لہراسپ خاں نے پیچھے مڑ کر کہا، "بیلی میریا فکر نئیں نکاح دے چھوارے، باداماں تے کھیسے پر دیوانگا۔"

"او جیو، جیو میرے راجہ۔۔۔"

ایک دوسرے صاحب شستہ اردو میں گویا ہوئے۔

"یار راجہ خدا جلد وہ دن لائے پر میرے شبیر یہ، دوپٹے سے کان باہر نکالنے والی رسم اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔۔

"اوئے فکر نئیں سارے کس بل نکل جائیں گے"، راجہ نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

بس بھڑبھڑاتی، چرچراتی چاندنی چوک اسٹاپ پہ رکی۔۔۔

تو پھر فضا میں یہ بول لہرایا۔

"میری تری منگنی ہو۔ او گئی"۔۔۔

راجہ نے جو پیچھے کی سیٹ کے وسط میں بیٹھا تھا بغل میں بیٹھے اپنے دوشہ بالوں کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ حمائل کرتے ہوئے اپنی ٹانگوں کو سامنے والی سیٹ کے نیچے اور بہت نیچے پسارنا شروع کر دیا۔۔۔

ایک شہ بالا، کھی کھی کرتے ہوئے بولا۔۔۔ "بس بس باقی حد ادب۔

آج کل وائرلیس کا زمانہ ہے۔ بے تار جوڑ سے پیغام پہنچ جاتا ہے۔۔"
بس کنڈیکٹر کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان گھستا پلتا" اور کوئی صاحب بغیر ٹکٹ "۔۔۔ کے نعرے مارتا جب لیڈیز سیٹوں کے درمیان آکر اس کی سیٹ کے قریب پہنچا تو اس نے چونی اس کی طرف بڑھائی۔۔۔

"صدر۔ صدر"۔ اس نے بے صبری سے پوچھا۔ تو اس کے جواب میں فرخندہ نے آہستگی سے کہا نہیں "تیلی محلہ"۔۔۔

تیلی محلہ کا نام سنتے ہی آج پھر معمول کے مطابق سٹ بالوں نے راجہ سے پوچھا "او یار تارے میرے کا کیا ریٹ چل رہا ہے۔ آج کل"۔۔

اور نوشاد نے شستہ لہجے میں ان سب سے پوچھا کیا پکوڑوں کی دکان کھولنے کا ارادہ ہے"۔۔۔

پھر خدا خدا کر کے تیلی محلے کا اسٹاپ آیا اور فرخندہ کتابوں کا بار شیریں بغل میں مار اس قیامت سے نکلی تو نوشاد اور سٹ بالوں کی یہ ٹولی اس کے ساتھ اتر پڑی۔۔۔۔ وہ سب آہستہ آہستہ اس کے پیچھے رینگنے لگے۔ اور جب وہ اپنی گلی میں داخل ہونے لگی تو اس نے آہستہ سے گردن موڑ کر۔ کہا "خدارا آپ لوگ ذرا رحم کریں یہاں میرا گھر ہے۔ جہاں میں ماں باپ کے ساتھ رہتی ہوں"۔۔۔

نوشاد نے بڑے کریمانہ انداز میں کہا۔۔۔ "دس از فاؤل۔ دس از فاؤل۔ راجہ۔۔۔۔ چھوڑو یار"۔۔۔۔ اور وہ سب پلٹ پڑے۔

یہ آج کا حادثہ نہیں تھا یہ تو روز کا معمول تھا۔ یہ جماعت بلاناغہ روز اسی طرح اسے گلی تک چھوڑ کر جاتی تھی۔۔۔

وہ یہ سب کچھ سہہ رہی تھی اور اس لئے سہہ رہی تھی کہ خالہ بی بڑی تند و تیز عورت تھیں۔ فرخندہ کے والد منشی فخرالدین نے ڈھلتی عمر میں ان سے دوسری شادی اس وقت رچائی تھی جب فرخندہ جوان ہو چکی تھی۔۔۔۔ فخرالدین طبعاً کمزور طبیعت کے انسان تھے۔ انہیں اپنی بیٹی اور دو لڑکوں سے جو ابھی زیرِ تعلیم تھے محبت تھی مگر طویل سنسان زندگی اور خاص کر فرخندہ کے جوان ہوتے ہی لوگوں کی چہ میگوئیاں ان پہ بری طرح اثر کر رہی تھیں۔ وہ لوگوں کا منہ تو بند نہیں کر سکتے تھے اور انہیں یہ بھی منظور نہیں تھا کہ فرخندہ بھی ان ہی کی طرح تیلی محلے میں آنکھیں کھول کر اسی کی تنگ و تاریک گلیوں میں ایڑیاں رگڑتی دنیا سے رخصت ہو جائے۔ تیلی محلے اور لالہ زار کالونی میں بڑا فاصلہ تھا مگر ایک ڈگمگاتے، کپکپاتے باپ کی بے پایاں محبت، بڑی سے بڑی جست لگانے کو تیار تھی۔۔۔۔۔ آخر انہوں نے اپنی مرحوم بیوی کی رشتہ کی ایک بیوہ بہن سے نکاح کر لیا کہ اور کچھ نہیں تو گھر کھل جائے گا۔ جوان بچی کے رشتے ناتے بھی آنے لگیں گے اور پھر سچ بات تو یہ ہے کہ یہ چھان پھٹک کچھ عورتوں ہی کا کام ہے اور وہی اسے بہتر طریقے پہ کرنے کی اہل بھی ہوتی ہیں۔

خالہ بی بی بڑی پختہ کار خاتون تھیں انہوں نے شروع شروع تو بچوں کو خوب پرچایا فرخندہ پہ تو وہ صدقے قربان ہوتی رہیں اور دیکھنے والے بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ بھئی سچ ہے ماں مرے موسی جئے کی کہاوت تو یہیں سچ ہوتی نظر آ رہی ہے۔۔۔۔۔

فرخندہ تو محبت کی بھوکی تھی وہ بڑی تیزی سے ان کے دام میں پھنستی چلی گئی۔ اٹھتے بیٹھتے خالہ بی کا نام جپنے لگی اور فخرالدین بھی بڑے مطمئن اور آسودہ نظر آنے لگے کہ خوبیٔ تقدیر سے اس نئی بیوی کے دل میں خدا نے مامتا جگا دی تھی۔ مگر پھر بہت جلد پانسہ پلٹا اور پردہ اس طرح فاش ہوا کہ خالہ بی نے اپنے ایک نکھٹو، رنڈوے بھائی مشتاق کے لئے جو ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں فرڈ تھا راہ ہموار کرنی شروع کی اور جب ایک دن سرخ رومال میں رشک منیر عطر کی شیشی کے ساتھ ایک پرچہ اس کے تکئے کے پاس رکھا ہوا ملا تو وہ ہق دق رہ گئی۔۔۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے پرچہ کھولا۔ خط کے اوپر کچے خط میں لکھا تھا:

"جب سے لاگیں انکھیاں موری۔۔۔"

اور آخیر میں کہا گیا تھا "اے جانِ تمنا اگر تم اس تغافل شعاری سے باز نہ آئیں تو بندہ یہ بتا دینا چاہتا ہے کہ تمہیں اٹھوا دیا جائے گا اور تم ایسی جگہ پہنچ جاؤ گی کہ کسی کو آواز دے کر بلا بھی نہ سکو"۔۔۔

عطر کا ایک چکنا ہوا بھبکا اٹھ کر اس کے سارے وجود کو چھا سا گیا
وہ سرخ رومال ایک ناگ کی طرح پھنکارتا محسوس ہوا.... مگر وہ اس
بات کو پی گئی.... پھر جب ایک دن فخر الدین کسی کام سے لاہور گئے
تو مشتاق نے صبح ہی آکر ڈیرہ جمالیا۔ اور رات گئے جب وہ اپنی
بہن سے رخصت ہونے لگے تو خالہ بی نے کہا۔ "فرخندہ ذرا ڈیوڑھی کے
کواڑ لگا لو مشتاق جا رہا ہے...."

جب وہ کیواڑ بند کرنے ڈیوڑھی میں پہنچی تو مشتاق نے اس کا
ہاتھ دبوچ لیا....

"ایسی بھی بے رخی کیا اے ستمگر....."

"چھوڑیئے.... میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے...." اس نے جھنجھلا کر ہاتھ
کھینچنا چاہا تو مشتاق نے کہا" بندہ یا تو کسی کا ہاتھ پکڑتا نہیں پکڑتا ہے
تو چھوڑتا نہیں"....

فرخندہ کے تن بدن میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا، اس کا دوسرا
ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور تڑاق سے ایک طمانچہ مشتاق کے منہ پر پڑا....
یہ وار ایسا اچانک تھا کہ حیرت اور استعجاب میں مشتاق کے ہاتھ سے اس
کی کلائی چھوٹ گئی، اور فرخندہ چیختی ہوئی خالہ بی کے پاس پہنچی...."خالہ بی ان
اپنے بھائی صاحب کو آپ سنبھال کر رکھیں میں کوئی ایسی ویسی نہیں ہوں"
نہ معلوم کیا کیا اول فول اس کے منہ سے نکلنے لگا۔

خالہ بی بڑی گھاگ تھیں صرف اتنا کہہ کر رہ گئیں۔ "وہ بھی کوئی
ایسا ویسا نہیں ہے جو اس کمبخت مارے گھر میں پھر قدم رکھے۔ مجھ پر
تمہاری پارسائی خوب روشن ہے۔ یہ مہینوں سے پرچے پرزے چل
رہے تھے جب تمہیں لاج نہیں آئی...."

اس واقعہ کے بعد خالہ بی کو فخر الدین کی اولاد میں بہت
بھونسڑے نظر آنے لگے۔ بشیر فیس کے پیسوں کی چرس پیتا نظر آنے
لگا۔ نذیر پڑوس کی لڑکیوں کو تاکتا محسوس ہوا۔

روز کی دانتا کل کل سے تنگ آکر دونوں لڑکے اپنی ننھیال
میں رہنے لاہور چلے گئے، مرد بچے تھے۔ بڑے نے ریلوے ورکشاپ
میں ملازمت کر لی۔ چھوٹا ایک اسکول میں داخل ہو گیا۔ دونوں بھائی جیسے تیسے
دن کاٹنے لگے۔

دونوں لڑکوں کے چلے جانے کے بعد فخر الدین کی صحت دن بدن
گرنے لگی اور آخر فالج کے ایک ہلکے سے حملے نے انہیں بائیں پاؤں
سے کچھ لنگڑا سا کر دیا۔ وہ اب بہت زیادہ بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔
میونسپلٹی کی کلرکی سے ریٹائر کر دیئے گئے۔ اب اس ہوش ربا گرانی
میں ان کے اوسان ٹھکانے نہیں تھے۔ وہ مسکینی کا مجسمہ بنے روز
یہ باتیں سنتے۔

"مشتاق نہ ہوتا تو فاقے ہو جاتے.... مشتاق نہ ہوتے تو صاحبزادوں
کی فیس داخل نہ ہوتی.... اس دن آپ کو جو اس نے فکر مند دیکھا تو جھٹ
رات میں پچھتر روپے دے گیا اور کمبخت نے لاکھوں قسمیں دلائیں کہ
آپا بیگم دیکھنا دولھا بھائی پر یہ بات نہ کھلے..."

فخر الدین ان باتوں کو سن کر ندامت سے سر جھکا کر حسرت زدہ
سی مسکراہٹ سے آب دیدہ ہو جاتے ان کے ہونٹ پھڑ پھڑا کر
رہ جاتے.....

پھر ایک رات اس نے خالہ بی کو یہ کہتے سنا...."جوان بیٹی
کو کب تک بٹھائے رکھو گے تمہیں تو کسی بات کی فکر ہی نہیں۔ کوئی
داغ لگ گیا تو چھاتی پکڑ کر بیٹھ جاؤ گے۔ میں کہتی ہوں مشتاق بہت امیر
نہ سہی ارے عزت تو ڈھک لے گا تمہاری...."

فخر الدین نے ایک آہ بھر کر صرف اسقدر کہا "اچھا جو اللہ کو منظور ہوگا"

خالہ بی نے گرج کر کہا "اللہ آسمان سے بر نہیں ٹپکائے گا۔ تم تو سٹھیا
گئے ہو۔ تمہاری قوت فیصلہ جواب دے گئی ہے۔ اب کے عید کے چاند پر اس
بوجھ کو ٹھکانے لگاؤ"۔

فرخندہ کا سارا وجود ایک لاوے کی طرح بھڑک اٹھا.... صبح
ہونے تک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار نہ تھما۔ آج وہ کچھ کھائے
پیئے بغیر ہی کالج چلدی۔

کالج میں آج بڑی دھوم دھام تھی سرخ سبز جھنڈیاں آویزاں

• تھیں عورتوں کا عالمی سال منانے کے لئے حقوق نسواں پہ ایک مذاکرہ منعقد ہو رہا تھا۔ بیگم کرنل باری، بیگم قدرت اور مس عفت جمال مجلس مذاکرہ سے خطاب کرنے والی تھیں۔

پرنسپل صاحبہ بڑی شوخ ساڑھی میں ملبوس اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھر رہی تھیں۔ کالج کے بڑے ہال میں طالبات قطاروں میں بٹھادی گئیں۔ مائک پر اعلان ہوا مہمان خصوصی تشریف لا رہی ہیں سب ایستادہ ہو جائیں۔

سب لڑکیاں کھڑی ہوگئیں۔ خطبہ استقبالیہ کے بعد۔ بیگم باری نے سیولیس (ESS · LEEVE) [illegible] فرمایا۔

"ہم عورتیں اب مٹی کے کھلونوں سے نہیں بہل سکتیں۔ یہ چند اسامیاں یہ چند عہدے ہمارے مسائل حل نہیں کر سکتے۔ ہمیں قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں زیادہ نمائندگی ملنا چاہیئے" اور مس عفت جمال نے کہا۔ "نہ معلوم عورتوں کو کیا سمجھ لیا گیا ہے آخر مرد تو چار شادیاں کر سکتا ہے۔ مگر بے چاری عورت ایک سے زیادہ طلاق بھی نہیں لے سکتی۔ اگر عورتیں بھی دو دو تین شوہر رکھنا شروع کر دیں تو یہ مرد خودکشیاں کر کر کے مر جائیں۔" ایسا کہتے ہوئے ان کے لمبے نازک ناخن بار بار ان کے گلے پر پڑتے اور وہ تخیل میں مردوں کے گلے گھونٹتی وہ باتیں کہہ رہی تھیں جن پر اس ملک میں کوئی بھی فہیم انسان سوچنا بھی معصیت سمجھتا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں "بات تو یہ ہے کہ ہمارا ملک بہت پسماندہ ہے یہاں کے تو مرد بھی ستم زدہ ہیں غریبوں کو محبت تک کا حق نہیں ان کی جوانیاں بلبلاتے گذر جاتی ہیں وہ برقعوں کی کالی کفنیوں کے علاوہ صنف نازک کے صحیح خدوخال تک نہیں دیکھ سکتے۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ خاص قسم کے ڈاک کے ٹکٹ جاری کئے جائیں جنہیں دو محبت کرنے والے اپنی خط و کتابت میں استعمال کریں ان خطوط کو متعلقہ افراد کے علاوہ اگر کوئی کھولے تو وہ مجرم قرار دیا جائے۔ کوئی پرواہ نہیں گر وہ کوئی دقیانوسی باپ ہی کیوں نہ ہوں"....

جب کچھ ہلکے گھٹے گھٹے قہقہے بلند ہوئے تو مس عفت جمال غصہ میں آگئیں ...

"آج آپ مجھ پر ہنس رہی ہیں مگر میں آپ پر رو رہی ہوں۔ احساسِ کمتری نے آپ سے سوچنے کی صلاحیتیں چھین لی ہیں"۔ فرخندہ کے کانوں میں یہ بول لرزنے لگے۔

میری تری منگنی ہو اوگئی۔

اہو ---ہو اوگئی ....

اس کا جی چاہا چیختی ہوئی ڈائس پر چڑھ جائے اور مس جمال کا گریبان نوچ کر ان سے کہے بتو تم نے کبھی تیلی محلے۔ ڈھوک رتا اور سنکاری بازار میں سانس نہیں لی تم لالہ زار سے اٹھ کر اس اسٹیج پر ہمارے نہیں امریکی اور فرانسیسی عورتوں کے مسائل لے کر آگئی ہو، تمہیں کچھ خبر نہیں ہے، میری تعلیم کا جنازہ نکلا چاہتا ہے۔ میرے بوڑھے باپ کی بیکسی کو کون سی صلیب پر چڑھایا جا رہا ہے۔ مگر وہ ضبط کئے بیٹھی رہی۔ اسٹیج پر کٹھ پتلیوں کا تماشا ہوتا رہا۔

پھر ایک بجے محفل برخواست ہوئی تو وہ پھر بس میں مجمع کو چیرتی جا دھنسی۔

آج بھی نوشاہ اور اس کے شہہ بالے اس کے گرد پرا جمائے ہوئے تھے۔ پچھلی سیٹ سے جب راجہ لہراسپ کے جوتے اس کی ایڑیوں میں لگے، تو اس نے گھوم کر کہا۔ "کیا آپ واقعی منگنی کرنا چاہتے ہیں"

جواب ملا "چٹ منگنی پٹ بیاہ ..."

نوشاد نے بول اٹھایا ...

موہے بھابھی لادو بھیّا

مورا جیا بہلا دو بھیّا ....

پھر تیلی محلے کا بس اسٹاپ آیا تو یہ جماعت آج کچھ زیادہ ہی جوش سے نیچے اتری ...

فرخندہ آگے چلی تو یہ جماعت پیچھے پیچھے ہوگئی۔

وہ اپنی گلی میں مڑنا چاہتی ہی تھی کہ معاً اس پر ایک دورہ سا پڑا۔ دوسرے لمحے ۔۔۔ اس کا ہاتھ راجہ لہراسپ کی کلائی پر پیوست ہو گیا۔

"آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ بولئے نا۔ میں تیار ہوں۔ میں تیار ہوں۔۔۔۔"

راجہ سر سے پاؤں تک کانپ رہے تھے۔

"دیکھئے چھوڑیئے نا چھوڑ دیجئے پلیز لوگ جمع ہو جائیں گے۔"

جمع ہو جانے دیجئے۔ میں واقعی آپ کو پسند کرتی ہوں۔ آپ کے گھنگریلے بالوں نے مجھے اسیر کر لیا ہے۔ پھر اس میں کیا حرج ہے؟"

"آپ کو شرم نہیں آتی مس ۔۔۔ کیا نام آپ کا ۔۔۔۔ خدا کے لئے چھوڑیئے"۔۔۔۔ راجہ بلبلائے۔

چودھری سلامت علی پنساری، جمال دین حجام اور محلہ کے معزز ترین شخص مولانا قطب الدین آن واحد میں وہاں جمع ہو گئے۔

"کیا بات بیٹا ۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔"

"یہ کالج کے منڈے چھیڑ دے ہیں کڑیاں نوں" جمال دین حجام نے بات مولانا کو سمجھائی۔

فرخندہ کے ہاتھ کی گرفت راجہ لہراسپ کی کلائی پر اور مضبوط ہو گئی۔

"کچھ نہیں یہ مجھے چھیڑتے نہیں مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا صاحب میں ان سے یہ ہی کہہ رہی ہوں کہ چلو میرے باپ کے سامنے چل کر رشتہ مانگ لو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

مولانا نے داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔

"ہوں از روئے شریعت اس میں کوئی قباحت نہیں منشی فخرالدین صاحب سلجھے ہوئے آدمی ہیں یہ محلے کی بیٹی ہے، ہماری بیٹی ہے ہم سب ان پر زور دیں گے۔ چلو برخوردار چلو۔"

راجہ نے کانپ کر سب کے آگے ہاتھ جوڑ لئے۔ "آپ لوگ مجھے معاف کر دیں۔ دیکھئے میرے ڈیڈی سن لیں گے تو مجھے مار ڈالیں گے۔"

مولانا نے مجمع کو بڑھتے ہوئے دیکھا تو کہا۔ "ڈرو نہیں بیٹا چلو، چلو یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں سامنے میری بیٹھک ہے وہاں بات ہو گی۔۔۔"

مختصر مجمع بیٹھک کی طرف چل دیا۔

مولانا نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔۔۔

"ہاں برخوردار تو بات یہ ہے میرے عزیز کہ شریعت کی رو سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اور میں تو اس بچی کی صاف گوئی کی تعریف کروں گا کہ اس نے حدود اللہ کا احترام کرتے ہوئے عقد مسنونہ کی طرف اس طرح دلیری سے قدم بڑھایا ۔۔۔۔ میں ہی نہیں پورا محلہ آپ کے ساتھ ہے۔ ہم سب یہ کار خیر سر انجام دیں گے۔"

راجہ لہراسپ اب سسکیاں بھر رہا تھا "خدا را مجھے معاف کر دیجئے۔۔"

"اچھا تو یہ کیا بات ہوئی یعنی کہ تم اس لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتے ۔۔۔۔"

"[illegible] نہیں [illegible] وہ [illegible] چاہتے [illegible] [illegible] میں [illegible] ہم [illegible] میں رہنے میں ہیں تو [illegible] ہی [illegible]"

"اچھا ۔۔۔۔ خوب [illegible] معقول ۔۔۔ حدود اللہ توڑنے میں اتنے تیز اور [illegible] کی [illegible] میں اتنے پیچھے ۔۔۔"

جمال دین حجام نے [illegible] نعرہ مارا ۔۔۔

"[illegible] شودے [illegible] دیکھتا ہوں [illegible] پیچھا کرتے ہوئے آتے ہیں" احمد دین قصائی نے [illegible]

مولانا نے [illegible] کر کہا۔ "[illegible] [illegible] دل ہیں یہ"

اچھا برخوردار معاملہ کی تہہ تک پہنچ [illegible] ہوں۔ اب فیصلہ یہ ہے کہ زمین پر ناک سے لکیریں [illegible] کہ اب کبھی کسی لڑکی کا پیچھا نہیں کرو گے۔ [illegible]

اور راجہ زمین پر جھکا تو فرخندہ ۔۔۔۔ زمین پر تھوک کر وہاں سے چل دی ۔۔۔

افسانہ

عظیم عورت

فوزیہ رشید

بیگم رفیق دھڑکتے دل کے ساتھ ہسپتال کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ کار کی کھڑکی سے سر ٹیکے آسمان پہ اداس بادلوں کے ٹکڑوں کو ملتے اور جدا ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ جب یہ آوارہ ٹکڑے آپس میں گلے ملتے تو بیگم رفیق خوشی سے جھوم اٹھتیں اور جب بھی ٹکڑے ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے تو وہ اک انجان سے خوف سے تڑپ اٹھتیں اور خلوصِ دل سے دعاگو ہوتیں کہ اے خدا! میری آرزو پوری کر دے مجھے ایک لڑکا عطا کر دے۔ وہ خوب واقف تھیں کہ رفیق صاحب کو لڑکیوں سے سخت نفرت ہے اور وہ کسی لڑکی کو بیٹی کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ سے تقریباً ایک ماہ پہلے انہوں نے اپنی بیوی امینہ سے کہا تھا کہ اگر ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو اسے ہسپتال میں ہی چھوڑ آنا اور اگر تمہاری تا یہ کرتے ہوئے چیخ اٹھی تو میری طرف سے تمہیں بھی اجازت ہے کہ ہاں چاہے بیٹی کو لے کر رہ جانا لیکن بیٹی کو لے کر اس گھر کا رخ نہ کرنا۔

اگر لڑکی ہو گئی۔؟

یہ خیال آتے ہی وہ کانپ اٹھتیں اور سوچ کے گہرے سمندر دب جاتیں کہ کس طرح وہ اپنی ممتا کا گلا گھونٹ سکیں گی کس دل کے نہ وہ ایسا کر سکیں گی۔ اس جگر گوشے کو جس کو انہوں نے اپنے خون کی ایک بوند سے سینچا ہو نہیں۔۔۔ نہیں ـــ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکیں گی۔ اگر ضرورت ہوئی تو وہ اپنے گھر، اپنے شوہر، سب کو خیر باد کہہ دیں گی۔ وہ اک ننھی سی جان پہ یہ ظلم نہیں کریں گی چاہے خود ان کی اپنی زندگی ہی کیوں نہ تباہ ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نہیں خدا اتنا ظالم نہیں وہ ضرور مجھے بیٹا دے گا۔

انہیں خیالوں میں غرق وہ پچھلی نشست پر اردگرد کے ماحول سے بے نیاز بیٹھی تھیں کہ اچانک کار رکی اور شوفر نے مطلع کیا کہ بیگم صاحبہ ہسپتال آگیا ہے۔ تب امینہ کا خیالات سے رابطہ منقطع ہوا اور ایک دفعہ پھر انہوں نے بیٹے کے لئے دعا مانگی اور گاڑی سے نیچے اتر آئیں۔

جنرل ہسپتال میں پہلے ہی سے ایک کمرہ بک کروایا جا چکا تھا۔ امینہ کو دیکھتے ہی کئی لیڈی ڈاکٹرز اور نرسیں ان کی طرف بڑھیں اور ایک خوبصورت پرائیویٹ کمرے تک لے گئیں۔ لیکن امینہ اب تک تصورات میں گم تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے معصوم صورتیں گھوم رہی تھیں کبھی وہ لڑکے کی شکل میں ہوتیں اور کبھی لڑکی کی۔ جب لڑکی کی شبیہ اس کی نظروں میں آتی تو وہ ایک دم بجھ سی جاتیں لیکن دوسرے ہی لمحے لڑکے کی صورت آنکھوں میں سما کر ساری کائنات کو رقصاں کر دیتی اور وہ اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت تصور کرتیں۔ خدا کو امینہ کی آزمائش مقصود تھی تبھی تو اگلے دن اس کے ہاں ایک پھول سی بچی نے جنم لیا۔ امینہ بچی کی پیدائش

[illegible] سن کر بے تحاشا روئی۔ سب اس کے رونے پر حیران تھے کہ آخر بچی کی پیدائش پر رونا کیسا۔ ؟

لیکن کوئی بھی تو امینہ کے درد سے واقف نہ تھا۔

وہ اپنا گھر کس طرح چھوڑے ؟ کہاں جائے ؟ کیا کرے ؟ یہ ظالم دنیا اس کی جوانی کو داغدار سمجھے گی، اس پر بدنامی کی کیچڑ اچھالے گی [illegible] کے لئے یہ دنیا تنگ ہو جائے گی وہ تنہا اس سماج کا کیسے مقابلہ کرے [illegible] خیالات سے ڈر کر وہ خاوند کے وجود میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش [illegible] لیکن کچھ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ بیاہ کی بھیک مانگ رہی ہے [illegible] سلسل تذبذب میں گزارنے کے بعد [illegible] امینہ نے [illegible]

روزی [illegible]

[illegible]

[illegible] روزی کو امینہ کی بات [illegible] بہت سخت ہوا اور ساتھ [illegible] کی خواہش اس کے دل میں کروٹ لینے لگی۔ روزی کی شادی [illegible] سال ہو چکے تھے لیکن ابھی تک وہ اولاد کی نعمت سے محروم [illegible] دونوں میاں بیوی بچوں کے بہت خواہش مند تھے لیکن ایک عرصہ [illegible] جانے کے بعد بھی ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ اور اب [illegible] دیرینہ خواہش اس قدر جلدی پوری ہوتے دیکھ کر روزی پھولے [illegible] سما رہی تھی۔ روزی نے امینہ کو تسلی دی اور بچی گود لینے کی [illegible] پیشکش کی۔ اور ماں سے بڑھ کر پیار دینے کا وعدہ کیا۔

آج روزی کو معلوم ہوا کہ امینہ کی بڑی بڑی اور خوبصورت آنکھیں کیوں [illegible] اداس اور کھوئی کھوئی سی رہتی تھیں اور اس کا خاوند اس عرصہ [illegible] سے ملنے کیوں نہیں آیا تھا۔ یقیناً بچی کی پیدائش کی اسے خبر مل [illegible] تھی۔

روزی بچی کو لے کر جب گھر پہنچی تو اس کا خاوند مائیکل اس معصوم سی بچی کو اپنے گھر میں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ دونوں میاں بیوی کو تو جیسے گمگشتہ جنت مل گئی تھی۔ بچی کے آتے ہی اس خزاں رسیدہ گھر میں بہار آگئی تھی۔ دونوں نے متفقہ طور پر بچی کا نام ڈارتھی رکھا۔ وقت ہوا کے دوش پر چل رہا تھا۔ ڈارتھی اب چار سال کی ہو گئی تھی۔ اس طویل عرصہ میں ایک دفعہ بھی رفیق صاحب یا بیگم رفیق بچی کا حال تک پوچھنے نہ آئے۔ یقیناً وہ عیش و عشرت میں کھو چکے تھے۔

مائیکل نے ڈارتھی کو اب تھوڑا بہت خود ہی پڑھانا شروع کیا اور جب وہ پانچ سال کی ہوئی تو اسے قریب ہی سکول میں اسے داخل کر دیا۔ ڈارتھی کو سکول لے جانا اور واپس لانا مائیکل کا معمول تھا۔ آج ڈارتھی بہت خوش تھی کیونکہ اس نے آج میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کر لیا تھا۔ اب اسے کالج میں داخل ہونا تھا۔ لیکن گھر کے حالات اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئے اور آخر کار اس نے تعلیم [illegible] اور گھر کے کام کاج میں مشغول ہو گئی۔

روزی کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی اور مائیکل کی چند ایک ٹیوشن سے گھر کی گذر بسر ہو رہی تھی۔ ڈارتھی بہت سمجھدار اور ذہین لڑکی تھی۔ اس نے گھریلو حالات کی قربان گاہ پر اپنی تمام خواہشات، اپنی تمام آرزوؤں کو بھینٹ چڑھا دیا۔ وہ دوسری نوجوان لڑکیوں کی طرح شوخ و چنچل نہ تھی بلکہ سارا دن خاموشی سے کام میں مصروف ہو کر گزار دیتی۔ غرضیکہ گھر کو صاف ستھرا رکھتی اور اسی صفائی کا نتیجہ تھا کہ گھر کا پرانا اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر بھی نیا نظر آتا۔

ڈارتھی بچپن ہی سے بہت خوبصورت تھی لیکن جوانی نے اور چار چاند لگا دیئے۔ کوئی شخص بھی اسے دیکھ کر دل تھامے بنا نہ رہتا۔ اسی عالم میں مائیکل کے ایک شاگرد دلنواز نے ڈارتھی کو دیکھا اور فریفتہ ہو گیا۔ دلنواز پٹھان خاندان کا چشم و چراغ تھا اور قبائلی حسن کا مکمل مجسمہ، حسن کے اس پیکر نے پہلی نظر دیکھتے ہی پختہ ارادہ کر لیا کہ شادی کرے گا تو اس پری پیکر سے، حالانکہ وہ واقف تھا کہ ان کے درمیان مذہب

کی مضبوط دیوار حائل ہے لیکن جوشیلی جوانی نے جوش مارا اور تصور میں ہی اس نے اس مضبوط دیوار کو پاش پاش کر دیا۔

اب دلنواز مائیکل کے گھر آ کر پڑھا کرتا تا کہ اسی بہانہ ڈارتھی کو ایک نظر دیکھ سکے۔ دلنواز کی ترکیب کامیاب ہوئی اور اس نے ڈارتھی سے تعلقات بڑھالئے۔ دلنواز کے حسین خوابوں میں اب ڈارتھی بھی برابر کی شریک ہوگئی اور صبح شام سپنوں میں رہنے لگی۔

ایک دن جھجکتے جھجکتے دلنواز نے مائیکل سے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا۔ مذہب مختلف ہونے کی وجہ سے اسے انکار سا خوف تھا۔

لیکن مائیکل نے یہ کہہ کر کہ "اگر ڈارتھی راضی ہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں" اقرار کر لیا۔ اگلے ہی ہفتے دونوں نے مسجد جا کر نکاح پڑھوایا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہوگئے۔ شادی کو ابھی چند ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ بعض سماجی مسائل پہ دونوں کی تکرار ہونی شروع ہوگئی۔ دلنواز عیسائیوں میں عورت کو ہر طرح آزاد چھوڑ دینے پہ اس کے چٹکیاں لیتا اور وہ مسلمانوں میں سات پردوں میں عورتوں کو مقید کر دینے کا مذاق اڑاتی۔ دلنواز بچپن ہی سے غصہ کا تیز واقع ہوا تھا اور اسی غصے کی بنا پر کئی سال پہلے اپنے والدین اور رشتہ داروں سے علیٰحدہ ہو چکا تھا۔ ایک دن معمولی تکرار پہ بیوی کو اس کے والدین کے پاس چھوڑ گیا۔ ڈارتھی جو کہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اس کی منتیں کرتی رہی لیکن دلنواز نے کوئی بات سنی تھی نہ سنی چنانچہ بیوی کو چھوڑ کر نو دو گیارہ ہوگیا۔

پندرہ دن بعد ڈارتھی کے ہاں گول مٹول سا، خوبصورت سا لڑکا ہوا بیٹے کی پیدائش پہ ڈارتھی دلنواز کو یاد کر کے خوب روئی لیکن بے سود۔

اگلے دن نہ معلوم کیوں دلنواز واپس پلٹ آیا اور ڈارتھی سے معافی مانگنے لگا۔ ڈارتھی جو پہلے ہی اس کی جدائی میں بدحال تھی فوراً ہی تمام گلے شکوے بھول کر خاوند کو خوش آمدید کہنے لگی۔ دلنواز بھی اب ڈارتھی کے ساتھ انہی کے گھر رہنے لگا۔ لڑکے کا نام باپ کے نام پہ شاہنواز رکھا گیا۔

شاہنواز کی پیدائش کے بعد دونوں میاں بیوی پھر پیار و محبت کی زندگی گزارنے لگے۔ کبھی کبھی معمولی بات پر تھوڑی سی چپقلش ہو جاتی لیکن وہ سنگین صورت نہ اختیار کرتی۔ شاہنواز ابھی سال کا ہوا تھا کہ ایک اور ننھی سی جان نے اپنی آمد کا الارم بجایا۔ دوسرا بیٹا ربنواز بالکل باپ کا ہم شکل تھا۔ یہ دونوں بچے سب گھر والوں کی محبت کا مرکز تھے۔ روزی اور مائیکل کو بڑھاپے میں دو کھلونے مل گئے ان کا سارا دن انہیں بچوں کے ساتھ گزر جاتا۔

ربنواز سات ماہ کا ہوا تھا ایک دن پھر دلنواز روٹھ کر ڈارتھی کو روتا چھوڑ کر چلا گیا۔ ڈارتھی کا خیال تھا کہ اس دفعہ بھی چند دنوں بعد خود ہی واپس آجائے گا اور معذرت طلب کرے گا۔ لیکن سال گزر جانے کے بعد بھی وہ واپس نہ آیا اسی عرصہ میں ڈارتھی ایک بچی کی ماں بھی بن گئی۔ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی دلنواز کا کچھ پتہ نہ چلا۔ روزی اور مائیکل سے بیٹی کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی۔ ایک دن اچانک دل کا دورہ پڑنے سے روزی اپنے مالک حقیقی سے جا ملی۔ اب گھر کا سارا کام ڈارتھی کو کرنا ہوتا۔ صبح کے وقت کام کی زیادتی کی وجہ سے دلنواز اسے بہت کم یاد آتا لیکن رات کو کئی کئی گھنٹے وہ ڈارتھی کے ذہن پر سوار رہتا اور بعض اوقات اُ کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو یاد کر کے ساری ساری رات گزار دیتی۔

مائیکل بیٹی کی وجہ سے بہت افسردہ رہتا۔ سوچتا کہ وہ ایک معمر شخص ہے اگر اسے کچھ ہوگیا تو ڈارتھی اس ظالم دنیا میں تنہا کس طرح زندگی گزارے گی۔ یہ خیال آتے ہی وہ دلنواز کی واپسی کی دعا کرتا۔ تاکہ کوئی تو اس کا سہارا ہو۔

باپ، بیٹی شام کے وقت بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی مائیکل نے دروازہ کھولا تو دلنواز کا ایک دوست تھا۔ ڈارتھی خوشی سے جھوم گئی کہ کچھ تو اس کے خاوند کی خبر ملے گی۔ لیکن یہ خبر کہ "دلنواز سمگلروں کے گروہ میں شامل ہوگیا ہے اور ہر وقت جوئے اور شراب میں دھت رہتا ہے۔"

پہاڑ بن کر ٹوٹی۔ اور وہ بجھے دل کے ساتھ بچوں کی طرف دیکھنے لگی کہ ان معصوم بچوں کا کیا قصور جو باپ کے ہوتے ہوئے باپ کے پیار سے محروم رہیں اور ہمیشہ ہی اس کے لئے ترسیں۔ ڈارتھی نے ہمت سے کام لیا اور دلنواز کو ایک جھٹکے سے خیال و ذہن سے نکال پھینکا۔ ۲۱۔۱۰ کہ چند دن بعد دلنواز گھر پلٹ آیا۔ لیکن اس دفعہ ڈارتھی نے ذرا بھی چاہت کا مظاہرہ نہ کیا اور وہ اس کی موجودگی سے لاپرواہی برتتی ہوئی اپنے کام میں مصروف رہی دلنواز جو دو سال بعد گھر میں آیا تھا اُس نے بھی نہ کسی بچے کی خیریت دریافت کی اور نہ ڈارتھی کی اور یہاں تک بھول گیا کہ میں اس گھر میں ایک عرصہ بعد آیا ہوں اور اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہونے کی بجائے رعب جمانے لگا کہ میں سخت تھکا ہوا ہوں مجھے جلد چائے بنا کردو۔ ڈارتھی نے اس نے ایک منہ سنی اور ننھی خالدہ کے ساتھ کھیلتی رہی دلنواز جو یقیناً نشے میں تھا بیوی کی لاپرواہی دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا اور قریب پڑی دیگچی ڈارتھی کے سر پر اس زور سے دے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ ڈارتھی جو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی ایک دم پھٹ پڑی اور غصہ سے چلانے لگی کہ اب اُس کا اُس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں اس لیے وہ اُس کے رعب میں نہیں آئے گی جہاں اتنا عرصہ گذارا وہیں سے جا کر چائے پی لے۔ تمہیں اس گھر کا کیسے خیال آیا تم نے آج تک کوئی پیسہ دیا ہے جو اس قدر تحکمانہ لہجے میں چائے مانگ رہے ہو۔ جاؤ اور دفع ہو جاؤ میرے گھر سے آئندہ کبھی اس طرف رُخ نہ کرنا۔ ڈارتھی غصہ میں نہ جانے کیا کیا بولتی رہی لیکن دلنواز بجائے شرمندہ ہونے کے زیادہ اشتعال میں آگیا اور لگا ڈارتھی کی پٹائی کرنے اتنے میں مائیکل دونوں نواسوں کو سیر کروا کر واپس لے آیا بیٹی کو اس بُری طرح پٹتے دیکھ مائیکل کے اوسان خطا ہو گئے۔ اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے آخر نزدیک پڑا ڈنڈا اٹھا کر اسے زور سے گھمانے لگا اور نہایت غصہ سے گرج کر کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" دفعہ ہو جاؤ میرے گھر سے۔

تمہارا یہاں کیا واسطہ؟ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟ میں تمہیں اسی جگہ پر ختم کر دوں گا۔ تم نے میری بیٹی پر پہلے ہی کیا کم ظلم کئے جو اب ملنے کے لئے بھی پہنچ گئے ہو۔ میں بیٹی کا بدلا لے کر ہی دم لوں گا۔

دلنواز بوکھلا سا گیا اُس نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو مائیکل کو بے انتہا غصہ میں پایا۔ دلنواز بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا مائیکل کو انتہائی غصہ میں دیکھ کر اُس کے قدموں میں گر گیا اور زور زور سے رونے لگا اور کہنے لگا۔ "بابا مجھے معاف کرو میں آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا میں ڈارتھی کو بھی ابھی یہی کہہ رہا تھا وہ مانتی ہی نہیں۔ بابا آپ ہی تو کہا کرتے تھے کہ صبح کا بھولا اگر شام کو واپس گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے ہیں اب واپس آگیا ہوں۔ خدارا مجھے معاف کر دیں۔ مجھے اپنی شفقت سے محروم نہ کریں۔ یہ ٹھیک ہے قصور میرا ہے میں ایک مدت تک گھر نہ آیا۔ لیکن آپ کم از کم میرے سے یہ تو پوچھیں کہ اتنا عرصہ کیسے کس حال میں گذارا؟ اگر آپ یہ سن لیں گے کہ میں نے یہ عرصہ کس قدر مصیبت اور تکلیف سے بسر کیا تو یقیناً آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

دلنواز کی یہ چال مائیکل جیسے سادہ لوح اور رحم دل شخص کے لئے کافی تھی اس کا.......... دل پسیج گیا اور اس نے معاف کرتے ہوئے داماد کو گھر میں رہنے کی اجازت دے دی۔

اگلے دن دلنواز کے واپس گھر آنے کا راز افشا ہوا۔ دلنواز جوئے میں بیوی بھی ہار چکا تھا اور اب وہ بیوی کو لینے آیا تھا، یہ بات دلنواز کے دوست نے آخری وقت بتائی جب ڈارتھی اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ مائیکل اصل حقیقت جان کر بیٹی کی قسمت پہ آنسو بہانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ دلنواز کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا گیا دلنواز یہ بے عزتی بھلا کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے عدالت سے چارہ جوئی کی کہ بوڑھا اُس کی بیوی کو ورغلا رہا ہے۔

مائیکل کے لئے یہ الزام بہت تکلیف دہ ثابت ہوا اور نہ ہی اب اُس میں اتنی ہمت تھی کہ ان تمام سنگین حالات کا سامنا کرے چنانچہ ایک دن بہت سوچ بچار کے بعد مائیکل نے ڈارتھی کو بتایا کہ اصل میں وہ کس کی اولاد ہے اور کس بنا پر انہوں نے لے کر پالا تھا۔
جب ڈارتھی کو معلوم ہوا کہ روزی اور مائیکل اُس کے اصل والدین نہیں بلکہ کوئی بہت بڑے زمیندار صاحب اس کے والد ہیں تو اُسے رونا

مائیکل کی شخصیت بہت عظیم لگی ۔ اور اپنے اصلی والدین کو بغیر دیکھے نفرت
کرنے لگی کہ کس قدر ظالم ہیں وہ والدین جنہوں نے آج تک بھول کر بھی اُس
کی خبر نہ لی کہ بیٹی کس حال میں ہے؟

مائیکل کی خواہش تھی کہ اپنی زندگی ہی میں ڈارتھی کو اس کے اصل
والدین سے ملا دے۔ چنانچہ مائیکل نے اپنی خواہش کا اظہار ڈارتھی سے
کیا لیکن وہ بالکل راضی نہ ہوئی اور بولی نہیں بابا بلکہ میں آپ کے ہی خون
سے سینچی گئی ہوں۔" "کاش! میں آپ کے خون وجگر کا حصہ ہوتی" اُس
وقت ڈارتھی بہت جذباتی ہو رہی تھی اس لئے مائیکل نے خاموش
رہنا ہی مناسب خیال کیا لیکن اگلے دن اسے سمجھایا کہ شاید تمہارا اصل باپ
اس وقت تمہاری کچھ مدد کر سکے۔ میرا کچھ بھروسہ نہیں کس وقت اس دنیا
کو خیرآباد کہہ جاؤں اور میرے بعد تمہاری عزت دوسروں کے ہاتھ ایک
کھلونا بن کر اچھلتی پھرے۔ ڈارتھی کو ہر حال میں عزت عزیز تھی چنانچہ
اس نے خاموشی سے باپ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ وہ
ایسے شخص کو ایک نظر دیکھنے کی روادار نہیں تھی جس نے اسے بن دیکھے
صرف اس لئے ٹھکرا دیا کیونکہ وہ ایک لڑکی تھی۔ حالانکہ وہ اُس کے خون کا
حصہ تھی، اس کی عزت تھی۔

اگلے دن جب دونوں باپ بیٹی "رفیق ولا" پہنچے تو محل نما کوٹھی
کی شان وشوکت دیکھ کر اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ڈارتھی نے
تو صرف افسانوں کہانیوں میں ہی ایسے بنگلوں کا ذکر سنا اور پڑھا تھا۔ آج
حقیقت میں وہ ایسی شاندار کوٹھی دیکھ رہی تھی۔ گیٹ پر ایک چوکس
چوکیدار بندوق تانے کھڑا تھا۔

چوکیدار نے کڑک دار آواز میں مائیکل سے پوچھا "کون ہو تم؟
کس سے ملنا ہے؟"

ڈارتھی نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایسی پُر رعب آواز سنی تھی وہ
تو ڈر گئی۔ اگر مائیکل اپنے آنے کی وجہ نہ بتاتا تو شاید ڈارتھی یہ آواز
سن کر بھاگ جاتی یا بے ہوش ہو جاتی۔ مائیکل کی ملائم اور شائستہ آواز نے
نے ڈارتھی کو تسلی دی۔

چوکیدار نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیا اور ان دونوں
کو اس طرح گھورنا شروع کیا جس طرح ایک کوتوال اقبالِ جرم کرنے والے
مجرم کو اور پھر بولا؟ ہاں تو صاحب! آپ نے رفیق صاحب سے ملنا
چندہ مانگنا ہوگا۔ انہیں کیوں تکلیف دیتے ہو میں یہیں منگوا دیتا ہوں
کتنے پیسے چاہیئے ہیں۔

ڈارتھی سے یہ توہین برداشت نہ ہو سکی وہ ایک دم غصہ سے
چلائی، ہمیں چندہ وغیرہ نہیں چاہیئے بلکہ رفیق صاحب اور اُن کی بیگم
سے نہایت ضروری کام ہے۔

"بی بی یہاں ہر روز سینکڑوں ضرورتمند کام سے آتے ہیں؟ وجہ بتائے
بغیر رفیق صاحب سے ملاقات ناممکن ہے۔"

چوکیدار سے تقریباً آدھ گھنٹہ بحث ہوئی آخر منت سماجت
کر کے دونوں باپ بیٹی اندر داخل ہوئے۔ اندر بھی ایک منتظر پھر نوکر
ملا۔ وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے مالک ہی ہو۔ اس نوکر نے بتایا کہ صاحب
دوسرے کمرے میں آرام فرما رہے ہیں اور وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتے

ڈارتھی یہ سب دیکھ کر باپ سے بولی "بابا! پلیز یہاں سے واپس
چلیں نہیں تو اس محل میں میرا دم گھٹ جائے گا جہاں انسان کو انسان سے
ملتے ہوئے منت سماجت سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن مائیکل کا ارادہ
کر چکا تھا کہ وہ ڈارتھی کو اس کے اصل والدین سے ملا کر ہی دم لے گا۔
چنانچہ مائیکل نے اپنی ضد برقرار رکھی اور بیگم رفیق اور رفیق صاحب کو
ملاقات پر آمادہ کر ہی لیا۔ بیگم رفیق کو مائیکل نے اپنے آنے کی وجہ بتائی
اور آج سے چوبیس سال پہلے کا دور یاد دلایا جب اُن کے ہاں لڑکی
پیدا ہوئی تھی اور وہ اسے ہسپتال چھوڑ آئی تھیں ایک نرس کے پاس۔
مائیکل نے ڈارتھی کی طرف اشارہ کیا اور بتایا یہی وہ لڑکی ہے جسے
نرس روزی کے پاس چھوڑا گیا تھا۔

رفیق صاحب اور بیگم رفیق نے قطعی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا
کہ اُن کے ہاں کبھی لڑکی پیدا نہیں ہوئی ان کے صرف دو بیٹے ہیں۔ اس کے
علاوہ وہ کسی بھی روزی نامی نرس سے واقف نہیں۔

دونوں مایوس ہو کر واپس پلٹ آئے۔ ڈارتھی نے مڑ کر کوٹھی
کا جائزہ لیا اور دل میں سوچا کہ اس صاف ستھری اور بڑی کوٹھی کے مقیم
کس قدر گندی ذہنیت اور چھوٹے ذہن کے مالک ہیں۔ جو یہاں تک

نہیں جانتے کہ اُن کی کوکھ سے کتنے پھول کھلے انہیں سوچوں میں غرق وہ گھر پہنچ گئی۔

مائیکل کو بالکل امید نہ تھی کہ اس طرح ناکام اور مایوس لوٹنا پڑے گا۔ اس کا خیال تھا کہ باپ نہ سہی ماں کے ہی دل میں ممتا تڑپے گی۔ لیکن وہاں باپ تو باپ ماں کی ممتا بھی پُرسکون تھی۔ بیٹی کا سُن کر اور بیٹی کو پاس دیکھ کر نہ وہ تڑپی نہ مچلی بلکہ صاف انکار کا پیکر بنی کھڑی رہی۔ مائیکل سارا دن بہت اداس اداس رہا۔ ڈارتھی نے جب باپ کو اس قدر افسردہ و غمگین دیکھا تو بڑی لاپرواہی سے بولی: بابا! اتنی سی بات پر غمگین ہونا مردانگی نہیں۔ حالانکہ مجھے افسردہ ہونا چاہیئے تھا کیونکہ میرے اصلی والدین نے میرے منہ پہ مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا مائیکل نے ڈارتھی کی ہمت کو سراہا اور پیار سے سینے سے لگا لیا۔

ڈارتھی کو جب معلوم ہوا کہ وہ مسلمان والدین کی اولاد ہے تو اس نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ دوسرے دن محلے کی مسجد میں جاکر وہ مسلمان ہو گئی اس نے اپنا نام فاطمہ رکھا۔

عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا اور آئے دن نئی نئی تاریخیں پڑتی جا رہی تھیں۔ دلنواز نے دھمکی دے رکھی تھی کہ کسی دن فاطمہ کو بچوں سمیت اٹھوا لے گا۔ اسی ڈر سے بے چاری سارا دن بیٹھی رہتی۔ شاہنواز اب سات سال کا ہو چکا تھا لیکن ابھی تک سکول اس ڈر سے داخل نہیں کروایا تھا کہ کہیں اس کا باپ اسے اٹھا کر نہ لے جائے۔

فاطمہ انہی مصیبتوں میں گرفتار تھی کہ خدا کو اس کی اور آزمائش منظور ہوئی اس کا باپ اچانک بیمار ہو گیا اور اسے ہسپتال داخل کر دیا گیا۔ اس کے گردے کا اپریشن ہونا مقصود تھا اور اپریشن سے پہلے ایک بوتل خون کی ضرورت تھی۔ لیکن خون خریدتی تو کیسے اس کے پاس تو گھر کا خرچ چلانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ فاطمہ پہلی مرتبہ پیسے مانگنے کی غرض سے گھر سے نکلی اور اپنے تمام رشتے داروں کے گھر گئی کہ شاید کوئی مدد کر دے لیکن کسی نے مدد نہ کی۔

فاطمہ مایوس ہو کر واپس آئی اور سوچنے لگی کہ کیا غریب ہونا اتنا بڑا جرم ہے کہ جو لوگ اسے بیٹی کہتے تھے آج اس بُری طرح دھتکار رہے تھے تین دن تک زندگی موت کی کشمکش کے بعد آخر بوڑھا اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا اور فاطمہ اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی باپ کی بے وقت موت نے اسے نیم دیوانہ بنا دیا وہ سوچتی رہی کہ اب کیا کرے بچوں کو کہاں بھیجے۔ آخر اس نے دلنواز کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا خاوند اعتبار کے قابل نہیں وہ کسی وقت بھی اسے بیچ سکتا ہے یا جوئے وغیرہ میں ہار سکتا ہے لیکن اس نے اپنے آپ کو بالکل اپنی قسمت اور اپنے خدا پر چھوڑ دیا۔ اور چند دن بعد دلنواز کے ساتھ پشاور چلی آئی۔

پشاور پہنچ کر کچھ دن بعد دلنواز گردن توڑ بخار میں بخار میں مبتلا ہو گیا یہ ایک ایسی بیماری تھی جس کی ہوا تک لگنے سے لوگ ڈرتے تھے۔ دلنواز کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ فاطمہ نے شب و روز اس کی خدمت کی....ایک دن جب اسے ذرا ہوش آیا تو اس نے اپنی بیوی سے کہا تم یہاں سے بھاگ جاؤ یہ بیماری تمہیں بھی لگ جائے گی لیکن فاطمہ نے بڑے ملائم انداز میں کہا اب اس سے بڑی بیماری کیا لگے گی کہ تم جیسے سے شادی ہو گئی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ واقعی ہمارے ملک کی عورت عظیم عورت ہوتی ہے۔

اور اب وہ دونوں اغوا شدہ عورتوں کو ان کے گھروں تک پہنچانے کے لئے ایک ادارہ بنائے زبردست جہاد کر رہے ہیں۔

ایک ماہر گڑیا ساز ۔ بابا احمد یار

(ایک مختصر ملاقات)

ف رشید

پچھلے دنوں مجھے فن گڑیا سازی کے ایک ماہر جناب احمد یار سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ احمد یار صاحب پچاس بچپن کی پیٹ میں ہیں۔ وہ ایک ایسے فن کار ہیں جو کاروباری منفعت سے کہیں زیادہ فن کو سنوارنے اور نکھارنے کے متلاشی رہتے ہیں۔ گڑیا سازی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس فن کو معنویت بخشنے کے لئے انہوں نے اکثر جہاں گردی بھی کی ہے اور دور دراز ملکوں میں جا کر فن کے انمول تجربات بھی حاصل کئے ہیں بنیادی طور پر وہ ایک فن کار ہیں ان کا خیال ہے کہ :

فن کا تنزل ایک قوم کا تنزل ظاہر کرتا ہے اس لئے فن کو ایک بلند مقام بخشنا چاہیئے۔ فن کار اپنے فن کے صلے میں صرف حوصلہ افزائی اور داد چاہتا ہے اور جب یہ چیزیں اسے مل جاتی ہیں تو اس کا فن نکھرتا جاتا ہے اور اس قدر روشن ہو جاتا ہے کہ ہر ایک کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالیتا ہے یہی تو فن کی معراج ہوتی ہے۔

فن کی تخلیق کرتے وقت فن کار کا سارا وجود خاص قسم کی حرکات و سکنات کرتا ہے پینٹنگ کرتے وقت آنکھیں، دماغ اور ہاتھ بیک وقت کام کرتے ہیں ڈانس کرتے وقت پورا جسم حرکت کر کے اس کا اظہار کرتا ہے۔ اداکاری کرتے وقت، لکھتے وقت، برتن بناتے وقت غرض ہر قسم کی تخلیق کرتے وقت پورا جسم عمل کرتا ہے۔ اسی طرح احمد یار صاحب جب گڑیاں بناتے ہیں تو ان کے ہاتھ تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور ساتھ ہی نظریں بھی گھومتی ہیں ہر پہلو سے دیکھتے ہیں کہ کہیں کچھ غلطی باقی نہ رہ جائے۔ گڑیوں کی تخلیق پر حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے موصوف جگہ جگہ گھومتے اور مختلف علاقوں کے لباس وغیرہ کو غور سے دیکھتے اور ان کی طرز زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر اس کو اسی انداز میں گڑیا کی صورت میں بناتے ہیں۔

احمد یار صاحب کی گڑیاں ہمارے ملک کے سادہ دیہاتوں اور دیہاتیوں کی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں جب ہم ان کی گڑیوں کو کنوئیں کے پاس کھڑے پانی بھرتے، گھڑے سروں پر بغلوں میں دابے دیکھتے ہیں تو ہماری نظر فوراً پنجاب کی الھڑ مٹیاروں کی تلاش میں گھومنے لگتی ہے۔ اسی طرح دلہن کو ایک مسہری پر بیٹھے شرمائے لجائے انداز میں دیکھتے ہیں اور پاس بیٹھی لڑکیوں کو ڈھولک پر تھاپ لگاتے، تالی بجاتے۔ تو ہم اپنے آپ کو مشرقی دلہن کے بہت نزدیک تقریب تصور کرتے ہیں اور شادی کی رسوم سے بخوبی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ نوجوان لڑکی کی خواہشات بھی اس کے سراپے کی طرح حسین و شاداب ہوتی ہیں وہ پیا کی آس لگائے درخت کے سائے تلے بیٹھی ہے نظریں دروازے پر مرکوز ہوتی ہیں اس ساری کیفیت کو گڑیوں کی صورت میں دکھانا یقیناً ایک بڑا فن ہے۔

چرخہ کا استعمال ہمارے دیہاتوں میں بہت عام ہے اور اکثر

خواتین چرخہ چلاتی اور دھاگہ تیار کرتی ہیں احمد صاحب نے اس دلچسپ شغل کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور اپنے فن سے اس کے ایسے مرقع پیش کئے ہیں جنہیں دیکھ کر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ بابا احمد یار گڑیا سازی میں ایک انفرادی مقام رکھتے ہیں موصوف نے ایک ادارہ لاہور میں کھول رکھا ہے جہاں گڑیاں بنانی سکھائی جاتی ہیں۔ گڑیاں بنانا اور دوسرے ملکوں میں ان کی مارکیٹ بنانا قومی سطح پر بہت مفید کام ہے اس سے ہمارے ملک کی ثقافت دوسرے ملکوں میں روشناس ہوتی ہے اور کسی ملک کی تہذیب و ثقافت ہی اس کی قیمتی متاع ہوتی ہے۔ اسی سے حب الوطنی کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ دوسرے ملکوں میں جو ثقافتی طائفے وغیرہ بھیجے جاتے ہیں اُن میں چند گانے والوں اور رقص کرنے والوں کو بھیج دیا جاتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ بھی ہماری ثقافت کا ایک حصہ ہیں لیکن گڑیا سازی ایک ایسی صنعت ہے جو ہمارے ملک، ہمارے معاشرے ہمارے قصبوں اور دیہاتوں کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ گڑیوں کو پہنائے گئے لباس، ان کے چہروں کے تاثرات اُن کے انداز غرض کہ ہر پہلو ہر رُخ ہمارے ملک کی ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔

احمد یار صاحب سے میں نے ایک سوال کیا کہ کیا آپ صرف یہی کام کرتے ہیں یا کچھ اور بھی کرتے ہیں اور یہ کہ آپ کو گڑیا سازی کا شوق کیونکر ہوا؟ میرا یہ سوال سن کر وہ مسکرائے اور بولے بھئی یہ اتنا دلچسپ کام ہے میں کوئی اور کام کیوں کروں مجھے اسی سے عزت کی روٹی مل جاتی ہے ہاں ویسے شروع شروع میں باہر کے ملکوں میں کام کرتا تھا لیکن مجھے بچپن سے اس شوق کی یہ وجہ ہے کہ میری آیا ایک جاپانی خاتون تھیں اور وہ مجھے بہلانے کے لئے اکثر تخلیقی قسم کی چیزیں بنانی تھیں جس سے مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ چیزیں ضرور اہمیت کی حامل ہیں اور ہماری زندگی میں اہم مقام رکھتی ہیں پھر میری زندگی میں ایک اور واقعہ ہوا وہ کچھ یوں کہ آج سے تقریباً ۲۰ سال قبل میں ایک ایسی نمائش میں گیا جہاں ہاتھ کی بنی ہوئی گڑیاں رکھی گئی تھیں۔ اور ان گڑیوں کی خالق ایک خاتون تھیں اور چونکہ میں شروع سے ایسے کاموں میں دلچسپی لیتا تھا اس لئے میں نے اُن سے ان گڑیوں کی تیاری کے بارے میں پوچھا لیکن انہوں نے میری باتوں پر توجہ نہیں کی اور لاپرواہی برتتی رہیں، مجھے ان کے اس رویے پر از حد دکھ ہوا اور جیسے ایک دھچکا سا لگا کیونکہ انہوں نے میرے اس تجسس کو کہ یہ کس طرح تخلیق کی گئی ہیں درخور اعتنا نہیں سمجھا مگر اگر میں نے اپنے محدود وسائل کی مدد سے اور ذہن میں خود ہی خاکہ سا بنا کر ایک ہفتے کے اندر ہی یہ اعلان کر دیا کہ میں گڑیا بنانی سکھاؤں گا۔ سب رشتے داروں نے میری اس بات کو مذاق کا نشانہ بنایا لیکن میرا شوق مذاق کو فوراً ہضم کر گیا۔ بہر حال مجھے شاگرد اکٹھے کرنے میں کچھ دقت محسوس نہ ہوئی میں نے اپنے شاگردوں کو بہت سستے طریقے سے یہ کام سکھایا یعنی صرف سامان وغیرہ کی قیمت وصول کی اس کے بعد کچھ اور لوگوں نے میرے ساتھ تعاون کیا اور میرا کورس کامیاب ثابت ہوا اور اسکولوں کالجوں کی طرف سے درخواستیں آئیں کہ یہاں آکر ایسا کورس شروع کریں۔ چنانچہ میں نے اس کورس کا اہتمام سارے ملک میں کیا ہر ضلع ہر صوبہ میں ایسے کورس کروائے ملک میں ہی نہیں بلکہ ملک سے باہر جا کر بھی یہ کام سکھایا۔ اور اکثر اس کی نمائشیں وغیرہ بھی کروائیں۔ جو کہ ملک کے تقریباً ہر گوشے میں منعقد ہوئیں اور اس کے علاوہ بیرون ملک بھی نمائشیں کرائیں"

گڑیا سازی کی افادیت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ بچوں کو کچھ سکھانا ہو یا بچیوں کو ان کے مستقبل کی ذمہ داریوں سے روشناس کروانا ہو تو یہ بہترین ذریعہ ہے نہایت مفید اور موثر مشغلہ ہے بچوں کو زندگی گزارنے کے طور طریقے سکھانے میں بھی اس کی افادیت مسلّم ہے نیز اس کے علاوہ عوام میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے اور اعلیٰ انسانی شعور بیدار کرنے کے لئے پتلیوں کا استعمال بہت موثر ہے۔ پتلیوں کی صورت میں دیکھا ہوا ڈرامہ ذہنوں پر نقش ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہماری ثقافت کا اس سے گہرا تعلق ہے احمد یار صاحب کا خیال ہے کہ ہماری ثقافت کا جتنا اظہار ان گڑیوں سے ہوتا ہے، کسی اور فن سے نہیں ہوتا۔

ایک سوال کے جواب میں بولے کہ جب میں گڑیاں بناتا ہوں تو مجھے اس بات کو سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ میری اس تخلیق کو خراب نہیں کیا جائے گا بلکہ قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ آرٹ کے فروغ دینے کے لئے ایک ادارہ ہے جہاں میری گڑیاں رکھی گئی ہیں یہ میرے لئے بہت سکون اور خوشی کا باعث ہے۔

میں نے پوچھا آپ کس قسم کے لوگوں کو یہ فن سکھا کر خوشی محسوس کرتے ہیں؟ وہ بولے "مجھے یہ بتاتے ہوئے نہایت دکھ ہو رہا ہے کہ میں نے جب کورس شروع کرنے کا اعلان کیا تو کھاتے پیتے گھرانے کی خواتین [illegible] انہوں نے یہ فن سیکھا اور صرف اپنے تک محدود رہنے دیا یعنی سیکھ کر [illegible] مجھے اس سے نہایت دکھ ہوتا ہے [illegible] ضرورت مند لوگ اسے اپناتے [illegible] میں نے اس فن کو اپنایا تو [illegible] اور میں چاہتا ہوں کہ یہ لوگوں [illegible] کام آ سکے۔ میں چاہتا ہوں [illegible] بڑھانے کی خواہش [illegible]

گڑیوں کی تیاری کے لئے آپ کن کن چیزوں کا استعمال [illegible]

"گڑیاں دو قسم کی ہوتی ہیں [illegible] سامان مثلاً کپڑا [illegible] لیکن جو گڑیاں [illegible] برتی جاتی ہے رنگ [illegible] خاص اہتمام کیا جاتا ہے ایسے رنگ استعمال کئے جاتے ہیں [illegible] چل سکیں [illegible]

"ابھی حال ہی میں یورپ کے دورے سے واپس آیا ہوں اور اس دورے کے بعد مجھے اس کی اہمیت کا اور زیادہ شدت سے احساس ہوا ہے۔ یہاں گڑیاں بنانے والوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ چھوٹے سائز کی گڑیاں بنانے پر زیادہ توجہ دیں کیونکہ باہر کے ممالک میں چھوٹے سائز کی گڑیاں بڑے سائز کی گڑیوں کی نسبت زیادہ وقعت اور اہمیت رکھتی ہیں اور دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو کوئی گڑیا بناتا ہے اُسے وقت اور پیسے کو مدِ نظر نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ اس کی کوالٹی اور پیکنگ پر زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ خوبصورت چیزوں کی پیکنگ ان سے بھی زیادہ خوبصورت ہونی چاہیئے تاکہ پہلی نظر میں لوگ اس سے متاثر ہوں۔

میں نے کہا ایک بات جو مجھے نہایت کھٹک رہی تھی اور میں اس بارے میں ہمیشہ ہی سوال کرنے کی خواہشمند رہی ہوں یہ ہے کہ نمائشوں وغیرہ کا اہتمام زیادہ تر ایسی جگہوں پر کیا جاتا ہے جہاں عام آدمی نہیں پہنچ سکتا۔

انہوں نے کہا آپ درست فرماتی ہیں مجھے بھی دکھ ہے کہ یہ نمائشیں وغیرہ ایک مخصوص طبقے کے لئے ہوتی ہیں میرا تو خیال ہے کہ نمائش انہیں [illegible] چاہیئے جو خوشی کے [illegible] ہوں۔ اور یہ ایسی چیزیں [illegible] دیکھ کر [illegible] ہوتے چہرے بھی مسکراہٹ سے کھل اٹھتے ہیں [illegible] جب میں ایک شہر سے دوسرے شہر جاتا ہوں تو [illegible] وہاں کے لوگوں کو معلوم ہوتا ہے [illegible] تو وہ لوگ خوش ہوتے ہیں اور انہیں دیکھ [illegible] ہیں اور ایسے موقعوں پر مجھے دلی مسرت ہوتی ہے کہ میں نے ان کو چند لمحوں کی مسکراہٹ تو دی ایک پل وہ خوش تو ہوئے [illegible] ان لوگوں کا زیادہ حق ہے ان چیزوں پر۔"

[illegible] گڑیا سازی کی صنعت کو فروغ دینے کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟ انہوں نے کہا اگر سرکاری سطح پر گڑیا سازی کی ورکشاپ کا کوئی مستقل اہتمام کیا جائے تو وہ بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ حکومت پاکستان نے تعلیمی نصاب میں گڑیا سازی کو شامل کر لیا ہے۔

میرے خیال میں گڑیا سازی کی قومی اور بین الاقوامی نمائشیں اکثر ہوتی رہنا چاہیئیں اس سے فنکاروں کو نئی راہیں ملتی ہیں اور نئے زاویئے فن میں پیدا ہوتے ہیں۔

مدیر اعلیٰ : بیگم مسرت برکی
مدیر : فضل قدیر
نائب مدیر : سید علی محمد حسینی

ماہِ نو

مارچ - اپریل، ۱۹۷۶ء
جلد: ۲۹ ——— شمارہ: ۲

چندہ سالانہ : نو روپے
فی پرچہ : ڈیڑھ روپیہ

اس شمارے میں

ادارہ مطبوعات پاکستان ـ پوسٹ بکس نمبر ۲۵۵ ـ راولپنڈی
خورشید پرنٹرز، اسلام آباد

ابتدائیہ

مارچ کا مہینہ ہمارے ہاں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ہی وہ زمانہ ہوتا ہے کہ جاڑے کا کیلا پن ختم ہو جاتا ہے، موسم میں بڑی دلربا کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر طرف شگوفے پھوٹنے لگتے ہیں، فصلیں پکنے پر آ جاتی ہیں اور پورے منظر پر ایک گہما گہمی اور ولولے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہماری قومی زندگی میں یہ مہینہ ان تمام باتوں کے علاوہ ایک اور بڑی نوعیت رکھتا ہے۔ اسی مہینے کی ۲۳ تاریخ کو ۳۶ برس قبل لاہور میں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے علیحدہ ملی وجود کے تحفظ و بقا کی خاطر اپنے لئے ایک علیحدہ وطن بنانے کا ایک تاریخی عزم کیا تھا جسے ہماری قومی تاریخ میں قرار داد پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُس مقام پر جہاں یہ تاریخ ساز قرار داد پاس کی گئی، ایک عظیم الشان مینار تعمیر کر دیا گیا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ تنہا ایک مینار اُس قومی خود آگہی کو معنی خیز نہیں بنا سکتا جس کے تحت یہ تاریخی قرار داد تاریخ کا ایک جیتا جاگتا باب بنی۔ اس کے لئے فکر رسا اور مطالعۂ تاریخ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے قوم میں اپنی ملی تاریخ کے تحفظ اور اس میں کدو کاوش کا شوق بھی اب پیدا ہو چلا ہے اور اس کا سہرا بھی عوامی حکومت کے سر ہے کہ اس نے پاکستان کی تاریخ کی تعلیم پر توجہ دینے کے ساتھ بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم حضرت محمد علی جناح کی عظیم و جلیل زندگی کو ایک منارۂ علم و نور تسلیم کرتے ہوئے اس سال کو قائدِ اعظمؒ کا سال قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت نے جو شاندار اقدام کئے ہیں ان سے ہر شخص آگاہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بابائے قوم کی زندگی کے اسرار رموز کو سمجھ کر ہی ہم پاکستان کی ضرورت و غایت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اس نعمتِ عظمیٰ کی بہتر نگہداشت کر سکتے ہیں۔

قائدِ اعظم کے ارشادات اور ان کی تحریروں اور تقریروں کے مجموعوں کے ساتھ ہمیں برصغیر کے غیر مسلم قائدین خصوصاً مسٹر گاندھی کے بیانات اور تقاریر اور دوسری کتب و دستاویز سے بھی استفادہ حاصل کرنا چاہیئے تاکہ ان کی روشنی میں ہم اپنے عظیم رہنما کے بیدار ذہن کو اچھی طرح سمجھیں اور ان کی نکتہ شناسیوں اور حکمت عملیوں کے مفاہیم تک رسائی پا سکیں۔ "ماہِ نو" اپنے قارئین اور لکھنے والوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ بابائے قوم کی عظیم تقاریر کا مطالعہ پیش کریں، ہمارے صفحات حاضر ہیں۔

بلوچستان میں سرداری نظام کا خاتمہ عوامی حکومت کا ایک اور عظیم الشان کارنامہ ہے۔ وزیرِ اعظم نے قوم سے کئے ہوئے ایک اور وعدے کی تکمیل کر دی ہے۔ بلوچستان میں ظالمانہ سرداری نظام دم توڑ چکا ہے اور بلوچی عوام ایک کشادہ اور روشن فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ اب انہیں بھی پاکستان کے دیگر صوبوں کے عوام کی طرح برابر کے حقوق حاصل ہیں اور صحیح آزادی سے بہرہ ور ہیں۔

عوامی حکومت کے دور میں اسلام جس طرح ایک متحرک قوت بن کر ہمارے فکر و عمل میں راہ بنا رہا ہے وہ سب پر عیاں ہے گذشتہ دنوں بین الاقوامی سیرت کانفرنس کا انعقاد بھی عوامی دور کا عظیم کارنامہ ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ سیرت رسولِ انامؐ کے مطالعہ کی تحریک انشاء اللہ مستقبل میں بڑی جاندار تحریک بن کر ابھرے گی جس سے عالمی فکر و نظر میں ایک انقلاب پیدا ہوگا۔ شاید یہ نقطۂ آغاز ہو یورپ کی اسلام کی طرف مراجعت کا۔

ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اپریل کے مہینے کی رعایت سے ہم نے اپنے صفحات کو یادِ اقبالؔ میں سجایا ہے۔ خدا کرے اقبال سے متعلق مضامین قارئین کے لئے مفید اور معلومات افزا ہوں۔

(ف۔ق)

محسنِ انسانیت اور اخلاقِ حسنہ

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

حضرت عائشہ صدیقہ سے ایک صحابی نے پوچھا کہ حضور صلعم کا کردار کیسا تھا؟ فرمایا کانَ خُلُقُہٗ القرآن کہ قرآن پاک آپ کا کردار تھا۔

الہامی صحائف میں قرآن مکمل ترین کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر عمل کرنے والا بھی کامل ترین انسان ہوگا۔ اسی بنا پر اللہ نے رسولِ اکرم کو مخاطب کر کے فرمایا: وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم۔

(کہ آپ بلاریب عظیم کردار کے مالک ہیں)

جب غارِ حرا میں حضور صلعم نے پہلی مرتبہ جبرئیل کو دیکھا تو ڈر گئے۔ جلدی سے گھر پہنچے، اور حضرت خدیجہ سے کہا کہ مجھے گرم کپڑوں سے ڈھانپ دو۔ ساتھ ہی فرمایا کہ اگر ان مافوق الفطرت واقعات کا سلسلہ جاری رہا تو شاید مجھے جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ خدیجۃ الکبریٰ نے جواب دیا۔ "آپ ہمیشہ سچ بولتے، اقربا کی مدد کرتے، یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں پر شفقت فرماتے اور مصیبت زدوں سے ہمدردی کرتے ہیں۔ اس لئے اللہ سدا آپ کے ساتھ رہے گا اور ہمیشہ آپ کی حفاظت کرے گا۔"

(بخاری و مسلم)

حضور صلعم نے بیشتر قبائل اور ہمسایہ ممالک مثلاً ایران، حبشہ، اسکندریہ اور روما کے فرمانرواؤں کو تبلیغی خطوط لکھے تھے۔ قیصرِ روم کی طرف ایک صحابی دحیہ بن خلیفۃ الکلبی حضور کا خط لے کر گیا تھا۔ قیصر نے قاصد سے بہت سی باتیں پوچھیں اور پھر ایک ملازم کو حکم دیا کہ جاؤ شہر میں تلاش کرو اگر کوئی اور عرب مکہ سے آیا ہوا ہو تو اسے پیش کرو۔ اتفاق سے اُن دنوں حضور صلعم کا ایک جانی دشمن ابوسفیان اس طرف بغرض تجارت گیا ہوا تھا۔ اسے دربار میں پیش کیا گیا۔ اور پھر دونوں میں یہ گفتگو ہوئی:-

قیصر: محمدؐ کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: بہت شریف

اس پر قیصر نے کہا: نبی ہمیشہ شریف گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ تاکہ اُن کی اطاعت سے کسی کو عار نہ ہو۔ پھر پوچھا کیا دعوائے نبوت سے پہلے آپ جھوٹ بولتے تھے؟

جواب: بالکل نہیں۔

اس پر کہا کہ جو شخص لوگوں سے جھوٹ نہ بولتا ہو وہ خدا پر کیسے جھوٹ باندھ سکتا ہے؟ پھر پوچھا: کیا یہ شخص عہد و پیمان کا پاس کرتا ہے؟

جواب: ہم نے اسی سال اس سے معاہدہ کیا ہے (حدیبیہ) دیکھیں نتیجہ کیا نکلتا ہے

سوال: اُس کی تعلیم کیا ہے؟

جواب: یہی کہ باپ دادا کے طریقوں کو چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کرو۔ نماز قائم کرو۔ سچ بولو۔ اپنے دامن کو پاک رکھو اور صلہ رحمی کرو۔

چند اور سوالات بھی پوچھے جن کے جواب سن کر ہرقل نے کہا کہ ہم کو آنے والے نبی کی یہی علامتیں بتائی گئی ہیں یہ تو ہمیں یقین تھا کہ اس نبی کا ظہور ہونے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں ہوگا۔ اے ابوسفیان اگر تمہاری باتیں صحیح ہیں تو وہ نبی جلد اس مقام کا جہاں آج میں ہوں مالک بن جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن سلام یہودیانِ مدینہ کے علماء میں شمار ہوتے تھے اور عربی شعر و ادب میں بڑی دسترس رکھتے تھے۔ ایک دن مسجدِ نبوی کے پاس سے گزرے۔ اس وقت حضور صلعم وعظ فرما رہے تھے یہ رک کر سننے لگے جب حضور کی زبانِ مبارک سے یہ کلمات نکلے :-

أَيُّهَا النَّاسُ أَفْشُوا السَّلَامَ وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَ
صِلُوا الْأَرْحَامَ وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ

(اے لوگو! سلام میں پہل کرو، غربا کو کھانا کھلاؤ،
رشتہائے قرابت کو محکم کرو اور جب لوگ رات کو سو رہے
ہوں تو تم نماز پڑھو)

وہ ان جملوں کی فصاحت و شعریت اور مضمون کی عظمت سے اتنا متاثر ہوئے کہ اسلام لے آئے اور صحابۂ کبار میں شمار ہونے لگے۔

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ جبار بن سلمیٰ کا ہے یہ شخص نجد کے امیر طفیل کا درباری تھا۔ جب حضور صلعم کا ایک قاصد حرام بن ملحان، طفیل کے ہاں پہنچا تو اسے جبار بن سلمیٰ کو جو سفیر کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اشارہ کیا اور اس نے پشت میں اس زور سے نیزہ مارا کہ وہ جگر کو چیر کر نکل گیا اس پر سفیر کے منہ سے بے ساختہ نکلا :-

فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَة۔

(ربِ کعبہ کی قسم کہ میں جیت گیا ہوں)

اس جملے کی فصاحت سفیر کے شوقِ شہادت اور مضمون کے تقدس سے قاتل اتنا متاثر ہوا کہ اسلام لے آیا۔

یہ تو بہت دور کی باتیں ہیں۔ آج سے تیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ انگلستان کے چرچ نے ایک نوآموز پادری کو عربی سیکھنے کے لئے دمشق میں بھیجا تاکہ اسے عرب ریاستوں میں کہیں لگایا جائے ڈیڑھ دو برس میں وہ عربی زبان کی لطافتوں سے آشنا ہوگیا ایک صبح اس نے ریڈیو کھولا تو قاری ان آیات کی تلاوت کر رہا تھا۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا وَخَلَقْنَاكُمْ
أَزْوَاجًا وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا۔

وہ ان آیات کے آہنگ، انداز اور ترنم سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی روز مسلمان ہوگیا۔

حضور کے قیامِ مکہ کے زمانے میں قریش نے حضور کو تنگ کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی تھی جس کا سردار ابولہب تھا اور مکہ کے ۲۵ دیگر سرکردہ افراد اس کے ممبر تھے۔ ایک مرتبہ کمیٹی کے سامنے یہ سوال پیش ہوا کہ باہر سے آنے والوں کو محمد کے متعلق کیا کہا جائے ایک نے تجویز کی کہ انہیں کاہن کہا جائے مکہ کے مشہور سردار ولید بن مغیرہ بول اٹھا کہ غلط کاہنوں کی تک بندیاں کجا اور محمد کا فصیح و مربوط کلام کجا۔ اگر ہم نے اسے کاہن کہا تو قبائل عرب ہمیں جھوٹا سمجھیں گے۔

ایک اور رکن نے کہا کہ اسے دیوانہ کہیں ایک اور بولا کہ اس پر جادوگری کی تہمت لگائیں۔ ولید نے کہا کہاں جادوگروں کی منحوس شکلیں اور نجس عادتیں، کجا محمد کا روشن چہرہ اور دلکش عادات۔ اس کے کلام میں اتنی حلاوت ہے کہ اسے سن کر بھائی بھائی کو چھوڑ دے اور شوہر و زن میں جدائی پڑ جاتے۔

سفرِ ہجرت میں جب حضور غارِ ثور سے نکل کر آگے بڑھے اور بھوک نے ستایا تو آپ ایک بڑھیا امِ معبد کے خیمے میں جا پہنچے اور پوچھا کیا کھانے کو کوئی چیز ہے؟ کہا کچھ نہیں صرف یہ سوکھی بکری ہے تو بس حضور نے برتن مانگا اور اسے دوہنا شروع کر دیا۔ وہ برتن تین دفعہ بھر گیا۔ حضور اور حضرت صدیق نے ایک ایک پیالہ پیا اور باقی امِ معبد کے لئے چھوڑ گئے۔ جب اس کا شوہر واپس آیا تو اس نے ساری حکایت سنائی اور حلیہ پوچھنے پر بتایا :-

چہرہ روشن، آنکھیں سیاہ و فراخ، بال گھنے، کلام شیریں،

اَجْمَلُ النَّاسِ وَاَبْہاھُم مِن بَعِیدٍ وَاَحْسَنُہُم وَاَحْلاھُم مِن قَرِیبٍ

(دور سے دیکھو تو حسین و دلفریب، قریب سے نظر ڈالیں تو شیریں و جمیل)

حضور صلعم ہر شخص سے حسبِ مراتب سلوک کرتے تھے ایک مرتبہ جب قبیلہ طے نے بغاوت کی اور تمام باغی گرفتار ہو کر حضورؐ کی خدمت میں پیش ہوئے تو اُن میں مشہور فیاض حاتم کی لڑکی بھی تھی۔ اُس نے کہا کہ میں حاتم کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ جود و کرم میں مشہور تھا۔ وہ غریبوں کو کھانا کھلاتا اور بے نواؤں کی مدد کرتا تھا یہ سن کر حضورؐ نے اُس کی طرف اپنی چادر پھینکی کہ وہ اپنے آپ کو ڈھانپ لے پھر زادِ راہ اور کچھ کپڑے دے کر اُسے تمام دیگر اسیروں سمیت واپس بھیج دیا۔

حضورؐ کے انکسار کی یہ کیفیت تھی کہ جب خیبر میں فاتحانہ داخل ہوئے تو آپ ایک گدھے پہ سوار تھے جس کی گردن میں رسّی کی جگہ کھجور کی ایک پتلی سی ٹہنی بندھی ہوئی تھی اور فتح مکہ کے بعد شہر میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آپ کے اونٹ پر آپ کے آزاد کردہ غلام زید کا بیٹا اُسامہ سوار تھا آپ کے رحم و عفو کی بے شمار کہانیاں اوراقِ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ لوگوں نے ہر قسم کی ایذا دیں۔ لیکن آپ کی زبان سے نہ کوئی شکایت نکلی اور نہ کوئی بد دُعا۔

امام غزالی کیمیائے سعادت میں (طبع نول کشور صفحہ ۲۸۰) میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلعم مویشیوں کو چارہ خود ڈالتے، دودھ خود دوہتے بعض اوقات گھر کی صفائی خود کرتے۔ بازار سے اشیائے خورد و نوش خود خریدتے اور خود ہی اٹھا کر لاتے۔ ہر خرد و بزرگ کو پہلے سلام دیتے۔ صبح کے کھانے سے شام کے لئے کچھ نہ بچاتے۔ نیک خو، کریم الطبع اور کشادہ رو، متواضع، باہیبت، رحیم، فیاض، شیریں سخن، گندی بات سے متنفر اور بد کلامی سے مجتنب تھے ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ آپ دشمنوں کے لئے بد دعا فرمائیں فرمایا:

اِنّی لَمْ اُبْعَثْ لَعّاناً وَلٰکِن دَاعِیاً وَرَحْمَۃً

(میں لعنت برسانے کے لئے نہیں آیا بلکہ داعی و رحمت بنکر بھیجا گیا ہوں)

آپ صدقہ کی کوئی چیز پاس نہ رکھتے، بلکہ پاس بیٹھنے والوں میں تقسیم کر دیتے۔

عفو و رحم

جنگِ بدر میں ستر قیدی پکڑے گئے تھے۔ حضور نے سب کو رہا کر دیا۔ بنو المصطلق کی جنگ میں جو پانچویں یا چھٹے سال ہجری میں ہوئی تھی، سو قیدی ہاتھ لگے تھے۔ قیامِ حدیبیہ میں کوہِ تنعیم کے اسّی باشندوں نے حضورؐ پر حملہ کیا تھا۔ سب کے سب پکڑے گئے تھے۔ فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین میں چھ ہزار آدمی گرفتار ہوئے تھے حضورؐ نے سب کو رہا کر دیا اور دنیا کو اپنے عمل سے سمجھایا کہ عفو و رحم اور درگذر کے بغیر دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

حضور صلعم کے چند ارشادات

۱۔ سلطان جابر کے سامنے سچ بولنا سب سے بڑا جہاد ہے (ترمذی)

۲۔ میں اور یتیم کی پرورش کرنے والے جنت میں یوں ہوں گے جیسے یہ دو انگلیاں (بخاری)

۳۔ دیانتدار تاجر نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالح لوگوں کے ہمراہ ہوگا۔ (ترمذی)

۴۔ بہترین مومن وہ ہے جس کا کردار پسندیدہ ہو (ابو داؤد)

۵۔ اگر کوئی حاکم لوگوں کی ضروریات سے آنکھیں بند کرے گا تو اللہ قیامت کے دن اُس کی ضروریات و حاجات سے منہ پھیرے گا (ترمذی)

بات لمبی ہو رہی ہے اس لئے میں اسے شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابت کے اس شعر پہ ختم کرتا ہوں۔

خُلِقْتَ مُبَرَّاً مِن کُلِّ عَیْبٍ
کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

(تو ہر عیب سے پاک پیدا ہوا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ جیسے چاہتے تھے، ویسے ہی پیدا ہوئے ہ)

ذکرِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ظہور ملک

پچھلی راتوں کی قسم
چاند ستاروں کی قسم
آہِ سوزاں کی قسم
غم کے ماروں کی قسم
پچھلے پہروں کے نظاروں کی قسم
صبحِ صادق کی قسم
بدرِ ہلال کی قسم
ابھرے خورشید کی کرنوں کی قسم
نورِ درخشاں کی قسم

★

اس دنیا میں
پھیلی ہوئی تھی
ظلمت ہر سو
نفرت ہر سو
نخوت ہر سو
بدبختی کا
چرچا ہر سو

گھر گھر میں تھی
پوجا بتوں کی
ہر اک جانب
شرک تھا پھیلا
دھندلا نقش تھا
کچھ وحدت کا

★

زیرِ فلک اک مُلکِ عرب
دنیا سب سے الگ تھی جس کی
چٹیل ساری زمیں تھی جس کی
ریت کے ٹیلے صحرا صحرا
پھیلے ہر سُو خارِ مغیلاں
حسرت، وحشت جنگل جنگل
ڈھونڈے سے ملتا نہ تھا پانی
اور نہ کہیں تھا نام کو سبزہ
زیرِ فلک اک مُلکِ عرب وہ
لوگ وہاں کے

وحشی وحشی
ذکر خدا کا
کوئی نہ کرتا
کرتے تھے
ہر بات پہ جھگڑا
نام انصاف کا تھا نہ باقی
جس کو دیکھو وہ فریادی
زخموں کا مرہم درد کا درماں
چارہ گروں کے پاس کہاں تھا
زیرِ فلک اک مُلکِ عرب

★

ہر ہر قریہ، ہر ہر بستی
ذلت، نفرت اور نخوت تھی
کیسا تمدن، کیسی ترقی
نام کو یہ شے ملتی نہیں تھی
گھر گھر رندی اور مستی تھی
ہر جانب پستی پستی تھی
غفلت تھی دیوانہ پن تھا
ایسا ہی کچھ ان کا چلن تھا

★

خطۂ پاک وہ ہے بطحا کا
اُبلا جہاں سے چشمہ ہدیٰ کا
پھیلا جہاں سے نور خدا کا
لیکن مہرِ منور واں پر
ظلمت کے بادل میں چھپا تھا
لوگ وہاں کے
کرتے تھے وہ ناگ کی پوجا
سورج چاند اور آگ کی پوجا
پیدا کوئی جو بیٹی ہوتی
موت کی نیند سلاتے وہ اس کو

★

یاد نہ تھا پیماں کوئی بھی —— ان کو
مالک کا احساں کوئی بھی —— ان کو
کچھ نہ خبر تھی ان کو ازل کی
کچھ نہ پتہ تھا ان کو ابد کا
اس صحرا کا
حال تھا کیسا
خطۂ پاک وہ ہے بطحا کا

★

دنیا کا یہ پیارا گلشن
جس میں
یوں تو آئیں کتنی بہاریں
ایسا منظر کب دیکھا تھا
محفلِ ہستی ایسی سجی تھی
سب خلقت حیران ہوئی تھی
یہ دن —— کتنا مبارک دن ہے
جس کی خاطر
پیرِ فلک نے
لاکھوں سال گذارے تھے
لیکن —— لیکن
—— لیل و نہار نے بدلے تھے
سینکڑوں پہلو

اور جس کے لئے ازل سے چشم براہ تھے سیارگانِ فلک
یہ دن — کتنا مبارک دن ہے
جس کے لئے قدرت نے ہر سُو
کیسی حسین تھی
بزم سجائی

★

نورِ براہیمیؑ کا جلوہ
حسنِ یوسفؑ اور دمِ عیسیٰؑ
اور یہ ساری متاعیں تھیں فقط
سرورِ عالمؐ کے لئے
یہ دن — کتنا مبارک دن ہے
جس کی ساعتِ نیک اختر میں
سب قیصر و کسریٰ کے ایوان جو تھے
گر گئے ان کے چودہ کنگرے
اور مسمار ہوئے سارے محل
خشک ہوا دریا ساوہ کا
آتشِ فارس سرد ہوئی
لیکن — سنو اب غور سے
ایوانِ کسریٰ ہی نہیں
شوکتِ روم اور راوجِ عجم
پندار کے سارے راج محل
خاک میں مل کر خاک ہوئے
بُت خانے پائمال ہوئے
یہ دن — کتنا مبارک دن ہے

★

اس خزاں دیدہ چمن کو اک بہارِ نَو ملی
شمع پھر روشن ہوئی
اور ہدایت کی یہ کرنیں
ہر طرف تھیں خیمہ زن
جگمگا اٹھا چمن
صبحِ نُوظاہر ہوئی
پھر چلی بادِ نسیم
پھر گونجا ہر سُو — نعرۂ ہُو

★

وہ صاحبِ لولاکؐ
وہ ہادیٔ برحقؐ
وہ مالکِ کونینؐ
پیغمبرِ آخرؐ
وہ رحمتِ عالمؐ
وہ روحِ حقیقت
وہ صادقِ دوراں
مسجودِ ملائک
فرمودۂ یزداں
وہ بولتا قرآں
اس پہ درود
اس پہ سلام
اس پہ درود
اس پہ سلام
صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم

نبیؐ پر صلوٰۃ و سلام

عبدالرحمٰن طاہر سورتی

قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام کا حکم دیا گیا ہے۔

اِنّ اللّٰہ و ملٰئکتہٗ یصلّون علی النبی یا ایھا الّذین آمنوا صلّوا علیہ وسلّموا تسلیماً۔

ترجمہ۔ بیشک اللہ اور اس کے فرشتے صلوٰۃ بھیجتے ہیں نبیؐ پر۔ اے مومنو! تم بھی ان پر صلوٰۃ بھیجو اور خوب سلام بھیجو۔

(الاحزاب ۳۳ - ۵۶)

صلوٰۃ کے لغوی معنی

"صلوٰۃ" کا ترجمہ اردو فارسی میں "درود اور نماز" کیا جاتا ہے۔ عربی میں صلوٰۃ کے معنی دعا ہیں اور برکت و رحمت بھی، مغفرت اور استغفار بھی، ثنا اور تعریف بھی تعظیم کرنا اور مہربانی کرنا بھی۔ عربی کی مشہور لغت القاموس کے مصنف علامہ فیروزآبادی نے اپنی تالیف "الصلات والبشر فی الصلوٰۃ علیٰ خیر البشر" میں تفصیل سے "صلوٰۃ" کے معنی پر بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس لفظ "صلاۃ" کا اشتقاق "صلی" سے ہے جس کے معنی آگ ہیں اور جب ہم عصا یا بید کو آگ دکھا کر سیدھا اور ہموار کرتے ہیں تو عربی میں اس عمل کے لئے "صلیت العصا" بولتے ہیں۔ گویا نماز پڑھنے والا "مصلی" نماز "صلوٰۃ" کے ذریعہ اپنے ظاہر و باطن کو سیدھا کرنا اور سدھارنا چاہتا ہے۔

"صلوٰۃ" کا ایک مفہوم وابستگی، ساتھ رہنا، جدا نہ ہونا اور چمٹے رہنا بھی ہے۔ "تصلّی نارًا حامیۃ" اور "سیصلٰی نارًا ذات لھب" میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے۔ یعنی آگ میں رہنا اور اس سے جدا نہ ہونا۔ گھوڑدوڑ میں اول آنے والے گھوڑے سے متصل جو گھوڑا دوسرے نمبر پر آتا ہے اسے بھی اسی لئے مصلّی کہا جاتا ہے کہ وہ اول سے ملا ہوا رہتا ہے۔

علامہ فیروزآبادی نے صلوٰۃ کے مادہ "ص ل و" کے الٹ پلٹ کر بننے والے جملہ مادوں مثلاً و ص ل، ص ل و، وغیرہ کو سامنے رکھ کر اس مادہ کے ایک بنیادی معنی جمع ہونا، یکجا اور اکٹھا ہونا، جم جانا اور اجزا کا باہم گڑ ملا ہوا ہونا بتائے ہیں اور اوپر درج شدہ تمام معانی میں اس مرکزی نقطہ کو واضح کیا ہے۔

صلوٰۃ علی النبی: اپنی مذکورہ بالا کتاب میں علامہ فیروزآبادی آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر "صلوٰۃ" کے معنی کی تلخیص یوں کرتے ہیں:

"جب تم محمدؐ پر صلوٰۃ بھیجتے ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بزرگی و عظمت عطا فرما اس طرح کہ آپ کا ذکر اور آپ کی شہرت بلند کر، آپ کی دعوت کو غالب فرما اور آپ کی شریعت کو بقا بخش اور آخرت میں آپ کو اپنی امت کا شافع بنا اور آپ کو بڑا اجر و ثواب عطا فرما اور اگلوں اور پچھلوں پر آپ کی فضیلت و برتری کو سرفرازیِ مقام محمود کے ذریعہ ظاہر فرما، اور آپ کو اپنے تمام مقربین اور اپنے دربار میں حاضر رہنے والوں پر فوقیت بخش۔

سلام کا لغوی مفہوم

"سلام" سے مراد ہر قسم کی خامیوں کوتاہیوں سے پاک صاف ہونا کرنا ہیں۔ امام راغب نے سلام کے معنوں میں لکھا ہے:

"سلام" کے معنی بغیر فنا کے بقا، بغیر فقر و احتیاج کے غنا، بغیر ذلت و شکست کے عزت و سربلندی اور بغیر روگ کے صحت و تندرستی ہیں۔"

سلّموا تسلیما

علامہ فیروزآبادی اپنی مذکورہ بالا کتاب میں محمدؐ پر سلام کے معنی مختصراً یوں بیان کرتے ہیں:

"اللھم سلم علی محمد" سے مراد یہ ہے کہ اے اللہ آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، آپ کی امت، اور آپ کی شہرت کو ہر نقص وعیب سے پاک صاف رکھنے اور زمانہ کے گذرنے کے ساتھ ساتھ آپ کی دعوت غالب و بلند ہوتی جائے، آپ کی امت بڑھتی چلی جائے اور آپ کی شہرت اور ذکر بلند ہوتا جائے۔

دعا

"صلوٰۃ و سلام" کے یہ مختصر معانی ذہن میں رکھنے کے بعد سب سے پہلے دعا کا مفہوم ابھر کر سامنے آتا ہے۔ دعا ہم اس سے مانگتے ہیں جسے ہم اپنی قوتوں اور طاقتوں پر غالب جانتے ہیں اور دعا اس کے لئے مانگتے ہیں جس سے ہمیں کچھ بھلائی اور خیر پہنچتی ہو یا اس کی توقع ہو یا پھر اس کے لئے جس کے احسانات سے ہمارے دل اس کی محبت و عقیدت سے پر ہوں یا پھر جس کے لئے ہمارے دل میں نیک تمنائیں ہوں اور ہم اس کی بھلائی اور منفعت و مصلحت کے خواہاں ہوں۔

دعا کا واقعی اور عملی پہلو یہ ہے کہ جس کام کے لئے دعا کی جائے ایک طرف تو اپنے قول و فعل اور دل سے کسی طرح بھی اس کی مخالفت نہ کی جائے، دوسری طرف اس کام کو مکمل کرنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لے آنا ضروری ہے۔ مثلاً اگر آپ اپنی کھیتی کو زرخیز و شاداب دیکھنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنی تمام معنوی و مادی صلاحیتوں سے اسے زرخیز بنانے میں کوشاں ہو جائیں اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ آپ کو مزید توفیق بخشے اور آپ کی محنت کا پورا پورا پھل عطا فرمائے۔

صلوٰۃ وسلام کا تقاضا

اس مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے کے لئے اولین اقدام یہ ہونا چاہئیے کہ ہم پوری طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ دعوت اور آپ کی عطا کردہ تعلیمات کی خوبیوں کو معلوم کریں، ان خوبیوں کو دنیا میں پھیلتا، پھلتا اور پھولتا دیکھنے کے لئے اپنی تمام مساعی وقف کر دیں، اپنے ہر عمل سے اس خیر و فلاح کو تقویت پہنچائیں جس کو پھیلانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر جد و جہد کرتے رہے، لا الٰہ الا اللہ کو اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں کارفرما کریں، اس کلمہ کی تفسیر یعنی "قرآن مجید" کے افہام و تفہیم پر توجہ دیں، اپنی آئندہ نسل کو ایسی تعلیم دیں جس کی اساس اس کتاب عظیم پر ہو جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور سیرۃ طیبہ کا مدار رہا، دین کے بلند و اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لئے امت سے تشتت و تحزب ختم کر کے اسے متحد کریں، اس لئے کہ جو دین میں تفریق کر کے فرقہ فرقہ ہو جاتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا (دیکھئے سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۹، إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ)

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا بہت بڑی ذمہ داری ہے اس کو پورا کرنے کے لئے پہلا کام تو یہ ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ احسانات اور کارنامے یاد رکھنے چاہئیں جو انہوں نے اللہ کے نام سے انسانیت کو سربلند کرنے کے لئے انجام دیئے۔ شیخ سعدی نے اپنی رباعی میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

بلغ العلیٰ بکمالہ ۔ کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ ۔ صلوا علیہ وآلہ

ثانیاً ہماری پوری جد و جہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق قرآن مجید کے اصولوں سے متجاوز نہ ہو ورنہ صلوٰۃ وسلام محض زبانی عمل ہوگا جس کی تائید عمل سے نہ ہو سکے گی۔ شاید اسی صورت حال پر ہی علامہ اقبال شرمسار کر رہے ہیں۔

چوں بنام مصطفےٰ خوانم درود
از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ محکوم غیر
سینۂ تو از بتان مانند دیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بو
از درود خود میالا نام او

سرچشمۂ آبِ بقا

عبدالغنی شمس

حقیقت کو حقیقت برملا کیسے نہ اب کہیئے — رُخِ گل دیکھ کر صلِّ علیٰ کیسے نہ اب کہیئے

بُرا ہو حسرتِ اظہار کا، اے دردِ ناکامی — کہ غیروں سے کبھی دل کا مدعا کیسے نہ اب کہیئے

مَلک جسکی تجلّی دیکھ کر حیران رہ جائیں — اسے قندیلِ عرشِ کبریا کیسے نہ اب کہیئے

جو ذروں کو بڑھا دے تاب و تب میں مہرِ روشن سے — اسے برقِ سرِ کوہِ صفا کیسے نہ اب کہیئے

جو انسانوں کو، انسانی شرف سے آشنا کر دے — اسے سرحلقۂ صدق و صفا کیسے نہ اب کہیئے

لُٹا دے راہِ حق میں، جو خوشی سے خانماں اپنا — اسے سرنامۂ اہلِ عطا کیسے نہ اب کہیئے

جو اجزائے حیاتِ بقا کو سرمدی کر دے — اسے سرچشمۂ آبِ بقا کیسے نہ اب کہیئے

ملا دے خاک کی چٹکی کو جو اجرامِ گردوں سے — اسے آئیں شناسِ ارتقا کیسے نہ اب کہیئے

جو اسرارِ حق و باطل کو نظروں پر عیاں کر دے — اسے مہرِ عروجِ اتّقا کیسے نہ اب کہیئے

مٹا دے جو من و تو کا اندھیرا بزمِ ہستی سے — اسے انسانیت کا آسرا کیسے نہ اب کہیئے

لقب جس کو ملا ہو "رحمتِ عالم" کا دنیا میں — اسے مقصودِ ہر شاہ و گدا کیسے نہ اب کہیئے

جو خود بھوکا رہے، کھانا کھلا دے اپنا اوروں کو — اسے صد نازشِ جود و سخا کیسے نہ اب کہیئے

ہجومِ دردِ غم میں بھی، دعا ہو جسکے ہونٹوں پر — اسے اک پیکرِ صبر و رضا کیسے نہ اب کہیئے

چراغِ راہ ہو نقشِ قدم جس کا زمانے میں — اسے غیرتِ دہ بدرالدجیٰ کیسے نہ اب کہیئے

جہاں میں حق کے اجزا جس کی سیرت سے مرتب ہوں — اسے انساں سے کچھ ماسوا کیسے نہ اب کہیئے

بہ فیضِ وحیِ ربانی، نرالی شان رکھتا تھا — ہمہ اوقات وہ پیشِ نظر قرآن رکھتا تھا

نعتیں

قمر احمد عثمانی

پائے ناز پر سر تھا، رات میں جہاں پر تھا
اوج پر مقدر تھا، رات میں جہاں پر تھا

نور کا سمندر تھا، رات میں جہاں پر تھا
اِک عجیب منظر تھا، رات میں جہاں پر تھا

وہ سکون کے لمحات، وہ سکوت کا عالم
کتنا روح پرور تھا، رات میں جہاں پر تھا

ایک عالمِ بےچوں، اِک مقام بے اطراف
ایک قصرِ بے در تھا، رات میں جہاں پر تھا

حور در بغل میکش، شیشہ در بغل حوریں
دورِ جامِ کوثر تھا، رات میں جہاں پر تھا

میرے خیر مقدم کو، میری پیشوائی میں
قدسیوں کا لشکر تھا، رات میں جہاں پر تھا

شش جہات کی دنیا، ممکنات کا عالم
میرے زیرِ شہپر تھا، رات میں جہاں پر تھا

سیم تن، پری چہرہ، سرو قد، صبا رفتار
کوئی حور پیکر تھا، رات میں جہاں پر تھا

میہماں شہِ بطحاؐ اور میزباں اُن کا
خود خدائے برتر تھا، رات میں جہاں پر تھا

✶

خورشید انصاری

فروغِ روحِ عالم بن کے گلشن میں بہار آئی
ہوئے قدوسیانِ عرشِ اعظم پھر تماشائی

یہ کس گل کے لئے یوں کی گئی ہے گلشن آرائی
زمیں پر آسماں سے آج تو جنت اتر آئی

منور کس کی آمد سے ہوا یوں گلشنِ عالم
کہ ہر موجِ صبا انوار کے دریا بہا لائی

وہ اِک نورِ مجسم، حسنِ مطلق، مالکِ تقویٰ
وہ اِک آئینۂ ایثار و تصویرِ شکیبائی

وہ بزمِ قدس کی قندیلِ روشن لمعۂ تاباں
عرب کی سرزمیں نے جس کے جلوؤں سے ضیا پائی

سراپا اِک مکمل عکس تو نورِ حقیقت کا
جمالِ حق کا آئینہ ترے جلوؤں کی رعنائی

تری معصوم نظروں میں خزانے نورِ ایماں کے
لبِ معجز نما میں تیرے اعجازِ مسیحائی

یتیموں نے ترے الطاف سے ہمدردیاں پائیں
اسیروں نے ترے آغوش میں جاکر اماں پائی

سبق توحید کا تو نے دیا ہے اہلِ عالم کو
ترے نقشِ قدم سے کہزاروں پر بہار آئی

تکبر سے نہیں جھکتے تھے جو دربارِ خالق میں
انہیں لوگوں میں پیدا کر دیا ذوقِ جبیں سائی

عرب کی دھوپ میں تو جس کو سر پہ اوڑھ لیتا تھا
فلک والوں سے پوچھے کوئی اس کملی کی رعنائی

چھپا لیجو اسے بھی حشر کے دن اپنے دامن میں
ترا خورشید جب تربت سے اُٹھے لے کے انگڑائی

نشیدِ حرّیت

شریف الحسن

آزادیِ وطن نے نئی رُوح پھونک دی عہدِ کہن کی خستگیِ جان و تن گئی

صد شکر رائگاں نہ گیا خونِ کشتگاں شاخِ فسُردہ نخلِ برومند بن گئی

بارِ دگر ہے امّتِ مرحوم کو نصیب

عزمِ بلند، شوقِ جواں، فہمِ چون وچیست طبعِ سلیم، ذوق وجمال، انبساطِ زیست

حرفِ غلط ہے تفرقہ، ممکن و محال

صدقِ طلب ہے آپ ہی حلّالِ مشکلات

خیر الامم ہے تجھ سے عبارت نژادِ نو

دستِ رسا بڑھا پئے تسخیرِ کائنات

(انقرہ ۲۳ مارچ ۱۹۶۴ء یوم پاکستان)

حصول پاکستان کیلئے مسلمانوں کی جدوجہد

ایک جائزہ

سعید احمد

آج سے ۲۹ برس قبل پاکستان کا معجزانہ قیام عمل میں آیا جس سے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ وطن میسر آیا اور انگریزوں کی غلامی سے آزادی اور ہندوؤں کے دائمی غلبہ سے نجات حاصل ہوئی۔ یہ سب کچھ مسلمانوں کے اتحاد اور یگانگت کا نتیجہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان اپنے اتحاد اور قومی یکجہتی ہی کی بدولت اپنے ثقافتی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی اقدار کا تحفظ کرنے کے لئے اپنا ایک علیحدہ وطن بنانے کے قابل ہوگئے۔

دراصل بیسویں صدی کے اوائل ہی میں مسلمانوں نے ہندوؤں کی تنگ دلی اور حکمرانی کی درون پردہ تمناؤں کے پیش نظر اپنے لئے ایک علیحدہ وطن حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور مستقل جدوجہد کے بعد اس مقصد کی تکمیل اور حصول کے لئے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے پاکستان کے قیام کا واضح تصور پیش کیا۔ یہ قرارداد پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات اور جذبات کی عکاسی تھی۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری مسلم قوم ایک آہنی دیوار بن کر کھڑی ہوگئی اور صرف سات سال کے عرصہ میں مسلمانوں کے ہمہ گیر اتحاد و یگانگت اور ناقابل فراموش قربانیوں نے انہیں منزل مقصود سے ہم کنار کر دیا۔ ہندوؤں اور انگریزوں کی مخالفت اور ناپاک عزائم مسلمانوں کے پختہ ارادوں کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔

مسلمانوں کے مابین ایک مضبوط اتحاد کی تحریک

سید جمال الدین افغانی نے عالم اسلام کو مغربی تسلط کے خطرے کے خلاف متحد کرنے کیلئے شروع کی تھی اور فرمایا تھا کہ مغرب کا وہ مذہبی جوش جو صلیبی جنگوں میں کارفرما تھا، اب بھی موجود ہے اور مغربی پالیسی کے پس پردہ ایک محرک طاقت کی حیثیت سے بہت زیادہ پوشیدہ ہے۔ ان لوگوں نے اس طاقت کو اور زیادہ بڑھا کر اسلام پر جارحیت برقرار رکھی ہے۔ خود ان کے ادب میں اسلام کے بارے میں نفرت اور تمسخر سے بھرپور تحریریں نظر آتی ہیں۔ اس بے جا مخالفت سے قبل مسلمانوں کو ایسا کوئی موقع نہ ملا تھا کہ وہ اپنے دفاع کے لئے متحد ہوتے لیکن اب یہ نہایت ضروری ہوگیا ہے کہ ملت اسلامیہ مل کر اس حملے کا جواب دے۔

جمال الدین افغانی نے پورے عالم اسلام کو اتحاد کا جو راستہ دکھایا تھا برصغیر میں اس کا واضح نتیجہ سر سید احمد خان کے عمل سے ظاہر ہوا۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد کے سنگین حالات میں ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی۔ اس جنگ کے بعد مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہوگیا تھا ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے اور بڑے ہولناک حالات سے دوچار ہونا پڑا ایسے وقت

ہیں سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی بے چارگی کو شدت سے محسوس کیا اور ان کے مستقبل کو سنوارنے کا بیڑا اٹھالیا۔ سر سید کو مسلمانوں کو علمی میدان میں آگے بڑھانے اور ان کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑی اگرچہ حالات بڑے مایوس کن تھے لیکن سر سید نے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی مسلم کش حکمت عملی سے باخبر کیا اور سیاسی بیداری پیدا کی۔

سر سید ہی نے پہلی مرتبہ مسلمانوں کے علیحدہ قوم ہونے کا تصور سیاسی طور پر اجاگر کیا تھا وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ایسی دو قومیں جو ایک ساتھ مل کر کبھی نہ رہ سکتی ہوں باہم آہنگی کے ساتھ حکومت نہ کر سکتی ہوں دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے اور نقصان پہنچانے کے درپے رہیں گی۔

۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو اس نے مسلم کش پالیسی اختیار کی۔ لیکن سر سید نے قوم پرست کانگریس کے عزائم کو پوری طرح بھانپ لیا تھا اور انہوں نے نیشنل کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کی بھرپور مخالفت کی۔ سر سید نے خیال ظاہر کیا کہ اگر کانگریس کی قراردادوں نے عملی شکل اختیار کر لی تو انگریز حکومت کے لئے اس وقت امن قائم رکھنا اور خانہ جنگی کو روکنا ناممکن ہو جائے گا۔

چونکہ کانگریس کی پالیسی ابتدا ہی سے ہندو نواز تھی اس لئے سر سید نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ آپس میں تفریق کو مٹا کر اتحاد پیدا کریں۔ اور اپنے آپ کو کانگریس سے دور رکھیں جو ہندوستان کے تمام فرقوں اور قوموں کی نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار تو ہے لیکن دراصل وہ صرف اور صرف ہندوؤں کے مفادات کی محافظ اور امین ہے۔

سر سید کی اسی دور اندیشی اور انتباہ کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت نے کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کانگریس کے بارے میں سر سید کے یہ شکوک و شبہات وقت سے بہت پہلے ہی درست ثابت ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں انگریزوں نے محض انتظامی سہولتوں کی بنیاد پر بنگال کو تقسیم کیا، تو ہندوؤں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس تقسیم کی وجہ سے جو نیا صوبہ وجود میں آیا تھا وہ مشرقی بنگال اور آسام پر مشتمل تھا۔ یہ مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ بنگال کی تقسیم سے اس علاقے کے ستم رسیدہ مسلمانوں کا مستقبل بہتر ہو جائے گا۔ تقسیم بنگال کے بعد نئے صوبے کی تشکیل سے مسلمان ہندوؤں کے اثر اور استحصال سے محفوظ ہو جائیں گے۔ لیکن ہندو یہ کس طرح گوارا کر لیتے کہ مسلمانوں کو بھی سہولتیں حاصل ہوں اور وہ اپنے مستقبل کے مالک بن جائیں۔ چنانچہ انہوں نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا مطالبہ کیا۔ مسلمانوں پر اس کا اثر یہ ہوا کہ انہیں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ضروری اقدامات کرنے پڑے اور انہوں نے اپنے حقوق کے تحفظ اور حصول کے لئے ایک علیحدہ سیاسی جماعت بنالی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنے حقوق کی بحالی کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ آخر کار ان کی یہ جدوجہد بارآور ہوئی اور قیام پاکستان کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔

جس سال مسلمانوں نے اپنی علیحدہ سیاسی جماعت کی تشکیل کی اسی سال چند ماہ قبل آغا خان سوئم کی سربراہی میں مسلمانوں کے ایک وفد نے شملہ جا کر اپنے مطالبات لارڈ منٹو کے سامنے پیش کئے۔ ان میں سب سے اہم مطالبہ جداگانہ انتخاب کا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی بے پناہ مخالفت کے باوجود اپنے جداگانہ انتخاب کے حق کے لئے تین سال تک نہایت عزم اور حوصلے سے جدوجہد کی اور ۱۹۰۹ء میں منٹو مورلے اصلاحات نافذ کی گئیں تو اس میں انگریزوں نے مسلمانوں کے اس بنیادی حق کو تسلیم کر لیا اور اس طرح مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے ابھرنے کا پورا موقع مل گیا۔

ہرچند کہ کانگریس نے مسلم لیگ کے ساتھ میثاق لکھنؤ کے تحت مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کو اصولی طور پر مان لیا تھا لیکن یہ معاہدہ

محمد علی جناح کی کوششوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ لیکن میثاق لکھنؤ کی
یہ دوستی اور مصالحت زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ چند سال بعد
۱۹۲۸ء میں کانگریس نے نہرو رپورٹ شائع کی جس میں اس نے مسلمانوں
کے ان تمام مطالبات کو یکسر مسترد کر دیا جو لکھنؤ پیکٹ کے تحت تسلیم
کئے جا چکے تھے۔ کانگریس کے اس فوری اقدام سے مسلمانوں کو جداگانہ
انتخاب کے حق سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی۔ علاوہ ازیں مخصوص
نشستوں کا تحفظ بھی خطرہ میں پڑ گیا اس طرح نہرو رپورٹ
سے ہندوستان میں مسلمانوں پر کانگریس اور ہندوؤں کی بالادستی
غلبہ اور تسلط کی سازش بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی۔

۱۹۲۹ء میں کلکتہ میں کل جماعتی کانفرنس کے موقع پر محمد علی
جناح نے شرکا کو مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات تسلیم کرنے پر آمادہ
کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی تمام تر کوششیں بے سود اور
رائیگاں ثابت ہوئیں۔ پھر محمد علی جناح نے ہندوستان کے
مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اپنے چودہ نکات
پیش کئے۔

مسلمانوں کے مطالبات کے سلسلے میں ہندوؤں کی زیادتی اور
مخالفت بڑھتی ہی رہی پھر کلکتہ میں کل جماعتی کانفرنس میں ہندوؤں
کی جانب سے تعصبات کے مظاہرے ہوئے جن کی بنیاد پر مسلمانوں کے
درمیان اتحاد اور یکجہتی کی ایک نئی روح پیدا مسلمانوں نے
آپس کے تمام اختلافات کو ختم کر دیا اور ایک دوسرے کے قریب
آ گئے اب وہ مکمل طور پر بیدار ہو چکے تھے۔

لکھنؤ میں قائدِ اعظم نے فرمایا۔

"اکثریتی فرقے نے خود ہی یہ ظاہر کر دیا ہے کہ
ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے۔"

مشہور مسلمان رہنما مولانا شوکت علی نے اکثریتی فرقے کے
عجیب و غریب رویہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"میں پوری زندگی شکار کا دلدادہ رہا ہوں مگر
میں نے شکاری کتوں کو بھی خرگوش کے ساتھ وہ
ظلم کرتے نہیں دیکھا جو ہندوستان میں اکثریت
اقلیت کے ساتھ روا رکھتی ہے۔"

نہرو رپورٹ کی منظوری کے بعد مسلمانوں میں مکمل اتفاق و
اتحاد پیدا ہو چکا تھا۔ وہ کانگریس سے بے نیاز ہو کر اپنے راستے
پر مکمل خود اعتمادی اور عزم کے ساتھ رواں دواں تھے۔ جب ۱۹۳۰ء
میں گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو مولانا محمد علی جوہر
نے صاف گوئی اور بے باکی سے کہہ دیا کہ جس طرح وہ انگریزی تسلط کے
خلاف ہیں اسی طرح وہ ہندو تسلط کی بھی برابر مخالفت کرتے ہیں
ہم گاندھی جی کے ساتھ شامل ہونے سے انکار کرتے ہیں۔

دوسرا اہم سبب جس نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب
کیا وہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ
میں کانگریس کا مسلم کش اور خود غرضانہ طرزِ عمل تھا۔ انتخابات سے
قبل کانگریس نے مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت بنانے کا
عہد کیا تھا لیکن انتخابات کے بعد کانگریس اپنے قول و قرار سے پھر گئی
اور مسلم لیگ کو حکومت میں شامل کرنے کیلئے نامناسب شرائط عائد
کرنے لگی۔ مثال کے طور پر لیگ کو اپنی پارلیمانی پارٹی ختم کر دینا چاہیئے،
لیگی ارکان کو کانگریس کے عہد نامہ پر دستخط کرنے چاہئیں، پالیسی سے
تعلق رکھنے والے تمام فیصلے کانگریس پارٹی کے اکثریتی ووٹ سے کئے
جائیں اور مسلمانوں کو ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت قطعاً حاصل نہ
ہو گی وغیرہ وغیرہ۔ اگر مسلمان ان شرائط کو قبول کر لیتے تو ان کی سیاسی
موت میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ لہٰذا انہوں نے ان شرائط کو ٹھکرا دیا
اور کانگریس کے اثرات سے آزاد رہ کر اپنے نصب العین کی جدوجہد
میں مصروف ہو گئے اس اثنا میں کانگریس نے اپنے دورِ حکومت میں
مسلمان اقلیتوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا اس سے مسلمان کانگریس
سے اور بھی متنفر ہو گئے۔

ان واقعات نے مسلمانوں کو علیحدگی کے بارے میں سوچنے پر

قافلہ و قافلہ سالار

(حصولِ پاکستان کی جدوجہد)

قائداعظم کا شاندار جلوس

قائدِ اعظم کے زیرِ صدارت
مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ
(۱۹۱۶ء)

جالندھر ریلوے اسٹیشن پر طلباء کی جانب سے
قائدِ اعظم کا استقبال

دہلی میں قائدِ اعظم کا
ایک شاندار جلوس

قائداعظم کا برطانوی حکام
سے بات چیت کے لئے
لندن میں ورود

قائداعظم آخری برطانوی
وائسرائے لارڈ اور لیڈی
ماؤنٹ بیٹن کے ہمراہ

قائداعظم ایک پریس کانفرنس
سے خطاب کر رہے ہیں

قائداعظم پنجاب مسلم لیگ کے اراکین کے ہمراہ

مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس

مجبور کر دیا۔ جمال الدین افغانی نے پہلے ہی مسلم جمہوری ریاست کی جانب اشارہ کیا تھا۔ بعد میں چودھری رحمت علی نے بار بار جمال الدین افغانی کے ان الفاظ کو سراہا کہ ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ مسلمانوں کا ہے اور مسلمان یہ علاقہ اپنے پاس رکھیں گے اور اسے مسلم مملکت بنائیں گے۔

لیکن علیحدہ مسلم مملکت کا جامع منصوبہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ۱۹۳۰ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے الٰہ آباد کے اجلاس میں پیش کیا اور کہا کہ ہندوستان ایک چھوٹا سا ایشیا ہے اور یہ مختلف قوموں، نسلوں، ذاتوں، زبانوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کا برِ اعظم ہے۔

علامہ اقبال نے ہندوستان میں مسلم مملکت کے قیام کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اپنے لامتناہی منظر میں مختلف نظریوں، زبانوں، عقائد اور معاشرتی نظام کا حامل ہے چنانچہ ایسی نئی مملکتوں کا قیام جن کی بنیاد ''اتحاد بین المسلمین، نسل، تاریخ'' مذہب اور معاشرتی مفادات پر ہو اس کے مسائل کا حل ہے۔

۱۹۳۵ء کے آئین کے سلسلہ میں مسلمانوں کی بے اطمینانی اور بے چینی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے کہا کہ نیا آئین صرف ہندوؤں کو مطمئن کرنے کے لئے ہے ان کے خیال میں ہندوستان میں امن صرف اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جبکہ ملک کی تقسیم سماجی، معاشرتی، مذہبی، لسانی اور نسلی بنیادوں پر از سرِ نو کی جائے۔

قائدِ اعظم نے ۱۹۳۸ء میں پٹنہ میں ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں کانگریس کی وزارتوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے فرمایا:

> "مسلمان بچوں کو سرکاری اور مسلم اسکولوں میں بندے ماترم گانے پر مجبور کر کے مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت کو کچلا جا رہا ہے اور کانگریس کے جھنڈے عمارتوں پر لہرائے جا رہے ہیں۔"

مسلمانوں کی تمام تر خواہش یہی تھی کہ صوبائی اسمبلی سے کانگریس کا راج ختم کیا جائے۔ جب کانگریس کا راج ختم ہوا تو مسلمانوں کو اطمینان ہوا اور انہوں نے ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو یومِ نجات منایا۔ قائدِ اعظم نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے درمیان مکمل اتحاد و اتفاق وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور اسی کے ذریعہ سے وہ اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے ۶ مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے انہیں نصیحت کی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلیں۔ مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام کریں اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ثابت قدم رہیں وہ عوام میں جائیں اور انہیں منظم کریں، انہیں تربیت دیں اور ان میں نظم و ضبط پیدا کریں۔ جو لوگ ہمارے ساتھ ہیں وہ مشکلات سے پریشان نہ ہوں اور ایک ایسی سیاسی فوج تیار کریں جسے ہندوستان والے حسرت سے دیکھیں۔ اس طرح ہم بہت جلد آزادی کی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوں گے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں قائدِ اعظم نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسلمان اقلیت نہیں وہ ایک قوم ہیں ہم وہ علاقے حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے یہ علاقے بنگال پنجاب شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان ہیں۔

یہ قرارداد بعد میں قراردادِ پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی اس قرارداد میں غیر مبہم الفاظ میں کہا گیا تھا کہ اس ملک میں کوئی آئینی منصوبہ قابلِ عمل نہیں ہوگا اور نہ مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہوگا جب تک حسبِ ذیل بنیادی اصولوں پر اس کا خاکہ تیار نہ کیا جائے۔

یعنی جغرافیائی حدود کے ذریعہ علاقوں کی حد بندی کی جائے اور جن علاقوں میں مسلمان عددی لحاظ سے اکثریت میں ہیں، شمال مغربی علاقے اور ہندوستان کے مشرقی حصے وہ آزاد مملکت پر مشتمل ہوں اور خود مختار ہوں۔

پاکستان کے مقاصد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا:-

"ہم سب مسلمان ایک خدا، ایک کتاب اور ایک رسول پر یقین رکھتے ہیں لہٰذا ہم کو ایک متحد قوم ہونا چاہیئے۔ انہوں نے پوری اسلامی دنیا سے کہا کہ یاد رکھو ہم ایک ایسی مملکت کی بنیاد رکھ رہے ہیں جو کہ اسلامی دنیا میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے گی۔"

حصول پاکستان اور مسلمانانِ ہند کو متحد کرنے کے لئے قائدِاعظم نے ملک کے دور دراز علاقوں میں جاکر تقریریں کیں۔ ۴ر مارچ ۱۹۴۱ء کو انہوں نے کہا کہ "جب تاریخ میں لکھا جائے گا کہ نو کروڑ مسلمان ان تین برسوں میں کس طرح ایک جھنڈے تلے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تو اسے ایک غیر معمولی کارنامہ سمجھا جائے گا۔ یہ بات مسلمانوں کی پچھلی دو سو سالہ تاریخ میں نہیں ملے گی۔ ہمارے تمام دشمنوں اور ہمارے سارے مخالفین کو پختہ یقین تھا کہ مسلمان کبھی متحد نہیں ہوں گے اور آپس میں لڑتے ہی رہیں گے۔"

۲۵ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو قائدِ اعظم نے اپنے پیغام میں قوم سے فرمایا:

"آج سب سے بڑا انعام و اکرام مسلمانوں کا اتحاد اور اتفاق ہے۔ آج مسلمانوں کی ایک آواز ہے۔ آپ لوگوں کے پاس اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ایک پلیٹ فارم اور ایک مرکز بھی موجود ہے۔ میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس علاقے میں آج کوئی دوسرا فرقہ ایسا متحد اور منظم نہیں ہے جتنا کہ مسلمان ہیں۔"

پھر ۲۳ر مارچ ۱۹۴۳ء کو قائدِ اعظم نے اپنے پیغام میں کہا:

"اس سے پیشتر کبھی ایک قوم نے جسے غلط انداز میں اقلیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اپنے آپ کو اتنا موثر، فعال اور طاقتور بنایا ہے نہ کبھی کسی قوم نے مذہبی اعتبار سے اپنے اندر اس قدر ہم آہنگی، یگانگت اور ہم خیالی کو فروغ دیا ہے اور نہ کروڑہا انسانوں پر مشتمل کسی قوم نے کبھی اتنے قلیل عرصے میں اور ایسے مخصوص حالات میں جن سے ہندوستان اس وقت دوچار ہے اپنے اندر اتحادِ کامل قائم کیا ہے۔"

اس طرح قائدِ اعظم ہر مرحلہ پر پاکستان کے قیام کے لئے مسلمانانِ ہند کو متحد کرتے رہے۔ دوسری جانب انگریز حکمران اور اکثریتی فرقہ ہر موقع پر مطالبہ پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے پوری طرح کوشاں رہا۔ قائدِ اعظم نے ایک ماہر سیاستدان کی حیثیت سے پاکستان کے مخالفین کو شکست فاش دی۔

قرار داد پاکستان کے دو سال بعد عین اس وقت جب برطانیہ جنگ عظیم میں دشمن سے نبرد آزما تھا، حکومت برطانیہ نے ہندوستانی لیڈروں سے مصالحت کے لئے کوشش کی اور اس کام کے لئے سٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیجا تاکہ وہ ہندوستان کے مسئلے کا کوئی حل پیش کریں۔ کرپس نے کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سے بات چیت کر کے اپنی تجاویز پیش کیں۔

کرپس تجاویز کے مطابق ایک انڈین یونین کی تشکیل کا وعدہ کیا گیا اور اس بات کا اختیار دیا گیا کہ اگر انڈین یونین چاہے تو وہ کامن ویلتھ سے علیحدگی بھی اختیار کر سکتی ہے۔ تجاویز میں دستور سازی کے لئے ایک اسمبلی بنانے کا وعدہ کیا گیا جو جنگ کے فوراً بعد اپنا کام شروع کر دے گی۔ تجاویز میں یونین کے صوبوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ دستور قبول نہ کرنے کی صورت میں اپنا سابقہ [illegible] قائم رکھ سکتے ہیں۔ کرپس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل ماسوا دفاع تمام تر ہندوستانی ممبران پر مشتمل ہو گی۔

ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں نے کرپس کی تجاویز پر غور کیا۔

قائدِاعظم نےاپنی تقریر میں یہ خیال ظاہر کیا کہ:

"ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ ایک نئی ہندوستانی یونین بنائی جائے اور اس غرض سے ایک مجلس دستور ساز قائم کی جائے۔ یہ مجلس دستور ساز کلی اختیارات کی حامل ہوگی۔ سر اسٹیفرڈ کرپس کے الفاظ میں یہ مجلس دستور ساز اپنا کام آل انڈیا یونین کے ساتھ شروع کر دے گی۔ انہوں نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا یہ کلی طور پر مختار و مجاز دستور ساز اسمبلی جداگانہ انتخاب سے نہیں۔ پروپرشنل ریپریزنٹیشن کے ذریعہ منتخب کی جائے گی۔ جس وقت یہ مجلس قائم ہو جائے گی تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سوائے ایک یونین کے کسی اور نتیجہ پر کیسے پہنچے گی۔ اور اسی وجہ سے اس کی یہ ترکیب متعین کی گئی ہے۔"

قائدِاعظم نے کہا کہ حقیقی مسائل کو ٹال کر اور صوبوں کے ملکی وجود پر ناواجب زور دے کر جو برطانوی پالیسی اور انتظامی تقسیم کا حادثہ ہیں ہندوستانی مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش بنیادی طور پر غلط ہے۔ مسلم ہندوستان بغیر اس کے مطمئن نہ ہوگا کہ اس کی قومی خود ارادیت واضح طور پر تسلیم کی جائے۔ اعلان میں علیٰحدگی کے متعلق اقلیت کو جو اختیار دیا گیا ہے وہ فریب ہے کیونکہ ایک آل انڈیا یونین کی تائید میں ہندوستان کا تمام صوبوں میں غلبہ ہوگا اور بنگال اور پنجاب کے مسلمان ہندو اقلیت کے رحم و کرم پر ہوں گے۔

قائدِاعظم کے تبصرہ کی روشنی میں مسلم لیگ نے تفصیل سے کرپس تجاویز کا جائزہ لیا اور صاف کہہ دیا کہ پاکستان اسکیم کا وہ اصول جو مارچ ۱۹۴۰ء کے ریزولیشن میں درج ہے آل انڈیا مسلم لیگ کا عقیدہ قرار پا چکا ہے... مسلم لیگ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ کوئی دوسری اسکیم یا تجویز قبول کرے۔

کانگریس نے بھی کرپس تجاویز کو اپنے نقطہ نظر سے جانچنے کے بعد انہیں مسترد کر دیا۔ اور اس طرح کرپس مشن ناکام ہوگیا۔

جنگ کے بعد حکومت برطانیہ نے ایک اور کوشش ہندوستان کے مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لئے کی۔ ۱۹۴۶ء کے شروع میں ایک برطانوی کیبنٹ مشن ہندوستان آیا جس میں کرپس کے علاوہ لارڈ پیتھک لارنس اور مسٹر اے۔ وی الگزانڈر ممبران کی حیثیت سے شامل تھے۔ ہندوستانی لیڈروں سے مذاکرات کے بعد وفد نے ایک اسکیم پیش کی جس کے تحت ہندوستان کو تین گروپوں میں تقسیم کرنا تجویز کیا گیا تھا۔ گروپ الف میں ہندو اکثریت کے تمام صوبے شامل تھے گروپ 'ب' میں مسلم اکثریتی صوبے یعنی پنجاب، سرحد اور سندھ اور 'ج' میں بنگال اور آسام۔ وزارتی مشن نے دستورسازی کے لئے ایک اسمبلی بھی تجویز کی جس کے ممبران کو جداگانہ انتخاب کے ذریعہ منتخب ہونا تھا۔ ہر منتخب ممبر دس لاکھ کے نمائندے کی حیثیت سے اسمبلی میں شریک ہوگا۔ سوائے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات تمام گروپ مختار کل ہوں گے۔ کسی گروپ کے صوبے اگر چاہیں تو الیکشن کے بعد اپنے گروپ سے نکل سکیں گے۔

مسلم لیگ نے اس اسکیم کو اعلان کے بیس دن کے اندر ہی تسلیم کر لیا کیونکہ اس کے خیال میں وفد کی تجاویز پاکستان کے نصب العین سے بہت قریب تھیں۔ لیکن اس کے برخلاف کانگریس نے ۷ جولائی تک ان تجاویز کو منظور نہیں کیا۔ اس سے قبل وائسرائے نے اعلان کیا تھا کہ جو پارٹی اس سکیم کو منظور کرے گی اسے عبوری حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی لیکن جب لیگ نے اس شرط کو پورا کر دیا تو حکومت اپنے وعدے سے منحرف ہوگئی محض اس لئے کہ کانگریس نے اسے کلی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔

حکومت کے اس رویہ سے جو کھلم کھلا ناانصافی پر مبنی تھا مسلم لیگ اور تمام مسلمانانِ ہند کو فطری طور پر بڑی مایوسی

ہوتی۔ لہٰذا مسلم لیگ نے اپنا آئندہ لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے بمبئی میں اجلاس کیا۔ قائد نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا،

"ہم نے پاک ہاتھوں سے کام کیا۔ صرف مسلم لیگ ہی وہ پارٹی ہے جو اس گفت و شنید سے عزت کے ساتھ باہر آئی اور اس کے ہاتھ صاف ستھرے ہیں۔ مشن نے عبوری حکومت کے معاملے میں عہد شکنی کی ہے۔ مشن اس وقت مرعوب اور مفلوج ہے۔ کانگریس نے وہ طریقے اختیار کئے جن پر ایک معمولی آدمی کو بھی شرم آئے گی۔"

آخر میں مسلم لیگ کونسل نے فیصلہ کیا کہ،

"اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے اپنے منصفانہ حقوق کا دعویٰ کرنے کے لئے اپنی عزت آبرو، رکھنے کے لئے اور موجودہ برطانوی غلامی اور مستقبل کے اس ہندو تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے جس کے منصوبے بن رہے ہیں راست اقدام (ڈائرکٹ ایکشن) کیا جائے
کونسل نے مسلم قوم سے اپیل کی کہ اپنی نمائندہ اور مختار انجمن مسلم لیگ کی نشست پر متحد ہو کر کھڑی ہو جائے اور ہر قربانی کے لئے تیار رہے۔
حکومت برطانیہ کے طرز عمل کے خلاف علامتی احتجاج کے طور پر مسلم لیگ کو ہدایت کی کہ وہ برطانیہ کے عطا کئے ہوئے خطابات واپس کر دیں اور جلسے میں شرکاء جلسہ نے خطابات واپس کئے۔

راست اقدام کے بعد فرقہ پرستوں نے کانگریس کی شہ پا کر ملک بھر میں مسلم کش فسادات برپا کر دیئے۔ لاکھوں بے گناہوں کا خون ہوا اور لاقانونیت کا دور دورہ رہا۔ برطانوی حکومت نے ایسے وقت میں کانگریس کو عارضی حکومت بنانے کی دعوت دی۔ چونکہ مسلم لیگ کے نمائندوں سے بد عہدی کی گئی تھی لہٰذا انہوں نے حکومت میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا مگر صرف کانگریس پر مشتمل عبوری حکومت سے مسلمانوں کی کسمپرسی کی کیفیت میں اور اضافہ کے خطرے کے پیشِ نظر بعد میں مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں شرکت کر لی مسلم لیگ کے نمائندوں نے عبوری حکومت میں کانگریس کے پروگراموں کو ناقابل عمل بنا دیا۔ لیاقت علی خان نے جو وزیر خزانہ تھے، ایسا بجٹ پیش کیا کہ سرمایہ داروں کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔ ایک قول کے مطابق لیاقت کے بجٹ سے غریبوں کو نمک میسر ہو گیا اور امیروں کو قبر۔ بہر حال ہندوؤں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ انہیں پاکستان ہر قیمت پر منظور کرنا ہو گا۔

ادھر فروری ۱۹۴۷ء میں حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کو خود مختاری دے دے گا اور اسی اعلان کے ساتھ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے ہند مقرر کر دیا گیا۔

ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان آتے ہی سیاسی لیڈروں سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ جب قائدِ اعظم وائسرائے سے ملے تو انہوں نے کہا کہ میں صرف ایک شرط پر گفتگو کروں گا۔ وائسرائے نے کہا کہ میں کسی شرط پر گفتگو نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف آپ کے خیالات معلوم کر رہا ہوں۔ گفتگو کے بعد وائسرائے کو کہنا پڑا: "جناح کس قدر ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک ہیں"۔

گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ ادھر ہندو مسلم فسادات شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے منظم دستے مسلمانوں پر حملے کر رہے تھے۔ غارت گری اور لوٹ مار کی فضا نے شہروں سے نکل کر پُر امن تعصبات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہندو مسلم کشیدگی ختم کرنے اور ملک میں امن و امان قائم کرنے کے لئے اب حکومت کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تھا کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے چنانچہ وائسرائے نے سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید کے بعد تقسیم ہند

کی ایک اسکیم تیار کی اور وہ اسے لے کر لندن گئے۔ پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد ۷ارمئی کو وائسرائے نے ایک کانفرنس طلب کی جس میں انہوں نے اس اسکیم کو پیش کیا۔ کانفرنس کی منظوری کے بعد وائسرائے خود لندن گئے جہاں تقسیم ہند کی تجویز برطانوی حکومت کے سامنے پیش کی گئی حکومت نے اسے تسلیم کر لیا۔

۱۲رجون کو وائسرائے نے ہندوستانی رہنماؤں کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں مسلم لیگ کی طرف سے قائدِ اعظم، لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر نے شرکت کی۔

پنڈت نہرو نے تو اسکیم کو منظور کر لیا مگر قائدِ اعظم نے فرمایا کہ منظوری سے قبل لیگ کی مجلسِ عاملہ کی رائے لینا ضروری خیال کرتا ہوں کیونکہ اسی کو اس اسکیم کو قبول کرنے کا حق ہے اگرچہ وائسرائے نے بہت زور دیا کہ قائدِ اعظم اپنی منظوری کا اعلان کر دیں مگر کوئی دباؤ ان پر کارگر نہ ہوا۔

۳رجون کو پھر ایک کانفرنس ہوئی اس میں تمام لیڈروں نے اس اسکیم کی منظوری کا اعلان کر دیا۔ اسی شام تمام لیڈروں نے ریڈیو سے تقریریں کی۔ قائدِ اعظم نے بھی خطاب کیا جب تقریر کر چکے تو انہوں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا جو ان کی تقریر میں لکھا ہوا نہیں تھا۔

۱۰رجولائی ۱۹۴۷ء کو ایوانِ عام میں آزادیٔ ہند کا بل پیش ہوا اور ۱۵رجولائی تک اس کی تیسری خواندگی بھی منظور ہو گئی۔ ۱۸رجولائی کو ملک معظم نے منظوری دے دی اس کے بعد بل نے قانونی شکل اختیار کر لی جس کی رُو سے ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کو انگریز کی دو صد سالہ غلامی سے نجات حاصل ہوئی۔

اس طرح قائدِ اعظم نے اپنی اعلیٰ قابلیت، غیر معمولی ذہانت اور بے مثال دردِ قومی سے ہندوستان کے منتشر مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کیا اور دنیا بھر کے مسلم دشمن عناصر کی مخالفتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر کے پاکستان کی بنیاد رکھی۔ علامہ اقبال کی توقعات کے مطابق انہوں نے شمالی ہندوستان میں جو سیلاب آ رہا تھا اسے روکنے میں ملت اسلامیہ کی صحیح رہنمائی کی اور اسے اپنا ایک وطن عطا کیا۔

رواج کی موت

(بلوچستان میں سرداری نظام کا خاتمہ)

ملک حبیب الرحمٰن

۸ راپریل ۱۹۷۶ء کا مبارک دن پاکستان کی تاریخ میں بالعموم اور بلوچستان کی تاریخ میں بالخصوص سنہرے دن کے نام سے یاد کیا جائے گا کیونکہ یہی وہ دن ہے۔جس نے ہزاروں سال پرانے سرداری نظام کے منحوس ستارے کو فضا میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ڈوبتے دیکھا۔

اپنے دو ہفتوں کے دورے کے خاتمے پر وزیرِ اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اسی دن کوئٹہ میں مردوں اور عورتوں کے ایک عظیم الشان جلسے سے خطاب کرتے ہوئے سرداری نظام کے خاتمے کا اعلان کیا۔ نعروں اور تالیوں کی گونج میں جناب بھٹو نے متعلقہ آرڈیننس کا ایک نسخہ ہاتھ میں اٹھا کر ڈرامائی انداز میں کہا۔" میں نے اس جابرانہ نظام کا خاتمہ اس تلوار (یعنی آرڈیننس) کے وار سے کیا ہے"۔ اسی موقع پر بلوچستان کے سب سے بڑے سردار جناب میر احمد یار خان نے بھی اعلان کیا۔

"آج سے میں آپ کا سردار نہیں بلکہ خادم ہوں"۔

اس ٹھوس اور جرأت مندانہ فیصلے نے بلوچستان کے عوام میں خوشی کی لہر دوڑا دی ہے اور صوبے بھر میں جگہ جگہ عوامی جشن منائے جا رہے ہیں۔ اس صوبے کی بلوچ آبادی کو زندگی میں پہلی بار یہ محسوس ہوا ہے کہ پاکستان کے دیگر عوام کی طرح وہ بھی آزاد ہیں اور قومی معاشرے میں اُن کو بھی پاکستان کے دیگر صوبوں کے بھائیوں کی طرح ایک باعزت مقام حاصل ہو گیا ہے۔

سرداری نظام یا رواج

اگرچہ اس ظالمانہ نظام کی تاریخ بہت پرانی ہے تاہم یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس نظام کو جسے "رواج" کہا جاتا ہے زیادہ پھولنے پھلنے کا موقع انگریزوں کے دورِ حکومت میں میسّر آیا۔ ۱۸۳۹ء میں بلوچستان پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں کو افغانستان سے دو جنگیں لڑنی پڑیں۔ یہ جنگیں ۱۸۳۹ء اور ۱۸۷۹ء میں ہوئیں۔ چونکہ برطانوی حکومت کو بلوچستان میں اپنی طاقت کو مضبوط بنانا تھا اس لئے اُس وقت کے بلوچستان کے کمشنر سر رابرٹ سنڈیمن نے خانِ قلات کے ساتھ متعدد عہد نامے کئے جن کے ذریعے چاغی درۂ بولان، کوئٹہ اور صوبے کے دیگر کئی علاقے برطانوی تسلط میں آ گئے۔ انگریز چونکہ سارے صوبے کو اپنی عملداری میں رکھنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے وقت کے تقاضے کے پیشِ نظر یہی مناسب سمجھا کہ صوبے پر براہِ راست حکومت کرنے کے بجائے

بلوچی سرداروں کے ذریعہ حکومت کی جائے۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے اپنے ان وفادار دوستوں کو اس بات کی کھلی چھٹی دے دی کہ وہ اپنے علاقوں کے عوام پر جس طرح چاہیں حکومت کریں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ نظام اور بھی بھیانک اور گھناؤنا ہوتا چلا گیا۔

رواج کا اصل رُوپ

سرداری نظام کا دوسرا نام "رواج" ہے۔ رواج کے تحت ایک عام بلوچ نہ صرف خود بلکہ اُس کا خاندان، اُس کی کمائی اور اس کے مال مویشی تک قبیلے کے سردار کے رحم و کرم پر ہوتے تھے اُنہیں اس بات کی مطلقاً اجازت نہیں ہوتی تھی کہ اپنے سردار کے خلاف کچھ کہہ سکیں۔ بٹائی کے علاوہ یہ بے چارے "چہارک" "سٹنک" اور "ہفتک" کی صورت میں سردار کو ٹیکس ادا کرتے تھے ٹیکس ادا نہ کرسکنے کی صورت میں انہیں سردار کے غضب کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ اور سردار چونکہ مطلق العنان ہوتا ہے اس لئے وہ ہر طریقہ استعمال کرکے ٹیکس وصول کرلیتا تھا۔ سردار اتنے وسیع اختیارات کا مالک ہوتا تھا کہ اگر کسی فرد یا گروہ کو لوٹنا یا قتل کرنا چاہے، تو وہ بلا جھجک کرسکتا تھا اور کوئی اس سے باز پُرس نہیں کرسکتا تھا سردار کے احکام کی تعمیل کرانے کے لئے اُس کی اپنی پولیس۔ اپنی عدالت اور جیل خانے ہوتے تھے یہ سردار اپنے علاقوں میں کسی بھی ترقیاتی کام کی اجازت نہیں دیتے تھے اب تک ان علاقوں میں حکومت کے معمولی اہلکار بھی نہیں جاسکتے تھے۔ ان علاقوں میں سڑکیں بھی نہیں تھیں اور نہ دیگر ذرائع حمل و نقل۔ سرداروں کی ان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے عوام موجودہ دور کی تمام سہولتوں سے محروم تھے اور یہ علاقے ایسے نظر آتے تھے جیسے یہ پانچ چھ سو سال قبل کی آبادیاں ہوں۔ سردار ہر ایسے قدم کے مخالف تھے جس سے لوگوں کی حالت سدھر سکے۔ وہ انہیں عمر بھر جاہل رکھنا چاہتے تھے کیونکہ عوام میں بیداری پیدا ہونے سے سرداری نظام کو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔ اور تو اور ان علاقوں میں مذہبی پرچار کی بھی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ بیگار کے علاوہ سردار اپنے قبیلے کے لوگوں سے جنگی خدمات بھی حاصل کرتے تھے۔ اور حکومت سے لوگوں کے نام پر رقمیں وصول کرکے اپنے خزانے پُر کرتے رہے تھے۔

لوگوں کے مقدمات کا سردار خود فیصلہ کرتے تھے۔ اور مجرموں کو جیل بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ جیل خانے کیا تھے عذاب گھر تھے۔ بدنصیب قیدیوں کو ان تنگ و تاریک اور غلیظ کوٹھڑیوں میں ایسی ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑتا تھا جن کے بیان سے ہی انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ایک بدترین ایذارسانی کے طریقے کا نام کاٹھ میں ڈالنا ہے۔ کاٹھ یہ ایک وزنی لکڑی کا کندہ ہوتا ہے جس کے عین بیچ میں ایک بڑا سوراخ ہوتا ہے۔ قیدی کا ایک پاؤں اس سوراخ میں سے گذار کر سوراخ کو لکڑی کی ایک موٹی اور مضبوط میخ سے تنگ کردیا جاتا ہے اور پاؤں اس میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ قیدی بے چارہ اس وزن کی وجہ سے نہ آسانی سے لیٹ سکتا ہے اور نہ بیٹھ سکتا ہے۔ اگر ضروریات کے لئے اٹھ کر چلنا پڑے تو وہ پہلے اس کُندے کو ایک رسّی کے ذریعہ ٹخنے سے اُوپر کو اٹھاتا ہے اور جب چلتا ہے تو رسّی کے ذریعہ کندے کو تھامے رکھتا ہے۔ چند دن پاؤں کندے میں رہنے سے ٹخنہ اور ٹانگ کا کچھ حصہ بُری طرح زخمی ہوجاتا ہے اور قیدی کو ان زخموں کی مرہم پٹی خالص مٹی سے کرنا پڑتی ہے۔

ایذا رسانی کا دوسرا طریقہ "جولان" کہلاتا ہے۔ اس میں ایک ٹانگ ایک قیدی کی اور ایک ٹانگ دوسرے قیدی کی زنجیر سے اکٹھی باندھ دی جاتی ہیں۔ یہی نہیں ان قیدیوں کو ہتھکڑیاں بھی لگائی جاتی ہیں۔ ٹانگیں زخمی ہونے کے علاوہ

ان دونوں قیدیوں کو دردناک اذیت پہنچتی ہے۔ اگر ایک لیٹنا چاہتا ہے تو دوسرے کو بھی لیٹنا پڑتا ہے اور اگر ایک اٹھنا ہے تو دوسرے کو بھی ساتھ اٹھنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ حوائج ضروری کی فراغت کے لئے بھی دونوں کو اکٹھے جانا پڑتا ہے یہ سزا کیا ہے شکنجۂ موت میں کس کر تڑپانا ہے۔

ایذارسانی کا ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ قیدی کی ڈاڑھی نوچ لی جاتی ہے اور منہ کالا کر دیا جاتا ہے۔ جسمانی اور ذہنی طور پر اذیت ناک ہونے کے ساتھ ساتھ یہ طریقہ اس لئے بھی رسوا کن ہے کہ روایتی طور پر ایک بلوچ اپنی ڈاڑھی کو نہایت مقدس سمجھتا ہے وہ اس پر کسی دوسرے کا ہاتھ کبھی نہیں برداشت کر سکتا چہ جائیکہ اُسے نوچ لیا جائے چنانچہ بلوچوں کے عظیم رہنما میر چاکر خان کے متعلق مشہور ہے کہ اُسے آزمانے کے لئے کسی بلوچ سردار نے اُن کے دودھ پیتے بچے کو ان کی گود میں ڈال دیا تھا اور جب بچے نے میر چاکر خان کی ڈاڑھی کو اپنے ننھے منے ہاتھوں سے چھوا تو والد نے تلوار نکال کر اپنے بچے کا سر قلم کر دیا۔

صدیوں کی غلامی نے ان لوگوں کی روح کو بھی مردہ کر دیا ہے۔ وہ سردار کو دنیا میں طاقت کا ایک عظیم سرچشمہ سمجھتے ہیں اور اس حد تک اس سے خوف کھاتے ہیں کہ اس کے حلف کو قرآن اور رسولؐ کی حلف سے بھی مقدس تصور کرتے ہیں۔

سرکش سردار

بلوچستان کے سردار طاقت کے نشے میں یہاں تک سرکش ہوگئے تھے کہ وہ حکومت پاکستان کو خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے چنانچہ پچھلی حکومتوں کے خلاف سرداروں نے پہلی بار ۱۹۵۹ء میں اور دوسری بار ۱۹۶۳ء میں بغاوت کی اور دونوں موقعوں پر حکومت کو سرداروں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ یہ حکومت کے کسی قانون کی پابندی نہیں کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اب تک بلوچستان میں نہ تو بندوبست ہو سکا اور نہ ہی زرعی اصلاحات کا نفاذ۔ سردار ہر اس قانون کو ٹھوکر مار دیتے تھے جس سے ذرہ برابر بھی اُن کی آن بان اور اختیار پر اثر پڑتا ہو۔ ان سرداروں نے زرعی اصلاحات کی بھی شدید مخالفت کی اور اپنے قبیلوں کے لوگوں کو مسلح کر کے دشوار گذار پہاڑی علاقوں اور دروں میں بھیج دیا جہاں سے وہ حکومت کے خلاف پریشان کن حربے استعمال کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ ان سرداروں نے پاکستان کے اندر اپنی خود مختار سلطنتیں قائم کر رکھی تھیں اور ان تک حکومت پاکستان کی رسائی خطرے سے خالی نہ تھی۔ بلوچستان کے کل ایک لاکھ چونتیس ہزار باون (۱۳۴۰۵۲) مربع میل رقبے میں سے صرف ۱۳۵ مربع میل سے کچھ زائد رقبے پر حکومت پاکستان کا عملی تسلط تھا۔ اس صوبے کے ۲۲ سردار ایسے بھی ہیں جنہوں نے اب تک زرعی اصلاحات کے سلسلے میں اپنی زرعی جائیداد کے فارم تک پُر کرنا گوارا نہیں کیا۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ سرداری الاؤنسوں کے علاوہ اُن کی پولیس (لیویز) کے تمام اخراجات بھی حکومت پاکستان کو ادا کرنا پڑتے تھے۔

اب جبکہ سردار ختم کر دیئے گئے ہیں اور "رواج" دفن ہو چکا ہے، امید ہے کہ زرعی اصلاحات کے تحت لاکھوں ایکڑ زمین صوبے کے چھوٹے کاشتکاروں اور مزارعوں میں تقسیم کرنے کے لئے حاصل کی جا سکے گی۔

صوبہ بلوچستان

بلوچستان کا صوبہ جس کی سرحدیں جنوب مشرق میں سندھ کے ساتھ، شمال مشرق میں پنجاب کے ساتھ۔ شمال میں صوبہ سرحد

بلوچستان میں صبح نَو

فرسودہ سرداری نظام کا خاتمہ

دو بلوچ معززین سرداری نظام کے خاتمے پر اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے ہیں

ایک معمر اور معزز بلوچ اپنے تاثرات ٹیپ کرا رہے ہیں

ظلم و استحصال کی زنجیریں ٹوٹ گئیں

ایک نجی جیل خانے کی بھیانک کوٹھری

جیلوں کی کھڑکیوں پر خاردار تار

قبر کی سی تاریک کال کوٹھریاں

جانوروں کے
سے بدتر جہ

ایک اور بھیانک زنداں

ایک قلعہ میں سردار کا ایک نجی قید خانہ

قلعہ کی حدود میں ایک اور نجی قید خانہ

کے ساتھ اور شمال مغرب میں ایران اور افغانستان کے ساتھ ملتی ہیں ، پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے - اس کا کل رقبہ ۱۳۴،۰۵۲ مربع میل ہے - مگر اس کی آبادی چوبیس لاکھ اکتالیس ہزار سے کچھ متجاوز ہے باقی صوبوں کے مقابلے میں سب سے کم ہے - آبادی کی اکثریت بلوچوں کی ہے جو چار سو سے زائد چھوٹے بڑے قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں یہاں پٹھانوں کی آبادی دوسرے درجے پر ہے - بلوچ اس صوبے کے مرکزی اور جنوبی حصوں میں اور پٹھان شمالی حصوں میں آباد ہیں - بلوچوں کی زبان بلوچی اور پٹھانوں کی پشتو ہے - بلوچوں کے مشہور قبیلے مری ، بگٹی ، مینگل ، مگسی ، رئیسانی ، زرک زئی اور نوشیروانی ہیں -

بلوچوں کی تاریخ اور ثقافت

بعض مورخین کے مطابق بلوچوں کا سلسلۂ نسب حضرت نوح سے جا ملتا ہے - مشہور مورخ (RAWLINSON) لکھتا ہے کہ حضرت مسیح سے دو ہزار چار سو سال قبل کے زمانے میں بابل پر ایک شہنشاہ کی حکمرانی تھی جس کا نام نمرود یا بلوس تھا - یہ شہنشاہ حضرت نوح کے بیٹے حام کی ساتویں اور ان کے پوتے کش کی چھٹی پشت میں سے تھا - اس شہنشاہ کے خاندان والے اپنے آپ کو بلوس (بلوچ) کہتے تھے - اور اس شہنشاہ کے پرستش کرنے والوں کو بلوسی (بلوچی) کہا جاتا تھا کچھ مورخوں کے نزدیک یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ یہ وہی نمرود ہے جس نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈلوایا تھا -

جب بابل اور شام وغیرہ پر ایرانی شہنشاہ سائرس اعظم نے حملہ کیا تو بلوچ اپنا وطن (شام - عراق وغیرہ) چھوڑ کر ایران کے شمالی علاقوں کردستان ، گیلان اور آرمینا میں آباد ہو گئے - زیادہ تر آبادی کرمان کے صوبے میں تھی - عربوں نے جب ایران پر حملہ کیا تو یہ کرمان چھوڑ کر ایران کے دیگر حصوں میں پھیل گئے - پندرھویں صدی کے آخر میں بلوچوں کی بھاری اکثریت نے ترکوں ، منگولوں اور مغلوں کے حملوں سے بچنے کی خاطر مکران کا رخ کیا اور قلات کے پہاڑی علاقوں تک پہنچ کر آباد ہو گئے - سولھویں صدی کی ابتدا میں یہ موجودہ بلوچستان اور سندھ تک پھیل گئے - ان کے مشہور قائد میر چاکر خان نے بلوچوں کی سلطنت کی طرح ڈالی تھی - جس میں موجودہ بلوچستان کے علاوہ ڈیرہ غازی خان - ملتان اور ساہیوال کے علاقے بھی شامل تھے - میر چاکر خان کو بلوچ اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے -

بلوچ ایک جفاکش ، بہادر ، جنگجو اور مہمان نواز نسل ہے - بلوچوں کو خانہ بدوش زندگی پسند رہی ہے - یہ گھڑ سواری - تیر اندازی ، شکار ، سیر و تفریح ، نشانہ بازی نیزہ بازی اور کشتی لڑنے کے بے حد شائق ہیں - بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کے علاوہ یہ عمدہ نسل کے اونٹ اور گھوڑے بھی پالتے ہیں اور ان سے بار برداری اور سواری کا کام لیتے ہیں - بلوچ صرف ایسے کھیلوں کے شائق ہیں جن میں شجاعت - مردانگی - ہمت اور بہادری کا نمایاں پہلو ہو -

ان کے لوک گیتوں میں سوت ، لڑوگ ، حالو ، داستانگ ، یا داستان ، ملید ، زہیروگ اور ڈیہی بہت مقبول ہیں - ان کے علاوہ کیلو - آمبہ اور موتک بھی عام گائے جاتے ہیں - لیکو ساربانوں کا گیت ہے اور آمبہ مکرانی مچھیروں کا دیہی رومانی گیت ہے اور موتک مرثیہ ہے -

بلوچوں کا سب سے مقبول لوک ناچ "چھاپ" ہے جو شادی بیاہ یا عید کے تہوار کے موقع پر کیا جاتا ہے - ان کے موسیقی کے مشہور ساز شے پر جا (ڈھول) - سروز (ستار) - دمبوراگ (سارنگی) نڑ (بانسری) اور

چنگ ہیں ۔

بلوچی دستکاریاں جن سے بلوچی فن کی نفاست عیاں ہوتی ہے نہ صرف پاکستان میں بلکہ غیر ممالک میں بھی بہت مقبول ہیں۔ ریشمی کڑھائی کا کام اور شیشے کا کام کئے ہوئے دستی بیگ، ٹی کوزیاں، بٹوے، چادریں اور خواتین کے لباس کی باہر کے ممالک میں بے حد مانگ ہے اور ان اشیاء کی برآمد سے پاکستان کو لاکھوں روپوں کا غیر ملکی سکہ حاصل ہوتا ہے۔

جاگ اُٹھا بلوچستان

موجودہ قیادت کے برسر اقتدار آتے ہی پاکستان نے جس رفتار سے ترقی شروع کر دی۔ اس کے پیش نظر یہ نہایت ضروری ہو گیا تھا کہ ملک کے تمام پسماندہ علاقوں کی ترقی کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی جائے تا کہ وطن غیر معمولی سُرعت کے ساتھ آگے بڑھنے کے قابل ہو جائے چنانچہ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر پچھلے دو اڑھائی برسوں میں ہمارے قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو نے گلگت ایجنسی ۔ صوبہ سرحد ۔ قبائلی علاقوں اور بلوچستان کے طوفانی دورے کئے ۔ عوام سے مل کر اُن کے مسائل دریافت کئے۔ اُن کی تعلیمی ۔ اقتصادی ۔ صنعتی ۔ زرعی اور صحت کی پسماندگی کا بچشم خود معائنہ کیا اور حکم دیا کہ ان علاقوں کی ترقی کو اولیت دی جائے اور تمام منصوبے برقی رفتاری کے ساتھ مکمل کئے جائیں ۔

ان احکامات کے صادر ہوتے ہی فوری طور پر منصوبہ بندی کی گئی ۔ ضروری فنڈ فراہم کئے گئے اور کام نہایت سرعت سے شروع ہو گیا۔ اب بلوچستان نہایت تیز رفتاری سے بدل رہا ہے "کل اور آج اور" والی بات ہے ۔ صوبے کے دُور دراز اور دشوار گذار علاقوں میں بھی سڑکیں پہنچ چکی ہیں۔ ان علاقوں میں اسکول، ہسپتال اور بجلی کی سہولتیں فراہم کر دی گئی ہیں ڈاک اور تار کا مواصلاتی نظام قائم ہو چکا ہے ۔ علاقائی تعاون برائے ترقی کی شاہراہ کے منصوبے کے ذریعے جلد ہی کراچی کو کوئٹہ سے اور کوئٹہ کو ایران سے ملا دیا جائے گا۔ ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کے پیش نظر اب سفر میں دقتیں بہت حد تک ختم ہو چکی ہیں۔ اس صوبے کی ترقی کے لئے صوبائی بجٹ کے علاوہ وفاقی حکومت نہایت فیاضی سے فنڈ فراہم کر رہی ہے۔ صوبائی بجٹ پچھلے چند برسوں میں تین کروڑ سے بڑھ کر تقریباً ساٹھ کروڑ تک جا پہنچا ہے ۔ صنعتی میدان میں ایک ارب تین کروڑ روپوؤں کی لاگت سے کپڑے کے دو بڑے کارخانے اور ایک سیمنٹ کا کارخانہ لگایا جا رہا ہے یہ کارخانے حکومت ایران کی امداد سے لگ رہے ہیں ۔ موٹر سائیکلوں کے ایک کارخانے نے جو کہ اُتھل میں لگایا گیا تھا موٹر سائیکلیں بنانی شروع کر دی ہیں۔ اسی طرح تعلیم اور صحت کے میدان میں بے پناہ ترقی ہو رہی ہے۔ اب بلوچستان کی اپنی یونیورسٹی اور متعدد کالج ہیں۔ ان میں ایک میڈیکل کالج ۔ ایک انجینئرنگ کالج ۔ ایک ٹیکنیکل کالج ۔ ایک کیڈٹ کالج ۔ ایک کامرس کالج بھی ہے ۔ اسکولوں اور ہسپتالوں کے جال بچھا دیئے گئے ہیں۔ تعلیم نہ صرف لڑکوں میں بلکہ لڑکیوں میں بھی عام ہو رہی ہے۔ پینے کے پانی اور آبپاشی کے کئی منصوبے مکمل ہو چکے ہیں اور متعدد ایسے ہیں جن پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ جنگلات کو فروغ دیا جا رہا ہے اور یہاں کی معدنی دولت سے فائدہ اٹھانے کے لئے رات دن کام ہو رہا ہے ۔ اب سرداری نظام کے خاتمے پر زرعی اصلاحات کا نفاذ ہو جائے گا اور لاکھوں ایکڑ زرعی اراضی حاصل کر کے غریب کاشتکاروں اور مزارعوں میں مفت تقسیم کی جائے گی ۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو صوبہ بلوچستان پر خاص توجہ دے رہے ہیں کیونکہ وہ چاہتے

ہیں کہ اُن کا بلوچستان کو ترقی یافتہ صوبوں کی صف میں شامل کرنے کا وعدہ جلد از جلد پورا ہو جائے۔ تیل کی تلاش جاری ہے۔ پاکستانی اور غیر ملکی فرمیں کروڑوں روپے تیل ڈھونڈنے کے سلسلے میں خرچ کر رہی ہیں اور سرداری نظام کے خاتمے کے بعد جس دن تیل دریافت ہوا وہ دوسرا سنہرا دن ہوگا۔ اس صوبے کے لوگ جاگ اٹھے ہیں اور انہوں نے صدیوں کی بے حسی کے دائرے کو توڑ دیا ہے۔ انہیں اب معلوم ہوگیا ہے کہ وہ بھی پاکستانی معاشرے کے اُتنے ہی اہم باشندے ہیں جتنے کہ دوسرے یونٹوں کے۔ چنانچہ آج انہوں نے بھی عہد کر لیا ہے کہ وہ استحصالی نظام، جہالت، بھوک اور افلاس اور بیماریوں کے خلاف حکومت کے ساتھ مل کر اُس وقت تک مقابلہ جاری رکھیں گے جب تک کامیابی نصیب نہیں ہو جاتی۔

بلوچستان میں گیس ہے اور تیل بھی ہے۔ تیل اگر دریافت ہو گیا تو یہ نہ صرف بلوچستان کا نقشہ بدل دے گا بلکہ پاکستان کے اقتصادی ڈھانچے میں بھی ایک عظیم انقلاب لے آئے گا۔ آیئے! ہم سب مل کر تن دہی سے محنت کرتے رہیں تاکہ بلوچستان کے لئے دوسرا سنہرا دن بھی قریب تر ہو جائے۔

معمورۂ اسلام!

(شہر اسلام آباد پہلی نظر میں)

فضل احمد صدیقی

یہ دامن کہسار میں اک شہر نگاراں،
رعنائیِ فطرت میں فسوں کاریِ انساں؛
تنظیم بہاراں کا سماں چار طرف ہے
سکّہ سا سلیقہ کا رواں چار طرف ہے

خوش رنگ درختوں کی اٹھان عظمۃ للہ
ایک ایک شجر کار چٹان عظمۃ للہ
یہ سبزۂ خوابیدہ یہ سنجافِ گُل تر
یا قاقم و مخمل ہے کہ پھیلی ہے زمیں پر

بالیدگیٔ حسن قطاروں میں مقیّد
اک جوشِ نمو لاکھ نظاروں میں مقیّد
شمشاد و سمن، سروِ سہی راہ نما ہیں
قامت بھی یہاں جلوہ و قیمت سے سوا ہیں

تعمیر میں اک جہد مسلسل کی لگن ہے
صناعیِ پیہم میں بھی عظمت کا چلن ہے
سڑکیں، روشیں، کنج و خیاباں نظر افروز
شب تابیٔ بلّور و چراغاں نظر افروز

گلبانگ حیات آتی ہے جھونکوں سے ہوا میں
برخیز کے نعروں کی ہے اک گونج فضا میں
آبادیٔ اسلام ہے معمورۂ نو سے
ایمان کے دیئے جلتے ہیں اس شمع کی لَو سے

محکم ہے یقیں شہر کا اور عزم جری ہے
ہر آن نگہدار یہاں کوہ مری ہے
تخئیل مگر تشنۂ تکمیل ہے اب بھی
ہے دھوپ کے دریا میں رواں سایۂ شب بھی

بستی سے خلاؤں کے بھی ڈانڈے سے ملے ہیں
اس شہر کے شجرے میں بڑے گاؤں پڑے ہیں

قرآن اور اقبال

الیاس رانا

قرآن پاک کامل صحیفہ ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ قرآن مسلمانوں کے لئے خاص طور پر اور تمام دنیا کے لئے عام طور پر کتاب مبین ہے۔ قرآن صراط مستقیم کی جانب ہماری رہبری کرتا ہے اور ظلمات سے نور کی طرف ہمیں لاتا ہے۔ قرآن ہر مسلمان کے گھر میں موجود ہوتا ہے۔ اکثر گھروں میں طاق پر سجا ہوا رکھا رہتا ہے۔ کچھ گھروں میں اس کی تلاوت بھی کی جاتی ہے مگر چند، اور صرف چند ارباب دل ایسے ہوتے ہیں جو اس کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اسکے ہر لفظ اور ہر آیت پر غور کرتے ہیں اس سے اپنے دماغ کو منور کرتے اور اس کی حکمت سے استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن ایسے افراد معدودے چند ہی ہوتے ہیں جو اپنے قلب و نظر کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ دوسرے افراد تک اس کا پیغام اس انداز میں پہنچانا اپنا مشن بنا لیں کہ کروڑوں بندگان خدا اس سے کسب فیض کر سکیں۔

علامہ اقبال ایسے ہی صاحب دل مفکر تھے جو اپنی روح کی عمیق گہرائیوں سے قرآن کے معانی و مفاہیم کا ادراک کرتے تھے خود تلاوت قرآن فرماتے تھے دوسروں کو بھی اس عمل کی نصیحت کرتے تھے کہ "قرآن مجید پڑھتے رہو تاکہ قلب میں محمدیؐ نسبت پیدا ہو۔"

علامہ کو قرآنی فکر کی جانب سب سے پہلے ان کے والد بزرگوار نے ان کے اوائل عمر میں توجہ دلائی تھی۔ ایک دن وہ صبح کو حسب معمول تلاوت کر رہے تھے، تلاوت کے بعد ان کے والد بزرگوار نے اُن سے کہا "کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اترا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔ غالباً اسی واقعہ کے ضمن میں

علامہ اقبال اپنی تصنیف تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ المعروف بہ خطبات مدراس کے پہلے خطبے میں بیان کرتے ہیں:۔

"جیسا کہ صوفیہ اسلام میں ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب تک مومن کے دل پر بھی کتاب کا نزول ویسا نہ ہو جائے جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا تھا اس کا سمجھنا محال ہے"۔ اسی خیال کو علامہ اقبال اس شعر میں بیان کرتے ہیں

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

قرآن سے علامہ کو جو لگاؤ اور شوق تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمہ اللہ ھو میرے رگ و پے میں ہے

اقبال نے ایک موقع پر سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا:-

"قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیاسیات انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔"

ایک اور موقع پر الٰہیات اور قرآن کے باہمی تعلق کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نکلسن کو لکھتے ہیں۔

"قرآن صرف الٰہیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسان کے معاش اور معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسکا تعلق الٰہیات ہی کے مسائل سے ہے۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ قرآن کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے پڑھنے اور سمجھنے کا درس دیتے ہیں۔

"قرآن کو اس زاویۂ نگاہ سے مت پڑھو کہ تمہیں فلسفے کے مسائل سمجھائے گا۔ اسے اس زاویۂ نگاہ سے پڑھو کہ اللہ تعالیٰ سے میرا کیا رشتہ ہے اور کائنات میں میرا کیا مقام ہے؟ قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ وہ انسان میں خدا سے ربط قلبی کا اعلیٰ شعور پیدا کر دے تاکہ انسان اس ربط کی بدولت مشیت ایزدی سے ہم آہنگی پیدا کر سکے۔"

اسی خیال کو خطبۂ اول میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"قرآن مجید کا حقیقی مقصد تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ان گوناگوں روابط کا ایک اعلیٰ اور برتر شعور پیدا کرے جو اس کے اور کائنات کے درمیان قائم ہیں۔"

قرآن کے مطالب پر صدیوں سے غور و فکر جاری ہے اور یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ یہ ایک ایسا چشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہو سکتا۔ اس سے بے شمار تشنگان نے اپنی سیرابی کی ہے اور ان گنت افراد اس سے فیضیاب ہوئے ہیں اسی خیال کی جانب اقبال توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں:

"جس قدر انسان کا ذوق و وجدان اور اخلاق و روحانیت ترقی کرتے جائیں گے اسی قدر اس پر قرآن کے مطالب آشکار ہوتے جائیں گے۔"

اقبال کو قرآن سے جو عقیدت تھی اس کے متعلق مرزا جلال الدین بیرسٹر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"مطالب قرآنی پر ان کی نظر ہمیشہ رہتی۔ کلام پاک کو پڑھتے تو اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے بلکہ نماز کے دوران میں جب باآواز بلند پڑھتے تو وہ آیات قرآنی پر فکر کرتے اور ان سے متاثر ہو کر رو پڑتے۔ ڈاکٹر صاحب کی آواز میں ایک خاص کشش تھی جب وہ قرآن پاک کو باآواز بلند پڑھتے تو سننے والوں کا دل پگھل جاتا۔"

علامہ کے نزدیک قرآن کو سمجھنے اور اس کی تفسیر لکھنے کے لئے عربی زبان و ادب میں خاطر خواہ استعداد اور عرب قدیم کے علمی سرمایہ پر نگاہ ہونے کے ساتھ بلندی علم ہونا ضروری تھا اس کے متعلق ان کو اکثر شکوہ رہتا تھا کہ مسلمان عربی زبان سے بیگانہ ہیں۔ ایک موقع پر علامہ نے فرمایا:

"قرآن اس اعتبار سے بڑا ہی مظلوم صحیفہ ہے کہ جسے دنیا میں اور کوئی کام نہیں ملتا وہ اس کے ترجمہ و تفسیر میں مصروف ہو جاتا ہے حالانکہ یہ نہایت ہی نازک اور محتاط ذمہ داری ہے۔"

اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس جانب اشارہ بھی کیا ہے:

احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند!

اقبال کے نزدیک مومن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں اپنے آپ کو ڈھالے۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم قرآن ناطق تھے اسی لئے اقبال کہتا ہے کہ مومن کو بھی آپؐ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرنی چاہیئے۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

قرآن کریم جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کائنات میں ارتقائی کشمکش جاری ہے۔ اسلام رجائیت کی تعلیم دیتا ہے قنوطیت کی نہیں۔ اسلام کردار کی تعمیر میں جدوجہد کی ضرورت پر زور دیتا ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ کا درس دیتا ہے۔ اسلام میں زندگی کو فعال اور باعمل گزارنے کی تعلیم ہے لیکن بعد ازاں ہمارے صوفیائے کرام نے کچھ تو وقتی تقاضوں کی خاطر اور کچھ عیسائی رہبانیت سے متاثر ہو کر ترک دنیا کی تعلیم دینی شروع کر دی جو کہ اسلام کی روح کے خلاف تھی اسی رجحان کے خلاف اقبال کہتے ہیں۔

اس قرآں میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر!

شکوہ میں اقبال نے خدائے تعالیٰ سے امت مسلمہ کی زبوں حالی اور خواری کا شکوہ کیا ہے لیکن جواب شکوہ میں اس خواری کے وجوہ بیان کئے ہیں۔ مسلمان پستی میں اس لئے جا گرے ہیں کہ انہوں نے تعلیماتِ قرآنی سے روگردانی اختیار کر لی ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اقبال کا بحیثیت شاعر ایک نہایت بلند مقام ہے۔ ان کی اردو اور فارسی شاعری کو نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ یورپی اور ایشیائی ممالک میں امتیازی حیثیت حاصل ہے انکے کلام کا کئی غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ان کے نظریہ خودی پر بہت بحث کی گئی ہے اس پر تنقید بھی کی گئی ہے اور داد و تحسین بھی ملی ہے۔ اقبال کے نظریہ خودی کے متعلق بہت سی متضاد باتیں کہی گئی ہیں کوئی اسے نطشے کے خیالات کا عکس قرار دیتا ہے تو کوئی برگساں اور ولیم جیمز کے نظریات کی پرچھائیں بتاتا ہے خودی کا مطلب احساس فرض معرفت حق اور تعین ذات ہے اور اقبال کے نزدیک خودی کا عرفان قرآن کے سوا اور کہیں نہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک حدود خودی کے تعین کا نام شریعت، اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔

روزگار فقیر جلد اول کے صفحہ ۱۸۳ پر درج ہے کہ علامہ یوسف سلیم چشتی نے سوال کیا کہ آپ کے فلسفۂ خودی کا ماخذ کیا ہے تو علامہ نے فرمایا کہ یہ آیت استحکام خودی پر دال ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ
مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا
فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۃ مائدہ آیت ۱۰۵)

اقبال کے ہاں خالق اور مخلوق کی خودی الگ الگ ہیں البتہ خالق کی خودی سے مخلوق کی خودی منسلک ہونے کی پیہم کوشش کرتی ہے اور کاملین کو یہ مقام بھی میسر آجاتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال نے کیا خوب کہا ہے میں تو شراب لا الٰہ الا ہو کا گرویدہ ہو چکا ہوں یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ہو!

یہ مے پی کر اقبال کی لے اور نے ہندی نہ رہی حجازی ہو گئی اور توحید کا جلوہ سایہ فگن ہو گیا۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے "لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" یعنی جو کچھ زمین اور آسمان میں وہ اللہ ہی کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سورہ حج میں آیت ۵ میں ذکر ہے "تو زمین کو خشک دیکھتا ہے پھر جب ہم اس پر پانی نازل کرتے ہیں تو لہلہانے اور ابھرنے لگتی ہے اور قسم قسم کی نفیس چیزیں اگاتی ہے"۔ اسی قرآنی حکمت کو الارض للہ کے زیر عنوان بالِ جبریل میں بیان کرتے ہیں:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار ؟
خاک یہ کس کی ہے ؟ کس کا یہ نور آفتاب ؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب!
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب!
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں ، تیری نہیں !
تیرے آبا کی نہیں ، تیری نہیں ، میری نہیں !

اقبال نے نہ صرف خودی کا تصور قرآن سے لیا بلکہ انہوں نے جا بجا قرآنی افکار سے استفادہ حاصل کر کے اس کی روح کو اپنے شعروں میں سمو دیا ہے اقبال کے اشعار قرآن کی آیات کی تفسیریں ہیں۔

سراج نظامی اپنے مضمون دانائے راز میں اقبال کے کلام کے اسی پہلو پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں۔

"کلامِ اقبال بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے بلا شبہ یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ آپ نے جو کچھ سمجھا قرآن حکیم سے سمجھا اور آپ کی شاعری کا اصل مدعا صرف یہی ہے کہ قرآن کے بصیرت افروز پیغام کو دنیائے انسانیت میں عام کر دیا جائے ۔ آپ کی مسلسل سعی کا یہ اثر ہوا ہے کہ آج سینکڑوں اربابِ فکر اقبال کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں کرتے ہیں اور ان کی رائے ہے کہ کئی بار ایسا ہوا کہ قرآن کے کسی مشکل مقام پر پہنچ کر رک گئے تو آپ کے ایک شعر نے ذہن میں بجلی کی طرح کوند کر صحیح راستے کی طرف راہنمائی کر دی اور اگر آپ کے کسی شعر میں الجھن پیدا ہوئی اور مطلب سمجھ میں نہ آیا تو قرآن حکیم کی کسی آیت نے اسے واضح کر کے ذہن نشین کر دیا۔

"ایک مرتبہ راجہ حسن اختر مرحوم و مغفور کی خدمت میں حاضر تھا گفتگو کا موضوع کلام اقبال تھا۔ راجہ صاحب نے فرمایا کہ چند دن ہوئے میں نے علامہ صاحب سے اس شعر کا مطلب پوچھا ؎

محمد بھی ترا جبریلؑ بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

آپ نے مطلب بتانے سے انکار کر دیا۔ وجہ پوچھی تو فرمانے لگے "میں مطلب بتا کر تمہیں مقید نہیں کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے کہ تم مجھ سے اچھا مطلب نکالنے میں کامیاب ہو جاؤ۔"

ایک دن میں قرآن حکیم کی تلاوت کر رہا تھا جب میں اس آیت پر پہنچا "تحقیق ہم نے تمہاری طرف کتاب نازل کی جس میں تمہارا ذکر ہے" ۱۰/۲۱ تو مندرجہ بالا شعر کا مطلب واضح ہو گیا۔ قرآن حکیم انسان کی ترجمانی کرتا ہے "ضالین" ہیں تو ہم، انعمت علیہم ہیں تو ہم مغضوب علیہم ہیں تو ہم۔ قوانین خداوندی پر ایمان لا کر اس کی کرم نوازیوں سے شاد کام ہوتے ہیں تو ہم ان سے سرتابی کر کے نامرادیوں سے ہم کنار ہوتے ہیں تو ہم۔"

اقبال کے کلام میں سے اگر ان اشعار کو لے لیا جائے جو آیات قرآنی کے تراجم ہیں یا تفسیریں ہیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اقبال نے کہا جہاں تک میرا اپنا مطالعۂ قرآن ہے ، اسلام کا مقصد اتنا ہی نہیں کہ افراد کی اخلاقی اصلاح کر دی جائے ، اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ تدریجی مگر بنیادی انقلاب بنی نوع انسان کی پوری اجتماعی زندگی میں برپا کیا جائے اور قومی و نسلی زاویۂ نظر کو بدل کر ان کی جگہ خالص انسانی شعور و احساس پیدا کیا جائے"

کیا اس امر سے انکار ممکن ہے کہ اقبال نے قرآن کے انقلابی پیغام کو اپنی شاعری کی بنیاد بنایا ہے۔ اقبال نے وطنیت کے بت کو پاش پاش کیا۔ فرنگی تہذیب کے طلسم کا پردہ چاک کیا۔ اور مسلمانوں کو درس دیا کہ وہ آپس میں متحد ہو جائیں۔ انہوں نے ملت بیضا کے سامنے اپنے خطبات کے ذریعے قرآنی تعلیمات کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اتحاد بین المسلمین کا تصور

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں تفرقہ مت ڈالو

سے لیا ہے۔ اسی تصور کو وہ شعر کی زبان میں کہتے ہیں ۔

ایک ہوں مسلم وطن کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

اور یہ اتحاد وطنیت پرستی کے مروجہ سیاسی مسلکوں اور نظریات کی بنا پر ممکن نہیں ہے بلکہ یہ قرآنی احکامات کی پابندی کرنے اور تعلیمات قرآنی پر

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی
(اقبال)

علامہ اقبال مصروفِ مطالعہ

علامہ اقبال کے والد بزرگوار شیخ نور محمد

ڈاکٹر اقبال افغانستان کے ہز ایکسلنسی سردار عبدالقدوس کے ہمراہ

گول میز کانفرنس میں علامہ اقبال مولانا شوکت علی کے قریب بیٹھے ہیں

گول میز کانفرنس کی ایک اور تصویر جس میں علامہ اقبال بھی شریک ہیں

علامہ اقبال حیدر آباد دکن میں (۱۹۲۹ء)

اسپین کی مسجد قرطبہ میں
علامہ اقبال مصروفِ عبادت

علامہ اقبال
دورۂ کابل کے موقع پر
سر راس مسعود کے
ہمراہ

عل پیرا ہونے سے ممکن ہوگا۔ قرآن سے روگردانی کرنے سے تو مسلمان ہی قائم نہیں رہ سکتی۔ ایسے میں اتحاد بین المسلمین کا کیا سوال؟

گر تو میخواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

اقبال کے فارسی کلام میں بھی جا بجا اردو کلام کی طرح قرآنی بصیرت کا پرتو نظر آتا ہے ان کے کئی فارسی اشعار آیات قرآنی کی تفسیریں ہیں۔ ایسی چند مثالیں درج ذیل ہیں،

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ
بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے

اقبال کے اشعار ملاحظہ ہوں،

لا الٰہ باشد صدف، گوہر نماز
قلب مسلم را حج اصغر نماز
در کفِ مسلم مثال خنجر است
قاتل فحشا و بغی و منکر است

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ
اے لوگو تم (بھی) خدا کے محتاج ہو اور اللہ (تو) بے نیاز (اور خود تمام) خوبیوں والا ہے۔

اقبال اس کی تفسیر بیان کرتے ہیں:-

بے نیازی رنگ حق پوشیدن است
رنگ غیر از پیرہن شوئیدن است
بر سر ایں باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود الا ہو، بزن

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا
وہ ذات پاک ایسی ہے، جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کے لئے جو کچھ زمین میں موجود ہے سب کا سب۔ کلام اقبال پر غور کیجئے:

من نگویم درگذر از کاخ و کو
دولتِ تست ایں جہانِ رنگ و بو
دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر
صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر

اقبال کے کلام میں کئی تراکیب قرآنی قصص سے ماخوذ ہیں اور کئی قرآنی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں ان میں چند ایک لا الٰہ الا اللہ، قم باذن اللہ، چوب کلیم، موسیٰ و فرعون و طور، نعرۂ لاتذر، شریک زمرہ لاتحزنوا، آتش نمرود براہیم کا ایماں، لوح و قلم، اللہ ہو جیسے الفاظ اور تراکیب بطور مثال ہیں۔

اقبال نے قصہ آدم کے قرآنی حقائق کی نہایت ہی عجیب، دلکش اور روح پرور جذبہ کے ساتھ تفسیر بیان کی ہے۔

قصہ ہبوط آدم کی تفسیر انہوں نے خطبات مدراس کے تیسرے خطبے ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا میں کی ہے لیکن اس کا انداز فلسفیانہ ہے جبکہ بال جبریل میں شاعرانہ اور عارفانہ انداز میں اس کی تفسیر موجود ہے۔ فرشتے آدم کو جنّت سے رخصت کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

ہبوط آدم کے بعد، روح ارضی آدم کا استقبال (عجیب والہانہ انداز میں) کرتی ہے۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ!
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ!
ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ!
بے تاب نہ ہو معرکہ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے!
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے!
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے!
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے!
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ!

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں!
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں!
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں!
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں!
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!

اقبال کی شخصیت اور خیالات اور احساسات پر قرآن نے نہایت ہی گہرا اثر ڈالا ہے۔ اقبال کو مردِ قلندر کا خطاب دلوانے، اس کو ایک مفکر شاعر بنانے، اس کی شخصیت میں ایسی بے نیازی پیدا کرنے ؏
(چرچا ہے شاہوں میں تیری بے نیازی کا)
اور اقبال کو صحیح معنوں میں اسم بامسمیٰ بنانے میں قرآن حکیم کا نہایت ہی اہم اثر ہے۔ قرآن کی جھلک اقبال کی زندگی اور اس کے کلام اور تحریروں میں نمایاں ہے۔

اقبال نے خود قرآن کے متعلق اپنی فارسی شاعری میں جو کچھ کہا ہے اس میں چند چیدہ چیدہ نمونۂ کلام پر میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست
نقشہائے کاہن و پاپا شکست

جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

کلامِ اقبال میں قرآن پاک پر علامہ کی نظم "کتابِ زندہ" پڑھنے کے لائق ہے اس کا آخری شعر ہے۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ اُو رحمۃ للعٰلمیں

اقبال کا فلسفۂ علم و عشق

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

نتائج کے لحاظ سے اقبال کے ہاں علم و عقل ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ بازی گاہِ حیات میں دونوں پٹتے رہے۔ ع

جیتا ہے رُومی ہارا ہے رازی

محملِ لیلیٰ تک صرف رُومی کا ہاتھ پہنچا۔ اور ع

بُوعلی اندر غبارِ ناقہ گم

ہربرٹ اسپنسر کا قول ہے:

KNOWLEDGE ENDS IN WONDER

(علم و آگہی تحیّر پر ختم ہو جاتے ہیں)

"وَنڈر سے" مراد حیرت، تشکیک اور تذبذب ہے۔ یہی علمِ بے عشق کا حاصل ہے۔

انسان کو رازجُو بنایا
راز اُس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوقِ آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

فلسفہ لاانتہا زمانوں سے یہ سوال پوچھ رہا ہے۔ کہ اس کائنات کا اَساسی عنصر کون سا ہے؟۔ اور اس میں یہ نظم و نسق اور حُسن کیسے پیدا ہوا؟ کسی نے پانی، کسی نے خاک، اور کسی نے آگ کو بنیادی جوہر قرار دیا۔ اس فکر میں رفتہ رفتہ لطافت آتی گئی اور فیثا غورث نے اعلان کیا کہ یہ فطرت ریاضی کا ایک کھیل ہے۔ اور یہ مختلف اشیا ریاضیاتی اعداد و تناسب سے وجود میں آئی ہیں بقراط، افلاطون اور ارسطو کے ہاں حقیقی وجود صرف عقل کا ہے۔ اور کائنات کے خارجی مظاہر فریبِ نظر ہیں، فلسفہ آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے یعنی مسائلِ حیات کو الجھا رہا ہے۔ ہماری حیرت (تشکیک و تذبذب) میں مزید اضافہ کر رہا ہے۔

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے

اقبال یہ نہیں کہتے کہ عقل بیکارِ محض ہے بلکہ وہ اس پر زور دیتے ہیں کہ عقل سے وہی کام لیا جائے جو وہ کر سکتی ہے۔ مثلاً کائنات میں غور و تدبر، ایجاد و تحقیق، عناصر کی تسخیر، فضا اور روشنی سے توانائی حاصل کرنا۔ طاقتور آلاتِ سمعی و بصری کی ایجاد سے سمیع و بصیر بننا علوم و فنون میں اضافہ تہذیب و تمدن کی رفتار کو قائم رکھنا و قس علیٰ ہذا۔ علم و خرد سے حقیقتِ حیات دریافت کرنا اور اس "امر" کے متعلق کچھ پوچھنا جس نے کائنات کو ایک رشتۂ وحدت اور بے نظیر

نظم و نسق میں باندھ رکھا ہے، ایسا ہی ہے جیسے کسی انجینئر سے کوئی پوچھے۔ کہ ملیریا، کالرا، اور ٹی بی کے جراثیم میں کیا فرق ہے؟

اس دنیا میں ایک بھی ایسا حکیم و فلسفی موجود نہیں۔ جو یہ بتا سکے کہ حیات کیا ہے؟ کہاں سے آتی ہے۔ اور موت کے بعد کہاں چلی جاتی ہے؟ یہ تو آخر بڑے بڑے مسائل ہیں۔ یہاں تو اتنا بتانے والا بھی کوئی نہیں۔ کہ نیند کیا ہے اور جمائی کیا؟ فکر کیا ہے اور نظر کیا؟ ان حالات میں ہم عقل کو کیوں راہبر بنائیں؟

عشق کی حقیقت

کائنات کی سب سے بڑی حقیقت خدا ہے۔ جو قوت۔ روشنی۔ جمال اور جلال کا ماخذ اول ہے۔ اس کا قرب توانائی و عظمت عطا کرتا ہے اور بُعد اسی طرح ناچیز و حقیر بنا دیتا ہے، جیسے کوئی قطرہ سمندر سے اچھل کر ساحل کی ریت پر آگرے اور وہیں فنا ہو جائے۔

اللہ سراپا خیر ہے۔ اور صرف خیر کو پسند کرتا ہے۔ حدیث میں وارد ہے:

انّ اللہ جمیلٌ و یُحبّ الجمال

(خدا جمیل ہے - اور صرف جمال کو پسند کرتا ہے)

انسانی اعمال میں کچھ برے ہیں۔ مثلاً ظلم، بدکاری، چوری وغیرہ اور کچھ اچھے مثلاً خدمت، محبت، عبادت، دیانت وغیرہ، ہر اچھا عمل حسن ہے جو عامل کو حسین، عزیز اور عظیم بناتا ہے۔ اللہ ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا اور حضوری کی اجازت دیتا ہے۔ اچھے عمل سے ایک قسم کی فرحت جنم لیتی ہے۔ جو بڑھنے لگے تو سوز و مستی میں بدل جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حیات کبھی جان اور کبھی تسلیم جاں کہلاتی ہے۔ جہاں نارِ نمرود گلستاں بن جاتی ہے۔ جہاں زندگی کا سیلاب تمام رکاوٹوں کو پھلانگ کر منزل کی طرف بے محابا بڑھنے لگتا ہے۔ اور جہاں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کے ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

عصرِ رواں اس حقیقت سے غافل ہے کہ جسم کیفیات روح سے دمبدم متاثر ہوتا ہے غم سے چہرہ مرجھا جاتا ہے اور خوشی سے چمک اٹھتا ہے ہمارا ہر عمل چہرے پر کچھ اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک شرابی جواری، چور، ڈاکو اور حرام کھانے والے کی صورت اتنی مسخ ہو جاتی ہے کہ اسے دیکھ کر نفرت و کراہت ہونے لگتی ہے۔ دوسری طرف ایک راستباز عابد اور خدا ترس کا چہرہ اتنا دلکش حسین اور جاذب بن جاتا ہے۔ جیسے اس کی جبیں میں چاند ڈوب رہا ہو۔

تعرفہم بسیماھم (بقرہ-۲۷۳)

(تم انہیں ان کی جبینوں سے پہچان لوگے)

انسانی صورت و شخصیت اعمال و افکار کے سانچے میں پیہم ڈھلتی رہتی ہے۔ اعمال اچھے ہوں تو صورت بھی جمیل ہو جاتی ہے ورنہ قبیح بن جاتی ہے۔ یقین نہ آئے تو اپنے بدکاروں، بے نمازوں اور اوباشوں، شرابیوں کی شکلیں دیکھو۔ یا ملحدوں کے کھردرے چہروں پہ نظر ڈالو۔ ساتھ ہی کسی پارسا کے چہرے پر بھی ایک نگاہ ڈال لو آپ پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ جسمانی حسن حسین روح سے جنم لیتا ہے۔ دہریوں نے خدا کا انکار کر کے اور مغرب نے عملاً خدا کو حریم دل سے نکال کر خود کو مایوسیوں کے سمندر میں ڈبو لیا ہے اور اپنے جسموں میں قباحتیں بھر لیں ہیں۔

دانشِ مغرب حجابِ اکبر است
بت پرست و بت فروش و بت گر است
پا بزندانِ مظاہر بستۂ
از حدودِ حس بروں ناجستۂ
در صراطِ زندگی از پا فتاد
بر گلوے خویشتن خنجر نہاد

سکون و مسرت کا سرچشمہ ایک مطمئن روح ہے۔ اور روح کو اطمینان اللہ کے ذکر سے ملتا ہے۔ ذکر الٰہی سے غافل انسان کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ کسی ریاست کا سربراہ کیوں نہ ہو اور نہ وہ دنیا کو آرام و راحت پہنچا سکتا ہے۔ دوسروں کو راحت صرف

خدائی ہدایات پر عمل کرنے سے پہنچ سکتی ہے جو شخص اللہ سے کٹا ہوا ہو آسمانی قدروں سے نا آشنا ہو جزا و سزا کا قائل نہ ہو اور صرف دنیوی مال و متاع کو سب کچھ سمجھتا ہو وہ دوسروں کے آرام کا خیال کیوں رکھے گا؟ وہ انصاف کیسے کرے گا؟ اور خواتین کو کیوں مقدس و محترم سمجھے گا؟

عصرِ حاضر را خرد زنجیرِ پاست
جانِ بے تابے کہ تو خواہی کجاست
از درونِ ایں گلے بے حاصلے
بس غنیمت داں اگر روید دلے

انسان اشرف المخلوقات ہے وہ خدائے اعلا و برتر کے سوا کہیں اور سر نہیں جھکاتا ــــ مغربی مادیت نے طرح طرح کے صنم تراش لئے ہیں اور انسان کو ربُّ العرش کی عبادت سے ہٹا کر پیٹ پوجا پر لگا دیا ہے یہ اسکی انتہائی توہین ہے - بے شک روٹی کمانا فرض ہے لیکن روٹی کی عبادت کفرِ ہے انسان کی عظمت و غیرت روٹی سے نہیں بلکہ:

خودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ

علم و عشق میں فرق

توانائی کے آخذ دو ہیں اول تو کائنات - جو مختلف توانائیوں مثلاً فولاد کوئلہ تیل وغیرہ کا سٹور روم ہے - دوم ربِّ کائنات - کائنات کے مخازن تک صرف علم کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے - اور کوئی بے علم ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا - رہا ربِّ کائنات تو اس کی خلوت میں صرف عشق (یعنی اطاعت عبادت ذوقِ جبیں سائی اور ایمان) جا سکتا ہے۔

عقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

علم زندگی کا جلال ہے اور عشق جمال، دونوں مل جائیں تو حیات کمال حاصل کر لیتی ہے۔

اقبال کے مرشد حضرتِ رومیؒ برسوں صیادِ عقل کے نخچیر رہے بقول اقبال:

پائے در زنجیرِ توجیہاتِ عقل
کشتیش طوفانیٔ ظلماتِ عقل
موسیٰ بیگانہ سینائے عشق
بے خبر از عشق و از سودائے عشق

پھر ان کی ملاقات حضرتِ شمس تبریزیؒ سے ہوگئی اور ان کا علم عشق میں بدل گیا -

امام غزالی (۱۱۱۱ء) بھی اس کشمکش میں مبتلا رہے (المنقذ من الضلال) خود اقبال بھی برسوں یہ سوچتے رہے کہ وہ سوز رومی کو اپنائیں یا پیچ و تابِ رازی کو - اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے:

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من عقل است غلامِ من

عشق کا سرمایہ عزم و یقین ہے اور عقل کا ظن و تخمین - عقل کی پرواز آسمان تک ہے اور عشق کی لامکاں تک:

عشق سلطان است و برہانِ مبیں
ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں
عشق با نانِ جویں خیبر کشاد
عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد
کلّۂ نمرود بے ضربے شکست
لشکرِ فرعون بے حربے شکست

اقوامِ مغرب

اقوامِ مغرب عشق سے محروم ہو کر بہت کچھ کھو چکی ہیں ان سے سکونِ قلب چھن گیا - وہ اُس سوز و ساز جذب و شوق اور سرور و مستی سے بیگانہ ہو گئیں جو حیات کا مقصد بھی ہے اور ماحصل بھی - انہیں نہ ناز کی دولت ملی نہ نیاز کی - ان کے پاس صرف علم ہے - سرکش اور باغی علم - جو انسانی بستیوں پہ آگ اور موت برساتا ہے اگر ساتھ عشق بھی ہوتا

یہ اس کی سرکشی کو روکتا اور اس کے منہ میں لگام دیتا اب ان کے پاس علم کا امرت نہیں بلکہ زہر ہے:

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب اے انقلاب

یہ تسلیم کہ ہمارے لئے علم اتنا ہی ضروری ہے جتنی غذا و ہوا۔ لیکن علم ایک اسپ سرکش ہے جسے صرف عشق رام کر سکتا ہے۔ اس لئے **عقل و عشق** کو جادۂ حیات میں ہم سفر ہونا چاہیے۔

عشق چون با زیرکی ہم بر شود
نقش بند عالم دیگر شود

مغرب کے چند علماء و مستشرقین نہ صرف اشعار مشرق کو مغرب کی زبانوں میں منتقل کر رہے ہیں بلکہ ان میں سے بعض انہیں اپنا رہے ہیں — مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا دیوان مغرب شاہد ہے کہ مغرب اپنی بے جان اور سرد مادیت سے تنگ آکر مشرق سے سوز و حرارت کی بھیک مانگ رہا ہے اسکے دیوان میں وہی روشنی گرمی اور توانائی پائی جاتی ہے جو حافظ شیرازی اور رومی کے ہاں ملتی ہے، جرمنی کا ایک اور حکیم ہرڈر سعدی سے متاثر تھا۔ شلر نظامی سے راکرٹ رومی سے اور فان ہیمر حافظ سے درست کہا تھا اقبالؔ نے:

"یوں محسوس ہوتا ہے کہ فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے اس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں آئین سٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے" (دیباچہ پیام مشرق)

اقبالؔ نے ایک مقام پر **عقل و عشق** کا ایک مکالمہ پیش کیا ہے جس میں عقل کہتی ہے کہ میں اسرارِ حیات کھولتی، عقدہ ہائے زندگی کو سلجھاتی اور انسان کو سمیع و بصیر بناتی ہوں۔ عشق جواب میں کہتا ہے:

چو با من یار بودی نور بودی
بریدی از من و نورِ تو نار است

یعنی اے عقل جب تک تو میرے ساتھ رہی تو نور تھی۔ لیکن مجھ سے کٹ جانے کے بعد تو نار بن گئی ہے۔

اور میرے اس مقالے کا حاصل بھی یہی ہے۔

اقبال ۔ بحیثیت فارسی شاعر

ڈاکٹر صغریٰ بانو شگفتہ

"یہ دنیا حقیقت میں ایک ایسی جلوہ گاہ ہے جس کے دامن میں ممتاز شخصیتیں اپنی تمام دانائیوں کے ساتھ چھپی ہوئی ہیں اور پھر مہر درخشاں کی طرح ایک معین وقت پر افق زیست پر نمودار ہوتی ہیں زندگی کی راہوں کو روشن کرتی ہیں اور آخر غروب ہستی کے بستر استراحت پر محوِ خواب ہو جاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ممتاز ہستیاں ہی زمان و مکان کی زینت ہیں۔ یہ گلشن حیات کی نادر اور پرکشش کلیاں ہیں جو شاہکار جہاں کہلانے کی مستحق ہوتی ہیں اور یہی نہیں یہ ہستیاں تو حقیقت میں رہنمائے بشریت ہیں۔ سرزمین مشرق جو کا حسن سراپا نور ہے آغوشِ وحی و الہام اور گہوارۂ فلسفہ و ادیان بھی ہے۔ اسی مشرق نے اپنی آغوش میں بے شمار برگزیدہ ہستیوں کو پروان چڑھایا ہے جن میں سے ایک محمد اقبال لاہوری بھی ہیں۔"

جی ہاں یہ گہر ہائے آب دار، یہ والہانہ ہدیۂ عقیدت کے کلمات ایران کے ایک دانشور ڈاکٹر ابوتراب رازانی کے لبوں سے نکلے ہیں۔ اقبال جیسے عظیم و منفرد مفکر کی زندگی اور فکر و فن پر بڑے بڑے علمائے ادب و فن نے بہت کچھ لکھا ہے اور اب تو اقبال کی شہرت وطن کی حدود و ثغور سے ماورا ہے اور وہ حقیقت میں پورے عالم کی متاع عزیز ہیں تاہم اقبال دوستی میں ایران کو گونہ نسبت حاصل ہے۔ ایران کی زبان فارسی ہے اور اقبال کا بیشتر کلام فارسی ہی میں ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اقبال کی فارسی گوئی پر گفتگو کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر جنوبی ایشیا سے فارسی زبان کے تعلق پر گفتگو کر لی جائے۔

یہ امر مسلّم ہے کہ جنوبی ایشیا میں فارسی اور دینِ اسلام دونوں ایران ہی کی راہ سے داخل ہوئے۔ سندھ میں محمد بن قاسم کا حملہ اور پنجاب میں محمود غزنوی کے حملے اشاعت دین اسلام کی تبلیغ اور فارسی و عربی کی ترویج میں ممد و معاون رہے۔ محمد بن قاسم شیراز کے گورنر تھے۔ گو خود عرب نژاد تھے مگر ان کی فوج کا بیشتر حصہ ایرانیوں پر مشتمل تھا جنہوں نے سندھ میں آ کر بود و باش اختیار کی۔

غزنوی دور (۹۶۲-۱۱۸۶) میں سلطان محمود غزنوی نے جہاد کا ارادہ کیا اور ہندوستان پر متعدد حملے کئے اس نے پنجاب و کشمیر کی تسخیر کی اور یہاں باقاعدہ حکومت قائم کی اور اس سرزمین سے ایسا تعلق استوار کیا کہ جب آخری غزنوی بادشاہ سلطان خسرو ملک

نے جب غزنہ میں غوریوں سے شکست کھائی تو اس نے لاہور ہی کی راہ اختیار کی چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ لاہور اس دور میں علم و ادب کا مرکز ہونے کی بنا پر غزنی ثانی کہلایا۔

غزنوی دور کے تمام سلاطین دلدادگان علم و ادب اور علوم اسلامی کے سرپرست رہے عنصری، فرخی، عسجدی، فردوسی اور منوچہری اس دور کے مشہور فارسی شعرا تھے۔ خود اقبال کے اشعار میں منوچہری کی تقلید ملتی ہے۔ فارسی بڑی آب و تاب سے اس خطے میں داخل ہوئی اور بتدریج ترقی کرتی رہی۔ غزنوی حکمرانوں کے بعد بھی سلاطین غوری (۱۲۰۶ - ۱۱۴۸) سلاطین مملوک (۱۲۹۰-۱۲۰۶) سلاطین خلجی (۱۲۹۰ - ۱۳۲۰) سلاطین تغلق (۱۴۱۴-۱۳۲۰) سلاطین سادات (۱۴۱۴ - ۱۴۵۱) سلاطین لودھی (۱۵۲۶-۱۴۵۱) اور سلاطین مغل (۱۸۵۷-۱۵۲۶) اس برصغیر پر حکمرانی کرتے رہے اور ان ادوار میں فارسی کشمیر، پنجاب، راجپوتانہ، سندھ، آسام، بہار، بنگال، گجرات، حیدرآباد دکن اور گولکنڈہ تک پہنچ گئی اور اس تمام دور میں فارسی زبان کا ادب اپنے کمال پر پہنچ گیا اور کشف المحجوب، تاریخ بیہقی، ترجمہ کلیلہ و دمنہ، سیاست نامہ سیر الملوک، لباب الالباب جیسی کتابیں وجود میں آئیں۔ مغلیہ دور تو علم و ادب کے اعتبار سے سنہری دور کہلاتا ہے۔ مغلیہ سلاطین و شہزادگان بڑے علم دوست، دانش گستر اور ہنر پرور تھے۔ انہوں نے ہر طرح شعرا اور ادبا کی سرپرستی کی۔ وہ مناظر قدرت کے بھی بڑے دلدادہ تھے۔ ان کے گرمیوں کے ایام اکثر جنت نظیر کشمیر کی فردوسِ نظر وادیوں میں گزرتے، یہاں فطرت کی رنگینیوں سے محظوظ و مسرور ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شعر و نغمہ سے لطف لینے کے لئے چوٹی کے شعرا اور مغنیوں کو بھی اپنے ساتھ رکھتے۔ چنانچہ اس دور میں شاہوں کی ہم جلیسی کا شرف عرفی کلیم صائب اور غنی جیسے فارسی گو شعرا کو میسر آیا۔

خلاصہ کلام یہ کہ شہر لاہور اور کشمیر کی سرزمین علم و ادب کے اعتبار سے ہمیشہ زرخیز رہی۔ کشف المحجوب تصوف پر پہلی جامع کتاب ہے جس کے مولف سرمدِ صوفیا شیخ ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری ہیں جنہیں عرف عام میں داتا گنج بخش بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نادر کتاب لاہور ہی میں تصنیف ہوئی۔ اسی طرح کلیلہ و دمنہ کا پہلوی نام کلیلگ و دمنگ تھا اور سنسکرت میں اس کا نام کرتکا و دمنکا تھا۔ اسے نوشیرواں عادل (۵۷۹ - ۵۳۱) کے زمانے میں اس کا طبیب برزویہ کشمیر سے ایران لے گیا۔ اس اہم کتاب کا فارسی میں ترجمہ ابو المعالی نصر اللہ نے (۱۱۴۴ - ۱۱۴۳) میں کیا۔ بہر نوع تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لاہور اور کشمیر کی سرزمین زمانۂ قدیم سے گوہر درانہ پیدا کرتی رہی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے دور استبداد میں بھی کشمیر اور لاہور میں فارسی زبان کی ترویج کرنے والے موجود تھے۔ چنانچہ برصغیر کی تاریخ میں مسلمانوں پر ایک ایسا وقت آیا جب وہ اپنی اجتماعی زندگی کے تاریک ترین دور سے گذر رہے تھے۔ ایسے میں ایک کشمیری برہمن خاندان میں ایک خورشید صبح آفرین طلوع ہوتا ہے۔ جو زیور علم سے مزین ہو کر نہ صرف پورے مشرق کو بلکہ تمام دنیائے اسلام کو اپنے آتشین افکار سے روشن و منور کر دیتا ہے جس کا نام نامی محمد اقبال ہے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ تقریباً تمام مشرق وسطیٰ پر انگریزوں کا تسلط تھا۔ اور مسلمان حکومتیں اپنی شان و شوکت جاہ و جلال کھو بیٹھی تھیں۔ ترک حکومت رو بزوال تھی۔ یونان ۱۸۲۹ء میں ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ بلغاریہ کے نام سے ایک نئی حکومت وجود میں آئی۔ قبرص انگلستان سے جا ملا۔ نہر سویز نے انگریزوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کر رکھی تھی۔ گویا کہ ایشیا پر انگریزوں کا کامل تسلط تھا۔ ایسے میں ہمارا یہ قومی شاعر سیالکوٹ میں آنکھ کھولتا ہے۔ لاہور میں پرورش پاتا ہے اور بقول ڈاکٹر مشائخ فریدانی جو پاکستان میں ایران کے سابق سفیر رہ چکے ہیں اور فارسی زبان کے ایک برگزیدہ دانش مند بھی ہیں

"اقبال نے فارسی زبان کو اس دور میں زندہ

کیا جبکہ وہ دم توڑنے والی تھی اور فقط لوح مزار یا
پھر یونانی حکیموں کے نسخوں کی پرچیوں تک محدود
ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے میں اقبال کے فارسی اشعار
نے اس مدھم چراغ کی روشنی کو دوچند کر دیا۔"

اقبال خود اپنی فارسی دانی کے سلسلے میں کہتے ہیں:

"لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ اقبال کو فارسی
کیسے آگئی۔ جبکہ اس نے اسکول یا کالج میں یہ زبان
نہیں سیکھی، یہ معلوم نہیں کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل
کے لئے اسکول ہی کے زمانے سے کس قدر محنت کی
اور کتنے اساتذہ سے استفادہ کیا ہے۔" (اقبالنامہ)

جہاں تک اقبال کے اساتذہ کا تعلق ہے، یہ امر مسلم ہے کہ اقبال میں ذوق فارسی کی روح ان کے استاد مولوی سید میر حسن صاحب نے پھونکی۔ مشرق میں میر حسن اور مغرب میں نکلسن اور براؤن نے اس آتش کو اور بڑھایا۔ ادھر لاہور میں سر تھامس آرنلڈ نے اقبال کی علمی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے، بلکہ بقول احمد سروش:

"سر تھامس آرنلڈ نے صحیح معنی میں اقبال کے
وجدان و فکر کا انکشاف کیا۔"

چنانچہ ایک طرف میر حسن کی معنوی بصیرت، دین سے لگاؤ اور انسان دوستی کا اثر اقبال پر پڑا اور اس کے نتیجے میں واقعی ان کی روح بشر دوستی، اور اسلامی تمدن اور عشق رسول و آل رسول میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا گئی۔ اور دوسری طرف آرنلڈ نے اقبال کے ذہن کو مغرب کے بہترین افکار سے آشنا کر دیا۔ مگر فارسی گوئی کی ترغیب بیشتر مولوی میر حسن نے دلوائی۔ اگرچہ فارسی سے خود اقبال کو فطری طور پر لگاؤ تھا اور کبھی کبھار فارسی میں شعر کہہ لیتے تھے۔

۱۹۰۲ء میں پہلی مرتبہ انہوں نے ایک نظم لکھی جس کا پہلا بند اردو اور دوسرا فارسی میں تھا۔ دراصل یہ نظم اقبال نے اظہار تشکر کے طور پر منشی سراج الدین کو بھیجی تھی، جبکہ انہوں نے کشمیر سے چار انگوٹھیاں اقبال کو بطور ہدیہ بھیجیں تھیں۔ اگرچہ یہ نظم ان کے مجموعہ کلام میں چھپ نہ سکی مگر اقبال نامہ میں یہ پوری نظم موجود ہے۔

۱۹۰۴ء تک اقبال نے جستہ جستہ فارسی اشعار کہنے شروع کر دیئے تھے۔ چنانچہ نظم ہلال اور التجائے مسافر میں بھی پہلے بند میں فارسی شعر ملتے ہیں۔ ان کی نظم "ہلال" کے چند اشعار ملاخطہ ہوں۔ ؎

تیری نظر کو رہی دید میں بھی حسرت دید
خنک دلی کہ تپید و دمی نیا سائید
تپش ز شعلہ گرفتند و بر دل تو زدند
چہ برق جلوہ بخاشاک حاصل تو زدند

اور یہ التجائے مسافر کا ایک شعر ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار توام
اگر کشادہ جبینم گل بہار توام

یہ تو چیدہ چیدہ اشعار تھے مگر فارسی غزل یا مسلسل فارسی نظم اقبال نے یورپ میں کہی۔ شیخ عبدالقادر نے مقدمہ بانگِ درا میں ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ اقبال اپنے کسی دوست کے یہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی خواہش کی گئی۔ اقبال نے یہاں اعتراف کیا کہ انہوں نے اب تک مستقل فارسی نظم کہنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن اس فرمائش نے ان کے قلب میں ایک ایسی تحریک پیدا کی کہ دعوت سے واپسی پر گھر آئے اور تمام شب فارسی میں شعر کہتے رہے۔ صبح اٹھ کر شیخ عبدالقادر سے ملے اور دو تازہ غزلیں سنا ڈالیں۔ لیکن اس کے بعد فارسی شعر نہ کہہ سکے اور وطن لوٹنے تک (۱۹۰۸ء) تقریباً چار پانچ سال تک ان کی فارسی گوئی پر جمود طاری رہا۔ لیکن راقم السطور کا خیال ہے کہ وہ ان ایام میں اپنے کو فارسی شاعری کے لئے آمادہ کرتے رہے۔

اقبال کے شعری آثار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں فارسی شعراء سے ہمیشہ لگاؤ رہا۔ ان کے کتب خانے میں فارسی اساتذہ کے دواوین ان کی لائبریری کی زینت رہے۔ خود یورپ میں عطیہ بیگم

لے اقبال سے پہلی ملاقات پر یہ احساس کیا کہ گویا اقبال کو پورا دیوان
حافظ تقریباً حفظ ہے۔ اس کے علاوہ عجم کی تاریخ و تمدن و فلسفہ
سے ان کا لگاؤ ان کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری DEVELOPMENT
OF METAPHYSICS IN PERSIAN سے ہی ظاہر ہے۔

احمد بیرجندی (ایرانی دانشمند) اقبال کے اس لگاؤ کے
متعلق کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

"حق تو یہ ہے کہ اقبال کو ایرانی ادب سے
والہانہ عشق تھا اور برصغیر میں فارسی شاعری کی
اشاعت و ترویج میں اقبال نے ایک اہم کردار
ادا کیا ہے۔ وہ واقعی "دانائے راز" اور "خودآگاہ"
تھے نہ فقط یہ بلکہ محب دین، محبِ مشرق اور
بالخصوص محبِ ایران تھے۔"

اقبال کی مستقل فارسی شاعری ان کی معروف و مشہور مثنوی
"اسرار و رموز" سے شروع ہوتی ہے۔ اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں
طبع ہوئی جہاں تک فارسی میں شعر کہنے کا تعلق ہے تو اس کی سب
سے نمایاں وجہ ان کا فارسی زبان کی طرف میلان و رجحان ہے،
جس کی بنا پر انہوں نے فارسی کی تاریخ ادبیات کا وسیع مطالعہ کیا۔ ادبیاتِ عجم
پر اُن کی عمیق نگاہ رہی۔ قبل از اسلام ایرانی حکومتوں کی تاریخ و تمدن کو کھنگالا۔ ماد،
ہخامنشی، اشکانی، ساسانی یہ تمام ادوار ان کی نگاہ سے پوشیدہ
نہ تھے۔ پھر اسلام سے عشق کی بنا پر اسلامی تاریخ ان کی رگ و
پے میں سما چکی تھی۔ قبل از اسلام ارسطو، افلاطون، افلاطونیانِ
جدید اور بعد از اسلام فلسفہ اشراقی و فلسفہ تشکیکی کا عمیق مطالعہ
تھا۔ الغرض ادبیات عجم کے اتنے وسیع مطالعہ کے بعد فارسی
مثنوی لکھی۔ اور سب سے اہم وجہ تو یہ تھی کہ اقبال فارسی زبان کو
تمام ممالک اسلامی تک رسائی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اقبال اپنے پیغام
خودی اور پھر رمزیت بے خودی کو عالمگیر بنانا چاہتے تھے، ورنہ
شعر برائے شعر اور ادب برائے ادب ان کا نظریہ نہ تھا۔ بلکہ اب شعر
برائے زندگی اور ادب برائے حیات ان کا مقصد بن چکا تھا چنانچہ
اسرار خودی کے مقدمہ میں خود فرماتے ہیں: ؎

شاعری زین مثنوی مقصود نیست
بت پرستی بت گری مقصود نیست

ہندیم از پارسی بیگانہ ام
ماہ نو باشم تہی پیمانہ ام

حسن انداز بیان از من مجو
خوانسار و اصفہان از من مجو

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرز گفتار دری شیرین تر است

فکر من از جلوہ اش مسحور گشت
خامۂ من شاخ نخل طور گشت

پارسی از رفعت اندیشہ ام
در خورد با فطرت اندیشہ ام

مندرجہ بالا اشعار میں ہندی سے مراد اردو ہے۔ گویا انہوں
نے خود اقرار کیا ہے کہ میری وسعت فکر کے لئے فارسی جیسی
شیریں وسیع دامن رکھنے والی زبان ہی موزوں ہوسکتی ہے اور
جس نے میرے قلم کو نخل طور پر بنا دیا ہے۔ جو میری طبیعت و
فطرت کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس کے علاوہ خود
"عجم" سے محبت کا اعتراف اور اس کی بیداری کی سعی
کے ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عجم از نغمہ ام آتش بجان است
صدای من درای کاروان است

دیدہ از خاک عجم نورانی است
لاجرم طرز نگہ تورانی است

یا پھر وہ مشہور غزل جس کا مطلع ہے۔

چون چراغ لالہ سوزم در خیابان شما
ای جوانان عجم، جان من و جان شما

عجم کے مقابلے میں عرب والوں سے گلہ مند ہیں کہتے ہیں:

نوای من بہ عجم آتش کہن افروخت
عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بی خبر است

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فارسی شاعری میں انہوں نے کن شعرا کی تقلید کی اور اسلوب شاعری کو نسا ہے۔ جہاں تک سبک ہندی کا تعلق ہے اقبال نہ اس سبک کے سختی سے پیرو کار ہیں اور نہ ہی انہوں نے اس سبک سے قطعی پرہیز کیا ہے۔ چنانچہ ان کی فارسی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم شعرا کی پیروی بھی کی اور ان پر اعتراضات بھی کرتے رہے ہے۔ خود سبک ہندی میں شعر کہنے والوں کی پیروی بھی کی ہے۔ اور ان سے شکایت بھی ہے۔ پھر اسرار خودی میں شعرا کے متعلق کہتے ہیں۔

کاروانہا گرچہ زین صحرا گذشت
مثل گام ناقہ کم غوغا گذشت

بہر نوع سبک ہندی میں انہوں نے نظیری کی تقلید کی ہے اسی طرح عرفی اور غالب کی پیروی میں بھی اشعار ملتے ہیں:
دراصل اقبال جمال و جلال دونوں کے قائل ہیں مگر مسلم میں جلال کا پہلو نہ ہو تو انہیں کلمہ گو ہونے پر شک ہوتا ہے۔ چونکہ کلمہ میں بھی جلال کا پہلو نمایاں ہے، اور جہاں کہیں کسی کلام میں جوش و ولولہ نظر آتا اسے وہ قبول کر لیتے ہیں۔
عرفی کا ذکر شعر میں اس طرح ہے۔

حدی را تیز تر خوانم چو عرفی
کہ رہ خوابیدہ و محمل گران است

اور نظیری کے اس شعر کو مثنوی اسرار خودی شروع کرنے سے پہلے جگہ دی ہے۔

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

اسی طرح غالب کی بھی پیروی کی ہے غالب کا شعر ہے۔

سوختہ جگر تا کجا رنج چکیدن دھم
رنگ شو ای خون گرم تا بہ پریدن دھم

اقبال کہتے ہیں۔

مثل شرر ذرہ را تن بہ تپیدن دھم
تن بہ تپیدن دھم بال بہ پریدن دھم

سبک ہندی سے قطع نظر مثنوی میں اقبال نے مولانا رومی کی تقلید کی ہے جس کا اعتراف جگہ جگہ کرتے نظر آتے ہیں، چنانچہ اسرار خودی کے مقدمہ میں کہتے ہیں۔

روی خود بنمود پیر حق سرشت
کو بحرف پہلوی قرآن نوشت
باز بر خوانم ز فیض پیر روم
دفتر سربستۂ اسرار علوم
شعلہ در گیر زد بر خس و خاشاک من
مرشد رومی کہ گفت منزل کبریاست
موجیم و در بحر او منزل کنم
تا در تابندہ ای حاصل کنم

بہر نوع مولانا رومی تو ان کے پیرو مرشد تھے۔ لیکن حکمت، فلسفیانہ اور صوفیانہ افکار میں اقبال، رومی کے علاوہ سنائی، عطار، عراقی اور محمود شبستری سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ انیس شاملو، کلیم، صائب اور جامی کے اشعار تضمین کے طور پر کلام میں لائے ہیں۔ نہ فقط یہ بلکہ گاہے گاہے ان کے اشعار میں نغانی، جلالی، علی قلی سلیم، رضی دانش، خاقانی، بیدل اور طالب کا رنگ بھی ملتا ہے۔
غزل میں اقبال نے حافظ کا انداز بیان، عرفی کا جوش اور

نظیری کا جلال و جمال اپنایا ہے۔ حافظ کے متعلق تو خود کہتے ہیں کہ جب میں حافظ کے رنگ میں غزل کہتا ہوں تو حافظ کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے، چنانچہ کہتے ہیں:۔

نغم گلی ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نواز شیراز است

بہر نوع ان کی غزلوں میں بھی ان کا پیغام جھلکتا ہے اگرچہ تغزل کمال پر ہوتا ہے مگر ساتھ ساتھ مسائل حکمت و فلسفہ بھی موجود ہیں۔ اور شاید ان کا یہ اسلوب جس کے وہ خود موجد ہیں ادبیات فارسی کی تاریخ میں پہلی بار وجود میں آیا ہے۔

بہر نوع پیام مشرق کے بیشتر حصے اور زبور عجم میں اُن کی غزلیات کے بہترین نمونے ملتے ہیں، جن میں حافظ کے بعد رومی، سعدی، عراقی، جامی اور سبک خراسانی میں منوچہری اور ناصر خسرو علوی کی تقلید نظر آتی ہے۔

غزل کے علاوہ رباعی، قطعہ، مسمط، ترکیب بند، مستزاد اور قصیدہ بھی فارسی میں ملتا ہے۔ قطعات و رباعیات، پیام مشرق اور ارمغان حجاز میں ملتی ہیں۔

نظموں میں سعدی کا رنگ اختیار کیا ہے۔ انہیں کی طرح عنوانات قائم کر کے نظم کہی ہے جیسے " قطرۂ آب اور طیارہ " اس میں سعدی کے اشعار کی تضمین بھی ہے۔ قطعات میں شاہین و ماہی جو ناصر خسرو کی تقلید میں ہے۔

ان کی نظموں میں جوش، ولولہ، غیرت، جدت اور شیرینی سب ہی کچھ شامل ہے۔ ان کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موج بے تابی
ہمیشہ در طلب ہستی چہ مشکلی داری؟
ہزار لولو و لالاست در گریبانت
درون سینہ چو من گوہر دلی داری!
تپید و از لب ساحل رمید و ہیچ نگفت

اس نظم میں اقبال بہت ہی دل پذیر انداز سے بتاتے ہیں کہ کس طرح میں سمندر کے پاس گیا اور موج بیتاب سے استفسار کیا کہ آخر تجھے کیا مشکل ہے جو ہمیشہ طلب میں بیتاب ہے میرے تو گریبان میں ہزار ہا لعل و گوہر ہیں مگر کیا میرے سینے میں جو گوہر قلب ہے آیا اس کی نظیر تیرے پاس ہے۔ اور وہ جواب میں کسمسائی، تڑپی اور لب ساحل سے فرار کیا اور کچھ نہ کہا۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان کی فارسی شاعری میں خواہ وہ کسی صنف میں ہو شیرینی، زیبائی، آہنگ، موسیقی، رمزیت، رومانیت، کلاسیکیت، جدت، وسعت فکر، ہیجان، تمثیل، استعارہ، سمبولزم، سوز و گداز، سرشاری فکر، شوخی، طنز ملیح، حسن لفظی و معنوی غرض ہر طرح کی چاشنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام تقریباً ہر زندہ زبان انگریزی، اردو، جرمنی، فرانسیسی، عربی وغیرہ میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیکن ایران اور ایرانیوں نے حق ادا کر دیا کسی ایرانی دانشمند نے انہیں " ماہتاب در شام شرق " کے نام سے، کسی نے " خود آگاہ و دانائے راز " کے نام سے اور کسی نے " برگزیدہ ترین محصولات زمان و مکان " سے۔ کسی نے " گل سرسبد عالم وجود " سے، کسی نے " شاہکار جہان خلقت و راہنمائے بشریت " سے، کسی نے " برگزیدہ ترین گویندگان قرن اخیر " کہہ کر پکارا حتیٰ کہ ایک ایرانی دانشمند نے ہمارے اس قومی شاعر کو " ایران کی نو سالہ ادبی تاریخ کا خلاصہ " کہہ کر یاد کیا ہے۔

ان دانشمندوں کے بالترتیب اسماء یہ ہیں۔ غلام حسین یوسفی، احمد بیرجندی، ڈاکٹر رازانی، استاد فروزانفر اور بہار۔ نہ جانے کتنے ایرانی شعراء نے اقبال کی برسی کے موقع پر صدہا تحسین و آفرین کے اشعار ہدیۂ عقیدت کے طور پر پیش کئے ہیں۔

جہاں تک ایرانی شعراء اور دانشمندوں کی اقبال دوستی کا تعلق ہے اس ضمن میں ہمارے ایک پاکستانی دانشمند ڈاکٹر عرفانی نے ایک گراں بہا کتاب " اقبال ایرانیوں کی نظر میں " لکھ کر حق دوستی

ادا کیا۔ یہ بیش بہا کتاب تقریباً ۲۸ ایرانی دانشمندوں کے افکار کی جلوہ نمائی کرتی ہے۔ آخر میں "دانش گستر و دانش پرور شاہنشاہ آریامہر کے پیغام کا ترجمہ بقول معروف "کلام الملوک ملوک الکلام" درج کیا جاتا ہے جو یوم اقبال کے موقع پر جاری کیا گیا اور بعد میں "ماہی پاکستان (تہران) میں شائع ہوا۔

ترجمہ: " پیام شاہنشاہ آریامہر"

یوم اقبال کی مناسبت سے ہم ایک بار پھر مشرق کے ادب و عرفان کی اس نامی گرامی شخصیت پر درود بھیجتے ہیں اور اپنی قلبی مسرت کا اظہار کرتے ہیں کہ گذشتہ سالوں کی طرح آج پھر اس عظیم شاعر اور مفکر کی یاد پورے احترام کے ساتھ منائی جا رہی ہے۔ اقبال لاہوری کی ذات ایران کے لوگوں کی نظر میں دو سبب سے محترم اور باعث دلچسپی ہے ایک یہ کہ اقبال اپنی ساری زندگی اخلاق و روحانیت کے انتہائی اعلیٰ اصولوں اور انسان دوستی و نیک نیتی کے فلسفوں کے علمبردار رہے۔ دوسرے یہ کہ وہ نہ فارسی ادب کے مخلص دوست تھے بلکہ وہ بذات خود موجودہ صدی کے فارسی ... کے بہترین نمائندہ بھی تھے اور یہ بات نادر دیکھی گئی ہے کہ ایک غیر ایرانی شاعر نے فارسی زبان میں اس قدر رواں اور دل نشین شاعری کی ہو۔ پیام مشرق، زبور عجم اور ارمغان حجاز جیسے مجموعہ ہائے کلام بے شک فارسی ادب کے خزانے میں نفیس ترین اضافے ہیں لیکن اقبال کی شاعری نہ فقط لفظی فصاحت سے مزین ہے بلکہ اس میں ایک اعلیٰ اور معنی آفرین روح اور فلسفہ جلوہ فرما ہے۔ ہم اقبال لاہوری کو ان کی اس روح و فکر کی بنا پر ایک حقیقی انسان شمار کرتے ہیں اور ان کے لئے اس مقام کے قائل ہیں جو بے شک انسانیت کے حقیقی خدمت گاروں کو میسر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہم دعا کرتے ہیں کہ ان کی روح پر اپنی ابدی رحمتیں نازل فرمائے اور دنیا کے لوگوں کو اس روحانیت و محبت سے نوازے جس کیلئے اقبال نے انتھک قلم فرسائی کی۔

غزل

حسیر نوری (ڈھاکہ)

★

برق ستم گرا کے پشیماں ہے آسماں
گلشن میں اٹھ رہا ہے لگاتار اب دھواں

اہل چمن ذرا مری ہمت کی داد دو
پھر بجلیوں کی زد پہ بناتا ہوں آشیاں

کٹتی ہے صبح و شام کی گردش میں زندگی
یہ وقت ہی بتائے گا بدلے گا کب سماں

سوچا ہے پھر بلائیں گے ہم ان کو پیار سے
مانا کہ ان دنوں ہیں وہ کچھ ہم سے بدگماں

آنکھوں میں ہیں سبھی کے اندھیرے بھرے ہوئے
جلتے ہیں دل کے داغ دکھائیں کسے یہاں

شاید نہیں ہے اس بھری محفل میں کوئی شخص
شاید کہ داستاں ہے مری سب کی داستاں

طوفاں میں اپنے ہاتھ سے پتوار بھی گئی
کشتی ہے بادباں کے سہارے پہ اب رواں

مہر سکوت لب پہ لگاؤ ذرا حسیر
ماحول ہو نہ جائے کہیں تم سے بدگماں

★

اقبال اور نظریۂ اجتہاد

سجاد حارث

علامہ اقبال کی شخصیت دو واضح عناصر کی آمیزش اور انجذاب سے بنتی ہے۔ ان میں سے ایک فکر اقبال ہے اور دوسرا عنصر ان کا فن ہے۔ عام طور پر ہم شاعر۔ اقبال کو زیادہ تفصیل اور توصیفی انداز سے جانتے ہیں مفکر۔ اقبال کو ہم بہت کم جانتے ہیں یعنی صرف اس حد تک جانتے ہیں کہ ان کے فکری نظام کے موضوعات اور عنوانات کیا ہیں۔ رہی اس ضمن میں تفصیلات سے کما حقہٗ آگہی چونکہ یہ جان جوکھوں کا کام ہے فکر و مطالعے کا متقاضی ہے اس لئے بالعموم لوگ اسے مقدس پتھر سمجھتے ہوئے محض چوم کر چھوڑ دیتے ہیں یوں تو ہمارے ملک میں افسوسناک شرح خواندگی کے باعث ایک بڑی اکثریت اقبال کے مجتہدانہ تصورات سے نابلد نظر آتی ہے تاہم دانشور طبقے کی ایک قلیل تعداد جو اقبال کے تصورات و نظریات کا علم اور شعور رکھتی بھی ہے، ان کے ہاں عام طور پر جذباتی اور روایاتی رویہ زیادہ نظر آتا ہے۔ عقلیت پسندی تیز تحلیل و تجزیے کا رجحان ان اصحاب کے ہاں خال خال ہی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اقبال کی شاعری کی تشریحات پر جتنا لکھا گیا ہے، رویہ تغیر سیاسی سماجی اور معاشی حالات کے تناظر میں اقبال کے فکر و فلسفہ پر مقابلتاً کم سوچا اور تحریر کیا گیا ہے اس سلسلے میں اگر کچھ تحریریں ملتی بھی ہیں تو وہ بہ تغیر الفاظ ایک ہی ذہنی سانچے سے نکلی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان تحریروں میں بالعموم اقبال کے فکر و فن کو بیرا فروز کرتے ہی کی سعی بلیغ نظر آتی ہے اقبال کی جن تحریروں کی جانب کم سے کم توجہ دی گئی ہے ان میں مثلاً اجتہاد سرفہرست ہے۔

قیام پاکستان کے چند ہی برسوں بعد ملک میں جو سیاسی صورت حال پیدا ہوئی اس کے تحت اقبال کا اصل چہرہ بالالتزام چھپانے کی سعی کی گئی۔ قدامت پسند اور جامد فکر رکھنے والے دانشوروں نے اقبال کے مجتہدانہ اور حرکی تصورات کے گرد ایک مضبوط گھیرا ڈال لیا تاکہ وہ اپنے مخصوص مفادات کے پیش نظر فکر اقبال کا صرف وہ پہلو ہی عوام الناس کو دکھا سکیں جو ان کے نزدیک بے ضرر ہو سکتا تھا، تاہم چند برس پیشتر جب سرمایہ داروں جاگیرداروں اور استحصالی طبقات کے خلاف ملک گیر سیاسی مہم کا آغاز ہوا ملک کے سیاسی اور تاریخی عمل میں ایک نیا ابھار آیا اس وقت اقبال کو ان مفاد پرست اور رجعت پسندوں سے پہلی بار نجات حاصل ہوئی۔ اس سے پہلے اقبالیات کے ان نام نہاد دانشوروں نے قومی شاعروں کو محض درسگاہوں ادبی مجلسوں اور قوالوں کی محفلوں میں قید کر رکھا تھا۔ استحصال دشمنی اور مساوات کے نعروں نے اقبال کو اب قومی پیمانے پر بحث کا موضوع بنا دیا ہے۔ اب لوگ اقبال کے افکار و نظریات کو ملک کی معروضی صورت حال کے حوالے سے دیکھنے لگے ہیں۔

عہد سرسید سے اقبال تک دانشوروں اور مصلحین کی ایک پوری کھیپ

نظر آتی ہے جن کے پیچھے اور سرگرمیوں کے شعبے اگرچہ مختلف ہیں لیکن مطمحِ نظر ایک ہے یعنی قوم کی اصلاحِ احوال۔ اور ان تمام اصلاحی خیالات اور جذبات کی زیریں سطح پر سیاسی غلامی کا المناک احساس بھی بدستور کار فرما نظر آتا ہے۔ تاہم اقبال اور دیگر مصلحین کے مابین ایک بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ اقبال کے عہد اور اس عہد سے پیشتر کے تمام مصلحین کی فکر و نظر محض برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی اصلاح تک محدود رہتی ہے لیکن اقبال اپنے وسیع مطالعے مشاہدے اور فکر و بصیرت کی صلاحیتوں کی بنا پر قومی پستی اور سیاسی غلامی کا تجزیہ زیادہ وسعتِ نظر سے کرتے ہیں، وہ سفید فام آقاؤں کو بین الاقوامی اقتصادی اور معاشی و تاریخی رشتوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں وہ ان کی حریصانہ نظریں پہچانتے ہیں ان کے استعماری اور استحصالی عزائم کو اچھی طرح جانتے ہیں اور پھر وہ ان حالات میں جب رنگ و نسل کے بتوں کو اور جغرافیائی حد بندیوں کو توڑ کر ملت میں جذب ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں تو سیاسی مفہوم میں یہ بات بڑی معنی خیز اور دوررس اثرات کی حامل بن جاتی ہے۔ ان کے تجربات و مشاہدات نے ان پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ بین الاقوامی استعمار کی قوت کا کامیابی سے مقابلہ بین الاقوامی نقطہ نظر اور بین الاقوامی اتحاد کے ذریعے سے ہی کیا جا سکتا ہے اسی کے تحت اقبال اس دور میں قومیت کے پرستار نہیں رہتے بلکہ اسے وہ مغرب کی سازش اور شاخسانہ قرار دیتے ہیں اور اس کی شد و مد سے مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر اسے ہم اقبال کی سیاسی حکمت عملی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے اس نظریے کے لئے دلائل اور جواز اسلامی معتقدات سے ہی مہیا کرتے ہیں لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ یہ اسلامی معتقدات تو صدیوں سے موجود تھے لیکن اقبال سے پہلے چند استثنائی مثالوں سے قطع نظر ملت اسلامیہ کے اتحاد اور جذبۂ اخوت کو کسی نے بھی اس انداز سے نہ ابھارا تھا نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی تھی جیسی کہ اقبال کے ہاں ہم دیکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا شاید حقیقت پسندی ہوگی کہ تاریخ اسلام اور عالمی تاریخ میں اس نوع کے متعدد واقعات ملتے ہیں جب ایک ہی ملت کے حکمراں اور عوام آپس میں دست و گریباں ہوئے ہیں، ایک دوسرے کو بنوک شمشیر زیر کرنے کی کوششیں کی ہیں، ایک تاجدار نے دوسرے تاجدار کا ملک اور مال و متاع تباہ کیا ہے اور بے گناہ لوگوں کا قتل عام تک کیا ہے۔ بعض مواقع اور مقامات پر اس نوع کا ملی اتحاد اور جذبۂ اخوت یقیناً ملتا ہے لیکن یہ اتحاد اور یہ جذبہ بالعموم دیرپا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس اتحاد کی بنیاد میں ملوکیت اور فرمانرداؤں کی ذاتی مصلحتیں مادی اور سیاسی مفادات زیادہ اہمیت رکھتے تھے، روحانی رشتے ان مفادات اور مصلحتوں کے تابع ہوا کرتے تھے اور یہ بات ان ممالک اور خطوں میں جہاں ملوکیت سرمایہ داری اور جاگیرداری کے باقیات موجود ہیں آج بھی اتنی ہی سچ نظر آتی ہے جتنی کہ پہلے تھی۔

علامہ اقبال کے پیش نظر نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی مادی خوشحالی سیاسی آزادی اور روحانی بیداری کے مسائل تھے بلکہ وہ دنیا کے تمام مسلمانوں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر۔ پوری بنی نوع انسان کی بہتری اور بہبود کے خواب دیکھتے تھے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ محض مجرد فلسفے سے سیاسی مادی اور روحانی بلندیوں تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ مادی حالات انسانی معاشرے اور افراد کے اذہان و کردار بدلنے کے لئے صحیح فکری زاویوں اور ایک ٹھوس لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ اقبال نے ماضی کی تاریخ کا بھی مطالعہ کیا تھا اور حال کے سیاسی واقعات اور گرد و پیش کی دیگر تحریکات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ انہیں اس بات کا بے حد قلق تھا کہ صدیوں سے ایشیائی ممالک سیاسی غلامی اور ذہنی افلاس میں مبتلا ہیں۔ اسلامی دنیا میں تاتاری غارت گری کے بعد علوم و فنون کے چراغ بجھ گئے ہیں اور جو ممالک آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور رہے ہیں وہاں ملوکیت اور مطلق العنانی نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جن سے ملت اسلامیہ کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا گیا۔ ان ممالک میں بتدریج تحقیق و اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔ نت نئے مسائل پیدا ہوئے لیکن انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق حل کرنے کے بارے میں سوچنا بند کر دیا گیا۔ اسلاف پرستی اس درجہ ترقی کر گئی کہ عوام و خواص جامد اور مقلد بن کر رہ گئے۔ ارباب سیاست نے دین اور دنیاوی معاملات میں جب استبدادی طریقے اختیار کئے تو وہاں علمائے سوء کی کثرت نظر آنے لگی ہر نیا خیال تحقیقی جذبہ اور ترقی پسند نقطہ نظر فتویٰ فروشوں کی ریشہ دوانیوں اور غیظ و

غضب کا شکار ہو گیا۔ جب کبھی اور جہاں کہیں دین کے نام پر اس قسم کا استبداد روا رکھا گیا ہے وہاں ذہن ٹھٹھر گئے علم و فن کے چراغ بجھ گئے اور قدامت پسندی اور روایات کی پرستش کا دوسرا نام مذہب بن گیا زندگی اور معاشرہ چونکہ جامد اور ٹھہری ہوئی حقیقتیں نہیں ہیں تغیر پذیر اور انقلاب آفریں حقیقتیں ہیں اس لئے زندگی جب نت نئی منزلیں طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے انسانی فکر اگر رو بہ تغیر زندگی کا ساتھ نہیں دیتی تو پورا معاشرہ انتشار اور تضادات کا ملغوبہ بن جاتا ہے چنانچہ علامہ اقبال اپنے خطبے "الاجتہاد فی الاسلام" کا آغاز ہی اس بنیادی نکتے کی وضاحت سے کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"تہذیب و ثقافت کی نظر سے دیکھا جائے تو بحیثیت ایک تحریک کے اسلام نے دنیائے قدیم کا یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا کہ کائنات ایک ساکن و جامد وجود ہے۔ برعکس اس کے وہ اسے متحرک قرار دیتا ہے۔"

(تشکیل جدید۔ الہیات اسلامیہ ترجمہ از سید نذیر نیازی صفحہ ۲۲۳)

دنیا کے وہ تمام لوگ جو زندگی اور انسانی معاشرے کے بارے میں سائنسی نقطہ نظر اور رویہ رکھتے ہیں اپنے تمام تر مباحث کا نقطۂ آغاز ہی اس اولین حقیقت کو ٹھہراتے ہیں۔ اپنی شاعری میں علامہ اقبال ملّا پر جو طعن و طنز کے تیر چلاتے ہیں اس کی بنیادی وجہ ملّا کی جامد فکر اور تحقیق و تجزیے سے اس کا گریز پا رجحان ہے۔ اگرچہ وہ اللہ کی اطاعت فطرت صحیحہ کی اطاعت سمجھتے ہیں جو ایک قائم و دائم وجود کی حیثیت رکھتی ہے تاہم اس کے فوراً بعد ہی وہ ملّا اور ملّا پرست جامد اذہان کو یہ بھی سمجھاتے ہیں۔

"لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب تو ہے نہیں کہ اس سے تغیر اور تبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے اس لئے کہ تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی آیت ٹھہرایا ہے۔ اس صورت میں تو ہم اس شے کو جس کی فطرت ہی حرکت ہے حرکت سے عاری کر دیں گے۔

(تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ترجمہ از سید نذیر نیازی صفحہ ۲۲۵ ۲۲۶)

آگے چل کر وہ اس امر کی صراحت کر دیتے ہیں کہ اسلام کی ہیئت ترکیبی میں جو عنصر حرکت اور تغیر قائم رکھتا ہے یا رکھ سکتا ہے وہ اجتہاد ہے

اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ نظری طور پر مسلمانوں کے سواد اعظم نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ مباحث اور گفتگو میں خلوص دل سے ہر فرد اجتہاد کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کرتا ہے لیکن جب اس پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو اس پر ایسی شرطیں عائد کر دی جاتی ہیں جن کو بقول اقبال پورا کرنا ناممکن تو کیا سرے سے محال نظر آتا ہے۔

اقبال اپنے اس خطبے میں اس ذہنی روش کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں جس نے قانون اسلام کو عملاً سر تا سر جامد بنا کے رکھ دیا ہے۔ وہ اس کی درج ذیل وجوہ بتلاتے ہیں۔

(۱) دولت عباسیہ کے دور میں معتزلہ کی عقلی تحریک اور آزاد خیالی جس کی وجہ سے عباسیوں کو خطرہ محسوس ہونے لگا تھا اور جنہوں نے آگے چل کر قدیم الخیال علماء کی اس لئے حمایت کی کہ تحریک عقلیت کے اندر بعض ایسی باتیں مضمر تھیں جن کے سیاسی نتائج ان کے لئے بڑے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ چنانچہ قدیم الخیال علماء نے فقہی مسائل کی حدود کو ہر طرف سے متعین کر کے سرے سے اجتہاد کا دروازہ ہی بند کر دیا۔

(۲) رہبانی تصوف کا نشو و نما غیر اسلامی اثرات کے ماتحت رفتہ رفتہ غور و فکر تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اس روش کا ایک سبب بنا۔ مذہبی پہلو سے دیکھا جائے تو تصوف عبارت ہے اس بغاوت سے جو فقہائے متقدمین کی لفظی حیلہ تراشیوں کے خلاف پیدا ہوئی فلسفیانہ موشگافیوں میں تصوف اور اعتزال کا راستہ اور طریقہ کار ایک جیسا ہو گیا اور مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ اس میں جذب ہو کر رہ گئے نتیجتاً اسلامی ریاست کی باگ ڈور اب متوسط درجے کے افراد یا بے علم عوام کے ہاتھوں میں آ گئی انہیں اپنی عافیت اسی میں نظر آئی کہ مذاہب فقہ کی اندھا دھند تقلید کرتے چلے جائیں۔

۳- تیرھویں صدی کے وسط میں اسلامی دنیا کا ذہنی مرکز بغداد تباہ و برباد ہو گیا۔ سیاسی زوال و انحطاط کے اس دور میں قدامت پسند مفکرین نے اپنی ساری کوششیں مسلمانوں کی حیات ملی کو ایک

ایک رنگ اور یکساں صورت میں تبدیل کرنے پر صرف کر دیں تاکہ اس طرح ملّت میں مزید انتشار نہ پیدا ہو۔

علامہ اقبال نے اجتہاد کے خاتمے کی جن وجوہ کو بیان کیا ہے خارجی واقعات اور حقائق کی رو سے تو یہ قطعاً درست ہیں تاہم اگر اس امر کا تجزیہ کیا جائے کہ زیریں سطح پر اس اصل وجوہ کیا تھیں تو یہ بات سمجھنا مشکل نہ ہوگی کہ ہر دور میں اجتہاد کے دروازے اس بالائی طبقے نے بند کئے ہیں جو سماجی اور سیاسی سطح پر تغیر اور انقلاب کو اپنے مخصوص مفادات کے منافی سمجھتے تھے۔ یہ دولت عباسیہ کا دور رہا ہو یا وہ دور جب بقول اقبال اسلامی ریاست کی باگ ڈور بے علم عوام کے ہاتھوں میں تھی یا فتنۂ تاتار کے بعد سیاسی زوال و انحطاط کا دور رہا ہو ہر زمانے میں حکمران اور مقتدر طبقے کے یہ سیاسی اور معاشی مفادات ہی تھے جو اجتہادی کوششوں اور اس کی مختلف النوع مؤثرات کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے تھے اور یکساں و یک رنگ صورت حال کو قائم و دائم رکھنا اپنی دولت و طاقت کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبے میں جن تین وجوہ کو بیان کیا ہے اس ضمن میں وہ مقتدر اور حکمران طبقے کے سیاسی اور معاشی مفادات کی جانب بین السطور اشارے کر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بشیر احمد ڈار اپنے مضمون "فکر اقبال ـ مسئلہ اجتہاد" میں، ان ادوار میں نفی اجتہاد کی کوششوں کے باب میں واضح طور پر کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کے نزدیک یہ "غیر فطری حدود و بندی" تھی۔

فتنۂ تاتار کے دور پر غور کرتے ہوئے علماء کے تحریری عمل پر اقبال نے پہلے غلط نتائج کا استخراج کیا تھا قومی وحدت کے پیش نظر وہ اجتہاد کے مقابلے پر تقلید کی حمایت کر بیٹھے تھے لیکن بعد ازاں انہیں اپنا نقطۂ نگاہ غلط معلوم ہوا اور پھر اپنے خطبات میں اپنے نتائج اور فیصلے پر انہوں نے خود تنقید کی۔ اب نئے سرے سے انہوں نے اپنے خیالات کا جائزہ لیا اور قومی شیرازہ بندی کے نام پر اجتہاد کی نفی کو ناپسندیدگی سے دیکھا۔ اب انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ قومی شیرازہ بندی سے انحطاط کا کلی طور پر راستہ بند نہیں کیا جا سکتا اور اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا۔

"اندریں صورت اگر قوم کے زوال و انحطاط کو روکنا ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ ہم اپنی گزشتہ تاریخ کو بے جا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں یا اس کا احیاء خود ساختہ ذرائع سے کریں"

آگے چل کر وہ اس نکتے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لہٰذا زوال و انحطاط کے سد باب کا اگر کوئی ذریعہ فی الواقع مؤثر ہے تو یہ کہ معاشرے میں اس قسم کے افراد کی پرورش ہوتی رہے جو اپنی ذات اور خودی میں ڈوب جائیں کیونکہ ایسے ہی افراد جن پر زندگی کی گہرائیوں کا انکشاف ہوتا ہے اور ایسے ہی افراد وہ نئے نئے معیار پیش کرتے ہیں جن کی بدولت اس امر کا اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ہمارا ماحول سرے سے ناقابل تغیر و تبدل نہیں ہے۔ اس میں اصلاح اور نظرثانی کی گنجائش ہے۔"

(تشکیل جدید الہٰیات اسلامیہ ترجمہ از نذیر نیازی صفحہ ۲۴۴)

علامہ اقبال ان سطور میں جن افراد کی پرورش اور سرپرستی کا ذکر کر رہے ہیں ایسے افراد کی پرورش اور نشو و نما مخصوص معروضی حالات کے بغیر سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ اگر کسی معاشرے میں مذہب کے نام پر تحقیق اور آزادی فکر پر قدغن لگادی جائے اختلافی نقطہ ہائے نظر پر فتووں کی تلواریں لٹکا دی جائیں اجتہادی نظریات پر نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا جانے لگے اظہار اور ضمیر کی آزادیاں سلب کرلی جائیں تو ایسے تحدیدی اور استبدادی حالات اور مسموم فضا میں افراد پر زندگی کی گہرائیوں کا انکشاف ہونا امر محال ہے اور اگر کوئی سخت جان فرد ان حالات میں نئے معیار پیش کرنے کی جرأت بھی کرے گا تو وہ تنہائی اور ہلاکت کا شکار ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ مناسب حالات کو پیدا کرنے کے لئے معاشرے کا معروضی اور مادی ڈھانچہ تبدیل کرنا اوّلین فرض بن جاتا ہے ہمارے ملک میں جب تک جاگیردارانہ نظام اور اس کے پیدا کردہ ادارے موجود ہیں فکری آزادی اور تحقیقی جذبے ہلاکت کے شکار ہوتے رہیں گے۔ صنعتی نظام کی ضرورت او پھیلاؤ سے ہی انہیں زندہ کیا جا سکتا ہے۔

گزشتہ صدیوں میں ملّت اسلامیہ جس جمود اور ذہنی پستی میں ڈوبی رہی ہے علامہ اقبال کا فکر و فن اس المناک صورت حال کو ختم کرنے کی طلبگا

کرتا ہے۔ ان کا واضح طور پر نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن زندگی کا حرکی تصور پیش کرتا ہے اور ارتقائی نظریہ قرآنی عقائد کے عین مطابق ہے چنانچہ وہ معاشرے میں سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں اور تغیرات کو امر لازم سمجھتے ہیں۔ اپنے خطبے "الاجتہاد فی الاسلام" میں قرآن کے اس حرکی نظریے پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

"ائمہ مذاہب کا یہی دعویٰ تھا کہ ان کے استدلال اور تعبیرات حرف آخر ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اندریں صورت مسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اگر اس امر کا دعویدار ہے کہ اسے اپنے تجربات علی ہذا القیاس زندگی کے بدلتے ہوئے احوال و ظروف کے پیش نظر فقہ و قانون کے بنیادی اصولوں کی از سر نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو غلط ہو۔

قرآن پاک کا یہ ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کا متقضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے یہ نہیں کہ اسے اپنے لئے ایک بوجھ تصور کرے۔

(تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ترجمہ از نذیر نیازی صفحہ ۲۴۴)

علامہ اقبال اسلام کے آغاز کو درحقیقت استقرائی یعنی سائنٹیفک ذہن کا آغاز سمجھتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام میں چند بنیادی ہدایات دینے کے بعد انسان کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ اپنے حالات اور زمانے کے تغیرات کے مطابق اپنے لئے قوانین وضع کرے، معاشرتی زرعی سیاسی اداروں اور اقتصادی ڈھانچے کا تعین کرے اور ملی و انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے لئے عقل اور اپنے تجربات سے کام لے یہی وجہ ہے قرآن میں بار بار انسانی عقل اور تجربے پر نیز فطرت اور تاریخ کے مطالعے پر زور دیا گیا ہے علامہ اقبال نے جس زمانے میں اجتہاد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اگرچہ آج کی دنیا میں سیاسی صورت حال مقابلتاً کافی تبدیل ہو چکی ہے تاہم اس باب میں ان کے خیالات و نظریات کی صداقت، آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

اجتہاد کے تیسرے ماخذ اجماع پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں

"بہر حال یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں جو نئی قوتیں ابھر رہی ہیں کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیش نظر مسلمانوں کے ذہن میں بھی اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ بلاد اسلامیہ میں جمہوری روح کی نشو و نما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بڑا ترقی زا قدم ہے"

(تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ترجمہ از سید نذیر نیازی صفحہ ۲۶۸)

تیسری دنیا میں آج جو ذہنی انقلاب آ رہا ہے اور ایک نئے اقتصادی نظام کا نقشہ ترتیب پا رہا ہے عالمی استحصالی اور استعماری قوتوں پر ضرب کاری کا جو عمل شروع ہو چکا ہے یہ عالمگیر سیاسی اور معاشی تبدیلیاں علامہ اقبال کے اجتہادی نظریات سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں تیسری دنیا کے ممالک میں ملوکیت، سرمایہ داری، جاگیرداری، اور استعمار کے خلاف جس نوع کی جدوجہد چل رہی ہے اس تحریک میں علامہ اقبال کے خوابوں کی تعبیر بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہے۔

اقبال کی یاد میں

سیّد عبدالواحد

اقبال قبا پوشد در کار جہاں کوشد
دریاب کہ درویشی با دلق و کلاہے نیست

علامہ اقبال کی شخصیت ایسی جامع کمالات تھی کہ خود قدرت کو ایسے جامع کمالات کی آفرینش پر ناز ہے۔ ان کی شخصیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر بھی ہیں حکیم نکتہ داں بھی، جہاں ان کے کلام میں درد و سوز کی فراوانی ہے وہاں قلندر کی شان بے نیازی بھی۔ ان کے کلام میں جہاں حسن و عشق کی سرمستی کا ذکر ہے وہاں فلسفیانہ موشگافیاں بھی ہیں اور ان سب کے علاوہ حسن شاعری کا کمال بھی موجود ہے۔ ایسا کمال کہ جس کی مثالیں دنیا کے ادب میں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں خود علامہ کو بارہا یہ خیال ستاتا تھا کہ کہیں ان کے کلام کے مطالعہ کرنے والے کلام کی عرآفریبیوں میں الجھ کر نہ رہ جائیں اور ان کے پیغام کو نظر انداز کر دیں۔ اس لئے بار بار کہتے تھے :

راز حرم سے شاید اقبال باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

بصیرت افروز نگاہ جو عیب اور جو کمزوری جہاں دیکھتی ہے اس کی اصلاح کی فکر میں مشغول ہو جاتی ہے۔ ہر قوم اور ہر ملت کے افراد کو مختلف زمانوں میں مختلف امراض سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک عرصے یورپ کے سیاست دانوں کی ریشہ دوانیوں سے ملت اسلامیہ قومیت اور وطنیت کے چکر میں سرگرداں اور پریشان تھی۔ ایک وقت تو ایسا تھا کہ دنیا کے مسلمان قومیت کے شکار بن کر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ اور اس برصغیر میں تو ہمارے دشمنوں کی حیلہ سازی کے نتیجہ میں قومیت کے مسئلہ نے اتنی اہمیت اختیار کر لی تھی کہ اگر خداوند کریم اس ملت کی راہبری کے لئے قائد اعظم اور حکیم الامت کو نہ بھیجتا تو اس ملت کا مستقبل بہت تاریک ہوتا۔ بڑے بڑے عالم اور مولوی حریفان عیار کی سیاسی چالوں کا شکار ہو گئے تھے۔ وطنیت اور قومیت کے تصور سے جو ستم کاریاں یورپ میں ظہور پذیر ہوئی تھیں ان کو بھلا کر ہندو پروپیگنڈے کے زیرِ اثر یہ سادہ لوح اور کج فہم راہبران ملت مسلمانوں کو ابنائے وطن کی عیاری کا شکار بنانے پر تیار تھے۔ ویسے تو انسانی اخوت اور اسلامی مساوات کے نظریوں کی روشنی میں جب علامہ نے وطنیت اور قومیت کے نظریات کا جائزہ لیا ہوگا تو اس کو انسانی فلاح اور بہبودی کے خلاف ایک سم قاتل پایا ہوگا مگر جب یورپ کے قیام کے دوران وہ ان نظریات کے ستم ظریفانہ اثرات دیکھ کر اس کے سخت مخالف ہو گئے تھے اور انہوں نے اس زہر کے خلاف قومیت کے نظریہ کی بیخ کنی کا تہیہ کر لیا اور عمر بھر وہ اپنے کلام میں وطنیت کو انسان کے لئے مضر ہی تصور کرتے رہے۔

مسلمانوں کو مخاطب کر کے علامہ کہہ گئے ہیں :-

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
یہ نکتہ سرگذشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس پاسبانی کا حق ہم کیسے ادا کرتے ہیں ۔
ایک بار علامہ نے لکھ دیا :-

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ایک جگہ تو علامہ صاف کہہ دیا :-

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں، مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

علامہ نے نسل اور رنگ اور قوم سے اسلام کے بالاتر ہونے کی بابت بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ دراصل وطنیت اور علاقہ واریت کو بت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔

علامہ فرماتے ہیں :-

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہوجا محبت کا بیاں ہوجا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہوجا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہوجا

یہ سب کچھ پیغام علامہ نے اپنے دلکش اور سحر آفریں کلام کے ذریعہ دیا ہے۔ پیغام جس دلکش اور دلآویز زبان میں پیش کیا گیا ہے اس کی مثالیں دنیا کے چوٹی کے شعرا کے یہاں بھی بمشکل مل سکتی ہیں۔ علامہ کی غزلوں کا مقابلہ حافظ، نظیری اور غالب کی غزلوں سے کیا جاسکتا ہے تو ان کی رباعیوں کا مقابلہ عمر خیام سے کیا جا سکتا ہے ان کی مثنویوں کا مقابلہ رومی اور سنائی کی مثنویوں سے کیا جا سکتا ہے۔ بعض نظمیں جرمن شاعر گوئٹے کی نظموں کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہیں اور ویسے گوئٹے کی بعض نظموں کا ترجمہ بھی علامہ نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے۔ ایک نظم ڈانٹے کی نظم کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ الغرض مشرق جتنا فخر اقبال کی شاعری پر کرے بجا ہے۔

علامہ کے فکر اور کلام کی غایت ایک ہے اور وہ ہے ارتفاع انسانیت۔ اس ارتفاع کے لئے وہ ایک ایسا انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے انسان کو وہ اعلیٰ مرتبہ حاصل ہوجائے جو قدرت کا مقصد ہے اس انقلاب آفریں جذبہ کے تحت علامہ کی خواہش صرف یہ ہے کہ انسان کو وہ اعلیٰ مقام میسر ہو جو قدرت کا مقصد اس کی آفرینش سے ہے۔

الغرض دنیائے ادب میں علامہ کی مثال ملنا دشوار ہے۔

شوقؔ سندیلوی اور اقبالؔ

محمد عبداللہ قریشی

سندیلہ کے شرفاء میں سے ایک صاحب محمد عبدالعلی خلف مولوی علی حسن نے شوقؔ تخلص اختیار کر کے ۱۹۱۲ء میں شعر کہنے شروع کیے۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی شاعری کا بچپن کس استاد فن کی آغوشِ تربیت میں گزرا لیکن طبیعت میں شعریت ضرور تھی۔ بہت کم کہا ہے مگر جو کچھ بھی کہا ہے، اچھا کہا ہے۔ کلام جاندار ہے۔ ان کے نانا منشی عاشق علی اٹاوہ میں کلکٹر کے سررشتہ دار تھے۔ خمخانۂ جاوید کا بیان ہے :

> "وہاں ان کی ملک کچھ مکان تھے، جن کے مالک بعد میں شوقؔ صاحب ہوئے۔ یہ پہلے سندیلہ کے بینک گھر میں، پھر میونسپل کمیٹی میں ملازم رہے۔ وہاں سے مستعفی ہو کر ایک وقف کے مدرسے میں جو سندیلہ میں ہے، معلم اعلیٰ ہوئے۔ تعلیم انٹرنس تک ہے طبیعت میں مزاح اور دل لگی کا مادہ از حد ہے، جو کبھی کبھی ستم ظریفی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔" [1]

شوقؔ سندیلوی صاحب شعور کی حدوں میں داخل ہو کر خود ایک خوش فکر شاعر بن گئے، تو انہیں ادب کی خدمت کرنے اور فنِ غزل گوئی کو ترقی یافتہ صورت میں دیکھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اس شوق کی تکمیل کے لئے انہوں نے ایک عجیب منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کا طریقہ انہوں نے یہ سوچا کہ اپنے عصر کے تمام صاحب کمال شعرائے اردو کی شاعری اختیار کر کے سب سے اصلاح لی جائے اور ان کی درسگاہِ ادب سے فائدہ اٹھا کر اس امر کو آشکارا کیا جائے کہ ع

"ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"

گویا ہر شاعر اور ہر استادِ سخن کی زبان اور اس کے مذاق میں کتنا اختلاف ہوتا ہے۔ انہوں نے مختلف اوقات میں اپنی پندرہ سولہ غزلیں اس زمانے کے پینتیس نامور اور مستند شعراء کی خدمت میں بغرض اصلاح بھیجیں اور سب سے ادب آموزی کا فخر حاصل کیا۔

کچھ عرصہ تو یہ کاروبار چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس ہرجائی پن کا راز فاش ہو گیا اور بعض اساتذہ نے اصلاح سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس طرح یہ سلسلہ ختم ہو گیا مگر شوقؔ سندیلوی نے غضب یہ کیا کہ ان سب غزلوں کو اصلاحوں سمیت ۱۹۲۶ء میں یک جا کر کے ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دیا [2]۔ مزید ستم یہ کیا کہ اس سلسلے میں حضرات اساتذہ کے جو بھی خطوط ان کے نام آتے تھے، وہ بھی شائع کر دیئے۔ شوقؔ صاحب نے تو ان سادہ دل استادوں کو بنایا۔ لیکن نقادانِ سخن کو طبع آزمائی کا ایک مضمون ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ کتاب چھپنے کے بعد عرصے تک ان اصلاحوں پر نقد و نظر ہوتا رہا اور بعض خطوں کا مذاق

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد پنجم صفحہ ۱۷۶ - ۱۷۷

[2] باہتمام محمد عبدالمقتدر قریشی مطبع النور پریس۔ محلہ بنی اسرائیلاں علی گڑھ

اڑایا جا رہا کیونکہ ان میں طرح طرح کی فرمائشیں اور مطالبات تھے۔

اس کتاب کا نام "اصلاحِ سخن" ہے۔ ۴۳۲ صفحات کی اس کتاب کے شروع میں نیاز فتح پوری مرحوم کی "تقریب" مولوی عبدالحلیم شرر کا دیباچہ سلطان حیدر جوش کا مقدمہ اور شوق کی اپنی التماس ہے۔ پھر سو غزلیں اور ان پر اساتذہ کی اصلاحیں ہیں۔ مشاہیر شعراء میں احسن مارہروی، آرزو لکھنوی، اطہر ہاپوڑی، علامہ اقبال، حضرت اکبر الہ آبادی، بیخود دہلوی، بیخود موہانی، ثاقب لکھنوی، جلیل مانک پوری، ریاض خیر آبادی، سائل دہلوی، شاد عظیم آبادی، شفق عماد پوری، شوق قدوائی۔ شوکت میرٹھی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، فانی بدایونی، محشر لکھنوی، مضطر خیر آبادی، ناطق لکھنوی، نظم طباطبائی، وحشت کلکتوی اور دیگر کئی اہم نام نظر آتے ہیں۔ ہر شعر کی اصلاح متعدد ناقدان سخن کے قلم سے پہلو بہ پہلو اور جداگانہ دکھائی دیتی ہے۔ نقوشِ الفاظ و معانی کی گوناگوں قطع و برید صاحب نظر کے سامنے کلام شوق کے محاسن و معائب کے علاوہ خود مصلحان سخن کے ذہن و دماغ کے متعلق ایک لطیف موازنہ و مقابلہ بھی پیش کرتی ہے۔ اس موازنے اور مقابلے سے اگر کوئی دامن بچا کر نکل گیا ہے، تو وہ حضرت اکبر الہ آبادی اور اقبال ہیں، جو کسی کو شاگرد بنانے کے روادار ہی نہ تھے۔ پھر بھی چلتے چلتے انہوں نے کوئی نہ کوئی مفید مشورہ دے دیا ہے۔ اصلاح کا یہ سلسلہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۳ء تک جاری رہا۔ پھر بند ہو گیا۔ بعض اساتذہ کے جو خطوط نکات ادبیہ کا گنجینہ معلوم ہوئے، مرتب نے انہیں ضمیمے کے طور پر کتاب کے آخر میں درج کیا ہے۔ یوں علامہ اقبال کے بھی تین چار خطوط محفوظ ہو گئے ہیں۔ وہی اس مضمون کی اساس ہیں۔

شوق سندیلوی کی پہلی غزل پر ہی جس کا مطلع یہ تھا ؂

خواب میں ان کا گلے مل کے جدا ہو جانا
دل کے ارمانوں میں اک حشر بپا ہو جانا

اقبال نے معذرت کرتے ہوئے ۴ نومبر ۱۹۱۱ء کو لکھا:

"مکرم بندہ! سلام مسنون۔

میں اس رنگ شاعری سے بے بہرہ ہوں۔ اس واسطے آپ کی تعمیلِ ارشاد سے قاصر ہوں۔ بظاہر کوئی غلطی اس میں نظر نہیں آئی۔

مخلص محمد اقبال

۴ نومبر ۱۹۱۱ء"

لیکن شوق اس سے دل برداشتہ نہیں ہوئے، مایوس ہو کر نہیں بیٹھ گئے۔ اس کورے جواب کے بعد بھی وہ برابر حضرت علامہ کو غزلیں بھیجتے اور اصلاح کا مطالبہ کرتے رہے۔ آخر ان کی استقامت اور مستقل مزاجی نے اقبال کو اس حد تک مائل کر ہی لیا کہ جب مندرجہ ذیل غزل ان کے پاس اصلاح کے لئے پہنچی تو انہوں نے شروع سے آخر تک اسے پڑھا اور اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ؂

اب اپنا دلِ تنگ ہے زندانِ تمنّا
اللہ رے یہ جوشِ فراوانِ تمنّا

کیا ڈالیں کسی آرزوئے تازہ کی بنیاد
نظروں میں ہے بربادیٔ ایوانِ تمنّا

ہچکی کی صدا، سب جسے سمجھے دمِ آخر
ٹوٹا تھا یہ قفلِ درِ زندانِ تمنّا

جز خواب نہیں وعدۂ باطل کی حقیقت
جز وہم نہیں موجۂ طوفانِ تمنّا

تیری نگہِ لطف تھی تمہیدِ محبت
میری نگہِ شوق ہے عنوانِ تمنّا

اے قافلۂ یاس گذر دل میں نہ ہو کر
پامال نہ کر گورِ غریبانِ تمنّا

اے شوق ہے اب روح کو پرواز بھی دشوار
پیوست کلیجے میں ہے پیکانِ تمنّا

علامہ اقبال نے غزل ملاحظہ فرمانے کے بعد شوق کو یہ مختصر سا خط لکھا:-

"مخدومی! السلام علیکم:

آپ کی غزل بہت اچھی ہے۔ زبان کی اصلاح تو
میں کیا کروں گا، خیالات ماشاء اللہ خوب ہیں۔

اے قافلۂ یاس .... الخ

اس شعر کا پہلا مصرع پڑھ نہیں سکا۔

مخلص

محمد اقبال"

حضرت علامہ کا جواب اتنا مختصر تھا کہ شوقی کی اس سے تسلی
نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنے اشعار کی خوبیوں اور خامیوں پر تفصیلی روشنی
ڈالنے کے لئے دوبارہ لکھا مگر یہ شاہین پھر بھی زیرِ دام نہ آیا۔ اقبال
نے اپنی پہلی رائے کا اعادہ کرتے ہوئے اس میں ذرا سا اضافہ کر کے
جواب دیا:

"مکرم بندہ تسلیم۔

مجھے آپ کی غزل میں کوئی خامی نظر نہیں آئی
اگر آتی، تو کم از کم آپ کی توجہ ضرور دلاتا۔ اے
قافلۂ یاس ...... الخ۔ مجھ سے پڑھا نہیں گیا اور نہ
مصرع کسی طرح سمجھ میں آتا ہے۔ یہ پہلے بھی عرض
کر چکا ہوں۔ باقی اشعار خوب ہیں۔

جز خواب نہیں وعدۂ باطل کی حقیقت
جز وہم نہیں موجۂ طوفانِ تمنا

پرانا اور مبتذل مضمون ہے۔ آپ کے باقی اشعار
میں تازگی پائی جاتی ہے۔

مخلص محمد اقبال"

جب شوقی نے دیکھا کہ اقبال شاید ان کی اردو غزلوں پر
اصلاح سے کتراتے اور پہلو تہی کرتے ہیں اور وہ آسانی سے قابو میں
نہیں آئیں گے تو آخری حربے کے طور پر ایک اور ترکیب لڑائی اور
مندرجہ ذیل فارسی نعتیہ غزل اصلاح کے لئے ان کی خدمت میں
روانہ کی ہے

دلا باش قربانِ آں ملک گیرے
کہ بے تاج و اورنگ بخشد سریرے

بہ حسن و جمالے عدیم المثالے
بوصف و کمالے ندارد نظیرے[1]

بہ رد ماہتابے بہ ضو آفتابے
بہ خو لا جوابے فقید النظیرے[2]

ہمہ غیر محدود در ملک باطن[3]
بظاہر بہ قید تعین اسیرے

نبی لا جوابے علیؓ انتخابے[4]
عجائب شہنشہ غرائب وزیرے

ز صبح تو خامش بود شمع ہستی
بیا شاہ شاہاں کہ میر و فقیرے

برآں شاہ کونین اے شوقی نازم
کہ خوش حال بودہ بہ فرش حصیرے

تیر نشانے پر بیٹھا۔ اقبال نے پوری توجہ سے غزل دیکھی۔ اگرچہ
یہ ان کے معیار پر کسی طرح پوری نہیں اترتی تھی، پھر بھی انہوں نے
مروت سے دو مصرعوں میں ذرا ذرا سی تبدیلی کی، ایک شعر کو قلمزد
کرنے کا مشورہ دیا اور غزل واپس کرتے ہوئے نہایت صاف بیانی
سے لکھا:

"حسن اعتقاد کی داد دیتا ہوں۔ زبان غزل
میں فارسیت کی شان نہیں ہے۔"

---

[1] اقبال کا مشورہ: بوصف و کمالے فقید النظیرے۔

[2] ایضاً: بہ خو لا جوابے ندارد نظیرے۔

[3] خوب شعر ہے — اقبال۔

[4] اسے اقبال نے قلمزد کر دیا۔

ہمہ غیر محدود در ملکِ باطن
بظاہر بہ قیدِ تعین اسیرے

خوب شعر ہے۔

محمد اقبال[1]"

اس کے بعد یہ سلسلہ بالکل بند ہو گیا۔ اگر اقبالؔ استادی شاگردی کے چکر اور اصلاحوں کے جھمیلوں میں پھنسے رہتے تو وہ مفید کام کبھی نہ کر سکتے جس کے لئے قدرت نے انہیں پیدا کیا تھا۔ شوقؔ بھی اپنی دل لگی، شرارت اور ستم ظریفی سے بدنامی مول نہ لیتے تو اپنے اس قسم کے اشعار کی بدولت قابل ذکر شعراء کی صف میں آ سکتے تھے ؎

زباں سے اُف نہ کرنا شمع ساں جل جل کے مر جانا
بالآخر رفتہ رفتہ حدِ ہستی سے گزر جانا

حیات و موت بیمارِ امید و بیم کی کیا ہے؟
نہ جینا سہل ہے جس کا نہ ہے آسان مر جانا

یہی دو حرف آہِ سرد کے شرحِ غمِ دل ہیں
طویل اک داستاں ہے جس کو تم نے مختصر جانا

مآلِ کار اپنی ہستیِ موہوم کا یہ ہے!
حیات چند روزہ وہ بھی غفلت میں گزر جانا

زبان پر ذکر، دل میں یاد اور سر میں ترا سودا
نظر کو جستجو تیری جہاں جانا جدھر جانا

جدھر نگاہ پھری سامنے وہ شکل تھی شوقؔ
یہ رنگ آنکھ کا اب جوشِ انتظار میں ہے

نگاہِ شوقؔ کی گرمی سے اڑ جاتا ہے رنگ اس کا
تری تصویر تجھ سے بھی زیادہ نازنیں نکلی

ہستی کا کچھ آسرا نہیں ہے
یہ نقش تو دیرپا نہیں ہے
کشتی کا خدا تو ہے نگہباں
کیا ڈر ہے جو ناخدا نہیں ہے
بیجا ہے ہزاروں کا شکوہ!
یہ کون کہے بجا نہیں ہے

غفلت سے آنکھ کھول کے دیکھا تو یہ کھلا
ساری خرابیوں کی بنا مادّ من میں تھی[2]

---

[1] خمخانۂ جاوید جلدِ پنجم صفحہ ۱۷۷ - ۱۷۸ +

مخمس بر غزلِ علامہ اقبالؒ

عبدالغنی شمس

بہر گام کوہِ گراں اور بھی ہیں — رہِ شوق میں ہفتخواں اور بھی ہیں
ترا آسماں، آسماں اور بھی ہیں — ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

نہ حرف آنے دے کاہشِ آرزو پر — ہے موقوف سب کچھ یہاں جستجو پر
بھروسا تو رکھ صرف اللہ پر — قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

نہ کر اپنی بے دست و پائی کا ماتم — کئے جا دما دم یونہی سعیٔ پیہم
ہے ذوقِ طلب تیرا سب پر مسلّم — اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

شبِ غم کا باقی کہاں ہے اندھیرا — سحر مسکرائی، ہوا اب سویرا
نہ کر کوہ و صحرا میں دم بھر بسیرا — تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

رموزِ خودی، بیخودی میں نہ کہہ جا — زمانے کے جبر کے کلیجے پہ سہہ جا
حوادث کے دھارے پہ تو یوں نہ بہہ جا — اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

افق سے تجھے یہ کسی نے صدا دی — مسلماں کو زیبا نہیں نامرادی
بڑھا چل اسی طرح وادی بہ وادی — تو اپنی ہی منزل پہ گم ہو نہ بادی
کہ پیچھے ترے کارواں اور بھی ہیں

رہا ہوں میں اک بے وطن سا وطن میں — نہ ابھری مری موج گنگ و جمن میں
گزارے ہیں ایام رنج و محن میں — گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

افسانہ

نئی زندگی

ف۔ق

ملوکیں گہلیں درناتہ کو ہلو اشتہ گنجانی
شتہ بے موکل ءَ ئی یار نصیب وچے ءُ گندانی

(بہادر جوان آخر تو نے سرسبز و شاداب کو ہلو چھوڑ ہی دیا میرا محبوب اجازت لئے بغیر مجھے چھوڑ گیا۔ دیکھئے قسمت پھر کب ملاتی ہے۔)

تاج بی بی کے لبوں پر یہ دلدوز بول ایک انجان تحیر میں لرز اٹھے......اور وہ پھونس سے بنی اپنی خستہ حال ماڑی (جھونپڑی) میں کھڑی اپنے محبوب بادل کے گھوڑے کے سموں سے اُڑتے ہوئے غبار کو تک رہی تھی........

بادل جس کی مسیں ابھی بھیگ رہی ہیں، بلا کا منچلا ہے۔ بہادری اور حاضر جوابی اُسے ورثہ میں ملی ہے۔ دن بھر کے کھیتی کسانی کے کام سے فارغ ہو کر وہ طنبورے پر بڑے شیریں نغمے الاپتا ہے۔ اس کے مردانہ حسن نے پہلی مرتبہ تاج بی بی کے دل پر اس وقت کمند ڈالی تھی جب وہ بڑے سردار کی کوئٹہ سے آمد پر گھر گھر پھر کر آسائش و آرام کی مختلف چیزیں جمع کرتا پھر رہا تھا.....تاج بی بی کے باپ بہارگ خاں کے ذمے دو مرغیاں تھیں۔ بادل جب بہارگ کی ماڑی پر پہنچا تو وہ کاریز کی طرف گیا ہوا تھا۔ تاج بی بی بیٹھی اُون کات رہی تھی۔ جب بادل مڑی اس کے دروازے پر پہنچا تو ایک دم اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

بادل نے اپنی سحر انگیز آواز سے کہا کوئٹہ سے بڑا سردار آیا ہوا ہے ٹکری یوسف نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ بستی سے ۳۰ مرغیاں پیدا کر کے دوں۔ تمہارے ذمے ۲ مرغیاں ہیں........

تاج نے مرغیوں کی طرف نظریں گاڑتے ہوئے کہا........ ہماری مرغیاں تو ابھی بچیاں ہیں انہیں لے جاؤ گے تو ان کی ماں روئے گی......! یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر بھر آگئیں۔

یہ ادا بادل کو ایسی پسند آئی کہ اس نے کہا "اچھا جی۔ یہ بات ہے تو بہارگ چاچا کو صرف میرا سلام دے دینا اور کہہ دینا کہ تمہارے حصہ کی مرغیاں میں نے پیش کر دی ہیں"۔ تاج، بادل کے لہرئیے بل کھائے انداز پہ اسی وقت ریجھ گئی۔ اس واقعہ کے بعد کسی نہ کسی بہانے بادل برابر اس سے ملتا رہا۔ کبھی وہ کاریز پر اس کے ہاتھوں سے بڑا گھڑا تھام کر چپکے سے کہتا "اتنے نازک ہاتھ بوجھ اٹھانے کے لئے نہیں ہوتے....." تو وہ شرم سے سرخ ہو جاتی.... اور کہتی "او مستان ذرا ہوش کر آس پاس کھڑی لڑکیاں کہیں مجھے نشانہ نہ بنا لیں اور

رقابت انہیں طرح طرح کی کہانیاں گھڑنے پر آمادہ نہ کردے"۔۔۔!

یہ باتیں سن کر بادل زور سے قہقہے مارنا شروع کردیتا۔ تاج بی بی غصے سے بے قابو ہو کر گھڑا سنبھال کر گھر کی طرف دوڑنا شروع کردیتی مگر عشق اور مُشک چھپایا نہیں جاسکتا۔ کچھ ہی دنوں میں ان کی محبت کے چرچے پورے کوہلو میں ہونے لگے۔۔۔!!

پھر جب میر بہرام خان جو ایک چھوٹے سردار ہیں نے یہ بات سنی کہ بادل خاں مری، بہارگ خان بگٹی کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو انہوں نے اس پر بہت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور بادل کے باپ سے کہا۔ دیکھو آج کل سرداروں اور بگٹیوں میں تعلقات کچھ پہلے جیسے نہیں رہے ہیں۔ بڑا سردار اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا اور اب تو وہ ہم کو بار بار کہلوا رہا ہے کہ تم چوڑیاں پہن لو۔ پھر بادل ابھی نوعمر ہے اس نے کسی لشکر کے ساتھ کوئی معرکہ نہیں لڑا ہے ...... بڑے سردار کو خبر ہوگئی تو خواہ مخواہ جان مصیبت میں آجائے گی۔ وہ اسے اپنی آن کا مسئلہ بنالے گا۔۔۔۔۔ غرض اسی کھڑپینچ نے تاج اور بادل کو ایک دوسرے کی دائمی رفاقت کے بندھن میں نہ بندھنے دیا۔ مگر یہ دونوں۔ کوہلو کے رتیلے ٹیلوں کے پیچھے ایک دوسرے سے ملتے رہے۔

کبھی بادل اُسے اپنے نغمے سناتا اور کہتا یہ شعر میں نے کہے ہیں میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میں بھی اپنے جدِ بزرگوار کی طرح ایک بڑا شاعر بن جاؤں ...... میرا سکڑ دادا انگریزوں کا بڑا دشمن تھا۔ جب انگریز مریوں سے لڑے تو اس نے کیا خوب شعر کہے تھے۔

پھلنگی آتکا مورانا
چغلال آڑ تھا ٹورانا

بنی بے عـزتیں جیـانا
وطن شـتہ مسلمـانا

(فرنگی آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ غدار اس کی راہنمائی کرتے رہے نشیبی علاقے کے بے غیرت انگریزوں کو یہاں لے آئے۔ وطن غیرت دار مسلمانوں سے خالی ہوگیا۔)

ایسے موقعہ پر تاج اس کے چٹکی لیتی۔ اور اسے طعنہ دیتے ہوئے کہتی۔۔۔ تم مری کبھی انگریزوں سے لڑے تھے۔ کسی پچھلے جنم میں اب تو تمہارا سردار اور سردارزادے سوٹ پہنتے ہیں گٹ پٹ انگریزی بولتے ہیں۔ اور تمہارے تن پر تو صحیح شلوار تک نہیں .... بادل کھسیا کر اس کی کلائی میں ایک زور کی چٹکی لیتا۔ چڑیل دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں تُو اول فول مت بکا کر مجھے وہم آتا ہے اگر کہیں یہ بات سرداروں کے کانوں تک جا پہنچے تو تجھے اور مجھے دونوں کو کاٹھ میں دے دیں۔ کاٹھ کا لفظ سن کر تاج بی بی کو جھرجھری سی آگئی پچھلے سال کا وہ واقعہ یاد آگیا جب اس کے بابا تین دن کاٹھ میں پڑے رہے تھے اور ان کی خلاصی جب ہی ہوسکی تھی جب اس نے کوہلو کے بازار میں جاکر اپنے کانوں کے کانٹے جو اس کی ماں کی آخری نشانی تھے فروخت کرکے ٹکری صاحب کو جو بڑے سردار کے مقرر کردہ ایک دستہ کے سالار کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو انسانی ریوڑ کو سردار کے اشاروں کے مطابق ہانکتے ہیں بقایا رقم پیش کی تھی۔ ہوا یوں کہ بہارگ خاں نے ایک چھوٹے سے افتادہ قطع پر مکئی کاشت کرلی تھی اور یہ کام ٹکری صاحب کی اجازت سے ہوا تھا پر جب فصل فروخت ہوئی تو کل سو روپے ہاتھ آئے۔ ٹکری صاحب کو جوں ہی فصل کی فروخت کی خبر ملی تو وہ بڑے سردار کی جانب سے ٹیکس لینے آدھمکے۔ انہوں نے اپنی نوٹ بک جیب سے نکالی۔ اور حساب یوں لگایا۔

بڑے سردار کے کارندہ کی تنخواہ کا ۴ فیصد ء — ۴ روپے
سردار کے گھوڑے کا خرچ ۲ فیصد کی شرح سے ، — ۲ روپے
سردار کے نجی نوکروں کا خرچ ۲ فیصد ء — ۲ روپے
فصل کی حفاظت کا معاوضہ کی شرح ۲ فیصد ء — ۲ روپے
اناج تولنے والے کی اجرت ۲ فیصد ء — ۲ روپے
سردار کی مسجد اور مولوی کا خرچ دس فیصد ء — ۱۰ روپے
گاؤں میں ترکھان، لوہار وغیرہ کا حق ۴ فیصد ء — ۴ روپے

۲۶ روپے

کل جمع چھبیس روپے ہتھیانے کے بعد انہوں نے بطور شیشک پونے تیرہ روپے کا حساب بنایا اور یہ بھی ہتھیا کر اب بٹائی پر آئے۔ اور اس کے حساب کو کچھ اس طرح پھیلایا کہ خود ان کے حساب سے بابا کے ہاتھ میں کل پندرہ روپے بچتے تھے۔ اب قصہ یہ تھا کہ بابا نے ٹکڑے پر کاشت کسی کا ہل بیل کرائے پر لے کر کی تھی۔ پھر کٹائی کے وقت انہوں نے دو مزدور بھی ساتھ لگائے تھے ٹیکس اور شیشک ادا کرنے کے بعد ان کے ہاتھ میں بٹائی دینے کو رقم نہیں تھی وہ کرایہ اور مزدوریاں پہلے ہی دے چکے تھے۔ جب بابا نے ٹکری صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر عرض کی، "سائیں اب کچھ سکت باقی نہیں تو ٹکری صاحب انہیں اپنے ڈیرے پہ لے گئے اور وہاں انہوں نے بوڑھے بابا کا پیر لکڑی کے ایک شکنجے میں کس دیا۔ وہ دن بھر دھوپ میں پڑے کراہتے رہے کبھی کھڑے ہو جاتے کبھی ٹیڑھے ہو کر زمین سے ٹیک لگا لیتے۔ رات گئے جب بوڑھے بجار خاں نے آ کر بابا کی بپتا سنائی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس وقت بجار خان نے تسلی دی۔" بیٹا ہم بلوچوں کو اتنا کمزور دل نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمارا کام ہی محنت کرنا اور اپنے بڑوں کی خدمت کرنا ہے۔ ہم گھوڑے سے بھی زیادہ وفادار ہوتے ہیں۔ گھوڑے کو تو مٹھی بھر دانا اور گھاس دے کر سنساتی گولیوں میں جھونکا جا سکتا ہے لیکن ہم اپنے مالکوں سے مٹھی بھر دانا اور گھاس بھی نہیں مانگتے۔ تمہیں تو یاد ہوگا کہ پچھلی ہول گڑ بڑ میں بڑے سردار کے حکم پر ہم لوگ پہاڑوں پر جا چڑھے تھے اُس وقت تمہارا بابا بیمار تھا۔ میں گیا تھا۔ کئی کئی ہفتے ہم نے پتے اور جڑیں کھا کر نکال دیئے پھر کہیں کچی مکئی نصیب ہوئی۔۔۔ بیٹا بلوچ بیٹوں کو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔ شکر کرو تمہارا باپ مرا نہیں زندہ ہے۔ میرے دادا خدا بخشے سنایا کرتے تھے ایک بار جھالاوان کے ایک سردار نے غصہ میں آ کر ایک نافرمان کو زندہ گڑوا دیا تھا۔ شکر کی بات ہے اب اگلا سا وقت نہیں رہا اب تو ہمارے سردار بہت کچھ پڑھ لکھ گئے ہیں، ولائت تک پڑھ آئے ہیں۔۔۔ بیٹا ایسے وقت میں پیسے کو عزیز نہیں رکھتے اگر ڈھکا چھپا کوئی

زیور پڑا ہو تو نکال دو۔ پھر بھی رقم پوری نہ ہو تو کچھ ادھار کا
بندوبست کر دوں گا اپنا دل چھوٹا مت کرو"....!!

اگلے دن کانٹے کسی طرح تیس روپے سے زائد میں نہ بک
سکے اور پھر کہیں تیسرے دن سولہ روپیہ قرض کا بندوبست ہوا تو
بابا کی نجات ہوئی ..... اف کس مشکل سے وہ لنگڑاتے، کراہتے اس
کا کندھا تھامے گھر تک پہنچے تھے۔ الٰہی توبہ ....!

وہ کاٹ کا نام سن کر گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی اچانک
بادل نے اس کے ایک مکا رسید کیا۔ "ارے کیا سوچنے لگی پگلی"
اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا کہے ..... دور افق پر نظریں گڑوئے
اس نے سرخ سورج کو دیکھا۔ ہوا میں اڑتے ہوئے شکرے نے اس کی
نظریں اپنی طرف منعطف کر لیں......

اس نے بادل کو انگلی سے اشارہ دیتے ہوئے کہا۔ وہ دیکھو
کتنا آزاد پرندہ ہے۔ ... کاش کاش ....! بادل نے منہ چڑایا کاش
تو ایک چڑیا ہوتی اور کاش میں ایک باز ہوتا.... جھٹ تجھے شکار
کر لیتا.... ٹیلے پر بیٹھ کر کرم کرم چباتا... ہا ہا۔ وہ شرارت سے
ہنسا.....!

تاج نے خلاف معمول اس پر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا...
بادل غور سے اس کا منہ دیکھنے لگا....

"ہیں اری تجھے کیا ہو گیا ہے کہاں بہہ نکلی ہے"... اس نے
اس کے ایک چپت لگائی..... تو وہ ایک دم چونک پڑی... جیسے
گہری نیند سے کسی نے اسے جگا دیا ہو.... ہیں ہیں کیا کہہ رہے تھے
تم..... اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا تو بادل نے پھر اسے
ایک چپت رسید کی اور بولا..." یہ ہی کہہ رہا تھا کیا سوچ رہی ہے"

تاج نے ایک لمبا سانس لے کر اس کی مضبوط کلائی اپنے
ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا.... "بادل تو کچھ پڑھ لکھ کیوں نہیں
لیتا۔ تو کبھی کبھی بڑے اچھے گیت بناتا ہے میں سوچ رہی ہوں
تو اگر پڑھ لکھ لے تو اور بھی اچھے گیت بنا سکتا ہے۔ شاید حاکی

اور شہ مراد کی طرح ہماری داستان محبت بھی زندگی کا روپ لے
لے۔ بادل نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھاتے ہوئے کہا" تاجو تو نے
میرے دل کی بات چرالی ہے... پر شاید تو یہ نہیں جانتی کہ یہاں
کوہلو میں کوئی مدرسہ نہیں کوئی پڑھا لکھا نہیں اور اگر کوئی ہے تو
وہ سرداروں کے ڈر کے مارے کسی کو پڑھاتا نہیں"...

"اونہہ چل کم ہمت..... تو شہر کیوں نہیں بھاگ جاتا۔
کوئٹہ، سکھر کہیں تو تجھے پناہ مل ہی سکتی ہے"۔ اس نے اپنی اوڑھنی
کو بل دیتے ہوئے برا سا منہ بنا لیا.... بادل نے کہا:" پاگل ہو
گئی ہے تاجو کیا۔ اگر کوئٹہ یا سکھر میں جا کر میں تعلیم حاصل کر لوں
تو کیا کبھی کوہلو میں واپس آ سکتا ہوں.....؟ کیا پھر کبھی تیری
صورت دیکھ سکتا ہوں"....؟

"ہاں ٹھیک کہتا ہے تو۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے"۔ تاجو نے
ایک لمبا سانس لیا پھر کچھ توقف کے بعد وہ بھرائی آواز میں بولی۔
"تو ایسا کر مجھے بھول جا، اپنی زندگی بنا لے...... میں تیری یاد
کو سینے سے لگا کر وقت کاٹ لوں گی"......

بادل نے غمگین اور اٹل انداز میں کہا " مجھے ایسی تعلیم کی
ضرورت نہیں۔ مجھے یہ ہرگز منظور نہیں"..... کچھ دور سے گھوڑوں
کی تیز ٹاپوں کی آوازیں سن کر وہ چونکتے ہو گئے۔ بادل نے کہا معلوم
ہوتا ہے ٹکری صاحب بستی کی طرف جا رہا ہے چلو اب گھر کی طرف
چلیں".......!

جب وہ دونوں قدم قدم چلتے، کوہلو کے بازار سے گزرے
تو انہوں نے عجیب کہرام دیکھا۔ ٹکری ایک ٹیلے پر کھڑے تھے ان
کے باڈی گارڈ رائفلیں تھامے آزاد و مستعد انداز میں ٹہل
رہے تھے ڈھول پر تھاپ پڑ رہی تھی۔ ہر طرف سے لوگ دوڑ دوڑ
کر غول در غول ٹیلے کے پاس پہنچ رہے تھے۔ مجمع دم بدم بڑھ
رہا تھا.... یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ مگر ایک دوسرے
کو آنکھوں میں لئے ایک طرف دبک کر کھڑے ہو گئے۔

تھوڑی دیر میں ٹکری صاحب نے گلے کی رگیں پھیلا کر چیخنا شروع کر دیا۔۔۔ "بہادر بلوچو موت سے کھیلنے والے جانباز و فرنگی ہمارا پرانا دشمن اپنی فوج کے ساتھ ہمارے علاقے میں آگیا ہے وہ ہماری بستیوں کو مٹا دے گا۔ ہماری عورتوں کو بے عزت کرے گا۔ ہوشیار ہو جاؤ۔۔۔ اپنی عزت اپنی ناموس کیلئے اپنے ہتھیار تیز کر لو۔ کڑا وقت آنے والا ہے۔ اپنے سردار کے جھنڈے کو تھامے آگے بڑھو۔۔۔ فرنگی کو اپنی بستیوں میں نہ داخل ہونے دو۔۔۔"

بڑی دیر کے بعد جب مجمع چھٹا تو گھنی ڈاڑھیوں والے بلوچوں نے ایک دوسرے سے اچنبھے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ ارے یہ وہی فرنگی پھر زندہ ہو گئے جن کی کہانیاں ہمارے دادا پردادا سنایا کرتے تھے۔ کمال ہے۔ بھئی یہ کن پہاڑوں کی اوٹ سے یہاں آ پہنچے۔۔۔۔ انہیں یہاں کے راستے کیسے معلوم ہو گئے پہلے سرداروں کے بڑوں نے انہیں یہاں پہنچایا تھا پھر ہمارے بزرگوں نے اپنا لہو بہا کر انہیں اس زمین سے نکالا اور اب پھر ایک صدی بعد آگئے۔ بوڑھے بجار خان نے کہا۔ "فرنگی ہزار سال بعد بھی اپنا بدلہ لیتا ہے"۔ اس نے اپنے پوپلے منہ سے یہ ابیات پڑھنا شروع کر دیں۔

ولائت بینہ ٹھگائی
تینڈی اور سنگ دیٹائی
دث اش واثہ یہ منائی
کھنثہ یہ پہوا بھائی

(عوام کو سنگ بٹائی کے ٹیکسوں تلے دبا دیا بد مستی میں لوگوں نے خود ہی وطن ان کے حوالے کیا)

اور پھر جب رات گئے بہارگ خان نے مکئی کی خشک روٹی پانی کے گھونٹوں سے حلق میں اتارتے ہوئے تاجو سے کہا۔ "بیٹی ذرا ہوشیار رہنا۔۔۔ کچھ نہیں معلوم کب حکم ہو جائے پہاڑوں پر کوچ کا۔۔۔۔ حالات کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔۔۔ ٹکری کو نہ گیا ہوا ہے۔ خدا خیر کرے"۔ تو تاجو کی رنگت زرد پڑ گئی اس نے باپ کو پنکھی جھلتے ہوئے کہا "بابا اب تو تم بہت بڈھے ہو گئے ہو کاٹھ سے نکلنے کے بعد جو بخار تمہیں آیا تھا اس نے کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ تم کہاں پہاڑوں کی خاک چھان سکتے ہو اب"۔

بڈھے بہارگ خان نے آسمان کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بات تو ٹھیک ہے بیٹا پر جب ہمارے سردار ہمیں چھوڑ... تب کی بات ہے۔ یہ خوشامدی ٹکری اگر ریوڑ کی طرح ہانکتے ہمیں پہاڑوں پر لے جانے پر اڑ گئے تو میں بوڑھا کیا کر سکتا ہوں۔ ... ہی ہو گا۔۔۔۔ بیٹا اور تو کچھ ہے نہیں ایک گائے ہے دودھ ... بھی اتر گئی ہے کوئی برا وقت دیکھنا تو بیچ ڈالنا۔۔۔ میں نے بجا... سے کہہ دیا ہے کہ میری عدم موجودگی میں اپنی بیوی کو تمہارے پاس بھیج دے۔۔۔۔ اس کے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی خطرہ نہ ہو گا۔"

کئی راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں اور آخر ایک رات پو پھٹے بابا نے اسے جگایا۔

"تاجو۔ تاجو۔ اٹھ بیٹھ بیٹا۔ ذرا سی مکئی تھیلے میں بھر دے ٹکری کے آدمی اطلاع دے گئے ہیں لشکر پہاڑوں کی طرف جا رہا ہے۔ فرنگی نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے"۔ جلدی جلدی آنکھیں ملتی وہ اٹھی۔ آج بوڑھے باپ کی بے چارگی ناگ کی طرح اس کی روح کو ڈستی معلوم ہوئی۔۔۔۔ وہ بے حد بوڑھا اور کمزور نظر آ رہا تھا کانپتے ہاتھوں سے اس نے مکئی تھیلے میں بھری۔ اور ایک پتھر اس میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بابا روکھے دانے اب تمہارے دانتوں سے نہیں چبیں گے۔ کسی پتھر پر رکھ کر انہیں کوٹ لیا کرنا۔"

بہارگ نے رائفل کندھے پر لٹکائی اور تیز قدموں سے کوہلو کے بازار کی طرف چل دیا۔۔۔۔ صبح کاذب کے جھٹپٹے میں ٹکری ٹیلے پر چڑھے۔ ایک ایک کو سلام علیک کہہ رہے تھے ساتھ

ہی وہ نام بنام ہدایت دے رہے تھے۔ چاکر خان تم پچاس آدمی کی ٹکڑی کی سالاری کرتے نکل چلو۔ برک خان تم اپنے گھوڑے کے ساتھ علاقہ دیکھتے قافلہ کی راہ بناتے چلو۔ اوئے۔۔۔۔ بڑی دیر میں آیا بادل خان۔ چل بیٹا سپل خدا بخش کی ٹکڑی میں مل جا سپل میرا بیٹا شاباش گھوڑا تیرا خوب جاندار ہے۔۔۔۔

بادل نے کہا "ٹکری صاحب فکر نہ کرو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر راستہ مجھے کچھ نہیں کہتا۔۔۔۔۔۔۔ وہ تیزی سے مڑا اور سراسیمہ عورتوں کے قریب رک کر تاجو کو ڈھونڈنے لگا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے اس کے گھر کی طرف گھوڑا موڑا۔ تاجو اپنی ماڑی کے سامنے کھڑی اس راہ کو تک رہی تھی جس پر اس کا باپ گیا تھا۔

"اری تو اتنے سویرے اٹھ گئی ہے" اس کا پرانا کھلنڈرا پن اس قیامت صغریٰ میں بھی ابھی زندہ تھا۔۔۔ تاجو نے اس کی بات کا جواب دینا چاہا مگر اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے اور آنکھیں ٹپکنے لگیں۔۔۔۔۔ اس نے اس کے بازو میں ایک چٹکی بھری۔ "اری پگلی تو بلوچ ہے یا کوئی بنجارن۔۔۔۔ فکر نہ کر خدا نے چاہا تو جلد لوٹ آئیں گے۔۔۔۔"

تاجو نے ایک آہ بھر کر کہا خدا ایسا ہی کرے۔ پر بات یہ ہے بادل کہ اب واپس آکر یہاں سے نکل چل یہ کوئی زندگی نہیں ہے کہ اونٹوں کے گلوں کی طرح ہمیں ہانکا جائے۔۔۔!

"چپ چپ پگلی۔۔۔۔۔ چپ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اپنے لمبے بالوں کی ایک لٹ نوچی اور اس کی مٹھی میں تھما دی۔۔۔۔۔۔ "لے یہ رہا میں اسے گلے میں لپیٹ لینا"۔۔۔۔ ایک شور بلند ہوا۔ چلو چلو۔ گھوڑ سوار دکوچ کرو۔ اللہ اکبر۔۔۔۔۔ اس نے تاجو پر آخری نظریں ڈالیں اور گھوڑے کو ایک ایڑھ لگائی۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ اس کے گھوڑے کی ٹاپوں سے اڑتے غبار کو پیار بھری نظروں سے دیکھتی، گنگنانے لگی (تو اے نوجوان آخر تو نے سر سبز و شاداب کوہلو چھوڑ دیا نا) صبح ہوتے

کوہلو کی بستی ڈھنڈار اور ویران سی ہو گئی۔ گھروں میں عورتوں بوڑھوں اور بچوں کے علاوہ کوئی جوان نہ رہا۔ دکاندار البتہ اطمینان سے اپنا دھندہ کرنے کو موجود تھے۔

اس دن سہ پہر کو ساری بستی لرز اٹھی ہر ایک کے منہ پر تھا فرنگی آگئے فرنگی آگئے۔۔۔۔۔۔ عورتیں اور بچے کچے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے۔۔۔۔ سہمی ہوئی عورتوں اور ڈرتے لرزتے بڑے بوڑھوں کی نظریں سڑک پر لگی تھیں۔ کچھ دیر میں کچھ جیپیں اور ٹرک غیں غیں کرتے کوہلو کے بازار میں نمودار ہوئے۔ ان فوجی گاڑیوں سے کچھ سپاہی اور افسر اترے۔۔۔۔ آرام آرام سے قدم اٹھاتے وہ کوہلو کے بازار کا جائزہ لینے لگے۔ پھر انہوں نے مسجد کا رُخ کیا۔ عورتوں نے کوٹھوں پر کھسر پھسر کی۔ ارے فرنگی اب مسجد میں جا رہے ہیں شاید مسجد ڈھا دیں گے۔ مائی گیتی نے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا میں اپنی جان دے دوں گی۔ مسجد کی بے حرمتی نہیں ہونے دوں گی۔!! پھر تھوڑی دیر بعد مسجد سے اذان کی آواز

بلند ہوئی اور فوجیوں نے صفیں باندھنا شروع کر دیں۔

تاجو نے مائی گیتی سے کہا۔"لو! تم کہتی تھیں مسجد کو شہید کریں گے یہ تو نماز پڑھ رہے ہیں۔"

مائی گیتی نے اس کی بات زور سے دہرائی۔۔۔۔ نماز پڑھ رہے ہیں نماز۔۔۔۔۔۔۔ اسے نماز۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ کیسے فرنگی ہیں۔۔۔؟

انہیں نماز پڑھتے دیکھ کر بڑے بوڑھوں کو کچھ حوصلہ ہوا۔ کچھ بوڑھے مرد کچھ عورتیں اور بچے ڈرے سہمے، کچھ دُور' ان کی حرکات کا مشاہدہ کرنے لگے۔۔۔ دیکھتے دیکھتے خاصا مجمع ہو گیا۔۔۔۔۔!

نماز ختم ہوئی فوجی مسجد سے باہر نکلے۔ ان کے چہروں پر عجیب نور تھا۔ ایک فوجی افسر نے مجمع کے پاس جا کر پوچھا۔!!

"کیا آپ لوگ نماز نہیں پڑھتے؟" مجمع پر سناٹا طاری تھا۔

فوجی افسر نے پھر ایک صوبیدار کو اشارہ کیا۔ صوبیدار نے بلوچی میں یہی بات پوچھی! ایک بوڑھے بلوچ نے افسر کے قریب آکر کہا؛" صاحب ہم آپ کی بات سمجھتے ہیں، ہم نماز پڑھتے ہیں پر ہم حیران ہیں آپ فرنگی کیسے نماز پڑھتے ہیں۔ ہمیں تو یہ بتایا گیا تھا کہ فرنگی کی فوج آرہی ہے، مسجدیں شہید کر دیں گے۔ آپ لوگ تو ہمیں مسلمان دکھائی پڑتے ہیں۔"

فوجی افسر مسکرایا اس نے صوبیدار سے کہا ذرا ٹرک ادھر لے آؤ۔" ٹرک جیسے ہی قریب آیا۔ افسر اس کی چھت پر چڑھ گیا۔ اس نے نہایت سنبھلے ہوئے انداز میں تقریر کی۔

"بلوچ بھائیو! بہنو اور بچو! ہماری سمجھ میں بھی اب یہ بات آگئی ہے کہ آپ کو بہکایا گیا ہے۔۔۔۔ ہم لوگ فرنگی نہیں دیکھو ہماری کھال دیکھو۔ دیکھو ہمارے بال دیکھو۔ اور کچھ دیکھنا چاہتے ہو تو ذرا خاموشی سے میری زبان سے قرآن سنو۔ پھر اس نے بڑی خوش الحانی سے الحمد شریف کی تلاوت کی۔"

بڑے بوڑھوں نے حیرت سے انگلیاں دانتوں میں دبالیں

فوجی افسر نے کہا بھائیو پورے ملک میں مسلمانوں کی حکومت ہے۔ انگریز کو گئے ۲۸ برس گذر گئے ہم سب آزاد ہیں اور ہمارا ملک پاکستان ہے ہم یہاں مسجدیں شہید نہیں مسجدیں آباد کرنے، اسکول اور ہسپتال بنانے اور آپ کو ظالم سرداروں سے آزاد کرانے آئے ہیں۔ آپ لوگ ہرگز، ہرگز نہ گھبرائیے ہمارے ساتھ تعاون کریں۔"

یہ باتیں کہہ کر فوجی افسر نیچے کودا اور اپنے دستے کو کیمپ لگانے کی ہدایت دینے لگا۔

دوسرے دن کوہلو کے لوگوں نے ان عجیب وغریب فرنگیوں کو بستی کا بازار صاف کرتے۔۔۔ اور اسکول کی عمارت کھڑی کرنے کے کاموں میں معروف پایا۔ اور تیسرے روز تو ظالموں نے غضب ہی کر دیا۔ آٹے، چینی، نمک اور سبزیوں سے بھرا ٹرک بیچ بازار میں اتار اتار کر نہایت سستے داموں اناج بیچنا شروع کر دیا۔۔۔۔ کچھ لوگوں نے حوصلہ کرتے ہوئے افسروں کو بتایا کہ ان کے پاس اناج خریدنے کو پیسے نہیں تو فوراً غریب اور نادار لوگوں کو مفت اناج کی تقسیم شروع ہو گئی۔۔۔۔! اور ایک ہفتہ بعد تو یوں لگنے لگا جیسے کوہلو میں کسی بڑی دھوم دھام کی شادی کا اہتمام ہو رہا ہے۔ اب ان فوجیوں نے ہسپتال کی تعمیر شروع کر دی تھی اور بوڑھے، بچے اور عورتیں تک ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد ہنستا مسکراتا اسکول ایک پھولوں کی کیاری کی طرح بھر گیا۔ اور ننھے منے بچے قاعدے تھامے اس کے کمپاؤنڈ میں خوشی سے اچھلتے کودتے نظر آنے لگے۔۔۔۔۔

پھر ایک دن مائی گیتی نے تاجو کو یہ خبر سنائی کہ پاکستان کہتا ہے یہ ماڑیاں خراب ہیں کوہلو کے لوگوں کو پکے مکان ملیں گے جن میں بجلی کی روشنی ہوگی اور بستی کے اندر ٹھنڈا پانی ملے گا۔۔۔۔۔۔ مفت ملے گا۔۔۔! یہ بات سنی تو تاجو کا دل ایک دم

پھڑپھڑا اٹھا۔ اس نے دھیرے سے کہا کاش بادل لوٹ آئے او خدا اُسے واپس لے آ۔۔ پھر وہ اپنے من سے بولی ہم دونوں ایک اچھا سا مکان لے لیں گے۔ افسر سے کہیں گے ہمیں بہت جلدی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں مکان دے دو ..... دل میں یہ باتیں سوچ کر خوشی سے اس کی کنپٹیاں تمتمانے لگیں۔ .....!

چند ہفتوں کے بعد ایک نئی بستی اٹھنی شروع ہو گئی نیویں کھدیں، بنیادوں میں پتھر کوٹا گیا اور کام چل پڑا۔ پھر دھیرے دھیرے پہاڑوں سے لوگ اترنے شروع ہوئے۔ انہیں عام معافیاں ملتی گئیں۔ مگر بادل نہ آیا .... وہ پہروں پہاڑوں کے درمیان پاگلوں کی طرح اس کی آمد کی منتظر رہی ...... ہفتوں سے مہینے بنے مہینوں سے سال ... نئی بستی تعمیر ہو گئی ....!! ٹیوب ویل لگ گیا .....!

ایک دن بستی میں یہ غلغلہ بلند ہوا کہ پاکستان کا کوئی بڑا افسر کوہلو میں آئے گا، لوگوں سے ملے گا، ان کا دکھ درد سنے گا.....!!

سب لوگ نو تعمیر بستی کے ملحق میدان میں جمع ہوئے۔ کمشنر صاحب نے بستی کا معائنہ کیا لوگوں کا حال احوال لیا اسی دن ایک ٹولی بہادر بلوچوں کی پہاڑوں سے اتری تھی۔ انہوں نے اپنے ہتھیار حکام کو دیئے ......! افسروں نے سب کی تعریف کی.... اور جب بادل نے بوڑھے بہارگ خان کو سہارا دیتے ہوئے اس کی بندوق اس کے کندھوں سے اتار کر سامنے بچھی میز پر رکھی تو اس سے ضبط نہ ہو سکا اس نے افسروں سے کہا۔ اب ذرا آپ اس میرے بوڑھے چچا کو دیکھیں اس نے راستہ کا بڑا حصہ میرے کاندھوں پر چڑھ کر طے کیا ہے... کیا یہ عمر پہاڑوں پر جا کر لڑنے کی ہے ...؟ صاحبو! یہ ظالم سردار ہمیں بھیڑوں کی طرح ہنکاتے پہاڑوں پر لے گئے تھے۔ وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ مجمع کو چیرتی تاجو بے اختیار بخار میں پھنکتے باپ سے آکر لپٹ گئی ..... دونوں رو رہے تھے ..... آخر فوجی افسر نے صوبیدار سے کہا .....

"بابا کو ہسپتال پہنچا دو .... آخر یہ تمہارا ہسپتال اسی دن کے لئے تعمیر ہوا ہے ...

تاجو اور بادل پیپلز کالونی میں اب میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ بوڑھا بہارگ خان اسکول کے گیٹ پر بیٹھا بچوں کا دل بڑھایا کرتا ہے۔" شاباش بچے شاباش جلدی جلدی جماعت میں جاؤ پڑھائی شروع ہے۔" اور بادل نے ان فوجیوں سے لاری چلانا سیکھ لی ہے۔ کوہلو سے کوئٹہ جانے والی لاری جب نئی سڑک پر چلتی ہے تو ترنگ میں آکر وہ گانے لگتا ہے۔

اے سرسبز و شاداب کوہلو خدا تجھے ہنستا مسکراتا رکھے ....

اور کوئٹہ کے جلسۂ عام میں جب اس نے وزیرِ اعظم کو سرداری نظام کے خاتمے کا اعلان کرتے سنا تو وہ خوشی سے پاگل سا ہو گیا ....!

اور جب کوئٹہ سے واپسی پر تاجو نے اس سے پوچھا وزیرِ اعظم نے یسے سرداری نظام ختم کیا تو اس نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی تلوار اٹھا کر ہوا میں دائیں بائیں لہرائی اور دو شدید ضربوں کا ایکشن دکھا کر چیخا ایسے۔ ایسے اور یہ کہتے وہ کوہلو کے بازار کی طرف دوڑ پڑا ......!

تلوار ہوا میں لہرا کر وہ نعرے بلند کر رہا تھا ......

سرداری نظام کی ٹوٹ گئی لگام .....!!!

جب اس کے گرد بھاری مجمع اکٹھا ہو گیا تو اس نے ٹیکرے پر چڑھ کر لوگوں کے سامنے تلوار ہوا میں لہرائی ....

بھائیو! یہ میرے سکڑ دادا کی تلوار ہے جو اس نے فرنگی سے لڑنے کے لئے اٹھائی تھی .... یہ ایک بلوچ کی تلوار ہے۔ آج یہ تلوار پوری قوم کی تلوار ہے۔ اپنے دل میں عہد کر دو کہ بلوچ کی تلوار اب کبھی ایک دوسرے کے خلاف نہیں اٹھے گی ..... بلوچ کی تلوار اب صرف پاکستان کی حفاظت کے لئے اٹھے گی ...... جس نے ہمیں اور تمہیں یہ دن دکھایا ہے آخر ہمیں ایک نئی زندگی ملی ہے ⁂

افسانہ

بوڑھا گوشت

فضلِ قدیر

روز صبح میں اس پتلی گلی سے گذر کر باغ کی طرف جاتا ہوں یہ گلی مردہ جسم کی طرح گھناؤنی اور اندھیری ہے ہر طرف کوڑے کرکٹ کے ڈھیر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں، بھونکتے ہوئے لاغر اندام کتے ایک ایسا معمول ہیں جن سے مفر نہیں۔

یہ گلی قصابوں کی گلی ہے اور گوشت کی باس اس میں ہر وقت موجود رہتی ہے۔ پو پھٹتے قصاب ریڑھوں، بائیسکلوں اور گدھا گاڑیوں پر گوشت کے لہولہان بوٹے دستیں، پٹھ اور رانیں لاد کر اس گلی میں آموجود ہوتے ہیں۔ اچھے اور توانا جانوروں کی رانیں اور پٹھ زنجیروں سے باندھ کر دکان کے سامنے لٹکا دیتے ہیں۔

میں جب تیز قدموں سے اُتو کرتا اس متعفن گلی کو لانگتا ہوں تو دور تک اس گلی کی آوازیں میرا تعاقب کرتی ہیں۔

"میاں کیا گول بوٹی ہے حلوان کا گوشت ہے کیا جاندار گوشت ہے کیا سرخم سرخ۔ دست ہے....

میں جب باغ کی تازہ ہوا میں اپنے پھیپھڑوں کو ورزش دے کر پھر اسی گلی سے گذرتا ہوں تو حشر کا میدان گرم ہوتا ہے ہر دکان پر حریص اور کنگلے گاہکوں کے جمِ غفیر کھڑے للچائی نظروں سے گوشت تاڑتے ہوتے ہیں ایک آواز بلند ہوتی ہے۔

اماں پہلوان یہ تمہیں یہ تو نری الابلا ہے ذرا ادھر کا یہ سینہ کا بوٹا۔ ہاں ہاں یہی یہی میاں" دوسری آواز اٹھتی ہے۔

"میاں پہلوان یہ آج نری ہڈیاں کیوں بھرے دیتے ہو کچھ تو خدا کا خوف کرو۔"

کھٹ کھٹ قیمہ کرتا ہوا پہلوان میلی کثیف بنیان سے پسینہ پونچھ کر اپنی چکنی چپڑی باتوں سے کسی نہ کسی طرح گاہکوں کو تیبٹر ہی دیتا ہے۔ وہ ہاتھ کی صفائی کا استاد ہے۔ اوپر اوپر دیدہ رو بوٹیوں کے ساتھ ہائیں ہائیں کرتے کرتے کچھ نہ کچھ چھیچھڑے ہر گاہک کے متھے ضرور چپکا دیتا ہے۔

میں بچپن سے گوشت کھانے کا عادی تھا مگر مجھے مدت تک دست اور ران کے گوشت میں کوئی امتیاز نظر نہ آ سکا۔ اس گلی سے سالہا سال کی یاری نے مجھے اب لحمی غذاؤں کا ماہر بنا دیا ہے۔ اور اس موضوع پر مغربی دنیا تک میں جا کر لیکچر دے سکتا ہوں۔ یہ بات میں بڑی جسارت سے کہہ رہا ہوں اس لئے کہ اسپیشلسٹ اور ایکسپرٹ کی نسل سوائے مغربی دنیا کے کہیں اور پروان نہیں چڑھتی۔ گذشتہ چند سالوں میں اسپیشلسٹوں کی فصل کچھ اس طرح اد بدا کر پیدا ہوئی ہے کہ بارش کی بوندوں کی طرح ہم انڈر ڈیولپڈ قوموں پر برسائی جا رہی ہے اور پھر بھی ختم نہیں ہوتی۔

اسپیشلسٹوں کا ذکر چل پڑا تو مجھے گھریلو زندگی کا وہ بقراط صفت بیرونی ماہر یاد آ گیا جس کی ہمسفری کا شرف کچھ دن ہوئے مجھے میسر آیا تھا۔ میں لاہور سے پشاور ایک ملازمت کے انٹرویو میں جا رہا تھا اور یہ ... بقراط گھریلو زندگی کے ایک سیمنار میں شرکت کے لئے پنڈی جا رہے تھے۔ ایک مختصر سے باہمی تعارف سے ہم ایک دوسرے سے ایٹ ہوم ہو گئے اور امریکن ایڈ سے لے کر ویٹ نام تک سارے موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوتا اور سفر کٹتا رہا۔ گجرات کے قریب کھیتوں میں چرتی ہوئی بھینسوں کی طرف انگلی اٹھا کر اس نے کہا۔ "یہ جانور تمہاری بدقسمتی کا نشان ہے خدارا اسے اپنی زندگی سے نکال دو۔ یہ نہایت مکروہ اور لدھڑ جانور ہے اس کا دودھ پی پی کر تم سست اور لدھڑ ہوتے جا رہے ہو۔ تمہیں احساس نہیں یہ کتنا بے وقت جانور ہے"۔ میں نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ ماری اور ہنس کر کہا...... تم سچ کہتے ہو میں بھی اپنی بیوی سے خاصہ بے زار ہوتا جا رہا ہوں...... یہ بات سن کر وہ اچھل دو زانو ہو بیٹھا..... اب گفتگو اس کی قلمرو کی حدود میں آ گئی تھی۔ اس لئے اس کا سارا وجود چمک اٹھا اس نے عینک ماتھے پر چڑھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ تم اپنی بیوی سے بے زار ہو۔ "کیوں ؟"

میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہ اس جانور کی طرح لدھڑ ہو گئی ہے۔

وہ بڑے زور سے ہنسا اور اُس نے ایک طویل قہقہہ لے کر کہا۔ "ہوں سمجھا..... ٹھیک ہے گھریلو زندگی کی ناخوشگوار یکسانی اور رو ادوں تمہاری ندرت پسند طبیعت پر بھی شاق گذر رہی ہے ..... گذشتہ سال میں نے سنسانی میں پانچ سال کے شادی شدہ پانچ ہزار جوڑوں کا جو سروے کیا تھا اس میں پچانوے فیصد لوگ زندگی میں یکسانی کی کلفت کا شکار نکلے ہیں تب ایڈاہو کے ہوم اینڈ سوشل سائنس انسٹیٹیوٹ میں ایک مقالہ بھی پڑھا تھا۔ اس مقالے میں میں نے کچھ بہت پتے کی باتیں بیان کی تھیں اس تفصیل میں جانے کا تو میرے پاس فی الحال وقت نہیں لیکن ایک گُر کی بات بتائے دیتا ہوں۔ اس سے تمہارا اور تمہاری طرح اور بہت سے شریف آدمیوں کا بہت بھلا ہوگا"۔

میں نے سمٹ کر کہا۔ فرمایئے میں ہمہ تن گوش ہوں۔

بقراط نے ماتھے سے عینک نیچے سرکائی اور بولے ذرا یہ سوچ لو کہ اس نسخے کو آزمانے کے لئے تمہیں تھوڑا سا اپنی سطح سے نیچے آنا ہوگا!

میں نے کہا۔ "اس کی فکر نہ کرو ہم نے ڈیڑھ سو سالہ انگریزی دور میں نیچے آنے میں خاصی مہارت پیدا کر لی ہے ویسے بھی اوپر چڑھنے کے بجائے سن سے پھسل کر نیچے آ جانا آسان ہے"۔

وہ دھڑ دھڑا کر ہنسا اور اُس نے آنجہانی چرچل کی شان میں کچھ ناواجب کلمات کہے اور پھر مربیانہ انداز میں بولا۔ انگریزوں نے تمہیں بہت سی غلط پٹیاں پڑھا دی تھیں درحقیقت اُن کی شہنشاہیت پرستی کے مفادات کے عین مناسب یہ تھا کہ تم میں احساس کمتری پیدا کریں۔ اور تمہیں بار بار تلقین کریں کہ اپنا معیار زندگی بڑھاؤ بھلا مسرتوں کے بغیر زندگی کی کوئی اہمیت برقرار رہ سکتی ہے۔ !!

میں نے سو فیصد اُس سے اتفاق کیا۔ پھر اُس نے سنسانی۔ اور ایڈاہو کے شادی شدہ جوڑوں کے پیچ در پیچ مسائل سمجھانے شروع کئے۔ میں نے کہا "پروفیسر مجھے سنسانی سے کوئی دلچسپی نہیں مجھے تو یہ بتاؤ کہ میں اپنی لدھڑ جورو سے بیزار رہتے ہوئے جو مجبور ہوا جا رہا ہوں اس کا حل کیا ہے ؟

وہ پھر زور سے دھڑ دھڑا کر ہنسا اور اُس نے کہا تم دونوں کو اپنی سطح سے ذرا نیچے آنا پڑے گا۔ تم ذرا اپنی بیوی سے کہو جن اداؤں میں دوشیزگی قائم رکھے اور تم سے کنواری نازنینوں کی طرح بچتی اور کتراتی رہے اس طرح

تم تو خیر ماشق کی طرح رست وخیز کی منازل سے گزر گئے تمہارا شوق تو تیز ہو گا اور تم اُنے گھر کی مرغی دال برابر نہیں سمجھو گے۔ اور اس بچے اور گھرانے سے اس کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا خصوصاً مٹاپے کے لئے تو اکسیر ہے وہ بے تحاشا ہنسا اور میرے بازو میں ایک چٹکی کاٹ کر اس نے اپنی دائیں آنکھ شرارت سے پھڑکائی اور پھر زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

میں نے کہا "پروفیسر آج سے تین سال پہلے جب گیارھواں بچہ وجود میں آیا تو وہ ایک دم سے اتنی موٹی اور لدھڑ ہو گئی کہ اس کے دماغ سے ساری لطافتیں ختم ہو گئیں تیسرے گیارھویں بچے نے سارا بہت بد مزہ کر دیا۔ اس نے ایک کڑوا سا منہ بنا کر کہا "تم میری اسکیم سے اہر ہوئے" باقی راستے وہ منہ موڑے ٹائم میگزین پڑھتا رہا پنڈی کے اسٹیشن پر ڈبے سے اترتے ہوئے وہ عجلت سے میرے پاس آیا اور اپنا منہ میرے کان کے پاس لاکر بولا "افیم کھایا کرو" قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں وہ ڈبے سے نیچے کود گیا۔"

اسپیشلسٹوں کی بات نہ معلوم کیوں اس وقت دماغ میں آن گھسی بات تو یہ تھی کہ اس گلی کے راستے نے اور اس پہلوان کی تہہ در تہہ شخصیت نے خود مجھے ہر قسم کے گوشت کا ماہر اور اسپیشلسٹ بنا دیا تھا

شروع شروع میں جب میں اس گلی سے گزرتا تو نجاست اور غلاظت سے ناک پر کپڑا رکھ کر۔ زناٹے سے گزر جاتا لیکن اب یہ معمول کچھ پرانا ہوا تو رفتہ رفتہ گلی میرے وجود میں رینگ گئی اور اس کی جزئیات میری توجہات خواہ مخواہ اپنی منعطف کرتی رہیں۔

پہلوان کی دکان پر کبھی ایک لڑکا نوکر رہا۔ پہلوان جس انداز میں اسے سیڑھی در سیڑھی گالیاں دیا کرتا تھا۔ اس نے مجھے ایک بار اس کی دکان پر جانے کے لئے مجبور کر ہی دیا۔ کچھ سودا دیکھ کر میں نے پہلوان سے ذرا رسمی سی صاحب سلامت بڑھانے کے لئے کچھ گوشت پر بات کی اور پہلوان نے مجھے بڑے غور سے گھور کر کہا، "اس عمر میں اور ہاتھے پر پیلا ہٹ اللہ کیا آج کل کے جوان ہیں۔ ارے میاں سری پکا کر کھاؤ پائے کی یخنی پیو دیکھو کیا رنگ آتا ہے۔" میں نے ذرا کچھ اور آگے بڑھ کر جب یہ پوچھا کہ پہلوان کیا گوشت سے بھی علاج ہوتا ہے تو پہلوان نے بوٹی بوٹی اور نس نس پر اظہار خیال شروع کر دیا۔ اپنے میل بنیان سے پسینہ پونچھ کر گال پھلا کر کہا۔ کلیجی کھاؤ گے تو کلیجی مضبوط ہوگی۔ سینے کا گوشت کھاؤ تو سینہ مضبوط ہو گا گردے کھاؤ تو گردے مضبوط ہوں گے۔ اس کی باتوں میں ٹیپ کا بند یہ تھا کہ میاں دنیا میں سوائے گوشت کے رکھا کیا ہے۔ پھر وہ لمبی سانس کھینچ کر فلسفیانہ انداز میں بولا "دنیا تو گوشت خریدتی ہے گوشت۔ اب دیکھو ذرا بڈھا جانور ہو تو اُس کے گوشت کی طرف لوگ نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جوان لہو کی ہر کوئی قدر کرتا ہے۔"

میں جب حاصل مطلب پر آیا اور میں نے اس کے نوکر چھوکرے کے متعلق کہا کہ "پہلوان آخر اس لڑکے سے اگر کام نہیں ہوتا تو اسے نکال کیوں نہیں دیتے" تو اُس نے بہت برا مان کر کہا "بابو جی تم دفتر میں کام کرنے والے معاملے کی حکمت کی بات نہیں جانتے۔"

میں نے کہا وہ کیسے تو اُس نے منہ میرے کان کے قریب لاکر کہا گوشت کی خرید ہوتی ہے اس دنیا میں گوشت کی۔

اس کو نوکر کی تکرار سے میں بہت بدمزہ ہوا اور میں نے منہ بنا کر کہا میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

تو اُس نے ماتھا پیٹ کر پھر میرے کان کے پاس منہ لاکر کھسیانا شروع کر دیا۔

"بھلا باؤ جی پانچ روپے میں کیا بنتا ہے۔ آج کل بس اللہ کا نام ہو بس جوان لہو ہے تازہ بوٹی ہے۔ قیمے پر دن بھر پلا رہتا ہے یہ حکمت کی بات ہے سمجھے"

میں نے اسی قدر رازداری میں کہا "پہلوان پھر تم اس قدر بھاری بھرکم گالیاں اُسے کیوں دیتے رہتے ہو سننے سے طبیعت خراب ہوتی ہے"

اس نے سر کھجایا اور کہا سالہ ابھی چوزہ ہے ابھی سے اگر اپنے کس بل کا کچھ خیال پیدا ہو گیا تو پانچ منٹ نہیں ٹکنے کا پانچ منٹ پھر تو جائے گا سیدھا فلم کمپنی میں۔

میں نے چلتے ہوئے کچھ گوشت خرید لیا تھا گھر پر جب پکایا گیا تو

سارے گھر نے تعریف کی واقعی بہت ملائم بوٹی تھی۔ پھر صورت یہ ہوئی کہ روز میں سیر سے لوٹتے وقت پہلوان کی دکان سے گوشت خریدنے لگا۔

کچھ دن تو گوشت کی واہ واہ رہی مگر جب بعد میں تنقید کا دروازہ کھل گیا تو مجھے پہلوان سے شکایت کرنی پڑی۔

میری شکایت سن کر پہلوان زور سے ہنسا۔ اور اُس نے تہمد سے پسینہ پونچھ کر کہا۔

"میاں روز روز حلوہ نہیں کھایا جاتا پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ سب روز کا گوشت ایک سا ہو تو حکمت کیسے پیدا ہو۔ اچھے بُرے کی تمیز کیسے آئے۔

مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے کہا "یہ اچھی دلائی آپ۔ مجھے سکھاتے ہیں کہ گھر میں بیٹھنا مشکل ہو گیا ہے روز تُو تُو میں میں سے ناک میں دم آگیا ہے"۔ پہلوان نے قیمہ کوٹتے ہوئے کہا "کوئی نہیں یہ چکر پھیر تو زندگی کا حصہ ہیں۔ ابھی جوان ہو ذرا سفیدی آئے گی تو بات سمجھ لوگے۔ چلو آج دیکھو کیا ادلے کی بوٹی دے رہا ہوں بڈھا بھی آرام سے لقمہ بنا لے گا۔"

اُس نے ایک، ماہر کاریگر کی طرح گوشت کی ایک راس سے چن چن کر بوٹیاں تراشنا شروع کر دیں .... بابو جی ساری دنیا میں گوشت کی خریداری ہے۔ گوشت کی ساری لیلا ہے جب جوان تھا کوایک بار کلکتہ گیا دو ایک کشتیاں ماریں تو بڑا چرچا ہوا ایک دن گوہر جان نے بلوایا کہ پنجاب سے جو پہلوان آیا ہے ذرا اُس کی ملاقات ہم بھی کریں۔ بس میاں میرے جب، اس کے آدمی نے مجھے یہ پیغام دیا تو میں بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ میں ٹھیرا پہلوان میرا رنڈی کے پاس کیا کام۔ بس جی خدا بھلا کرے آپ کا میں نے اس کے نوکر سے کہلایا کہ بائی جی کو سلام دو اور کہو ہم پہلوان لوگ صوفی ہوتے ہیں ہمارا آپ کے پاس کیا کام۔ مگر میرے ساتھ کے یاروں نے کہا واہ بھئی پہلوان بھلا جانے میں حرج بھی کیا ہے بھلا ایک عورت کیا تمہیں پنجرے میں بند کر لے گی سو بابو جی میں نے بھی کچھ خیال کر کے کہا اچھا بائی جی کو سلام دینا شام کو آئیں گے۔ بابو جی خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی بیس برس کا میرا سن ہوگا اور قوت اور بل کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا سچ جانو میں اپنے آپے پر آپ عاشق ہو گیا تھا۔ بس جی اللہ تمہارا بھلا کرے میں شام کو جو سلک کا لاچہ اور دو گھوڑے بوسکی کا کرتہ پہن کر گوہر جان کے یہاں پہنچا تو اُس کے چھکے چھوٹ گئے بڑی خاطر کی۔ دے گلاس پہ گلاس لسی کا۔ اور تھال بھر خالص گھی کی مٹھائی سامنے رکھی۔ اس وقت اس کا سن ڈھل رہا تھا مگر شوق نہ سن دیکھتا ہے نہ سال شوق تو شوق ہے۔

میں نے ہمہ تن گوش ہو کر کہا "پھر"؟ اس نے ایک سرد آہ کھینچ کر کہا اُس وقت دل میں استاد کی بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اگر کشتی مارنی ہے تو عورت سے دور رہ میں نے باؤجی گوہر جان سے کہا بائی جی مجھے معاف کرو۔ اس نے بڑے لالچ ڈالے بولی ہزار روپیہ مہینہ جیب خرچ لئے جاؤ ہم سے۔

میں نے کہا بائی جی آپ کو مجھ سے لینا کیا ہے میں پہلوان آدمی ہوں صوفی منش۔ میں آپ کے کس کام کا۔ اور خاموشی سے وہاں اٹھ آیا۔

اب کبھی کبھی پچھتاوا ہوتا ہے اس عمر میں صبح سے شام قیمہ کوٹتے دل اُوب جاتا ہے۔

پہلوان سے میری یاد اللہ برابر بڑھتی گئی اور وہ روز گوشت کے کسی نہ کسی پہلو پر مجھے طویل لیکچر دیتا رہا۔ گوشت کے اس سیر حاصل مطالعے نے مجھے اب کچھ ایسا کر دیا کہ ساری دنیا میں گوشت ہی گوشت بکھرا نظر آنے لگا۔ جوانی کی دوپہر جب چڑھی تو خوب سے خوب تر کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارا پھرنے لگا۔ مال روڈ کے چکر پر چکر لگاتا رہا ہر طرف انسان کم گوشت کے ڈھیر زیادہ نظر آئے۔

وہ جاڑوں کے آخری ایام کی ایک اداس شام تھی ماحول کی گھٹن سے اکتا کر مال پر آ نکلا کچھ دیر مٹرگشت کے بعد ایک ریستوران میں جا بیٹھا یہ ریستوران گزشتہ دس برس سے میری تنہائیوں کا شریک رہا تھا میں یہاں کی ہر شخصیت سے آشنا ہوں۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے منشی جی میرے سامنے ادھیڑ سے بوڑھے ہوتے ہیں۔ آج اس ریستوران میں داخل ہوا تو منشی جی کو اپنی جگہ نہ پایا۔ اور جب میں نے پاس آرام کرسی پر لدے

ہوٹل مالک سے دریافت کیا تو انہوں نے انتہائی سادگی سے برا سا منہ بنا کر کہا۔ جی ان کی لمبی چھٹی کر دی ہے۔ اب کام ان سے ہوتا نہیں بوڑھے بہت ہوگئے ہیں۔ کئی بل لکھنا بھول جاتے ہیں۔

میں نے اپنے دل میں کہا سچ ہے بوڑھے گوشت کا کوئی خریدار نہیں اور چپکے سے ہوٹل سے سرک آیا۔ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر جب گھر کی طرف چلا تو قصابوں والی گلی میں پہلوان کی دکان پر خاموشی سی طاری تھی وہ دکان بند کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے مجھے دیکھ کر ایک لہرائے مستانے انداز میں انہوں نے سلاموئیکم (سلام علیکم) کا نعرہ مارا میرے قدم آگے بڑھنے سے رُک گئے.....

میں نے کہا "پہلوان خیریت تو ہے" وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ سب خیریت ہی ہے بابو جی.... پھر ایک لمبا سا سانس لے کر وہ منہ میرے کان کے پاس لا کر کھسپھسائے...."ہوٹل بازیاں ہو رہی ہیں۔ ہوٹل بازیاں۔ آج صاحبزادے نے گلّے سے ساٹھ روپے نکال لئے ہیں۔ کچھ نہ پوچھو بابو جی۔ کوئی دن دیکھ لو گے دکان سے مجھے ہاتھ پکڑ کر اٹھا دے گا.... گوشت بڈھا ہوگیا ہے تاہم تو جانتے ہی ہو اس دنیا میں گوشت ہی پوچھا جاتا ہے۔"

میں ان کی ڈھارس بندھانے کے لئے کچھ اوندھے پونے جملے کہہ کر گھر آ گیا۔ کچھ عرصے بعد مجھے ملازمت کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا جہاں سے میں سات سال بعد لوٹا.... قصابوں کی گلی لانگتے ہوئے میری نگاہیں مسلسل پہلوان کو ڈھونڈھنے لگیں۔ پہلوان کی دکان وہاں کہیں نظر نہ آئی اس کی جگہ ایک چائے کا ہوٹل قائم تھا.... میں نے آزو بازو نظریں ماریں تو ایک مختصر سے کوشے میں پہلوان کو ایک مونڈھے پر جھولتے پایا۔ ان کے سامنے سگریٹ ماچس کا خوانچہ تھا اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں ان کا جسم بری طرح جھول گیا تھا۔ اور جب میں نے ان کا شانہ پکڑ کر انہیں جھنجھوڑ کر خود کو بمشکل پہچنوایا تو وہ بڑے اداس لہجے میں بولے "بھیا گوشت بڈھا ہوگیا ہے۔ اب کچھ ہی دن میں کپڑے مکوڑوں کی خوراک بننے والا ہے لمڈے نے ہمیں ہاتھ پکڑ کر دکان سے اتار دیا کہ لوگ مجھے قصائی قصائی کہتے ہیں اب یہ ہوٹل نکال کر ایڈی پولو بن گیا ہے.... پھر وہ اپنی مخصوص ہنسی ہنسے۔ وہ میں نے کہا نا بابو جی گوشت بڈھا ہوگیا ہے بڈھے گوشت کا کوئی خریدار نہیں۔ اور اب کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہ گوہر جان کلا والی کی بات، مان لیتا تو بڑھا وقت تو ٹھکانے سے گذر ہی جاتا... میں کنپٹیوں پر چڑھے سفید بالوں کو کھجاتا کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پہلوان نے میری طرف دیکھ کر کہا اجی کس سوچ میں پڑ گئے آپ اجی گوہر جان بڑی اونچی زنانی تھی۔ اور پھر انہوں نے جب اس قصہ کو مکرّر شروع کیا تو میں نے بات کاٹ کر کہا "پہلوان گوہر جان کا قصہ میں سن چکا ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اب ریٹائر ہو جاؤں" اور اپنے بوڑھے وجود کے ساتھ مفاہمت کرتے ہوئے میں اُس گلی کو آہستہ آہستہ عبور کرنے لگا۔

افسانہ

رفاقت

سعیدہ عبدل

آج تقریباً بارہ سال بعد سمرنا اپنے میکے واپس آئی تھی .... اور اتنی طویل مدت بعد آئی تھی تو کس حال اور کن حالات میں .... نہ ابا جان گھر کی دہلیز پر منہ میں پائپ دبائے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہتے ہوئے ملے اور نہ امی جان نے پھیلی ہوئی باہوں کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگایا۔ نہ شہاب بھیا نے اپنی پیشانی پر لٹکی ہوئی گھنگھریالی لٹوں کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیچھے سنوارتے ہوئے آکر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر پیار کیا اور نہ ہی چھوٹی بہن روزینہ اس کے گلے میں باہیں حمائل کر کے زور سے چیخی۔ "ارے اپی آگئیں۔" بلکہ وہ قہقہوں اور خوشیوں بھری چیخوں سے گونجتا ہوا بھرا پُرا خوشنما گھر اب کھنڈر کی طرح ویران ہو چکا تھا اور اس پر قبرستان جیسا ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔

وہ بے اختیار ہو کر امی کے پلنگ پر گر پڑی اور تکئے پر منہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی.... کچھ دیر یوں ہی صاف شفاف تکیہ بھگونے کے بعد اس نے سسکیوں کے درمیان آہستہ سے کہا۔ "امی آپ تو میری ذرا سی پریشانی پر بلک اٹھتی تھیں اور اب جبکہ میں بالکل بے آسرا ہو کر دنیا میں تن تنہا ہو کر نحیف و نزار ہو کر آپ کے پاس آئی ہوں تو آپ نہیں ملتیں۔ مجھے آپ کی ہمدردی کی ڈھارس اور پیار کی اشد ضرورت ہے .... خدا کے لئے صرف چند لمحوں کے لئے واپس آجایئے.... میں بڑی دور سے آپ کا سہارا پانے کے لئے آئی تھی.........

......امی ....." اتنے میں اس کے غم کی شدت سے کانپتے ہوئے شانوں پر کسی نے نرمی سے ہاتھ رکھا اس نے مڑ کر دیکھا چوکیدار کی بیوی نوزن آنسو بھری آنکھوں سے کھڑی اسے تک رہی تھی "نہ رو بیٹیا۔" اس نے بڑی رقت سے کہا۔ "مجھے ہی ماں سمجھ لو۔" سمرنا کا دل بھرا ہوا تو تھا ہی. وہ اٹھ کر نوزن کی باہوں میں سما گئی اور آنکھیں ساون کی ندیا کی طرح بہنے لگیں۔

یہ نہیں کہ شوپارہ کی خوبصورتی یا گہما گہمی میں کوئی فرق پڑا ہو بلکہ اب تو وہاں پہلے سے بھی زیادہ رونق اور چہل پہل تھی ۔ رات گئے تک ساتھ والے چھوٹے چھوٹے خوشنما بنگلوں میں مغربی موسیقی کے ریکارڈ چنگھاڑتے اور اس کی تیز دھن پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مست ہو کر ٹیپک کرتے۔ لیکن اسے ان باتوں سے وحشت ہونے لگتی۔ اسے اگر کسی بات سے سکون ملتا تو وہ صبح صبح کی چہل قدمی تھی ۔ نور کے تڑکے کا سہانا سہانا وقت پرندوں کے خوش الحان گیت ننھے ننھے باغیچوں میں کھلے ہوئے شبنم میں نہائے پھولوں کی پیاری پیاری خوشبو اور تر و تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکے....اسے ان چیزوں کو دیکھتے انہیں محسوس کرنے اور اپنے آپ میں جذب کر لینے میں بڑا لطف آتا تھا وہ چائنیز شومیکر "چو نگ ہا" کے یہاں کے بنتے ہوئے کالے

سوئیٹ کے واکنگ شو میں بڑا آرام محسوس کرتی ہوئی تیز تیز قدم اٹھاتی مہکتی ہوئی ہوا کی تازگی کو گہری سانسوں میں سموتی شو پارہ سے کئی میل آگے نکل جاتی۔ پھر وہاں کے فیشن ایبل بازار بند پر دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ چلتی پریذیڈنسی روڈ سے ہوتی ہوئی گھر واپس آجاتی۔ اسے سب کچھ ویسا ہی معلوم ہوتا جیسا آج سے بارہ تیرہ سال پہلے تھا۔ اس حسین وادی کے وہ پرکیف نظارے ..... وہ قدم قدم پر بکھری ہوئی دل ربائیاں .... وہ سفید سفید چکنے تنوں والے نیلگوں آسماں کو تکتے ہوئے لمبے سفیدے کے درختوں کی قطاریں وہ عظیم الشان چنار کے درختوں کے جھنڈ .... وہ سیب آلو بخارے اور چیری کے مسکراتے ہوئے شگوفے ... وہ پہاڑوں کے ڈھلان پر اونچے نیچے بنے ہوئے شال کے لہلہاتے کھیت .... وہ فضا میں پھیلی ہوئی زعفران کی دل لبھا دینے والی خوشبو اور اسی طرح حسن و دلربائی میں ڈوبی ہزاروں چیزیں سب کچھ اپنی اپنی جگہ ویسی ہی دلکش تھیں ... البتہ اس کے دل کی کائنات میں سدا کے لئے خزاں نے اپنا ڈیرہ جما لیا تھا۔ ادھر اس کا عزیز شوہر دل کے دورے میں ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ ادھر شفیق اور پیاری ماں اللہ کو پیاری ہوئی۔ باپ کا سایہ پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ وہ بیوگی کا بھیانک لبادہ پہنے دور دراز کے دیس نائیجیریا سے میکے آئی تو دل اجڑ چکا تھا۔ دوست احباب اور عزیز واقارب اس کی جوان سال بیوگی کا افسوس کرتے .... اس کے غم میں شریک ہوتے اور دکھ درد بانٹنے کے لئے برابر آتے رہے۔ ... لیکن کافی دنوں انہیں برداشت کرنے کے بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے ان کی باتوں میں بناوٹ اور تصنع کی آمیزش ہو .... جیسے وہ لوگ اس کی بدحالی احساس محرومی اور اکیلے پن کا تمسخر اڑا رہے ہوں۔ اور پھر ایک دم سے اس کا جی چاہا کہ یہ رسمی گفتگو کرنے والے لوگ اس کی تنہائی میں مخل نہ ہوا کریں .... تنہائی ... کتنی عزیز شے ہے یہ تنہائی بھی۔ کوئی ساتھ دے یا نہ دے لیکن یہ ساتھ نہیں چھوڑتی۔ مرتے دم تک غم خواری کرتی ہے۔ کتنی بے غرض رفیق اور انیس ہوتی ہے یہ۔

•

اس نے اپنی دس سالہ سرخ و سفید پیاری سی بیٹی ثناکو ایک پرائیویٹ کونونٹ میں داخل کروا دیا جس میں بچپن میں اس نے خود بھی پڑھا تھا اور خود وہیں ٹیچر کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ان کے پرانے چوکیدار رمضو کی بیٹی زلیخا اس کے گھر کا کام کاج کرنے صبح ہی صبح آجاتی اس کی ماں نوراں کھانا پکا دیتی سمرنا کا وقت بھی اسکول میں اچھا گذر جاتا اور پیسے بھی اچھے خاصے مل جاتے کچھ پیسے وقت بے وقت کے لئے بینک میں بھی جمع تھے ... اس نے یہ پیسے اپنے میاں کے شراب اور جوئے سے بڑی سختیاں جھیل کر بچائے تھے۔ بس اس کی اسی عادت سے وہ بے حد نالاں تھی۔ پھر بھی وہ جیسا بھی تھا اس کا شوہر تھا اور شوہر جیسا بھی ہو ایک عورت کی عزت کی زندگی کے لئے بڑا سہارا ہوتا ہے .... خیر .... زندگی اب ایک نہج پر لگ گئی تھی اور وہ رفتہ رفتہ اس خاموش زندگی کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ لوگوں نے بہت چاہا کہ وہ حسب سابق کلب کی ممبر بنے سوشل فنکشنز اور پکنک پارٹیز میں شریک ہو اور پہلے کی طرح وہاں کی ہیپی گرل کہلائے۔ لیکن اس نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ان مشاغل سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

جب کچھ ماہ و سال ایسی ہی پرسکون تنہائیوں اور گہری خاموشیوں میں گذر گئے اور وہ اپنے اوپر بیتی ہوئی قیامتوں کو کچھ کچھ بھولنے لگی تو اچانک ذہن کے نہ جانے کون سے پردے کے پیچھے سے ایک دھندلی سی تصویر ابھری اور پھر اس کے نقوش بتدریج گہرے ہوتے ہوتے ایک بالکل صاف اور واضح تصویر کا روپ دھار گئے۔ سمرنا نے چونک کر اسے دیکھا .... یہ تو تبریل تھا .... اس کی پہلی اور آخری محبت اور یکا یک وہ پندرہ سولہ سال پہلے کی دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ نوجوانی کا زمانہ تھا۔ ایسے میں زندگی کتنی حسین اور دلفریب معلوم ہوتی ہے .... اس دن وہ لوگ سونا رباغ پکنک کے لئے گئے ہوئے تھے واپسی میں دریائے جہلم پر ان کا شکارہ پرسکون رفتار سے بہہ رہا تھا وہ اور اس کی سہیلیاں کوئی خوبصورت لے والا گیت مدھم سروں میں گا رہی تھیں کہ دفعتاً ساتھ ساتھ چلنے والے شکارے سے آواز آئی " یہ رفتار شان کے خلاف ہے تیز چلاؤ۔ چلو ہو جائے مقابلہ تمہارے "گلس پی کوک" اور ہمارے "فلاور گارڈن" ۔ کا (یہ دونوں شکاروں کے نام تھے)۔ اس جاذب نظر لڑکے کا یہ کہنا تھا کہ شکارے والوں

نے رفتار تیز کر دی ۔ لڑکیاں بہت چیخی چلائیں لیکن تو یہ کیجئے ان پر جیتنے کا بھوت سوار تھا۔ وہ طوفانی تیزی سے اڑے چلے جا رہے تھے ۔ آخر منزل مقصود پر پہنچ کر سمرنا نے اس خوش شکل لڑکے شرجیل کی وہ خبر لی کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور وہ لگا ہاتھ جوڑنے اور معافی مانگنے ۔

اس دن تو سمـــرنا شرجیل کی آنکھوں میں اپنے لئے پسندیدگی کی لہر نہیں دیکھ سکی تھی کیونکہ وہ سخت غصے میں تھی لیکن رفتہ رفتہ جب دونوں خاندانوں میں دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے اور جلد جلد ملاقاتیں ہونے لگیں تو دو دلوں نے محبت کی لہروں کو خاصا گرم پایا ۔

سب سے زیادہ قریب وہ اس وقت ہوئے جب پہلگام میں دونوں خاندانوں کے خیمے پاس پاس نصب ہوئے ۔ ہر سیر و تفریح ہر پکنک کے پروگرام میں دونوں خاندانوں کے افراد کی شرکت لازمی ہوتی تھی ۔ روزانہ شام کو سب ایک ساتھ ہی نکلتے لیکن آگے بڑھتے بڑھتے بڑوں کی ٹولی جوان نسل کی ٹولی سے خود بخود الگ ہو جاتی اور اکثر ایسا ہوتا کہ سمرنا اور شرجیل کسی نہ کسی حیلے بہانے اپنے بھائی بہنوں اور کزن وغیرہ کی ٹولی سے کٹ کر کبھی آگے کبھی پیچھے رہ جاتے ۔

ایک بے حد حسین شام جبکہ شاہ خاور سامنے والے سب سے اونچے پہاڑ کی چوٹی کے عقب میں جانا ہی چاہتا تھا موسم نہایت ہی خوشگوار اور پر لطف تھا قدرت کی ہر شے سے خوبصورتی کی شعائیں پھوٹ رہی تھیں ۔ ایسے میں سمرنا اور شرجیل ندی کے صاف و شفاف چمکتے ہوئے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے ۔ شرجیل کی پر شوق نگاہیں سمرنا کے عارض گلگوں کی بلائیں لے رہی تھیں ۔ وہ ان نگاہوں کے پیار کو محسوس کر رہی تھی لیکن انجان بن کر بولی ۔ "شرجیل دیکھو پانی کے نیچے یہ رنگین سنگریزے کتنے پیارے لگ رہے ہیں ۔" وہ ایک سیکنڈ رکی اور پھر اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا ۔ "اوہ ۔ یہاں قدرتی مناظر اپنے اصل روپ میں جلوہ گر ہیں ۔ ۔ ۔ اتنے پرکشش اتنے مسحور کن کہ جی چاہتا ہے کہ ساری عمر یہیں بتا دوں ۔"

شرجیل نے مدہوش ہو کر کہا ۔ "لیکن اس سے کہیں زیادہ قیامت خیز پاگل بنا دینے والا حسن قدرت کے اس جیتے جاگتے شاہکار کا ہے ۔

یہ سیر و تفریح اور خوش باشی کے ایام طویل سے طویل تر ہوتے گئے ۔ اتنے بہت سے آسودہ حال جوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولی ایک جگہ جمع ہو جائے تو کوئی نچلا کیسے بیٹھ سکتا ہے ۔ چند دن بعد ایک لمبی سیر کا پروگرام بنا یہ چندن کی وادی تھی جہاں پوری جماعت ٹٹوؤں اور خچروں پر لد کر روانہ ہوئی ۔ جب چڑھائی شروع ہوئی تو منظر اور بھی زیادہ خوشنما ہو گیا ۔ سمرنا اور شرجیل کے گھوڑے سب سے پیچھے ساتھ ساتھ چل رہے تھے ۔ شرجیل کے بائیں ہاتھ پر مہیب کھڈ تھا ۔ اس نے چلتے چلتے آہستہ سے سمرنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ۔ " اگر میں اس کھڈ میں اتفاقاً گر جاؤں تو یہ کتنی دلفریب موت ہو گی کیونکہ تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے منہ سے بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اچانک سمرنا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا ۔ ۔ ۔ ۔ شرجیل پاگل مت بنو تم تو مجھے مار ہی ڈالو گے ۔ چلو تم اپنا گھوڑا اس طرف لے آؤ ۔ ۔ ۔

یہ حسین لمحہ شرجیل کی زندگی میں کیسا تابناک تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے منہ سے سرشاری کے عالم میں نکلا ۔ زندگی کے سفر میں اتنا خوبصورت ساتھی ہو تو میں کیا کیا شدائد نہ جھیل ڈالوں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

پک نک بہت ہی پر لطف رہی ایک لکڑی کے خوشنما ہٹ میں مزے مزے کے کھانے کھائے گئے ۔ اس کے بعد ناش کے مختلف کھیلوں کی بازی جمی پھر سریلی آوازوں کے گانے ٹیپ کئے گئے کچھ لڑکیاں اور لڑکوں نے مغربی موسیقی پر ٹیک اور جرک کیا شام کی چائے جلدی پی کر سب گھر روانہ ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ راستہ میں انہیں وہ پل بھی دیکھنا تھا جو برف سے ڈھکا ہوا تھا ۔

جب یہ لوگ قہقہوں ہنسی کی پھلجھڑیوں گنگناہٹوں اور خوبصورت باتوں میں مگن وہاں تک پہنچے تو برف کا اتنا بڑا سا پل دیکھ کر حیران رہ گئے ۔ دو بڑی بڑی پتھر کی چٹانوں کے بیچ میں یہ برف کی بہت بڑی اور بہت موٹی چٹان یا پل رکھا ہوا تھا اور اس برفیلے پل کے نیچے

سے ایک پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سے گرتا ہوا پہاڑی نالہ اچھلتا کودتا اور بے حد شور مچاتا نیچے چلا جار ہا تھا۔ سب قدرت کا یہ کرشمہ دیکھ کر بے حد محظوظ ہوتے ہوئے گھر جانے کے لئے اپنے گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ اتفاق سے اس وقت سمرنا کو ناشپاتی کے ایک بڑے سے درخت پر ایک بہت پیارا طوطا نظر آیا۔ اس نے آج تک اتنا بڑا اتنا رنگین اور خوبصورت طوطا نہ دیکھا تھا۔ وہ چپکے چپکے اس کے قریب جاکر اسے دیکھنے لگی۔ شرجیل اسے بلانے آیا تو سمرنا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کو کہا۔ دونوں اس حسین طوطے کو اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ بڑے بڑے قوس قزح جیسے پیارے رنگوں والے پر پھڑ پھڑاتا اُڑ نہیں گیا۔ زرینہ، بمپی، طاہرہ شاہد اور عدنان ان کو پکار پکار کر چلے گئے تھے۔ اب جو یہ لوگ اس جگہ آتے جہاں گھوڑے کھڑے تھے تو دیکھا کہ کار۔ واں کوچ کر چکا ہے سمرنا کے گھوڑے کا ہاتو پانی پینے گیا ہوا تھا گھوڑے کی رکاب کافی اونچی تھی۔ شرجیل نے سمرنا کی مدد کرنا چاہی لیکن اس نے منع کر دیا اور ایک پتھر پر کھڑے ہوکر جیسے ہی پاؤں رکاب میں ڈالنا چاہا نہ جانے ایک دم سے گھوڑے کو کیا ہوگیا۔ وہ پہلے بڑے زور سے ہنہنایا۔ پھر بڑی تیز رفتار سے اس طرف بھاگ گیا جدھر سے ابھی یہ لوگ آئے تھے۔ اب ہاتو کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ دونوں ایک پتھر پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ سمرنا نے سنجیدگی سے کہا۔ یہ تو بڑی مشکل ہوگئی۔ نہ جانے وہ لوگ کتنے آگے نکل گئے ہوں گے۔ شرجیل مسکرا کر بولا۔

”گھبرایئے نہیں۔ ہم لوگ بہت تیز دوڑ کر جلدی سے
ان کو پکڑ لیں گے۔“

اتنے میں ہاتو پانی پی کر واپس آگیا۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ اس کا گھوڑا بھاگ گیا ہے وہ خود بھی سر پر پاؤں رکھ کر اسے پکڑنے کے لئے دوڑ گیا۔

سمرنا پھر فکر مندانہ لہجے میں بولی، شرجیل اب کیا ہوگا۔

” شرجیل نے نہایت سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا:

”میرے اوپر بھروسہ نہیں ہے تم کو۔“

سمرنا نے نیچے گرے ہوئے سوکھے پتوں پر نظر گاڑ کر کہا۔ ”میں اپنے بارے میں تو کچھ وثوق سے کہہ بھی سکتی ہوں لیکن دوسرے کیا سوچ رہے ہوں گے یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں“۔ اور عین اسی وقت اپنے آپ ہی اس کی شرمائی شرمائی نظریں اوپر اٹھیں۔ نگاہوں کا ایک لطیف تصادم ہوا نظروں کا ایک حسین ٹکراؤ اور چند ثانیے کے لئے وہ نگاہیں ساکت ہوکر رہ گئیں فضا پر ایک ایسا سکوت چھایا رہا جس میں نغموں کی حسین گنگناہٹ تھی دل کھینچ لینے والی موسیقی کی نرم پھوار تھی فرشتوں کا گیت تھا حوروں کا تقدس تھا۔ آج شاید پہلی بار سمرنا کی پُرکشش آنکھوں میں پیار چھلک اٹھا تھا اور پھر وہ جادو بھرے لمحے بڑی سرعت سے گذر گئے۔ سمرنا اپنی نگاہوں کے پیمانے چھلکانے کے بعد لمبی پلکوں کی چلمن گرا کر گھبرائی گھبرائی سی بیٹھی تھی لیکن شرجیل اس کے نشے میں یوں سرشار تھا جیسے دنیا کو بھول بیٹھا ہو۔ پھر اسی نے مہر سکوت توڑی اور سحر زدہ سے انداز میں آہستہ سے کہا:

” سمری تم میرے چمن حیات میں ایک بہار
جانفزا بن کر آئی ہو۔ تمہیں پا لینے کا تصور کتنا
سرور انگیں ہے میرے لئے۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ اگر تم
نہ ملیں تو یہ گلشن جل کر راکھ ہو جائے گا میں تاخت و
تاراج ہو جاؤں گا، تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ بولو
کیا تم یہ گوارا کر سکو گی۔“

سمری نے اس کے جواب میں ہلکے سے اپنا سر نفی میں ہلا دیا شرجیل کے لئے یہ ہی بہت کافی تھا اس نے اسی ایک اشارے میں اپنی ساری زندگی کی خوشیاں وابستہ کر دیں اور اس کا دل آنے والی مسرتوں کے خوش آئند تصور سے جھوم جھوم اٹھا۔

وہ دونوں محبت کے متوالے اسی طرح اپنی پاکیزہ، سادہ اور

معصوم باتوں میں کچھ ایسے کھوئے کہ وقت کا احساس ہی جاتا رہا جب اپنے دلکش خوابوں سے چونکے تو دیکھا کہ قافلے والے ان سے بہت دور جا چکے ہیں .... ان کے دل کو ان جانے خوف نے دبوچ لیا.... گھر پہنچ کر لوگ انہیں شک و شبہ کی نظروں سے دیکھیں گے سہیلیاں اور رقابت میں ڈوبے چچیرے ممیرے بھائی کیسی چٹکیاں لیں گے....

گھر پہنچ کر وہی ہوا جس کا خدشہ سمری کو کھائے جا رہا تھا۔ ان دونوں نے لاکھ اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کیا لیکن مانتا کون تھا۔

اس انجانے حادثے کے نتیجے میں شرجیل اور سمرتا پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ کچھ دن عجیب کسمپرسی کی حالت میں گذر گئے۔ پھر حالات نے بڑی تیزی سے پلٹا کھایا۔ وہ محفل برخاست ہوئی تو شرجیل کو ہوٹل مینجمنٹ کا کورس کرنے ملک سے باہر جانا پڑا۔ اور ستم یہ تھا کہ وہ اس طویل سفر پر جانے سے پہلے اس سے مل بھی نہ سکا۔

ادھر سمرتا کے ابا جان کے ایک بچھڑے ہوئے پرانے دوست لاگوس (نائیجیریا) سے آئے ہوئے تھے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات اس قدر بڑھے اور تجدید محبت اس طرح ہوئی کہ ان کے صاحبزادے نوید شہزاد سے آناً فاناً سمرتا کی شادی طے کر دی گئی۔ اس غریب کے لئے شرجیل کی جدائی کیا کم سوہان روح تھی کہ اوپر سے یہ ظلم و ستم ٹوٹ پڑا۔ وہ بہت چیخی چلائی۔ مگر ہمارے گھروں کی تہذیبی و معاشرتی منافقت نے آزاد خیالی اور دقیانوسیت کے ان گنت روپ دھار کر سب کچھ ملیامیٹ کر دیا اور پھر وہ چونکہ ایک بار بدنام ہو چکی تھی اس لئے اسے خاندان اور صرف خاندان کی ناک اونچی رکھنے کے لئے سوچنا تھا......

زندگی کے اس موڑ پر کئی بار اس کے لئے سب لوگ اجنبی بن گئے کئی بار اس نے اپنے باپ کو اندھیروں میں ڈوبتے اور کوٹتا لئے جلاد کے روپ میں ابھرتے دیکھا۔ شروع شروع میں اس کو ایسا لگا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا اور وہ غم سے پاگل دیوانی ہو جائے گی۔ لیکن یہ سب کچھ بھی تو نہ ہوا۔ امیر کبیر سسرال کی ہنگامہ خیز زندگی اور پھر شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں اور فرائض۔ ان سب نے مل کر اس کے دل سے شرجیل کی یاد کو محو کر دیا۔ اس کا سادہ اور بھولا دل اس زندگی کی رنگینیوں اور دلچسپیوں میں بہل گیا۔ اور وہ دُور دراز افریقہ میں زندگی کے دن بتانے یا بھوگنے کے لئے زندہ رہی۔ وہ اپنے امی ابا کے پاس کئی بار آئی اور گئی۔ ان کے دلوں میں بھی اس کے لئے وہی شفقت اور محبت عود کر آئی تھی جو اپنی پیاری بیٹی سے پہلے تھی اور اس کا دل بھی ان کی طرف سے آئینے کی طرح شفاف ہو چکا تھا۔ اور اب اتنے عرصے بعد جب اسے یہ سب کچھ بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا وہ سوچنے لگی کہ اصل معنوں میں وہ شرجیل کو کبھی نہ بھلا سکی تھی وہ ہمیشہ سے اس کے دل میں رچا بسا ہوا تھا۔ نس نس میں ہمیشہ سے سمایا ہوا تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ دوسری بات تھی کہ کچھ سالوں تک اس کا خیال خارجی حالات کی وجہ سے گہرے پانیوں میں ڈوبا رہا۔ لیکن آج وہ پھر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ اس کے دل کی دنیا میں شورش طوفان بن کر ابھر آیا تھا۔

زندگی کے نئے لمحے پرانے لمحوں کی جگہ لیتے رہے اور نئے ماہ و سال پرانے ماہ و سال کی اور سمرتا کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی اپنی بیٹی حسنہ بڑی ہو گئی اور وہ حیرت سے دیکھتی رہ گئی کہ کس طرح تاریخ بار بار اپنے کو دہراتی ہے۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے ابھی کل ہی تو وہ خود حسنہ کے برابر تھی۔

حسنہ جب میٹرک میں پہنچی تو اس کی ایک خوبصورت سے لڑکے دانی سے دوستی ہو گئی۔ اکثر یہ لڑکا حسنہ کے گھر آجایا کرتا تھا۔ سمرتا کو وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ اس لئے کہ نہ صرف وہ خوبرو اور بھولا بھالا تھا بلکہ نہایت تہذیب یافتہ اور خوش اخلاق بھی تھا۔ حسنہ اور اس لڑکے دانیال

میں بڑی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ حالانکہ ابھی دونوں بچے ہی تھے پھر
بھی ان کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لئے پسندیدگی کی جھلک کو
سمرنا نے بھانپ لیا تھا۔

ایک روز دانیال کے یہاں ڈنر تھا۔ حسنہ کے ساتھ سمرنا بھی
مدعو کی گئی تھی۔ سمرنا نے بہت پیچھا چھڑایا لیکن حسنہ جان کو لگ
گئی کہ آپ کو جانا ہی پڑے گا۔ سمرنا اب خاموش زندگی کی عادی
ہو گئی تھی بادلِ ناخواستہ حسنہ کی خاطر چلی گئی۔

ڈرائینگ روم کے دروازے پر دانی کے ساتھ ایک لانبے
قد کا خوش شکل آدمی مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے
ہی سمرنا کا دل ایک بار بڑی زور سے اچھلا اور پھر ڈوبتا ہوا محسوس
ہونے لگا لیکن بہت جلد اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا.... تو
اسے آج معلوم ہوا کہ دانی شرجیل کا بیٹا ہے۔ سمرنا اور شرجیل کو ایک
دوسرے کو پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ سمرنا کو دیکھتے ہی شرجیل
چند لمحوں کے لئے مبہوت ہو کر رہ گیا مگر پھر فوراً ہی اسی طرح
خاطر مدارات میں لگ گیا جیسے آج پہلی ملاقات ہو ...... اس کے
بعد بھی ملنے ملانے کا سلسلہ جاری رہا لیکن سمرنا اور شرجیل کو اپنے
بچوں کے سامنے برابر اس قسم کی ایکٹنگ کرنا پڑی جیسے وہ ایک
دوسرے کو پہلے سے جانتے نہیں۔ پہچانتے نہیں۔ اکیلے میں ملنے کا اب
کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ سمرنا نے دیکھا کہ شرجیل کی آنکھوں
میں اب بھی وہی چمک وہی سحر اور وہی کشش ہے اور بے ساختہ
اس کا جی چاہا کہ اس سے طویل باتیں کرے اور بچھڑنے کے وقت
سے اب تک کی ساری رام کہانی سنائے مگر پھر اس نے سوچا کہ
اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔

ادھر شرجیل کے دل میں ہزاروں گلے شکوے مچل رہے تھے
وہ سمرنا سے اس کی بے وفائی کی وجہ پوچھنے کے لئے بے چین تھا۔

ہلکی ہلکی خوشگوار سردیوں کی ایک سہانی صبح سمرنا حسب
معمول اپنی چہل قدمی کے لئے نکلی ہوئی تھی کہ "تختِ سلیمان"
پہاڑ کے دامن والی سڑک پر بالکل اچانک ہی شرجیل سے مڈبھیڑ
ہو گئی۔ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔۔۔ سمرنا کا دل بے تحاشہ
تیزی سے دھڑکنے لگا۔ شرجیل کی آنکھوں میں دکھ کے سائے لرزاں
تھے اور دل میں طوفانوں کا ریلا تلملا رہا تھا۔ اس نے التجا کی کہ کسی
پُرسکون گوشے میں چل کر بیٹھا جائے لیکن سمرنا نے اس کی خواہش
مسترد کر دی۔.... مجبوراً چلتے چلتے اسے باتوں کا آغاز کرنا پڑا۔
اس نے راستے کے کسی خوبصورت موڑ پر نظریں جما کر ہولے
ہولے لرزتی آواز میں کہا۔.... " میں اتنے سالوں سے تمہاری
تمنا میں جلتا رہا ہوں۔ تمہاری محبت کی"..... اچانک سمرنا
نے بات کاٹ دی..... کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ماضی کی راکھ ہم نہ
کریدیں.....!

"مجھے اب بھی تمہاری قربت کی شدید آرزو ہے۔ کیا ہم
شادی....." شرجیل کی بات سمرنا نے پھر کاٹ دی۔ شادی
میں کیا رکھا ہے۔" سمرنا کے لبوں پر یہ کہتے ہوئے ایک ایسی مسکراہٹ
کھیل گئی جس میں طنز بھی تھا اور حسرت بھی۔" شادی تو میں نے بھی
کی تھی، شادی تو تم نے بھی کی تھی۔ اصل چیز تو ہے دلوں کی رفاقت
سو وہ ہم الگ رہ کر بھی ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں۔ اور
پھر اس سے بڑھ کر تمہیں اور کیا چاہیئے کہ چند سالوں بعد میں نے
اپنی زندگی بھر کی کمائی اپنی سب سے عزیز اور پیاری بیٹی حسنہ تمہارے
بیٹے کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اسے ہی سب سے بڑا
تعلق سمجھنا۔ دلوں کی رفاقت روحوں کا ملاپ"۔

★

ماہِ نو

مدیر اعلیٰ : بیگم مسرت برکی
مدیر : فضل قدیر
نائب مدیر : سید علی محمد حسینی

مئی — جون — ۱۹۷۶ء
جلد ۲۹ — شمارہ ۳
چندہ سالانہ : نو روپے
فی پرچہ : ڈیڑھ روپیہ

اس شمارے میں

ادارۂ مطبوعات پاکستان — پوسٹ بکس نمبر ۱۸۵ — راولپنڈی
خورشید پرنٹرز، اسلام آباد

ابتدائیہ

مُسلم ملت نے برصغیر کی تقدیر بنانے میں ہمیشہ عظیم کردار ادا کیا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف ایک زبردست جنگِ آزادی کا آغاز کیا۔ یہ کوشش بدقسمتی سے ناکام ہوئی لیکن اس کے اثرات بہت دوُر رس اور نتیجہ خیز تھے۔ اس نے پوری قوم کو احساسِ کمتری سے نکال دیا اور برصغیر کے باسیوں پر یہ ثابت کر دیا کہ غلامی ان کا ازلی و ابدی مقدر نہیں اگر وہ کوشش کریں تو غلامی کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینک سکتے ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ غیر مسلم مؤرخین مسلمانوں کے اس عظیم کردار پر پردے ڈالنے کی مسلسل کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں چنانچہ اس کے پیشِ نظر ہم مئی کے اکثر شماروں میں اس داستان پارینہ کو بیان کرتے ہیں اس مرتبہ بھی ہم نے اس کا اہتمام کیا ہے۔

خدا کا بڑا شکر ہے کہ عوامی حکومت نے بے مثال فراست اور دانشمندی سے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو ایسی بنیادوں پر استوار کر دیا ہے کہ آج پاکستان کا وقار بیرونی دنیا میں بہت بلند ہو گیا ہے۔ وزیرِ اعظم نے حال ہی میں شمالی کوریا، چین اور افغانستان کے دورے کئے ہیں ان دوروں میں ملک کو بڑی کامیابی میسر آئی ہے۔ دوستی و خیر سگالی کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مبنی بر حق موقف کی پُرزور تائید کی گئی ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ امن و آشتی حق و انصاف کا بول ہو گا اور پاکستان کے جملہ مسائل خیر و خوبی سے سلجھ جائیں گے۔

۷۷ - ۱۹۷۶ء کا وفاقی بجٹ عوامی حکومت کا ایک بڑا کارنامہ ہے اس بجٹ میں جس طرح زرعی شعبے کو پوری امداد دی گئی ہے۔ اس کی مثال گذشتہ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بجٹ کا ہر طبقے نے خیر مقدم کیا ہے یقین ہے۔ آنے والے مالی سال میں ملک میں ترقی کی رفتار اور زیادہ تیز ہو جائے گی۔

خدا کرے یہ شمارہ مرغوب قارئین ہو۔

حضرت لعل شہباز قلندر کی صوفیانہ شاعری

وفا راشدی

حضرت عثمان مروندی عرف لعل شہباز قلندر نہ صرف ایک سالک کامل اور عارف عامل کی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتے تھے بلکہ ایک شاعر اور مفکر کی حیثیت سے بھی ان کا مقام بلند تھا۔ وہ جس پایہ کے صاحب علم وفضل اور صاحب تصوف و معرفت تھے اسی پایہ کے معلم و مقرر اور شاعر بھی تھے۔ عربی و فارسی علوم و ادبیات پر کامل دسترس رکھتے تھے۔

یہ وہ دور تھا جب سندھ میں سومرو خاندان برسر اقتدار تھا۔ برصغیر پاک و ہند شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ، شیخ علی ہجویری عرف داتا گنج بخش لاہوری، شیخ جلال الدین تبریزی، قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر پانی پتی، شیخ فرید گنج شکر (پاک پتن)، اور شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی جیسے مشائخ دین اور اولیائے کبار کے علم و عرفان اور روحانی فیضان کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ کفر و الحاد جبر و استبداد کی ظلمتیں توحید و رسالت حقیقت و معرفت کی روشنی سے چھٹ رہی تھیں۔ حضرت عثمان شہباز افغانستان روس ترکستان و ایران کے بعض شہروں مثلاً بخارا سمرقند شیراز وغیرہ بھی تشریف لے گئے۔ شیخ سعدی، فریدالدین عطار اور مولانا جلال الدین رومی وغیرہ۔ جیسے یکتائے روزگار ارباب علم فکر بقید حیات تھے۔ ممکن ہے ان حضرات سے بھی حضرت شہباز کی ملاقاتیں ہوئی ہوں گی یہ زمانہ عربی فارسی ادبیات کے عروج کا زمانہ تھا۔

سیاسی لحاظ سے حضرت شہباز کا زمانہ برصغیر میں ذہنی خلفشار اور روحانی انتشار کا زمانہ تھا۔ سماج میں اسلامی عقائد اور دینی اقدار متزلزل ہو رہی تھیں۔ ہند و فلسفہ اور رسم و رواج نے قوم پرستی کو غالب کر دیا تھا۔ اضطراب و انقلاب کے پُر آشوب اثرات نے دلوں میں بے کیفی اور مایوسی کی لہر دوڑا دی تھی ایسے تیرہ و تاریک حوصلہ شکن ماحول میں شہباز قلندر نے اپنی عارفانہ اور بصیرت افروز شاعری اور نغمات سے ایک جہاں کو منور کیا۔ آپ ان مشائخ دین میں سے تھے جنہوں نے فقر و درویشی کے ساتھ ساتھ جدوجہد اور تعمیر شخصیت پر زور دیا۔ شہباز کے نزدیک زندگی خالق دو جہاں کی وہ مقدس امانت ہے جس کو حسن و جمال کا دلکش و دلنواز روپ دینا فرائض انسانی میں شامل ہے زندگی کی رعنائیوں، لطافتوں اور دلکشی سے لطف اندوز ہونا ہر انسان کا حق ہے۔ تاہم جمال کائنات میں حسن ازلی کا حقیقی عکس دیکھنے کے لئے ہست و نیست کے مرحلوں سے بھی عارف کو گزرنا ہوتا ہے۔

شہباز نے مقامات سلوک و رہ معرفت کے حصول کی خاطر صعوبتیں جھیلیں، اپنی زندگی کو شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔ کے مصداق تج دیا۔ حقیقت و معرفت کی جستجو کی جلوہ کائنات، مظاہر قدرت،

اور مناظر فطرت کے اسرار ہائے دروں نیروں سے واقف و باخبر ہونے
کی خاطر دور دراز ملکوں کی سیر و سیاحت کی ۔

شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی، جلال الدین تبریزی، بوعلی قلندر جیسے
عالی مرتبت سالکین عارفین اور صالحین کی صحبتوں اور محفلوں سے فیضیاب
ہوئے۔ اس عہد میں ملتان سندھ کا ایک حصہ تھا اور اپنی دینی و علمی خدمات
کی بدولت دینی و روحانی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ حاکم ملتان خان شہید
حضرت شہباز کی روحانیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے آپ کے
لئے ایک خانقاہ بنوائی اور وہاں سکونت کی درخواست کی لیکن آپ
خانقاہ نشین بزرگوں میں نہ تھے۔ آپ فرسودہ خیالات، جمود آمیز و غیر متحرک
زندگی کو موت کے مترادف سمجھتے تھے۔ آپ نے خانقاہ یا آستانہ میں نظر بند
ہو کر پند و وعظ کو شعار بنانا ملت اسلامیہ کے لئے مفید نہ پایا۔ دیس دیس
قریہ قریہ سیر کی جہاں گئے وہاں ہر چھوٹی بڑی چیز کا مطالعہ کیا۔ حد نظر تک
جلوہ ہائے رنگ کی اصلیت و ماہیت کے کھوج لگانے میں زندگی کا بیشتر
حصہ صرف کر دیا۔ اس طرح تجربات و مشاہدات کے آئینے اور علم و آگہی
کی روشنی میں فلسفہ تصوف و نظریۂ توحید کی تشریحات کیں ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت شہباز مولانا رومی کی دینی تعلیمات
اور اسلامی رجحانات سے متاثر تھے۔ شاعری میں آپ نے کسی حد تک رومی
سے استفادہ بھی کیا ہے۔ اور ان کا اتباع بھی عشق مجازی کی خارجی کیفیتوں
سے گذر کر عشق حقیقی کی روحانی لذتوں سے سرشار ہونا کوئی آسان کام نہیں
یہ منزل بڑی محنت اور ایثار کے بعد میسر آتی ہے۔ بقول مولانا رومی:

ہر چہ گویم عشق را شرح و بیاں
چوں بعشق آیم خجل باشم ازاں

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

افکار و مطالب مثنوی روم کی طرح شہباز کے فلسفہ عشق میں جو
سوز و گداز، ذوق و شوق، بے خودی و سرمستی، تڑپ و جستجو ہے، وہ معراج عشق
کی دلیل خودی و خود آگہی خدا شناسی و خدا پرستی کی آئینہ دار ہے:

ز عشق دوست ہر ساعت درون نار می رقصم
گہے بر خاک می غلطم گہے بر خار می رقصم
من بندہ خدایم، ہم شاہ و ہم گدایم
ہم وصل ہم جدایم، مست الست ہستم
من مرغ لامکانم جز لامکاں ندانم
بر تخت قدسیانم مست الست ہستم
آں رہ کہ قدسیاں را دشوار محنت آید
از فکر حق تعالیٰ آساں شداست مارا
بت خانۂ جہاں بسیار سیر کردیم
آئینہ خود پرستی ایماں شداست مارا
اوصاف ذات خود را ایزد بداد مارا
با ذوق ایں معانی عرفاں شداست مارا
دریائے بے نہایت پایاں کجاست اورا
بنگر بغیر کشتی پایاں شداست مارا

شہباز کا عشق کیف و جنون اور جذب سرشاری کی بے پناہ قوت
رکھتا ہے۔ ان کے پاس خدا کا تصور عقل و فہم کے عین مطابق ہے۔ عاشق عزم
و ہمت کا دامن نہیں چھوڑتا اور رشتۂ محبوبی کی استواری میں دیوانہ وار گذر جاتا
ہے۔ مقام عشق کی اس منزل پر عاشق کو محبوب کی رفاقت عرفان ذات میں گم
کر دیتی ہے۔ وہ نہ صرف اسرار عاشقی سے وابستگی محسوس کرتا ہے بلکہ
بشریت کی اعلیٰ منزل پر نظر آتا ہے۔

ہمت بلند باید عشاق مست مئے را
سر خیس ہمت در عاشقاں نگنجد
در دو عالم عاشقاں را جز خدا مقصود نیست
در شہود چشم ایشاں غیر وی مشہود نیست
عاشقاں را در دو عالم جز خدا محبوب نیست
پیش مجنوں ہیچ کس جز نقش لیلیٰ کی بود؟
بغیر عشق نتوان فہم کردن سر آں دلبر

کمالِ عشق باید درمیان خاصگاں دیدم
عاشقاں را ز رہ نورشش چہ آید در نظر
عاشق سرمست را دیوانگی از سر گرفت
در عقل نگنجیم کہ آں نور خدائیم
در فہم نیائیم کہ بے نام و نشانیم

حافظ شیرازی نے شانِ قلندری اور فلسفۂ حیات کا رُخ پیش کیا ہے۔ شہباز قلندر اس کے ایک پیکرِ جمال تھے حافظ کہتے ہیں:۔

بر در قلندر رنداں قلندر باشند
کہ شناسند رموز افسر شاہنشاہی

دیوانِ حافظ شعر و نغمہ اور معرفت و عرفان کا حیات آفریں مجموعہ ہے اس قسم کے اشعار سے انکا کلام مملو ہے۔

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمی بما کنند؟

حافظ کی شمع غزل نے شہباز قلندر کے فانوس تخیل سے روشنی پائی تھی۔ زباں و بیاں طرز و اسلوب کے اعتبار سے حافظ ان کے ہم کلام معلوم ہوتے ہیں۔ عشق، شراب، ساقی، جام، مینا، میخانہ، ہوش، مدہوشی، مستی، سرمستی، جمال و جلال وغیرہ الفاظ حافظ کی طرح کثرت سے ملتے ہیں۔ شہباز مے کدۂ حق میں بادۂ عشق کی مستی و بے خودی کو معراجِ عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔ سرمستی و مدہوشی اپنے محبوب حقیقی کے وصل اور قربت کی لذتوں سے ہمکنار کرتی ہے۔ عالم ہستی میں راہِ عشق کی حقیقتوں کا ادراک ہوتا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ایا عثمان مروندی چرا مستی درایں عالم
بجز مستی و مدہوشی دگر چیزے نہ دانم
زمنم بعرشش اکبر خوردم شراب اطہر
و اصل شدہ وصالم مست الست ہستم
آیت زمی بخندم زاہد کند گریزم
نوشم و نا ستیزم مست الست ہستم
جام زعشق نوشم و دنیا و دیں فروشم
جز ایں دگر نہ گوشم مست الست ہستم
دریا شراب آدم در دل فرو سپادم
بے مے بقا ندارم مست الست ہستم
در کوئے میفروشاں عشاق جام نوشاں
افتادہ ستیز جوشاں مست الست ہستم
زاہد زمئے گریزد عابد زمئے ستیزم
سرمست مئے پرستد مست الست ہستم
چوں بخوردم آں شراب لم یزل از دست دوست
بعد خوردن جہاں گہی مست و گہی ہشیار شد
بادست خود پیالہ دانی چہ ذوق دارد؟
یا ذوق آں پیالہ باغ جہاں نگنجند

صوفیا سماع کو معراج الروح کہتے ہیں۔ سلسلہ چشتیہ قادریہ کے بزرگانِ دین جو کیف آمیز سرور کے بڑے شیدائی تھے۔ ان کے زمانے میں عام موسیقی کی اجتماعی سرپرستی سے اس فن کی ترقی و ترویج ہوئی۔ محفل سماع میں لوک گیتوں نے جنم لیا۔ سندھ اور پنجاب کی کافیاں سابق مشرقی پاکستان کے عارفانہ مرشدی گیت صوفیانہ خیالات و موضوعات کے آئینہ دار ہیں۔ عوام میں روح کی بیداری اور قلوب کی صفائی میں رقص و نغمہ کا خاص حصہ رہا ہے۔

حضرت شہباز سماع کی محفلوں میں اپنے ہم مشرب فقیروں، درویشوں کے ساتھ عربی و فارسی کلام رقت آمیز لہجے اور سحر انگیز آواز میں پڑھتے تھے اکثر اپنا کلام بھی عالم محویت و بے خودی میں سناتے تھے۔

بیا اے مطرب ساقی سماع شوق در دل دہ
کہ من در شادی وصلش قلندر وار می رقصم
مرا مخلوق می گوید گدا چنداں چہ می رقصم
بدل دایم اسرارے ازاں اسرار می رقصم
خلائق گر کند بر من ملامت زیں سبب ہر دم

گر نازم بریں ذوقے کہ پیشِ یار می رقصم
اگر صوفی شدم یارم بیا تا خرقہ پوشم
اگر زنار بربستند دراں زنار می رقصم
منم عثمان مروندی کہ یار خواجہ منصورم
ملامت می کند خلقے کہ من بردار می رقصم
دیدار حق تعالیٰ درمان درد ما شد
دیدہ بغیر بینا حرمان شدست ما را
رقصیم بر قصیم کہ خوباں جہانیم
نازیم بنازیم کہ در عین عیانیم
نہ آبیم نہ بادیم نہ خاکیم نہ آتش
مائیم بہمہ صورت و ماکون و مکانیم

شہباز نے خدا اور انسان کے رشتہ محبوبی کو اسلامی نظریات وجہات کے آئینے میں دیکھا ہے ان کا فکری و ذہنی دائرہ قرآن حکیم اور احادیث نبوی کی روشنی سے تاباں و درخشاں نظر آتا ہے۔ وحدت الوجود وحدت وکثرت، ہمہ اوست، از ہمہ اوست جیسی صوفیانہ اصطلاحوں کو منفرد انداز دلکش سادہ اسلوب میں ڈھال دیا ہے۔ وہ وحدت وکثرت کی نیرنگیوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور حیات وکائنات کے اسرار والوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

ہیچو در لباس صوف باش
با صفت ہائے خدا موصوف باش
دوئی از سر بدر کردم یکے دیدم دو عالم را
یکے بینم یکے جویم یکے دانم یکے خوانم
مائیم عین وحدت آزاد ہم ز کثرت
باشد نہ ہیچ ملت مست الست ہستم
درمیان عارفاں سرِ پنہاں یافتم
ہر کراں جستہ بودم عین خود را یافتم
کور مادر زاد ہرگز می نہ بیند آفتاب
صد ہزاراں شکر واجب چشم بینا یافتم
چوں وجود کس نباشد بالحقیقت جز خدا
آں وجود عین سابق عین خود را یافتم
ہمہ وحدت ہمہ کثرت ز کثرت ہم ہمہ وحدت
ولیکن اختلافش درمیان حکم آں دیدم

یہ جہاں رنگ وبو چند روزہ ہے اس کائنات بے ثبات میں کسی چیز کو بقائے دوام نہیں۔ انسان بھی دار فانی سے دار بقا کی راہ لیتا ہے۔ صرف ایک اللہ کی ذات ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ شہباز نے اس نکتے کو شعری لہجے میں یوں بیان کیا ہے:۔

فانیست ہمہ چیز کہ ایں دار بقا نیست
بردار دل خویش کہ ایں جائے وفا نیست

حضرت قلندر شہباز تاریخ اسلام اور اسلامی دنیا پر عمیق نظر رکھتے تھے۔ انبیائے کرام اور اکابرین کی زندگی وشخصیت اور ان کے افکار ونظریات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ جہاں وہ خاص کر روایات وکرامات سے مستفیض ہوئے وہاں اپنے عصر کے حالات وکوائف سے پوری طرح آگاہ و باخبر تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں تلمیحات واصطلاحات کی کئی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ عارفانہ شاعری میں ایسے جلال وجمال حسن وکمال اور ہجر و وصال کے حیات آفریں نمونے شاذو نادر ہی ملتے ہیں۔

من آں درم کہ در بحر جلال اللہ بودستم
بکوہ طور با موسیٰ کلیم اللہ بودستم
بہ آبے زندہ ہم بودم بہ خضرے زندہ بودستم
بہ اسکندر در آں لشکر بہ لشکر گاہ بودستم
بہ اسمٰعیل پیغمبر بہ ابراہیم بن آذر
دراں سر وقت قربانی بہ قرباں گاہ بودستم
گہے بر تخت گریا نم گہے بردار خندانم
عجائب جا کہ من دیدم کہ دیدست و ندیدستم

حقیقت، شریعت طریقت کے رموز ونکات کو جس دل کش انداز

میں پیش کیا ہے اس سے آپ کی فکار انہ عظمت اور سالکانہ بصیرت آشکارا ہے۔ شعری زبان میں اظہار و ابلاغ کی یہ ادا دینی تبلیغ و اشاعت کے لئے بے حد موثر ثابت ہوئی ہے۔

اسلام من یہ دریائے کہ موجش آدمی خوار است
نہ کشتی اندر آں دریا نہ ملاح عجب کار است
شریعت کشتی دارد طریقت بادبان او
حقیقت لنگرے دارد کہ راہ عقل دشوار است
ندا از حق چنیں آمد مگر از جان می ترسید؟
ہزار جان مشتاقاں دریں دریا نگوں سار است
ایا عثمان مروندی سخن با پردہ داراں گو
تنیا بی درجہاں بارے جہاں پراز اغیار است

ذکر و فکر صبر و شکر توکل و قناعت اخلاص و ایثار خلوص و محبت معرفت و رواداری نیکی و سچائی صدق و صفا امانت و سخاوت شرافت و انسانیت کی اعلیٰ صفات ہیں۔ حضرت شہباز ان خوبیوں کے عملی پیکر تھے اس لئے ان کے فکر و عمل میں گداز تھا، سچائی تھی اور ایک عالم کو اپنی ذات گرامی کی طرف متوجہ و مائل کرنے کی بھرپور صلاحیتیں تھیں۔ آپ نے زندگی کے ان پہلوؤں پر عمل کرنے کی پر زور تلقین کی ہے۔ آپ کے اکثر اشعار اس قسم کی تعلیمات کی ترجمانی پوری توانائی و رعنائی سے کرتے ہیں۔

حضرت شہباز کی شاعری تمام تر حمد و نعت اور منقبت جیسی اہم اصناف پر حاوی ہے۔ غزلوں کے جو اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ خالق کائنات اور وجود باثبات کی حمد و ثنا کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں حضور سرور کائنات رحمت عالم محسن انسانیت سے والہانہ عشق اور بے پناہ عقیدت کے مظہر ہیں آپ کی نعت کا یہ شعر بہت مشہور ہے

کعبۂ عشاق باشد روئے احمد در جہاں
صد ہزاراں روئے خوباں منزل مظہر گرفت

حضرت لعل شہباز قلندر نے بڑے خوبصورت قصیدے کہے ہیں ان میں رسول مقبولؐ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں کہے ہوئے قصیدے بہت پُر زور اور پر اثر ہیں۔

غزل

نسیم سحر

کس کیفیت میں ہجر کے لمحے گزارنا!
تیرے ہی خدّ و خال کے پیکر ابھارنا

جب بھی اُداس ہونا، تجھی کو پکارنا
آیا نہ تیرے درد کو اب تک سہارنا

اے دوست برقرار ہی رکھ تو یہ فاصلے
مرغوب ہے یہ زہر بدن میں اُتارنا

پتھر ہوں میں تو مجھ کو نہ رکھنا سنبھال کر
شیشہ ہوں میں تو تم مجھے پتھر نہ مارنا

پہلے ہی غم نصیب ہے دل، یہ بھی سوچنا
لہجے کی تیغ تیغ چبھن مت اتارنا

مانندِ زلفِ یار پریشان میں بھی ہوں
اے دستِ انبساط مجھے بھی سنوارنا

○

اسلام آباد کا جشنِ بہار

سلمان رضوی

خوش رنگ گلابوں کا چمن دیکھ رہے ہیں
ہم اپنے گلستان کی پھبن دیکھ رہے ہیں

ہر پھول کے ہونٹوں پہ تبسّم کی کرن ہے
فن کار کا منہ بولتا فن دیکھ رہے ہیں

لگتا ہے کہ ہر غنچہ دہن بول اُٹھے گا
تصویر کا بے ساختہ پن دیکھ رہے ہیں

تھالوں میں سجے ملکۂ فطرت کے جواہر
اے مادرِ گیتی تیرا دھن دیکھ رہے ہیں

سبزہ ہے کہ بلقیس کے دربار کی مخمل
پانی ہے کہ سورج کی کرن دیکھ رہے ہیں

یہ رات کی رانی کے محلّات کی خوشبو
یا رامش آہوئے ختن دیکھ رہے ہیں

حوریں ہیں اگر پھول تو غلمان ہیں غنچے
پاکیزگیٔ ارضِ وطن دیکھ رہے ہیں

محنت کا یہ اعجاز کہ پتھّر کی سلوں پر
ہم سنبل و ریحان وسمن دیکھ رہے ہیں

آرائشِ گل اپنی جگہ خوب مگر ہم
سلمان تیرا رنگِ سخن دیکھ رہے ہیں

آخری مغل تاجدار کے ایامِ کرب و بلا

فضلِ قدیر

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو تین ہندوستانی رجمنٹوں نے جو میرٹھ میں مقیم تھیں اپنے انگریز افسروں کو گولیوں سے اُڑا دیا۔ میرٹھ چھاؤنی کو پوری طرح تباہ کر دینے کے بعد انہوں نے دہلی کا رُخ کیا اور لٹے ہوئے ضعیف و نحیف آخری مغل تاجدار بہادر شاہ کو شہنشاہ ہند کا مرتبہ دے کر بدیشی سامراج سے نجات کیلئے ایک عظیم جنگِ آزادی کا آغاز کیا۔ اس محاربۂ عظیم کو انگریزوں نے سپاہیوں کے غدر کے نام سے یاد کیا اور ہمیشہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ ایک ہڑبونگ تھی جس کے بنیادی مقاصد لوٹ مار اور افراتفری کے علاوہ اور کچھ نہ تھے نیز یہ کہ اس غدر کو محسن کش بادشاہ دہلی نے ہوا دی تھی۔ ......اس نے سلطنت برطانیہ کا وظیفہ خوار اور رعایا ہونے کے باوجود اپنے محسنوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی سازش کی۔

بادشاہ دہلی یقیناً ایک عظیم مجاہد تھے عمر کی آخری حدود پر پہنچنے کے باوجود انہوں نے برصغیر کی پہلی جنگِ آزادی میں جو کردار ادا کیا وہ ہماری تاریخ کی متاعِ عزیز ہے۔ تاہم جس محسن کشی کا انہیں طعنہ انگریز مؤرخ دیتے آئے ہیں اس کی قلعی ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ گزرا خود ان کی قوم کے ہاتھوں کھل چکی تھی پھر بھی جس ظلم اور سفاکی سے انہوں نے برصغیر کی مسلم حکومت کو تباہ کیا تھا اس پر پردے ڈالنے کا کام وہ آخر تک انجام دیتے رہے حتیٰ کہ وہ زمانہ آیا جب ہندوستان کے مسلمانوں کے بے تاج بادشاہ مسلم عوام کے ہر دلعزیز رہنما قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ اپنی ملت کے حقوق کے حصول کے لئے تاجِ برطانیہ کے نمائندوں جنرل ویول اور آخری وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اپنے تاریخی مذاکرات میں مصروف ہوئے۔ ان مذاکرات کے دوران تاجِ برطانیہ کے کینہ پرور نمائندوں نے کمال عیاری اور سفاکی سے اس عظیم قائد سے آخری تاجدار مغلیہ بہادر شاہ سے کم بدسلوکی روا نہیں رکھی انہوں نے اس نابغۂ روزگار سیاست داں آزادی کے اس نڈر اور بیباک سپاہی کی شخصیت کے متعلق لعن وطعن اور افترا پردازی کی ایسی مہم چلائی کہ اگر برصغیر کے مسلمان ان تمام پُرفریب حکمتِ عملیوں سے ناواقف ہوتے جو انگریز نے اپنے ڈیڑھ سو سالہ دورِ حکومت میں انہیں ذلیل وخوار کرنے کے لئے استعمال کی تھیں تو وہ یقیناً بدظن ہو جاتے۔ اُسے مغرور، متکبر اور آزادی کی راہ کا روڑا ظاہر کیا گیا۔ اسے ضدی منتقم اور متعصب بنا کر پیش کیا گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے اس دور میں قوم اپنی تاریخ سے آگہی رکھتی تھی جو کچھ اس پر بیت چکا تھا اس کا اندازہ اُسے تھا......... مگر آج صورت کچھ مختلف ہے حصولِ پاکستان کے بعد جو نعمتیں ہمیں ملی جو آرام و سکون میسر آیا اس میں جو نسل پروان چڑھی اس کے افراد ان شدائد کا تصور نہیں کر پاتے جن سے گذشتہ پوری ایک صدی جنوبی ایشیا کے ستم رسیدہ مسلمان دوچار رہے۔ اپنی تاریخ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس داستان درد کو اور کبھی نہیں تو کم از کم ۱۰ مئی کو ضرور دہرائیں جو بدیشی سامراج نے ہم پر توڑی تھی۔ اس لرزہ خیز داستان کو سن کر ہمارے نوجوانوں، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو یہ عزم اپنے قلوب میں کرنا چاہیئے کہ اس پاکستان کو جو عظیم محنتوں اور قربانیوں کا ثمر ہے، اپنی جانوں سے زیادہ عزیز رکھا جائے گا۔ ہم اس کی متبرک خاک پر کبھی حملہ آوروں کے قدم نہیں پڑنے دیں گے۔ ہم ہر اس حربے کو ناکام بنا دیں گے جو وطنِ عزیز کی سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اندرونی اور بیرونی سازشوں کے تحت

بروئے کار لایا جاتے گا۔

ہمارے دشمن پوری طرح یہ سمجھ چکے ہیں کہ پاکستان کو فوجی قوت سے زیر نہیں کیا جاسکتا اس لئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب فلسفے اور نظریات کے رخ پر اپنے مورچے باندھ رہے ہیں اور ہماری صفوں میں نظریاتی شگاف ڈالنا چاہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک صدی قبل میکالے نے اپنے تعلیمی منصوبے کے تحت نظریاتی بنیاد کو تہ و بالا کرنے کی کوشش کی تھی جس کی تصویر علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کھینچی تھی۔

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

بہر حال مقام شکر ہے کہ دشمنانِ وطن کے مقابلے کے لئے عوام کا مقبول رہنما ایک چٹان کی طرح صف آرا ہے اور اب ہم سب کا فرض ہے کہ اس کے ہاتھ مضبوط کریں اور نظریاتی انتشار کا شکار نہ ہوں۔

بہادر شاہ پر جس محسن کشی کا الزام انگریز مؤرخین نے لگایا اس کی قلعی اس دور کے ایک انگریز صحافی ٹائمز کے نمائندے ولیم ہاورڈ رسل کی اس ڈائری سے کھلتی ہے جو اس نے اس عظیم جنگِ آزادی کے ایک سال بعد ہندوستان میں رہ کر لکھی اور جو اس کے مراسلوں کی صورت میں ٹائمز میں شائع ہوتی رہی۔ رسل جب ہندوستان پہنچا تو فوجی نوعیت سے جنگِ آزادی ختم ہو چکی تھی تاہم اس نے ظالمانہ مقدمے کے لئے منتظر بہادر شاہ کو لال قلعہ میں اسیر دیکھا۔ اس نے لکھنؤ پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے ہولناک مناظر دیکھے۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف تیغِ ستم کو پوری طرح چلتے دیکھا۔ یہ کیسا خوفناک وقت تھا لاکھوں بیگناہ محض اس لئے نشانۂ ستم تھے کہ ان کا تعلق اس ملت سے تھا عظیم مغل جس کے افراد تھے۔

جنگِ آزادی کے دوران کانپور میں نانا صاحب ڈھونڈو پنت نے جب انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ تو کچھ انگریز عورتیں اور بچے اس وقت قتل ہو گئے جب جنرل ہیولاک نے نانا پر یلغار کردی ان عورتوں اور بچوں کی لاشوں کو ایک کنوئیں میں پھینک دیا گیا یہ واقعہ یقیناً افسوسناک تھا مگر یہ طے ہے کہ یہ سوچے سمجھے کسی منصوبے کے تحت رونما نہیں ہوا تھا یہ گڑبڑ اور بلوہ کی فضا میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ مگر اس وقت کے مجنون انگریز جرنلوں نے جس طرح اس کا انتقام لیا، اس کی داستان سر جارج کیمبل نے اپنی کتاب "میموائرز آف مائی انڈین کیریئر" (MEMOIRS OF MY INDIAN CAREER) مطبوعہ لندن ۱۸۹۳ء میں ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"بعد کو جب اس قتل عام کے اسباب کی احتیاط سے تفتیش کی گئی تو ہم کو یہ بات تحقیق نہیں ہوتی کہ اس معاملے میں کوئی سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ نیل (بریگیڈیر جنرل نیل) نے وہ باتیں کیں جو اس قتل عام سے کہیں زیادہ تھیں۔ ہیولاک جب تک کانپور میں رہے، انہوں نے اُسے (نیل کو) دبائے رکھا۔ لیکن جوں ہی ان کی پیٹھ ادھر سے مڑی تو نیل نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ خون بہانے کے ایک مذہبی تقاضے کو پورا کر رہا ہو۔ جس انداز میں اس نے ہندوؤں اور مسلمان سول افسروں کو احکامات دیئے یہاں تک کے انہوں نے چیختے چلاتے اپنی زبانوں سے خون چاٹا...... اگر حقیقت میں یہ لوگ اس قتل عام کے مجرم ہوتے۔ تب بھی یہ انتہائی افسوسناک کارروائی تھی لیکن نیل یہ بات خود نہیں کہتا کہ وہ اس قتل عام کے مجرم پائے گئے تھے۔"

اصل معاملہ یہ تھا کہ بریگیڈیر جنرل نیل کے ہتھے جو معقول آدمی خاص کر مسلمان چڑھتا تھا اسے پکڑ کر اس مقام پہلے جایا جاتا تھا،

جہاں یورپین عورتیں اور بچے مقیم تھے۔ وہاں خون کے جو دھبے باقی رہ گئے تھے انہیں صاف نہیں کیا گیا تھا۔ مظلوم مشکوک لوگوں کو پکڑ کر وہاں لے جایا جاتا اور ان سے حکماً یہ خون ایسے طریقوں سے صاف کروایا جاتا جو انہیں انتہائی ناگوار ہوں۔ نیل کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"ہر شر پسند کو متعلقہ مکان پر لے جایا جائے گا،
اور اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ خون کے دھبوں
کا ایک چھوٹا حصہ صاف کرے اور یہ کام اس کے
جذبات کے اتنے برعکس کروایا جائے گا جتنا ممکن
ہو۔ پرووسٹ مارشل ہر اس شخص پر جو اس کام
کو کرنے پر معترض ہو گا کوڑا استعمال کرے گا۔ اپنے
حصے کے دھبے پوری طرح صاف کر دینے کے بعد
مجرم کو فوراً پھانسی دے دی جائے گی اور اس مقصد
کے لئے ایک پھانسی قریب ہی کھڑی کر دی گئی
ہے"

آگے چل کر نیل لکھتا ہے:

ہمارے سول کورٹ کے ایک مسلمان افسر نے جو ایک بڑا بدمعاش ہے .... اس پر کچھ اعتراض کیا۔ اس کے کوڑے لگوائے گئے اور اس سے خون کے دھبوں کا کچھ حصہ زبان سے چٹوایا گیا۔

(پیش نامہ مائی انڈین میوٹنی ڈائری از مائیکل ایڈورڈ
ص ۱۵ مطبوعہ کیسل اینڈ کمپنی لندن)

رسل نے لٹی اجڑی دلی کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اس نے بوڑھے تاجدارِ ہند بہادر شاہ کو لال قلعہ میں بیماری اور پریشان حالی میں وہ ظالمانہ فیصلہ سننے کا منتظر پایا۔ جس کا ڈراپ سین رنگون میں ایک بوسیدہ قبر ہے۔ دہلی کا آنکھوں دیکھا حال ذرا رسل کی زبانی سنیئے۔

"میں مغلِ اعظم کے اس عظیم شہر (دہلی) کے متعلق اپنے اولین تاثرات

منتشکل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہی وہ شہر تھا جہاں سے وہ لوگ اٹھے تھے جنہوں نے کچھ ڈگمگاتے کانپتے غریب تاجروں (انگریزوں) کو خدمت اور اطاعت کے عوض ہندوستان میں زمین حاصل کرنے وغیرہ کے حقوق عطا کئے تھے یہی وہ شہر تھا جو ایک سال قبل ایک زبردست بغاوت کا مرکز بنا ہوا تھا۔

"میری نگاہیں کنارِ جمنا ان بلند و بالا قدیم دیواروں کی طرف مرکوز تھیں یہاں میں یہ بات ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس ملک میں جہاں سے ہندوستان پر حکومت کی جا رہی ہے۔ ۵ ہزار نفوس بھی ایسے نہ ہوں گے جنہوں نے ابھی دو سال قبل تک یہ سنا ہو۔ کہ دہلی کا بادشاہ ایک زندہ انسان ہے یا یہ کہ وہ اپنی انتہائی سقیم حالت اور اپنی قوم کی انتہائی ذلت کے باوجود شہنشاہ اکبر کا خلف ہے اور اس کی بچی کچھی عظمت کے آثار اس قدر تھے کہ ہندوستان کا گورنر جنرل بھی اس سے برابری سے نہیں مل سکتا تھا اور یہ کہ دہلی کے برطانوی افسر اس سے معاملت میں وہ تمام ظاہری عزت و احترام ملحوظ رکھتے تھے جسے ایک شہنشاہ کو اپنے خادموں سے طلب کرنے کا حق حاصل ہے۔

"شہنشاہ دہلی کے متعلق انگلستان میں انگریزوں کی بڑی تعداد کو پہلی مرتبہ جس حقیقت کا علم ہوا وہ یہ تھی کہ وہ (شاہ دہلی) ایک ایسی بغاوت کا برائے نام سربراہ تھا جس نے ان کی ہندی مملکت کی بنیادوں کو ہلا دیا تھا۔ اس پر آج اپنے محسنوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ وہ یقیناً ایک کمزور اور سنگدل ضعیف آدمی تھا، لیکن بہر حال ایک ایسے شخص پر جس نے اپنے بزرگوں کے مقبوضات اور علاقوں کو بتدریج بزورِ قوت یا دوسرے طریقوں سے غصب ہوتے دیکھا اور یہ نوبت آگئی ہو کہ اب اس کے پاس خالی خولی القاب ہی رہ گئے ہوں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جس کا خزانہ خالی ہو اور محل ایسے قلاش شہزادوں اور شہزادیوں سے بھرا ہو جن کا اس سے خونی اور نسلی تعلق ہو کیا اُسے کمپنی کا اپنی اس حالت پر پہنچ

جانے کے لئے ممنون ہونا چاہیئے؟ کیا اسے ہمیشہ کے لئے انہیں آشیر باد دینا چاہیئے کیونکہ برطانوی حکومت نے ایک حواصل کی طرح غریب شاہ عالم کو مرہٹوں کے ہاتھوں سے چھین لیا تھا اور پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے کھاتے رہے تھے۔

"یہ صحیح ہے کہ ہمیں اپنے مقبوضات اور نو آبادیوں کیلئے حکومت کے وہی اختیارات حاصل ہیں جو ان مسلمانوں کو تھے جنہوں نے دہلی کے شاہی خاندان کی بناء رکھی تھی۔ لیکن ہم ہندوستان میں اپنی فوجوں کے ساتھ ملک کو تسخیر کرنے کے لئے اس طرح داخل نہیں ہوئے تھے جیسے وہ آئے تھے۔ ہم تو ایسے عاجز کاروباریوں کے انداز میں یہاں رینگ آئے تھے جن کا وجود سلطنت دہلی کے صوبیداروں امراء و اعیان کی خوشنودی اور الطاف و مراحم پر تھا۔ ہم شاہ عالم کے ساتھ جس لطف و عنایت سے پیش آئے تھے وہ حقیقت میں اس کے اسلاف کی عنایات و کرم کا ایک حقیر اعتراف ہی تو تھا۔

آگے چل کر ولیم ہاورڈ رسل لکھتا ہے:

"میرے خیال میں تو اس بادشاہ کا وجود بغاوت پھوٹنے سے بہت پہلے ایک اذیت مسلسل تھا۔ اس کا محل حقیقت میں ایک قیدخانہ تھا۔ چند نام نہاد اختیاراتِ خصوصی جو اُس کے لئے چھوڑ دیئے گئے تھے گویا عظمت و اقتدار رفتہ کے ایک سوانگ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے اسے معلوم تھا کہ یہ اختیارات بھی اس کے جانشینوں سے چھین لئے جائیں گے اور انہیں ان کے محل میں رہنے کا حق بھی نہیں دیا جائے گا۔ اور ان محلات کی چاردیواری سے ہٹاکر اسے کسی دوسری جگہ جلا وطن کر دیا جائے گا۔"

"ہم نے اس کے شاہی خاندان اور رشتہ داروں پر اپنی ملازمت کے دروازے بند کر دیئے ہم نے انہیں اپنے محلوں کی چہار دیواریوں میں مفلسی، اور قرضوں کے بوجھ تلے ایڑیاں رگڑنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اور پھر ہم نے انہیں ان کی سستی، عیاشی اور ذلت کے طعنے دیئے۔ ہم نے فوجی ملازمت کے دروازے اُن پر بند رکھے۔ الغرض ہم نے ان پر معاش کا ہر راستہ بند کر دیا۔

"ہم نے عزت و وقار کی زندگی کی ہر آرزو ان سے چھین لی اور پھر ہمارے اخبارات میں اور فوجی میسوں میں ان کا رہن سہن اور عیش پسند شہزادوں پر لعن طعن ہوتا رہا۔ . . .

رسل پھر کمشنر دہلی مسٹر سانڈرز کے ساتھ لال قلعہ میں مظلوم قیدی بادشاہ کو دیکھنے گیا . . . . اس نظارے کی جزئیات بڑی درد انگیز ہیں۔

لال قلعہ کی زبوں حالت کا نقشہ کھینچنے کے بعد وہ لکھتا ہے:-

"ایک اندھیری تاریک غلام گردش کو جو دیوان عام سے نکلتی ہے عبور کرنے کے بعد ہم ایک اندھیرے کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہاں ایک کمزور اور ناتواں بوڑھا نہایت معمولی ڈھیلا ڈھالا ململ کا کرتہ پہنے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے نازک مہلے پتلے پاؤں ننگے تھے۔ اس کے سر پر جالی دار ایک معمولی سی ٹوپی منڈھی ہوئی تھی۔ یقیناً یہ وقت دودمان تیمور کے اس نام لیوا سے جو لٹی ہوئی سلطنت کا ایک نشان تھا ملنے کے لئے کسی طرح بھی موزوں نہیں تھا۔ سابق بادشاہ بیمار تھا۔ ان کا جسم پیتل کی ایک سلابچی پر جھکا ہوا تھا اور اسے بری طرح اُبکائیاں آرہی تھیں، اس لئے ہم نے اپنے منہ دروازے سے موڑ لئے اور مختصر سے صحن کی طرف دیکھنے لگے جو کسی طرح بھی تیس فٹ مربع سے زائد نہ تھا۔ اس صحن کے ایک کونے میں ایک چارپائی پر ایک دبلا پتلا منحنی سا نوجوان لمبا پڑا ہوا تھا۔ ہماری آوازیں سن کر وہ اٹھ بیٹھا اس نے ادب سے سب کو سلام کیا۔ وہ عمدہ ململ کا لباس پہنے ہوئے تھا اس کی کمر پر پیلی اور سبز سلک کا پٹکا تھا۔ اس کا سر ننگا تھا ـــــ اس کی چارپائی کے سامنے سفید انگرکھوں اور پگڑیوں میں ملبوس

چار خادم ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ وہ اس نوجوان کی ہر جنبش پر پُر تشویش آنکھیں لگائے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا: "یہ بیمار ہیں" کمشنر نے ہدایت کی کہ وہ لیٹ جائے اور ایک اور سلام کے بعد جواں بخت۔ جو دودمان دہلی کا نہال سر سبز تھا۔ ایک طویل آہ بھر کر دوبارہ چارپائی پر گر پڑا اس نے اپنا منہ ہماری طرف سے پھیر لیا اور خود کو چادر سے ڈھانپ لیا۔ گویا وہ ہماری موجودگی سے پناہ اور سکون چاہتا تھا۔

"آخر بادشاہ کی تسلی ختم ہوئی اور ہم اس غلام گردش میں پہنچے .... یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چاہتا تھا کہ کاش ہم کسی اور وقت اس کے پاس گئے ہوتے .... وہ ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ اس نے کمشنر کی بات کا ہاتھ ہلا کر مختصر جواب دیا۔ یہ ایک پریشان نظر، اپنے خیالوں میں کھویا ہوا ناتواں بوڑھا تھا جس کا نچلا ہونٹ لٹکا ہوا تھا جس کے منہ میں ایک دانت نہیں تھا .... کیا حقیقت میں یہی وہ انسان تھا جس نے ایک عظیم مملکت کو دوبارہ زندہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور جس نے دنیا کی تاریخ میں ایک زبردست غدر کو ہوا دی تھی۔ اور جس نے اپنے پرانے محل کی دیواروں کے عقب میں بیٹھ کر مقابلہ و مجادلہ کیا تھا اور اس قوم کا تمسخر اڑایا تھا جس کی ہتھیلیوں میں ہندوستان کا ہر تخت و تاج سما سکتا ہے۔ آخر اس نے مہر سکوت توڑی اور یہ ہمیں اس بات سے آگاہ کرنے کے لئے تھی کہ وہ بیمار ہے۔ اور اسے اتنی قے ہوئی ہے کہ بارہ تسلے بھر چکے ہیں۔ ان کا یہ بیان جو حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا تھا۔ میرے خیال میں بالکل درست نہیں تھا۔ تسلوں کی تعداد میں دیسی لوگوں کا مبالغہ تھا جسے مزید تقویت ہز میجسٹی کے شاعرانہ تخیل نے بھی پہنچائی تھی۔ وہ ایک شاعر ہیں۔ عاشقانہ اور گرم مضامین منتخب کرتے ہیں اور اس انداز کی خیال بندی ہی سے ان کی شاعری عبارت ہے۔ ان کے کلام کے چار ضخیم مجموعے ہیں۔ ذوق و فکر شعری آج بھی ان سے جدا نہیں ہوا۔ کیونکہ ابھی ایک آدھ ہی دن ہوا انہوں نے اپنے اس قید خانے میں ایک جلی ہوئی لکڑی سے کچھ بڑے پاکیزہ اشعار دیوار پر لکھے تھے۔ آج کون ہے جو انہیں رحم کی نظر سے نہیں دیکھے گا؟

وہ جس تنگ و تاریک غلام گردش میں اقامت پذیر تھے۔ اس میں مجھے کوئی چیز نظر نہیں آئی ماسوا ایک مختصر چارپائی کے جسے غریب ترین ہندوستانی استعمال کرتے ہیں ..... یہ ضعیف و ناتواں بوڑھا اپنے گھٹنوں پر جھکا ہوا فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کی پشت ایک چٹائی سے لگی ہوئی تھی جسے راہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آویزاں کر دیا گیا تھا اور اس سے ایک ۱۲ فٹ چوڑا اور چوبیس فٹ لمبا راستہ سا بن گیا تھا۔ اس قنات کے پیچھے کچھ کھسر پھسر ہو رہی تھی اور کبھی کبھی کوئی آنکھ اجنبیوں کو حیرت سے تکتی نظر آجاتی تھی اور اس سے ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ بادشاہ بالکل تن تنہا نہیں ہے۔ میں نے اپنے تخیل پر پورا دباؤ ڈال کر بے سود اس میں عظیم تیمور کو ڈھونڈنے کی کوشش کی اگر اس کے چہار طرف زر و جواہر، پر تکلف ساز و سامان زربفت کے ملبوس ہاتھی، گھوڑے، موسیقار، چوبدار اور داروغہ ڈیوڑھی ہوتے تو شاید میں کامیاب ہو جاتا لیکن وہاں تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے صرف ایک تیرہ و تار گلی تھی ..... اس کا ماتھا بہت چوڑا ہے جو بہت نمایاں انداز میں بھوؤں پر ابھر کر ایک دم پچکی سی کھوپڑی میں گم ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں صرف کبر سنی کی ناتوانی کے آثار ہیں۔ کہر کی طرح دھندلی روشنی جو ان کی آنکھوں سے نکلتی ہے معلوم ہوتا ہے بڑے اندھیروں کی طرف ہمیں لے جا رہی ہے۔ سامیوں کی بلند نکیلی خمیدہ ناک کو لرزتے کپکپاتے پوپلے منہ نے شوکت و قوت سے عاری کر دیا ہے۔"

نیا بجٹ اور اقتصادی جائزہ

سیّد محبوب علی

وفاقی وزیرِ خزانہ رانا محمد حنیف نے ۵ جون ۱۹۷۶ء کو قومی اسمبلی میں ۱۹۷۶-۷۷ء کا قومی بجٹ پیش کیا اور حسبِ دستور اس سال بھی بجٹ پیش کرتے ہوئے ملک کی اقتصادی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔

قومی بجٹ کے اعلان کے وقت عام طور پر سب کی توجہ ٹیکسوں کی تجویزوں کی طرف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ بجٹ کا یہ پہلو ہر شخص کے ذاتی اور خاندانی بجٹ پر اثر ڈالتا ہے۔ لیکن ٹیکسوں کی تفصیلات معلوم ہونے کے بعد عوام نے اطمینان کا سانس لیا کہ ان کے روزمرہ کے استعمال کی کسی چیز پر براہِ راست کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا گیا اور نہ ان چیزوں پر موجودہ ٹیکسوں میں اضافہ کیا گیا۔

جیسا کہ وزیرِ خزانہ نے بتایا ٹیکس لگاتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔

۱۔ صنعتوں اور مکانوں کی تعمیر میں نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۲۔ برآمد بڑھا کر اور درآمد گھٹا کر ادائیگیوں کا توازن بہتر بنایا جائے۔

۳۔ پرائیویٹ سیکٹر میں بچت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۴۔ افراطِ زر کی وجہ سے لوگوں کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے انہیں کم کرنے کے لئے ٹیکس ادا کرنے والوں کو مراعات دی جائیں۔

وزیرِ خزانہ نے بتایا کہ عالمی کساد بازاری اور اندرونِ ملک بعض دشواریوں کے باوجود مجموعی طور پر قومی معیشت کا مشکل ترین دور گزر گیا ہے۔ حکومت نے جو اقتصادی اصلاحات نافذ کی ہیں ان کی بدولت پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے اور معیشت نے ایسا رخ اختیار کیا ہے کہ عوام کی زیادہ سے زیادہ ضرورتیں پوری ہونے لگی ہیں۔

پیداوار میں اضافہ

موجودہ مالی سال میں مجموعی قومی پیداوار میں ۵ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ پچھلے سال عالمی اقتصادی صورتِ حال کی وجہ سے مجموعی قومی پیداوار میں صرف ۲ء۴ فیصد اضافہ ہوا تھا۔ اس حقیقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۶ء تک کی مدت میں مجموعی قومی پیداوار میں کوئی بھی اضافہ نہیں ہوا تھا ۵ فیصد اضافہ ایک نمایاں کارنامہ ہے لیکن تیز رفتار قومی ترقی کے لئے یہ اضافہ کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے کم از کم ۸-۹ فیصد سالانہ اضافہ ہونا چاہیئے۔ پاکستان اس منزل تک پہنچ سکتا

تھا لیکن کساد بازاری کی وجہ سے عالمی منڈیوں میں پاکستانی مال کی قیمتیں گر گئیں اور ملک کے اندر کپاس کی فصل خراب ہوگئی۔ اب عالمی کساد بازاری ختم ہونے کے آثار پیدا ہوگئے ہیں اور ملک کے اندر پیداوار بڑھانے کے لئے ضروری تدبیریں اختیار کرلی گئی ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سال مجموعی قومی پیداوار میں ۸ فیصد اضافہ ہوگا۔

زراعت

موجودہ مالی سال میں اقتصادی صورتِ حال کا سب سے خوش آئند پہلو یہ رہا ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ کا رجحان دوبارہ شروع ہوگیا ہے۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک زرعی پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۵ء تک برائے نام اضافہ ہوا جس سے بمشکل پچھلے سالوں کی کمی پوری ہوسکی۔ موجودہ مالی سال میں زرعی پیداوار میں ۴ فیصد اضافہ ہوا جو پچھلے تین سال کے دوران مجموعی اضافے کے برابر ہے۔ کپاس کے سوا تمام بڑی بڑی فصلوں کی پیداوار میں مجموعی طور پر ۵ء۴ فیصد اضافہ ہوا۔ گندم کی پیداوار میں ۷ فیصد، چاول کی پیداوار میں ۱۲ فیصد اور گنے کی پیداوار میں ۲۰ فیصد اضافہ ہوا۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اس سال ۸۱ لاکھ ٹن گیہوں پیدا ہوا۔ ہوسکتا ہے اصل پیداوار اس سے بھی زیادہ ہوئی ہو۔ حکومت نے گندم کی فصل بازار میں آنے سے بہت پہلے اس کی سرکاری خریداری کا بندوبست کرلیا تاکہ فصل آنے پر بازار میں گندم کی قیمت بہت زیادہ نہ گر جائے اور کاشتکار کو نقصان نہ ہو۔ ۳۷ روپیہ فی من کے حساب سے گندم کی سرکاری خریداری جاری ہے۔ اور اب تک آٹھ لاکھ من گندم خریدی جاچکی ہے۔

اگلے سال کے ترقیاتی منصوبے میں زراعت پر خاص توجہ دی گئی ہے تاکہ زرعی پیداوار میں ۸ فیصد اضافے کا ہدف پورا کیا جاسکے۔ اس کے لئے یہ انتظام کیا جارہا ہے کہ آبپاشی کے لئے زیادہ سے زیادہ پانی، کیمیائی کھاد اور فصلوں کے تحفظ کی سہولتیں دستیاب ہوں اور زرعی پیداوار کی قیمتیں مستحکم رہیں۔

جہاں تک پانی کا تعلق ہے تربیلا بند سے آئندہ فصلِ ربیع کے لئے پانی ملنے کی پوری توقع ہے۔ اس سال سیم اور تھور پر قابو پانے کی کئی اسکیمیں مکمل کرلی جائیں گی۔

پچھلی اسکیموں میں جو ٹیوب ویل بے کار ہوگئے ہیں ان کی مرمت کی جائے گی۔ ڈیزل سے چلنے والے دس ہزار ٹیوب ویل لگانے کے لئے مالی امداد دی جائے گی۔ صوبائی حکومتوں سے کہا گیا ہے کہ جو نہریں خراب ہوگئی ہیں ان کی صفائی اور مرمت کا انتظام کیا جائے۔

پاکستان میں کیمیائی کھاد کا استعمال پچھلے سال چار لاکھ ۲۵ ہزار ٹن سے بڑھ کر اس سال پانچ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن ہوگیا ہے۔ پھر بھی یہ مقدار موزوں مقدار کی ایک چوتھائی ہے۔ آئندہ سال کیمیائی کھاد کا استعمال ۶ لاکھ ۴۰ ہزار ٹن تک بڑھانے کی تجویز ہے۔ اس سال کیمیائی کھاد کی قیمت میں پہلے ہی دس فی صد کمی کردی گئی ہے۔

اس سال کیڑا لگ جانے کی وجہ سے کپاس کی فصل خراب ہوگئی۔ اب یہ انتظام کیا جارہا ہے کہ کپاس کی اگلی فصل کاشت کرنے سے پہلے کپاس کے بیج میں دوا لگائی جائے۔ پھر پودوں پر دوائیں چھڑکنے کے انتظام میں بھی توسیع کی جارہی ہے۔ صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ کپاس کی فصل پر دوائیں چھڑکنے کا خاص طور پر بندوبست کیا جائے۔

اس سال سبزیاں، ترکاریاں بھی وافر مقدار میں پیدا ہوئی ہیں۔ اگر حکومت ان کی محدود برآمد کا انتظام نہ کرتی تو منڈی میں ضرورت سے کہیں زیادہ سبزیاں ترکاریاں آجاتیں تو اور بہت سستے داموں بکتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اگلے سال کاشتکار سبزیاں نہ بوتے اور

عوام کو دشواری کا سامنا ہوتا۔

توقع ہے کہ زرعی میدان میں مناسب تدبیروں کی بدولت اگلے سال کم سے کم ۹۰ لاکھ ٹن گیہوں پیدا ہوگا جس سے ملک گیہوں کے معاملے میں قریب قریب خود کفیل ہو جائے گا۔

اس سال کپاس کی فصل خراب ہو گئی اور صرف ۲۹ لاکھ گانٹھ روئی حاصل ہو سکی۔ توقع ہے کہ اگلے سال فصلوں کو کیڑوں مکوڑوں سے بچانے کے مناسب انتظام کی وجہ سے ۴۰ لاکھ گانٹھ روئی پیدا ہو سکے گی۔ یہ مقدار زیادہ نہیں ہے۔ ماضی میں بھی ۳۹ لاکھ گانٹھ تک روئی پیدا ہو چکی ہے۔

صنعت

پچھلے چند سال میں صنعتی پیداوار میں تھوڑا بہت اضافہ ہوتا رہا ہے۔ یہ اضافہ پہلے سے لگائے ہوئے کارخانوں کے بہتر استعمال سے ہوا ہے۔ عوامی حکومت نے قومی تحویل میں لی ہوئی اور نجی صنعتوں میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے لئے جو اقدامات کئے ہیں ان کی وجہ سے صنعتی سرمایہ کاری میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ خاص طور پر بناسپتی گھی، شکر اور کپڑے کے کئی کارخانے لگے ہیں۔ فولاد، کیمیائی کھاد اور سیمنٹ کے کارخانے بھی لگائے جا رہے ہیں، لیکن ان میں پیداوار ذرا دیر سے شروع ہوتی ہے اس لئے خیال ہے کہ فولاد، سیمنٹ اور کیمیائی کھاد کی مزید پیداوار دو سال یا اس سے زیادہ عرصے بعد شروع ہوگی۔

پاکستان کی سب سے بڑی صنعت کپڑے کی صنعت ہے یہ صنعت ۷۵-۱۹۷۴ سے عالمی منڈی میں کساد بازاری کا شکار رہی ہے۔ توقع ہے کہ دنیا میں کساد بازاری کم ہونے کے ساتھ ساتھ کپڑے کی کھپت بڑھے گی اور پاکستانی کپڑے کی مانگ میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے عالمی منڈی میں کپڑے کی مانگ ابھی تک کساد بازاری سے پہلے کی سطح تک نہیں پہنچی۔ البتہ اب بہتری کے آثار پیدا ہوئے ہیں اور موجودہ سال کے آخر میں عالمی منڈی میں کپڑے کی مانگ بڑھی ہے۔ توقع ہے کہ ۷۷-۱۹۷۶ میں عالمی منڈی میں کپڑے کی مانگ معمول پر آجائے گی۔ اگر پاکستان کے پاس وافر مقدار میں روئی ہوئی تو وہ کافی کپڑا بنا کر برآمد کر سکے گا۔

نئے مالی سال میں صنعتی پیداوار میں ۹ فیصد اضافہ کی توقع ہے۔ موجودہ کارخانوں میں ابھی اضافے کی گنجائش موجود ہے۔ توقع ہے کہ اگلے سال سوت کی پیداوار میں ۱۴ فیصد، شکر کی پیداوار میں ۸ فیصد، ۱۰، کاغذ اور گتّے کی پیداوار میں ۲۶ کپڑے کی پیداوار میں ۱۰ فیصد، بناسپتی گھی کی پیداوار میں ۱۴ فی صد فیصد اضافہ ہوگا۔ اس اضافے کا اندازہ موجودہ کارخانوں کی گنجائش سامنے رکھ کر لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شکر کے دو اور کارخانے اور بناسپتی گھی کے بھی کئی کارخانے لگائے جا رہے ہیں۔

آئندہ سال صنعتی شعبے میں سب سے زیادہ خرچ کراچی میں فولاد کے کارخانے پر ہوگا۔ اس لئے کہ فولاد کو بنیادی صنعت کی حیثیت حاصل ہے۔ صنعتی شعبے کے لئے مجموعی طور پر چار ارب ۵۲ کروڑ روپیہ رکھا گیا ہے۔ اس میں سے دو ارب روپیہ فولاد کے کارخانے پر خرچ ہوگا۔ توقع ہے کہ تین چار سال کے عرصے میں اس کارخانے میں فولاد تیار ہونے لگے گا۔

کیمیائی کھاد کی صنعت میں بھی کافی سرمایہ لگایا جا چکا ہے ملتان میں کیمیائی کھاد کی پاک عرب فیکٹری ۱۹۷۷ء میں آزمائشی طور پر مال تیار کرنے لگے گی۔ میر پور ماتھیلو میں پاک سعودی فرٹیلائزر فیکٹری میں بھی اس سال کافی کام ہوگا۔ یہ فیکٹری ۱۹۷۸ء میں مکمل ہوگی۔ ہزارہ میں کیمیائی کھاد کا کارخانہ لگایا جا رہا ہے ان دنوں اس کارخانے کے یوریا پلانٹ کی تعمیر ہو رہی ہے۔ کیمیائی کھاد کی ایک اور فیکٹری صادق آباد کے قریب فوجی فاؤنڈیشن

لگا رہی ہے۔

سیمنٹ کی پیداوار بڑھانے کے لئے ایک کارخانہ کوہاٹ میں لگایا جا رہا ہے۔ اور سیمنٹ کے "مستحکم اور جاوداں" نامی کارخانوں میں توسیع کی جا رہی ہے۔

تیل اور گیس

وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ہدایت پر ۷۷-۱۹۷۶ء کے دوران تیل اور گیس کی تلاش پر خرچ دوگنا کیا جا رہا ہے آئل اینڈ گیس ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے لئے ۴۲ کروڑ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اگلے سال کنویں کھودنے کی چار جدید مشینیں خریدی جائیں گی اور چار جدید کنویں کھودے جائیں گے۔ اب تک کسی سال سرکاری خرچ پر ایک یا دو سے زیادہ کنویں نہیں کھودے گئے۔ ملک میں تیل اور گیس کی تلاش کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔ حکومت تیل تلاش کرنے والی آٹھ کمپنیوں کے مشترکہ منصوبوں میں شریک ہوگی۔

برآمدات

۷۶-۱۹۷۵ء کے دوران برآمدات کی صورت حال عام طور پر پہلے سے بہتر ہوئی ہے۔ پہلے نو مہینوں میں برآمدات سے ۸۵ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر کا غیر ملکی زرمبادلہ کمایا گیا۔ بعد میں ہر مہینے اوسطاً دس کروڑ ڈالر کا مال برآمد کیا گیا۔ اندازہ ہے کہ ۷۶-۱۹۷۵ء کے دوران برآمدات سے مجموعی آمدنی ایک ارب دس کروڑ ڈالر سے کہیں زیادہ ہوئی ہے۔ اور پچھلے سال کے مقابلے میں دس فیصد زیادہ ہے۔ یہ اضافہ اس حقیقت کے باوجود ہوا ہے کہ کپاس کی فصل خراب ہوگئی اور عالمی منڈی میں چاول کی قیمت گر گئی۔

توقع ہے کہ آئندہ سال برآمدات سے ایک ارب ۵۴ کروڑ ڈالر کا غیر ملکی زرمبادلہ کمایا جائے گا۔ جو ۷۶-۱۹۷۵ء کے مقابلے میں ۲۴ فیصد زیادہ ہوگا۔ اگلے سال روئی اور کپڑے کی برآمد میں نمایاں اضافے کی توقع ہے۔ عالمی اقتصادی صورتِ حال بہتر ہونے کی وجہ سے پاکستان کی دوسری برآمدات میں بھی اضافہ ہوگا۔

درآمدات

۷۶-۱۹۷۵ء میں درآمدات کی مجموعی مالیت کا تخمینہ دو ارب بیس کروڑ ڈالر ہے۔ پچھلے سال بھی درآمدات کی مجموعی مالیت تقریباً اتنی ہی تھی۔ آئندہ سال اشیائے صرف اور خام مال کی درآمد میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ البتہ مشینیں پہلے سے زیادہ منگائی جائیں گی اور اس طرح درآمدات کی مجموعی مالیت دو ارب پچیس کروڑ ڈالر تک پہنچ جانے کی توقع ہے۔

سالانہ منصوبہ

۷۷-۱۹۷۶ء میں ترقیاتی منصوبوں پر پبلک سیکٹر میں ۲۰ ارب ۵۴ کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ اس میں سے ۱۷ ارب روپیہ وفاقی حکومت سالانہ ترقیاتی منصوبے پر خرچ کرے گی۔ ۳ ارب ۵۴ کروڑ روپے کی ایک اور رقم پبلک سیکٹر کے ادارے براہ راست خرچ کریں گے۔ اس طرح پبلک سیکٹر کے خرچ میں ۷۶-۱۹۷۵ء کے مقابلے میں ۲۰ فیصد اضافہ ہوگا۔ پرائیویٹ سیکٹر میں ۶ ارب ۵۰ کروڑ روپیہ کا سرمایہ لگایا جائے گا۔ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹروں میں مقررہ سرمایہ کاری کا تخمینہ ۲۷ ارب ہے جو مجموعی قومی پیداوار کا ۱۸ فیصد ہے۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں یہ شرح ۱۷ فیصد تھی اور عوامی حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے وقت صرف ۱۲.۶ فیصد تھی۔

۱۷ ارب کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں سے قومی اقتصادی کونسل وفاقی حکومت اور اس کے اداروں کو ۱۳ ارب

۵۰ کروڑ روپیہ خرچ کرنے کی منظوری دے چکی ہے۔ صوبائی حکومتوں کے سالانہ ترقیاتی پروگرام پر تین ارب ۵۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ صوبوں کے لئے ۳ ارب ۵۰ کروڑ روپے کی جو رقم رکھی گئی ہے اس میں سے ۲ ارب ۱۵ کروڑ روپیہ چاروں صوبوں میں ان کی آبادی کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں سے ہر ایک کو ۱۷ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ فالتو دیا جائے گا تاکہ وہاں ترقی کی رفتار تیز کی جاسکے۔ صوبوں کے لئے رقموں کی تخصیص حسب ذیل ہے۔

پنجاب	ایک ارب ۸۹ کروڑ ۸۰ لاکھ روپیہ
سندھ	۷۰ کروڑ ۹۰ لاکھ روپیہ
صوبہ سرحد	۵۹ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ
بلوچستان	۲۹ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ

صوبائی حکومتیں ان رقموں کے علاوہ اپنے وسائل سے ترقیاتی پروگرام پر مزید رقمیں خرچ کرسکیں گی۔

وفاقی حکومت ترقیاتی پروگرام پر ۱۳ ارب ۵۰ کروڑ روپیہ کی جو رقم خرچ کرے گی وہ ۷۶-۱۹۷۵ء کے اصل پروگرام کے مقابلے میں ۳۰ فیصد زیادہ ہے۔ وفاقی حکومت کی طرف سے وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں پر ۲۲ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ آزاد کشمیر پر ۱۲ کروڑ ۶۰ لاکھ روپیہ اور شمالی علاقوں پر ۷ کروڑ ۴۵ لاکھ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔

مستقبل کا منصوبہ

آئندہ مالی سال کے لئے جو اقتصادی منصوبہ تیار کیا گیا ہے اس کے مقاصد درج ذیل ہیں:-

۱- زرعی شعبہ میں ترقی کی رفتار بڑھا کر زرعی پیداوار میں ۸ فیصد اضافہ۔

۲- صنعت میں جمود کی کیفیت ختم کرکے صنعتی پیداوار میں ۹ فیصد اضافہ۔

۳- مجموعی قومی پیداوار میں ۸ فیصد اضافہ۔

۴- برآمدات میں ۳۲ فیصد اضافہ کرکے ادائیگیوں کا توازن بہتر بنانا۔ ساتھ ہی ساتھ اشیائے صرف کی درآمد قابو میں رکھی جائے گی اور صرف مشینوں کی درآمد میں اضافہ کیا جائے گا۔

۵- پبلک سرمایہ کاری میں ۲۰ فیصد اضافہ اور نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی۔

۶- افراط زر ختم کرنے کی کوشش جاری رکھنا اور قیمتوں میں استحکام پیدا کرنا۔

وزیر خزانہ نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا تھا کہ ہماری یہ کوشش ہوگی کہ قیمتوں کے استحکام پر اثر ڈالے بغیر ترقی کی رفتار بڑھائی جائے۔ ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ کے لئے ہر قسم کی ترغیب اور سہولت فراہم کی جائے۔ ترقیاتی پروگرام کے لئے رقم مہیا کرنے کی غرض سے جو تدبیریں اختیار کی گئی ہیں ان میں ایسی بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جہاں کہیں چھوٹ یا رعایت واقعی ضروری تھی وہاں چھوٹ اور رعایت دی جائے۔ اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر میں بچت اور سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی ہو۔ توقع ہے کہ اس سال ترقی کی جو رفتار قائم کی گئی ہے اس میں آئندہ سال اور اضافہ ہوگا۔ ہمارا قوم سے یہ وعدہ ہے کہ جب تک اقتصادی ترقی کے فائدے عام نہیں ہو جاتے ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

پیکرِ شرافت — مولانا حالیؒ

خواجہ شبلی پانی پتی

مولانا حالیؔ شرافت واخلاق کے پیکر اور عالم باعمل تھے۔ ان کے کردار اور گفتار میں ذرّہ برابر بھی تضاد نہ تھا۔ مولانا نے اردو زبان کو بے بہا تالیفات سے مالا مال کیا۔ اُردو نظم کو ایک نئی سمت عطا کی اس کے علاوہ مسلمانوں کی ترقی اور اُن کی بہبودی میں جو کوششیں کیں تعلیم الاطفال اور تعلیم نسواں میں جس قدر بلیغ سعی کی وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ بلند پایہ اَخلاقی مضامین کی بدولت ان کو "سعدیؔ ہند" کہا گیا۔ فرسودہ اور کہنہ شاعری کے جسدِ بیجان میں آپ نے زندگی کی جو روح پھونکی اس کے باعث قوم نے آپ کو "مجددِ نظم اردو" کا خطاب دیا بقولِ حفیظؔ جالندھری صاحب ؎

سخن کی اک نئی دنیائے عالی شان پیدا کی
بنائے خود ہی پیکر اور خود ہی جان پیدا کی

مولانا کو حکومتِ وقت نے علمیت اور فضیلت کی بنا پر "شمس العلماء" کا خطاب عطا کیا اور مولانا شبلیؔ نعمانیؒ کے مطابق "مولانا آپ کو تو نہیں لیکن "شمس العلماء" کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اب جاکر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔ بخار کی حالت میں اسی قدر لکھ سکتا تھا۔"

(شبلیؔ ۳۰ر جون ۱۹۰۴ء)

مولانا حالیؔ نام ونمود اور شہرت کے بالکل خواہاں نہ تھے۔ لہٰذا جب مولانا کو یہ خطاب ملا تو آپ نے اپنے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین مرحوم کو ایک خط میں یوں تحریر فرمایا:

"اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے کہ جس کی ہمارے بہت سے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں۔ مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہ ملتا اور ایسے مواقع سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ مگر اب جب کوئی حاکم پانی پت آوے گا یا جب کوئی ڈپٹی کمشنر کرنال بدل کر آوے گا۔ لامحالہ وہاں جانا پڑے گا۔ بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں"۔

سرسیدؒ نے مولاناؒ کو فخرِ قوم، فخرِ شعراء اور فخرِ علماء کے القاب سے نواز کر اُن کی عزت افزائی فرمائی ——— سرسید فرماتے ہیں،

"ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے اور فخر کرنا چاہیئے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا کہ آئندہ زمانہ میں جب کہا جائے گا کہ فخرِ قوم، فخرِ شعراء، فخرِ علماءٗ زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور ان سے نجات دینے والا قوم کا کون ہے؟ تو کہا جائے گا "حالیؔ" ——— (مجموعہ لیکچرز سرسید صفحہ ۴۷۴)

ایک اور جگہ تحریر کرتے ہیں:

"بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں جب خدا مجھ سے پوچھے گا کہ "تو کیا لایا" تو میں کہوں گا کہ "حالیؔ سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں"۔ (مکتوبات سرسید صفحہ ۳۱۲)

نواب عماد الملک مرحوم فرماتے ہیں:

"سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا

کا پایہ بہت بلند تھا۔ اس بات میں سرسید بھی انہیں
نہیں پہنچتے تھے۔"

محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں :

"آپ کے اوصاف کا احاطہ کرنا مشکل ہے آپ انسان
تھے فرشتہ صفت۔ آپ فرشتہ تھے مگر انسانی خصائص کے
ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے وہ اطمینان
اور سکونِ قلب میسر ہوتا تھا جو اولیائے کرام کی صحبت
میں لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کامل انسان
کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔"

غلام صفدر فرماتے ہیں :

"مولانا خوش خلق با اخلاق، راقم السطور سے جو
ایک ملاقات ہوئی تھی اس میں ان کا التفات اور مربیانہ
برتاؤ ایسا حیرت انگیز تھا کہ طبیعت کو دلی لطف اور
روحانی خوشی تا ہنوز حاصل ہوتی ہے۔" ؎

بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

مولانا بہت ہی سیر چشم تھے ہوس و طمع تو آپ کو چھو کر
بھی نہیں گزری تھی چنانچہ مولانا کی مقبولِ عام نظمیں اور کتابیں بغیر
آپ کی اجازت سینکڑوں تاجرانِ کتب چھاپ لیا کرتے تھے مگر آپ
نے کبھی کسی کو منع نہیں فرمایا بلکہ آپ سے جب بھی اشاعت کی اجازت
چاہی تو آپ نے بڑی دریا دلی سے فوراً اجازت دے دی۔ ایک دفعہ
مولوی نظام الدین صاحب ایڈیٹر "ذوالقرنین" نے مولانا حالیؔ
سے ان کی چند رباعیاں چھاپنے کی اجازت طلب کی تو مولانا نے
جواب میں لکھا۔" آپ شوق سے ان رباعیوں کو جو "علی گڑھ گزٹ"
میں چھپی ہیں چھاپ لیں اور جو رباعیاں دیوان میں موجود ہیں اور
منشی رحمت اللہ رعدؔ ان کو چھاپ چکے ہیں اُن کو آپ بھی چھاپ
سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ کوئی تازہ کلام ان کے سوا موجود نہیں۔"

مولانا حالیؔ کی اس صفت کا مولانا محمد علی جوہرؒ یوں ذکر کرتے ہیں۔

"اگر "حیاتِ جاوید" اور "مسدسِ حالی" کا مصنف شہرت پسند ہوتا
اور کسبِ شہرت کرتا تو بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نام دنیاوی
اور مادی نقطۂ خیال سے بہت بلند ہوتا۔ لیکن اس نے کبھی بازار میں
بکنا گوارا نہ کیا۔ مولانا حالی کا یہ امتیازی کیرکٹر تھا جو ہمیں اپنی قوم
میں بہت کم نظر آتا ہے۔ وہ وضع اور عزم کے پکے تھے۔"

مولانا حالیؔ کسی کی نہ غیبت کرتے تھے اور نہ برائی کرتے
تھے۔ بلکہ ان دونوں عیوب کو ناپسند فرماتے تھے۔ اگر کوئی آپ
کی محفل میں کسی کی برائی یا غیبت کرتا تو آپ اسے سختی سے منع فرماتے
چنانچہ مولانا نے کس پیارے انداز میں ان عیوب کی نشان دہی
کرتے ہوئے قوم کو ٹوکا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بد گوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی ہی یہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس امت میں (حالیؔ)

خواجہ غلام الثقلین فرماتے ہیں :

"مولانا یونانی خیال کی رُو سے معتدل اور متوسط
کامل انسان اور صوفیانہ خیالات کی رُو سے ایک
صاحبِ باطن ولی تھے کبھی کسی کی برائی ان کی زبان
سے نہ سنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا
پسند فرماتے تھے۔ عزیزوں سے محبت رکھتے عزیزوں
کی امداد کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ نیک آدمیوں
کی قدر دانی کرتے تھے۔ اخلاق میں، عادات میں
برتاؤ میں، مروت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال
تھا۔ محبِ اہلِ بیتؑ اور صوفی منش "سُنّی" تھے۔
مولانا کے پاس بیٹھنے اور باتیں سننے سے نہایت
بد باطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔ ہر اک کی

طرف سے دل کو صاف رکھتے اور ہر ایک کو نیک سمجھتے تھے۔"

چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

میں بتاؤں آپ کو اچھوں کی کیا پہچان ہے
جو ہیں خود اچھے وہ اوروں کو نہیں کہتے بُرا

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

نیکوں کو نہ ٹھیرائیو بد اسے فرزند
اک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہو اُس میں اگر گلے سڑے دانے چند

موجود ہزار ہوں ذات میں جس کی ہنر
بدظن نہ ہو عیب اس میں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کرکے نظر
کر حسن و جمال کا نہ اس کے انکار

مولانا بہت ہی عالی ظرف انسان واقع ہوئے تھے۔ مسدس کی مقبولیت اور مقدمہ شعر و شاعری کی اشاعت سے طرزِ قدیم کے پرستاران نے ملک بھر میں مخالفت کا شدید طوفان بپا کر دیا۔ اور رکیک سے رکیک حملے مولانا کی ذات پر کیے لیکن یہ مولانا ہی کی ایک واحد شخصیت تھی جس نے مخالفت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور اعتراضات کا نہ خود جواب دیا اور نہ کسی کو جواب دینے دیا۔ "اودھ پنچ" لکھنؤ میں اعتراضات کا لامتناہی سلسلہ زیرِ عنوان جاری رہا ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

اس کے علاوہ "اردوئے معلیٰ" میں بھی مولانا حسرت موہانی نے مولانا حالی پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی اور یہاں تک لکھ دیا کہ "سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرّب زبان کوئی ہو نہیں سکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا اچھا ہے۔"

ایک دفعہ مولانا حالی علی گڑھ تشریف لے گئے اور سید زین العابدین مرحوم کے یہاں قیام کیا۔ ایک دن حسرت موہانی مولانا حالی سے ملاقات کے لئے آئے۔ چونکہ سید زین العابدین شوخ طبع واقع ہوئے تھے اس لئے وہ "اردوئے معلیٰ" کے دو تین پرچے اٹھا لائے اور بولے "ارے! مولانا یہ دیکھئے آپ کے متعلق یہ کیا تحریر کیا ہے" "سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرّب زبان کوئی ہو نہیں سکتا۔ وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا اچھا ہے"۔ مگر مولانا ذرا بھی مکدّر نہ ہوتے۔ کہا تو مسکرا کر یہ کہا "نکتہ چینی اصلاح زباں کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں" اور فرماتے ہیں ؎

اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالی یہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

کیا بتاؤں کس طرح سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

غرضیکہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اس شعر و سخن کی لڑائی میں بھی میدان پانی پت مولانا ہی کے ہاتھ رہا ؎

وہ حالی جس نے ابدالی سے بڑھ کر معرکہ مارا
تکلم سے مسخر کر لیا ہندوستان سارا

(حفیظ جالندھری)

مولانا میں ہمدردی اور رحمدلی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ اپنوں اور غیروں کی بلا امتیاز ہر ممکن امداد فرمایا کرتے تھے بلکہ مولانا صحیح معنوں میں "اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ" اور "لَا یَرْحَمُ مَنْ لَّا یَرْحَمْ" کا عملی نمونہ تھے آپ نے ان احادیث کو اپنے اشعار میں کس خوبی اور سلیس و بلیغ پیرائے میں ادا کیا ہے۔

" خدا رحم کرتا نہیں اُس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کسی کے گر آفت گذر جائے سر پر
پڑے غم کا سایہ نہ اس بے اثر پر
کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر "

اسی سلسلہ میں مولانا کے چند واقعات بھی پیشِ خدمت ہیں۔

مامی نامی ایک غریب عورت کو مولانا نے اپنے مکان کا ایک حصہ دے رکھا تھا۔ اُس کا خود کا بیان ہے کہ مولانا مجھ سے بہت ہی حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے۔ سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے اور مالی امداد بھی کر دیا کرتے تھے۔

مولانا نے عطاء اللہ نامی ایک ملازم رکھا ہوا تھا۔ جو کہ بالکل معذور تھا۔ کانوں سے بہرا، ہاتھوں سے لُنجا اور وہ پیروں سے لنگڑا اس کے علاوہ مزاج کا غصیلا تھا۔ اکثر مولانا سے بھی بے ادبی سے پیش آجاتا تھا۔ لیکن مولانا کا اس کے باوجود اس سے برتاؤ مُربیانہ اور ہمدردانہ تھا۔ ایک صاحب نے مولانا کا یہ برتاؤ دیکھ کر مزاحیہ انداز میں کہا۔

" مولانا اگر عطاء اللہ خوش قسمتی سے بالکل اندھا
بھی ہوتا تو آپ کے نقطہ نگاہ سے اس میں ایک اور
خوبی کا اضافہ ہو جاتا۔"

چنانچہ مولانا کا جو اس سے برتاؤ تھا وہ عطاء اللہ ہی کی زبانی سنیئے۔ "مولوی صاحب بڑے ہی اچھے آدمی تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی چیز بازار سے منگائی اور روپیہ دیا۔ باقی پیسے گنے بغیر جیب میں ڈال لیا کرتے تھے۔ مولانا کو چائے کی عادت بھی تھی اور چلنے سے آنے والوں کی تواضع بھی کرتے تھے۔ چونکہ اس کا انتظام میرے سپرد تھا۔ اس لئے یہ سب چیزیں میرے ہی پاس رکھی رہتی تھیں۔ میرا جب دل چاہتا یا بھوک لگتی تو بسکٹ کھا لیا کرتا تھا۔ گرمی کے موسم میں چینی کا شربت بنا کر خوب پیا کرتا تھا۔ اس طرح چینی اور بسکٹ جلدی ختم ہو جایا کرتے تھے۔ جب اور جس وقت بھی یہ کہتا کہ مولوی صاحب چینی اور بسکٹ ختم ہو گئے تو فوراً منگا لیا کرتے تھے اور کبھی یہ نہیں کہا کہ ابھی تو چینی منگائی تھی اتنی جلدی کس طرح ختم ہو گئی۔ گرمی سردی میں ہر قسم کے کپڑوں کا خیال رکھتے تھے۔ بیمار ہوتا تو بڑی فکر کرتے اور تو اور ڈاکٹر حکیم کو بلا کر خود دکھلاتے اور توجہ سے علاج کرواتے۔ میں اپنے مزاج کے مطابق مولوی صاحب پر غصہ ہو جاتا اور دیر تک بُڑ بڑاتا رہتا۔ مگر مولوی صاحب کچھ بھی نہ کہتے۔ میرا یہ برتاؤ دیکھ کر اگر کوئی مولوی صاحب کی توجہ میری اس حرکت پر بھی دلاتا تو مولوی صاحب کہتے۔

" ہاں بھائی کبھی ہم اس پر ناراض ہو لیتے ہیں کبھی یہ
ہم پر ناراض ہو لیتا ہے آج اس کی باری ہے۔ اچھا
میرا کیا ہرج ہے ناراض ہو لینے دو۔"

مولانا کا ایک اور ملازم نانوں خان کہتا ہے کہ،

" ایک مرتبہ مولانا حالی دہلی گئے وہاں پر نواب لوہارو کے یہاں مولانا کی دعوت تھی۔ اسی دن اتفاقیہ میں بیمار ہو گیا۔ مولانا کو سخت پریشانی ہوئی۔ مولانا نے فوراً حکیم کو بلوایا اور بڑی توجہ سے علاج شروع کر دیا اس دوڑ دھوپ میں مولانا مصروف ہی تھے کہ نواب صاحب کا ایک آدمی مولانا کو بلانے کے لئے آیا۔ آپ نے نواب صاحب کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ نانوں خاں کی طبیعت خراب ہے اور میں اس کی دیکھ بھال میں مصروف ہوں۔ اس عذر کے لئے شرمندگی کے ساتھ معافی چاہتا ہوں۔"

اس ملازم کی زبانی ایک اور واقعہ ضبط تحریر ہے۔

" سردی کا موسم تھا میں نے کوئی کپڑا سردی کے لئے نہیں بنوایا تھا۔ مولانا کو جب یہ معلوم ہوا، مولانا نے اپنی نئی روئی کی واسکٹ اتار کر دے

دی۔"

مولانا ایک دفعہ آب و ہوا تبدیل کرنے کی غرض سے اپنے ایک عزیز ڈاکٹر لیاقت حسین کے ہاں فرید آباد چلے گئے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کی ملازمہ وزیرن کا چھوٹا بچہ بیمار ہوگیا۔ اور ساری رات روتا رہا۔ جب مولانا نے متواتر بچہ کی رونے کی آواز سنی تو بے چین ہوگئے اور اپنے بستر سے اُٹھ کر وزیرن کو آواز دی، بچہ کا حال دریافت کیا اور فرمانے لگے کہ اگر اس وقت ڈاکٹر کی یا دوا کی ضرورت ہو تو کچھ انتظام کیا جائے۔ وزیرن نے کہا کہ "نہیں مولوی صاحب صبح دیکھی جائے گی۔" لیکن مولانا کا خیال رات بھر بچے ہی کی طرف لگا رہا۔ صبح اٹھتے ہی جب ڈاکٹر لیاقت حسین صاحب مولانا کے پاس آئے تو فوراً مولانا نے کہا۔

"آپ پہلے وزیرن کے بچّہ کو دیکھ آیئے وہ بیچارا رات بھر بخار ہونے کی وجہ سے روتا رہا۔ چنانچہ جب تک بچہ اچھا نہ ہولیا برابر اس کی دوا کرتے رہے۔ اور روزمرہ اس کی حالت اور کیفیت دریافت کرنے برابر جاتے رہے۔"

فرید آباد میں قیام کے دوران مولانا حالیؔ کو ایک پُرلطف واقعہ درپیش آیا۔ مولانا کے خط بنانے کے لئے ایک نائی آیا۔ اس نے خط بنانے کے دوران مولانا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "جی حضور مولوی صاحب! خدا آپ کو خوش رکھے ایک کام تو ہمارا بھی کر دیجئے ساری عمر آپ کی جان و مال کو دعا دیتا رہوں گا۔ کام یہ ہے کہ ہمارا ایک عورت پر دل آگیا ہے۔ ہم نے اس سے شادی کرنی چاہی وہ تو راضی ہوگئی مگر خدا ستیاناس کرے اس کے رشتہ داروں کا کہ انہوں نے خدا واسطے کے بیر میں آکر اسے بہکا دیا اور نہ معلوم میری طرف سے اس کے کان میں کیا پھونکا کہ اب وہ عورت بھی فرنٹ ہو گئی ہے۔ میں نے ہرچند کوشش کی مگر وہ کمبخت کسی طرح پگھلنے ہی میں نہیں آتی بس حضور کوئی ایسا تعویذ مجھے لکھ دیں کہ اس کے بھائی بند اور وہ خود ہاتھ جوڑتے پھریں اور خوشامد کرتے پھریں۔ مولوی صاحب یہ کام تو آپ کو کرنا ہی ہوگا۔ چاہے خط کے پیسے آپ نہ دیں۔ مگر تعویذ ضرور لکھ دیں۔ میں نے آپ کی بڑی تعریف سنی ہے۔ اور میں بغیر تعویذ لئے یہاں سے ہرگز نہ ٹلوں گا"۔ لطف یہ کہ مولانا حالیؔ نے اس عجیب وغریب مسئلہ کو حل کرنے کا وعدہ فرما لیا۔ چنانچہ جب دوسرے دن قصبہ کے ذی وجاہت اور بااثر اصحاب مولانا کے پاس جمع ہوئے تو مولانا نے نہایت شد و مد کے ساتھ چھٹو حجام کی سفارش کی اور کہا جس طرح بھی ممکن ہو آپ صاحبان کوشش کریں کہ اس عورت کے والدین اس سے شادی کر دیں۔ لوگوں نے کہا۔

"حضرت چھٹو کے ساتھ شادی کرنا غریب لڑکی کو تباہ اور برباد کرنا ہے۔ کیونکہ وہ نہایت آوارہ، نشہ باز، جواری اور عیاش آدمی ہے۔ اگر ایسا ہوگیا تو بیچاری کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ جب مولانا کو یہ حالات معلوم ہوئے تب جاکر مولانا اس کی وکالت سے دستبردار ہوئے۔"

مولانا انور احمد مرحوم ایک دفعہ مولانا کے یہاں پانی پت مہمان ہوئے۔ رات کا وقت تھا سردی کا موسم تھا۔ مولانا انور کہتے ہیں کہ:

"رات کے بارہ بجے تھے مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص میری رضائی کو آہستہ سے چھو رہا ہے۔ میں نے چونک کر پوچھا کون؟

مولانا حالی نے کہا:

"میں ہوں۔ آج سردی زیادہ ہے مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کے پاس اوڑھنے کا سامان کافی نہ ہو تو یہ کمبل لایا تھا اور آپ کو اڑھا رہا ہوں" انور صاحب کہتے ہیں کہ "مجھے ان کی شفقت کا ایسا اثر ہوا کہ عمر بھر نہ بھول سکا۔"

مولوی عبدالحق مرحوم تحریر کرتے ہیں "ایک دفعہ مولانا حالی نواب حیدر آباد کی دعوت پر جوبلی میں شرکت کے لئے حیدر آباد دکن تشریف لائے۔ ایک صاحب مولانا موصوف سے ملنے کے لئے ٹم ٹم پر آئے۔ وہ صاحب بالکل دروازے کے سامنے اترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دروازے سے دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہوگئے اور کئی ہنٹر اس غریب سائیس کے لگائے۔ یہ نظارہ مولانا برآمدہ میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مولانا کا چہرہ متغیر تھا۔ آپ برآمدہ میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔ "ہائے ظالم نے یہ کیا کیا"۔ اس روز دوپہر کا کھانا مولانا نے اچھی طرح نہ کھایا۔ اور کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوئی۔ فرماتے تھے۔ "یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہنٹر میری پیٹھ پر مارے ہیں۔" اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔"

مولانا خواجہ تصدق حسین صاحب مرحوم کو ایک عزیز کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اس بات کی بھی مجھے کچھ پرواہ نہیں ہے کہ وہ اپنی قدیم عادتیں چھوڑیں یا نہ چھوڑیں۔ اپنی بیوی بچوں کی خبر لیں یا نہ لیں اور اپنے باپ دادا کا چلن اختیار کریں یا نہ کریں۔ میں بہرحال ان کی اعانت کرنے کو موجود ہوں۔"

راقم الحروف کے تائے خواجہ لطیف احمد (مرحوم) فرمایا کرتے تھے کہ:

"مولانا حالیؒ کے میرے والد مرحوم سے بڑے گہرے تعلقات تھے مولانا اکثر ہمارے یہاں آیا جایا کرتے تھے ہم سب بھائیوں سے بڑا انس تھا۔ چنانچہ مولانا نے مجھے علی گڑھ میں داخل کرایا۔ اور جب میں نے بی۔ اے کر لیا تو اینگلو عربک کالج دہلی میں ملازم کرایا اور اس کے بعد محمڈن ہائی سکول (جو کہ بعد میں گورنمنٹ نے تحویل میں لے لیا تھا) امراؤتی برار (جو کہ اب مدھیا پردیش ہے) میں ہیڈ ماسٹری کی ملازمت دلوائی۔"

ایک مرتبہ ایک شخص مولانا کے پاس آیا۔ اور کہا کہ نواب کنج پورہ کے ہاں ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ایک سفارشی چٹھی مجھے لکھ دیں اور اس میں یہ تحریر کر دیں کہ حامل رقعہ میرا رشتہ دار اور عزیز ہے۔ اور جو سلوک آپ ان کے ساتھ کریں گے۔ وہ میرے ساتھ کریں گے۔ مولانا نے اسی طرح لکھ دیا۔ ایک صاحب جو اس وقت مولانا کے پاس بیٹھے تھے کہنے لگے کہ مولانا یہ تو آپ کا رشتہ دار نہیں تھا۔ پھر آپ نے ایسا کیوں لکھ دیا۔ مولانا نے فرمایا۔

"بنی آدم اعضائے یک دیگرند" اگر اتنا بھی ہم اپنے بھائیوں کے لئے کام نہ آسکیں تو ہماری حالت پر افسوس ہے۔ ذرا سوچو تو سہی اگر صرف اتنا لکھ دینے سے اس شخص کو نوکری مل جائے تو اس میں میرا کیا ہرج اور نقصان ہے۔"

"ہیں وہی انساں جو آتے ہیں ہم جنسوں کے کام
ورنہ ہیں انساں سے سو بار بہتر جانور" (حالی)

مولانا حالی حسنِ اخلاق کا زندہ نمونہ تھے۔ وہ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آتے تھے چنانچہ مولوی عبدالحق مرحوم فرماتے ہیں۔

"طالب علمی کے زمانہ میں علی گڑھ میں مولانا حمید الدین مرحوم اور میں جب مولانا سے ملنے گئے تو مولانا سروقد تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ہم اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ مولانا حمید الدین نے کہا بھی کہ آپ ہمیں تعظیم دے کر محجوب کرتے ہیں۔"

مولانا نے فرمایا کہ:

"آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں۔ آئندہ
آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔"

مولانا حالیؔ جہاں خود ہمدرد وطن و قوم تھے وہاں دوسروں کی قومی خدمات کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ مولانا ظفر علی خانؒ جو کہ مولانا حالیؔ کے بچوں کے برابر تھے اُن کی قومی خدمات کو کس طرح کن الفاظ میں سراہتے ہیں اور کتنی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں ذرا غور فرمائیں۔ "مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مناظر پر کچھ طبع آزمائی کرتا مولوی اسماعیل میرٹھی بھی اب ہماری طرح پا بہ رکاب ہیں صرف پنجاب میں آپ جیسے چند لوگوں کی صورتیں نظر آتی ہیں بشرطیکہ آپ کو فکرِ معاش دم لینے دے۔ اس کے علاوہ مولانا حالیؔ نے جنگ بلقان سے متاثر ہو کر ایک طویل نظم لکھی جس میں مولانا ظفر علی خانؒ کی خدمات پر دادِ تحسین یوں دی۔

اے مالکِ دفترِ زمیندار
اے نازشِ قوم و فخرِ اقران
اے دیں کے امتحاں میں جاں باز
اے نصرتِ حق میں تیغ عُریاں
اے صدق و صفا کی زندہ تصویر
اے شیر دل اے ظفر علی خاں
بلقان و طرابلس میں ناگاہ
اُٹھا ستم و جفا کا طوفان
ہمدردیٔ اہلِ دیں نے آخر
جوہر ترے کردیئے نمایاں
مشرق میں ہوں درد دل سے بے چین
مغرب میں سُنیں جو رنجِ اخواں
سوزِ غمِ دینِ حق سے جن کے
سینے ہوں کباب دل ہوں بریاں
زندہ ہے وہ ملک اور وہ ملت
ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں
جو ملک و وطن کے ہوں فدائی
جو قوم کے نام پر ہوں قربان
کاش ایسے جئیں سدا وہ فرزند
جو قوم کے درد کے ہوں درماں
ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ
سنتا بھی ہے اے ظفر علی خاں"

اپنے زمانہ کے باعظمت و با رفعت انسان نے اپنی منکسر المزاجی کا اظہار خواجہ تصدق حسین مرحوم کے خط میں یوں کیا "جب میں زمانہ کی نگاہ میں اپنی قدر و منزلت کا اندازہ کرتا ہوں تو اس سے زیادہ نہیں پاتا کہ ایک مشہور گویا جہاں کہیں جاتا ہے امراء اس کی خاطر کرتے ہیں اور اگر وہ خود نوکری چاہتا ہے تو تھوڑی بہت نوکری بھی ہر جگہ اس کو مل جاتی ہے لیکن اگر وہ گھر بیٹھے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی سفارش کرنی اختیار کرے تو کوئی اس کی طرف التفات نہیں کرتا۔ یہی حال میرا ہے۔ اگر میں خاص اپنی ذات کے لئے کہیں جا کر کچھ فائدہ حاصل کرنا چاہوں تو شاید کسی قدر کامیابی ہوجائے لیکن یہ ہرگز امید نہیں کہ میری سفارشوں کی بھی ایسی ہی قدر و پرسش ہو جیسی مجھ کو اپنی

حق کو ہوتا ہے جنہیں دنیا میں کرتا سربلند
خصلتیں یہ برگزیدہ ان کو ہوتی ہیں عطا

غرضیکہ علم و ادب کی یہ شمع جو ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں روشن ہوئی اور جس کی روشنی سے تمام ملک روشن ہوا۔ اور جس نے لاکھوں دلوں میں جوت جگائی وہ ہمیشہ کے لئے ۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کی رات کو گل ہوگئی۔

جگا کر خاکیوں کو گنبدِ افلاک کے نیچے
وہ حالیؔ سو گیا اپنی وطن کی خاک کے نیچے

آپ کو حضرت بو علی شاہ قلندر رحمتہ اللہ علیہ کے مزار مبارک کے احاطہ میں جگہ نصیب ہوئی۔

تحریکِ پاکستان اور طلبائے علی گڑھ

قیصر سہارنپوری

جب انگریزوں اور ہندوؤں نے یہ تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے تو قائداعظم نے چیلنج کیا کہ اس کا فیصلہ انتخابات کے ذریعے کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی مرکزی قانون ساز اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے جن میں مسلم لیگ کو زبردست کامیابی ہوئی۔ مسلم لیگ کی فتح سے انگریز اور ہندو یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے اور پاکستان کا مطالبہ بالکل صحیح ہے۔ اس الیکشن میں چند مسلمان ایسے بھی تھے جو کانگرس، جمعیت العلمائے ہند، احرار اور خاکسار تحریکوں سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے ہر مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کی سخت ترین مخالفت کی مگر مسلم لیگ کو فتح ہوئی اور اس کے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آگیا۔

اس الیکشن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء نے مسلم لیگ کا ساتھ دیتے ہوئے اہم کردار ادا کیا۔ قائداعظم کے فرمان پر مسلمانانِ ہند جوق در جوق الیکشن کا کام کرنے کے لئے ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئے۔ اغیار کا سخت ترین مقابلہ کر کے عوام کو مسلم لیگ اور پاکستان سے روشناس کرایا اور بتایا کہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے کیا جذبات ہیں؟ اگر خدانخواستہ پاکستان حاصل نہ ہوا تو مسلمانوں کا انجام (نہ صرف اُن کا جو مسلم لیگی تھے بلکہ اُن کا بھی جو ہندوؤں کے ساتھ ہیں) انتہائی دردناک ہوگا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء نے ہندوستان کے شہروں اور دور دراز گاؤں میں پھر پھر کر پاکستان کی صحیح ضرورت کا احساس دلایا۔ اور مسلمانوں نے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر پاکستان حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس سلسلہ میں مجھے بھی مسلم لیگ کا کام کرنے کے لئے یوپی اور پنجاب کے شہروں اور دیہات میں جانا پڑا۔ یہ وہ دن تھے جب علی گڑھ سے طلباء تقریباً ہر روز ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بھیجے جا رہے تھے۔ میں بھی طلباء کی ایک پارٹی کے ہمراہ لاہور جانے کے لئے علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ جب دہلی جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر رُکی تو ہم نے جلدی جلدی سامان ریل کے ڈبے میں رکھنا شروع کر دیا۔ مسلم لیگ کا سبز پرچم ریل کے ڈبے کے باہر رسی سے باندھ دیا۔ ہماری پارٹی تقریباً پچاس طلبا پر مشتمل تھی۔ ہم لوگ جلدی جلدی گاڑی میں سوار ہونے لگے، جس ڈبے میں مَیں اور میرے ساتھی سوار ہوئے تھے، اس ڈبے میں زیادہ تر ہندو مہا سبھائی بیٹھے تھے ہم لوگ نعرۂ تکبیر، نعرۂ توحید، مسلم لیگ زندہ باد، پاکستان لے کے رہیں گے کے نعرے لگا رہے تھے۔ جب ہندوؤں نے "پاکستان لے کے رہیں گے" کے نعرے سُنے تو صبر کا دامن چھوڑ دیا اور ایک دوسرے سے اس طرح گویا ہوئے "مسلم لیگ نے لڑکوں کا وقت خراب کرنے کے لئے ان کو ایک طرح سے بھینٹ چڑھا دیا ہے۔" ایک کہہ رہا تھا "پاکستان کیا بلا ہے مسلمان سہانے خواب دیکھ

رہے ہیں۔ پاکستان کس طرح بن سکتا ہے؟" ان باتوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ہمارے چند ساتھیوں سے کہا "دوسرے ڈبے میں چلے جاؤ کیونکہ تم لوگ پاکستان کی باتیں کرو گے اور ہم لوگوں کو غصہ آئے گا۔ بیکار میں ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔"

جب میرے ساتھی اور میں ڈبے سے اترنے کو تیار نہ ہوئے تو ایک ہندو نے ہمارے ایک ساتھی کو چھیڑنے کے لئے باہر دھکیل دیا۔ ہم لوگ برابر ضبط سے کام لے رہے تھے۔ یہ وہی ریلوے اسٹیشن تھا جہاں کسی مسلمان لڑکے کو کوئی بُری نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ آج اُسی ریلوے سٹیشن پر ایک مہاسبھائی ہندو نے ایک طالبعلم کو دھکا دیا جیسے ہی اُس نے دھکا دیا۔ طالب علم نے اُسے ایک زوردار گھونسہ رسید کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ علی گڑھ کے طلباء کا وقار وافتخار اپنے عروج پر تھا ایک طالب علم کے ساتھ ناروا سلوک کا آخری جواب یہی ہو سکتا تھا۔ گھونسہ کھا کر ڈبے میں موجود لوگوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اب کسی شخص کی مجال نہ ہوئی کہ ہمارے خلاف بات کرے۔ جب

لیاقت علی مرحوم نے جو خود بھی علیگ تھے ہندوستان کو گھونسہ دکھایا تھا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علی گڑھ کے طالبعلم کا وہ گھونسہ اُن کو یاد آ گیا ہو گا۔

ہماری ریل گاڑی ۸ بجے شب دہلی ریلوے سٹیشن پر پہنچی ہمارا قافلہ کھانے سے فارغ ہو کر لاہور جانے والی گاڑی کے انتظار میں پلیٹ فارم پر پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد لاہور جانے والی گاڑی فرنٹیئر میل آ گئی اور ہم لوگ گاڑی میں سوار ہو گئے تمام رات سفر کرنے کے بعد صبح ۹ بجے کے قریب لاہور پہنچ گئے لاہور ریلوے اسٹیشن پر ہمارا شاندار استقبال ہوا۔ مسلم لیگی کارکن اور طلباء نے جو پہلے لاہور پہنچ گئے تھے لاہور اسٹیشن پر استقبال کی تیاریاں کر رکھی تھیں اور خود بھی استقبال کے لئے موجود تھے۔ ہم لوگ ایک جلوس کی شکل میں میکلوڈ روڈ پر "زمیندار" اخبار کے دفتر آئے۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم سے ملاقات ہوئی وہ ہم لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہم لوگوں کو "زمیندار" اخبار کے دفتر میں چائے پلائی گئی۔ اس وقت لاہور میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد کافی تھی۔ ہم لوگ کالی اچکنوں پر ہرے رنگ کی ساٹن کی پٹی جس پر لفظ "مسلم لیگ" کالے رنگ میں چھپا ہوا تھا، باندھے ہوئے تھے۔ سکھ اور ہندو ہم لوگوں کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر "زمیندار" کے دفتر میں ٹھہر کر مسلم لیگ کے دفتر جو لکشمی بلڈنگ کے سامنے تھا۔ یہ بلڈنگ اُس زمانے میں مسلم لیگ کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال ہو رہی تھی یہاں پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک پروفیسر عمر علی خان مرحوم جو میرے دادا ڈاکٹر حافظ محمد فیاض خان مرحوم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ہیڈ میڈیکل آفیسر کے دوست تھے، موجود تھے۔ اور لڑکوں کو ٹھہرانے اور مختلف جگہوں پر روانہ کرنے کا انتظام کر رہے تھے۔

میں میاں افتخار الدین کے نام جناب عمر علی مرحوم کی معرفت علی گڑھ سے ضروری خط لے کر آیا تھا میری ڈیوٹی یہ تھی کہ خط لاہور میں عمر علی صاحب کو پہنچا دوں۔ پروفیسر محمد عمر مرحوم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ریاضی کے پروفیسر تھے اور اُن کے والد سر سید احمد خان کے خاص کارندے رہے تھے۔ ان کو سر سید احمد خان نے "منشی" کا خطاب دیا تھا۔ ہر آدمی ان کو منشی جی کے نام سے پکارتا تھا۔ یہ اکثر ہمارے یہاں آتے رہتے تھے۔ خیر میں نے وہ خط عمر علی مرحوم کو پہنچا دیا۔

ایک رات لاہور ٹھہر کر دوسرے دن ہماری پارٹی گوجرانوالہ کے لئے روانہ ہوئی اُس گاڑی پر مسلم لیگ کے پرچم لہرا رہے تھے۔ ہم نعروں کی گونج میں گوجرانوالہ اسٹیشن پہنچے۔ یہاں بھی مسلم لیگی کارکن اور عوام ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے ہم لوگوں کو ایک جلوس کی شکل میں مسلم لیگ کے دفتر لے جایا گیا۔ دوپہر کو آرام کرنے کے بعد ہم لوگ جلوس کی شکل میں نعرے لگاتے اور نظمیں پڑھتے ؂

ہم جانانِ علی گڑھ دین پر مٹ جائیں گے
پرچم اسلام پاکستان پر لہرائیں گے

شہر کی سڑکوں پر نکل آئے۔ لڑکوں کی اکثریت ہمارے ساتھ تھی۔ جب احراریوں نے ہماری آمد اور جلوس کی خبر سنی تو انہوں نے بھی ایک مختصر جلوس نکالا۔ جب یہ جلوس ہمارے قریب سے گذرا تو انہوں نے ہمارے خلاف نعرے لگائے اور "کرائے کے ٹٹو ہائے ہائے" کہا۔ احرار والے تحریکِ پاکستان کے خلاف تھے۔ جب شام ہوگئی تو ہمارا جلوس ختم ہوگیا اور ہم لوگ واپس مسلم لیگ کے دفتر آگئے۔

دوسرے دن تانگوں میں سوار ہوکر گوجرانوالہ کے دیہات میں پہنچے۔ اُن دنوں اس علاقے میں اتنی زیادہ ریت اڑتی تھی کہ ہم لوگ چادریں لپیٹ کر سفر کرتے۔ مگر پھر بھی منزل مقصود پر پہنچ کر ہم ریت سے اٹے ہوئے ہوتے۔ گوجرانوالہ کالج کے طلباء ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے جگہ جگہ مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں تقریریں کیں اور اپنی تقریروں میں بتایا کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہوجانا چاہیئے کیونکہ ہمیں اسلامی حکومت قائم کرنا ہے جس کا نام "پاکستان" ہوگا۔ اگر ہم مسلمان ایک جگہ جمع نہ ہوئے تو ہم مٹ جائیں گے۔ کیونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ مسلمان آزاد ہوکر اپنا الگ وطن بنائیں۔ وہ ہم پر راج کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے غلامی کی زنجیریں توڑ دو۔ ہم اس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتے جب تک پاکستان نہ حاصل کرلیں۔ ہندو چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنا مذہب تبدیل کرکے ہندو مت اختیار کرلیں۔ صرف اسی صورت میں وہ ہندوستان میں رہ سکتے ہیں۔ ہماری اس تبلیغ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں بھی ہم گئے ہمارے نعروں کا جواب دیا گیا "لے کے رہیں گے پاکستان"۔ اور اس طرح سارے برصغیر میں پاکستان کے لئے فضا سازگار ہوگئی۔ ہندوستان کے کونے کونے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء گئے اور اپنے مشن میں کامیاب ہوکر واپس لوٹے۔ جس کا حسین نتیجہ "پاکستان" آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ پاکستان پائندہ باد۔

بڑھتے چلو

_______ سلطان محمود بسمل

شکست و یاس کی ظلمت مٹا کے بڑھتے چلو
دلوں میں عزم کی شمعیں جلا کے بڑھتے چلو

اگرچہ سینکڑوں صبر آزما مراحل ہیں
رہِ حیات میں تم مسکرا کے بڑھتے چلو

ازل سے برسرِ پیکار حق سے ہے باطل
غرور و سطوتِ باطل مٹا کے بڑھتے چلو

خلوص و مہر و محبت، مروت و شفقت
دل و نگاہ میں اپنے بسا کے بڑھتے چلو

"اگر کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام"
کلامِ شاعرِ ملت سنا کے بڑھتے چلو

پئے خراجِ عقیدت حضور قائدِ قوم
سرِ نیاز کو اپنے جھکا کے بڑھتے چلو

خدا کے واسطے فرقہ پرستیاں چھوڑو
خدا، رسولؐ کا پرچم اٹھا کے بڑھتے چلو

وطن کی آن پر کٹ جائے سر، جھکے نہ کبھی
وطن کی شان کو بسمل بڑھا کے بڑھتے چلو

رپورتاژ

سرزمینِ چنگیز خان سے

روح افزا حیدر

آج شام ساڑھے چھ بجے ہم ماسکو کے ہوائی اڈے "شیریمیتیوو"
SHEREMETEVO سے اُولن باتور ULAN BATORE روانہ ہوئے
اُولن باتور منگولیا کا دارالخلافہ ہے۔ خیال تھا کہ گرمیوں میں وہاں ہوا آئیں چونکہ
وہاں سردی جلد شروع ہو جاتی ہے مگر وہاں کی حکومت نے ۲۰ اکتوبر کو
سفارتی کاغذات پیش کرنے کی تاریخ مقرر کی۔ حکومتوں کے مزاج کچھ
قدیم شاعروں کی محبوباؤں سے مختلف نہیں ہوا کرتے۔ سرِ تسلیم
خم ہے......

مجھے مدت سے منگولیا دیکھنے کا شوق تھا۔ اُس سرزمین کو....
جہاں چنگیز خان کی اولاد نے اپنے دبدبہ کا ڈنکا بجا دیا تھا یہ سرزمین
طویل ترین عرصے تک ان کے پھریرے اڑاتی رہی۔ انہوں نے اپنی فتوحات
سے مشرق سے مغرب تک ایک آگ سی لگا دی تھی۔ منگولیا میں اُولن باتور
کی شمال کی طرف اونچے پہاڑوں پر اُن کا دارالخلافہ تھا جہاں برطانیہ
اور یورپ کے دیگر ملکوں سے کاریگر آکر خانِ اعظم کے لئے سونے
چاندی کی جواہرات جڑی گھڑیاں بناتے تھے اور اٹلی کے سنگتراش ان
کے ہاتھوں میں سنگِ مرمر کے مجسموں کا جادو جگاتے تھے اور یہ سب
کچھ بارھویں صدی میں رو پذیر ہوا تھا۔ ترک اور مغل سب کا شجرۂ نسب
چنگیز خان اور ہلاکو خان سے جا ملتا ہے۔ ہلاکو خان کی اولاد خوارزم
اور بغداد فتح کر کے کچھ عرصہ بعد اسلام سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام
ہو گئی تھی۔ اس سلسلہ میں شاعرِ مشرقؒ نے کہا۔

ع "پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے"

اور ادھر ۱۵۲۵ء میں بابر کی فوج دریاؤں میں گھوڑے دوڑاتی
ہوئی دہلی پہنچ گئی۔

اس مناسبت سے منگولیا جاتے ہوئے میں نے رائی اور کاکو
کو لکھا کہ ہم "GRAND FATHERS" کے ملک میں جا رہے ہیں

(یہ بھی ایک لطیفہ ہے جسے پھر کبھی پیش کروں گی) دفتر سے ہمارے
سکریٹری دوم ایاز امیر صاحب ساتھ تھے۔ ایاز امیر صاحب کی بیوی
شہناز ریڈیو کے ہردلعزیز میوزک ڈائریکٹر سرور نیازی صاحب کی بیٹی
ہیں۔ شہناز کی امی میری پرانی دوست ہیں۔ شہناز کو دیکھ کر مجھے وہ زمانہ
یاد آجاتا ہے جب ہم نے ریڈیو شروع شروع میں خریدا تھا۔ میں
ابتداء میں پڑھتی تھی اور والدِ محترم ریڈیو سے صرف خبریں ہی سنا پسند
کرتے تھے اور موسیقی سے انہیں دلچسپی خاص نہیں تھی۔ سردیوں کے
زمانہ میں بیٹھنے کے کمرہ میں آتشدان کے قریب بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھا
کرتی اور رات کو ۱۱ بجے مدھم مدھم آواز میں ریڈیو کو کھولتی تو
"ایک صاحب" کی آواز میں نیازی صاحب کی مسحور کن آواز سنی جاتی۔

نغمہ تھا۔ ؎

"میں کیسے بھلا دوں تجھے میں کیسے بھلا دوں"

تقریباً چھ گھنٹے کی پرواز کے بعد ارکتسک پہنچے۔ یہ شہر قدیم جھیل
"بیکل" کے قریب ہے۔ یہ جھیل دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے گہری
جھیل ہے۔ جرمنی سے آتے ہوئے وہاں کے وزارتِ خارجہ کے معاملات
پاکستان PAKISTAN AFFAIRS کے سیکریٹری
مسٹر لان نے جو دو سال پہلے پاکستان بھی تشریف لے گئے تھے۔ ہماری
الوداعی دعوت میں سجاد حیدر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "میری یہ
دعا ہے کہ ہماری آپ کی دوستی اتنی ہی عظیم اور گہری ہو جتنی جھیل بیکل ہے۔"
چنگیز خان کی قدیم تاریخ میں بھی جھیل بیکل کا ذکر ہے اس وقت تک صبح
کے چار بج چکے تھے۔ صبح صادق کی روشنی میں ہوائی جہاز سے جھیل
کا بے پناہ پانی ڈولتا ہوا جھلملا رہا تھا۔ اس پانی میں ایک عجیب سی
وسعت کھوئی ہوئی نظر آتی ہے جو مکان اور لامکان سے بے نیاز
ہے۔

ہم اپنے وقت کے اندازے کے مطابق صبح چھ بجے اولن باتور
پہنچے۔ وہاں کی گھڑی گیارہ بجا رہی تھی یہاں اور وہاں کے وقت میں
پانچ گھنٹوں کا فرق ہے۔ گویا اس وقت ہم پاکستان سے بہت مشرق
کی طرف آنکلے تھے۔ وہاں بارش ہو کر تھمی تھی۔ ہوا بہت سرد چل رہی
تھی۔ ہمیں لینے کے لئے محکمہ استقبالیہ کے افسر اعلیٰ اور ایک منگولین ترجمان
خاتون موجود تھے۔ ایرپورٹ پر کوئی نصف گھنٹہ ٹھہرنا پڑا اور پھر اپنے
مہربان ترجمان کے ساتھ ہوٹل پہنچے۔ دامنِ کوہ بلکہ یوں کہیئے کہ چھوٹی
چھوٹی پہاڑیوں میں گھرا ہوا یہ چھوٹا سا شہر ہے۔ دریائے طولی اس
شہر کے وسط سے گذرتا ہے۔ دریا پار کرتے ہوئے ترجمان نے بتایا
کہ اس پر پل نیا بنا ہوا ہے۔ اور بہت سی سرکاری عمارتیں اور رہائشی
فلیٹ نئے بنے ہوئے نظر آرہے تھے۔ سڑکیں واجبی ہیں اور شہر کے
ارد گرد بلکہ وسط شہر میں بھی یورت (YURUT) یعنی منگولی
خیمے کثرت سے نظر آتے ہیں۔ منگول شروع سے ہی انہیں خیموں میں
رہتے تھے اور ہمیں معلوم ہوا کہ شہر کی ساٹھ فیصد آبادی اب تک ایسے
ہی خیموں میں رہتی ہے۔

ہوٹل کے بارے میں ماسکو میں چند یورپین سفیروں اور ان
کی بیگمات نے بہت ڈرایا ہوا تھا۔ اس لئے ڈرتے ڈرتے وہاں قدم
رکھا۔ مگر ایسا برا بھی نہ تھا۔ اچھے خاصے صاف کشادہ کمرے تھے
اور صاف ہی غسل خانہ تھا۔ سینٹرل ہیٹنگ CENTRAL HEATING
اور ٹی وی موجود تھا کھانا البتہ ہم نے وہاں کے کمرۂ طعام میں نہیں
کھایا۔ کیونکہ غلام گردش ہی سے چربی کی مخصوص بو آتی تھی۔ ایک دن سفیرِ عراق
کے ہاں کھانا کھایا جو حسنِ اتفاق سے بغداد میں چودہ سال پہلے ہمارے
ساتھ تھے اور ان سے بہت دوستی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ نیا پل اور اکثر
بڑی بڑی سرکاری سنگین عمارتیں چینیوں نے بنائی ہیں۔
مدارس میں منگولی زبان ہے لیکن روسی لازمی ہے اور سب
عمارتوں اور شاہراہوں کے نام روسی زبان کے رسم الخط میں لکھے ہوتے
ہیں۔ ایک دوپہر میں برطانوی سفیر کے ہاں کھانا کھایا۔ دونوں میاں
بیوی بہت خلیق اور ملنسار ہیں۔ سفیر کی بیوی MRS PONSOVY

پاکستان بننے سے پہلے پشاور میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد فوج میں تھے اور یہ خاتون غالباً تیرہ چودہ سال کی عمر تک لاہور میں رہیں۔ وہاں کی باتیں دلی اشتیاق سے پوچھ رہی تھیں۔ ان کے اس جذبہ کے مدّنظر میں نے ان کی ملاقاتی کتاب میں اردو میں "پشاور کی طرف سے سلام محبت" لکھا۔ وہ لوگ اپنے لئے پھل، سبزیاں، گوشت، مچھلی اور پھول پیکنگ سے منگواتے ہیں۔ ان کا ایک کوریئر (COURIER) سفارتی بیگ لے کر ہر ہفتہ سرکاری ڈاک اولن باتور لاتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ قاصد برطانوی عملے کے لئے سودا سلف بھی لے آتا ہے

گھوڑے شہر میں نظر تو آئے تو کم از کم ہماری ترجمان کہتی تھیں کہ ہم لوگ شہر میں رہ کر بالکل بیکار ہو گئے دیہاتوں میں تو بچے چھوٹی عمر میں ہی شہسواری سیکھ لیتے ہیں۔ مذہب ان کا بدھ مت تھا مگر اب کیا ہے کسے معلوم!!! البتہ (MONSTRY) عبادت گاہ جا کر دیکھی بقول (MRS. PONSOVY) اب بھی صبح کے وقت اس میں عبادت ہوتی ہے۔ تاریخی عجائب گھر تو بند تھا غالباً مرمت ہو رہی تھی۔ بہت اصرار کے بعد خان کا محل (PALACE) دیکھا۔ یہ سٹیٹ میوزم کا حصہ ہے اور منگولیا کے قدیم شاہی خاندان کا موسم سرما کا محل ہے یہ بادشاہ یا خان مذہبی پیشوا بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ محل چینی اور منگولی کاریگروں نے دس سال کے عرصے میں تعمیر کیا تھا اس محل کے وحصے ہیں اور باہر سے ایک چینی پگوڈا کی شکل میں منقش لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان پیچ در پیچ

لکڑی کی جالیوں میں ایک بھی کیل استعمال نہیں کی گئی تھی۔ پہلا حصہ ڈیوڑھی کا تھا جو بڑا تھا اور جو خانِ اعظم کے لئے تھا۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک کئی عبادت خانے ہیں جن میں قدیم منگولین دیوتاؤں اور حیا تابدھ کی تصاویر اور مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔ ان تصاویر اور مجسموں میں منگولین، چینی اور تبتی آرٹ کی آمیزش نظر آتی ہے کئی بت قدیم منگولین دیوتاؤں کے چاول کے باریک کاغذ اور مٹی کو گوندھ کر رنگین اور منقش بنائے گئے ہیں۔ اس عبادت خانے کے چند کمروں میں دیوار گیریاں، چینی سلک اور اطلس پر نازک گلکاری سے بنائی گئی ہیں۔ ان تصویروں میں شکار کے مناظر سوتی اور ریشمی دھاگوں سے کاڑھے ہوئے ہیں اور بیچ بیچ میں باریک پسے موتی، سونے چاندی اور جواہرات سے جالی بنائے ہوئے ہیں۔ اس قدر پیچیدہ اور نفیس کام میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ آخری کمرہ میں تمام موسیقی کا سامان تھا جیسے طبل اور نقارے وغیرہ اور منگولین موسیقی کا ایک خاص باجا جو کہ ڈگڈگی کی شکل کا تھا جو تھے ہال میں سولہ پجاری رات دن چنگیز خان کی مال و دولت، عزت اور زندگی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اس کمرے کی دیواروں پر چیتے کی کھالیں لگی ہوئی تھیں۔ نویں ہال کے عبادت خانے میں چنگیز خان خود عبادت کرتا تھا۔ اس کمرے کی تصویریں سب سے خوبصورت اور نمایاں آرٹ کے نمونے تھے۔ یہ داتا بہزار خان کے ہاتھ کے بنے ہوئے تھے جو نوشیت خان کا بیٹا تھا اور بچپن سے اسے تصویریں بنانے اور خیمہ سازی کا از حد شوق تھا۔ اس نے خان بننے کے بعد بھی یہ شغل جاری رکھا۔ عبادت گاہ کے بعد دوسری غلام گردش میں چلتے ہوئے دوسری عمارت میں داخل ہوئے جو خان کا محل تھا۔ اس میں بغد خان بڑی شان سے رہتا تھا۔ ان کمروں میں اس کی اور اس کی بیگم کی ذاتی اشیاء سلیقہ سے نمائش کی گئیں تھیں۔ کئی کمرے مختلف نوادرات کی نمائش گاہ بنے ہوئے تھے۔ ان نوادرات میں خوبصورت قالین، فانوس، گلدان، اطلس کے لباس، سونے چاندی کے کھانے کے ظروف، سنگِ مرمر کی میزیں، سونے چاندی اور ہاتھی دانت کی منقش میز اور کرسیاں، تخت اور چھپر کھٹ ریشمی پردوں کے ساتھ پسے موتیوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔

نیچے کی منزل میں سب سے زیادہ اہم تاریخی اور قدیم چیز جو نظر آئی وہ خان کا خیمہ ہے۔ باہر سے اس کی چھت کھالوں کی بنی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہاں کی نگہبان خاتون نے مجھے کمال مہربانی کے ساتھ خیمے کے اندر جانے کی اجازت دی۔ (اندر جھک کر جانا پڑتا ہے) اس گول سے کمرے میں ایک

دریا کو کوزے میں بند کیا ہوا نظر آتا ہے۔ اندر کی چھت اونی شالوں سے منڈھی ہوئی ہے۔ ایسی خوبصورت شالیں جیسے کہ جامہ وار۔ زمین پر نرم و گرم قالین خیمے کے عین وسط میں بڑی سی انگیٹھی چاندی کی (جسے عربی میں "منقلہ" کہتے ہیں) گول گول دیواروں کے ساتھ گولائی میں دیوان جن پر قالین اور ان پر مخمل کے گدے جن پر کارچوب کا کام، ان کے اوپر کمخواب کے تکیے لگے ہوئے۔ ان دیواروں کے سامنے ننھی ننھی سبک و نازک میزیں ہاتھی دانت اور آبنوس کی بنی ہوئی تھیں ان کے اوپر چاندی کے عودان خوشبو جلانے کے لئے طلائی شمعدان۔ سامنے کے بڑے دیوان کے سامنے ایک خوبصورت کرسی شہ نشین کیجئے۔ بڑی میز پر دو خوبصورت چاندی کے اونچے اونچے چائے دان جن میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ چاندی کی سینی میں چینی کی نازک نازک پیالیاں۔ دوسری طرف ایک بڑا سا خوبصورت طلائی سماوار، ایک چھوٹی سی انگیٹھی پر مستقل رکھا رہتا ہے جس میں چائے

کا پانی دن رات گرم رہتا ہے۔ یہ منگولیا کی تہذیب کی ہلکی سی جھلک ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ یہ چنگاریاں کس خاکستر کی باقی ہیں

ترجمان خاتون سے معلوم ہوا کہ ان کا رہن سہن اب بھی چینیوں کے بہت قریب ہے ان کی طرح یہ بھی پانی بالکل نہیں پیتے۔ ہر وقت چائے پیتے ہیں چائے کو چائے ہی کہتے ہیں۔

اپنے بزرگوں کے سامنے ننگے سر بیٹھنا گستاخی سمجھتے ہیں۔ عورتیں اب بھی منگول لباس پہنتی ہیں لیکن اب نئی تہذیب کے زیر اثر لمبے لمبے کھلے کمر لگے لبادوں کے ساتھ پاؤں میں لمبے بوٹ ہاتھ میں بٹوہ اور چھاتا لے کر نکلتی ہیں۔ کمر میں ایک ریشمی پیٹی اور سر پر ایک بنارسی قسم کا رومال۔ ان کے لبادوں کی تراش خراش دیکھ کر مجھے مغل بیگمات کے لباس کا خیال آتا ہے ؎

وہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

انڈسٹری بہت کم ہے۔ فر کی کھالوں کے کوٹ بنائے جاتے ہیں۔ وہ بھی زیادہ تر باہر کے ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ بلغاریہ والوں نے ایک کارخانہ فر کے کوٹ بنانے کا لگایا ہے۔ سنا ہے کہ ہر سال جس قدر فر کے کوٹ تیار ہوتے ہیں (سب ہی عمدہ ہوتے ہیں) سب کے سب منافع کے حساب میں خود ہی لے جاتے ہیں۔ دروغ برگردن راوی۔

'اُولن باتور' سے یاد آیا کہ یہ لفظ 'باتور' بہادر کی خرابی ہے۔ اصل لفظ بہادر ہے جس کا وہی مطلب ہے جو ہماری زبان میں ہے اور یہ لفظ منگولیا سے نکل کر تبت، نیپال اور ہندوستان میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ مثلاً وائسرائے بہادر۔ اب ان کے یہاں بگڑ کر باتور بن گیا۔ اس شہر کا قدیم نام URGA اب انقلاب کے بعد اس کا نام اولن باتور میں بدل دیا گیا ہے اولن کے معنی سُرخ ہوتے ہیں۔ چنگیز خان کے دادا کا نام بارتان بہادر تھا۔ بہادر کا مطلب منگول زبان میں شجاع کا ہے۔ چنگیز خان کا دادا ایک شجاع سپاہی تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے، تیسرا بیٹا یسوگے چنگیز خان کا باپ تھا۔ چنگیز خان کی ماں ہیولون کو یسوگے نے پہلے پہل گھوڑا گاڑی میں دریا عبور کرتے دیکھا تھا۔ اس وقت ہیولون ایک خوبصورت لڑکی تھی اُسے یسوگے نے کس طرح جیتا اپنی جگہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ بڑی عمر میں ہیولون میں حسن کے ساتھ ساتھ وقار اور دبدبہ بھی آگیا تھا۔ چنگیز خان اپنی ماں کے حکم کو عبادت سمجھتا تھا اور اس سے بہت خائف رہتا تھا۔ وہ ایک دلیر اور غیور خاتون تھی جس نے اپنے بیٹوں کو نہایت محنت سے شرافت، شجاعت، اور خودداری کے اصول بچپن سے سکھائے تھے۔ صحرائے گوبی کے اوپر کا یہ حصہ جہاں جہاں سے منگول تاتار اور ترک اُٹھے دلاور سپاہیوں، جنگجو بہادروں اور برق رفتار گھوڑوں کے لئے تاریخ عالم میں مشہور ہے۔ اس وقت کے منگولوں میں رواج تھا کہ قبیلہ کے سردار کے بیٹوں کی شادیاں دور دراز کے قبیلے کے سرداروں کی بیٹیوں کے ساتھ کرتے۔ اِس طرح اُن کی نسل تازہ دم رہتی اور مختلف علاقوں کے با اثر سردار مددگار اور دوست بن جاتے۔ اس خیال کے مدنظر چنگیز خان کی نسبت وادیٔ سیچین کے سردار کی بیٹی بورتہ سے ہوئی جس کا علاقہ چین کے بالکل قریب تھا۔ اور اُن کا چینی سوداگروں

سے لین دین تھا، چنگیز خان اس وقت نو سال کا تھا۔ اور اس کی منگیتر برتہ دس سال کی تھی۔ چنگیز خان کا نام تیموجن ایک بہادر تاتار کے نام پر رکھا گیا تھا بارہویں صدی کا پردہ اٹھایئے تو معلوم ہوگا کہ چنگیز خان کا ایک ادنیٰ سپاہی صوبہ تائی بہادر سے کو ریا فتح کرنے کے بعد شاہ محمد کو شکست دی سمرقند سے جارجیا پہنچا اور اسے فتح کرتا ہوا بحیرۂ کیسپین کے کنارے گھوڑے دوڑاتا چند سال بعد روس، پولینڈ، ہنگری، سرویا، بلغاریہ سب کو زیر نگیں کرنے کے بعد "ویانا" کے دروازے پر جا دستک" دی۔

ماضی سے پھر حال کی طرف آنا پڑا۔ ترجمان کے ساتھ یہاں کی بڑی بڑی دکانیں دیکھیں۔ دکانوں میں روسی مصنوعات زیادہ تھیں کھانے پینے کی کچھ چیزیں "ہینوئی" سے بھی تھیں۔ مثلاً پھلوں کے ٹین اور کیلوں کے مربّے وغیرہ۔ کچھ چین کے اطلس اور کمخواب بھی موجود تھے لیکن بہت مہنگے تھے۔ سوچا کہ کچھ تو وہاں کی یادگار چیز لی جائے۔ قدیم زمانے کے آرٹ کے نمونے تو خرید نہیں سکتے تھے اگر مل بھی جاتے تو ان کی بلیک مارکیٹ کی قیمت کون ادا کرتا۔ اسی ترجمان نے ایک چھوٹی سی دکان دکھائی۔ ایک بوسیدہ الماری میں ایک قدیم زین اور لگام چاندی کے کام کی نظر آئی۔ سوچا کہ خرید لوں عثمٰن میاں کو ایسی چیزیں بہت پسند ہیں مگر جب قیمت معلوم کی تو فقط پانچ ہزار تغرق تھی اور ایک قدیم شکستہ سی تلوار کی بوتل جس پر شکستہ ہی مونگے کا ڈھکنا تھا اور اس پر کچھ قدیم منگولی زبان میں لکھا ہوا تھا قیمت صرف پانچ سو۔ مجبوراً ایک نئی دکان سے جو سیاحوں کیلئے بنائی گئی ہے اور جس میں صرف ڈالر کا کاروبار ہے چند چیزیں ملتی ہیں۔ مثلاً منگولی لباس، جو یورپین عورتیں بہت شوق سے خرید کر ہاؤس کوٹ یا شام کے لباس کی صورت میں پہنتی ہیں۔ فرکوٹ۔ چمڑے کے بٹوے۔ اونی قالین، (جیسے ہمارے بلوچی نمدے) دھات تانبے اور چاندی کے چائے کے پیالے۔ مجھے چاندی کا ایک کٹورہ نما پیالہ پسند آیا جو دہلی کا نقشی کٹورہ معلوم ہوتا تھا اس پیالے میں خوشی کی تقریبات میں چائے پی جاتی ہے۔ میں نے سوچا عثمٰن میاں کے لئے ایک پیالہ خرید لوں۔ ان کے سکّہ کو تغرق کہتے ہیں پیالے کی قیمت تیس ڈالر کے برابر ہے ...... جو مہنگی سہی لیکن چلئے تقریب کچھ تو ہو وہاں کی جو یاد رہے۔

چند چھوٹی چھوٹی اور متفرق روغنی مٹی کی رنگین پیالیاں خریدیں تحفتاً دینے کے لئے۔ چار ڈالر کی پیالی چھوٹی سی۔ جب ایاز اور میں اس فضول خرچی کے بعد ہوٹل آئے تو سجاد صاحب حسب عادت بہت ناراض ہوئے کہ یہ کیا مٹی کی بیکار پیالیاں اٹھا لائی ہو۔ ان سے کہیں بہتر ہمارے گجرات میں پیالے ملتے ہیں۔ میں نے کہا جناب درست! لیکن ان کی کیا بات ہے یہ تو تاریخی پیالے ہیں

غزل

پیرزادہ عاشق کیرانوی

حیراں ہوں اپنے دیدۂ حیراں کو کیا کہوں
دیکھوں تجھے تو پھر مہِ تاباں کو کیا کہوں

نقش و نگارِ بزمِ نگاراں کو کیا کہوں
پھولوں کا ذکر کیا ہے گلستاں کو کیا کہوں

امکاں نہ گفتگو کا رہے جب کسی طرح
اس وقت اس کی جنبشِ مژگاں کو کیا کہوں

نسبت رہی نہ کوئی جہانِ خراب سے
سنگِ درِ حبیب کے عرفاں کو کیا کہوں

مشکل بہت ہے گو ترا ملنا جہان میں
پھر بھی خیالِ وصل کے امکاں کو کیا کہوں

اپنا حصارِ ذات ہی کیا کم ہے دوستو
دیر و حرم کو کیا کہوں، زنداں کو کیا کہوں

مانوس ہو گئے ہیں غمِ روزگار سے
آزردگانِ گردشِ دوراں کو کیا کہوں

رکھا نہ اہرمن نے کسی کام کا مجھے
لیکن خیالِ رحمتِ یزداں کو کیا کہوں

جب خود کو دیکھتا ہوں تو عاشقؔ ہوں سوچتا
آوارگانِ کوچۂ جاناں کو کیا کہوں

اُردو شاعری میں آزاد نظم اور نثری نظم کی تحریکیں

ایم فیروز شاہ

ژاں پال سارتر نے ایک بار کہا تھا :۔

"...... ہر عہد اپنے وقت میں بھرپور طریقے سے
زندگی کا احساس دلاتا ہے۔"

ہر دور کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی رجحانات اس وقت کی اقدارِ حیات کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ کسی دور کا ادب اس زمانے کے رجحانات کا عکاس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری میں نظم جدید یا آزاد نظم کی تحریک پابند نظم کی مسلمہ روایات کے خلاف علمِ بغاوت کے طور پر ابھری۔ کیونکہ وہ دور پابندیوں اور قیود کا تھا۔ اور ہر نوجوان اور حساس ذہن معاشرے کے سیاسی، سماجی اور ادبی رجحانات سے بیزار نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ اُردو ادب میں بھی بغاوت کا عنصر در آیا اور شاعری کی مروجہ روایات اور قواعد کو چیلنج کر دیا گیا۔

انیسویں صدی کے اواخر تک اردو شاعری کی معنوی ترتیب مسلّمہ قواعد و ضوابط کی حدود میں مقیّد رہی تھی۔ رنگینیٔ الفاظ اور صوتی دلکشی کو اعلیٰ تخیّل اور معنوی حسن پر بالعموم ترجیح دی گئی تھی۔ انیسویں صدی میں دنیا میں ایک فکری انقلاب آیا۔ یعنی مارکس۔ فرائیڈ۔ آئن سٹائن۔ میکس پلانک ایسے مفکرین کے نظریات دنیا کے سامنے آئے۔ اگرچہ یہاں ہمیں ان نظریات کی اصلیت اور صداقت سے کوئی غرض نہیں۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ ان نظریات کی وجہ سے لوگوں میں زندگی کو نئے زاویوں سے دیکھنے کا شعور پیدا ہوا۔ اس کا ہمارے پڑھے لکھے طبقے پر کافی نمایاں اثر ہوا .... اور ہیئت اور مواد کے بارے میں ذہنوں میں انتشار (CONFUSION) پیدا ہو گیا۔ سرسید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ اور شبلی نعمانیؔ کے نثری اور شعری کاوشیں اسی دورِ انتشار کی نمائندگی کرتی ہیں کہ ایک طرف تو ان کی ہمدردیاں ملکہ وکٹوریہ کے زمانے اور غزل کے پیٹرن (PATTERN) سے وابستہ تھیں۔ اور دوسری طرف وہ ہیئت پر مواد کی ترجیح، نظم کے میدان میں نئے تجربات اور نثر میں روشن ضمیر اور روشن دماغ برصغیر کے علمبردار تھے۔ یوں ان کے ہاں نئے عہد کی معنوی ترتیب کا ادراک بے حد مبہم ہے۔ تاہم اس ابہام اور کنفیوژن کو ہم سنگِ میل یوں کہہ سکتے ہیں کہ اردو نظم کو پہلی دفعہ ایک مستقل اور واضح بنیاد میسر ہوئی جس نے اردو شاعری کو ایک نئی فضا میں لا کھڑا کیا۔ اور یہ گویا تازہ ہوا کا ایک ایسا جھونکا تھا جو بند کمرے میں مقیّد انسان کو اچانک دروازہ کھلنے پر بغل گیر ہو کر نوید جاں فزا

سناتا ہے ——— آگے چل کر انہی بنیادوں پر ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔

ترقی پسند تحریک کا بنیادی نصب العین بھی یہی تھا کہ انسان کے مسائل کا تعلق کسی مافوق الفطرت ہستی سے نہیں بلکہ برصغیر پر مسلط سامراجی نظام سے ہے۔ انسان کا استحصال کرنے والے تمام ادارے درحقیقت ادب دشمن ہیں ——— پس ایک ایسے ادب کی ترویج کی جائے جو براہِ راست انسانی مسائل سے متعلق ہو ——— ہیئت اور مواد دونوں اس مقصد کے مرہونِ منت ٹھہرے۔ اور یوں ادب برائے زندگی کا نعرہ لگایا گیا۔ اس ادب برائے زندگی کے توسط سے پھر ادب نے سماجی رجحانات سے خاصا اثر قبول کیا۔

اور اس عہد کی سیاسی، سماجی اور ادبی اقدار کے خلاف ذہنوں میں پکنے والا لاوا اظہار کی راہ پا کر بہہ نکلا۔ نوجوان ذہن جو انتشار کا شکار تھے انہوں نے کھلم کھلا سماجی روایات سے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ انہیں معاشرہ ایک ایسا قفس محسوس ہو رہا تھا۔ جس میں انہیں حبسِ دوام کی سزا سنا کر بھیج دیا گیا ہو۔ چنانچہ انہوں نے معاشرے سے بغاوت اور فرسودہ قیود کے خلاف آواز بلند کی ——— ادب میں اس کا لازمی نتیجہ یوں ظہور پذیر ہوا کہ جدید شعراء نے غزل کی مروجہ ردیف اور قافیہ کی بندشوں سے آزادی کا اعلان کر دیا۔

انہوں نے نظم جدید کو قافیہ ردیف کی قید سے چھڑانے کا جواز کچھ یوں پیش کیا کہ ——— شاعری دراصل پروازِ تخیل اور رعنائی خیال کا نام ہے۔ جذبے کو اس کی پوری شدت کے ساتھ منظرِ عام پر لانا تخلیقِ شعر کا عمل کہلاتا ہے۔ لیکن پابند نظم میں قافیہ ردیف کی پابندی کی وجہ سے خیال مجروح ہو جاتا ہے اور شاعر خیال کی بجائے قافیہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

چنانچہ آزاد نظم کے نام سے ایک نئی صنفِ شعر معرضِ وجود میں آئی۔ جسے نظم جدید بھی کہا گیا اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی زبان میں نظم غیر مقفیٰ بھی ——— آزاد نظم میں قافیہ ردیف کی پابندیوں سے آزادی کے باوصف اوزان کا خیال رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کا ایک مخصوص صوتی آہنگ نمایاں طور پر برقرار رہا۔

شروع شروع میں آزاد نظم کی شدید مخالفت کی گئی ——— ایک اعتراض یہ بھی ہوا کہ یہ محض چند باغی نوجوانوں کے فکری انتشار کا نتیجہ ہے اور بس ——— لیکن، جیسا کہ میں نے کہا ہر عہد کا ادب اپنے دور کے سماجی رجحانات کی عکاسی کرتا اور ان سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ ادیب یا شاعر اپنے زمانے سے کٹ کر نہیں جی سکتا ——— چنانچہ یہ تحریک بھی اپنے وقت کے رجحانات کا ماحصل تھی ———

آزاد نظم کے بانیوں میں تین نام بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ ن۔م۔ راشد، میراجی اور تصدق حسین خالد۔ ان میں سے خالد نے اگرچہ کسی خاص تخلیقی اپج کا مظاہرہ نہیں کیا تاہم ان کی بعض نظمیں خاصی اچھی ہیں۔ لیکن راشد اور میراجی کی نظمیں اس عہد کے ان باغی رجحانات کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں جو نوجوان اور حساس ذہنوں میں لاوے کی طرح کھول رہے تھے۔ ن۔م۔ راشد اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں۔

درختوں کی شاخوں کو اتنی خبر ہے
کہ ان کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں
مگر ان میں ہر شاخ بزدل ہے
یا مبتلا خود فریبی میں شاید
کہ ان کرم خوردہ جڑوں سے
وہ اپنے لئے تازہ نم ڈھونڈتی ہیں

میراجی کی ایک نظم "شام کے راستے پر" میں واضح طور پر سماج کے خلاف نفرت کے جذبات ملتے ہیں۔

اور دل کہتا ہے یہ درد دل سوختہ ہے
ایک گھنگھور سکوں ——— ایک کڑی تنہائی
میرا اندوختہ ہے

مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ دنیا مٹ جائے
مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ بے کار سماج
اپنی پابندی سے دم گھٹ کے فسانہ بن جائے
میں ہوں آزاد ـــــ مجھے فکر نہیں ہے کوئی
ایک گھنگھور سکون ـــــ ایک کڑی تنہائی
میرا اندوختہ ہے

آزاد نظم روایات کے خلاف بغاوت کا وہ تند و تیز ریلا تھا۔ جو اپنے راستے میں آنے والے ہر بند کو ریت کی مانند بہالے گیا اور آج جبکہ اردو ادب کے تمام اہل رائے، اہلِ قلم آزاد نظم کو بطور ایک صنفِ شعر کے تسلیم کر چکے ہیں، ایک نئی تحریک آہستہ آہستہ ابھر رہی ہے ـــــ جسے اس کے حامی "نثری نظم" کا نام دیتے ہیں اور جس کے بارے میں ملتاز شاعر انور مسعود کا کہنا ہے۔

اس کی حالت کرتی تھی کچھ ایسی ہی غمازی
اس کے لئے یہ تازہ صدمہ آفتِ جاں ہے گویا!
اس سے پہلے کبھی نہ اس نے اتنے اشک بہائے
نثری نظم کا سن کر یارو بہت کبیرا رویا!

دراصل اردو ادب میں یہ تحریک انگریزی ادب کی پروز پوئم (PROSE POEM) سے متاثر ہو کر شروع کی گئی ہے۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں شعریت ہونے کے باوصف شعری آہنگ موجود نہیں ہوتا جو "نظم" کا لازمی اور شناختی عنصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معروف شاعر ریاض مجید نے اس صنف کے لئے "نثم" کا نام تجویز کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اگر ایسی تحریروں کو "نثمیں" کہہ لیا جائے تو کیسا رہے؟ اس لفظ میں ہیئت کا ½ نثری پن اور تخلیقی مواد کا ½ متنثری پن (نثر سے نث اور نظم سے م) موجود ہے۔ یوں یہ تعریف اسم با مسمّٰی بھی ہو گی اور خالصتاً نثر و نظم ہی نہ ہو گی۔"

لیکن اس صنفِ ادب کے حامی اسے نظم ہی کہلوانے پر مصر ہیں اور اس سلسلے میں عجیب عجیب توجیہات پیش کر رہے ہیں۔ مثلاً اس تحریک کے ایک نمایاں پرچارک مبارک احمد کا کہنا ہے:

"میرے نزدیک فن کی دنیا میں آئندہ کے لیے قواعد اور پیمانے وضع کرنے والے حقیقتاً مجرم اور غدّار تھے۔" (فن کی نئی توضیح۔ مطبوعہ نوائے وقت)

"نثری نظم" کے ایک اور موید انیس ناگی کا کہنا ہے:

"شاعر کا جذباتی مجادلہ، انفرادیت اور انا کے باوجود زندگی کی قبولیت کے حوصلے سے پیدا ہوتا ہے اور اس تجربے کی ترسیل کے لئے امیج (IMAGE) یا خیال بنیادی چیز ہے۔ اس کا متنوع استعمال آج کا موثر ترین ذریعہ ہے۔"

نثری شاعری کے باوا آدم افتخار جالب کی مرتبہ کتاب "نئی شاعری" میں اس قسم کی بہت سی باتیں کہی گئی ہیں جن میں کئی "شعرا" نے اعلان کیا ہے کہ:

"ہمارا جذبۂ خودی انتہائی گہرا اور وسیع ہے جس کے متحمل پرانے اوزان نہیں ہو سکتے۔"

ایک اور "نثری شاعر" فہیم جوزی کہتے ہیں۔

"مروّجہ شعری اسلوب آج کے جذباتی بحرانوں اور معاشرتی سطح پر جنم لیتی ہوئی متضاد حقیقتوں کے اتصال سے طلوع ہوتے ہوئے رابطوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ زندگی اب کسی ترل ترل کی نغمگی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اوزان اور بحور فرد کے احساسات کے تنوع کا ساتھ نہیں دے سکتے کہ LYRICISM کا دور اب لد گیا۔"

سعادت سعید بھی نثری نظم کی حمایت میں یوں دلیل دیتے ہیں:-

"اصل مسئلہ شعری ہیئت کا نہیں، مواد کا ہے۔ ہر
عہد مخصوص موضوعات کا عہد ہے۔ اور ہر موضوع
اپنے جلو میں اپنی ہیئت لاتا ہے۔ نثری نظم ہمارے
عہد کے عظیم اور تازہ موضوعات کا مکمل اظہار کر سکتی
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کے نوجوانوں نے اس
صنف کو اپنے لئے منتخب کیا ہے۔"

ان صاحبانِ فکر کی آرا کی روشنی میں اس امر کا اندازہ لگانا
محال نہیں کہ نثری نظم اوزان کی حدود سے مکمل ترین آزادی کا
نام ہے اور اس کے حامی محض خیال کی بلند پروازی کو ہی شاعری
کی اولین و آخریں صفت گردانتے ہیں۔ ان کی اس منطق پر بیشمار
اعتراضات کئے گئے ہیں اور تاریخِ ادب کے حوالے سے "نثری نظم"
کو "انشائے لطیف" کہا گیا ہے۔ معروف ادیب اور ممتاز شاعر
جناب احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا اور صہبا لکھنوی کے
بقول "نثری نظم" چند مستثنیات کو چھوڑ کر بطور ایک علیحدہ
صنفِ ادب کے ابھی تک اپنا وجود تسلیم نہیں کرا سکی۔ ڈاکٹر وزیر آغا
نے اسے "نثرِ لطیف" کا نام دیا ہے اور اردو ادب کی تاریخ سے
حکیم یوسف حسن اور ڈاکٹر تاثیر وغیرہ کی تحریروں کا انتخاب دے کے
یہ ثابت کیا ہے کہ نثرِ لطیف پہلے بھی لکھی جا رہی تھی۔ اس وقت اسے
فقط انشائے لطیف ہی کہا گیا۔ ورنہ اپنی ہیئت اور مواد کے لحاظ
سے وہ بالکل وہی چیز ہے جسے آج کل "نثری نظم" کہا جا رہا
ہے...... پس اسے اس کی اصل ہیئت یعنی نثر کی طرح لکھا جانا
چاہیئے۔ تاکہ اس صنفِ ادب کا دوسری اصناف میں گڈمڈ ہونے
کا خدشہ تشنۂ تکمیل ہی رہے ـــــ کیونکہ دراصل یہ بعینہٖ وہی
چیز ہے۔ جو آج سے پہلے نثری صف میں شمار کی جاتی رہی....
اگرچہ یہ پہلے بھی لکھی جاتی رہی لیکن یہ دور اس کی پذیرائی کا دور
ہے اور اس کی وجہ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"نثرِ لطیف اس نئے منطقے کی سیاحت کے لئے نہایت موزوں
ہے۔ جو علم کی حدود کے وسیع اور ذہنی افق کے کشادہ ہونے کے
باعث موجودہ صدی میں نمودار ہو رہا ہے۔"

معروف شاعر حضرت احسان دانش اس صنفِ ادب کے
بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

"اسے جدید نثر یا نثرِ جدید کہہ لیجیے۔ کیونکہ میرے
نزدیک وہ شاعری ہی کیا ہوئی...... جس کے لئے
کہا جائے ساتواں شعر سناؤ تو شعر سنا نہ سکے۔ اور
اگر تجربہ کرنا ہے تو اسے نظم کا نام ہی کیوں دیا
جائے؟"

ذوالفقار احمد تابش کہتے ہیں۔

"نثری نظم کے نام سے آج کل جو پیش کیا جا رہا
ہے اسے نثری صنف کے طور پر قبول کرنے کو ہم تیار
نہیں۔ اگر آج "نثری نظم" لکھی جا سکتی ہے تو پھر
"نثری غزل" کیوں نہیں۔؟ نثری قصیدہ کیوں
نہیں؟"

"نثری نظم" کی حمایت میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ
شاعری کا مقصد عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنا ہے تاکہ معاشی
تبدیلیوں کے لئے ان کے ذہنوں کو تبدیل کیا جا سکے اور چونکہ
پابند اور آزاد نظم کی قیود ابلاغ کے راستے کا پتھر ہیں لہٰذا نثری
نظم لکھی جانی چاہیئے ـــــ ڈاکٹر وزیر آغا نے اوراق کے سالنامہ
میں بڑی خوبصورت بات کہی ہے ـــــ لکھتے ہیں ـــــ

"ہماری رائے میں اگر واحد مقصد عوامی رابطے کی
مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرنا ہے تو پھر اس کے
لئے نظم قطعاً کارآمد نہیں بلکہ نثرِ لطیف بھی
بے کار ہے۔ کیونکہ اظہار کے یہ سارے سانچے
اپنے بالواسطہ انداز اور تخیلی پیکروں کے حوالے
سے بات کرنے کے رویے کے ابلاغِ عام کے ان

مدارج تک کہاں پہنچ سکتے ہیں جن تک صرف کاروباری زبان کو رسائی حاصل ہے۔ مثلاً کسی جلسے کا ایک شعلہ بیان مقرر اپنی نثر سے جو کام لیتا ہے وہ نظم یا نثرِ لطیف دونوں کے بس کا روگ نہیں ـــــ کیونکہ ادب قاری کو" دو اور دو چار" قسم کے ابلاغ سے نہیں بلکہ اپنی پُر اسرار خوشبو، لطیف آہنگ اور نئی سرزمینوں کی سیاحت کے عمل سے متاثر کرتا ہے اور یوں قاری کے سارے جذباتی نظام کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔"

آخر میں معروف شاعر اور ادیب سید ضمیر جعفری کی موضوعِ زیرِ بحث پر رائے اغلباً حرفِ آخر کے طور پر پیش کرنا چاہوں گا۔ آپ کا کہنا ہے،

"فی زمانہ نثری نظم کا کمنڑاگ بڑے طمطراق سے پیش کیا جا رہا ہے۔ دل چاہے مانے نہ مانے۔ دماغ چاہے نہ قبول کرے مگر نثری نظم کا شاعر سامعین کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گیا ہے کہ ؎

میں بھی شاعر ہوں تمہارا مجھے تسلیم کرو
مجھ کو ہر بات گوارا مجھے تسلیم کرو"

بہرحال اپنا اپنا نظریہ ہے .... اپنی اپنی سوچ ہے .... تاہم اس امر سے انکار کسی اہلِ قلم کو نہ ہوگا کہ نثری نظم یا نثرِ لطیف بہرطور ایک صنفِ ادب ہے۔ بلکہ ہر اہلِ ذوق ایسی تخلیقات کے لئے دامنِ دل کشا اور چشمِ شوق وا رکھے گا .... تاہم بحیثیت ایک صنف کے اس کے مقام کا تعین غور طلب مسئلہ ہے۔ جس پر تمام اہلِ فکر اصحاب کو صحت مند جذبے کے تحت مل کر سوچنا چاہیئے اور یہ کبھی ہوگا جب انتہا پسندی کا راستہ ترک کر کے اعتدال اختیار کی جائے گی ٭

غزل

ارشاد ارشی

ایک ہی شخص بدلتا رہا پیکر کتنے
مری آنکھوں نے دکھائے مجھے منظر کتنے

بیج تم آج کدورت کے جو بو جاؤ گے
کل کو ہو جائیں گے یہ پیڑ تناور کتنے

مرے ہونٹوں پہ ہمیشہ سے بپا بدچپ ہے
زلزلے ہیں مگر روح کے اندر کتنے

جس کا چہرہ تھا چہکتے ہوئے پھولوں جیسا
اُس نے ہاتھوں میں چھپا رکھے تھے پتھر کتنے

اپنی رائے کا ہی اظہار کیا تھا میں نے
آستینوں سے نکل آتے ہیں خنجر کتنے

گھیر لیتی ہیں مجھے یوں تری خوش کن یادیں
جیسے بیٹھے ہوں منڈیروں پہ کبوتر کتنے

ایک بھی وار نہ آندھی کا یہ سہہ پائیں گے
پیڑ یوں تو نظر آتے ہیں تناور کتنے

اس کے تو خواب ہیں پتھر کے زمانے جیسے
آئے انساں کی ہدایت کو پیمبر کتنے

سوکھے پتے کی طرح اب ہیں ہوا کی زد میں
ہم ہوا کرتے تھے ارشی کبھی خود سر کتنے

غزل

ڈاکٹر سید حسین جعفر حلیم

آج کچھ درد بھرے نالے زباں تک پہنچے
دیکھئے اس کا اثر کتنا وہاں تک پہنچے

جبکہ عقل و خرد و ہوش کے پر جلتے ہوں
فہم و ادراک ہے کیا شے جو وہاں تک پہنچے

میکدے چھان لئے دیر و حرم دیکھ لئے
جستجو میں تری ہم دیکھ کہاں تک پہنچے

بزم میں آج نہ محروم ہمیں رکھ ساقی
دُردِ ساغر ہی سہی تشنہ دہاں تک پہنچے

اپنی محرومیٔ قسمت کا گلہ کس سے کروں
بے اثر جبکہ ہر اک بات وہاں تک پہنچے

دامنِ ضبط و تحمل کہیں چھوٹے نہ حلیم
نیشِ بے مہریِ قاتل رگِ جاں تک پہنچے

افسانہ

منٹو کا افسانہ ــ ایک تجزیہ

از آغا سلمان باقر

منٹو کا افسانہ کلرک، مزدور، طوائف، کشمیر، بمبئی، دہلی، لاہور، فلم اسٹوڈیو، کالج، بازار، ہوٹل، بچے، جوان، بوڑھے، عورتوں، مردوں کی ذہنی اور جنسی الجھنوں کی واضح نشاندہی کرتا ہے اور اس سلسلے میں یہ ایک علامت بن جاتا ہے، وہی علامت جو معاشرے کا ناسور ہے۔ منٹو کے افسانے کا فن مختلف موقعوں کے اظہار پر ایک نئی لطافت اور گداز پن کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے۔ بعض کرداروں کا ذکر وہ جس ادائے خاص سے کرتے ہیں، وہ ادا ہر موقع پر نمایاں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہنے اور بعض رموز آشکار کرتے ہیں منٹو کو ٹھیٹ الطف اور مزا آتا ہے۔

منٹو کے فن کی معراج "احساس" کا ادراک ہے، ان احساسات کو پھیلانے کے لئے وہ تخیل، فکر اور ذہنی کاوش کو بروئے کار لاتے ہیں اور جس حد تک وہ اپنے فن سے رشتہ جوڑتے ہیں اور ذہنی کاوشوں کی بدولت اظہار و ابلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے ان کے ہاتھ آتے ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں مصنف کا تخیل اور فکر، جو حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزا اور عناصر ہیں، ابلاغ کے وسائل میں نت نئے رنگ بھرتے ہیں۔ یہی انداز منٹو کے افسانے کا اسلوب ہے اور یہی خصوصیت اور عمل دخل کے ساتھ تحریر کے انہی پہلوؤں کا انوکھا پن اور اس رنگ کی شوخی ہمیشہ قائم رہتی ہے انہی باتوں سے فنکار کے فن ارتقا کا سراغ مل جاتا ہے۔

افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے مختلف موضوع اور ہیئت رکھتا ہے اور وہ اس لحاظ سے منفرد اکائی اور امتیازی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور اس میں واضح طور پر صرف ایک چیز کی ترجمانی، وضاحت، مصوری ہوتی ہے ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، غرض افسانے میں جو کچھ پایا جائے وہ ایک مرکز رکھتا ہے، عام طور پر افسانہ نگار افسانے کی بنیادی ضروریات اور خصوصیات سے غفلت برت کر افسانے تحریر کر دیتے ہیں اور پھر وہ افسانے قاری کے ذہن پر گہرا اثر نہیں چھوڑتے، افسانے کی حقیقی خصوصیات کو اردو کے افسانہ نویس پریم چند نے مد نظر رکھا ہے۔ منٹو کا افسانوی مطالعہ، ایک ہمہ گیر مشاہدہ ہے اور منٹو ماحول کے انتہائی نازک اور باریک پہلو کو افسانے کا پس منظر اور نقطۂ عروج بناتے ہیں اور اس کے واقعات کے کردار اس پس منظر میں اس طرح جذب ہوتے ہیں۔ جیسے وہ لازم و ملزوم ہیں۔ منٹو کے افسانے میں یہ سارا علم عموماً ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لئے کام میں لایا جاتا ہے۔ اسی طرح کے افسانوں میں نیا قانون خوشیا نعرہ اور نیا سال پڑھنے کے بعد افسانہ نگار (منٹو) کے تخیل، فکر اور تجزیہ حیات کا عکس آنکھوں میں گھوم جاتا ہے اور پھر یہی عکس یا تصور قاری کے ذہن پر کردار کا تصور، ذہنی کیفیت

کا نقش بٹھاتا ہے۔ منٹو کے افسانے پڑھتے ہوئے ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی ان گنت ان دیکھی اور ان دیکھی تصویروں کا ادراک ہوتا ہے لیکن افسانہ ختم کر لینے کے بعد یہ نقوش بھی رخصت ہو جاتے ہیں لیکن پڑھنے والے کے ذہن پر ایک تاثر چھوڑتے ہیں جس سے قاری کو معاشرے کے حقائق کو سمجھنے میں زیادہ آسانی محسوس ہوتی ہے۔ اِن افسانوں کے کردار واقعاتی اور نفسیاتی رنگا رنگی کے باوجود ایک جذباتی کیفیت کا اظہار ہیں اور پھر جو کردار آتا ہے وہ ایک مخصوص مزاج اور منفرد خصوصیات کا عکس ہوتا ہے۔ لیکن افسانے کے اختتام کے بعد صرف ایک تنہا منا تاثر اور واقعہ ذہن کے پردوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ منٹو کے افسانے کی یہ نمایاں خصوصیات ہیں جو ان کے فن کی معراج ہیں۔

منٹو کے افسانے کا فن مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا بھی محسوس ہوتا ہے۔ ان منزلوں میں بعض ترقی کی ہیں اور بعض تنزل کی، لیکن منٹو نے ہر منزل پر اپنے منصب کو یاد رکھا ہے وہ بات کو ایک مکمل افسانے میں قاری کے ذہن تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس میں وہ کامیاب و کامران لوٹتے ہیں افسانہ نگاری کے اس بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہیئے۔ لیکن اس واحد تاثر کو قائم رکھنے کے لئے مختلف فنی اور تکنیکی وسیلوں کی شدت سے ضرورت ہے اور یہ وسیلے اگر پوری ذمہ داری اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے جائیں تو فن کے تاثر کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے اور اس طرح افسانے کی وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

اِس فنی بحث میں افسانے کی تمہید کا ذکر بھی آتا ہے افسانے کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم اور دشوار منزل ہے۔ افسانہ نگار اگر افسانے کی ابتدا میں اپنے قدم گاڑ کر رکھے اور تاثر کے عمل کو تیز تر اور شدید کر دے تو آئندہ کا باقی افسانہ، اس تمہید کے باعث فن کی منزلیں خیالات سے قدم سے قدم ملا کر طے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمدہ افسانہ نگار اپنے افسانے کی تمہید سے غفلت نہیں برتتے۔ تمہید کے باعث آدھے سے زیادہ افسانہ سمٹ کر چند فقروں میں سمو یا جاتا ہے اور سعادت حسن منٹو نے اپنی

جیسے اس میں پائی ہے۔ تمہید کی دلکشی اور الفاظ اور خیال کی کشش قاری کو افسانہ پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ منٹو کے افسانے کی تمہید ایک مکمل افسانہ ہے اور یہ تمہید قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے اُسے جذباتی جمالیاتی، اور ذہنی سطح پر محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ اپنے اندر کچھ لئے ہوئے ہے افسانہ "پہچان" کی تمہید ملاحظہ ہو:-

"—— ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیسی وہسکی
کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور
ایک ایسی عورت تلاش کی جائے جو ہوٹل اور وہسکی کے
پیدا کردہ تکدر کو دور کر سکے۔"

"—— پہچان ——"

مذکورہ تمہید میں نہ کسی کردار کا تعارف ہے۔ اور نہ کسی فضا اور ماحول کا ذکر ہے۔ نہ کوئی خبر ہے اور نہ ہی چونکا دینے والا انکشاف ہے۔ یہ اک کا اشارہ جو تمہید کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ قاری کو مستقبل کا احساس دلاتا ہے اور معصوم قاری فوراً افسانے کے اس جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ ایک دوسرے افسانے میں تمہید کا انداز ملاحظہ ہو۔

"—— دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی بستر پر لیٹی تھی
اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی،
جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارتی تھی، ابھی ابھی ہڈیاں
پسلیاں جھنجھوڑ کر، شراب کے نشے میں چور، گھر کو واپس گیا
تھا۔ وہ رات کو یہیں ٹھیر جاتا، مگر اُس کو اپنی دھرم پتنی
کا بہت خیال تھا جو اُس سے بے حد پریم کرتی تھی۔"

منٹو نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا ہے۔ اور اپنے ترکش کے ہر تیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا ہے۔ انہی تیروں میں سے ایک تیر اُس کے افسانے کی تمہید ہوتی ہے، جو ہر افسانے میں نیا کام کرتی ہے۔ کردار کو متعارف کرنے کا، ایک خاص فضا یا ماحول کا، ایک پھڑکتی ہوئی خبر سنانے کا، کسی کردار کی ذہنی کشمکش کی مصوری کرنے کا آنے والے واقعات کے لئے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی یکسر

کئی سلے جلے مطالب پورے کرے گا، لیکن ان گونا گوں کاموں کے علاوہ جو کام منٹو کے افسانے کی ہر تمہید نے اپنے ذمہ لے لیا ہے یہ ہے کہ قاری کے ذہن کو بیدار کرے، اُس کے دل میں گدگدی پیدا کر سکے یا اس کے ذہن میں آگے بڑھنے کی خواہش پیدا کر کے افسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔ منٹو کی فنی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور یہ منزل طے کرنے کے لئے اس نے پورے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تمہید افسانے کا آغاز ہے اور افسانے کی آخری منزل یا انجام بھی تمہید کی اس نوعیت کے تحت افسانہ نگار تمہید سے قاری کے ذہن اور دل پر قبضہ کرتا ہے اور افسانے سے دلچسپی لینے پر مجبور اور مائل کرتا ہے۔ افسانے کے آنے والے حصے سفر کی کٹھن منزلیں ہیں اور اس بھولے ہوئے مسافر (قاری) کو منزل تک پہنچانے کے لئے ایک گائیڈ یا رہبر ہوتا ہے جس کا نام ہے افسانہ نگار۔ یہی افسانہ نگار ہر افسانے میں مختلف کرداروں میں ظاہر ہوتا ہے، پھر افسانہ نگار کو ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے، جو فنی حیثیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی ہو اور قابل قبول بھی۔ افسانے کے خاتمے پر افسانہ نگار کی ذرا سی سستی، ذرا سی تن آسانی، ذرا سی غفلت یا تھوڑی سی سہل انگاری افسانے کا خون کر دیتی ہے۔ افسانہ، واقعات کی ایک مربوط زنجیر ہوتا ہے، جس کا پہلا سرا، آخری سرے سے اور ہر سرا ایک دوسرے سے پیوستہ ہوتا ہے۔ اگر یہ پیوستگی ترتیب سے نہ ہو تو افسانے کے نشیب و فراز، کوفت اور خلش کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔ منٹو نے اپنے افسانوی فن میں انجام کی ان نزاکتوں، کو پوری طرح محسوس کرنے کے بعد "انجام" سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کسی بھی افسانہ نگار کے فن کی پختگی کا اندازہ کرنے کے لئے آغاز یا تمہید کے بعد انجام کی منزل کو دیکھ لینے سے افسانے کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ منٹو اس میں کہاں تک کامیاب و کامران ہوئے ہیں اس کا فیصلہ بھی ایک افسانے کا انجام پیش کرتا ہے:۔

"وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔
تھوڑی دیر کے بعد اُس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔"

"مجھے زندہ رہنا ہوگا۔"
"اس کے اس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے اس کی تھکی ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔"

(شہ نشین)

ایک دوسرے افسانے کا انجام ملاحظہ ہو:۔
"پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فوراً ہی سب معاملہ صاف ہو گیا۔ سیوا جی، میری غیر حاضری میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپا مار گئے تھے۔"

(میرا اور اُس کا انتقام)

اُن کے ہر افسانے کا انجام ایک نفسیاتی اور جذباتی کشمکش کا اسیر ہے منٹو نے جذبات، نفسیات اور فن سے رشتہ جوڑنے اور انہیں مضبوط بنانے میں ہمیشہ اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔

منٹو کو فن کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اسی لئے ان کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مراحل طے کرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں ایک منطقی جواز پیدا کرتا ہے اور مربوط و مبسوط انداز میں قاری کے سامنے کہانی پیش کرتا ہے اس منطق کا احساس قاری کو نہیں ہوتا لیکن وہ اس کے تاثر سے متاثر اور مسرور ضرور ہوتا ہے۔ منٹو کا افسانہ شروع ہونے کے بعد نہایت دھیمی اور پرکشش چال چلتا ہے اُس کے قدم، نرم اور توانا ہوتے ہیں جس طرح وہ آگے بڑھتا ہے اُسی طرح وہ دل و دماغ پر قبضہ مستحکم کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی دھیمی اور نپی تلی چال افسانے کے انجام پر آجاتی ہے اور افسانہ شروع سے آخر تک اس کا ساتھ انتہائی آرام سے دیتا ہے اور قاری اسی باعث اختتام پر ایک طرح کا سکون محسوس کرتا ہے اور ایک بے نام سی سوچ یا احساس، اس کے ذہن میں جنم لیتی ہے یہی سوچ یا احساس افسانہ نگار سعادت حسین منٹو کے افسانے کی فنی، تمہیدی اور اختتامی کامیابی کی دلیل اور وضاحت ہے۔

افسانہ

دمکتی لہریں

اکبر کاظمی

شیردل پہاڑ کے دامن میں بہتے ہوئے دریا کے کنارے بیٹھا تھا اور ہاتھ میں بکریاں ہانکنے والی چھڑی پکڑے پانی کی لہروں سے کھیل رہا تھا وہ حد سے زیادہ مغموم تھا اُسے رہ رہ کر لالی کا خیال ستا رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ لالی کبھی اتنی دیر نہیں لگاتی تھی وہ ہر روز دوپہر ہوتے ہی یہاں پہنچ جایا کرتی تھی آج نہ جانے کیا بات ہے کہ دن ڈھلنے کو آیا لیکن وہ ابھی تک نہیں آئی اس نے ایک لمبا اور گہرا سانس لیا اور زرد ہو گیا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں لالی کا بھائی ہاتھ میں تیشہ لئے کھڑا اُس کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

شیردل نے سوچا کہ اس کو یہاں سے فوراً بھاگ جانا چاہیئے لیکن پھر اُسے فوراً اپنا وہ عہد یاد آگیا جو اُس نے اسی دریا کے کنارے اور اسی مقام پر لالی سے کیا تھا جب لالی نے نم آلود نگاہوں سے بڑے پیار بھرے انداز میں شیردل سے کہا تھا شیردل میرا بھائی طوطی گل بڑا ظالم ہے اور پھر تمہارے خاندان سے ہمارے خاندان کی پرانی دشمنی بھی تو چلی آ رہی ہے اگر خدا نخواستہ طوطی گل کو ہماری محبت کی خبر ہو گئی تو پھر تم مجھے ..... اور شیردل نے لالی کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا لالی میں خاندانی آدمی ہوں جب تک میرے دم میں دم ہے میں تم کو نہیں بھولوں گا میں تم کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں تم سے کبھی بے وفائی نہیں کروں گا۔ اس کے ذہن میں وہ تمام باتیں ایک پل کے اندر گھوم گئیں۔

اُس نے ذرا دل کڑا کر کے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنی طبیعت پر پوری طرح قابو پاتے ہوئے طوطی گل کی طرف بڑھا اُس نے مسکرا کر کہا۔ "کہو طوطی گل کیسے آئے؟" اور طوطی گل نے بڑی تمکنت کے ساتھ اپنے تیشے کو فضا میں لہراتے ہوئے کہا "شیردل تمہارے دن بُرے آ گئے ہیں میں نے بہت چاہا کہ تم حرام کی موت نہ مرو لیکن تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے اور مجبوراً مجھے یہ قدم اٹھانا پڑ رہا ہے تیار ہو جاؤ اب مرنے کے لئے"

شیردل کے ذہن میں وہ تمام باتیں گھومنے لگیں جو اُس کو کبھی کبھی اس کا چچا جبر دستایا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا شیردل تم ابھی بچے ہی تھے کہ تمہارے والد نے طوطی گل کے بوڑھے دادا کو قتل کر دیا تھا اور پھر وہ گاؤں سے بھاگ کر انگریز کی فوج میں بھرتی ہو گیا تھا لیکن اللہ کا کرنا کچھ ایسا ہی تھا کہ تمہارا والد چار سال فوج میں رہنے کے بعد جنگ میں انگریزوں کی طرف سے لڑتا لڑتا مارا گیا طوطی گل کے والد نے کئی مرتبہ مجھ پر حملہ کیا لیکن یہ میری قسمت تھی کہ میں ہر بار اُس کے حملے سے بچ نکلا اور پھر جب مجھے تمہارا خیال آتا تو میرا کلیجہ منہ کو آجاتا کہ میرے بھائی کی تم نشانی ہو اور پھر تمہاری جان کی خاطر میں نے جرگہ میں درخواست دے کر جرگہ کے سامنے طوطی گل کے باپ سے معافی مانگ لی اس کی

آنکھیں یہ باتیں کرتے کرتے نم آلود ہوجاتیں اور وہ کہا کرتا شیر دل تم میرے بھائی کی نشانی ہو دیکھو تم ان سے زیادہ نہ ملا کرو تمہارا ان سے زیادہ ملنا اچھا نہیں یہ ایک نہ ایک دن خرابی کا باعث ہوگا لیکن شیر دل اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا وہ کیا کرتا کہ وہ تو لالی کو دل دے بیٹھا تھا وہ اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا تھا اور پھر لالی بھی تو شیر دل کو دل وجان سے چاہتی تھی لالی نے کئی مرتبہ شیر دل سے کہا تھا کہ شیر دل عورت صرف ایک دفعہ ہی محبت کیا کرتی ہے میں تمہاری ہوچکی ہوں صرف تمہاری لیکن دیکھنا تم کہیں مجھ کو چھوڑ نہ دینا کہ میں تو اب تمہارے بغیر نہیں جی سکوں گی اور پھر وہ دونوں اکثر سوچا کرتے کہ ہماری محبت کا کسی اور کو علم نہ ہو لیکن عشق اور مشک چھپائے سے بھی کہیں چھپتے ہیں آخر لالی کے خاندان کو اس بات کا علم ہو ہی گیا کہ شیر دل لالی سے محبت کرتا ہے اور پہلے تو طوطی گل نے کافی پیچھا کیا وہ کسی طرح دونوں کو باتیں کرتے پکڑے اور دونوں کا کام تمام کردے لیکن شیر دل بھی اس سے باخبر تھا اس نے لالی کے گھر آنا جانا بند کردیا اور اب ان کی ملاقاتیں بجائے گھر کے دریا کے کنارے ہونے لگیں شیر دل بکریاں چرانے آتا تو لالی گھر سے موقع پاکر دوپہر کو وہاں پہنچتی اور دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن آخر ایک دن بوڑھے جمعہ خاں نے ان کو یہاں دیکھ لیا جمعہ خاں خود تو کمزور آدمی تھا وہ تو کیا کرتا لیکن وہ ایک عرصہ سے طوطی گل کے خاندان کے ٹکڑوں پر گذارا کر رہا تھا وہ طوطی گل کے گھر کا کام کاج کرتا ان کے بیلوں کی حفاظت کرنا دیکھ بھال کرتا اور بس دو وقت کا کھانا کھا لیتا وہ نمک حرام نہیں کہلانا چاہتا تھا کہ وہ اس واقعہ کو نظرانداز کردیتا۔

اس نے سارا ماجرا طوطی گل کو کہہ سنایا اور طوطی گل ایک دفعہ پھر آپے سے باہر ہوگیا اس نے کافی کوشش کی کہ وہ دونوں کو موقع پر پکڑ سکے لیکن ایسا نہ ہوسکا اور آخر اس نے ایک دن تنگ آکر اپنے دل سے یہ فیصلہ کیا کہ وہ آج شیر دل کو زندہ نہیں چھوڑے گا وہ گھر سے کھانا کھاکر اپنی حویلی میں آیا تو وہاں اُس کا باپ اور چاچا دوسرے گاؤں سے آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ معروف گفتگو تھے اس نے چپکے سے تیشہ اُٹھایا اور دریا کی جانب چل دیا لیکن نہ جانے نواب خان کو ایکدم کیا سوجھی کہ اُس نے زمان سے کہا کہ تم جلد جاؤ اور طوطی گل کو واپس بلا لاؤ اور زمان تیزی سے طوطی گل کے پیچھے ہوگیا۔

اگر وہ چند منٹ بھی دیر کردیتا تو معاملہ بگڑ چکا تھا طوطی گل نے جونہی شیر دل پر تیشہ اٹھایا پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ کر اس کو اپنی طرف کھینچ لیا اس نے مڑ کر دیکھا کہ اس کا چچا زمان تھا "پاگل ہوگئے ہو کیا؟ حویلی میں چلو وہاں ساتھ والے گاؤں سے جمیل خاں صاحب آئے ہوئے ہیں جن کے لڑکے جبرو کی پورے علاقے میں دھوم مچی ہوئی ہے کہ وہ پڑھ لکھ کر نہ صرف بڑا بابو بن گیا ہے بلکہ اب وہ جج بھی بن گیا ہے وہ اس خوشی میں سارے گاؤں کو دعوت ہی دینے نہیں آئے بلکہ انہوں نے سب خاندانوں کو حویلی میں اکٹھا کر رکھا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم سارے گاؤں کو بھائیوں کی طرح رہنا بھی سکھانا چاہتے ہیں ہم سب کے پرانے اختلاف بھی ختم کرائیں گے اور آج تمام خاندانوں کی آپس میں صلح کراکر ہی واپس جائیں گے کہ انسانی برادری بھیڑیوں کی طرح زندگی نہ گذارے حویلی میں سب لوگ اکٹھے ہوچکے ہیں بس اب تمہارا اور شیر دل کا انتظار ہے میں تم دونوں کو لینے کے لئے آیا ہوں جلدی چلو جب وہ تینوں حویلی میں پہنچے تو اُس وقت ایک عجیب منظر تھا کہ سب لوگ آپس میں گلے مل رہے تھے اور جج صاحب کے چچا مراد خاں کہہ رہے تھے کہ میرا بیٹا کہتا ہے میں علم کی روشنی اپنے تمام بھائیوں کے گھروں میں پہنچا کر ہی دم لوں گا۔ اب شام ہو رہی تھی اور حویلی کے چراغوں کی روشنی دور دور تک سارے ماحول پر نور بکھیر رہی تھی"۔

افسانہ

لانپو

سلیم خان گمی

یہ ایک تاریک رات تھی اور لانپو حویلی میں منتظر کھڑی تھی حویلی جو گاؤں سے دو فرلانگ دور تھی۔

یہ ایک سرحدی گاؤں تھا۔ شکر گڑھ سے مشرق کی جانب دس میل کے فاصلے پر۔ اس گاؤں سے آگے سرکنڈوں اور ایوے کا جنگل تھا۔ اور اس جنگل میں پاکستان اور ہندوستان کی سرحدی پٹی تھی۔ سرحدی پٹی کی دونوں جانب دونوں ملکوں کے محافظ دن رات پہرہ دیتے تھے۔ سرحدوں کے یہ محافظ جان پر کھیل کر اپنا فرض پورا کرتے تھے۔ لیکن ایک خطرہ تاریک راتوں میں مجسم ہو کر ان کے سروں پر منڈلاتا تھا اور یہ تھا اسمگلنگ کا خطرہ۔ چاندنی راتوں میں اسمگلنگ ختم ہو جاتی لیکن تاریک راتوں میں قاچاق کی یہ قسم اپنے شباب پر ہوتی۔ اور یہ ایک تاریک رات تھی اور لانپو حویلی میں کھڑی تھی۔ حویلی جو گاؤں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔

لانپو شیر خان کی گھوڑی تھی جس کے ذریعے وہ اسمگلنگ کرتا تھا اور شیر خان پورے سرحدی علاقے کا بدنام ترین اسمگلر تھا۔ وہ چرس کا دھندا کرتا تھا۔ وہ کئی بار پکڑا گیا۔ سزا ہوئی۔ جرمانے ادا کئے لیکن اسمگلنگ کے کاروبار سے باز نہ آیا۔ یہ دھندہ اس کے خون میں کچھ اس طرح سے رچ بس گیا تھا کہ صرف موت ہی اسے کالے کاروبار سے الگ کر سکتی تھی۔ طبعی موت بہت دور تھی کیونکہ وہ ابھی بوڑھا نہ ہوا تھا۔ اس کا جسم مضبوط تھا اور اس میں ابھی چیتے کی سی پھرتی تھی۔ اس کی آنکھیں آنکھیں نہ تھیں دو الاؤ تھے جن سے شعلے لپکتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے پاس لانپو تھی جو آواز سے زیادہ تیز بھاگتی تھی اور شیر خان کی سیٹی کا مفہوم سمجھتی تھی!

لانپو ایک سدھائی ہوئی گھوڑی تھی اور اپنے مالک اور کام کو خوب سمجھتی تھی۔ شیر خان اسے بستی کے میلہ مویشیاں سے ایک بوڑھے بلوچ سے خرید کر لایا تھا اور اسے سال بھر سدھاتا رہا تھا۔ وہ سرحدی علاقے اور سرحدی پٹی کے انچ انچ سے واقف تھی۔ ایک بار شیر خان نے شام کے وقت لانپو کو دس میل دور ایک گاؤں میں کھلا چھوڑ دیا اور خود ایک دوسرے راستے سے ایک دوسرے گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے گاؤں آ گیا۔ اگلے دن سویرے اس نے دیکھا کہ لانپو حویلی میں کھڑی ہے۔ ایک تاریک رات جب وہ چرس بیچ کر سرکنڈوں کے جنگل میں سے آ رہا تھا تو سرحدی محافظوں نے اس پر فائرنگ کی۔ اس نے گھوڑی سے چھلانگ لگائی زمین پر گرا، سیٹی بجائی اور گھوڑی سرپٹ بھاگ گئی۔ سرحدی محافظ گھوڑی کے پیچھے بھاگے اور شیر خان جنگل میں چھپتا چھپاتا اپنے ایک دوست کے پاس دوسرے گاؤں چلا گیا۔ سویرا ہونے سے پہلے گھوڑی حویلی میں تھی!

کہا جاتا ہے کہ ایک رات شیر خان چرس لے کر سرحد پار جانے والا تھا کہ پیٹ کے درد کی وجہ سے نڈھال ہو گیا۔ اسے درد سے اتنی پریشانی نہ تھی جتنی اس بات سے کہ جس سکھ اسمگلر سے وعدہ کیا ہے وہ کیا سوچے گا؟ اور ممکن ہے وہ اسے وعدے کا کچا آدمی سمجھنے لگے۔ چنانچہ اس نے چرس دو تھیلوں میں ڈال کر لانبو پر رکھ دی اور آدھی رات کو اسے حویلی سے باہر نکال دیا۔ دوسرے دن سویرے لانبو واپس آ گئی۔ دونوں تھیلوں میں انڈین کرنسی تھی اور ساتھ یہ رقعہ کہ چرس اصلی ہے اور پوری ہے جن لوگوں کو اس بات کا پتہ چلا انہوں نے برملا کہا کہ لانبو انسان سے زیادہ سمجھدار ہے اور انسان سے زیادہ وفادار بھی.....

لیکن شیر خان ہر بار اس طرح کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا کیونکہ اسے لانبو کی عقلمندی اور وفاداری پر تو اعتبار تھا لیکن ہندو اور سکھ سمگلروں کی نیت پر یقین نہ تھا اس لئے اسے لانبو کے ساتھ تاریک راتوں میں سرکنڈوں کا جنگل پار کر کے سرحد پار جانا پڑتا تھا۔ اور یہ پندرہ تاریک راتوں میں پہلی تاریک رات تھی اور لانبو حویلی میں کھڑی تھی۔ حویلی جو گاؤں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔

رات جب بارہ کا عمل ہوا تو شیر خان کمر سے پستول باندھے آیا اور چرس کے تھیلے لانبو پر رکھ کر سرحد کی طرف چل پڑا۔ یہ کالا کاروبار پندرہ دن جاری رہا وہ کبھی شام کو روانہ ہو جاتا کبھی رات دس بجے کبھی رات بارہ بجے کبھی آدھی رات کے بعد۔ چاند کے گھٹنے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی روانگی بندھی ہوئی تھی اور پھر چاندنی راتیں آ گئیں اور چاندنی راتوں کے ساتھ شیر خان کا بیٹا سردار خان بھی آیا، جو لاہور کے ایک کالج میں ایف اے کا طالب علم تھا۔

سردار خان گاؤں آیا تو ایک دن گلی میں اس کا سامنا عارفہ سے ہوا جو اس کی منگیتر تھی اور ایک دوسرے گاؤں میں آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی۔

"عارفہ! پڑھ کر کیا بنو گی؟" سردار خان نے پوچھا

"کچھ بھی نہیں" وہ شرما کر بولی

"میں تو بی اے کر کے فوج میں کپتان بن جاؤں گا" سردار خان بولا

"کپتان بن کر کیا کرو گے؟" عارفہ نے پوچھا۔

"ملک کی حفاظت کروں گا۔ سرحد پر پہرہ دوں گا" وہ سینہ تان کر بولا

"تایا جان تو مہینے میں پندرہ بار سرحد پار جاتے ہیں۔ پہلے ان کو روکو" عارفہ نے دو ٹوک کہا۔

"مجھے یہ بات آج مولوی صاحب نے بھی بتائی ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ اصل قصور ابا جان کا نہیں۔ لانبو کا ہے اگر لانبو نہ ہو تو ابا جان سمگلنگ نہیں کر سکتے" سردار خان بولا۔

"تو دونوں کو روکو" عارفہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"دونوں کو روک دوں گا"

"وعدہ کرو"

"وعدہ رہا"

اور سردار خان جلدی جلدی قدم اٹھا کر حویلی کی طرف چل پڑا۔ لانبو حویلی میں اکیلی تھی سردار خان کو معلوم تھا کہ اس کا باپ اپنا پستول کہاں چھپاتا ہے۔ اس نے حویلی کی ایک تاریک کوٹھڑی میں جا کر لکڑی کے صندوقچے سے پستول نکالا۔ کمر کے ساتھ باندھا اور باہر آ کر لانبو پہ زین ڈال کر اس پر سوار ہو گیا۔ لانبو کا رُخ سرحد کی طرف تھا۔

سرکنڈوں کے جنگل میں جا کر اُس نے لانبو کو کھڑا کیا اور نیچے اترا۔ پستول نکالا اور لانبو پر تابڑ توڑ سات فائر کئے۔

جب سرحدی محافظ سردار خان کے پاس پہنچے لانبو دم توڑ چکی تھی۔

اگلے دن شیر خان نے گاؤں والوں کو چوپال میں بلایا اور سمگلنگ سے توبہ کا اعلان کیا۔ ساتھ ساتھ اس نے گاؤں والوں کو عارفہ اور سردار خان کی منگنی توڑنے کا بھی فیصلہ سنایا۔

ماہِ نو

مدیر اعلیٰ: بیگم مسرت برکی
مدیر: فضل قدیر
نائب مدیر: سید علی محمد حسینی

جولائی۔ اگست ۱۹۷۶ء
جلد ۲۹ —— شمارہ ۴

چندہ سالانہ: [illegible] روپے
فی پرچہ: ڈیڑھ روپیہ

اس شمارے میں

ابتدائیہ

......تعمیرِ جہاں خیز

وقت دبے پاؤں پانی کے سرسراتے ہوئے ریلے کی طرح گذر جاتا ہے۔ گذری ہوئی گھڑیاں فضا کے غار میں مدفون ہو جاتی ہیں لیکن ان لمحات سے وابستہ یادیں ہمارے تخیل و تفکر میں کہکشاں بن کر چمکتی ہیں اور ان کی روشنی ہمیں نئی منزلوں کی آگہی و بصیرت عطا کرتی ہے۔ ؎

سنو! سنو! کہ کہکشاں سنا رہی ہے داستاں
وہ داستاں کہ ہم جسے کہیں حدیثِ کن فکاں

پاکستان کی عظیم مہم حضرت قائدِ اعظمؒ کی ولولہ خیز قیادت میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو فتح و نصرت کے پھریرے اڑاتے سر ہوئی اور دُنیا کی پانچویں سب سے بڑی اسلامی مملکت معرضِ وجود میں آگئی۔ قدم قدم پر اپنی منزلیں تراشتا تجلیوں کا یہ قافلہ کتنا تابناک تھا۔ آج بھی لوگوں کی نگاہوں میں گورنر جنرل ہاؤس سے قائدِ اعظم کی بصورت جلوس مجلس قانون ساز میں تشریف آوری انتقالِ اقتدار کی رسم کا منظر زندہ ہے۔ لوگوں کی یادوں میں انصار و مہاجرین کا مثالی وہ بھائی چارہ بھی زندہ ہے جسے دیکھ کر دُنیا دنگ رہ گئی تھی اور اللہ والوں نے کہا تھا مدینہ کی تاریخ ارضِ پاک میں دہرائی گئی ہے۔

آج ہم پاکستان کے تیسویں جشنِ استقلال پر جب پورے قومی افق کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کو مضبوط و مستحکم بنانا قیامِ پاکستان کی مہم سے کسی طرح کم عظیم مہم نہیں اور یہ مہم بلا شبہ سر کر لی گئی ہے۔ پاکستان کو اب کسی داخلی انتشار کا خطرہ نہیں۔ اس کے عوام جاگ اٹھے ہیں۔ انہیں دوبارہ ایک عظیم قیادت میسر آگئی ہے اور وہ جو آج سے بہت پہلے شاعرِ مشرق نے کہا تھا "معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز" تو اقبال کے مخاطب معمارِ حرم کے لئے تعمیرِ جہاں کے امکانات ہر طرح روشن ہو چکے ہیں، ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ لیا گیا ہے۔ علاقائی تعصبات اور قبائلی اور گروہی مفادات کی ہولناک آندھی ختم ہو چکی ہے اور اب تعمیر کے نئے افق ہمارے منتظر ہیں اسلامیانِ عالم کی شیرازہ بندی کی سعادت بھی عوامی حکومت کو میسر آئی اور اب وہ اندرونی استحکام، اقتصادی ترقی اور کامیاب خارجہ حکمتِ عملی کے ساتھ تیسری دُنیا کی چارہ جوئی کیلئے آگے بڑھ رہی ہے۔ سفینۂ پاکستان کا جیالا ناخدا تند موجوں سے کھیلتا اپنی ملت کے کارواں کو ساحلِ مراد کی طرف لئے بڑھ رہا ہے۔ ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ اس عظیم جدوجہد میں اپنا کردار ادا کرے اور اپنے محبوب راہنما کے ہاتھ مضبوط کرے۔

ہمیں توقع ہے کہ ملت کا ہر فرد ایک مرتبہ پھر پاکستان کی عظمت و وقار کی خاطر اپنے آپ کو وقف کر دینے کا عہد کرے گا۔ خدا ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

یومِ آزادی اور کشمیر

خواجہ غلام دین وانی

بیورلی نکولس (BEVERLY NICHOLAS) نے ۱۹۴۴ء میں اپنی مشہور کتاب ورڈکٹ آن انڈیا (VERDICT ON INDIA) میں لکھا تھا:

"یہ تصوراتی مملکت (پاکستان) ہر مسلمان کے ذہن میں موجود ہے اور وہ دن دور نہیں کہ یہ ایک دھماکے کے ساتھ دنیا کے نقشے پر ایک حقیقت بن کر ابھرے۔ مسٹر جناح اس انقلاب آفریں دور کے ہیرو ثابت ہوں گے۔ دس کروڑ مسلمان ان کے ایک اشارۂ چشم پر سب کچھ کر گزرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ شرف کسی اور کو اس ملک میں حاصل نہیں ہے۔"

۳ جون ۱۹۴۷ء کو لوگ ابھی نیند سے بیدار ہی ہوئے تھے کہ آل انڈیا ریڈیو نے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا اعلان سنایا کہ برطانوی حکومت نے تقسیم ہند کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مسلمانوں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو چکا ہے لیکن قائدِ اعظم محمد علی جناح کی قیادت ان کے خلوص، ذکاوت و فراست، ذہانت و معقولیت، اخلاص اور تدبر کا یہ ایک منہ بولتا اعجاز تھا اور اب مسلمانوں کی امیدوں اور آرزوؤں نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔

مغل سلطنت کے زوال کے بعد ۱۸۵۷ء کے ہولناک اثرات نے مسلمانوں کی [illegible] سیاسی [illegible] میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ [illegible] پھر سے ایک آزاد اور خود مختار قوم بن کر اُٹھے۔ ہندوؤں کی [illegible] مسلمانوں سے بھی بڑھ کر تھی وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے اکھنڈ بھارت کا سپنا یوں یکلخت ٹوٹ جائے گا۔ فرمانِ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے "مومن کی فراست سے ڈرنا چاہیئے۔" اس کی سچائی آج ہر ایک کے سامنے تھی اور آج قائد اعظم کی عظیم شخصیت اپنی تمام تر وسعتوں اور ضیاء پاشیوں کے ساتھ ہر ایک کی آنکھوں میں تھی۔ اُن کے متعلق بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو نے کیا خوب پیشین گوئی کی تھی:

"کون ہے جو رازہائے فردا کو منکشف کر سکے؟ کون ہے جو ان خفیہ قوتوں کو حیطۂ نگاہ میں لا سکے، جو سرگرمِ عمل ہو کر بعض اوقات ہمارے خواب و خیال کو حقیقت میں تبدیل کر دیتی ہیں پھر بھی شاید کتاب مستقبل میں مرقوم ہو چکا ہے کہ وہ جو اپنی اولعزمی سے مسلمانوں کا گھوکھلے بننا چاہتا تھا۔ ہماری قومی جدوجہد کے شاندار اور نازک صورتِ حال میں ہندوستان کی آزادی کا میزبنی (اطالیہ کا نجات دہندہ) بن کر غیر فانی ہو جائے گا۔"

مسلمان قوم کو بہر حال اپنے سہل انگار ماضی کا کفارہ ادا کرنا تھا۔ انہیں آزمائشوں کی بھٹی میں سے کندن بن کر نکلنا تھا۔ انہوں نے مسلسل قربانیاں کیں، مصائب سہے اور خاک و خون سے گذر کر ایک ایسی مثالی مملکت تک پہنچے جہاں وہ اپنا سَر اٹھا کر چل سکتے تھے، جہاں وہ اپنے مذہب کے بتائے ہوئے راستہ پر اپنی زندگیاں گذار سکتے تھے۔ آج اگر کوئی پاکستان کے استحکام یا کشمیر کی آزادی کے بارے میں کچھ وہم رکھتا ہے تو اس کو ۱۹۴۰ء اور

۱۹۴۷ء کا درمیانی دور تصور میں لانا چاہیئے۔ جب برصغیر کی آزادی کا ساحل دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن مسلمانوں کو اپنی آزادی کی منزل کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی اور خطرہ دم بدم بڑھ رہا تھا، کہ وہ اکثریت کے بحرِ فنا میں گم ہو کر رہ جائیں گے۔ لیکن قوم کو وہ قیادت میسر آ چکی تھی جس کا صدیوں سے انتظار تھا۔

جب ۳ رجون کے پلان کا اعلان ہوا تو ریاست جموں کشمیر کے طول و عرض میں مسلمانوں کے دلوں میں جوش اور ولولے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جموں کے قلعہ باہو سے لے کر سری نگر کے قلعہ ہری پربت تک کی فضا پاکستان زندہ باد، قائدِاعظم زندہ باد کے روح پرور نعروں سے گونج اٹھی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی تاریخی قراردادِ پاکستان کے بعد ان کی اپنی تحریکِ آزادی کا دھارا برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک میں مل چکا تھا اور اب ریاست کی مسلم تحریک بھی درحقیقت تحریکِ تکمیلِ پاکستان ہی تھی۔ کشمیری عوام کو یقین تھا کہ ریاست کی ڈوگرہ شاہی ۸۰ فیصد مسلم آبادی کی امنگوں کو کچل نہیں سکتی اور نہ ریاست کے جغرافیائی، اقتصادی اور تاریخی حقائق کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ کشمیری مسلمانوں کے دلوں میں قائدِاعظمؒ کا یہ فرمان جو انہوں نے مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ سری نگر، ۱۷ جولائی ۱۹۴۴ء سے خطاب کرتے ہوئے دیا تھا، گونج رہا تھا:

"عزت کا ایک اور صرف ایک راستہ ہے، وہ ہے اتحاد و اتفاق۔ ایک پرچم، ایک نصب العین، ایک پلیٹ فارم۔ اگر آپ نے یہ حاصل کر لیا تو آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ مسلم لیگ اور ہماری خدمات، تائید و حمایت آپ کے قدموں پر ہو گی۔"

کشمیری مسلمانوں کے قلب و جگر میں اپنے اس محسنِ حقیقی کے الفاظ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کانگریس نے خطرے کو بھانپ لیا لیکن ڈوگرہ راجہ اپنی جگہ کشمکش و پیچ میں تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے زبردست دباؤ تھا کہ مہاراجہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ مسلمانوں کے منشا کے مطابق کرے۔ چنانچہ ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل نے یہ قرارداد پاس کی کہ ریاست جموں و کشمیر ہر اعتبار سے پاکستان کا جزو لاینفک ہے۔ اس لئے مہاراجہ پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کرے۔ مسلم کانفرنس کے علاوہ کسان، مزدور کانفرنس اور دیگر سیاسی جماعتوں اور عظیم شخصیتوں جیسے پنڈت پریم ناتھ بزاز وغیرہ نے مہاراجہ کو یہی رائے دی۔ سیاسی کشمکش اپنے عروج پر تھی کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا تاریخی دن آیا۔ اس دن فرزندِ کشمیر شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کے مقدس خواب کی عملی تعبیر حضرت قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کے ہاتھوں ہوئی۔ قائدِاعظم کو کشمیر اور کشمیری عوام سے والہانہ محبت تھی۔ وہ کشمیر سیر و سیاحت کیلئے نہیں جاتے تھے کشمیر کے مسلمانوں کی نبضیں ٹٹولنے اور ان کے دلوں کی دھڑکنیں سننے جاتے تھے۔

۱۷ جولائی ۱۹۴۴ء کے مسلم کانفرنس کے تاریخی سالانہ اجلاس میں جب غازی انور اکبر آبادی اپنے مخصوص پرجوش ترنم سے فضا پر چھائے ہوئے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ وقت کی رفتار رک گئی ہے، وہ بڑے والہانہ انداز میں پڑھ رہے تھے۔ ؎

ملت ہے فوج، فوج کا سردار ہے جناح
اسلامیوں کے ہاتھ میں تلوار ہے جناح
ملت تھی بے زبان، زبان مل گئی جناح
شوقِ جہاد قوم کا اظہار ہے جناح
"مولانا" وقفِ دہر ہیں۔ "علامہ" ذہن غیر
یہ سب غبارِ راہ ہیں کہسار ہے جناح
دشمن ہزار ادھر، تن تنہا ہے یہ ادھر
بے باک ہے، غیور ہے، خوددار ہے جناح
باطل سے جنگ، حق کا تحفظ، فلاحِ عام
گر دینِ حق یہی ہے، تو دیندار ہے جناح

اب دیکھ آنکھ کھول کے، اور دور دور دیکھ
اے قوم تا دیدۂ بیدار ہے جناح
ہر سُو بلند ہوئی صدا زندہ باد کی
اسلامیانِ ہند کا سردار ہے جناح

اس وقت ہر مسلمان مجسم پاکستان بنا آنے والے اس دن کا منتظر تھا جس دن صدیوں کا اندھیرا چھٹنے والا تھا۔ جس دن حقیقی آزادی کا اجالا ہونے والا تھا۔ اور جب وہ دن ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو طلوع ہوا تو کشمیری مسلمانوں کی بے پایاں خوشی اور مسرت جنون کی حد کو چھو رہی تھی۔ ساری ریاست شادمانی کے نشے میں جھوم رہی تھی۔ سری نگر شہر کا یہ سماں تھا کہ ہر گھر پر ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ گلی کوچوں میں پاکستان زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔ سری نگر کا پہلا پُل امیرا کدل جو شہر کا سب سے ستھرا اور فیشن ایبل علاقہ تھا عجب منظر پیش کر رہا تھا چوک میں مسلمانوں کا ہجوم ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہلالی پرچم یوں تو ہر جگہ لہرا رہا تھا لیکن رسمی طور پر اُس کو لہرانا تھا۔ اس مقصد کے لئے مشہور ہوٹل گیسٹ ہاؤس کو منتخب کیا گیا۔

مظفر آباد کے نوجوان رحمت اللہ خان چغتائی کا یہ ہوٹل سیاسی گرمیوں کا مرکز تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہی ہوٹل پاکستان کے جاں نثاروں کا بھی اڈہ تھا۔ جہاں راقم، قریشی محمد یوسف مرحوم، محمد اسمٰعیل ساغر، غلام محی الدین رہبر، خواجہ غلام احمد ترالی، خواجہ غلام محی الدین ترنبو، میر عبدالعزیز ایڈیٹر ملت، محمد امین حیدر اور دوسرے قائدِ اعظم کے شیدائی نوجوان پاکستان کے بارے میں اپنی جدوجہد کے منصوبے بناتے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ، خواجہ غلام محمد صادق، بخشی غلام محمد نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کی بھی یہی بیٹھک تھی۔ لیکن ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے دن ماڈرن گیسٹ ہاؤس کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ رحمت اللہ چغتائی کی تو خوشی بیان سے باہر تھی۔ گول مٹول چہرے پر اکڑی ہوئی مونچھیں، اور سر پر طرحدار پگڑی کا لہراتا ہوا طرہ لئے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ ہلالی پرچم بلند ہوتے ہی اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد اور قائد اعظم زندہ باد کے فلک شگاف نعرے یہ ایک ناقابل فراموش منظر تھا۔ بلاشبہ چغتائی ریاست کا خوش قسمت ترین انسان تھا۔ لیکن اکتوبر ۱۹۴۷ء کی خزاں کے ساتھ چغتائی کو بھی اپنی خوش بختی کی خزاں دیکھنا پڑی۔ اپنے وطن میں بھارتی فوجوں کی موجودگی پر فخر کرنے والے غداروں نے رحمت اللہ چغتائی سے سارے بدلے چکا دیئے۔ اور آخر وہ اپنے پاکستان میں چلا آیا۔

شہر کے ڈاک خانوں اور تار گھروں پر جس طرح ہلالی پرچم بلند کئے گئے اور رات کو چراغاں کیا گیا وہ ایک الگ داستان ہے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو سری نگر بلاشبہ ایک دُلہن نظر آ رہا تھا۔ مسلمانوں نے مسجدوں میں نمازِ شکرانہ ادا کی، جشن منایا اور مساکین میں کھانا تقسیم ہوا۔ سری نگر کے علاوہ بارہ مولہ، بانڈی پورہ، سوپور، بیجباڑہ، اسلام آباد، شوپیاں، جموں، پونچھ، باغ، مظفر آباد، اوڑی، اپاہی، راجوری اور کشتواڑ میں جلسے ہوئے۔ ہلالی پرچم لہرائے گئے۔ اور قراردادوں کے ذریعے ڈوگرہ حکمران پر واضح کیا گیا کہ ریاست جموں و کشمیر مسلم اکثریت کی ریاست ہے اور جغرافیائی، مذہبی، اقتصادی و تاریخی طور پر پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ کشمیری مسلمانوں کی پاکستان سے اس والہانہ محبت کا شعلہ آج بھی بھڑک رہا ہے۔ کشمیر کے بارے میں قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلم کانفرنس کے ڈل گیٹ کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا "کشمیر ایشیا کی انگوٹھی کا نگینہ ہے۔" ظاہر ہے کہ قائد اعظم کے ان احساسات کی تکمیل اُس وقت ممکن ہے جب اہلِ کشمیر کو آزادی اور خود ارادیت کا حق مل جائے اور وہ پاکستان میں کشمیر کے "کاف" کو عملی شکل دیں اور سامراجی شکنجے سے رہائی حاصل کریں۔ یہ منزل موجودہ پُرعزم قیادت کو دیکھتے ہوئے کچھ دُور نہیں اور اس میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ قائد عوام پاکستان ہی کے نہیں مقبوضہ کشمیر کے عوام کے بھی ہیرو ہیں۔ انھوں نے مسئلہ کشمیر کو سرد خانے سے نکال کر پھر زندہ کر دیا اور جہاں ملت کے بہت سے مسائل ان کے ہاتھوں سلجھے ہیں وہاں یہ عظیم مسئلہ بھی ان ہی کے ہاتھوں سلجھے گا۔

اِک دانش نورانی اِک دانش بُرہانی

(عالمی مسائل پر قائدِ عوام کا ایک انٹرویو)

ترجمہ: ادارہ

وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو سے ویانا (آسٹریا) کے اخبار ووخن پریس (WOCHEN PRESSE) کے چیف فارن ایڈیٹر ڈاکٹر وسیان۔ او۔ میزیل نے ۱۹ مارچ کو راولپنڈی میں ایک ملاقات کی اس ملاقات کے دوران وزیرِ اعظم نے جو انٹرویو اس مشہور صحافی کو دیا اس کی تفصیل قارئین کی آگہی کے لئے ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

ایڈیٹر: جناب والا جب کوئی شخص مشرق بعید اور مشرقِ قریب کی سیاحت کرتا ہے تو اُسے بحرِ ہند میں ایک خلاء نظر آتا ہے جس میں عظیم طاقتیں اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے کی متمنی محسوس ہوتی ہیں۔ کیا یہ امر پاکستان جیسی کچھ چھوٹی قوموں کے لئے خطرہ کا باعث نہیں؟

وزیرِ اعظم: یہ امر اپنی ذات میں کوئی خطرہ نہیں بنتا۔ خطرہ تو قوت کے اس توازن سے پیدا ہوتا ہے جو آج دنیا میں قائم ہے بڑی طاقتیں بحرِ ہند میں موجود ہوں یا نہیں، کمزور ممالک ہمیشہ خطرات کی زد میں ہوں گے۔ یقیناً ان کی موجودگی خطرے میں اضافہ کا باعث تو ہو سکتی ہے لیکن خطرہ پیدا نہیں کرتی۔

میری رائے میں یہ حریفانہ کشمکش اور یہ طویل عرصے کی موجودگی بڑی شدت اور سرگرمی کے ساتھ جاری رہے گی۔

آپ جانتے ہی ہیں کسی بات کی تمنا کرنا اور اقوامِ متحدہ میں جا کر پُر تقدس قرار دادیں پاس کروانا ایک علیحدہ بات ہے اور حقائق کا سامنا کرنا جدا بات ہے۔ بہرحال حقیقت اپنی جگہ موجود ہے اور میری رائے میں جیسے جیسے وقت گذرے گا یہ صورتِ حال وسیع تر اور شدید تر ہوتی جائے گی۔

ایڈیٹر: آپ نے مختلف مواقع پر پاکستان کے ہندوستان کے ساتھ تعلقات کی راہ میں تین مسائل کو حائل قرار دیا ہے۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ان پر مجموعی انداز میں بات چیت ہونا چاہیئے یا علیحدہ علیحدہ۔

وزیرِ اعظم: ہندوستان کے ساتھ میں نے شملہ مذاکرات میں پہلے ہی ان مسائل پر ہندوستان سے گفت و شنید کی بات مسترد کر دی تھی۔ ہندوستان کی جانب سے ایک تجویز یہ تھی کہ ہم اپنے مسائل بالمقطع انداز میں (پیکیج ڈیل) حل کرنے کی کوشش کریں میں نے ان سے کہا کہ ہمارے مسائل بہت پیچیدہ ہیں اور یہ مسائل و معاملات اتنی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ کہ انہیں ایک پیکج انداز میں حل نہیں کیا جا سکتا ان کے لئے ہمیں مذاکرات کا دائرہ وسیع تر کرنا ہوگا پہلے چھوٹے مسائل حل کرنا ہوں گے اور ان کے حل ہو جانے سے جو خود اعتمادی اور خیر سگالی پیدا ہوگی اس سے پھر ہم بڑے مسائل کی طرف پیش قدمی کریں گے۔

ایڈیٹر: جناب والا کیا آپ مشرقِ وسطیٰ کے مسئلہ کو حل کرنے کے

لئے قدم بہ قدم پیش قدمی پسند فرمائیں گے ؟

وزیراعظم: وہ ایک بالکل ہی مختلف نوعیت کا معاملہ ہے جیسا کہ میں نے کہا آپ کو ہر صورت حال کی سیٹنگ کو دیکھنا ہوگا۔ ہر صورت حال کی اپنی مختلف نوعیت کی سیٹنگ ہوتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس معاملہ کے لئے مرحلہ بہ مرحلہ حل کے بجائے جنیوا کے بسیار پہلو انداز کے مذاکرات زیادہ بہتر رہیں گے۔

ایڈیٹر: کیا آپ کے پاس ایسے شواہد ہیں کہ ہندوستان کشمیر پر سنجیدگی سے گفتگو پر آمادہ ہو ؟

وزیراعظم: اب تک تو بہرحال ہندوستان نے کشمیر پر سنجیدگی سے بات چیت سے پہلو تہی کی ہے۔ سابق میں ہندوستان نے کئی مرتبہ کشمیر پر مذاکرات میں حصہ لیا ہے لیکن وہ تمام باتیں بے نتیجہ رہیں۔ اس کے معنی بہرحال یہ نہیں ہیں کہ ہم مذاکرات کے ذریعہ مسئلہ کے حل کو مسترد کردیں۔ میری رائے میں تنازعات کے حل کا موثر ترین ذریعہ بالمشافہ اور براہ راست بات چیت ہے۔ اگر براہ راست بات چیت تعطل کا شکار ہوجائے اور براہ راست بات چیت سے نتیجہ پر پہنچنا ممکن نہ رہے تو پھر بسیار پہلو انداز کے مذاکرات سے مفر نہیں ہوسکتا تاہم، پہلا زور براہ راست بات چیت پر ہونا چاہیئے۔

اب آپ مجھ پر ایک جوابی سوال داغ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ اگر جموں و کشمیر کے تنازعات کو حل کرنے کی تمام کوششیں سابق میں ناکام ہوچکی ہیں تو مستقبل کی ایک کوشش کی کامیابی کے امکانات کہاں سے پیدا ہوجائیں گے۔ اس سوال کے لئے میرا جواب بہت سادہ اور آسان ہے۔ ہم اب ۱۹۴۷ء یا ۱۹۶۲ء میں نہیں ہیں، ہم اب ایک مختلف ماحول میں ہیں۔ دنیا میں بہت کچھ ہوچکا ہے، ایشیا میں بہت کچھ ہوچکا ہے اور برصغیر کے دریاؤں سے بہت سا پانی گذر چکا ہے۔ وقت نے یہ دکھا دیا ہے کہ اس تنازعہ کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ بعض اوقات اگر آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ تنازعہ گہرے سکتہ میں پڑ جاتا ہے مگر وہ مر نہیں جاتا۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ تنازعہ پھر سے زندہ ہوجاتا ہے مگر یہ حل نہیں ہوتا۔ بہرحال تنازعہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ خواہ یہ مدہم خروش رکھتا ہو یا تیز۔ خواہ یہ امن کا وقت ہو یا جنگ کا اسے مٹایا نہیں جاسکتا اور اسے اس وقت تک مٹایا نہیں جا سکتا جب تک اس کے حل کیلئے کوئی کوشش نہ کی جائے۔

پھر مجھے اس بات پر بھی یقین ہے کہ زود یا بہ دیر بردباری اور سوجھ بوجھ ہندوستان میں پیدا ہوگی۔ ہندوستان کو اس تعطل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے برعکس اس کے میں تو یہ کہوں گا کہ ہندوستان نے اس کی بدولت بہت سی تکالیف سہی ہیں۔ ہم اس مسئلہ کو حل کرنے کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ ہندوستانی دماغوں میں بھی اسے حل کرنے کی ضرورت کا احساس پیدا ہوگا۔

ایڈیٹر: کشمیر پر اقوام متحدہ کی ان غیر مبہم واضح قراردادوں پر غور کرتے ہوئے جو اب بھی کتابوں میں موجود ہیں کیا آپ نے کبھی کشمیریوں کے لئے وہ اقدامات طلب نہیں کئے جو مثال کے طور پر فلسطینیوں کے لئے کئے جارہے ہیں۔

وزیراعظم: نہیں ہماری صورت حال تاریخی اعتبار سے مختلف ہے برصغیر کی تقسیم اور وہ تمام کمٹمنٹ جو اس وقت کئے گئے اور پھر ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ ۔۔۔۔ اگر ان سب کو یکجا کیجئے تو ظاہر ہوگا کہ اقوام متحدہ کی قراردادیں تاریخی عمل کے مطابق ہیں۔

ایڈیٹر: وزیراعظم آزاد کشمیر نے کہا ہے کہ کشمیر پوری دنیا میں آزادی

کی تحریکوں کو اس لئے دیکھ رہا ہے کہ ان کے تجربات سے کچھ
سیکھے۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ گوریلا انداز کی جدوجہد کی
سوچ رہے ہیں؟

وزیرِ اعظم: میں نہیں سوچتا ایسا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ ان کا مطلب
یہ تھا کہ وہ ایک گوریلا جدوجہد کا آغاز کرنے والے ہیں بہرحال
ہو سکتا ہے دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے ضمن میں
وہ یہ کہہ رہے ہوں۔ لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ
ہم اولاً افہام و تفہیم کے ذریعے اس جھگڑے کے پُرامن
حل پر توجہ مرکوز رکھیں گے۔

ایڈیٹر: کیا کشمیر کے لئے آزادی اگر وہ ایسا چاہیں ....
.. ایک حل ہو سکتی ہے؟

وزیرِ اعظم: ہم اُس تاریخی عمل کے پابند ہیں جن کی جامہ پوشی
اقوامِ متحدہ کی قراردادیں کرتی ہیں۔

ایڈیٹر: کیا اُن میں رائے شماری بھی آتی ہے؟

وزیرِ اعظم: اس میں کشمیریوں کے لئے رائے شماری بھی شامل ہے
کہ آیا وہ ہندوستان کے ساتھ شریک ہوں گے یا پاکستان
کے ساتھ۔

آپ یہاں یہ نکتہ دیکھئے کہ نہ پاکستان اور نہ ہی ہندوستان
تقسیم کی طرفداری کر سکتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی قراردادیں
تاریخی عمل سے مطابقت رکھتی ہیں اور رائے شماری
کشمیریوں کی مرضی سے متعلق ہے کہ پاکستان میں شریک
ہوں یا ہندوستان میں۔

ایڈیٹر: کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان میں موجودہ سیاسی
رجحان پاکستان کے لئے کوئی خطرہ ——— یعنی ان کا
جمہوریت سے پرے ہٹنا۔

وزیرِ اعظم: ہندوستان میں جمہوریت جب اپنے شباب پر تھی تو ہمیں
ان کی جارحیت برداشت کرنی پڑی۔ اس لئے ہم بنیادی سوال
یعنی ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کو اس ملک
کے اندرونی معاملات کے اتار چڑھاؤ کے مقابلے میں کہیں
زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

ایڈیٹر: لیکن کیا آپ یہ خیال نہیں کرتے کہ ہندوستانی حکومت پر
اندرونی دباؤ کچھ ناعاقبت اندیشانہ اقدام کا باعث نہیں
بن جائے گا۔

وزیرِ اعظم: یہ اتنا سہل نہیں ہے۔ ہم چوکنے ہیں۔ ناعاقبت اندیشانہ
اقدام سے بڑی پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہو جائے گی اور
ہندوستان کو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ
بنگلہ دیش کی طرح یہ ایک آسان معاملہ ہوگا تو ایسا نہیں ہوگا۔
پنجاب کے میدان سندھ کے ریگزار اور ہمارے علاقے کے
پہاڑ اس لئے نہیں ہیں کہ ہندوستان انہیں روند کر دھنس
آئے۔

ایڈیٹر: جی ہاں میرا مطلب ہے وہاں بنگلہ دیش میں تو ایک
محصور..........

وزیرِ اعظم: ہاں وہ تو ایک جزیرہ تھا۔ وہاں واقعی جنگ کا کوئی
اسکوپ نہ تھا۔

ایڈیٹر: تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ نظام میں کسی مبارزت و مقابلہ
کا کوئی خطرہ نہیں۔

وزیرِ اعظم: میں بہت جلد اسے آتا نہیں دیکھتا۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا
ہمیں چوکنا رہنا ہوگا اور گذشتہ ۲۸ برسوں کے تجربات کو بھی
نظر میں رکھنا ہوگا میں کوئی پیش گوئی نہیں کرتا۔ تاہم میں
خوف و ہراس کی پالیسی کا بھی پرچار نہیں کرنا چاہتا۔

ایڈیٹر: شہنشاہ ایران نے جب وہ ہندوستان میں تھے کہا تھا۔ اور میں
نے بھی ان سے بات کی تھی کہ ایران عربوں کا حامی ہے۔ وہ
اقوامِ متحدہ کی قرارداد ۲۴۲ اور ۳۳۸ پر صاد کرتا ہے دوسرے
لفظوں میں یوں کہیے کہ وہ علاقے کی تمام مملکتوں کے حقوق تسلیم

کرتا ہے اور یہی کچھ صدر سادات نے بھی کہا ہے۔ کیا آپ کی رائے بھی یہی ہے؟

وزیراعظم: جہاں تک ان قراردادوں کا تعلق ہے یہ وہ قراردادیں ہیں جنہیں اقوام متحدہ نے منظور کیا ہے اگر عرب مملکتوں نے ان کی تائید کی ہوتی تو اقوام متحدہ انہیں منظور نہ کرتی۔

ایک مرتبہ جب ایک قرارداد اکثریت سے منظور ہو جاتی ہے تو اس قرارداد کی پابندی لازم آجاتی ہے۔ یہ پابندی اس کی عمل پذیری کے معاملہ میں نہیں اخلاقی نوعیت میں ہوتی ہے ان قراردادوں پر سلامتی کونسل میں ویٹو استعمال نہیں ہوا اس لئے ہم قدرتی طور پر ان کی تائید کرتے ہیں۔ مگر ان قراردادوں کے بعد بنیادی نوعیت کی کچھ تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ تنظیم آزادئ فلسطین (P.L.O) کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔

حقیقت میں اسے لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس (فروری ۷۴ء) میں تسلیم کیا گیا اور پھر رباط کانفرنس میں اس کی حمایت کی گئی اور اردن، لاہور اور رباط دونوں جگہ اس حمایت کا ایک فریق تھا۔ پس اس لئے اب یہ فلسطینی مہاجرین کے ایک غیر متشکل مسئلہ کا معاملہ نہیں رہا۔ اب آپ فلسطین کے ایک وجود سے معاملہ کر رہے ہیں اور اس وجود کی نمائندگی فلسطین کی تنظیم آزادی ہے۔ زود یا بہ دیر قرارداد کے اس جوف کو پُر کرنا ہوگا اور یہ ضرور پُر ہوگا۔

ایڈیٹر: لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ علاقے کی تمام مملکتوں کے وجود کے حق کو اور مزید ایک فلسطینی ریاست کے وجود کے حق کو تسلیم کرنا ہیں ... کیا یہ ممکن ہے؟

وزیراعظم: یقیناً یہی اسے تمام عرب ریاستوں نے تسلیم کر لیا ہے۔

ایڈیٹر: ہاں مگر میرا خیال ہے لیبیا اس کا مخالف تھا۔

وزیراعظم: سوال یہ ہے کہ آپ اسرائیل کے بغیر ایک جنیوا کانفرنس کا تصور نہیں کر سکتے۔ اب بہر حال عرب مملکتوں نے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔

ایڈیٹر: اب اگر مجھے آخری سوال کرنے کی اجازت دیں تو پوچھوں کہ کیا آپ غیر جانبدارانہ ملکوں کی پالیسی سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہیں؟ کیا آپ یہ خیال نہیں کرتے کہ کہیں متبادل تعلقات ہوتے ہیں۔ پاکستان کے لئے بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک سے دوستی خطرناک ہو سکتی ہے۔ لیکن یورپ پاکستان کے ساتھ تعلقات میں ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

وزیراعظم: جی ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں نے اس کے متعلق اپنی کتاب آزادئ موہوم میں ۱۹۶۷ء میں لکھا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ یورپ کی شخصیت ابھرنے کی امید ہے اور میں نے ایشیاء اور یورپ کے مثبت تعلقات قائم ہونے کو کہا تھا۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہمارے دولت مشترکہ کو چھوڑنے کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہم یورپی شخصیت کو مضبوط کرنا چاہتے تھے۔

برطانیہ یورپ کا حصہ ہے اور برطانیہ اپنی وسیع اور دور رس ذمہ داریوں کو مختلف شکلوں میں نباہ نہیں سکتا۔ اسے بہر حال اپنے مستقبل کو یورپ سے منسلک کرنا ہوگا۔ بہر حال یہ ایک پہلو تھا۔ آنے والے واقعات کے ارتقاء پر نظر رکھتے ہوئے ہم نے سوچا ہم شکرگزاری کے ساتھ دولت مشترکہ سے اور بھاری ذمہ داریوں سے علیحدہ ہو جائیں۔

میرے نزدیک دولت مشترکہ ایک مبہم ادارہ ہے اور یہ محض ایک گزرے ہوئے زمانے کی چیز ہے۔ پس جوں ہی یورپ ایک قوت کے مرکز کی حیثیت سے ابھرتا ہے اور برطانیہ اس میں بھرپور طریقہ پر شامل ہو تو پھر ہمیں تین کونوں کے بجائے چار کونوں کی دنیا مل جاتی ہے۔ اور مضبوط تعمیر دو ستونوں کے بجائے چار ستونوں پر ہی ہوتی ہے۔

ایڈیٹر: ایک تکون آسان چیز ہے۔

وزیراعظم: لیکن یہ بہتر ہے کہ دنیا کی چار ٹانگیں ہوں۔

ایڈیٹر: آپ کا شکریہ!

وزیراعظم: آپ کا بھی شکریہ!

ایک بروقت قدم

آٹا پیسنے، چاول چھڑنے اور روئی بیلنے کے کارخانے حکومت کی تحویل میں!

ادارہ

۱۷ر جولائی ۱۹۷۷ء کو وزیر اعظم پاکستان نے آٹا پیسنے، چاول چھڑنے اور روئی بیلنے کے بڑے بڑے کارخانوں کو حکومت کی تحویل میں لینے کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

"غذا میں ملاوٹ ایک لعنت ہے جس کا خاتمہ ہمارے ملک سے ہوجانا چاہیئے میں بے غل وغش ہوکر اپنے عوام کو غذا کی کمی اور بیماریوں کا محض اس لئے شکار ہوتا نہیں دیکھ سکتا کہ آٹا پیسنے کی ملیں ہمارے کنٹرول سے باہر ہیں۔ میں اپنے عوام کی صحت کو یہ خطرہ نہیں برداشت کرسکتا۔ کوئی بھی ترقی پسند سماج عوام کی اس بے حرمتی کی محض اس لئے کہ یہ صنعت نجی ملکیت میں ہے اجازت نہیں دے سکتی۔"

غذا میں ملاوٹ ایک انتہائی گھناؤنا سماجی گناہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آٹے میں ملاوٹ کی جاتی تھی اور نہایت سنگدلی کے ساتھ عوام کی صحتوں سے کھیلا جاتا تھا۔ حکومت کے مسلسل انتباہ کے باوجود بڑے مل مالکوں نے کبھی اپنے اخلاقی فرائض صحیح انداز میں انجام نہیں دیئے اور آٹے میں جو ہماری غذا کا جزو اعظم ہے، برابر ملاوٹ کرتے رہے۔ کبھی آٹے میں سوکھی روٹیاں پیس کر ملائی گئیں، کبھی پتھر اور کھریا۔ اس افسوسناک صورت حال سے متاثر ہوکر عوامی حکومت نے مفاد عامہ میں یہ قدم اٹھایا ہے حکومت کے اس اقدام سے اب آٹے کی ملوں کے نظام کی سائنسی طریقوں پر تنظیم کی جائے گی۔ مختلف مراحل پر آٹے کے سیمپل لئے جائیں گے اور کسی بھی مرحلہ پر اگر ان کے معیار میں کوئی کمی یا نقص پایا گیا تو متعلقہ لوگوں کو سخت سزائیں دی جائیں گی۔ یقین ہے کہ آئندہ عوام کو آٹے سے متعلق کوئی شکایت نہیں رہے گی۔ اور عوام کی صحت پر اس کا خوشگوار اثر پڑے گا۔

آٹے کی ملوں کے قومی تحویل میں چلے جانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بیچ کے ایجنٹ اور آڑھتیئے اب کاشتکاروں اور ڈپو ہولڈروں سے ناجائز منافع نہیں کما سکیں گے۔ آٹا پیسنے کے نرخوں کو بھی معین کیا جائے گا۔ اور ملوں میں کام کرنے والوں کے مفادات کا خاص انداز سے تحفظ کیا جائے گا اور انہیں وہ تمام مراعات دی جائیں گی جن کا اعلان حکومت کی لیبر پالیسی میں وقتاً فوقتاً کیا گیا ہے۔

چاول چھڑنے کے کارخانوں کے قومی تحویل میں آجانے سے بھی بڑے دور رس فائدے حاصل ہوں گے۔ اس کا اولین فائدہ دھان کے کاشتکاروں کو پہنچے گا انہیں اب اپنی فصل کی معقول

قیمت ملے گی اور اب وہ ایجنٹوں اور آڑھتیوں کے استحصال سے ہر طرح آزاد ہو جائیں گے۔ چاول کے استعمال کا مکمل جائزہ لیا جائے گا اور اس کی تقسیم اور قیمتوں کو سائنسی انداز میں کنٹرول کیا جائے گا۔ اور نفع خوری کو عوام کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے کا موقعہ نہیں دیا جائے گا۔

ان فوائد کے علاوہ چاول چھڑنے کے عمل میں چاولوں کے ٹوٹنے اور ضائع ہونے کی مقدار کو کم سے کم کر دیا جائے گا۔ نیز ان کی قسم وار درجہ بندی بڑے ٹھوس سائنسی طریقِ کار پر کی جائے گی۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بیرونی منڈیوں میں پاکستانی چاول کی ساکھ بڑھ جائے گی اور اس کی مانگ میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہوگا۔

روئی دھننے کے بڑے کارخانوں کے قومی تحویل میں چلے جانے سے بھی ملک اور قوم کو بڑے فائدے حاصل ہوں گے، سب سے پہلے کپاس کے کاشتکاروں کو مناسب اور معقول قیمتوں کی ضمانت میسّر آئے گی اور وہ اپنا مال براہِ راست ملوں کو فروخت کر کے نقد پیسے وصول کر سکیں گے۔ اس سے پہلے آڑھتی اور ایجنٹ انہیں قیمتوں کی ادائیگی میں سخت پریشان کرتے تھے اکثر صورتوں میں وہ ان کی فصل کی قیمت قسطوں میں ادا کرتے انہیں بہانوں اور حیلوں سے ٹالتے رہتے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کی پیداوار کا نرخ گرا دیتے اور اپنی چالبازیوں سے انہیں ابھرنے اور کھل کر کام کرنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ روئی کے کاروبار میں سٹہ بازوں نے الگ طوفان مچا رکھا تھا نرخوں کے گھٹنے بڑھنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہوا کرتا تھا۔ اب اس کا احتمال ختم ہو جائے گا۔ اور بنولے سے پاک روئی کے اندرونِ ملک استعمال کو بھی سائنسی انداز میں کنٹرول کیا جائے گا۔ روئی کی قسموں کا امتیاز قائم رکھا جائے گا اور اس میں کسی قسم کی گڈمڈ نہیں ہونے دی جائے گی اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستانی روئی دساوری منڈیوں میں اپنا وقار بحال کر سکے گی اور اس کے نتیجے میں اس کی مانگ بھی بڑھے گی اور قیمت بھی۔

کاشتکاروں کو اب کپاس کے مناسب قسم کے بیجوں کے انتخاب میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی اور یہ بیج انہیں نہایت مناسب نرخوں پر دستیاب ہوں گے۔

قومیائی ہوئی ملوں میں بنولے کا تیل سائنسی طریقوں پر نکالا جائے گا اور یہ کوشش کی جائے گی کہ اس کی بھرپور مقدار حاصل کی جائے۔

روئی بیلنے کی صنعت سے خود غرض سرمایہ داروں اور ایجنٹوں کے نکل جانے سے حکومت کے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ اس صنعت میں زیادہ سے زیادہ توسیع اور اصلاحات کر سکے اور سائنسی ذرائع اور تکنیک کو استعمال کر کے بہتر فوائد حاصل کر سکے۔

حکومت نے آٹا پیسنے، چاول چھڑنے اور روئی بیلنے کے کارخانوں کو اپنی تحویل میں لے کر یہ اعلان بھی کیا ہے کہ ان کارخانوں کے مالکوں کو مناسب معاوضہ ادا کیا جائے گا چھوٹے یونٹوں کو نقد معاوضہ دیا جائے گا اور بڑے یونٹوں کو بونڈ کی صورت میں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے یونٹوں کو جنہیں بیرونی کمپنیاں مناسب سائنسی انداز میں چلا رہی ہیں مستثنیٰ قرار دے دیا جائے گا۔

حکومت نے یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ قومی تحویل میں لئے جانے والے یونٹوں کے عملے اور مزدوروں کے حقوق اور ملازمت کا ہر طرح تحفظ کیا جائے گا اور انہیں کسی قسم کا اکھاڑ پچھاڑ کا سامنا نہیں ہوگا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام مزدور اور کارکن جو ان صنعتوں میں کام کر رہے ہیں پہلے سے زیادہ خوش اسلوبی سے زندگی گذار سکیں گے اور انہیں ہر قسم کی مراعات جن کا لیبر پالیسی میں اعلان کیا جا چکا ہے میسّر ہوں گی۔ توقع ہے کہ مل مزدور اور تکنیکی عملہ اب پہلے سے زیادہ مستعدی اور جانفشانی سے پیداوار بڑھانے پر اپنی توجہ مرکوز کر سکے گا اور یوں ملک اور قوم کا حقیقی فائدہ ہوگا۔

غزل

عارف حجازی

کسی صورت بھی میرے غم کی شدت کم نہیں ہوتی
بدلتا ہوں جو پہلو بھی تو رقت کم نہیں ہوتی

جو ہو ذوقِ یقیں دل میں تو پھر فکرِ گماں کیسی
بچھڑ جانے سے، دوری سے محبت کم نہیں ہوتی

ہر اک مشکل میں تیرا غم ہی دل کے کام آتا ہے
مگر پھر بھی ترے غم کی ضرورت کم نہیں ہوتی

دِل آزاری بُری شے ہے، دلوں کو توڑ دیتی ہے
اگر دِل میں یہ گھر کر لے تو نفرت کم نہیں ہوتی

میں وہ نقشِ تمنا ہوں مٹائے مٹ نہیں سکتا
اگر رنگت بھی اُڑ جائے لطافت کم نہیں ہوتی

چھپائیں لاکھ ہم عارفؔ خیالِ حسن کو لیکن
حقیقت کو چھپانے سے حقیقت کم نہیں ہوتی

حضرت قائدِ اعظمؒ

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

دراز قد، ہلکا بدن، پُر وقار، خوش اطوار، بلند کردار، عظیم سیاست کار، مہذب، خلیق، زیرک، فہیم، فطین، جینئس، صاف، اجلے، پاکیزہ، دلکش شخصیت، صاحبِ یقین، پُر خلوص گفتار میں حرارت، رفتار میں زلزلے، جلال و جمال کا حسین امتزاج، سب کے لئے ایک کھلی کتاب، بے غرض، ملت کے لئے وقف اور ہر دام سے بچ نکلنے والے۔ یہ تھے ہمارے قائد و رہبر۔

دفعتہً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ امم
ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقلِ سلیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے کبھی چوبِ کلیمؑ
(اقبالؒ)

مسلم ملت ایک مارشل قوم ہونے کے علاوہ اپنے ماضی میں لیڈرشپ کے خوبصورت نمونے رکھتی ہے۔ جب یہ ماضی کی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھتی ہے تو اسے سیاسی دنیا میں خلفائے راشدین، عمر بن عبدالعزیز، ہارون، مامون، سنجر اور سلطان اعظم جیسے لوگ نظر آتے ہیں۔ کشورِ علم میں غزالی، رومی اور سینا جیسے ہزار علماء و حکما ملتے ہیں۔ اقلیم تصوف میں غوث اعظم، بایزید، جنید، داتا گنج بخش اور خواجہ اجمیری جیسے صدہا پاکیزہ نفوس پر نظر پڑتی ہے۔ اس لئے مسلم قوم صرف ان افراد کو قیادت کے لئے منتخب کرتی ہے جن میں عظیم اسلاف کی صفات یعنی دیانت، تقویٰ، فیاضی، جذبۂ خدمت، خلوص اور خدا ترسی کسی حد تک موجود ہوں۔ قائدِ اعظم کے ہمراہ کتنی ہی بلند و بالا شخصیتیں تھیں مثلاً۔ نواب محمد اسماعیل، چندریگر، عبدالرب نشتر، لیاقت علی خان وغیرہ۔ لیکن قوم نے قائدِ اعظمؒ کو منتخب کیا کیونکہ اس کے بلند معیار پہ یہی پورے اترتے تھے۔ یہ حضرتِ قائد کے خلوص و ایقان کا نتیجہ تھا۔ کہ دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی ایک مردہ، افسردہ، مایوس اور منتشر بھیڑ منظم ہوکر اس رفتار سے آگے بڑھی کہ منزل نے لپک کر اُن کے قدم چوم لئے۔

جس طرح انگریز کو مشکل وقت میں چرچل ملا تھا، روس کو لینن اور چین کو ماوزے تنگ، اسی طرح مسلمانوں کو قائدِ اعظم نصیب ہوا۔

لیڈر عموماً عوام کی پیروی کرتے اور وہی بات کہتے ہیں۔ جو عوام کو پسند ہو۔ لیکن قائدِ اعظم نے اپنی بات کہی اور نہ صرف دس کروڑ مسلمانانِ ہند سے منوالی بلکہ تیس کروڑ ہندوؤں نیز اس مہیب قوت کو جھکا لیا جس کی قلمرو پہ سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔

مردِ سپاہی ہے تُو تیری زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں تیری پناہ الا اللہ - (اقبال)

تصورِ پاکستان

پاکستان کا اولین تصور سر سید احمد خان کی تحریروں میں ملتا ہے۔ جب ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے یہ مطالبہ کیا کہ اردو کو دیوناگری خط میں لکھا جائے تو سر سید (۱۸۹۸ء) نے اردو کی پُرجوش حمایت شروع کر دی۔ اور اپنے ایک انگریز دوست شیکسپیئر کو جو ایک ضلع میں کلکٹر تھے لکھا۔

"مجھے یقین ہو چکا ہے کہ دونوں قومیں ہندو اور مسلمان کسی مقصد کے لئے بھی مل جل کر کام نہیں کر سکتیں۔ گو اس وقت ان میں کھلم کھلا عداوت نہیں ہے لیکن نام نہاد تعلیم یافتہ لوگوں کی وجہ سے مستقبل میں لاتعداد پیچیدگیاں ہونی لازمی ہیں"۔

۱۹ اپریل ۱۸۷۰ء کو سر سید نے نواب محسن الملک کو لکھا۔

"ہندوؤں کے لسانی مطالبے کی وجہ سے مسلم۔ ہندو اتحاد ناممکن ہو گیا ہے۔ . . . . اگر ہندوؤں کا یہ مطالبہ جاری رہا۔ تو ایک دن ہندو اردو کو قطعی طور پر مسترد کر دے گا۔ اور ہندو و مسلم مکمل طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں گے"۔

(صلاح الدین ناسک :۔ تحریک آزادی۔ لاہور ۱۹۷۲ء ص ۱۵۹)

پاکستان کی حمایت میں دوسری آواز علامہ اقبال کی تھی۔ آپ نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا، کہ مسلمانوں کی نجات ایک ایسی آزاد اسلامی مملکت کے قیام میں ہے جو مسلم اکثریت کے تمام صوبوں پر مشتمل ہو اور جس میں مسلمان اپنے عقائد اور روایات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

اس سلسلے میں تیسری آواز چودھری رحمت علی ہوشیار پوری (۱۹۵۱ء) کی تھی۔ یہ کیمرج میں زیرِ تعلیم تھا۔ ۱۹۳۳ء میں اس نے دو پمفلٹ شائع کئے۔ پہلے کا نام تھا "اب یا کبھی نہیں" اور دوسرے کا "تحریکِ پاکستان" ان میں رحمت علی نے مسلمانوں کے لئے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیا تھا اور اس کا نام پاکستان تجویز کیا تھا۔ یہ یاد رہے کہ لفظ "پاکستان" چودھری رحمت علی کی اختراع ہے۔

قائدِ اعظم اور پاکستان

قائدِ اعظم پہلے کانگریسی تھے۔ یہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۷ء تک کانگرس میں رہے اور اس تمام مدت میں مسلمانوں کے حقوق کے لئے لڑتے رہے۔ پھر ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ساتھ ہی کانگرس کے ممبر بھی رہے۔ مقصد یہ کہ کانگرس کو جھکانے کے لئے قابلیت، خطابت اور منطق کے علاوہ وہ دس کروڑ مسلمانوں کے اتحاد کا حربہ بھی استعمال کر سکیں۔ لیکن سالہا سال کی گفت و شنید بیکار گئی اور ہندوؤں کی روش میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

کانگرس ہندو مسلم اتحاد و اخوت کے بڑے بڑے اعلان کرتی تھی لیکن عملاً وہ سخت مسلم کُش تھی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں پر ملازمت و تجارت کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ اوقاتِ نماز میں مساجد کے سامنے سے ڈھول اور نقارے بجاتے ہوئے گزرتے تھے۔ محرم کے جلوسوں پر پتھر برساتے تھے۔ مسلمانوں کو ملیچھ اور شودر سمجھتے تھے۔ مسلمانوں سے ہاتھ ملانے کے بعد ہاتھ کو گائے کے گوبر سے پوِتر کر کے صابن سے دھوتے تھے۔ ان کے لیکھرام، دیانند اور راجپال سرورِ کائنات صلعم کو بُرا کہتے تھے۔ ان کے ملاپ اور پرتاب فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکا دیتے تھے اور پٹیل جیسے کانگرسی اس پر تیل ڈال رہے تھے۔

اس تشویش ناک صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے قائدِ اعظم نے پورا زور لگایا۔ کانگرس ہائی کمان کے ارکان سے بار بار ملے۔ لیکن کانگرس نہ مانی۔ مہاتما گاندھی کانگرس کے غیر متنازعہ سیاسی و روحانی لیڈر تھے۔

اور مہا سبھا کی زمامِ اقتدار ساورکر کے ہاتھ میں تھی۔ ساورکر انتہائی متعصب، اسلام دشمن، فتنہ پسند، اور لٹھ مار واقع ہوئے تھے۔ گاندھی جی بڑے ذہین سیاستدان تھے۔ جب قائدِ اعظم کے سامنے لاجواب ہو جاتے تو کہتے:

"میں یہ بات کانگرس سے کیسے منوا سکتا ہوں۔ میں تو اس کا چار آنے والا ممبر بھی نہیں ہوں"۔

مولانا ظفر علی خان نے یہ شعر اسی زمانے میں کہا تھا:۔

؎ بھارت کی بلائیں دو ہی تو ہیں اِک ساورکر اِک گاندھی ہے
وہ جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے یہ مکر کی اٹھتی آندھی ہے

چودہ پوائنٹ

جب قائدِ اعظم کوئی بات کانگرس سے نہ منوا سکے، تو انہوں نے ۱۹۲۷ء میں لیگ کے پلیٹ فارم سے چودہ پوائنٹس کا اعلان کیا اور دھمکی دی کہ اگر کانگرس نے ان چھوٹے چھوٹے مطالبات کو تسلیم نہ کیا، تو وہ کانگرس سے الگ ہو کر کوئی اور راہِ عمل سوچیں گے۔

ان نکات میں سے چند ایک یہ ہیں:۔

۱۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ مقرر کیا جائے۔
۲۔ قانون ساز اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نشستیں مخصوص کی جائیں۔
۳۔ انتخابات جداگانہ ہوں۔
۴۔ اردو کو ہندوستان کی قومی زبان قرار دیا جائے۔
۵۔ بندے ماترم کا ترانہ نہ گایا جائے۔
۶۔ مسلمانوں کو پوری مذہبی آزادی ہو۔
۷۔ گائے کی قربانی پر کوئی پابندی نہ ہو۔
۸۔ مسلمانوں کے پرسنل لاء اور کلچر کا تحفظ کیا جائے۔

بس اسی قسم کے بے ضرر سے چودہ مطالبات تھے، جنہیں کانگرس نے مسترد کر دیا۔ اور قائدِ اعظم کانگرس سے الگ ہو گئے۔

نئے مطالبات

۱۹۲۷ء میں قائدِ اعظم نے اپنی فہرست میں چند اور مطالبات کا اضافہ کر دیا یعنی:۔

۱۔ پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں نیز ملازمتوں میں مسلمانوں کو آبادی کے مطابق نمائندگی دی جائے۔
۲۔ سندھ کو بمبئی سے کاٹ کر الگ صوبہ بنایا جائے۔
۳۔ سرحد اور بلوچستان کو باقاعدہ صوبوں کا درجہ دیا جائے۔

لیکن کانگرس نہ مانی۔

گول میز کانفرنس

جب ہندو مسلم اختلافات نے فسادات کی شکل اختیار کر لی، تو برطانیہ نے لندن میں گول میز کانفرنس کا انتظام کیا اور اس میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور ریاستوں کے ۷۲ نمائندوں کو دعوتِ شرکت دی۔ ان میں سولہ مسلمان تھے یعنی قائدِ اعظم، سر آغا خان، نواب چھتاری، محمد علی جوہر، اے کے فضل الحق، سر عبدالقیوم، میاں محمد شفیع وغیرہ۔

باقی مندوبین ہندوؤں، شودروں، سکھوں، پارسیوں اور عیسائیوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ دوسری کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ء اور تیسری نومبر ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ ان کانفرنسوں میں تقریریں ہوئیں۔ کمیٹیاں بنیں۔ انگریز نے بھی زور لگایا۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

قائدِ اعظم کا قیام ولایت میں

پہلی کانفرنس کے خاتمے پر قائدِ اعظم ولایت ہی میں رہ گئے تھے۔ دوسری کانفرنس میں وہیں سے شامل ہوئے اور تیسری میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا:۔

"ہندو ذہن، ہندو جذبات اور ہندوؤں کے رویئے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اتحاد کی اب

کوئی امید نہیں۔"

(اقتباس از میٹ مسٹر جناح صـ۷)

واپسی

جب ہندوستان فسادات کی آگ میں جلنے لگا اور حالات بہت بگڑ گئے تو قائدِ اعظم کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں مسلمان کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں، اور ہمیشہ کے لئے غلام نہ ہو جائیں، چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۳۴ء میں واپس آ گئے یہاں آکر سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ تمام بڑے بڑے شہروں مثلاً بمبئی، لکھنؤ، علی گڑھ، کلکتہ، پٹنہ، دہلی، مدراس، ڈھاکہ، کراچی، لاہور اور پشاور میں لاکھوں کے اجتماعات کو خطاب کیا۔ آپ جہاں جاتے میلوں لمبے جلوس نکلتے اور فضا "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعروں سے گونج اٹھتی۔ پیری اور بیماری کے باوجود آپ نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک ۷۳ اجتماعات کو خطاب کیا۔ اور ظہورِ پاکستان کے بعد ایک سال میں ۳۰ تقاریر کیں۔ ان تقاریر کا موضوع یہی تھا کہ ہم تنگ نظر ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے ہمیں اپنی روایات تہذیب اور مذہب کی حفاظت کے لئے ایک الگ ملک چاہیئے۔ ایک آدھ نمونہ حاضر ہے:

۱۹۳۷ء میں لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ اس انتہائی پُر رونق اور عظیم اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا۔

" ہندوستان میں آٹھ کروڑ مسلمانوں کو کسی بات کا ڈر نہیں ہونا چاہیئے ان کی تقدیر خود ان کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ باہم پیوستہ ٹھوس انداز میں منظم متحد قوت سے ہر خطرہ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ صادق اور وفادار رہے تو کامیابی آپ کی ہی ہوگی۔"

(میٹ مسٹر جناح صـ۹۹)

قراردادِ لاہور کے بعد ایک اخباری بیان میں فرمایا۔

" ہم ایک قوم ہیں اپنی منفرد تہذیب و ثقافت زبان ادب، آرٹ، فنِ تعمیر اپنی قدروں، اخلاقی ضوابط، رسم و رواج، تاریخ، روایات، رجحانات اور آرزوؤں کے اعتبار سے بین الاقوامی قانون کی ہر نوعیت سے ہم ایک قوم ہیں۔"

(میٹ مسٹر جناح صـ۱۲۱)

ایک اور موقعہ پر فرمایا۔

" مجھے یہ بات صاف صاف لفظوں میں جس حد تک میں بیان کر سکتا ہوں بتا دینا چاہیئے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مقصود ہندوستان کے شمال اور مشرق میں ایسی آزاد ریاستیں قائم کرنا ہے جن کے ہاتھ میں دفاع، خارجہ معاملات، مواصلات، کسٹمز، کرنسی اور زرمبادلہ کا کنٹرول ہو۔"

(میٹ مسٹر جناح صـ۱۲۱)

قائدِ اعظم کو طلبہ سے بڑی محبت تھی۔ آپ اُن کی ہر دعوت کو قبول فرمایا کرتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں آپ کو اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ نے دعوت دی۔ کالج کے میدان میں وسیع پنڈال تھا جسے جھنڈیوں، نعروں اور کتبوں سے پوری طرح آراستہ کیا گیا تھا۔ جب قائدِ اعظم تشریف لائے تو فلک شگاف نعروں، پھولوں اور ہاروں سے استقبال کیا۔ قائدِ اعظم نے [illegible] گھنٹہ تک تقریر کی۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ دورانِ خطاب فرمایا:۔

" ہم بوڑھوں کا کام آزادی کا حصول اور جوانوں کا فرض اس کی حفاظت ہے۔"

" اخلاق و عزت کے بلند معیار ضوابط برتیئے۔ بھاری بھرکم ڈگریوں کے ساتھ اگر کردار کا بحران ہو تو سمجھیے آپ کی قوت ضائع ہوئی۔ جس دن آپ نے تعمیر کر لیا اور ایک مکمل نمونہ ایمانداری اور شرافت کا بن گئے

اس دن سمجھ لیئے کہ آپ کا وطن پاکستان آپ کا ہو جائیگا۔"

(ماخوذ از بیاضِ خود)

پاکستان کیوں؟

قائدِ اعظم نے پاکستان حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کیوں کی؟ اس کا جواب انہی سے سنیئے:۔

" اگر حکومتِ برطانیہ چاہتی ہے کہ برصغیر کے لوگ ایک پُر امن زندگی بسر کریں تو اس کی سیدھی راہ یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی بڑی قوموں کیلئے علیحدہ علیحدہ منطقے مقرر کر دے تاکہ وہ اپنی خواہشات، اعتقادات اور روایات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ ہندو مسلم کا تعلق دو مختلف تہذیبوں سے ہے۔ ان کے تاریخی مآخذ، اکابر، ادب، رہنما اور زبانیں الگ الگ ہیں۔ انہیں ایک گاڑی میں جوتنے سے کشمکش میں اضافہ ہوگا۔ ہماری تمنا یہ ہے کہ ہم اپنی روحانی و اخلاقی قدروں کے مطابق زندگی بسر کریں۔"

(مارچ ۱۹۴۰ء۔ اجلاس لاہور سے خطاب)

۲۶ مئی ۱۹۴۰ء کو فرمایا:۔

" ہم اس ملک میں باعزت زندگی گذارنا اور آزاد ہندوستان میں اسلام کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔"

(خطباتِ قائدِ اعظم۔ از رئیس احمد جعفری ص ۲۳۹)

اپریل ۱۹۴۱ء کو اجلاس مدراس میں ارشاد ہوا:۔

" ہم ایک الگ ملک اس لئے لینا چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی اپنی تاریخ اور اخلاقی اقدار کے مطابق بسر کریں۔ اپنی ہی زبان استعمال کریں۔۔۔ جب وقت آئے گا۔ تو ہماری ریاست میں آباد اقلیتیں دیکھیں گی کہ مسلمان نہ صرف منصف بلکہ فیاض بھی ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں اسلام کی روایات ہی یہی ہیں، اور اسلام یہی سکھاتا ہے۔"

(ایضاً ص ۲۰۶)

۱۱ جولائی ۱۹۴۶ء کو حیدر آباد دکن میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

" اس وقت میدانِ سیاست میں ہندو مسلم کی جنگ ہو رہی ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ کون جیتے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا راہبر بنا کر شیوۂ صبر و رضا اختیار کریں۔ تو ہم کم ہونے کے باوجود اسی طرح فتح یاب ہوں گے۔ جس طرح مٹھی بھر مسلمانوں نے ایران و روم کی سلطنتوں کو الٹ دیا تھا۔"

(ایضاً ص ۳۴۴)

۲۹، اگست ۱۹۴۷ء کو عید کے موقعہ پر فرمایا:۔

" رمضان کا مبارک مہینہ ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ سخت کوشی اور قربانیوں کے بغیر کوئی شخص اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند اس مبارک موقعہ پر یہ عہد کریں کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں مل کر کام کریں گے کیونکہ درخشندہ ماضی اور عظیم تاریخی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا خواب اسی طرح پورا ہو سکتا ہے"

(ایضاً ص ۵۰۰)

ایک اور موقعہ پر ارشاد ہوا:۔

" کلام اللہ میں انسان کو خدا کا خلیفہ کہا گیا ہے۔ اس لئے ہم پر قرآن کی پیروی فرض ہے اور یہ ضروری ہے کہ ہم دوسروں سے ایسا ہی سلوک کریں، جیسا کہ خدا نوعِ انسان سے کرتا ہے صوم و صلوٰۃ سے باطن روشن ہوتا ہے۔ باطن کی اس روشنی اور ہدایات کی روشنی میں سوچیئے جو قرآنِ حکیم نے دی ہیں، اور یاد رکھیئے کہ ہمارے رسول پاک کے نزدیک سب سے بڑا عمل خدمتِ خلق اور رواداری تھا۔ یہی زندگی کا مفہوم یہی عینِ اسلام بلکہ روحِ اسلام ہے۔" (ایضاً ص ۱۸۶)

تو یہ تھا وہ مقصد، جس کے لئے قائدِ اعظم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔

قائدِ اعظمؒ وادیٔ کشمیر میں

سلیم خان گمی

یہ موضوع نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ وادیٔ کشمیر کی طرح خوبصورت بھی ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کتنی بار وادیٔ کشمیر میں تشریف لے گئے! اس موضوع پر کشمیر کے ایک صحافی پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اپنی انگریزی تصنیف "کشمیر میں جدوجہد آزادی کی تاریخ" میں روشنی ڈالی ہے اس موضوع پر مظفر آباد (آزاد کشمیر) کے ایک دانشور اور محقق سید غلام حسن شاہ کاظمی نے بھی خاصا کام کیا ہے۔ آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خواجہ محمد یوسف صراف نے ۱۹۷۵ء میں اس موضوع پر ایک مقالہ تحریر کیا جو بعد میں آزاد کشمیر ریڈیو سے بھی نشر ہوا۔ تاہم یہ موضوع ابھی تشنہ ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت آزاد کشمیر یا حکومت پاکستان اس موضوع پر مواد فراہم کرنے کے لئے کسی محقق کی خدمات مستعار لے۔ میرے خیال میں اس موضوع کے لئے صراف صاحب سے بہتر محقق نہ مل سکے گا۔

قائداعظم سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں کشمیر تشریف لے گئے اُن کی شادی ۱۹۱۸ء میں رتن بائی سے ہوئی تھی اور کشمیر کی سیر میں اُن کی بیگم اُن کے ہمراہ تھیں۔ آپ نے یہ سفر راولپنڈی مری کوہالہ مظفر آباد کے راستے کیا تھا۔ آپ راولپنڈی تک ریل گاڑی کے ذریعہ آئے اور راولپنڈی سے سری نگر تک آپ نے راولپنڈی کے ایک ٹرانسپورٹر سے کار لے کر سفر کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قائداعظمؒ نے کشمیر کا پہلا سفر ۱۹۱۹ء میں نہیں ۱۹۲۱ء میں کیا۔ اس سفر کی کہانی مذکورہ مسلمان ٹرانسپورٹر نے راولپنڈی کے روزنامہ "یادِ شمال" میں تحریر کی تھی جو سید ضمیر جعفری کی ادارت میں چھپتا تھا۔ مذکورہ مضمون تاحال نایاب ہے۔ اگر کسی صاحب کے پاس مذکورہ مضمون ہو تو وہ براہ کرم مدیر "ماہ نو" یا راقم کو ارسال فرمائیں۔

قائداعظم مرحوم و مغفور دوسری بار ۱۹۲۵ء میں کشمیر گئے۔

۱۔ آغا غلام جیلانی

آپ کا دوسرا دورہ سیاسی اور پیشہ ورانہ اعتبار سے بے حد کامیاب ہا۔ ریشم خانہ کی بغاوت کے بعد کشمیری مسلمانوں کا جذبہ حریت شعلۂ تاباں کی شکل اختیار کر چکا تھا چودھری غلام عباس خان مرحوم کی زیر قیادت مسلم کانفرنس نے اہل کشمیر کو تحریک آزادیٔ کشمیر کی شاہراہ پر لاکھڑا کیا تھا اور کشمیر کے سیاسی نقشہ میں ایک نیا رنگ بھرا تھا۔ کشمیریوں کو بزدلی کا طعنہ دینے والے اب کشمیریوں کو سربکف اور کفن بردوش میدان عمل میں دیکھ رہے تھے۔ اس سیاسی فضا میں مسلم کانفرنس نے قائداعظم کو ایک دعوت میں زحمت فرمانے کی استدعا کی جسے قائداعظم نے بے حد مسرت کے ساتھ قبول کرلیا۔ مسلم کانفرنس کے سپاسنامہ کے جواب میں قائداعظم نے مسلم کانفرنس کے زعما کو اتحاد کی تلقین فرمائی اور یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ اقلیتوں کا تعاون واشتراک حاصل کرنے کے لئے پوری کوشش کریں

قائداعظم نے اس بار جن دو مقدموں میں حصہ لیا اُن میں سے ایک مقدمہ ایک سیاسی کارکن مہر علی کا تھا جو کشمیر ہائی کورٹ میں زیر سماعت تھا۔ مہر علی پر الزام تھا کہ انہوں نے ایک خاتون حنیفہ بیگم سے عدت کے دوران نکاح کیا ہے۔ مہر علی کو ماتحت عدالتوں سے سزا ہوئی تھی۔ مہر علی سیاسی کارکن تھے اور قائداعظم سے آپ کی ملاقات اسی حوالے سے ہوئی۔ قائداعظم نے اُن سے کہا کہ وہ پیشی کی تاریخ سے ایک دن پہلے مقدمہ کے کاغذات ان کو دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور قائداعظم دوسرے دن کشمیر ہائی کورٹ میں پیش ہوئے عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ قائداعظم کے مدمقابل ریاست جموں وکشمیر کا ایڈووکیٹ پنڈت امرناتھ کاک تھا جو ذہانت فطانت اور پیشہ ورانہ مہارت میں ریاست کا چوٹی کا وکیل خیال کیا جاتا تھا۔ قائداعظم نے عدالت عالیہ کو بتایا کہ عدت کا حساب کتاب عیسائی کیلنڈر کے مطابق کیا گیا ہے کیونکہ مہر علی مسلمان ہیں اور مسلمان عدت کا حساب قمری کیلنڈر سے کرتے ہیں، اگر قمری کیلنڈر کے مطابق عدت کا حساب کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مہر علی نے حنیفہ سے عدت ختم ہونے کے کچھ گھنٹے بعد نکاح کیا تھا۔ عدالت عالیہ نے اس دعویٰ کے لئے سند مانگی تو قائداعظمؒ نے برجستہ فرمایا کہ اس مقدمہ میں میرا بیان قانون کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ کشمیر ہائی کورٹ نے مہر علی کو باعزت بری کر دیا۔ قائداعظمؒ نے مہر علی سے کوئی فیس نہ لی کیونکہ وہ تحریک حریت کشمیر کے کارکن تھے۔

جسٹس خواجہ محمد یوسف صراف دوسرے مقدمہ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"دوسرا مقدمہ سوپور کے خواجہ عبدالعزیز پنڈت اور حکومت کے درمیان تھا۔ یہ دیوانی نوعیت کی اپیل تھی۔ اس میں قائداعظمؒ کو غالباً اٹھ سو روپے فیس ادا کی گئی جو انہوں نے انجمن نصرت الاسلام سرینگر کے ہائی سکول کو بطور چندہ دی۔"

تیسری بار قائداعظمؒ ۹ مئی ۱۹۴۴ء کو سرینگر تشریف لائے اور ۲۳ جولائی ۱۹۴۴ء کو واپس تشریف لے گئے جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ ۱۹۴۴ء میں قائداعظم برصغیر کے تمام مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر تھے اور ہندوستان کے مسلمان آپ کو قائداعظمؒ کا خطاب دے چکے تھے تین سال بعد پاکستان بننے والا تھا اور یہ خیال عام تھا کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہوگا کیونکہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ آپ کو کشمیر آنے دعوت دی جا چکی تھی ــــ مولوی محمد سعید۔ خواجہ غلام محمد صادق مرحوم اور شیخ عبداللہ آپ کو دہلی میں مل چکے تھے اور کشمیر آنے کی دعوت دے چکے تھے۔ شیخ عبداللہ چاہتے تھے کہ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس میں صلح صفائی ہو جائے۔ قائداعظم سوچیت گڑھ کے راستے ریاست میں تشریف لائے۔ آپکا خیر مقدم شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد نے کیا سوچیت گڑھ سے جموں اور جموں سے سرینگر آپ کو عظیم ترین جلوس کی شکل میں لایا گیا اس سفر کے دوران آپ نے رات باتہال میں گذاری بانہال سے سرینگر کا فاصلہ اسی میل ہے جو عام طور پر دو گھنٹے میں بذریعہ کار طے کیا جاتا ہے لیکن جلوس کی وسعت کا اندازہ لگائیے کہ یہ فاصلہ گیارہ گھنٹوں میں طے ہوا۔ سرینگر میں داخل ہوتے ہی آپ نے پرتاب پارک

میں ایک بہت بڑے جلسہ عام سے خطاب فرمایا اور کہا کہ اہل کشمیر نے میرا شاہانہ استقبال کیا ہے۔ یہ جلسہ نیشنل کانفرنس یعنی شیخ عبداللہ کی نگرانی میں ہوا اور اس میں سپاسنامہ بھی شیخ عبداللہ نے پیش کیا۔ قائداعظم نے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ان کا استقبال جس عقیدت اور شان سے ہوا ہے یہ دراصل ہندی مسلمانوں کی عزت افزائی ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ استقبال میری ذات کے لئے نہیں ہندوستان کے مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔

سرینگر میں آپ کو کئی دعوتیں دی گئیں لیکن دو دعوتیں یادگار ہیں۔ ایک دعوت علی گڑھ اولڈ بوائیز ایسوسی ایشن کی طرف سے تھی۔ دوسری دعوت میر واعظ کشمیر حضرت مولانا محمد یوسف شاہ مرحوم نے دی جس میں تین سو مہمانوں نے شرکت کی۔ اس دعوت میں قائداعظم شیروانی اور شلوار پہن کر تشریف لائے اور پہلی بار فرش پر بیٹھ کر کشمیری انداز میں کھانا تناول فرمایا۔ آپ کے لئے جو کھانا تیار کیا گیا اُس میں مرچ مصالحہ کم ڈالا گیا تھا۔ کھانے کے دوران سالن کے چند چھینٹے آپ کی شلوار پر گرے۔ دعوت کے بعد میر واعظ مرحوم نے آپ کو کشمیری پوشاک پیش کی، اس کے علاوہ آپ کو شلوار زری کے جوتے اور کشمیری شال بھی پیش کی گئی۔ آپ نے کشمیری شال اہل کشمیر کی طرح اوڑھی اور حاضرین دعوت سے مخاطب ہو کر بولے "کیا اب میں کشمیری لگ رہا ہوں!"

۱۷ جون کو مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس جامع مسجد کے وسیع احاطہ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں قائداعظمؒ نے تقریر فرمائی حاضرین اجلاس کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ جب آپ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو پندرہ منٹ تک تالیوں کی گونج نے سارے احاطہ کا احاطہ کر لیا۔ ہر طرف سے تالیاں اور نعرے امڈ رہے تھے۔ لوگ پگڑیاں اور ٹوپیاں اظہار مسرت کے لئے ہوا میں اچھال رہے تھے۔ کچھ حاضرین خوشی کے مارے رو رہے تھے عجیب منظر تھا۔ آپ نے اُردو میں تقریر کی اور برملا فرمایا کہ اہل کشمیر کی امداد ہندوستان کے مسلمانوں کا مقدس فریضہ ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے وہ اہل کشمیر کو امداد کا پورا پورا یقین دلاتے ہیں۔

۲۳ جولائی کو آپ جہلم ویلی روڈ سے راولپنڈی کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں آپ نے بارہمولا۔ اُوڑی اور مظفرآباد میں منعقدہ عام جلسوں میں تقریریں کیں۔ مظفرآباد میں آپ نے ایک رات کے لئے قیام بھی فرمایا۔ آپ نے یہ رات دومیل کے اس ڈاک بنگلہ میں گذاری جس میں دو سال بعد پنڈت جواہر لال نہرو چند گھنٹوں کے لئے قید رہے۔ اگلے دن آپ راولپنڈی چلے آئے۔

سرینگر میں آپ نے سر مراتب علی کی کوٹھی کوٹنگ میں قیام کیا حکومت ریاست جموں و کشمیر نے آپ سے سرکاری مہمان خانہ میں بطور سرکاری مہمان ٹھہرنے کی استدعا کی جو آپ نے قبول کر لی۔ یہ دعوت دو ہفتوں کے لئے تھی لیکن آپ سرکاری مہمان خانہ میں ایک ہفتہ ٹھہر کر واپس کوٹنگ آ گئے۔

"آر۔سی۔ڈی۔ انقلاب آفریں دور میں"

شبنم حبیب

ترکی کے مشہور شہر ازمیر میں آر۔سی۔ڈی (علاقائی تعاون برائے ترقی) کے ممبر ممالک کے سربراہوں کی حالیہ کانفرنس میں علاقائی تعاون برائے ترقی کے پروگراموں پر بدلتے ہوئے عالمی حالات کی روشنی میں غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لئے ممبر ممالک ایک عہد نامہ کریں گے جسے "عہد نامۂ ازمیر" کا نام دیا جائے گا۔ اس عہد نامے کا مسودہ تین ماہ کی مدت کے اندر اندر تیار ہو کر تینوں ممبر ممالک کے دستخطوں کے لئے پیش کر دیا جائے گا۔

آر۔سی۔ڈی میں جو وسعت اس معاہدے میں ملحوظ رکھی گئی ہے اس کا اندازہ وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کا وہ مضمون فراہم کرتا ہے جو ازمیر کانفرنس سے قبل اخبارات میں شائع ہوا تھا اور دوسرا ترکی وزیرِ خارجہ جناب احسان صابری کا وہ اخباری بیان ہے جو آپ نے کراچی میں گذشتہ سال نومبر کے مہینے میں دیا تھا آپ نے اپنے بیان میں کہا تھا آر۔سی۔ڈی ممالک کی مشترکہ دفاعی صنعتوں کی بنیاد پہلے ہی رکھی جا چکی ہے۔ آپ نے آگے چل کر اپنے بیان میں یہ بھی فرمایا تھا کہ ایک ملک کے دفاعی کام کی ذمہ داری کسی غیر ملکی ٹھیکیدار کو نہیں سونپی جا سکتی۔ اپنے بیان میں جناب احسان صابری نے ایک اور اہم بات یہ کہی تھی کہ آر۔سی۔ڈی میں کسی اور ملک کی شمولیت کے ضمن میں یہ دیکھنا ہوگا کہ جو ملک اس ادارے میں شمولیت کا خواہاں ہے آیا وہ امن پسند بھی ہے۔

اس کانفرنس میں جو دیگر فیصلے کئے گئے ان میں سے اہم یہ ہیں :-

(۱) آر۔سی۔ڈی ممالک کو دس سال کے عرصے کے اندر اندر آزاد تجارتی علاقہ بنا دیا جائے۔

(۲) صنعت، زراعت، تیل اور تیل کی مصنوعات، تجارت، بینکاری، بیمہ کاری، سیاحت، ٹرانسپورٹ، مواصلات، فنی تعاون، پبلک ایڈمنسٹریشن، ثقافتی اور ابلاغ عامہ کے میدانوں میں موجودہ تعاون کو اور وسعت دی جائے۔

(۳) آر۔سی۔ڈی جہاز ران کمپنی کا قیام عمل میں لایا جائے اور تینوں ممالک کے درمیان جہاز رانی کے راستے میں جو دشواریاں حائل ہیں وہ دور کی جائیں۔

(۴) مختلف شعبوں میں ہنرمندوں کی علاقائی مانگ کے پیشِ نظر تین تربیتی مراکز قائم کئے جائیں۔ ان میں سے سائنس اور ٹیکنالوجی کا ادارہ ایران میں اکنامکس (اقتصادیات) کا

اسکول اسلام آباد (پاکستان) میں اور سیاحت اور ہوٹل کی انتظامیہ کا ادارہ ترکی میں قائم کیا جائے۔ ان کے علاوہ اسلام آباد (پاکستان) میں ایک سائنس فاؤنڈیشن بھی کھولا جائے گا جو ممبر ملکوں کو زیادہ سے زیادہ ہنرمندوں اور ماہرین کی مطلوبہ تعداد مہیا کرے گا۔

(۵) ثقافتی اور دوستانہ وفدوں کے تبادلوں کو فروغ دینے کے لئے ایک یوتھ فاؤنڈیشن قائم کیا جائے۔

(۶) تینوں ممبر ممالک کے مرکزی بینک اپنے اپنے ملک کے برآمدی تاجروں کو ممبر ممالک کے درمیان برآمدات کے لئے قرضوں کی سہولتیں فراہم کریں اور۔

(۷) سفر کی سہولتوں کے پیشِ نظر شاہراہ آر۔سی۔ڈی کی تعمیر و ترقی اور تینوں ممالک کو ملانے والی ریلوں کے نظام کو اوّلیت کا درجہ دیا جائے۔

علاقائی تعاون برائے ترقی کا ادارہ

علاقائی تعاون برائے ترقی یا آر۔سی۔ڈی کا ادارہ جو ۲۱ جولائی ۱۹۶۴ء کو استنبول میں ترکی، ایران اور پاکستان کے سربراہوں کی کانفرنس کے موقع پر وجود میں آیا۔ دراصل ان تینوں ممالک کے باشندوں کی دلی خواہش کا نتیجہ ہے۔ اور یہ خواہش کوئی سیاسی خواہش نہ تھی بلکہ مقصد یہ تھا کہ چونکہ یہ تینوں ممالک جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی، مذہبی اور تمدنی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں اس لئے یہ مشترکہ طور پر ایک ایسی تنظیم بنالیں جو ان کی ترقی کے لئے اقتصادی، معاشی اور ثقافتی میدانوں میں موثر علاقائی تعاون کی حامل ہو۔ چنانچہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اب یہ ادارہ ایک اہم، فعال اور طاقتور ادارہ بنتا چلا جارہا ہے جس کا مستقبل نہایت درخشندہ اور تابناک ہے۔ گذشتہ بارہ برسوں کے دوران اس کی کارگذاری سے یہ ثابت ہوا ہے کہ آر۔سی۔ڈی ممالک کی اقتصادی قوت بہت زیادہ ہے اور یہ ممالک دیگر ملکوں کے ساتھ اپنے روائتی اقتصادی تعلقات جاری رکھ کر بھی ایک دوسرے کے ساتھ مشترکہ صنعتی، فنی، تجارتی، مواصلاتی، معاشی اور ثقافتی میدانوں میں رابطے قائم رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ جو خواب بارہ سال قبل دیکھا گیا تھا وہ آہستہ آہستہ شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے اور وہ منصوبے جو بہت حد تک خیالی متصور ہوتے تھے اب عملی جامہ پہن رہے ہیں۔

گو اس ادارے کو گذشتہ برسوں میں کافی دقتوں کا سامنا رہا اور یہ قابلِ قدر ترقی کرنے سے قاصر رہا۔ تاہم ممبر ممالک نے اسے تمام ضروری مدد اس لئے بہم پہنچائی کہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ یہ ادارہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی پوری اہلیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی بات کے پیشِ نظر تینوں ممبر ملکوں کی حکومتوں کی وزارتی کونسل کے نمائندوں نے اپریل ۱۹۷۲ء میں اپنے مشترکہ اعلامیہ میں اس ادارے کی مقصدیت اور افادیت پر پوری تسلی کا اظہار کیا اور کہا کہ عالمی اقتصادی میدان میں اہم اور دوررس ترقی کے پیش نظر اس ادارے کو اور مستحکم بنانے کے لئے تمام ضروری اقدامات کئے جائیں۔ چنانچہ وعدہ کیا گیا کہ مشترکہ صنعتیں لگانے۔ فنی ماہرین کے تبادلوں، مواصلاتی نظام اور بین علاقائی تجارت کے سلسلے میں ایک دوسرے پر انحصار اور تعاون کو مزید فروغ دیا جائے گا۔

صنعتوں کا قیام

صنعتوں کے قیام کے سلسلے میں اس بات کو پیش نظر رکھا گیا تھا کہ جدید طرز کی صرف ایسی صنعتیں قائم کی جائیں جو تینوں ممالک کی ضروریات پوری کریں اور ان کی منصوبہ بندی کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ ان صنعتوں میں سے کوئی بھی دوہرے پن کا شکار نہ ہونے پائے تاکہ ہر ممبر ملک اقتصادی طور پر مضبوط بھی

ہو جائے اور غیر ملکی قرضوں پر اُس کا انحصار بھی کم ہو جائے۔

اسی اصول کے تحت ایسی کُل پچاس مشترکہ صنعتیں لگانے کی منظوری دی گئی۔ ان میں سے ۱۸ صنعتیں اب پیداواری دور میں داخل ہو چکی ہیں۔ ان ۱۸ میں سے ۹ صنعتیں پاکستان میں قائم کی گئیں، اور باقی ترکی اور ایران میں۔ جو صنعتیں پاکستان میں لگائی گئیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ کرنسی نوٹوں کے لئے کاغذ کا کارخانہ۔
۲۔ بال بیئرنگ بنانے کا کارخانہ۔
۳۔ تیل بنانے کا کارخانہ۔
۴۔ شاک ایبزاربر سپرنگوں کا کارخانہ۔
۵۔ مشینی اوزار بنانے کا کارخانہ۔
۶۔ گاڑیوں کے گیئر بکس اور ڈیفرینشل بنانے کا کارخانہ۔
۷۔ یوریا فارمل ڈی ہائیڈ کا کارخانہ
۸۔ میتھونال اور گلیسرین بنانے کا کارخانہ۔

جو کارخانے ترکی اور ایران میں قائم کئے گئے وہ یہ ہیں:

۱۔ المونیم کا کارخانہ۔
۲۔ ٹنگسٹن کار بائیڈ بوریکس اور بورک ایسڈ بنانے کا کارخانہ۔
۳۔ سینٹری فیوگل سپیشل فلٹر بنانے کا کارخانہ۔
۴۔ ہائی ٹینشن اِنسولیٹرز کا کارخانہ۔
۵۔ ٹیٹرا سائیکلین بنانے کا کارخانہ اور کئی ایک دوسری صنعتیں

ان کے علاوہ متعدد ایسے صنعتی منصوبے ہیں جن کا قیام اصولی طور پر منظور کیا جا چکا ہے اور ابھی پیداواری دور میں داخل نہیں ہوئے یا اُن کے متعلق ابھی گفت و شنید جاری ہے۔

متذکرہ بالا صنعتی منصوبے پیداواری دور میں داخل ہو چکے ہیں اور ان کی پیداوار کے تبادلے ممبر ممالک میں پہنچنے شروع ہو گئے ہیں۔

ایران کے ساتھ فروری ۱۹۷۶ء کے ایک معاہدے کے تحت پاکستان میں کپڑے، کھاد اور سیمنٹ کے مشترکہ بڑے بڑے کارخانے بھی قائم کئے جا رہے ہیں۔

تیل اور تیل کی مصنوعات

تیل اور تیل کی مصنوعات کے میدان میں تینوں ملکوں کے تعاون کو اوّلیت دی گئی تھی مگر اس ضمن میں لاتعداد پیچیدگیوں اور دشواریوں کے پیشِ نظر ابھی تک یہ معاملہ گفت و شنید اور وضاحتوں تک محدود ہے۔ دراصل اس صنعت میں تینوں ممالک میں مشترکہ تیل کی دریافت اور اُسے کام میں لانا۔ تیل صاف کرنے اور تیل کی مصنوعات کے مشترکہ کارخانے لگانا اور اسے تقسیم کرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لانا پہنچانا اور منڈی میں پہنچانا شامل ہیں اس لئے اس صنعت کے منصوبوں کو ابھی تک عملی شکل نہیں دی جا سکی۔

پاکستان میں گلیسرین کا جو کارخانہ کام کر رہا ہے اُس کی پیداوار ترکی درآمد کر رہا ہے۔ ترکی کا ڈوڈی۔ سیل بینزین کا کارخانہ ۱۹۷۳ء سے پیداواری دور میں داخل ہے اور یہی حال ترکی کے پولی تھین کے کارخانے کا ہے۔ ایران میں سیاہ کاربن کا کارخانہ بھی پیداواری دور میں داخل ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ کیپروکیلٹم پولی بوٹاڈین ربڑ۔ ایرومیٹکس (خوشبویات) اور پلاسٹی سائیزر کے کارخانے ایران اور ترکی میں آئندہ چند برسوں تک کام شروع کر دیں گے۔

اس صنعت کے سلسلے میں کچھ اور پہلوؤں سے کامیابی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ممبر ملکوں کی سرحدوں پر موٹر گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کے لئے تیل حاصل کرنے کے سٹیشن قائم ہو چکے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ تیل اور تیل کی مصنوعات کے ماہرین اور تربیت حاصل کرنے والوں کے تبادلے بھی تینوں ملکوں میں تسلی بخش حد تک ہو رہے ہیں۔ تیل

اور تیل کی مصنوعات کی صنعت کے متعلق تینوں ممالک میں معلومات کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایران کی نیشنل آئیل کمپنی کروڈ آئیل کی بین الاقوامی فروخت میں اپنی سالانہ فروخت کی پالیسیوں کے طے ہوجانے پر پاکستان اور ترکی کو اولیت دے گی۔ اسی سلسلے میں ترکی تک قدرتی گیس کی پائپ لائن بچھانے کے لئے بھی حالات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

تجارت

تجارتی میدان میں بدقسمتی سے کوئی ترقی نہیں ہوئی حالانکہ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ آر۔سی۔ڈی کا ایوان تجارت وصنعت آر سی ڈی کی جہازرانی کمپنیاں اور آر۔سی۔ڈی کی مشترکہ بیمہ کمپنیاں قائم کی جائیں گی اور آر۔سی۔ڈی کے تجارتی معاہدے وغیرہ کئے جائیں گے۔ آر۔سی۔ڈی کی علاقائی تجارت تینوں ممبر ممالک کی عالمی تجارت کا صرف ۲ فیصد رہی۔ چنانچہ جب علاقائی تجارت اور اقتصادیات کے وزیروں کی میٹنگ ستمبر ۱۹۶۸ء میں ہوئی تو یہ معاملہ UNCTAD کے حوالہ کیا گیا اور جب مئی سن ۱۹۷۰ء میں ازمیر میں علاقائی سربراہوں کی کانفرنس ہوئی تو اس میں متعلقہ علاقائی وزیروں کو ہدایات دی گئیں کہ وہ جلد از جلد ایسے اقدامات کریں جن سے کسٹم وغیرہ کی پابندیاں اور مشکلات کو کم کیا جاسکے۔

بیمے کا مشترکہ نظام

بیمے کے مختلف شعبوں میں سن ۱۹۷۳ء تک ۴۴ کمپنیوں کا اشتراک عمل میں آچکا تھا جن کی سالانہ بیمہ اقساط کی آمدنی ڈیڑھ کروڑ ڈالر تک تھی۔ اس کے علاوہ آر۔سی۔ڈی کے بیمہ کے بین الاقوامی سکول نے جو سن ۱۹۷۱ء میں قائم ہوا تھا خاص شعبوں میں تحقیق کے لئے مینیجروں اور عملے کو ضروری تربیت دی ہے۔

سلسلۂ مواصلات

آر۔سی۔ڈی کے تینوں ممبر ملکوں کو آپس میں ملانے کیلئے ایک شاہراہ پر کام شروع کیا گیا تھا جو اب قریب قریب مکمل ہوگئی ہے۔ اس شاہراہ کی کل لمبائی ۱۰۷ر۵ کلومیٹر یا ۳۰۲ر۲ میل ہے ایران میں اس شاہراہ کی لمبائی ۲۶۵۶ کلومیٹر (۱۶۶۳ میل) پاکستان میں ۳۱۷ر۱ کلومیٹر (۸۰۰ میل) اور ترکی میں ۲۰۶ر۱ کلومیٹر (۷۰۹ میل) ہے۔ تجارتی نقطۂ نگاہ سے یہ شاہراہ بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اس کے مکمل ہونے سے آر۔سی۔ڈی کے تینوں ممبر ملک ایک دوسرے کے اور قریب ہو جائیں گے۔

ریلوے لائن

اس شاہراہ کے علاوہ ۵۰۰ر۵ کلومیٹر (۶۳۲ر۳ میل) لمبی ریلوے لائن بھی آر۔سی۔ڈی کے ممبر ملکوں کو آپس میں ملائے گی۔ اس ریلوے لائن کا ایران میں صرف ۶۰۰ کلومیٹر (۳۷۰ میل) لمبا ٹکڑا بننا ابھی باقی ہے جو امید ہے ۱۹۸۰ء تک مکمل ہو جائے گا۔ اس کے مکمل ہو جانے پر یہ ریلوے لائن صرف بین الاقوامی سفر اور سامان کی ترسیل کے لئے سہولتیں بہم پہنچائے گی بلکہ ایشیا کے اس پار مواصلاتی نظام سے بھی جا ملے گی اور اس طرح مشرق بعید سے روانہ ہوکر خشکی کے راستے یورپ اور یورپی منڈیوں تک رسائی ہوجائے گی۔

ہوائی رابطہ

گو موجودہ صورت میں ان تینوں ملکوں کی قومی ہوائی کمپنیوں یعنی ایران ایئر، پی۔آئی۔اے اور ٹی۔ایچ۔وائی کے درمیان محدود قسم

کا تعاون جاری ہے تاہم سامان کے رسد کے سلسلے میں ایک مشترکہ ہوائی کمپنی کا قیام ضروری ہے۔ اس ضمن میں اقوام متحدہ کے ایک ماہر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جس نے اپنی رپورٹ جلد مرتب کرکے آر۔ سی۔ ڈی کے سیکرٹریٹ کو پیش کردی ہے۔

جہازرانی

آر۔ سی۔ ڈی کے لئے ایک جہازران کمپنی "آر۔ سی۔ ڈی شپنگ سروسز" کا قیام جولائی ۱۹۶۵ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ اس میں پاکستان کے ۴۴ فیصد حصص ہیں اور ایران اور ترکی کے اٹھائیس اٹھائیس فیصد شپنگ سروسز ہیں اب تک قریباً تمام بڑی بڑی علاقائی جہازران کمپنیاں شامل ہو چکی ہیں۔ اس کے جہاز ممبر ملکوں کے درمیان چلنے کے علاوہ امریکی راستوں پر بھی چلتے ہیں۔ سروسز کے اندر تینوں ممالک کی جہازران کمپنیوں کا تعاون قابلِ ستائش ہے۔ اب جبکہ نہر سویز کھل گئی ہے اس کا مستقبل زیادہ تابناک ہو گیا ہے۔

ڈاک اور تار کا نظام

تینوں ممالک کے ڈاک اور تار کے محکمے ایک دوسرے سے پورا پورا تعاون کر رہے ہیں اور علاقائی ڈاک کے لئے خاص شرح مقرر ہے۔ علاقائی ہوائی جہاز کمپنیوں کے ذریعہ ڈاک کی ترسیل زیادہ سے زیادہ ہو رہی ہے۔ علاقائی ڈاک کے محکموں کا آپس میں رابطہ رہتا ہے۔ اور اب ایک علاقائی پوسٹل یونین بنانے کا معاملہ بھی زیرِ غور ہے علاقائی ڈاک اور تار کی انتظامیہ ہر سال ۲۱ اپریل کو آر۔ سی۔ ڈی کے ڈاک کے یادگاری ٹکٹ جاری کرکے اس ادارے کی سالگرہ مناتی ہے۔

تہران کا بین الاقوامی مائکرو ویو کنٹرول سینٹر تسلی بخش طور پر کام کر رہا ہے اور پاکستان کے مواصلاتی سیاروں کے سٹیشن بھی خوش اسلوبی سے استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔ جب ترکی کے مواصلاتی سیاروں کا سٹیشن اس سال کام شروع کر دے گا تو علاقائی مواصلاتی نظام مزید فعال اور کارآمد ہو جائے گا۔ علاقائی تار اور ٹیلی فون کے پیغامات کے لئے رعایتی شرح مقرر ہے۔

فنّی تعاون

فنّی تربیت۔ ماہرین کے تبادلوں اور طلباء کے وظائف کے سلسلے میں بھی تسلی بخش تعاون کا مظاہرہ ہوا ہے۔ دراصل آر۔ سی۔ ڈی کے تعاون کے پروگرام کی بنیاد "اپنی مدد آپ" اور "اقتصادی ترقی کے لئے علاقائی وسیلوں پر انحصار" کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ لہٰذا اب تک اس پروگرام کے تحت ۱۶۰۰ فنی ماہرین کو کان کنی۔ زراعت۔ صنعت۔ سائنس۔ صحت اور دیگر مختلف شعبوں میں تربیت دی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ ۶۸ ماہرین نے ممبر ملکوں کی اپنے اپنے شعبوں میں مدد کی اور ۱۰۰۰ وظائف جاری کئے گئے۔ اب تک اس پروگرام کے تحت ۴۵ سیمینار منعقد کئے جا چکے ہیں۔ اس میدان میں آر۔ سی۔ ڈی کی علاقائی مشاورتی کونسل برائے سائنس و ایٹمی ریسرچ نے بھی تینوں ملکوں کے درمیان تعاون بڑھایا ہے اور تینوں ملکوں کی ایٹمی توانائی کی تنظیموں کے سربراہوں کی میٹنگ سے اس تعاون میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

اسی طرح ثقافتی، سماجی اور ابلاغِ عامہ کے میدانوں میں بھی آر۔ سی۔ ڈی کے طے شدہ پروگراموں کے تحت خاصا تعاون ہوا ہے اور کھیلوں کے سلسلے میں بھی تعاون کی رفتار کافی حد تک تسلی بخش رہی ہے۔

آر۔ سی۔ ڈی کا تنظیمی ڈھانچہ

آر۔ سی۔ ڈی کے ڈھانچے کے اہم اور بڑے ادارے یہ ہیں :۔

(i) وزارتی کونسل۔ (ii) علاقائی منصوبہ بندی کی کونسل۔

(iii) آر۔ سی۔ ڈی کی کمیٹیاں۔
(iv) آر سی۔ ڈی سیکریٹریٹ۔
(v) آر۔ سی۔ ڈی ماہرین کی ایجنسیاں مثلاً
(ا) ثقافتی انسٹی ٹیوٹ۔
(ب) بیمہ کاری کا مرکز۔
(ت) شپنگ سروسز

۱۔ آر۔ سی۔ ڈی کا سب سے بڑا اور آخری فیصلے کرنے والا ادارہ وزارتی کونسل تینوں ممبر ملکوں کے خارجہ امور کے وزراء پر مشتمل ہوتا ہے۔ عام حالات میں اس کونسل کا اجلاس ۶ سے ۹ مہینوں کے اندر بلایا جاتا ہے۔ اجلاس کے لئے جگہ کا تعین باری باری ہر ممبر ملک میں ہوتا ہے۔

۲۔ علاقائی منصوبہ بندی کونسل تین ممبروں پر مشتمل ہوتی ہے جو تینوں ممالک کے منصوبہ بندی کے سربراہ ہوتے ہیں۔ یہ اپنی سفارشات وزارتی کونسل کو پیش کرتی ہے اور اس کا اجلاس وزارتی کونسل کے اجلاسوں سے قبل ہوا کرتا ہے۔

۳۔ رابطہ کمیٹی
یہ کمیٹی آر۔ سی۔ ڈی کی مختلف کمیٹیوں کے درمیان رابطہ قائم رکھتی ہے یہ کمیٹی علاقائی منصوبہ بندی کون کی رپورٹوں کے وزارتی کونسل کے فیصلوں کے اور مشترکہ اعلامیوں کے مسودے تیار کرتی ہے۔

۴۔ آر۔ سی۔ ڈی کی خاص خاص شعبوں کے لئے کمی ہیں اور ان کی ذمہ داریوں کے متعلق ان کے ناموں سے پتہ چل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر صنعتی کمیٹی۔ تجارتی کمی وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ آر۔ سی۔ ڈی کے سیکریٹریٹ کا مستقل قیام تہران میں ہے۔ اس کے سیکریٹری جنرل کی تقرری تینوں ممبر ملکو رضامندی سے ہوتی ہے۔ ہر تین سال کے بعد نئے سیکر جنرل کی نامزدگی کی جاتی ہے۔ ہر ممبر ملک ایک ایک ڈ سیکریٹری جنرل اور دو دو ڈائرکٹروں کا تقرر کرتا اس سیکریٹریٹ کے موجودہ عملے میں ایک سیکریٹری جنر تین ڈپٹی سیکریٹری جنرل اور چار ڈائریکٹر ہیں۔ موجو سیکریٹری جنرل ڈاکٹر احمد مینائی ہیں جو ایران کے منجھے ہوئے سفارتی عہدیدار ہیں۔ آر۔ سی۔ ڈی کی کارگزاری کی سالانہ رپورٹ بھی سیکریٹریٹ مرتب کرتا ہے۔

اُردو قصیدہ نگاری کے ارتقاء کا مختصر جائزہ

آغا سہیل

اُردو میں قصیدہ نگاری کی تاریخ اتنی شاندار نہیں ہے جس قدر کہ فارسی ادب کی ہے۔ کیونکہ آمرانہ نظامِ حکومت اور آمرانہ طمطراق کو ایران سے ایک خاص نسبت رہی ہے۔ تاہم برصغیر میں بھی فارسی قصیدہ گو شعراء کی کمی نہیں۔ اکبرؔ اور جہانگیر کے دربار میں عرفیؔ اور نظیریؔ کے علاوہ بھی ایسے ایسے شعراء ملتے ہیں کہ جو فی البدیہہ قصیدے لکھنے میں اور ارتجالاً شعر کہنے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ نظیریؔ اور عرفیؔ کے باہم مقابلے ہوتے تھے تو قصیدہ نگاری کی ایک فضا پیدا ہوگئی تھی۔ عرفیؔ نے قصیدے میں ایک وقیع مقام بنالیا اور وہ سرِ دربار ایسے ایسے قصائد پڑھتا تھا کہ اہلِ دربار انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔ عرفیؔ کے قصیدے میں ممدوح عموماً سرورِ کونین ﷺ کی ذات بابرکت ہوتی یا حضرت علیؓ ممدوح ہوتے اگر کسی آمرِ مطلق کی شان میں قصیدے لکھنے کی نوبت آ بھی جاتی تو اسے ہرگز ممدوح نہ بناتا بلکہ معشوق بنا کر پیش کرتا، اور اگر دس اشعار ممدوح کی شان میں کہتا تو بیس اشعار پہلے اپنی شان میں کہہ لیتا۔ تسکینِ نخوت کا یہ انداز باغیانہ اور متکبرانہ سمجھا جاتا تھا لیکن اکبر اور جہانگیر نے کبھی عرفیؔ کی اس شاعرانہ تعلّی سے تعرض نہ کیا اور عرفیؔ بدستور :

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نخورد نیشتر ولا و نعم را
بے برگیٔ من داغ نہد در دل سامان
بے مہری من زرد کند روے درم را

کے نغمے الاپتا رہا۔ اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ اُردو [illegible] عرفیؔ پیدا نہ ہوسکا۔ دکن میں نصرتیؔ کے علاوہ اور کسی شاعر کے قابلِ ذکر قصائد نہیں ملتے، شمالی ہند میں سوداؔ نے قصیدے [illegible] طرف توجہ کی اور اپنے پرشکوہ، مہتم بالشان اور بانکے انداز [illegible] کی خوب داد وصول کی، اس میں شک نہیں کہ الفاظ کی ردوبست اور پرشکوہ لغات، اور اس کے گھنگھرج کے استعمال میں سوداؔ کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی وہ خود کو عرفیؔ عصر بھی سمجھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرفی کا سا دم خم اور عرفیؔ کا مزاج ان کو میسّر نہ تھا۔ وہ محض نقل پر قادر تھے سودا ہی کرتے رہے اور عرفیؔ کی زمینوں میں قصائد لکھتے رہے مگر وہ طمطراق جو عرفیؔ کی شخصیت کا جزو تھا سوداؔ کو میسّر نہ تھا۔ سوداؔ کا مشہور قصیدہ،

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اُردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

عرفی کی زمین میں ہے لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ دونوں کا تقابل ایک فضول اور مہمل سا خیال ہے یا طفلانہ خوش فعلی، کیونکہ عرفی نے قصیدے کے معروضی مزاج کو داخلی اور درونی بنایا اور اسے اپنے واردات قلب کو بیان کرنے کا وسیلہ قرار دیا، سودا کا مزاج معروضی تھا۔ داخلیت وہ اس میں داخل نہ کر سکے جس کے سبب عرفی نے قصیدے کو بحیثیت صنف ادب کے کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا ذوق نے بھی سودا کا اتباع کیا اور زیادہ تر انہیں کی زمینوں میں قصائد لکھے، محاورے اور روزمرہ کے بیان میں یدِ طولیٰ حاصل کیا مگر سودا کے فن کی بازگشت کے سوا اور کچھ ذوق کے فنِ قصیدہ نگاری میں خاص جذب وکشش نظر نہیں آتی، غالب نے جو ذوق کے ہم عصر بھی تھے اور ظفر کے دربار سے وابستہ تھے اپنے ڈھنگ اور اپنے مزاج پر قصائد کا طور باندھا، کچھ سودا اور عرفی کو ملحوظ رکھا لیکن ان کے قصائد میں رنگِ غزل جھلکتا رہا البتہ فارسی میں غالب کے قصائد ایک خاص طنطنہ رکھتے ہیں۔

منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، جلال لکھنوی اور تسلیم وغیرہ کے قصائد اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں لیکن یاد رہے کہ سودا، ذوق اور غالب کے زمانوں میں پھر بھی بادشاہت قائم تھی دربار موجود تھے اور جاگیرداری نظام کا وہی شان وشکوہ تھا اس لئے قصیدے کی صنف کسی حد تک نبھ گئی، منیر، امیر، جلال اور تسلیم وغیرہ کے زمانے میں برائے نام بھی بادشاہت نہ تھی، اگر تھی تو وہ سات سمندر پار تھی اور یہاں محض اس کے نمائندے موجود تھے جن کے مغربی مخدوم و ہم مشرقیت کو بار نہ پانے دیتے تھے۔ نیز یہ کہ جاگیرداروں کا حال بھی پتہ تھا ان کے وظائف یا لگان درباداریوں کے متحمل نہ تھے۔ تاہم چھوٹی موٹی ریاستوں سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ ان شعراء کی پذیرائی میں کرتی تھیں۔ لیکن جو کچھ کرتی تھیں وہ بقدر سد رمق کا درجہ رکھتا تھا، اسی طرح محسن کوروی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی، نجم آفندی، رزم ردولوی اور جمیل مظہری وغیرہم نے بھی قصائد لکھے اور اس صنف کو زندہ رکھنے کی سعی کی لیکن چونکہ ان شعراء کے قصائد میں بیشتر روحانی تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر بر بنائے ارادت و عقیدت نعت اور منقبت کے مضامین باندھے گئے۔ اس لئے قصیدے کی صنف ایک طرح سے معدوم ہونے لگی۔ ان تمام شعراء نے حضور سرور کائنات ؐ کی شان میں نعتیہ اور حضرت علیؑ کی شان میں منقبتیہ قصائد لکھ کر ہرچند کہ فنی مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا۔ لیکن قصیدے کی صنف میں جب دنیاوی ممدوح کے اوصاف کے بیان میں مبالغے اور غلو سے کام لیا جاتا تھا اور صنائع لفظی و معنوی کا بے دریغ استعمال ہوتا تھا تو شاعر کا کمال کھلتا تھا اور اس کے جوہر نظر میں آتے تھے۔ عقیدت و ارادت کی فضا خواہ کتنی ہی مقدس کیوں نہ ہو اس فضا میں کہنے اور سننے والے کے لئے جو جبر کا پہلو نمایاں ہے وہ در اصل اس کے بیان کے عجز کا پہلو ہے۔ پاکستان میں بھی بعض مرثیہ گو شعراء نے قصیدے سے رجوع کیا ہے اور ان میں بعض کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن بجائے خود صنف قصیدہ میں بطور خاص کوئی بھی قابلِ ذکر نہیں ہے کیونکہ ان سب نے جزوی حیثیت سے قصیدے کے خال خال اوصاف میں اکا دکا اشعار کہہ لیئے ہیں بجائے خود صنف کو مفرد شکل میں استعمال نہیں کیا۔

بناوٹ یا ہیئت میں قصیدہ غزل کی صنف سے مختلف نہیں ہے لیکن بمراحل اس کے پانچ اہم اجزاء قابلِ توجہ ہوتے ہیں جنہیں مطلع، تشبیب یا تمہید، گریز، مدح اور اظہار مدعا اور دعا کہتے ہیں، دعا پر خاتمۂ کلام ہوتا ہے۔ عام طور پر تشبیب کے اشعار بہاریہ یا شبابیہ ہوتے ہیں یعنی شاعر یا تو بہار سے تشبیب کا آغاز کرتا ہے یا شباب کے مضامین نظم کرتا ہے۔ تشبیب کا حصہ جس قدر جاندار ہوتا ہے قصیدے کی ساخت اسی قدر اچھی اور اس کی اٹھان اتنی ہی ذیشان ہوتی ہے مثلاً سودا کا مشہور قصیدہ جس کا مطلع اوپر درج کیا گیا کہ:

"اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

بہت جاندار ہے کیونکہ آگے چل کر بہار کا جس طرح ذکر
یا ہے وہ اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور بجائے خود صنائع و بدائع کے لحاظ
سے جاذبِ توجہ بھی مثلاً صنعت حسنِ تعلیل کے لحاظ سے یہ اشعار
حظہ فرمائیے :

سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک
دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عز وجل
واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ
آبجو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

دوسرے اشعار میں صنعت حسنِ تعلیل کے علاوہ بھی دوسری
نعتیں قابلِ توجہ ہیں :

بخشتی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی
پوشش چھینٹ قلمکار بہر دشت وجبل
عکس گلبن یہ زمیں پہ ہے کہ جس کے آگے
کار نقاشی مانی ہے دوم وہ اوّل
سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہراک گل پر
ساغرِ لعل میں جوں کیجئے زمرد کو حل
بار سے آبِ رواں عکس ہجوم گل کے
لوٹے ہے سبزے پہ از بس کہ ہوا ہے بے کل
آبجو گرد چمن لمحہ خورشید سے ہے
خط گلزار کے صفحے پہ طلائی جدول
چشم نرگس کی بصارت کے زبس ہے در پئے
غنچۂ لالہ نے سرمے سے بھری ہے مکحل
لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

اس تشبیب میں بہار کا زور ہے، سودا نے تشبیب میں
تراعات بھی کی ہیں مثلاً رزمیہ بھی بیان کئے ہیں شجاع الدولہ
نے حافظ رحمت خاں کو شکست دی تو سودا نے قصیدے کی تشبیب
میں رزمیہ لکھ دیا۔ یہاں تک بھی غنیمت ہے لیکن بعض اوقات تضحیک
روزگار قسم کی ہجویہ منظومات کو بھی قصیدہ کہا گیا، سو غلط ہے،
کیونکہ ان کا نام قصیدہ رکھ دینے سے ان کا مزاج نہیں بدل سکتا
یہ صاف صاف ہجویہ کلام ہے۔ اس کی معروضیت ہرچند کہ تاریخی و
معاشرتی پس منظر سامنے لاتی ہے اور واقعات پر نکتہ چینی کرتی ہے
لیکن یہ قصیدہ نہیں ہے اسے ہجو کے ذیل میں جگہ ملنا چاہیئے۔

سیّد انشاء اللہ خاں انشاؔ نے بھی سعادت علی خاں کی شان
میں قصیدے لکھے لیکن ان میں وہ طنطنہ وہ شکوہ اور وہ متانت
نہیں ہے جو ہونا چاہیئے۔ ذوقؔ نے لاتعداد قصائد لکھے اور انہیں
قصائد کے بل بوتے پر غالبؔ سے نکتہ داں شاعر سے ٹکر لی اور
اپنا لوہا منوایا، تہنیت جشنِ نوروز کی تشبیب میں وہی دم خم ہے جو
سوداؔ کی بہاریہ تشبیب کا حصہ ہے۔ پہلے مطلع ملاحظہ فرمائیے :

دہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر
زباں سے ذکر اگر چھیڑیئے تو پیدا ہو
نفس کے تار سے آواز خوشتر از بم و زیر

اب تشبیب ملاحظہ کیجئے :

ہوا یہ باغِ جہاں میں شگفتگی کا جوش
کلیدِ قفل و دلِ تنگ، و خاطرِ دلگیر
کرے ہے وا، لبِ غنچہ در ہزار سخن
چمن میں موجِ تبسم کی کھول کر زنجیر
کچھ انبساطِ ہوائے چمن سے دور نہیں
جو وا ہو غنچۂ منقارِ بلبلِ تصویر
اثر سے بادِ بہاری کے لہلہاتے ہیں
زمیں پہ ہمسرِ سنبل ہے موجِ نقشِ حصیر
نکل کے سنگ سے گر ہو شرارہ تخم فشاں
تو سبز، فیض ہوا سے ہو وہ، برنگِ شعیر

اور غلوئے تشبیہ ملاحظہ ہو:

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیلِ مست بے زنجیر

ہر ایک خار ہے گُل، ہر ایک ساغرِ عیش
ہر ایک دشت چمن، ہر چمن بہشت نظیر

ہر ایک قطرۂ شبنم، گہر کی طرح خوش آب
ہر اک گہر، گہرِ شب چراغِ پُرتنویر

اس حصے میں دوسرے اشعار بھی لائق توجہ ہیں کہ ان میں محاورے اور روزمرہ کا مزہ ہے:

سنوارتی ہے جو شام اپنی زلفِ مشکیں کو
سوادِ مشکِ ختن پر ہے لاکھ آہو گیر

ہنسے چراغ تو ایسی ہنسی میں پھول جھڑیں
حیا سے رنگِ گُلِ آفتاب ہو تغیر

عجب نہیں ہے کہ آرائشِ زمانہ سے
حنائی پنجہ ہوں تاک و خیار و بید انجیر

اسی قصیدے میں مطلعِ ثانی کے بعد ذوقؔ نے علم نجوم ہیئت منطق اور فلسفہ کی بعض اصطلاحات کو استادانہ اور عالمانہ رنگ میں پیش کیا ہے اور ان سے رعایتِ لفظی و معنوی کے کمالات دکھائے ہیں بعض مقامات پر سجع بندی سے بھی کام لیا ہے اور گریز کا مضمون نہایت اہتمام سے ادا کیا ہے اور پھر طب و حکمت کی اصطلاحات پر اپنی قدرت دکھائی ہے۔ علوم مروجہ و متداولہ کا دلنشین استعمال، اُن کی اصطلاحات کا جی بھر کے ذکر کرنے کا موقع اگر کسی صنفِ سخن میں مل سکتا ہے تو وہ صرف قصیدہ ہے۔ اور ذوقؔ نے ان مواقع کا خوب استعمال کیا ہے۔ گریز کے بعد مدح ہے اور ممدوح کے شفایاب ہونے پر تہنیت دی گئی ہے اور علم کا زور صَرف کیا گیا ہے۔ مدح میں مبالغہ، غلو اور تملق کے مضامین ہیں لیکن حُسنِ ادا کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا ہے بلکہ خوبی اور خوبصورتی کو ہر ہر پہلو سے نکھارا ہے ذرا مدح پر یہ اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے:

عجب نہیں یہ ہوا سے کہ مثلِ نبضِ صحیح
کرے اگر حرکت موجِ چشمۂ تصویر

شہنشہا ترے یُمنِ شفائے کامل سے
جو لا علاج مرض تھے وہ ہیں علاج پذیر

کہ چوبِ گُل کو اگر ماریں بیدِ مجنوں پر
تو صورتِ بشر ہوش مند خوش تقریر

اشارۂ فہم ہو ایسا کہ وہ بیان کرے
زبانِ برگ سے گونگے کے خواب کی تعبیر

یہ میل، کحلِ بصارت ہو کلکِ خطِ غبار
تو چشمِ دائرۂ عین بھی ہو چشمِ بصیر

نہ برق کو تپ و لرزہ نہ ابر کو ہو زکام
نہ آب میں ہو رطوبت نہ خاک میں تبخیر

بدل گئی ہے حلاوت سے تلخیٔ دارو
شرابِ تلخ بھی ہے میکشوں کو شکر و شیر

قوی ہے قوتِ تاثیر سے دوائے طبیب
غنی قبول کی دولت سے ہے دعائے فقیر

اور دوسرا قطعہ بند اسی سلسلے میں ملاحظہ ہو:

شکستِ دل کو ترے یُمنِ تندرستی سے
کرے درست اگر مومیائی تدبیر

تو موئے کاسۂ چینی کو چارہ سازِ قضا
نکالے کاسۂ چینی سے مثلِ موئے خمیر

کھجائے سر جو کبھی مفسدانِ سرکش کا
علاجِ خارشِ سر ہو، بناخنِ شمشیر

بنا ہے نقشِ شفا خانۂ ہزار شفا
ہر ایک خانہ تعویذ صاحبِ تکبیر

ہر ایک اسم ہزیمت میں اسم اعظم ہے
ہر ایک نسخۂ شفا میں ہے نسخۂ اکسیر

شہا ہے دم سے ترے زندگانیِ عالم
یہ تیرا دم ہے وہ اعجاز عیسوی تاثیر

تو ہے وہ حامیِ دنیا و دیں زمانہ میں
کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو دین کی توقیر

کیا شہان سلف نے مسخر ایک جہاں
کئے ہیں تو نے شہنشاہ دو جہاں تسخیر

سحر سے شام تلک زر فشاں ہے پنجۂ مہر
نثار کرتا ہے ہر روز ایک گنج خطیر

فلک پہ کرتا ہے ہر شب ادا جو سجدۂ شکر
نشان سجدہ ہے زیب جبین ماہ منیر

اسی طرح مدح میں مطلع ثالث آتا ہے اور عقول عشرہ کے حوالے سے اصطلاحات فلسفہ کا سلسلہ چھڑ جاتا ہے اور مدح جاری رہتی ہے، ممدوح کے علم، حکمت اور تدبر کے بیان کے بعد گھوڑے اور ہاتھی تک کی تعریف کی جاتی ہے اور پھر اظہار مدعا اور دعا کے بعد خاتمہ لیکن کمال یہ ہے کہ مطلع اول سے لے کر مقطع تک بہار کے مضامین کو نہیں چھوڑا۔ مرزا غالب کا ممدوح بھی وہی ہے لیکن وہ قصیدے میں وہ اہتمام نہیں کرتے جس کو ذوق ضروری سمجھتے تھے، پھر بھی جاذبیت پیدا ہوتی ہے اور توجہ ان پر مرکوز ہو جاتی ہے، ملاحظہ ہو:

ہاں مہ نو، سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب
بندہ عاجز ہے گردش ایام

اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرور خاص خواص
حبذا اے نشاط عام عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا، کہ سب نے جان لیا
ترا آغاز اور ترا انجام

راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام

گریز دیکھئے:

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امیدگاہ انام

رعایت دیکھئے:

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام!

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرز استفہام

مہر تاباں کو ہو تو، اے ماہ
قرب ہر روزہ برسبیل دوام

تجھ کو کیا پایۂ روشناسی کا
جز بتقریب عید ماہ صیام

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام ؟
جب کہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکی قطع تیری تیزیٔ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اِک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام
زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
مے خواری کا مواز ملاحظہ ہو:
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اُس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام
چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام ؟

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تُو کہہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

اب مدح ملاحظہ ہو:

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلال والاکرام!
شہسوارِ طریقۂ انصاف
نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیٔ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اوستادِ رستم و سام

یہ ابھی تک تمام تر مدح شخص غائب کی ہو رہی تھی اب یہی شخص غائب شخص حاضر یا شخص مخاطب بن جاتا ہے گویا قرآنِ حکیم کے سورۂ حمد میں جس طرح اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے کرتے براہِ راست اس سے خطاب شروع ہوتا ہے وہی تکنیک مدح میں غالب نے ممدوح کے لئے وضع کی ملاحظہ ہو:

اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام
چشمِ بد دور خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

وارث ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تور و خسرو بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز و بیژن و رستام

تیر و تلوار کی تعریف قطعہ بند کی صورت میں ملاحظہ ہو:

مرحبا موشگافیٔ ناوک
آفریں آبداریٔ صمصام

تیر کو تیرے، تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری، تیغِ خصم نیام

ممدوح کے ہاتھی اور گھوڑے کی تعریف قطعہ بند کی شکل میں ملاحظہ ہو:

رعد کا کر رہی ہے، کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

اور اسی طرح قطعہ بند کی صورت میں ممدوح کے قتلِ عام کا حسین طریقہ بھی ملاحظہ ہو:

فنِ صورت گری میں تیرا گرز
گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام

اس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام

اور اب ذرا قصیدے کے آخری اشعار ملاحظہ ہوں:

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام

اور ان اوراق میں بکلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

لکھ دیا شاہدوں کو "عاشق کش"
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گردِ نیلی فام

حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ، اور زلف کو دام

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی، بدستور، صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائیٔ آغاز
ہو ابد تک رسائیٔ انجام

غالب نے ذوق سے ہٹ کر قصیدے میں بھی اپنی انفرادیت قائم کی۔ اس چھوٹی سی مترنم بحر میں سادگی و پرکاری موجود ہے قصیدے کا اہتمام و انتظام وہ نہیں ہے جو ذوق کے یہاں نظر آتا ہے نہ زبردستی کا اظہارِ علمیت ہے پھر بھی قصیدے میں جاذبیت ہے، حسن ہے، محاورے اور روزمرہ کا مزہ بھی ہے واقعیت بھی ہے، صنائع بھی ہیں خاص طور پر حسنِ تعلیل سے بہت اچھا کام لیا گیا ہے اور پھر قصیدے کے تمام مرحلے موجود ہیں کہ مطلع، تشبیب، گریز، مدح، اظہارِ مدعا اور دعا سب اپنے اپنے مقام پر واقع ہیں۔

محمد حسین آزاد نے ذوق کے قصائد اکٹھا کر کے طبع کرائے انہیں سرشاہ سلیمان نے دوبارہ مدون کیا اور ایک بار اسے پاکستان کے

ایک ادارہ سے ایک ادیب شہیر کے مقدمے سے مزین کر کے طبع کرایا گیا، لیکن اپنی جگہ ہر پھر کر وہی بات رہی کہ سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ، محسنؔ کاکوروی، صفیؔ لکھنوی، عزیزؔ لکھنوی، منیرؔ شکوہ آبادی، جلال اور تسلیمؔ وغیرہ نے ہرچند کہ اردو قصیدے کے تہذیبی سرمائے کا تحفظ کیا لیکن نہ تو اسے فارسی قصیدے کا ہمسر بنا سکے اور نہ اس میں کوئی اضافہ کر سکے۔ خاص طور پر شعرائے متاخرین نے اس صنف میں قطعاً کوئی اضافہ نہیں کیا۔ نہ ہم کوئی قاآنی پیدا کر سکے نہ عرفیؔ، پھر بھی سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ نے اردو ادب میں اس صنف کو زندہ کر دیا ہے اور ہمارے ایک تہذیبی سرمائے کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ کر دیا ہے۔

یہ زمانہ قصیدے کا نہیں ہے، اور نہ آیندہ دبعید آئندہ میں قصیدے کے زمانے کا اعادہ ممکن ہے، ممکن ہے کہ اس کی کوئی اور شکل متعین ہو جائے تاہم اس قدر یاد رکھنا ضروری ہے کہ موجودہ زمانے کے اقدار اگر قصیدے کے جھوٹ مبالغے، غلو اور تملق کے منافی ہیں تو اس سے بھی بڑی لعنتیں پیچ مچ ہمارے اس معاشرے کو محیط ہیں جن میں "سچ" اور "حق" کو بری طرح کچلا جا رہا اور انسانوں کے اس انبوہ میں ایک محشرستان برپا ہے ہر شخص نفسی نفسی کے کرب سے دوچار ہے اور روز بروز اپنی ذات کے خول میں بند ہوتا جا رہا ہے اور یہ خول روز بروز تنگ اور تنگ تر ہوتا جا رہا ہے، قصیدے کی صنف معروضی ہے اور اگر کبھی کبھی بعض شعراء نے اس میں داخلیت کی چھوٹ بھی ڈالی ہے تو یہ محض ایک خوش رنگ عکس یعنی SHADE ہے یا شخصیت کا پرتو ہے جس سے اس کی معروضیت کے اصل مزاج میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، یہ مہلک قسم کا گھن معاشرے کے رگ و پئے میں لگتا جا رہا ہے۔ ہمارے اقدار کا یہ درخت عنقریب زمین پر ڈھیر ہوا چاہتا ہے یہ گھن صنف قصیدے کے لئے بھی جان لیوا ہے کیونکہ اکبر اعظم اور جہاں گیر جیسے آمروں کے سامنے کلمۂ حق، قصیدے کی شکل میں کہنے والا، کوئی کجکلاہ، کوئی عرفیؔ پیدا نہیں ہوتا، تضحیک روزگار لکھنے والا کوئی سوداؔ اب نہیں پیدا ہوتا، کوئی عرفیِ وقت بہ بانگ دہل سر دربار اس قسم کے اشعار نہیں پڑھتا کہ ؂

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نخورد نیشتر دلا و نعم را
بے برگیٔ من داغ نہد در دل سامان
بے مہری من زرد کند روے درم را

رشید الدین فضل اللہ

(دنیا کا سب سے پہلا مورخ)

سید رضا سعید

مانچسٹر یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے سربراہ، پروفیسر جان اینڈ ریو بوئیل کی تحقیق کے مطابق اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دنیا کا پہلا باقاعدہ مورخ ہونے کا سہرا ایران کے دانشور رشید الدین فضل اللہ کے سر ہے کسی ایک دربار سے وابستہ رہ کر روز نامچے یا کسی فاتح کے لشکر کے ساتھ رہ کر سفر نامے لکھنا اور بات ہے لیکن باقاعدہ عالمی تاریخ مرتب کرنا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس میں اولیت کے سلسلے میں مسلمانوں کے سوا کوئی اور فخر نہیں کر سکتا۔

رشید الدین فضل اللہ نے تیرھویں صدی کے بالکل شروع میں یعنی ایچ۔ جی۔ ویلز سے چھ صدی قبل یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ بدقسمتی سے اس کی تصنیف جامع التواریخ، کے صرف دو نسخوں کی چند جلدیں دریافت ہو سکی ہیں۔ باقی جلدیں اب تک نہیں ملی ہیں۔ ان میں پہلا نسخہ ۱۳۰۶ء میں مکمل ہوا تھا اور دوسرا ۱۳۱۰ء میں۔ پہلے نسخے کی تین اور دوسرے کی چار جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ مشہور مستشرق، پروفیسر کارل جان لکھتے ہیں رشید الدین سے پہلے تو کیا، اس کے بعد بھی کئی صدی تک دنیا میں کسی کو عالمی تاریخ مرتب کرنے کا خیال نہیں پیدا ہوا۔

رشید الدین نے اپنی کتاب کا آغاز حضرت آدمؑ سے کیا اور پھر بتایا کہ آدم کی اولاد کس طرح دنیا کے مختلف خطوں میں پھیل مختلف قومیں کیونکر وجود میں آئیں اور یہ دنیا مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں کیسے تقسیم ہوئی؟ اس نے عرب کی تاریخ بڑی تفصیل سے بیان کی ہے اور رسول مقبول صلعم اور خلفائے راشدین کے بعد خلافت کے تفصیلی واقعات لکھے ہیں حتیٰ کہ ۱۲۵۸ء میں منگولوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور خلافت کا خاتمہ کر دیا۔

پھر اس نے یہودیوں، ایران، وسط ایشیا، ترکی، چین اور برصغیر کی تاریخ بھی مختلف ابواب کے تحت رقم کی۔ برصغیر کے تحت رشید الدین نے گوتم بودھ اور بودھ مذہب کے بارے میں بھی بڑی تفصیل سے لکھا ہے

کتاب کی دوسری جلد کئی حصوں میں منقسم تھی، منگولوں کے بارے میں تھی یہ واقعات زیادہ تفصیل سے اس لئے لکھے گئے ہیں کہ رشید الدین منگول شہنشاہ الخان اولجیتوؒ کے دربار میں ملازم تھا اور اسی نے اسے تاریخ لکھنے کا حکم دیا تھا۔ پروفیسر ٹاگون نے کتاب کے ان حصوں کا مسودہ مشہد میں برآمد کیا تھا لیکن پروفیسر بوئیل کے بیان کے مطابق اب یہ حصے ناپید ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس جلد کے بھی دو حصے تھے۔ ایک حصے کے مقدمے اور چار ابواب میں مشہور ترک اور منگول قبائل کے حالات اور ان کے آپس میں مل کر دوسرے قبیلے وجود میں آنے کے واقعات ہیں دوسرے حصے کے مزید تین حصے کئے گئے ہیں۔

پہلا چنگیز خان کے آباؤ اجداد، دوسرا خود چنگیز خاں اور تیسرا اس کے جانشینوں کے لئے وقف ہے۔ یہ حصہ روس میں تین جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کی ایک پوری جلد منگول شہنشاہ الخان الجیتو کے لئے وقف ہے، ۱۲۳۶ء سے ۱۲۴۲ء تک منگولوں نے روس اور مشرقی یورپ پر جو حملے کئے تھے ان کا تفصیلی حال ان میں بیان کیا گیا ہے۔ ان ہی حملوں کے دوران منگولوں کے مشہور اور بے پناہ سنہرے لشکر کی تشکیل ہوئی تھی۔ اسی جلد میں جنوبی چین کے خلاف فوج کشی کا بھی حال بیان کیا گیا ہے یہ فوج کشی ۱۲۶۸ء اور ۱۲۶۹ء میں کی گئی تھی اور اسی کے نتیجے میں منگول شہزادے قبلا خان کا خاندان چینی شہنشاہوں کا یُوآن خاندان کہلایا۔

قبلا خان کے عہد کے واقعات مشہور اطالوی سیاح مارکوپولو نے بھی لکھے ہیں لیکن اس کا بیان محض ایک روزنامچے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جبکہ رشید الدین نے باقاعدہ تاریخ مرتب کی ہے اس سے موازنہ کرنے پر پتہ چلا ہے کہ مارکوپولو کا سفرنامہ اعتبار کے قابل نہیں ہے مثال کے طور پر جنوبی چین کے خلاف مہم کے دوران سیانگ یانگ کا تاریخی محاصرہ ۱۲۶۸ء سے ۱۲۷۲ء تک جاری رہا مارکوپولو نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ اس محاصرے کے دوران قبلا خان کو عیسائی انجنیئروں اور ماہرین کی خدمات حاصل رہیں اور نہ صرف مارکوپولو کے باپ اور چچا بلکہ خود مارکوپولو نے ان اختلافات کی نگرانی کی۔

لیکن رشید الدین نے لکھا ہے کہ یہ انجنیئر اور ماہرین سب مسلمان تھے اور ان کی منجنیقوں کی مدد سے قبلا خان کو فتح حاصل ہوئی اور یہی صحیح ہے اس لئے کہ اب یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ مارکوپولو کے باپ اور چچا کے چین سے واپس چلے جانے کے بعد یہ محاصرہ شروع ہوا تھا خود مارکوپولو یہ محاصرہ ختم ہوجانے کے دو برس بعد چین پہنچا

اس قسم کے چند اتفاقی اختلافات کے سوا دیگر تفصیلات میں رشید الدین اور مارکوپولو کی تحریروں سے ایک دوسرے کی تصدیق ہوجاتی ہے اسی طرح چنگیز خان کی مغربی ایشیا پر فوج کشی کے واقعات کی تصدیق کے لئے ایک اور ایرانی مورخ جُوَینی کی تاریخ، جہاں گوشا، موجود ہے جو چنگیز خاں کی مختصر تاریخ ہے۔

لیکن منگولوں کے ابتدائی حالات کے بارے میں آج کی دنیا کے پاس رشید الدین کی تحریروں کے سوا کوئی دوسرا ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ خود چنگیز خاں نے اہتمام کیا تھا کہ منگولوں کی کتاب 'ایک سنہری کتاب' میں مرتب کرائی تھی۔ یہ 'سنہری کتاب' خزانے میں رکھی جاتی تھی اور آئے دن کے واقعات اس میں رقم کئے جاتے تھے۔ منگول شہنشاہ الخان اولجیتو کی اجازت سے رشید الدین کی رسائی اس 'سنہری کتاب' تک تھی۔ بعد میں امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں 'سنہری کتاب' تو ضائع ہوگئی، صرف رشید الدین کی تحریر باقی رہ گئی۔

رشید الدین جسے رشید طبیب بھی کہا جاتا ہے، ۱۲۵۴ء میں ہمدان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ اس کے ماں باپ یہودی تھے۔ ہمدان اس زمانے میں یہودیوں کا بڑا مرکز تھا اور وہاں ان کا ایک کالج بھی تھا جس میں مذہبی علوم کے علاوہ دیگر علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ رشید الدین اسی کالج کا فارغ التحصیل تھا۔ عبرانی اس کی مادری زبان تھی لیکن اسے عربی، فارسی اور بعض دوسری زبانوں پر بھی قدرت حاصل تھی۔

ایران کے دوسرے منگول حکمراں، الخان اباقہ کے عہد میں اسے دربار میں ملازمت ملی۔ یہ واقعہ ۱۲۷۸ء میں پیش آیا۔ دربار میں مسلمان علماء کی موجودگی کی وجہ سے رشید الدین میں اسلام کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ سب سے پہلے اس نے قرآن پاک کا مطالعہ کیا اور پھر احادیث پڑھنے کے بعد ۱۲۸۴ء میں برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا۔ اپنی غیر معمولی اہلیت کی بنا پر رشید الدین نے بڑی ترقی کی بیس برس تک دربار سے وابستہ رہنے کے بعد الخان اباقہ کے پوتے الغازان کے عہد میں نائب وزیر اعظم کے عہدے پر پہنچ گیا۔ اس وقت وزیر اعظم صدر الدین سنجانی تھا جو خود بھی لائق آدمی تھا ۱۲۰۲ء اور ۱۲۰۳ء میں الغازان نے مصر کے مملوکوں کے خلاف فوج کشی کی تو رشید الدین بھی ساتھ تھا۔ اس مہم کے دوران رشید الدین نے ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ دریائے فرات کے مغربی ساحل پر واقع شہر رباط الشام کے حاکموں سے بات چیت کرکے انہیں ہتھیار

ڈال دینے اور اطاعت قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا۔

اس زمانے میں جاگیردار چھوٹی موٹی فوج رکھا کرتے تھے۔ بعض وحشی منگول جاگیر دار اس فوج کے ذریعہ شہروں کے تاجروں کو دوران سفر لوٹ لیا کرتے تھے جن کے سد باب کے لئے الغازان نے جو اصلاحات جاری کیں وہ رشید الدین کے دماغ کی ہی پیداوار تھیں کہا جاتا ہے الخان الغازان نے ہی رشید الدین کو تاریخ مرتب کرنے کا حکم دیا تھا لیکن اس کے بیٹے الخان اولجیتو کے دور میں یہ کام مکمل ہوا۔

اولجیتو رشید الدین کی بڑی قدر کرتا تھا اور اس کی خدمات کے صلے میں گراں قدر انعام دیا کرتا تھا چنانچہ وہ سلطنت کے مختلف حصوں، حتیٰ کہ عراق، آذربائیجان اور اناطولیہ تک میں وسیع جائیدادوں کا مالک بن گیا۔ رشید الدین کی زندگی میں ہی اسکے چھ بیٹوں میں سے آٹھ کو گورنر مقرر کیا گیا اور پورا مغربی ایران، جارجیا، عراق اور موجودہ ترکی کا بڑا حصہ اس کے بیٹوں کی عملداری میں تھا۔

الخان اولجیتو نے سلطانیہ نامی نیا دار الحکومت تعمیر کرایا۔ تو رشید الدین نے اس کے مضافات میں ایک بہت بڑی بستی تعمیر کرائی جس میں ایک خوبصورت مسجد، ایک وسیع اسلامی مدرسہ اور ایک شفاخانہ شامل تھا۔ اسی طرح تبریز کے مضافات میں بھی ربع رشیدی نامی بستی اس نے تعمیر کرائی تھی۔

رشید الدین نے جو کتابیں لکھیں، ان کی نقلیں کرنے کے لئے خوشنویسوں، جلد بندی کے لئے جلد سازوں اور نقشے اور تصویریں بنانے کے لئے مصوروں کا باقاعدہ عملہ اس نے رکھ چھوڑا تھا جن پر ساٹھ ہزار دینار (موجودہ حساب سے سات لاکھ روپے) سالانہ خرچ ہوتا تھا۔

وزیر اعظم صدر الدین زنجانی نائب وزیر اعظم رشید الدین کی ترقی دیکھ کر کچھ امراء جلنے لگے تھے چنانچہ انہوں نے دونوں کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا ۱۳۱۲ء میں ایک سازش کامیاب ہوگئی جس کے نتیجے میں بچارے صدر الدین کو اپنے عہدے اور جان، دونوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس کے بعد رشید الدین کے خلاف ایک خوفناک سازش تیار کی گئی اور الخان اولجیتو کے سامنے عبرانی زبان میں لکھا ہوا ایک خط پیش کیا گیا۔ یہ خط منگول امیر کے یہودی ملازم کے نام اگیا تھا اور ہدایت کی گئی تھی کہ کسی طرح اولجیتو کو زہر دے دیا جائے۔ لیکن رشید الدین نے ثابت کر دیا کہ یہ خط جعلی ہے چنانچہ اولجیتو مطمئن ہوگیا۔

صدر الدین زنجانی کے بعد تاج الدین علی شاہ کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اس کا تعلق امراء کے دوسرے گروہ سے تھا چنانچہ رشید الدین کی اس سے کبھی نہیں بنتی تھی آخر الخان اولجیتو نے اپنی سلطنت کے دو حصے کر دیئے۔ وسطی اور جنوبی ایران، میسوپوٹامیہ، اور ایشیائے کوچک کا وزیر اعظم رشید الدین کو مقرر کیا گیا اور باقی حصوں کا وزیر اعظم تاج الدین علی شاہ قرار دیا گیا۔ لیکن تاج الدین اس انتظام سے بھی مطمئن نہ ہوا اور برابر رشید الدین کے خلاف سازشیں کرتا رہا۔

الخان اولجیتو کی زندگی میں تو اس کی کوئی چال کارگر نہیں ہوئی لیکن ۱۳۱۶ء میں جب اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا الخان ابوسعید تخت پر بیٹھا تو تاج الدین کی سازش کامیاب ہوگئی اور رشید الدین کو برطرف کر دیا گیا۔

کچھ عرصے بعد رشید الدین کے حامیوں نے بادشاہ کو اس پر راضی کر لیا کہ رشید الدین کو دربار میں بلا لیا جائے۔ لیکن تاج الدین نے پھر سازش کی۔ اس مرتبہ الزام لگایا گیا کہ رشید الدین نے الخان اولجیتو کو زہر دیا تھا۔

واقعہ محض یہ تھا کہ اولجیتو کی بیماری کے دوران رشید الدین نے جو خود بھی ایک اچھا طبیب تھا، بادشاہ ایک مسہل دیا تھا لیکن تاج الدین نے جھوٹے گواہ پیش کر کے ابوسعید کو اس کا یقین دلا دیا۔ چنانچہ رشید الدین کو سخت ایذائیں دے کر قتل کیا گیا۔ تاج الدین کے حکم سے اس کا سر کاٹ کر تبریز لے جایا گیا اور تین دن گلی کوچوں میں گشت کرایا گیا۔

کُرسی کی فریاد

(بسلسلہ مہم شجر کاری)

ریٹا شفقت

اللہ تعالیٰ کتنا بے نیاز ہے کہ کبھی تو کسی کو اتنا پروان چڑھا دیتا ہے کہ وہ شخصیت آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہے اور کبھی کسی کے وجود کو اتنا بے معنی اور مبہم کر دیتا ہے کہ اسے ہر چند کہ لوگ دیکھتے ہیں پر نہیں دیکھتے۔

میں ایک کرسی ہوں چوب خشک سے بنی ہوئی۔ کس منہ سے بڑی باتیں کروں مگر یہ بھی عجیب تماشا ہے کہ مجھ پر بیٹھ کر لوگ فلکِ افلاک سے بھی پرے کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ فرعون صاحب مجھ پر بیٹھے تو کیا گل نہیں کھلائے اور نمرود صاحب نے تو خدا کی پناہ میرے منہ میں خاک رب کائنات ہونے کا دعویٰ فرما دیا۔ اور فرعون اور نمرود کی بات تو بہت پرانی ہوئی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے سرپھرے ہٹلر صاحب نے سارے یورپ میں کیا ادھم نہیں جوت ڈالا تھا۔ اور میں کہ ایک کرسی ہوں چوب خشک سے بنی ہوئی ٹک ٹک یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور اپنے رب سے التجا کرتی رہی کہ میرے مولا میرے وجود کو تحلیل کر دے اور مجھے زمین کی خاک سے ہم آغوش کر دے کہ میں یہ مناظر پھر کبھی نہ دیکھ سکوں۔

یہ صحیح ہے کہ مجھ پر ہمیشہ فرعون نمرود ہی نہیں بیٹھے بڑے بڑے صاحبانِ خیر بھی متمکن ہوئے لیکن میں کیا کروں ہر کسی کی نظر برائی پر بڑی جلدی جاتی ہے۔ تاریخ کے کچھ منچلے مجھے ہمیشہ کیلئے رسوا کر گئے اب تک مجھے طعنے سننے پڑ رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کرسی نے دماغ خراب کر دیا ہے کوئی کہتا ہے کرسی کا نشہ ہے۔ کبھی کبھی جب میں اپنی زندگی پر غور کرنے لگتی ہوں تو پہروں کے لئے ہست و بود کے فلسفے میں ڈوب جاتی ہوں۔ بھلا غور تو کیجئے ابھی چند سال ہی گذرے میں ایک گھنے اور تناور درخت کا حصہ تھی یہ درخت وادیٔ نیلم میں بل کھاتی پہاڑی ندی کے کنارے کھڑا تھا۔ اس اس درخت کی سبز شاخوں میں طیورِ خوش الحان بسیرا لیتے تھے، صبح کو اُن کے رس گھولتے نغمے آج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ اس درخت کی چھایا دور تک پہنچتی تھی اور تھکے ہارے مسافر اس کے نیچے بیٹھ کر آرام کرتے تھے اور مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس گھنے درخت کی سرسبز پتیاں سورج کی روشنی میں روزانہ بے اندازہ مقدار میں آکسیجن فضا میں چھوڑتی تھیں اور اس پاس کے علاقے کی ہوا کو صاف اور صحت مند بناتی تھیں درخت کے سوکھے سڑے پتے زمین پر گرتے تھے تو ایک فرش سا بچھ جاتا تھا، نمی اور دھوپ بہت جلد انہیں خاک سے ہم رشتہ کر دیتی تھی اور یوں زمین میں نئی طاقت اور توانائی پیدا ہوتی تھی۔

پیڑ کے تنے میں کوئی چھوٹا سا شگاف پیدا ہو جاتا تو لیس دار
مادہ گوند کی صورت میں جم جاتا۔ اس پاس کی بستیوں کے لوگ یہ
گوند چن کر پنساریوں کی دوکانوں تک پہنچا دیتے۔ درخت کی سوکھی
ٹہنیاں جب جھڑتیں تو گاؤں کی عورتیں انہیں بٹور کر اپنے چولہے
روشن کرتیں۔ پھر کچھ دن بعد جب علاقے کی آبادی بڑھی تو ان عورتوں
نے میرے سرسبز پیڑ پر نت نئی قیامتیں ڈھانا شروع کر دیں۔ وہ
صبح صبح کھرپیاں اور درانتیاں لے کر آجاتیں اور اس شجر سایہ دار کی
کھال کے ٹکڑے نوچ نوچ کر جھولیاں بھرنی شروع کر دیتیں۔ یہ ستم
رسیدہ درخت خاموش فریادی بن کر آہ و زاری کرتا۔ اے نیک
بخت بیبیوں میری کھال کیوں نوچے پھینکتی ہو۔ اگر تمہیں بالن کی
ضرورت ہے تو سوکھے پتے اٹھا لو۔ سوکھی شاخیں اٹھا لو۔ ہائے
میری جیتی جاگتی کھال کیوں کھینچے پھینکتی ہو۔ میری کھال اتر گئی تو میری
زندگی مرجھا جائے گی۔ میں سوکھ جاؤں گا ___ اگر تم کو اپنے چولہے
جلانے ہیں تو ذرا کشادہ دل بنو۔ انسان کی عظیم دریافت مٹی کے
تیل سے فائدہ اٹھاؤ۔ آہ تمہیں نہیں معلوم میرے وجود سے کتنی
برکتیں ہیں، میں آندھیوں کو روکتا ہوں۔ میں زمین کی نمی برقرار رکھتا
ہوں میں مٹی کی تہوں کو مضبوط اور مستحکم رکھتا ہوں، میں ہوا صاف
کرتا ہوں، میں تمہیں بہت کچھ دیتا ہوں۔ مگر توبہ کیجئے کسی کے
کان پر جوں نہ رینگی۔ اور تھوڑی سی مدت میں مجھے لنڈ منڈ کر کے
رکھ دیا۔ میری کھال اتری تو میرا ہاضمہ خراب ہو گیا، زمین سے غذا
کھینچنا میرے بس میں نہ رہا۔ اور جب نوبت یہ آئی کہ سبز پتیاں بھی
نکلنی بند ہو گئیں تو پھر محکمہ جنگلات کے عملے نے مجھے بیکار تصور کر کے
میرے وجود کے بوجھ سے دھرتی کو پاک کرنے کی ٹھانی۔

کچھ دن ہی گذرے ہوں گے کہ کچھ لوگ لمبی لمبی کلہاڑیاں لئے
میرا قصہ پاک کرنے آن موجود ہوئے چشم زدن میں انہوں نے مجھ
پر وہ ضربیں لگائیں کہ میرا پیارا بوڑھا جسم کمال بے کسی سے
زمین پر چیت ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک زندہ لاش زمین
پر پڑی ہے پھر آرے لئے ایک دوسری جماعت آئی اس نے
ٹکڑے پارچے کئے اور ایک بھاری بھرکم ٹرک میں مجھے لاد کر جہلم دریا
کے کنارے پہنچ دیا۔ دوستو میرا سفر یہاں ختم نہیں ہوا میرے جسم کے
ٹکڑے پھر دریا میں بہائے گئے۔ اور میں موجوں کے دھکے سہتی کئی
ہفتے بعد مشہور شہر جہلم پہنچی یہاں ایک چوب فروش کے آدمیوں نے
مجھے دریا سے گھسیٹا گودام میں ڈھیر کیا۔ مہینوں دھوپ میں پڑی
سوکھائی گئی پھر بجلی کے آرے پر میرے مزید ٹکڑے پارچے
ہوئے۔ اور پھر میاں خیر دین ترکھان نے مجھ نصیبوں جلی کو کرسی بنا
دیا۔ میں ایک مقامی عدالت میں قضا و قدر کا دھندہ دیکھتی رہی۔
پھر خدا بھلا کرے اُس گھن کا جو میرے ایک پیر سے ایسا چمٹا کہ مجھے
پھر نیلام چڑھنا پڑا اور اب میں ننھو کے ہوٹل میں پڑی زندگی کے
دن گذار رہی ہوں۔ میری چول چول ہل گئی ہے کچھ ہی دن میں میاں
ننھو مجھے کباڑی کی نظر کریں گے جہاں سے میں یقیناً چولہے کی نظر ہو جاؤں
گی ..... میں سوچتی ہوں انسان اتنی ترقی کرنے کے باوجود کتنا جاہل
ہے مجھ جیسی قیمتی شے کو کس طرح ضائع کر دیتا ہے۔ ارے بے عقل
انسانوں کرسیاں تو دھات کی بھی بن سکتی ہیں۔ اور ان کا لوہا ہر حالت
میں باقی رہ سکتا ہے مگر میں کہ چوب خشک سے بنی ہوں دن گذرنے
پر اپنا وجود بتدریج ختم کر دیتی ہوں اے عقل والو سوچو تھوڑی سی
شان و شوکت کے لئے دن رات جیتے جاگتے پیڑ کاٹتے ہو۔ اور
پھر ستم یہ ہے کہ جتنے پیڑ کاٹتے ہو اتنے لگاتے نہیں۔ دن رات
محکمہ جنگلات والے پکارتے پھرتے ہیں درخت زمین کی دولت ہیں
زیادہ درخت اُگاؤ۔ درختوں کی حفاظت کرو۔ اے اس وطن
کے خوش قسمت باسیو ذرا ان آوازوں پر کان تو دھرو۔

نصیحت

ظہور محمد ملک

ظہور محمد ملک صاحب: ہماری بساطِ شاعری کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ بنیادی طور پر غزل گو ہونے کے باوصف خوبصورت نظمیں بھی ان کے کلام میں وافر مقدار میں دستیاب ہیں۔ غزل میں حسرت کا سا مدھر سیدھا انداز اور رومانوی ترنم ریزی ہے۔ مضامین جدید کے ساتھ تصوف کی دروں پردہ کیفیات کا رچاؤ ان کی شخصیت میں معصوم سچائی اور حقیقت پسندی کا رنگ بھرتا ہے۔ ظہور صاحب ۱۹ اگست ۱۹۳۲ء میں امرتسر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی سکول کڑہ خزانہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، آزادی کے بعد مستقل سکونت راولپنڈی میں اختیار کی۔ ۱۹۵۸ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے اردو لٹریچر میں ایم۔ اے کیا۔ عرصہ ۲۵ سال سے ریڈیو پاکستان سے منسلک ہیں اور اب سینئر پروڈیوسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کی چند غزلیں اور ایک نظم پیشِ خدمت ہے نقد و نظر کی میزان پر ان کے کلام کا معیار آنکنا و پرکھنا اب قارئین کا کام ہے۔

اگلے وقت کے لوگوں نے یہ راز سمجھایا اے بیٹے سُن!
وقت کا دھن انمول ہے پیارے وقت نہ یونہی کھونا ہوگا

سانس کی ہے وہ نازک ڈوری پل پل جس کا تانا بانا!
بیش بہا ہیں گوہرِ عمل کے ان کا ہار پرونا ہوگا

عالم سارا گھر ہے دکھوں کا جس میں کال رہا ہے وفا کا
گرم و سردِ جہاں کے سہہ کر درد کو جی میں سمونا ہوگا

تیز چمکتی دھوپ ہو دن کی یا ہوں گھرے بادل چھائے
رُت ہو کوئی خونِ جگر سے بیج سخن کا بونا ہوگا

کام بہت ہے وقت ہے تھوڑا جیتے جی کچھ تم بھی کر لو
آخر خاک کی سیج پہ برسوں سُکھ کی نیند بھی سونا ہوگا

غزل

ظہور محمد ملک

فصلِ گُل آئے گی پھر چاک گریباں ہوگا
داغِ دل اور بھی وحشت میں نمایاں ہوگا

جو کسی طور مرے درد کا درماں ہوگا
یہ کرشمہ ترا اے گردشِ دوراں ہوگا

جوشِ گریہ سے کوئی حشر بداماں ہوگا
تارِ بارش سے دل و دیدہ بیاباں ہوگا

اشک کے سیل میں ڈوبے جو یہ ساری بستی
اور بھادوں کی جھڑی سے نیا طوفاں ہوگا

لے گا ہر ڈوبنے والا بھی سہارے کیا کیا
یہاں پھر کون رقیبِ سر و ساماں ہوگا

عہد و پیمانِ وفا از سرِ نو اب ہوں گے
مژدہ اے اہلِ جنوں درد فراواں ہوگا

سرخیٔ رنگِ حنا خار سے پھر جھلکے گی
آبلہ پا کوئی جب جانِ بیاباں ہوگا

غزل

ظہور محمد ملک

دِن بیتا ہے عصر کا عالم جوں توں کر کے شام کریں
چین ملے تو دلِ زدگان بھی پل بھر کو آرام کریں

یار احباب الزام دھریں اور جی بھر کر بدنام کریں
پیار بھری آواز پہ اس کی کیا فکرِ انجام کریں

دیس بدیس میں ہم کس کارن مارے مارے پھرتے ہیں
نقشِ کفِ پا روشن ہوں تو سجدہ ہر ہر گام کریں

فقر سی شے وہ جنسِ گراں ہے جس کا ملنا مشکل ہے
دین ہے اپنے داتا کی یہ اس بخشش کو عام کریں

گھٹے چاند کی چال ہمارا عہدِ جوانی ماند ہوا
پیری کے آغوش میں دل کے ارماں اب آرام کریں

عقل و دل کے لاکھ جتن بھی رازِ عشق چھپا نہ سکے
محفل محفل شعر پڑھیں اور راز کو طشت از بام کریں

غزل

ظہور محمد ملک

لذت ملی خلش میں تو گھر دل میں کر گئی
دُنیا یہ سمجھی سوزشِ زخمِ جگر گئی

رو رو کے آج آبروئے چشمِ تر گئی
دل کی وہ ساکھ ہائے پرانی کدھر گئی

جس سمت بھی یہ گردشِ شام و سحر گئی
بزمِ جہاں سے عزتِ اہلِ ہنر گئی

غم اس قدر اٹھائے کہ ہستی نکھر گئی
اب دل سے سخت گیریٔ شام و سحر گئی

کیسے ملے گا منزلِ مقصود کا سُراغ
اُس نقشِ پا کے ساتھ ہی گردِ سفر گئی

قحط الرجال وہ تھا نہ آیا کوئی نظر
شہرِ وفا میں میری نظر در بدر گئی

آجاؤ اب کہ ضبط کا یارا نہیں رہا
دل پر میرے ہزار قیامت گذر گئی

غزل

ظہور محمد ملک

دل ہے سودائی ترا جلوۂ پیدا مانگے
عقل کشکول لئے پھرتی ہے کیا کیا مانگے

شوقِ نظارہ اُدھر دیدۂ بینا مانگے
ہے جنوں وہ کہ سرا وسعتِ صحرا مانگے

حسن بے باکیٔ جرأت کا تقاضا مانگے
موج طوفان جو اُٹھے شورشِ دریا مانگے

مانگنے والوں نے تو حور وجناں مانگے ہیں
ہے مرا عشق کہ جو جلوۂ پیدا مانگے

رقص کرتے ہیں نگاہوں میں مری ویرانے
اب جنوں برہنہ پا اور تنِ تنہا مانگے

یوں تو ہر موڑ پہ دیکھے ہیں ترے سودائی
ترا شیدا سرِ بازار تماشا مانگے

دِل وہ وحشی ہے کہ آدابِ جنوں میں اکثر
چاہے تیری ہی رضا تیرا اشارہ مانگے

دور پہ دور چلے ساقیا میخانے میں
رند صد شیوہ نئے ساغر و مینا مانگے

نئے افلاک کو چھوتا ہے مرا فکرِ سخن
اور مرا ذہن رسا اِک نئی دُنیا مانگے

خیر ہم مانگتے رہتے ہیں ترے جلووں کی
خلق کی آنکھ ترا حُسنِ سراپا مانگے

نقش اب دِل پہ مرے اِک ہی صورت ہے ظہور
جذبۂ شوق کوئی اور نہ اُن سا مانگے

چینی افسانہ

محنت کی خوشبو

ترجمہ: پروین عارف

اُس سال بہار کے موسم کا آغاز (چینی کاشتکاروں کی) توقع سے کچھ قبل ہی شروع ہوگیا تھا حتیٰ کہ وسطِ سرما کو ابھی دو مہینے بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ موسم میں غیر معمولی تمازت تغیر پذیر تھی ہوا میں موسم کی حرارت کے سبب سے مٹی میں سوندھاہٹ اور مہک لبس گئی تھی۔

ایک روز صبحِ کاذب کی ملگجی روشنی میں ایک گھوڑا گاڑی جس میں تازہ سبزیاں لدی ہوئی تھیں پیکنگ شہر کے جنوب کی جانب سے قومی شاہراہ چین سے گذرتی ہوئی دکھائی دی۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز نے اس وقت موسیقی کے سے سُروں کا ترنم فضا میں بکھر دیا تھا۔

اس گاڑی میں گاڑی بان کے پیچھے دو اور آدمی بھی سوار تھے۔ اُن میں سے ایک کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ اُس کا نام چی چنگ کوان تھا جو مزارعوں کی جمعیت کی تنظیمی پارٹی کا قدیم سیکرٹری تھا۔ اُس پارٹی کا تعلق زرد پھولوں والی پہاڑی کی ماہی پشت منظم جماعت سے تھا۔ یہ پارٹی سیکرٹری اچھی ہڈی گوڈی اور پُروقار شخصیت کا مالک تھا۔ اُس کے چہرے کے جبڑے کشادہ اور ابروؤں کے بال بڑے گھنے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں چیتے کی آنکھوں جیسی چمک نظر آتی تھی اس نے اپنے جسم کو ایک موٹی دبیز تہ دار صدری سے ڈھانک رکھا تھا جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور اُس کے پس منظر میں اس کی تانبے جیسی جسم کی جلد اس کے سخت جان ہونے کی غمازی کر رہی تھی۔ دوسرا شخص جس کا نام لسٹو فانگ تھا وہ مذکورہ جمعیت کا ڈپٹی لیڈر تھا جو حال ہی میں اس عہدے پر منتخب ہوا تھا۔ اس جواں سال لیڈر کا جسم مضبوط اور کرتی تھا۔ اُس کے چوڑے چکلے بازوؤں سے اُس کے پیکر کی خوبصورت ساخت کا پتہ چلتا تھا اور اُس کے چہرے پر جوانی کے ابلتے ہوئے خون کی سرخ تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ اُس وقت اس کی نظروں میں چین کا ایک کیف آور رنگ جھلکیاں مار رہا تھا۔

دفعتاً لسٹو نے پرانے سیکرٹری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا،

"قبلہ سیکرٹری صاحب غالباً اس وقت ہم اپنی منزل کے کے اختتام پر ہیں۔ ہیں نا؟" چی نے لسٹو کے سوال کے جواب میں کہا،

"ہیں تو سہی مگر پہلے اگلے چوراہے پر ہماری گاڑی مُڑلے جب سمجھو"

اور پھر یکایک گاڑی بان کے سرخ چمڑے کے گتھے ہوئے

چابک کی چٹاخ کی آواز کانوں میں آئی گویا یہ علامت تھی اس اظہار کی کہ گھوڑا گاڑی قلب شہر کے مقابل اس موڑ پر پہنچ چکی ہے جہاں سے گھوم کر اُسے اُس چورلہے پر سے گزرنا تھا جس کا اوپر ذکر کیا گیا آخر کار وہ گاڑی خراماں خراماں اس معروف زرعی علاقے سے گذرنے لگی اور پھر وہ متعلقہ بازار کے مقابل پہنچ کر رک گئی۔ وہاں اور کئی دوسری جمعیتوں کی گاڑیاں قطار بنائے کھڑی ہوئی تھیں۔ یہاں کی سبز منڈی کے چھوٹے کارکن آنے والے ڈرائیوروں اور سبزی پیدا کرنے والوں کی ٹوکریوں کے اتارنے میں ان کی مدد کر رہے تھے لیکن جیسے ہی یہ زرد پھولوں والی ماہی پشت کی جمعیت کی گاڑی وہاں پہنچی وہ وہاں کے خریداروں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو مال اس میں لدا ہوا تھا وہ واقعی نہایت ہی جاذبِ نظر تھا مثال کے طور پر سُرخ سُرخ ٹماٹر ہری ہری ککڑیاں، تازہ ہرا بھرا پالک جو تمام کا تمام ان کھیت کیاریوں سے براہ راست لایا گیا جہاں کی جاں بخش ہوا کا ایک مخصوص تاثر ہوتا ہے۔ اس گاڑی میں تین قسم کے شلجم تھے۔ کچھ دودھ کی طرح چکنے اور سفید، کچھ سُرخ گول مٹول بڑے ہی بھاری بھر کم اور کچھ "حسن نادیدہ" کے نام سے موسوم تھے۔ منڈی میں مؤخر الذکر شلجم کی شہرت اس کی خوبصورتی کے باعث تھی۔ ان شلجموں کے اندر کا گودا جس کا رنگ ہلکا گلابی ہوتا ہے۔ گہرے سبز غلاف میں ڈھکا ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاہکوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ گاڑی کے چاروں طرف منڈلانے لگے۔ یہ خریدار آغازِ موسم کی ان نایاب سبزیوں پر ایک نگاہ ڈالنی چاہتے تھے جو عام طور پر بازار میں دستیاب نہیں ہوتیں۔ حق تو یہ ہے کہ لوگ انہیں دیکھ کر ہی ان کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے۔ ایک گاہک کو یہ کہتے سنا گیا:

"آپ ان سب کو دیکھ رہے ہیں یہ سبزیاں کتنی
فرحت بخش اور کس قدر تازہ ہیں۔"

دوسرا شخص بھی اس کے ساتھ بول اُٹھا۔

"ماشاء اللہ! آئے سال کی آمد کے ساتھ ساتھ
کیسی رنگ برنگی سبزیاں اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔
ایسی سبزیوں کی پیداوار میں کوئی ندرت تو یقیناً
ہوگی ورنہ ....."

خریداروں کے تاثرات سے گاڑی بان خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اُس سے خاموش نہ رہا گیا تو اپنی مسرت کے اظہار کیلئے سرگوشی اختیار کر لی اور پارٹی سیکرٹری اور لسٹو دونوں کو مخاطب کر کے بولا۔ "آپ بھی سن رہے ہوں گے ہی ہی!! .... اس موسم بہار میں ہماری فصل کی پہلی پیداوار کتنی ایک نمبر ہے ...." چی نے ڈرائیور کے اظہارِ خیال کا جو اثر لیا وہ یہ تھا۔

"بھئی اتنا بھی مت پھولو کہ آپے میں نہ رہ سکو۔" لسٹو جو ترکاریوں کی ٹوکریاں اتارنے میں مدد دے رہا تھا اس نے بھی چی کے مؤقف کو سراہتے ہوئے کہا۔" ایسی تعریفوں سے ہمیں اپنے دماغوں کو عرش پر نہیں پہنچا دینا چاہیے گاڑی بان۔" ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہم اپنے خریداروں کی گفتگو کو پوری توجہ سے سنیں تاکہ ہم یہ محسوس کر سکیں کہ وہ واقعی ہمارے مال سے خوش اور مطمئن ہیں بھی یا نہیں"۔

چی نے لسٹاؤ کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو لسٹو تاہم اگر ہم یوں صُمٌ بکمٌ بنے رہے تو اس سے ہم کیا اخذ کریں گے سوچو تو ہمیں پورے غور و خوض کے ساتھ اپنے دماغوں کی صلاحیت سے کام لینا چاہیے تاکہ ہم معلوم کر سکیں کہ ہم اپنی ان کوتاہیوں کو جن کا اظہار خریدار دورانِ گفتگو اکثر نہیں کرتے ہیں ہم خود بر وقت ان کی اصلاح کر لیں۔ ساتھ ہی ہمیں اس بات کا بھی کھوج لگانا چاہیئے کہ کہیں کسی عنوان ہماری کارکردگی میں کوئی سُقم تو نہیں رہ گیا۔ میرا مطلب ہے ایسا سُقم جس کی تہہ تک خریداروں کی نگاہیں بھی نہیں

پہنچا کریں۔ ابھی ان دونوں کی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک نوعمر لڑکی جس کا نام سُنگ تھا اور جو سبزیوں کے کاؤنٹر پر کام کرتی تھی یکایک پیچھے سے نمودار ہوئی۔ بڑی ہی ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی وہ۔ لمبا قد، چھریرا جسم خوبصورت آنکھوں میں اظہارِ خیال کی بے پناہ قدرت، دو لمبی لمبی چوٹیاں جو گندھی ہوئی تھیں۔ اِدھر سے اُدھر اس کے جسم کی لچک کے ساتھ گھوم جاتی تھیں۔ اس کی نظر بھی نو وارد گاڑی بانوں پر مرکوز تھی۔ یہ گاڑی بان صاحب پارٹی سیکرٹری کے عقب میں چھپے کھڑے تھے۔ اس لڑکی نے اپنے کولھوں پر دونوں ہاتھوں کی توسیں بنا رکھی تھیں اس نے بڑی توانا آواز میں کہا۔

"میں جب ایسے نازک اندام ہرے بھرے شعلہ بار سبزیوں کے انبار دیکھتی ہوں تو معاً میرا ذہن زرد پھولوں والی ماہی پشت جمیعت کی طرف پہنچ جاتا ہے"......چی نے اس تخیل کی پرواز پر گرفت کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو یہ ہے آپ کی ذات شریف"

سنگ نے ایک جھٹکے سے اپنی چوٹیوں کو پشت پر پھینکتے ہوئے ان بزرگوار کے ہاتھوں کو بڑی گرم جوشی سے بھینچتے ہوئے نہایت سرگرم لہجے میں کہا،

"جناب عالی محترم سیکرٹری صاحب۔ ابھی واپس نہ چلے جائیے گا...... مجھے اپنی الماری کے تختوں کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں آپ کی (تھوڑی سی) مدد لینی ہے......میری مدد کریں گے نا!......(آپ تو جانتے ہی ہیں) مجھے اپنے خریداروں کی خاطر کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں...... ہاں نہیں تو!...... ان کی ضرورت کے مطابق اُن کی خوشنودی کے خیال سے ADJUST بھی تو کرنا پڑتا ہے؟"

چی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"کیوں نہیں! ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ ہم بھی یہاں اسی جذبہ (خیر سگالی) کے ساتھ آئے ہیں۔"

اس الھڑ کم عمر لڑکی نے لسٹو کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "گپیں مت ہانکئے۔ یہ تو میں بھی خوب سمجھتی ہوں آپ یہاں میری مدد کرنے کیوں آنے لگے۔ آپ لوگوں کی دلچسپی بھی خریداروں سے ہی وابستہ ہے".....

"غلط!... غلط! بالکل غلط! بھئی ہم ایک پنتھ دو کاج پر عمل کرنے والوں میں سے ہیں۔ کیا ہمارے شہری اور گاؤں والے ایک ہی بڑے خاندان کے جُدا جُدا فرد نہیں ہیں۔ کہئیے!"

پارٹی سیکرٹری اور نوجوان سنگ کی اس گرما گرم بحث سے لسٹو خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔ اس نے جب سبزی منڈی کے اندرونی حصے پر نظر دوڑائی تو اسے یہ محسوس ہوا کہ کچھ شیلف کاؤنٹروں کے پیچھے ابھی تک خالی ڈھنڈار پڑے ہیں۔ اس نے فوراً ہی حسن نادیدہ نامی شلجموں کی ایک ٹوکری اٹھائی اور انہیں کسی ایک شیلف میں بے پرواہی سے انڈیل دیا۔

نوخیز شوخ و شنگ سُنگ جو لسٹو سے واقف نہیں تھی اس کارگذاری کو دیکھ کر اپنے اوپر قابو پانے کے لئے سر کو جنبش دے کر اپنے غصّہ کو ضبط کر کے رہ گئی لیکن جب لسٹو دوسری سفید شلجموں کی ٹوکری لوٹانے کے لئے پلٹا اور ان شلجموں کو بھی اس نے اسی بے دردی سے شیلف میں پھینکا تو لڑکی جھلّا اٹھی۔ اس سے بغیر کہے نہ رہا گیا وہ چیخ کر بولی.... ہے ہے۔ سنبھال کے احتیاط کے ساتھ گراؤ انہیں.... دیکھتے نہیں ہو یہ شلجم "حسن نادیدہ" سے کہیں زیادہ نازک ہوتے ہیں اور آسانی سے خراب بھی ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مہنگے داموں بھی بکتے ہیں۔

لسٹو کچھ لمحے کے لئے لڑکی کے ڈانٹنے پر بدحواس سا ہو گیا تھا۔ وہ خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ لڑکی کی خفگی بے جا نہیں ہے اُسے شلجموں کو لاپرواہی سے نہیں پھینکنا چاہیئے تھا۔ نہایت معذرت آمیز لہجے میں بولا۔

"فروخت کے سلسلے میں تعاون کرنے کا یہ میرا پہلا موقع ہے۔" اس کے اس جواب پر لڑکی بے ساختہ چیخ اٹھی :.... خیر!... ہو سکتا ہے! ... خیر!!!

لیکن یہاں منڈی میں سبزیوں کو اتارنے اور چڑھانے اور ان کا تحفظ کرنے میں آپ مجھے اتنے کورے بھی نہیں لگتے اور پھر بھلا آپ تو مختلف قسموں کی سبزیوں کے نرخ کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں .... کیا نہیں سمجھتے ہیں آپ"!!! .....

کچھ خفیف سی شرمندگی اور خجالت محسوس کرتے ہوئے وہ نوجوان صرف اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ اس کے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا وہ اس لڑکی سے کیا کہے۔ یہ کیفیت اس وقت تک اس کے حواس پر چھائی رہی جب تک چی اس کی مدافعت کے لئے نہیں آیا۔

"لسٹوفانگ میں یہ بات تمہارے نوٹس میں لانا چاہتا ہوں کہ یہ نو عمر لڑکی سُنگ بہت ہی با اخلاق اور بے تکلف ہے۔ اس کے ذہن پر صرف خریداروں کی خوشنودی مسلط رہتی ہے۔" پھر وہ سُنگ کی جانب متوجہ ہوا اور اس سے کہا۔ "سنگ اگرچہ میں تمہارے نقطۂ نظر سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تمہیں اس طرح براہ راست لسٹو کو نشانہ نہیں بنانا چاہیئے تھا۔ سُنگ ہماری مقبول ترین پیداوار کی کوئی بھی سبزی ہمیں ہمیشہ اچھے دام نہیں دیتی۔ ہمیں گاہکوں کے بارے میں ابھی تک کون سا اندازہ ہے۔ کہ وہ کن شلجموں کی خریداری کے لئے اپنی زیادہ سے زیادہ رقم کا بہترین مصرف سمجھیں گے۔"

نو عمر سُنگ کی مسکراہٹ میں پشیمانی اور تردد کا ہلکا سا عنصر غالب تھا۔ اس نے لسٹو پر طائرانہ نظریں ڈالیں لسٹو بے چارہ نے اسے دیکھ کر اپنا سر ہلا دیا مگر بولا کچھ نہیں۔ ادھر ہوا اور ادھر پارٹی سیکرٹری بہ نفسِ نفیس قسم قسم کے شلجموں کو ان کے مخصوص خانوں میں رکھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے ان شلجموں کو اقلیدس کے زاویوں کی شکل میں چننا شروع کیا کہ سبز اور سرخ کے ساتھ جو تناسب قائم کیا جائے اس کا پس منظر سفید رنگ میں نمایاں ہو۔ چی نے یہ کام نہایت پھرتی، صفائی اور مہارت سے اس طرح انجام دیا کہ نوجوان سُنگ خوشی سے جھوم اٹھی۔ وہ چی کو چاقو دیتے ہوئے بولی:

"محترم پارٹی سیکرٹری صاحب کیوں نہ ہم کچھ شلجموں کو پھولوں کا لباس پہنا دیں۔ ہمارے خریداروں کے لئے اس صورت میں بڑی زیبائش پیدا ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے! آپ ایسا کریں گے: بغیر کچھ جواب دیئے چی نے ایک "حسن نادیدہ" شلجم چپ چاپ اٹھا لیا اور بڑی مہارت سے پتّروں کی تہ پر تہ اس طرح جمائی کہ "حسن نادیدہ" خوبصورت نظر آنے لگا۔ اس نے کچھ اسی انداز کی کاریگری دوسرے شلجموں کی ہیئت سنوارنے میں کی۔ حتیٰ کہ شیلفوں میں رکھے ہوئے شلجم تمام کے تمام نظر نواز بن گئے

خوشی سے تالی بجاتے ہوئے نو عمر سُنگ نے کہا:

"محترم پارٹی سیکرٹری صاحب! آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے۔"

چی نے اس کے ریمارک کو اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا:

خیر! خیر! اس وقت اس کی نگاہیں ناقدانہ طور پر شیلفوں پر جمی ہوئی تھیں وہ کہنے لگا۔ "بازار کی خرید و فروخت میں ابھی خاصی دیر ہے۔ اسی اثنا میں ہمیں خاصا وقت مل رہا ہے کیوں نہ ہم آپس میں بات چیت سے اپنی پیداوار کے بارے میں کچھ اصلاحی پہلوؤں پر غور کر لیں۔ اتنا کہہ کر وہ نو عمر سُنگ کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا تاکہ وہ دوسرے سبزی فروشوں سے بھی ان کی تجاویز کے بارے میں آگاہی حاصل کر لے۔

اور پھر جیسے ہی منڈی لگی لوگوں کا جمگھٹ بھی ساتھ ہی لگتا چلا گیا ایک ایک خریدار سُنگ کے اسٹال کے قریب پہنچ کر اپنے قدم جما دیتا کیونکہ اس اسٹال پر شلجموں کو بڑی دیدہ ریزی

کے ساتھ سجایا گیا تھا اور اُن کی زیبائش بڑی جاذبِ نظر تھی۔ چی بڑی پھرتی کے ساتھ ہر سبزی کو بڑے سلیقے سے اُٹھا کر اس کا وزن کرتا، موقع کی مناسبت سے گاہکوں سے باتیں بھی کرتا۔ خریداروں میں گھریلو بیبیاں اور مختلف طبقوں کے لوگ شامل تھے۔ لسٹو فانگ بھی چی کی معاونت کے خیال سے چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ اور پھر خود ہی اپنے دل میں فیصلہ کر کے کہ بس آج وہ شلجم ہی فروخت کرے گا۔ وہ پشت کی طرف کے کاؤنٹر پر پہنچا اور کباچی کنجڑوں کی طرح مخصوص بولیوں سے گاہکوں کو متوجہ کرنے لگا اس کی آوازوں کا شور کچھ اس طرح کا تھا۔

میرے شلجم کیسے رسیلے جیسے لال انار
اُن کی بھاجی کھائی نہ ہو گی

ان کو کھاؤ کھا کر اپنی جان بناؤ
صحت پکڑو ڈھیروں چلّو خون بڑھاؤ
کیسے سندر کیسے میٹھے کیسے گول مٹول ہیں بابو کیسے گول مٹول
لگیں جیسے کچھ ہیں اُس میں ان کو چاہو ان کو لے لو نہیں ہیں انمول
شلجم میرے من بھاتا ان سے بھاگے جگ کی پیاس
آؤ مسٹر آؤ بابو بھاجی اس کی سب کی آس

سٹو کی آواز سن کر خریدار اس کے کاؤنٹر پر جمع ہونا شروع ہوئے۔ حسب منشا خریدار اپنی پسند کے مطابق شلجم خریدنے لگے زیادہ لوگوں نے تو تینوں اقسام کے شلجم خرید ڈالنے۔ اس وقت لسٹو فانگ بے حد مصروف نظر آ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے شبنم کے قطروں کی طرح جمع ہو گئے تھے۔ دوپہر کے قریب ایک ادھیڑ عمر کی عورت خریداری کے لئے آئی۔ اُس کی نگاہ ان شلجموں پر پڑی جنہیں چی نے نئے قالب میں ڈھال دیا تھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے فوراً اپنی ٹوکری لسٹو کی طرف بڑھاتے ہوئے اس سے کہا۔ کامریڈ! پوری ڈبیا... "حسن نادیدہ" کی میری ہوئی، سُن لیا آپ نے۔ لسٹو نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے ہوئی"

ابھی وہ گھوم کر ان شلجموں پر نظر ڈال ہی رہا تھا کہ اُسے ایک آہنی ہاتھ اپنے بازو پر محسوس ہوا۔ یہ چی تھا۔ کہنے لگا۔ "بھلے مانس پہلے اپنے شیلف پر تو نگاہ ڈال لیا کرو۔ لسٹو یہ سن کر بہت خفیف ہوا اور بجھے ہوئے لہجے میں بڑی بے دلی سے بولا۔ "محترمہ "حسن نادیدہ" تو خال خال ہی نظر آ رہے تھے" اس وقت تک سرخ گول مٹول شلجم تو سب کے سب فروخت ہو چکے تھے البتہ سفید براق جیسے شلجموں کا اب بھی ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لسٹو نے اپنا سر کھجاتے ہوئے اُس بڑی بی سے کہا محترمہ کیا دودھیا دلے پڑے ہیں۔"

اس ادھیڑ عمر والی خاتون نے لسٹو کو ایک مشفقانہ تبسم کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا "صاحبزادے! تم اس منڈی میں نئے نئے آئے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے میں اس منڈی کی پرانی خریدار ہوں۔ میں یہاں سے ہمیشہ "حسن نادیدہ" ہی خریدا کرتی ہوں۔ یہ شلجم نہ صرف کھانے ہی میں مزے دار ہوتے ہیں بلکہ کھانسی اور زکام میں بھی یہ بڑے کام کی چیز ہیں" اُس پر لسٹو نے معذرت کے ساتھ ان بڑی بی سے کہا "حسن نادیدہ" میرے پاس سردست اتنے نہیں ہیں" چی نے برسبیل تذکرہ ان محترمہ کی دلجمعی کے لئے کہا۔ "محترمہ بات دراصل یہ ہے ہم نے گذشتہ موسم گرما میں "حسن نادیدہ" کی کاشت زیادہ مقدار میں نہیں کی اس لئے ہماری اور ہمارے خریداروں کی مانگ میں مطابقت نہیں پیدا ہوئی۔ اگر آپ کو ہمیں اپنے گھر کا پتہ دینے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم آپ کے لئے مزید "حسن نادیدہ" فراہم کرنے کا بندوبست کر دیں گے اور آپ کے گھر پہنچا دیں گے۔"

بڑی بی بولیں۔ "نہیں میاں میں آپ کو اس قدر زحمت دینا گوارا نہیں کرتی۔ بہرحال آپ کا بہت بہت شکریہ"

اتنا کہ کروہ مڑیں اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

جب سٹو فانگ نے کنکھیوں سے چی کا ردِعمل معلوم کیا تو اسے پتہ چلا کہ وہ بکھرے ہوئے سفید شلجموں کے انبار پر اپنی نظریں گاڑے بیٹھے ہیں۔ اور پھر اس نے سٹو کو دیکھ کر اپنی بھنویں چڑھالیں۔
بھولے سٹو نے چی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا،

"اگر آپ ضرورت سمجھیں تو میں اب بھی اس کا پیچھا کرسکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے اس کا پتہ حاصل کرنا مقصود ہو تو....."

چی نے نفی میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا "نہیں نہیں سٹو!!.......میں اس بات کے لئے فکرمند نہیں ہوں۔ دیکھو ایک گاہک کو مطمئن کرنا مسئلہ نہیں ہوتا۔ مسائل تو ہمارے اپنے باغ کی سبزیوں کی رسل و رسائل سے وابستہ ہیں جن کا براہِ راست منڈی سے تعلق ہے اور منڈی کو تم جانتے ہو ہزاروں خاندانوں کی ضرورت پوری کرنی ہوتی ہے۔"

"خیر! اب گھر چلنے کا وقت ہو چلا ہے۔"

چی نو عمر سنگ کو خدا حافظ کہنے کے لئے اس کی طرف بڑھا گھر جانے سے پہلے اس نے تینوں قسم کے شلجموں میں سے ایک ایک اٹھا لیا۔ لڑکی نے بڑی شوخی سے چی کو چھیڑتے ہوئے کہا:

"یہ بھی کیا کم بات ہے آپ خالی ہاتھ گھر نہیں لوٹ رہے ہیں"
وہ یہ کہتی جارہی تھی اور اپنی ساتھیوں کو آنکھ مارتی جاتی تھی۔

چی نے اس پر کہا "ایسی تو کوئی بات نہیں ۔۔......میں جس مقصد سے یہاں آیا تھا وہ میں پورا کرچکا ہوں"۔ اور پھر اس نے ان تینوں شلجموں کو نمونے کے انداز سے اسے دکھایا۔ نوعمر سنگ نے تجاہلِ عارفانہ کے انداز میں زیرِ لب کہا۔ "میں سمجھی نہیں اس سے آپ کا کیا مفہوم ہے"۔ مگر چی تو اس وقت تک کافی آگے بڑھ چکا تھا۔
اور اسی شام کو زرد دھپولوں والی ماہی پشت جمیعت کا ایک اجلاس اُن کی جماعت کے دفتر میں منعقد ہوا۔ چی نے ان تینوں شلجموں کو جنہیں وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا پیکٹ سے باہر نکالا اور جلسے کے شرکاء سے مخاطب ہو کر کہا۔ (چی ایسی سمت میں کھڑا تھا جہاں روشنی سب سے زیادہ تیز تھی)

"حضرات! آپ اپنی دانست میں ان تینوں شلجموں میں سے کسے ترجیح دیں گے۔ میری مراد کسی ایک کا مقابلتاً زیادہ اچھا ہونے سے ہے"

حاضرینِ جلسہ کا ذہن اس پہیلی کو بوجھنے کی طرف مائل نظر آیا لیکن حتمی طور پر وہ یہ بتانے سے قاصر تھے کہ کون سا شلجم سب سے اچھا ہے۔ تاہم ان میں سے ایک شخص نے چی سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا،

"جناب یہ بات کون نہیں جانتا "حسن نادیدہ" کچا کھانے کے لئے، گول گول سرخ پکانے کے لئے درست سمجھے جاتے ہیں"

"اور ان گورے بھبوکا سفید شلجموں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے"

چی نے برجستہ کہا۔ کسی دوسرے شخص کی آواز سنائی دی۔
اس نے کہا "لیکن صاحب اس کی تو شہرت ہے ہی نہیں"

"تو پھر اس صورت میں" جبکہ چی کی پیشانی سے سنجیدگی اور ذہانت کے آثار درخشاں تھے اپنے سوال کو دہراتے ہوئے کہا ....."
ہم نے گذشتہ موسم گرما میں ان سفید نام شلجموں کی کثرت سے کاشت کیوں کی اور "حسن نادیدہ" کو ان کے مقابلے میں کیوں نظر انداز کردیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور یہ سوال حل طلب بھی ہے"

یہاں سے بحث کا رُخ گہماگہمی میں تبدیل ہوگیا۔ سٹو فانگ کے اپنے پیٹ میں اُگل دینے کو بہت سا مواد موجود تھا اور جسے وہ ابھی منڈی سے اپنے ساتھ تجربے کے طور پر ساتھ لایا تھا۔ اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور پاؤں پٹختے ہوئے چلا کر بولا۔

"سامعین میں بتاتا ہوں، میں سناتا ہوں۔ اس نکتہ کا تعلق ہمارے گذشتہ پیداواری منصوبے سے ہے جہاں باہم مقابلے میں آنے

والی چیزوں کی قدر و قیمت کے تعین میں بڑی مشکل پیش آتی ہے آپ کو یاد ہوگا موسم بہار میں کچھ خریدار شہر سے واپسی پر یہ کہتے ہوئے کہ سفید ذات والے شلجم اونچے داموں پر اٹھے تھے اور ان کے مقابلے میں "حسن نادیدہ" کی قیمت خاصی نیچے آگئی تھی۔ انہوں نے ہماری بریگیڈ کے رہنما کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اس مرتبہ ہم سفید ذات کے شلجموں کو (IVORY WHITES) کثیر تعداد میں بوئیں اور "حسن نادیدہ" (HIDDEN BEAUTY) نسبتاً کم چنانچہ ہم نے اُن کے مشورے پر عمل کیا۔ لیکن یہ بات اب روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ ہم اُن کے پٹاؤ میں آگئے تھے۔ وہ جو عام قدیم مقولہ ہے "اپنے فائدے کی پہلے سوچو" .... یہاں تک ہی کہنے پایا تھا کہ اس کی سانس پھول گئی اور وہ اس سے آگے نہ بول سکا۔ اس نے اپنے کسی ساتھی کی طرف دیکھا جو میز کے پاس بیٹھا ہوا تھا مگر وہ کچھ ایسا بے ڈھب گردن نیچے جھکائے بیٹھا ہوا تھا کہ لسٹو اس کے چہرے کے تاثرات کا کوئی اندازہ نہیں کر سکا۔

لسٹو فانگ کا نقطۂ نظر بڑی حد تک برق آسا ثابت ہوا۔ اور کمیٹی ہال میں خاصا تناؤ اور گرمی کے انداز کا رجحان پیدا ہوتا محسوس ہوا۔ اور پھر جیؔ کا اشارہ ملتے ہی لسٹو بیٹھ گیا۔ پارٹی سیکرٹری یعنی جیؔ نے اب باری باری ہال کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے افراد کی انفرادی خواہشات کا جائزہ لینے کی غرض سے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ معزز حضرات مجھے لسٹو فانگ کے اظہار خیال سے قطعی اتفاق ہے اس لئے کہ "حسن نادیدہ" صرف ایک شلجم ہی کی قسم کو ہم لوگ کہتے ہیں لیکن اسی شلجم کو (اجتماعی طور پر) اب کاشتکاروں اور شہر کے کارندوں کے مزاجوں کی مساوی کڑی بن جانا چاہیئے۔ ہمارا کام چونکہ اپنے باغات کی پیداوار کو منڈیوں تک پہنچانا ہے لہٰذا یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم شہریوں کو خاصی مقدار میں سبزیاں فراہم کرتے رہیں۔ اگر ہم نے کوئی کوتاہی کی تو ہم نادار اور کم متوسط درجے کے کاشتکار اپنے فرض سے رُوگردانی کریں گے۔

اس وقت ہال کے اندر خاموشی مسلط تھی البتہ پائپ کا دھواں آوازوں کے زور شور اور مباحثہ کے عوامل کی نشان دہی کر رہا تھا ایک مختصر وقفے کے بعد جیؔ نے اراکین جمعیت کے متفقہ فیصلے پر مبنی قرارداد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہیں عملی طور پر اقدام کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو میرے معزز ساتھیو ہمیں اب سوچنا یہ ہے کہ آئندہ سال کے لئے ہمارے منصوبے کی بنیاد کس پر رکھی جائے۔ اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر شدید بے قراری اور رقت کی سی کیفیت عیاں تھی، اس پر مستزاد ہکلاہٹ نے آمیزش کر کے الفاظ کو اور گنجلک بنا دیا۔ اس کے مبہم الفاظ کچھ اس طرح ادا ہو رہے تھے۔

"اب ب ..... اب کے بعد ہمیں "حسن حسن حسن نانادیدہ" کی کاشت کرنی نی چاہیئے۔ بس م م م مجھے ات ت نا ہی کہنا ہے"۔

جیؔ نے مزید کہنے کی گنجائش ہی نہیں رکھی چنانچہ میٹنگ کے اختتام پر ہال قہقہوں سے گونجنے لگا۔ جیسے ہی پارٹی سیکرٹری نے دروازہ کھولا تو تازہ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے انہیں خوش آمدید کہا۔ جیؔ کو پتہ بھی نہیں چلا موسم بہار کی پہلی بارش کا کب آغاز ہوا۔

"بھئی بارانِ رحمت نے بھی کیسے عین وقت پر دستک دی ہے"۔

روانگی کے دوران کسی کے یہ الفاظ سنائی دے رہے تھے۔ پے در پے موسم بہار کی بارشوں نے زمین میں ڈالے ہوئے بیجوں کو فروغ دینے میں موثر کردار ادا کیا ہے۔

گرمیوں کے مصروف ایام آئے اور گذر بھی گئے پھر سنہری خزاں جب اپنے اختتام پر تھی اس وقت زرد پھولوں والی ماہی

پشت جمعیت کے عملے کو "حسن نادیدہ" کی وافر پیداوار حاصل ہوئی۔
کوئی دیہات ایسا نہ تھا جہاں ان کاشتکاروں کی کامیابی پر لوگوں کے
سر فخر سے بلند نہ ہوں اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا اس لئے کہ کاشتکاروں
نے اپنے منصوبے میں ردّ و بدل کے بعد فوراً ہی کھیتوں میں پیداوار
کی حقیقی قدر و قیمت کے تعین میں خاصا زور لگا دیا تھا۔ انہوں نے
اس ضمن میں کافی مقدار میں پانی اور کھاد کا بھی اہتمام کیا تھا چنانچہ
اس سال کی فصل کے "حسنِ نادیدہ" غیر معمولی طور پر نظر فریب تھے
بڑے ہی فربہ اندام۔ مفرحِ قلب نہایت باریک جھلی والے اندر سے
خاصی سرخی مائل جھلی سے مسحور اور نہ جانے کیا کیا۔

ایک شام جبکہ سردی کی پہلی لہر اتنا زور باندھ رہی
تھی۔ شلجموں کا ذخیرہ کرنے کے بارے میں مذاکرات کے لئے ایک
مجلس کا انعقاد عمل میں آیا مباحثے میں بحث طلب امور یہ تھے۔ دو
ماہ کے اندر اندر "حسن نادیدہ" کو جو شہریوں کو بہت مرغوب ہیں
کافی تعداد میں نہ صرف منڈی تک پہنچایا جائے بلکہ ہمارے تنظیمی
عملے کے بکری کے کوٹے کو بازار کی مانگ سے زیادہ مطابقت ہونی
چاہیئے۔ چنانچہ مختلف نوعیت کے امور کے بارے میں تقسیم کار کے
تعین کا شعبہ مقرر کیا گیا اور اس ضمن میں اور بھی کئی فیصلے کئے گئے۔
پارٹی سیکرٹری کو براہِ راست کھیتوں سے شلجموں کو منڈی پہنچانے
کا پورا اختیار سونپا گیا۔ اور لستو فانگ کو نوجوان کاشتکاروں کی
معیشت میں شلجموں کو ذخیرہ کرنے کا نگراں مقرر کیا گیا۔

دوسری صبح منہ اندھیرے جمعیت کا سارا عملہ بڑا ہی پُرجوش
اور چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا کیوں نہیں! ان کی فصل کی پیداوار
بھی تو خاصی وافر تعداد میں انہیں حاصل ہوئی تھی۔ سارا کا سارا
عملہ اپنے فرائض کی تکمیل کے لئے تیار کھڑا تھا۔

اور ادھر بڑی جھیل کے نیم شفاف پانی کی مانند خزاں رسیدہ
گہرے نیلے رنگ کا آسماں بادلوں سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔
میپل کی پتیاں جو کہر کی زد میں آکر جھڑ گئی تھیں ان کی رنگت گلنار
نظر آتی تھی۔ پورا کا پورا محنت کشوں کا مختصر سا قافلہ کھیتوں کی
پگڈنڈیوں پر رواں دواں تھا۔ بہنگیوں میں لٹکی ہوئی ٹوکریاں
ان کے شانوں پر اوپر نیچے لچکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔
بوائی کی ہوئی اوپر کی سمت پھیلی ہوئی مٹی میں غضب کی سوندھاہٹ
محسوس ہو رہی تھی۔ اس محنت کش کارواں کا سالار چی چانگ کو
اپنی بہنگی پر بہت بھاری بوجھ لادے ہوئے سب کے آگے آگے
چل رہا تھا۔ جب وہ اپنے قدموں کو جنبش دیتا تھا تو اس کی بہنگی کافی
وزنی ہونے کے باعث ہلال کی مانند جھکی ہوئی دکھائی دیتی تھی وہ
بڑی مستعدی مگر تیز گامی کے ساتھ آگے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس
کے جوتوں کی ایڑیوں سے خاک کے بگولے اس کی رفتار کی تیزی
کی نشان دہی کر رہے تھے۔

کچھ ہی وقفے کے بعد لستو فانگ بیلچہ ہاتھوں میں تھامے دوڑتا
دوڑتا ادھر آنکلا۔ شدید کھدائی کی مشقت کی وجہ سے اس کا چہرہ
تمتما رہا تھا۔

اس نے آتے ہی چی کو زور سے پکارا اور کہا۔ "محترم پارٹی
سیکرٹری ہم سب تیار ہیں۔ یہ بتایئے ہمیں کُل کتنے گڑھے کھودنا
ہوں گے۔"

چی نے اپنی بہنگیوں کو زمین پر ٹکاتے ہوئے جواب دیا۔
"بھئی فصل کی مناسبت سے میں سمجھتا ہوں کم از کم دس
گڑھے تو درکار ہوں گے۔ اس پر لستو بولا۔ "تب تو جناب ہمارا
سارا عملہ ہی اسے مل کر انجام دے سکے گا۔ لیکن ہمارے دونوں گروپ
اگر لگاتار کام میں پوری تن دہی کے ساتھ لگ جائیں تو ہم آج ہی
کام کو نبٹا سکیں گے۔"

اتنا کہہ کر وہ بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ چی نے چیخ کر کہا۔ "اے
میاں جلد بازی ایسی بھی کیا بھاگڑ مچی ہے۔ شلجموں کا ذخیرہ کرنے میں خاصی
مہارت درکار ہوتی ہے۔ سوکھی ہوئی زمین جو گڑھوں کے جنوب کی
جانب چھٹی ہوئی ہے۔ اسے نم کرنا ہے۔ سمجھے کہ نہیں، تمہیں نرم مٹی

بیلچے کی مدد سے اٹھا کر شلجموں کی ہر تہہ پر پھیلانا ہے۔ شلجم گرم موسم میں تو ٹھہر نہیں سکتے۔ اسی لئے یہ بات بھی غور طلب ہے کہ شلجم اچھی طرح ڈھکے رہیں تاکہ وہ محفوظ رہ سکیں۔"

لسٹو نے دوڑتے ہوئے چلا کر کہا۔ "آپ بالکل مطمئن رہیں ہمارے اس سال کے "حسن نادیدہ" گزشتہ کئی سالوں کے مقابلے میں کہیں بہتر رہیں گے۔ اور میں خود بھی ان پر زیادہ سے زیادہ توجہ دوں گا۔ سطح زمین پر کہیں دراڑیں باقی نہیں رہیں گی اور وہ ہی انہیں قبل از وقت کریدا جائے گا۔ جب بہار کے میلے میں ہمارے شلجم منڈی بھیجے جائیں گے تو اس بات کی میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ ہمارے شہر کے چھوٹے بڑے سب ہی انہیں حاصل کر کے خوش ہوں گے۔"
اتنا کہنے کے بعد وہ اپنے دوسرے ساتھیوں میں شامل ہو کر گڑھے کھودنے کے لئے سرعت کے ساتھ چل پڑا۔

تیسرے پہر یکایک موسم میں تبدیلی واقع ہوئی۔ بادلوں کے لمبے چوڑے غول کے غول بادبانی جہازوں کی مانند شمال کی سمت کھیتوں کے اوپر دھند کی شکل میں چھانے لگے۔ لسٹو فانگ نے تشویش آمیز نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا اور زیر لب بڑبڑایا۔ "جب آسمان پر بھورے مٹیالے رنگ کی تہہ چڑھ کر انہیں پہلی سفیدی میں نمایاں کر دیتی ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یا تو ہوا کے تیز جھکڑ چلیں گے یا پھر بارش ہوگی۔" ابھی مشکل ہی سے اپنے بڑے بوڑھوں کی سنی سنائی اس کہاوت کو اپنی زبان پر لایا ہی تھا کہ ایک مانوس (مصنوعی) کرخت آواز پیچھے سے اُس کے کانوں نے سنی۔
" ساتھی! کیا آپ کی جمعیت کے پارٹی سیکرٹری یہاں کہیں موجود ہیں؟"
لسٹو فانگ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو نوعمر سبزی فروش سنگ کی آواز ہے جو سائیکل گھماتی ہوئی کھیتوں کے ایک کنارے پر چلی آ رہی ہے۔

آہاہا! یہ تم ہو! بتاؤ کیسے آنا ہوا۔ لسٹو نے لڑکی سے دریافت کیا۔ لڑکی نے چٹاخ پٹاخ دوٹوک جواب دیا۔ "کیوں جناب اگر میں آنا چاہوں تو اس میں بھی کوئی پابندی ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنے سر کی چوٹیوں کو گھمایا اور بات کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کہا بھئی فون پر تو آپ لوگوں سے ملاقات کرنا ناممکن ہے۔ میں نے کئی بار آپ کو فون بھی کیا مگر کسی نے جواب ہی نہیں دیا۔ لہٰذا مجھے خود ہی آنا پڑا۔ دیکھئے شوخ و شنگ سنگ ہم اس وقت سے لے کر ابھی تک فصل کاٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس اتنے فالتو آدمی کہاں ہیں جو صرف ٹیلی فون پر جواب دینے کے لئے تعینات رہیں" یہ جملہ لسٹو نے اپنے ماتھے پر شکن ڈال کر بڑے لہجے میں ادا کیا جبکہ اس کا سارا زور اُس کے بیلچے پر تھا۔

سنگ لسٹو سے مخاطب ہو کر بولی "منڈی میں انتظامیہ کمیٹی کی طرف سے کسی خاص مذاکرے کے لئے آپ کے پارٹی سیکرٹری کی طلبی ہوئی ہے۔" یہ سن کر لسٹو نے ایک نوجوان شخص کی طرف جو اس کے عین مقابل کھڑا تھا مڑ کر دیکھا اور کہا "آپ اسے پارٹی سیکرٹری کو تلاش کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے جائیں لسٹو جتنی جلد ہو سکے آپ کو واپس آجانا ہوگا۔" جوں ہی وہ دونوں چلنے کے لئے آمادہ ہوئے لسٹو نے لڑکی کو پکارتے ہوئے کہا "سنگ (تم دیکھ رہی ہو) میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ کسی اور وقت واپسی پر مجھ سے آکر بات چیت کرنا، سمجھ گئی"، نوعمر سنگ نے جواب دیا،" یہاں کس کے پاس گپ شپ کے لئے فاضل وقت ہے۔ اوں ہوں، ہاں سنئے البتہ منڈی میں ہم نے اپنے اوقات کار کی کچھ ایسی درجہ بندی کی ہے کہ پرسوں (اگر ہو سکا) ہم فصل کٹنے کے دوران تمہارا ہاتھ بٹا سکیں گے۔" اور پھر وہ اپنے شانوں پر پڑی ہوئی چوٹیوں کو اچھالتی ہنستی، کودتی رخصت ہو گئی۔

لسٹو اور اس کے آدمی پھر دوبارہ گڑھوں میں اتر کر اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ وہ سب کے سب پسینے میں نہا رہے تھے لیکن اس عالم میں بھی انہوں نے پل بھر کے لئے بھی اپنے کام سے منہ نہیں موڑا۔ یہاں تک کہ تمام "حسن نادیدہ" مکمل طور پر

محفوظ طریقے سے ڈھانک دیئے گئے جب کام ختم ہو گیا تو لسٹو آخری گڑھے کے اندر سے قلابازی کی شکل میں اچھل کر باہر نکل آیا۔ معاً اس کا سابقہ شمال مغرب کی تیز و تند ہوا سے پڑا جو کھیتوں کو اپنی برق رفتاری سے لرزہ براندام کر رہی تھی۔ اپنے چہرے پر جمے ہوئے پسینے کو پونچھتے ہوئے لسٹو نے کارکنوں کو آواز دے کر اکٹھا کیا اور کہا:

ساتھیو! اب ہوا کے کتنے ہی زوردار جھکڑ چلیں ہم نے اپنے شلجموں کو محفوظ کر دیا ہے۔ پھر وہ اپنے بیلچوں کو اٹھا کر گھر جانے کی تیاری میں مصروف نظر آنے لگے۔ اسی دوران ایک ہچکانی سی آواز انہیں سنائی دی۔ "ادھر دیکھیئے سامنے کون بڑھا چلا آ رہا ہے:" انہوں نے اپنی نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ یہ تو ان کا اپنا پارٹی لیڈر ہے جو دھول اور خاک سے اٹی ہوئی سڑک پر تیز قدم بڑھائے ان کی سمت چلا آ رہا ہے یہ (آنے والا شخص) چی جو عام طور پر مستعد اور کم سخن نظر آتا تھا اس وقت اس کے چہرے سے تردد کے آثار نمایاں تھے۔ لسٹو بہت ہی پُر جوش انداز میں اس کے خیر مقدم کے لئے آگے بڑھا اور اس سے کہا "خیر تو ہے! اگر آپ کو (خدانخواستہ) شلجموں کے بارے میں ایسی ہی تشویش ہے تو آپ اپنے طور پر اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔ انہیں اچھی طرح اندر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ان میں ڈھکے ہوئے گڑھوں کو آپ دیکھ رہے ہیں نا:"

چی گڈھوں کی طرف جانے لگا۔ اُس کی جھاڑ جھنکاڑ بھویں اس وقت بل کھا رہی تھیں میرا خیال ہے تم لوگوں نے اپنا کام زیادہ عجلت میں تو نہیں کیا ہے:"

یہ سوال کچھ ایسا غیر متوقع تھا کہ لسٹو کے تمام کے تمام ساتھیوں نے اپنے بیلچے زمین پر رکھ دیئے اور پارٹی سیکرٹری کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے (نیم لرزاں) خوف کو پارٹی سیکرٹری نے تاڑ لیا۔ ویسے تو چی کو اُن کی سرگرم کارانداز ی کا اندازہ ہو چکا تھا اور اس نے محسوس بھی کر لیا تھا کہ ان سب نے بہر صورت اپنا کام دن چھپنے سے پہلے ہی انجام دے دیا ہو گا اور چی اس بات سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا اور اس کے ساتھ ہی اُس پر ج بھاری ذمہ داری عائد تھی اس کا وزن بھی اس کے دماغ پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ وہ ان سے مخاطب ہو کر بولا:

عزیز ساتھیو! میں شہر سے ابھی واپس آ رہا ہوں چند فیکٹر اور آس پڑوس کی کمیٹیوں نے ہم سے "حسنِ نادیدہ" کی ترسیل کی فر فرمائش کی ہے۔ ہمیں اب اپنے بندھے ٹکے خود پسندانہ اور فرسودہ طرزِ عم کو ختم کرنا ہو گا۔ رجحانات کے بدلتے ہوئے اس دور میں ہمیں اپنے منصوبوں کو نئے سانچوں میں ڈھالنا ہو گا۔

اُن کارکنوں میں سے کسی ایک نے تشویش اور اضطراب کے ملے جلے انداز میں دریافت کیا:

"انہیں کتنی چھابڑیوں کی ضرورت ہے؟" چی نے برملا جواب د

"اتنی جتنی ہمارے ذخیرے میں موجود ہیں:" "کیا کہا آپ نے:" ایک اکھڑ قسم کے نوجوان نے جھلا کر کہا۔ "ان ناعاقبت اندیشو سے کون جا کر کہے۔ انہوں نے ہمیں پہلے سے کیوں نہیں بتایا۔ ہم نے کچھ ہی دیر پہلے تو اتنے ڈھیر سارے شلجموں کا ذخیرہ کیا تھا۔ کیا یہ ہمار اتنی زبردست کھدائی بغیر کسی مقصد کے رائگاں چلی جائے گی (بھلا آ ہی سوچئے)

لسٹو فانگ جو اس وقت آلتی پالتی مارے زمین پر بیٹھا ہوا تھ کچھ زیادہ ہی کبیدہ خاطر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نوجوان نے بیکنگ کی منڈی میں عمدہ ترکاری کی معقول رسد کا جو بیڑا اٹھایا تھا اور اُس کی تمام تر کاوش اس ضمن میں ہر فرو گذاشت سے مُبرّا تھی ظاہر ہے اس تبدیلی کار سے اُس کے ذہن پر پریشان کُن خیالات کا ہجوم مختلف ہئیت میں عود کر آیا۔ لسٹو کا تردد اپنی محنت کے رائیگاں جانے کے سبب سے نہیں تھا بلکہ وہ کچھ اور ہی بات تھی جس سے وہ ملول نظر آ رہا تھا کچھ وقفے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے جسم کے پورے تناؤ کے ساتھ اپنے پاؤں کو زمین پر مارا اور پارٹی سیکرٹری پر اپنے احساسِ قلب کو پوری کیفیت سے روشناس کرانا چاہا۔ اس نے کہا

(یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے) ہم ماہ بہ ماہ بلکہ روز بروز اپنی منصوبہ بندی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے رہے ہیں اور ہم نے اس پر سختی سے عمل پیرا ہو کر یہ بھی ثابت کیا کہ ہماری سبزیوں کی رسد کا مناسب طور پر توازن قائم رہے اب وہ لوگ ہم سے یہ فرمائش کر رہے ہیں ہم اپنے "حسنِ نادیدہ" کا سارا اسٹاک اُن کے ہاتھوں فروخت کر دیں (آپ ہی غور کیجئے) جب آئندہ موسم بہار اپنے ساتھ بہار کی خوشیاں لائے گا اُس وقت ہم صورت حال کی مطابقت کے ساتھ اپنی رسد کی کس طرح ضمانت دے سکیں گے؟ چی لسٹو کے تاثرات معلوم کر کے صرف مسکرا دیا پھر اس نے لسٹو سے کہا۔ "بھئی دیکھو ہم نے اپنے حسن نادیدہ پر آج کل جو نقاب ڈال رکھی ہے اُس سے اس بات کا کیا جواز پیدا ہوتا ہے اور کیا ضمانت ہے کہ وہ تمام ذخیرہ متوازن رسد کی ضمانت بن جائے گا"۔ ان محنت کشوں میں سے کسی ایک کی آواز آئی "کیوں نہیں بن جائے گا صاحب؟" چی نے کہا "بھئی اس لئے کہ بعض سبزیوں کی مانگ میں ہر وقت توازن برقرار نہیں رہتا تم دیکھ رہے ہو چین میں ذہنی انقلاب کس قدر تیزی سے قدم بڑھا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہمارے عوام کے معیار زندگی میں نمایاں تبدیلی ہو رہی ہے دوسرے الفاظ میں ہم لوگ جن کا شمار منڈی میں رسد پہنچانے والوں میں ہے اُن پر تو مسلسل زیادہ ہی مانگ کا دباؤ پڑے گا اس لئے منصوبے کی اہم فوری تبدیلی مستقبل کے لئے اچھا پیش خیمہ ہے کسی کی آواز آئی "اچھا پیش خیمہ وہ کیسے؟" چی نے جواب دیا۔ "اچھا پیش خیمہ اس لئے کہ حسنِ نادیدہ کی اچھی فصل تیار ہوئی ہے۔" اگر ہم انہیں فروخت کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں محض یہ سوچ کر کہ اُن کی مانگ فوری ہے تو ہم غلطی کے مرتکب ہوں گے اور دیہی شلجم ہمارے لئے بحالتِ ذخیرہ موذی قرضے کی شکل اختیار کر لیں گے خود ہی سوچو ہم اتنی بڑی ذمہ داری کے ساتھ اس قرضے سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ چی کی آنکھوں میں خود اعتماد اور پیش بینی کا کوندا سا لپک رہا تھا۔ اُس کا نقطۂ نظر بہر نوع عاقبت اندیشی پر مبنی تھا (خیالات کی رو میں وہ بہے چلا جا رہا تھا) .... اگرچہ ہماری سبزیوں کے کھیت صرف سینکڑوں ایکڑ کے رقبے میں محدود ہیں لیکن عوام کی خدمت کی بجا آوری میں جذبات کو پیمانوں سے نہیں ناپا جاتا۔ ہمیں اپنے "حسنِ نادیدہ" کے پورے ذخیرے کو فوراً منڈی پہنچا دینا چاہیئے اور اُس کے ساتھ ساتھ ان نرم گرم کیاریوں میں اُن سے بھی زیادہ تعداد میں "حسنِ نادیدہ" کی تخم ریزی بھی شروع کر دینی چاہیئے اس صورت میں ہماری سبزیوں کی اقسام میں اور زیادہ اضافہ ہوگا۔ اگر ہم اس پر عمل پیرا ہو سکے تو ہمیں نئی بنیادوں پر نیا توازن حاصل ہو سکے گا۔ اس موسم سرما میں اب ہم اتنے زیادہ شلجم نہیں بوئیں گے جتنے کہ ہم نے اب تک بوئے ہیں اور جن شلجموں کو اب تک فروخت کیا جا رہا ہے (گھبراؤ مت ساتھیو!) ہم اس موسم بہار کی خوشی میں پیکنگ کے شہریوں کو کثیر تعداد میں انواع و اقسام کی سبزیوں کے تحفے دیں گے۔"

(سچ پوچھئے تو) چی کی واعظانہ تقریر نے ان محنت کشوں کے اجتماع میں ایک تحریک کو جنم دیا تھا چنانچہ جیسے ہی چی کی تقریر اختتام پر پہنچی وہ اولوالعزم نوجوان اپنی آستینیں چڑھا کر نئی مہم کے لئے آمادۂ پیکار ہو گئے بزرگ کاشتکاروں نے ان نوجوانوں کے عوامی جذبے کو بے حد سراہا۔ لسٹو فانگ اپنے مضبوط شانوں کو فضا میں لہرا کر زور سے دھاڑا۔ "ساتھیو اگر اسے اب سب کا فیصلہ سمجھا جائے تو آج ہی رات گئے ہم "حسنِ نادیدہ" کو گاڑیوں میں لاد کر شہر پہنچانے کی ہمت کرتے ہیں۔"

اودی مائل زعفرانی شام نے اپنی نقاب اٹھا کر کھیتوں کو روپوش کر دیا تھا ملحقہ گاؤں کے باشندے چھوٹے بڑے سب ہی "حسنِ نادیدہ" سے بھری ہوئی گاڑیوں کے کارواں کو جلوس کی شکل میں سڑک پر سے گزرتے ہوئے دیکھنے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ رات گئے تک قومی شاہراہ چین پر یہ ننھا منا کارواں رواں دواں تھا۔ سڑک نہایت کشادہ اور حد نظر تک سیدھی دکھائی دے رہی تھی۔ دائیں بائیں کے کھیت فاصلے فاصلے تک پھیلے ہوئے تھے جنہیں شام کے گہرے سائے اپنا اثر جما کر تاریکی میں ڈبوتے جا رہے تھے سبزی سے لدی ہوئی گاڑیاں رات کی تاریک راہوں کو کاٹتی چھانٹتی گذرتی چلی جا رہی تھیں۔ ان کے عقب میں روشنیوں شہر کی قندیلیں ستاروں کے جھرمٹ معلوم ہو رہی تھیں جو ایک خواب اور منظر پیش کر رہی تھیں۔

ناآسودہ تمناؤں کا سفر

فضل قدیر

واللہ وہ ایک عجیب و غریب خاندان تھا۔ اس کا ہر فرد ایک دوسرے سے نبرد آزما تھا۔ وہ ایک دوسرے سے شرمندہ تھے وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے ان کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ تھی کہ ان کی جڑیں کسی بھی سماجی گروپ میں پیوست نہیں تھیں ان سب میں بعد المشرقین تھا وہ سب مشیت کے ہاتھوں مجبور تھے جس نے انہیں اس گھر میں ان کی مرضی دریافت کئے بغیر دھکیل دیا تھا۔

بیگم آصفہ اپنے شوہر سے نالاں تھی۔ وہ نہایت گھٹیا، خسیس اور لڑاکو تھا۔ بیگم آصفہ کا شوہر نثار حسین جو مقامی میونسپلٹی میں اکاؤنٹنٹ تھا اپنی بیوی سے متنفر تھا اس کا کہنا تھا کہ وہ بے حد اترئی، چھچھوری اور نیچ ہے۔ بڑے آدمیوں کی نقالی کرتی ہے۔ جب کبھی وہ اپنی بچیوں کو کانونٹ میں داخل کرنے کے منصوبے پر بات چیت شروع کرتی تو حقیقت میں شوہر منہ چڑا کر اپنی مخصوص ہنسی ہنستے ہوئے کہتا۔ "گھر میں نہیں دانے اماں چلیں بھنانے" اور وہ سُلگ کر اول فول بکنے لگتی جس میں اپنے شوہر کی کنجوسی، ذلالت اور گھٹیا پن کے طعنوں کے علاوہ اس کی جسمانی حیثیت پر کھلی ہوئی چوٹیں ہوتیں۔

شوہر اونٹوں کی طرح بلبلاتا مٹھیاں بھینچ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ ایسے موقعوں پر دونوں بیٹیاں شوکت آرا اور راشدہ بلک بلک کر رونے لگتیں۔ اور اکلوتا توتلا لونڈا معراج چیخ کر باپ کے پیروں سے لپٹ جاتا۔

نثار حسین کو ایک دم بریک لگ جاتا اور ان کا تنا ہوا ہاتھ نیچے گر پڑتا۔ چند ساعتوں کے بعد پھر کسی شدید جذبے سے بے قابو ہو کر وہ دھڑا دھڑ اپنا منہ پیٹتا باہر نکل جاتا۔

اس کے باہر نکلنے کے معنی کئی دن تک گھر سے غیر حاضری کے ہوتے۔ ایسے موقعوں پر وہ ہیرا من کے پُردے سے نکل کر ریل بازار میں اپنے ایک بچپن کے دوست شیر محمد حجام کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ شیر محمد جو سماجی لحاظ سے اس سے بہت نیچے تھا اس کی بڑی آؤ بھگت کرتا۔ اس کی آمد کو عزت افزائی سمجھ کر وہ اس کے آگے بچھ بچھ جاتا۔ گرم راتوں میں اسے دیر تک پنکھا جھلتا رہتا۔ اس کی داستان غم سنتا بڑے مودب انداز میں ایک آدھ جگہ اُسے ٹوک بھی دیتا۔ "اب دیکھئے نا نثار میاں شروع ہی سے آپ کو شوہر بننا نہیں آیا۔ آپ اگر پہلے ہی دن تیور دکھا دیتے تو آج یہ دیکھنا نہ پڑتا۔"

نثار حسین ایک دم پھنکارتا، "اوہ ہو۔ تیور تیور کیا معنی کیا اب میں کنجڑے قصائیوں، نائی، تیلیوں کی طرح ڈنڈا لے کر کھڑا ہو جاتا؟"......

ایسے موقعوں پر شیر محمد حجام کچھ کہتا ہر جھکا کر وہ آہستہ سے کہتا۔ "نثار میاں کنجڑے قصائی اور نائی بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ سارا نخرہ پیسے کا ہوتا ہے۔"

نثار حسین ایک دم گڑبڑا سا جاتا۔ "ارمان شیر محمد تم واقعی غلط سمجھے میری مراد نائیوں سے نہیں کنجڑے قصائیوں سے تھی اوہ اوہ معاف کرنا تمہیں رنج پہنچا۔"

شیر محمد بڑے طنزیہ انداز میں اُسے دیکھ کر مسکراتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ نثار میاں تم جو بڑے شریف ہو، نثار میاں تم جو بڑے خاندانی ہو۔ ذرا اپنی شرافت میں جھانکو تو تمہاری جورو نے آج تمہیں ہم جیسوں کے ہاں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور میں جو ایک حجام ہوں۔ عرف عام میں کمین میری جورو نے تو آج تک مجھ سے سر ڈھکے بغیر بات نہیں کی۔ لیکن شیر محمد کے منہ سے یہ تمام باتیں نکلتی نہیں تھیں وہ ایک خاموش سی مسکراہٹ سے سر جھکا لیتا۔

اس خاندان کی زندگی اسی طرح بسر ہوتی رہی۔ پھر کچھ دن بعد دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ ہر طرف ایک افراتفری کا عالم تھا۔ دھڑا دھڑ فوجی بھرتیاں ہو رہی تھیں اور گلی محلوں کے ہوٹلوں پر جرمن کے تازہ حملے کی سنسنی خیز خبریں بات چیت کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔

گرمیوں کے دن تھے نثار حسین اور بال بچے مختصر آنگن میں لیٹے ہوئے تھے۔ چاند ایک جلے دل عاشق کی طرح آہیں بھرتا معلوم ہو رہا تھا۔ بچے غافل سو رہے تھے مگر نثار حسین اور ان کی بیوی کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ نثار حسین نے پنکھا جھلتے ہوئے کہا۔ "اجی میں نے کہا سنتی ہو۔"

آصفہ نے کروٹ بدلی۔ "ہوں۔ کیا بات ہے۔"

"دفتر میں سرکلر آیا ہے کہ جو اہل کار فوجی خدمت کے لائق ہیں اور رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات۔ فوجی خدمت کے لئے پیش کریں گے ان کو ترقی دی جائے گی .... ہو سکتا ہے اپنے دن بھی پھر جائیں۔" نثار حسین کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ آصفہ اچک کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"اے کیا واقعی۔ بلا وجہ ... کے لئے جلدی سے اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ فارم بھر دو۔ سچ ہے خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ خدا نے میری بھی سن لی اب ایک دن کیپٹن کی وردی تمہارے بدن پر ہوگی۔ مفت کے دو دو اردلی ہوں گے۔ ہمارے بچے بھی کانونٹ میں پڑھ سکیں گے۔ میں تو کہتی ہوں نسیمہ آپا کے منہ پر اللہ میاں نے طمانچہ مارا ہے بڑا غرور ہے انہیں اپنے میاں کی کپتانی پر ..... اب اللہ نے ہماری بھی سن لی ہے۔ اب دلدر دور ہوا چاہتے ہیں خدا کے لئے اب اپنا فلسفہ بگھارنے نہ بیٹھ جانا یہ از غیب سے سامان ہوا ہے تمہارے لئے ..... بھئی ایک بات میں بتائے دیتی ہوں۔ مجھ سے یہ کمبخت کانپور کی گرمیاں اب نہیں گزاری جائیں چاہے تم کچھ کہو میں تو مسوری یا نینی تال میں کوئی ہٹ کوئی جھونپڑی لے کر اپنے بچوں کو وہاں ڈال کر یہ کمبخت گرمیاں تیر کر لیا کروں گی۔" نثار حسین کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "ارار بھئی یہ یہ کیا گورکھ دھندہ بننے بیٹھ گئیں۔ اتنی اونچی اڑان ٹھیک نہیں میں بیچارا ایک اکاؤنٹنٹ ہوں مجھے کون کنگز کمیشن دے دیں گے یہ لال منہ کے بندر بہت ملا تو جونیئر کمیشنڈ آفیسر کا رینک مل جائے گا۔ یعنی صوبیدار۔"

آصفہ نے زانو پر دوہتڑ مارا۔ "غضب خدا کا عجب نیلجا مردوا ہے۔" منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے اس نے نقل کی۔ "میں موری کا ایک کیڑا ہوں موری ہی میں پڑا رہوں گا۔ مجھے موری ہی میں پڑا رہنے دو۔"

"آصفہ سوچو تو ذرا بات تو سنو تم تو عجب جذباتی عورت ہو۔ بھلا حقائق سے کیسے کر آنکھیں چرائی جا سکتی ہیں۔ یہ تمہارے حسین خوابوں کے محل اگر آڑ آڑا کر دھڑام سے گر پڑے تو ......" نثار حسین نے مضطرب انداز میں بیوی کو قائل کرنا چاہا۔ مگر جس قدر وہ اونچ نیچ سمجھاتے گئے۔ آصفہ کا پارۂ غضب اتنا ہی اوپر چڑھتا گیا۔

"صاف بات یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ کم ہمت ہو جنگ سے ڈرتے ہو۔ اپنی تقدیر، ہمت اور کوشش سے بدلنے کا حوصلہ نہیں اس لنترانی کا یہی مطلب ہے۔ تمہیں کیا معلوم لوگ کن کن جتنوں سے

بڑھ جاتے ہیں۔

نسیمہ آپا کے میاں کیپٹن الطاف نے ... یا نہیں کیا۔ ارے خدا بخشے منجھلے چچا بتلاتے تھے کہ خچروں کی لید تک صاف کی ہے۔ انہوں نے بھرتی ہو کر نائک بنائے گئے تھے۔ پھر اللہ نے دن پھیرے ایک انگریز کرنل کا دل ایسا مٹھی میں کیا کہ اس نے انہیں جو ترقی پر ترقی دی ہے کہ اللہ اکبر ..... اور آج بیگم صاحبہ بڑے ٹھسے سے کہتی ہیں میرے اتو کو گرمی کی تاب نہیں میری فیما ہنٹلی پامر کے علاوہ کوئی بسکٹ منہ پر نہیں رکھ سکتی۔ .... اللہ کی شان ہے صاحب۔

نثار حسین اتنا بولے کہ ان کا گلا خراشیدہ ہو گیا۔ آخر تھک کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنا شروع کیا۔ الٰہی میری شامت اعمال میں کوئی اور سزا تجویز کر دی ہوتی یہ حرص کی ماری جورو مجھ پر کیوں نازل کر دی اور اگر کرنا ہی تھا تو اس کے ایک چچا کی بیٹی کی شادی برطانوی فوج کے ایک کپتان سے کیوں کروا دی ایک تھکا ہوا گھوڑا ایک برق رو موٹر کار کی سنگت کس طرح کر سکتا ہے ؟ ؟ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیوں کر اس تنی ہوئی تلوار سے بچیں۔ یہ تلوار جو ان کی ایک نادان گفتگو نے آج کی شب ان کے سر پر تان دی تھی۔ پھر ان کا خیال نسیمہ کے شوہر کیپٹن الطاف کی ذات میں الجھ گیا۔ انہیں خیال آیا شادی کے کچھ ہی عرصے بعد ان کی بیوی نے کسی رَو میں انہیں بتایا تھا کہ کیپٹن الطاف ان پر لٹو تھے ...... اس وقت تو انہوں نے یہ ہی سوچا تھا کہ عورتیں اپنی مارکیٹ ویلیو بڑھانے کے لئے اکثر ایک خیالی عاشق تخلیق کر لیا کرتی ہیں مگر آج اس خیال کے منتشر ٹکڑے ایک میکانکی عمل سے از خود جڑتے جا رہے تھے۔ اور ڈوبے وقت کے لمحے نامعلوم کس کنوئیں سے دوبارہ طلوع ہو رہے تھے۔ آج انہیں سیما کی پہلی سالگرہ کا وہ موقعہ یاد آ رہا تھا جب کیپٹن الطاف کو دیکھ کر ان کی بیوی کی کنپٹیاں تمتما اٹھی تھیں اور شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے کسی نے کہا تھا : "تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں" مگر وہ خاموش پڑے کھولتے در صبح ہوتے وہ مارکس سے جا الجھے جس نے سرمایہ داری کو تمام برائیوں کی جڑ قرار دیا تھا۔ آج نثار حسین بھی اس کے ہم خیال تھے اور سوچ رہے تھے یہ سب کچھ اس خاندان میں نسیمہ کے عام سطح سے بلند ہو جانے کی بدولت ہوا نہ وہ اتنی اونچی ہوتی اور نہ ان کی بیوی پر یہ آئے دن کے دورے پڑتے۔

سورج نکلا وہ اٹھے غسل کیا کپڑے بدلے اور سیدھا ناشتہ حلق کے اندر ٹھونسا مگر اب بیوی نے پھر ٹانگ لی۔ "اگر آج تم نے فارم نہ بھرا تو گھر میں نہیں گھسنے دوں گی" بڑی دیر جھائیں جھائیں ہوئی آخر جلبلا کر انہوں نے آخری فیصلہ کر ہی لیا اور دفتر کو چل دیئے۔

دفتر جاتے ہی انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ فارم پُر کر دیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔

فارم پُر کرنے کے ٹھیک پندرہ دن بعد ان کی ڈاکٹری ہوئی اور انہیں موٹر ٹریننگ کے لئے بھیج دیا گیا۔

کانپور اسٹیشن پر ان کی رخصت کا منظر قابلِ دید تھا۔ ان کے گلے میں پھولوں کے ہار پڑے تھے، چھوٹے چھوٹے بچے ہراساں کھڑے تھے مگر بچوں کی ماں بار بار لمبی لمبی تقریریں کر رہی تھی۔ "بچو اب ہم لوگ بہت جلد بنگلے میں رہا کریں گے۔ گرمیوں میں نینی تال اور جاڑوں میں کانپور ہم اب مکھن ڈبل روٹی کا ناشتہ کیا کریں گے۔ تمہارے ابو بہت جلد فوج کے افسر بن جائیں گے پھر تم لوگ گھوڑوں پر سواری کرنا، اردلیوں کی گودوں میں کھیلنا"

اور نثار حسین تصویرِ یاس بنے ڈبے کے دروازے سے لگے اپنی ادھ کچری فصل کو دیکھ رہے تھے۔ اس لمحے ان کا سر گھوم رہا تھا۔ کبھی انہیں خود پر ترس آ رہا تھا اور کبھی اس نیک بخت کی ناآسودہ تمناؤں اور ارمانوں پر .... وقفے وقفے سے وہ یہ سوچنے لگتے "کچھ اتنی بڑی خطا تو نہیں کی اس عورت نے .... آخر جلتی دھوپ سے چھاؤں کی طرف ہر کوئی بھاگتا ہے۔ پھر خواب تو ہر ایک ہی دیکھتا ہے۔ خواب اگر نہ رہیں تو روئے زمین

پر زندگی ختم ہو جائے۔ ساری امیدیں ختم ہو جائیں۔ ساری کشمکش
۔ ساری لہر بہر ختم ہو جائے۔"

سرمی سے تمتمائے لال منہ کے انگریز فوجی افسر کھڑکھڑاتی
وردیوں میں اپنے جوتے چرمراتے پلیٹ فارم پر بڑے پُر خشونت
انداز سے اوپر نیچے دوڑ رہے تھے۔ خوانچے والے دھیمے سُروں میں
آوازیں لگاتے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ ایک ملائی کی برف کی
ہتھ گاڑی کو دیکھ کر نثار حسین کے اکلوتے لڑکے نے ٹھنکنا شروع
کر دیا۔

"ابو میں ڈنائی ٹی ڈنف مٹاؤں ڈا۔" (ابو میں ملائی کی
برف کھاؤں گا)

ماں نے بچے کو بری طرح ڈانٹ دیا۔ "خبردار چپ کر ملائی
کی برف سے گلا خراب ہو جائے گا۔" مگر نثار حسین کے جذبات
ایک دم امڈ پڑے۔ انہوں نے جیب سے دس روپیہ کا نوٹ نکالا
اور برف والے سے کہا سب بچوں کو برف کھلا دو جس قدر
یہ کھائیں۔

بیوی نے انہیں گھورا ..... تو وہ ہونٹ بھڑ بھڑا کر رندھے
گلے سے بڑبڑائے۔" نہ معلوم اب ان کی فرمائشیں پوری کرنے کا موقعہ
بھی ملے گا یا نہیں۔" انہیں روتا دیکھ کر بچے آئس کریم کھانا بھول
گئے اور سب باجماعت رونے لگے۔

پورے کنبے کو روتا دیکھ کر ایک انگریز فوجی افسران کی طرف
بڑھا۔ اس نے بڑے پرتپاک انداز میں صورت حال دریافت کی۔
بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا نثار حسین کو قائل کیا۔" وَل آپ
ایک دم کمزور کمزور آدمی۔ ہز میجیسٹیز کی لینڈ فورسیس میں بھرتی
ہونا آنر ہے۔ آنر۔ ہر کوئی جنگ میں مرتا نہیں آپ لوٹے گا
اپنے بچہ لوگ میں۔" نثار حسین آنسو پی کر خاموش ہو گئے۔

کئی گھنٹے کھڑے رہنے کے بعد گاڑی چلی تو پھر سارے بچے
کورس میں رونے لگے۔ اور نثار حسین دروازے میں کھڑے ہاتھ
ہلاتے آگے نکل گئے۔

مئو میں چھ ماہ کی ٹریننگ کا عرصہ جیسے تیسے گذرا اور
پھر وہ صوبیدار میجر بنا کر فوراً برما بھیج دیئے گئے۔

قریبی رشتہ داروں نے سینہ تھام کر کہا" ہائے کیا خبطی
پن کیا ہے اس شخص نے چین سے اپنے بچوں میں بیٹھا ٹیں ٹیں کرتا
تھا کہ خود ہی جاکر سولی کا پھندا گلے میں پہن لیا۔"

نثار حسین کی بوڑھی ماں جو بہو کی تیز مزاجی کے باعث اپنے
پرانے مکان میں رہتی تھیں، رو کر بولیں" اللہ اسے اپنے بچوں کے
ساتھ سلامتی کے دوبارہ لا ملائیو۔ اللہ تجھ میں بڑی قدرت
ہے۔"

نثار حسین کے لام پر جانے کے ۳ ماہ کے اندر ہی آصفہ
کی زندگی میں ایک عجب تغیر پیدا ہو گیا۔ اب میاں کی چوبیس
گھنٹے کی نگرانی اور روا نتا کل کل ختم ہو جانے کے بعد وہ ایک آزاد
چڑیا کی طرح چہچہانے لگی تھی۔ ہیرامن کے پُروے میں اب اس کا گھر
ایک چھوٹا موٹا کلب سا بن گیا تھا جہاں صبح شام بڑی پُر لطف
محفلیں جمتیں...... رشتے ناتے کے نوجوان کنوارے لڑکے
اس کے اردگرد منڈلاتے۔" آصفہ آپا، آصفہ آپا" کہتے ان کے
منہ خشک ہوتے۔ اس گھر میں دو لڑکیاں جوانی کے زینے چڑھ رہی
تھیں کچھ مذاق تو نہیں تھا۔ آصفہ کے آنکھ کے اشارے پر یہ لڑکے
چھوٹے چھوٹے کاموں کو دوڑ پڑتے۔ خالو سلطان کا لڑکا کمال خیر سے
شاعر بھی تھا۔ روزانہ شام کو وہ سامعین کو اپنا تازہ کلام نہایت
ترنم سے سناتا۔ ایسے موقعوں پر نیمبو کے شربت کا دور مزہ دے
جاتا۔ راشن کے اُس زمانے میں جب چینی آنکھ میں لگانے کو نہیں
میسر آتی تھی آصفہ کے ہاں چینی کا کبھی توڑا نہیں پڑا۔ جب چینی
ختم ہونے لگتی تو آصفہ کسی والنیٹر قسم کے بھائی بھتیجے کی طرف
"آج شربت کا دور نہیں چلے گا چینی ختم ہو گئی ہے۔" یہ سنتے ہی
بھیا مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے۔" اماں آصفہ آپا حد کرتی ہر

اپنا عزیز ہی ہو ارسے صبح کہہ دیتیں تو چینی کے پہاڑ لگا دیتا۔ اچھا ٹھہرو دو چار پیسے ابھی پیدا کئے دیتا ہوں"۔ بچھو بھائی تھیلا لے کر نکل جاتے اور واقعی آدھ گھنٹے میں چار سیر چینی کنٹرول ریٹ پر لا کر ڈھیر کر دیتے۔ بچھو بھائی اور چینی لازم و ملزوم تھے۔ پورے ایک سال بعد یہ عقدہ پرچونئے کی بیوی مٹھن مائی نے کھولا اس نے بتایا کہ بچھو میاں بلیک میں چار روپیہ سیر چینی اس کی دکان سے دوسرے تیسرے دن خریدتے رہتے ہیں۔ واقعی وہ بلا کے بنڈل باز تھے چار روپئے سیر چینی لے کر آصفہ آپا کو سوا روپئے سیر دیتے تھے۔ اور لطف یہ ہے کہ ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ راشن کنٹرولر ان کا بڑا دوست ہے انہیں کنٹرول ریٹ سے بھی سستی چینی دلواتا ہے ان کے اس اثر و رسوخ سے آصفہ بہت متاثر ہوتی تھی وہ بار بار اپنی بڑی بیٹی شوکت آرا سے کہتی "ایک تمہارے ابو ہیں گوبر کا چوتھ ان کے لئے کوئی چیز ممکن ہی نہیں تھی۔ اور ایک ہمارے بچھو بھائی ہیں کہ گولر کا پھول بھی کہو تو لے آئیں"۔

یہ محفلیں بہت زمانے تک چلتی رہیں۔ پھر کچھ کم ظرف لوگوں نے اناپ شناپ اڑانی شروع کر دی۔ پڑوس میں ڈرافٹس مین صاحب کی بیگم نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا۔ بیٹوں کی کمائی کھا رہی ہے' خدا نے بلی کے بھاگوں چھینکا توڑا ہے۔ نثار حسین کو لام پر لدوا کر اب کھیل ہو رہے ہیں کھیل۔!!

اور جب نبو صاحب کے آوارہ پوت کلن نے شوکت کے نام رقعہ بھیجا۔ اور چھوٹے آغا نے اس کی پٹائی کی تو بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور آصفہ کے بڑے بھائی تجمل حسین جو بیل بازار میں مولویانہ انداز سے زندگی گذار رہے تھے ضبط نہ کر سکے نثار حسین کے لام پر جاتے ہی آصفہ نے انہیں بڑی ذلیل نظروں سے دیکھنا ع کر دیا تھا وہ موقعہ بے موقعہ انہیں جلی کٹی سنا دیا کرتی تھی۔

وہ غریب اور انتہائی غیور انسان تھے اس لئے انہوں نے کے گھر میں قدم رکھنا چھوڑ دیا۔ لیکن اب چونکہ پانی سر اوپر ہونے لگا تھا تو وہ ہانپتے ہنہناتے بہن کے گھر پہنچے۔

"ارے بھئی سنتی ہو آصفہ .... میں یہ کہنے آیا ہوں کہ خدارا اپنے مرے ماں باپ پر رحم کرو۔ جو کچھ اس گھر میں ہو رہا ہے وہ ان کی شرافت کو خاک میں ملا چکا۔ مگر اب للہ اپنی جوان بچیوں کو مت ڈبو"۔

آصفہ نے لال پیلے ہو کر بڑے بھائی کی وہ درگت بنائی کہ وہ روتے ہوئے الٹے پاؤں گھر سے نکل گئے۔

اور پھر اس خاندان میں بڑے بڑے واقعات رونما ہوئے شوکت آرا کی کئی منگنیاں ٹوٹیں۔ راشدہ کے کئی رومان ابھرے اور آخر میں آصفہ کی پیٹ کی رسولی کا جب اپریشن ہوا تو ایک زلزلہ سا آگیا پورے محلے میں۔ اور ڈرافٹسمین صاحب کی بیوی کو جب کوئی نہ ملا تو انہوں نے ایک دن آصفہ کے توتلے لونڈے ہی کے چٹکی لے لی۔ "ارے منو تو وہ تمہاری ماں تیرے بہا کے بیٹھ ہی گئیں نا"........ اور جب وہ کچھ نہ سمجھا تو انہوں نے مہترانی سے پوری وضاحت کر دی۔

اسی زمانے میں جنگ ختم ہو گئی اور ایک دن نثار حسین غیبی گولے کی طرح آ ٹپکے۔ محلے والوں نے بڑے ظرف کا ثبوت دیا کسی نے منہ تک نہ کھولا۔ مگر ڈرافٹس مین صاحب کی بیوی جب زیادہ بلبلائیں تو نثار حسین نے اس میں مفر سمجھا کر محلے سے نقل مکانی کر کے کہیں اور اٹھ جائیں۔

ان کے محلے سے چلے جانے کے بعد میرے ذہن سے یہ خاندان معدوم ہو گیا۔ دن پر دن گذرے سال پر سال پھر کٹی پتنگ کی طرح ڈولتا میں جب ۱۹۵۰ء میں کراچی پہنچا تو ایک دن مکان کی تلاش مجھے لالو کھیت لے گئی۔ خاک چھانتا جب ایک ڈبیا سگریٹ خریدنے ایک پرچون کی دکان پر پہنچا تو یہاں میں نے نثار حسین کو ترازو تھامے چینی تولتے دیکھا "نثار بھائی" میں چیخا ...... اور نثار حسین ترازو چھوڑ کر سینے سے لپٹ گئے۔ بڑی

دیر تک بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے ...... مجھے گھسیٹتے اپنے گھر لے گئے یہ گھر کیا تھا مرغیوں کا ڈربہ تھا ہر طرف عسرت کا راج تھا۔ چند جھلنگا سی چارپائیاں۔ ایک ٹوٹی ہوئی میز جس کے ایک پایہ ٹے کے بجائے اینٹوں کا ستارا تھا اس گھر کی کل کائنات تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ لو چلو خیر سے نینی تال اور مسوری کے خواب تو اس میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو ہی گئے۔ میں ایک اٹکی سی کرسی پر ٹکا ہی تھا کہ شوکت لپ جھپ کرتی اندر داخل ہوئی ..... وہ بھرپور جواں ہو کر خاصی وجیہہ نظر آ رہی تھی۔

انکل سلام علیکم ..... اس نے ٹھیٹھ موڈرن لڑکیوں کے انداز میں بانگ دی ....

"ارے اتنی بڑی ہو گئیں تم"۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تو وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ نثار حسین نے لقمہ دیتے ہوئے کہا "گو لیبار میں گرلز اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ابھی اسکول سے آ رہی ہے"۔ ... میں نے کہا " ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ"

شوکت نے بڑے جچے جمائے انداز میں پوچھا۔ "انکل آپ کچھ ٹھنڈا لیں گے یا گرم؟"

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ اصطلاح کس لغت سے آئی ہے کہ وہ لپ جھپ کرتی اندر گئی اور کچھ دیر بعد ایک ٹرالی دھکیلتی ہوئی آگئی۔ ٹرالی پر چائے کا سامان قرینے سے رکھا تھا۔ ٹرالی کا خاصا بڑا حصہ چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا ٹوٹی ماری بچہ گاڑی ہے جس پر ایک تختہ ٹھونک لیا گیا ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جا سکتا۔ ابھی نا آسودہ تمناؤں کا سفر جاری ہے ادھر ادھر کی باتیں کر کے کھسک آیا ...... پھر مدت بعد پشاور، کوہاٹ، کوئٹہ، چیچا وطنی خدا جانے کہاں کہاں کی خاک اڑاتا پنڈی میں نمودار ہوا۔ تو ایک دن ایک گنجے سے کرنل کے ساتھ۔ شوکت کو بڑے ٹھسے کی ساڑھی پہنے شاپنگ کرتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

معلوم ہوا یہ آپ کے میاں ہیں۔ لالہ زار کالونی میں کہیں رہتے ہیں پہلی بیوی مر چکی ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا چلو اچھا ہوا ٹھکانے سے کہیں بیٹھ تو گئی۔

پانچ چھ سال ہی گذرے ہوں گے کہ ایک صبح اخبار نے یہ خبر سنائی کہ شوکت بیوہ ہو گئی ہے۔ دوڑا ہوا اس کے گھر پہنچا کرنل صاحب کو گاڑا تو پا دعائے مغفرت کی اور تسلی کے دو بول کہہ کر گھر آگیا۔

پھر بہت سی باتیں سننے میں آتی رہیں۔ کسی نے کہا پہلی بیوی کی اولاد نے گھر سے نکال دیا ہے۔ شادیاں کروانے کا کاروبار کر لیا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے آشنائی کر لی ہے۔ کوئی کہتا حاکمِ شہر کو پسند آگئی ہے غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

ایک دن سیٹلائٹ ٹاؤن کے کمرشل سنٹر میں پان خریدتے ہوئے شوکت سے ملاقات ہو گئی۔ تو وہ میری جان میں چمٹ گئی۔ ارے واہ انکل آپ تو بلا کے سنگ دل ہیں آپ نے تو پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ میں نے کہا "بی بی مرے زندوں میں اب کچھ زیادہ فرق نہیں رہا ہے ہیں مردوں سے زیادہ زندوں کا پرسا دینا چاہیئے کہ بے حیا ہیں جیئے جاتے ہیں"۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے بتایا مرحوم کرنل کی پہلی بیوی کی اولاد نے ہر چیز پر قبضہ کر لیا ہے۔ سیٹلائٹ ٹاؤن میں ایک مختصر سا بنگلہ اس نے قبضا لیا ہے اور یہاں وہ اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ رہتی ہے ...... اس کے گھر گیا کافی پی بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور چلا آیا۔ واقعی گھر بڑے سلیقے سے چلا رہی تھی صوفے، قالین، ریفریجریٹر سب کچھ تھا۔

پھر کچھ کچھ وقفوں سے وہ شہر کے مختلف حصوں میں ٹکراتی رہی۔ ایک دن انٹر کانٹیننٹل میں مل گئی اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا طرح دار شخص تھا۔ وہ نہایت نفیس سوٹ میں ملبوس تھا اس کی داہنے ہاتھ کی انگلی پر سونے کی ایک موٹی سی انگوٹھی تھی۔ اس کی

انگلیاں پھولی پھولی اس انداز کی تھیں کہ انہیں دیکھتے ہی گمان ہوتا تھا کہ یہ شخص صبح سے شام تک نوٹ گننے کے علاوہ کچھ نہیں کرتا تعارف ہوا تو پتہ چلا آپ یعقوب چاندنا صاحب ہیں کراچی میں ایک پلاسٹک کا اور پنڈی میں قالین کا کارخانہ ہے اور کریدا تو پتہ چلا کبھی دِلّی کے چاندنی چوک میں گوٹہ کناری کی دکان تھی۔ شوکت ان سے بڑی بے تکلفی سے یعقوب بھائی، یعقوب بھائی کہہ کر مخاطب ہو رہی تھی۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ یعقوب صاحب جب بھی کراچی سے آتے ہیں شوکت ہی کے ہاں مقیم ہوتے ہیں مجھے کیا پڑی تھی کہ تجسس کرتا۔ یہ نئی دنیا تھی نئی زندگی یہاں پیاز کے سارے چھلکے اتر کر شرافت اور روایات کے لبادے چاک ہو کر جو برآمد ہو رہا تھا .... ، سامنے تھا۔

اور پھر میرا رشتہ اس خاندان سے بہت ہی مبہم سا تھا۔ میں حرفِ اعتراض منہ پہ لانے کا مجاز کیوں کر ہو سکتا تھا۔ اِدھر اُدھر کی خوش گپیاں کر کے ان لوگوں کو ہنستا مسکراتا چھوڑ اپنی راہ چل دیا۔

کچھ عرصے بعد پنڈی کی سماجی فضا میں شوکت کے پھریرے اڑنے لگے۔ نیشنل سنٹر کی تقریبات میں ٹی وی کی موسیقی کی محفلوں میں وہ معزز سامعین کی سب سے اگلی صف میں نظر آتی۔

پھر اچانک پوری پنڈی ہل گئی۔ شوکت آرا ایک تیز رو موٹر کی زد میں آکر شدید زخمی ہو گئی۔ اخبار میں خبر پڑھ کر سی۔ ایم۔ ایچ دوڑا گیا۔ شوکت بے ہوش تھی .... بے ہوش رہی۔ اور آخر تیسرے دن اس نے اس جہانِ فانی سے اپنا منہ ہمیشہ کے لئے چھپا لیا اور جب میں سیٹلائیٹ ٹاؤن میں اس کے بنگلے پر تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے پہنچا، تو میں نے عجب منظر دیکھا۔ نثار حسین سر یوڑھائے کرسی پر اکڑوں بیٹھے تھے وہ اب بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ گھر میں بڑے آدمیوں کا مجمع تھا .... بھنبھناتی بسورتی آواز میں بار بار مجھ سے یہی کہتے رہے۔ "میری بیٹی کا بہت بڑے بڑے آدمیوں سے ملنا جلنا تھا۔ ایسے ویسوں کو تو وہ گھاس نہیں ڈالتی تھی" کسی کرنل اور جرنل کو آتا دیکھ کر وہ کمر جھکائے اٹھتے اور ہونٹھ بھینچ کر "اوں ہوں ہوں" کر کے سُبکنا شروع کر دیتے۔ لوگ آرہے تھے جا رہے تھے۔ سیٹھ یعقوب چاندنا نوٹوں کا ایک تھبہ لئے دھڑا دھڑ روپیہ بکھیر رہے تھے۔ "بھئی مجید یتیم خانے والوں کو بلاؤ پہنچا آؤ لو یہ پچاس روپئے۔ ارشد یہ لاش گاڑی والوں کو ایڈوانس دے دینا۔ لو چلو رکھو۔" اور جب قبر ڈھک دی گئی اور آخری فاتحہ ہوا تو مختلف ٹولیوں میں بٹ کر لوگ اِدھر اُدھر رینگ گئے۔ سیٹھ یعقوب چاندنا نے سگریٹ کا طویل کش لے کر ایک موٹے سے گنجے آدمی سے سرگوشی میں کہا۔ "شاباش ہے اس مکھی چوس باپ کو بیٹھا روں روں کرتا رہا یہ نہ ہوا کہ بیٹی پر کفن ڈال دیتا ..... ارے میجن کچھ نہ پوچھو دو دن میں پانچ ہزار صاف ہو گئے۔ خیر مرحومہ سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔"

میجن کی رگ ظرافت پھڑکی اس نے سیٹھ کے چٹکی لی اور کھسیائے "مراسم مراسم ارے خاص الخاص مراسم تھے یار .... ہے ہے ..... ہا ہا ہا۔"

نثار حسین لڑکھڑاتے ہوئے کہیں سے ممیائے "اوتھ ہوں۔ میجر صاحب بڑی پاپولر لڑکی تھی بڑی ساکھ تھی اس کی .... چھوٹے موٹے آدمی سے تو وہ بات نہیں کرتی تھی ... ارے سب بڑے لوگ اسے رو رہے ہیں۔"

سیٹھ یعقوب نے بڑبڑا کر کہا یار میں تو آج نائٹ کوچ سے کراچی دوڑ جاؤں گا پھلجڑی چھٹ گئی اپنی تو۔

.... اور جب سب چلے گئے تو میں اس کی قبر کو بڑی دیر تکتا رہا۔ اور آہستہ سے میرے منہ سے نکلا تو آج شوکت تمہاری ناآسودہ تمناؤں کا سفر ختم ہو ہی گیا.... شوکت میں شرمندہ ہوں میں خاموش تماشائی بنا تمہارا رقص بسمل دیکھتا رہا۔ مگر میں کرتا بھی تو کیا۔ شوکت میں تمہیں مظلوم سمجھتا ہوں تمہارا گناہ صرف اتنا ہی تھا کہ تم نے اکٹھے بہت سے خواب دیکھ ڈالے۔ مگر خواب تو ہر کوئی دیکھتا ہے ... شوکت ... اچھا شکر کرو اب تم کبھی خواب نہیں دیکھو گی ..... دو شریر آنسو میری آنکھوں سے پھسل کر قبر کی عرق گلاب سے نم مٹی میں جذب ہو گئے۔

لافانی سفر

احمد شمیم

" وہ موسم خزاں کی ایک مغموم، اُداس اور پھیکی پھیکی سی دوپہر تھی۔ ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ درختوں کے پیلے، سوکھے اور بے جان پتے ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ اِدھر اُدھر اڑتے پھر رہے تھے۔ لیکن کچھ پُرانے سخت جان پتے اپنے دلوں میں مزید زندگی کی خواہش لئے ہوئے کچھ شاخوں سے اب تک چمٹے ہوئے تھے۔ اُس ضعیف ناتواں مریض کی طرح جو ایک طویل عمر گزار لینے کے بعد بسترِ مرگ پر پڑا دم توڑ رہا ہو لیکن زندگی کی آخری سانس تک دنیا کے کچھ اور دُکھ جھیل لینا چاہتا ہو۔" اجنبی ایک لمحے کے لئے رُکا۔ ایک سرد آہ کھینچی اور پھر گویا ہُوا۔

" آہ ساری زندگی میں جو تمنائیں پوری نہ ہو سکیں
اُن کی تکمیل کی موہوم سی اُمید زندگی کی آخری سانس
تک باقی رہتی ہے۔"

ایسی ہی ایک اُداس دوپہر کو میں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور ایک انجانے اور طویل سفر پر تن تنہا چل پڑا۔ نہ کسی کو کچھ بتایا اور نہ کسی سے ملا، نہ ہی کوئی ساز و سامان اپنے ساتھ لیا۔ جس راستے سے دن میں بیسوں بار گزرا تھا، جب آخری بار گزرنے لگا تو زمین نے میرے پاؤں تھام لئے۔ اور بیتے ہوئے لمحوں کی یاد دلائی لیکن میں ایک ہلکی سی چھلانگ لگا کر گاؤں کی سڑک سے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر ہو لیا۔ جب ربیع کی فصل والے کھیتوں کے درمیان سے ہو کر گزرا تو زمین اور ہوا میں ملی جلی سوندھی سوندھی خوشبوؤں نے سرگوشیاں کیں۔ اے خاکِ وطن تم جہاں بھی جاؤ ہم سے کتنی ہی دُور کیوں نہ ہو جاؤ۔ ہماری یاد تمہارے دل سے محو نہ ہو سکے گی۔ ایک نہ ایک دن ہماری یاد تمہارے دل میں آئے گی۔ اور تم میرے لئے بے قرار ہو اٹھو گے۔

میں ایک لمحے کے لئے اُس جگہ پر رُک گیا۔ جہاں پر سے دیہاتی نالہ ہلکے سُروں میں گنگناتا ہوا ایک تیز بل کھاتے گاؤں کی سرحد سے دور ہوتا چلا جاتا تھا۔ اور وہاں پر صرف شہر جانے والی سڑک ہی رہ جاتی تھی وہیں پر سے اجنبیت کا ایک ہلکا سا احساس شروع ہو جاتا تھا۔

میں نے اس جگہ سے آخری بار اپنے گاؤں کو دیکھا۔ گاؤں سے پرے اپنی زمینوں کو دیکھا جو ہم سے اجنبی بن کے ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہی تھیں۔ اے وطن الوداع۔ اے سرزمین وطن الوداع اے بلند قامت پہاڑو الوداع۔ اے رات کی تاریکی میں نغمہ سنانے والے آبشارو الوداع۔"

ہاں تو اجنبی اجنبی تم نے کہاں کہاں کی خاک چھانی اور اب اس جگہ پر تمہارا گزر کیسے ہوا۔ نوجوان جو اب تک ریتیلے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اب شکستہ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ چکا تھا۔ اس کا اشتیاق آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسے اجنبی کی سرگزشت اپنے دامن میں عجیب و غریب واقعات کے خزانے سمیٹے ہوئے تھی۔

اجنبی نے ٹوٹے ہوئے دریچے سے باہر کی جانب نگاہ کی اور وقت کے اس طویل فاصلے کو اپنی یادداشت کے آئینے کی مدد سے قریب ترلانے کی کوشش کرنے لگا۔

"اس وقت میں نوعمر تھا۔ اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا اب کہاں جاؤں۔ ہر جانب ایک نیا ماحول تھا۔ ہر شخص اجنبی تھا۔ اور میں ان غیر مانوس انسانوں کی ٹولیوں میں گھوم رہا تھا۔

ایک دن میں نے کسی شہر میں ایک کونا اپنے مستقل قیام کے لئے ڈھونڈ ہی نکالا۔ اور نئے ماحول میں پرانی باتوں کو بھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

پہلے پہل تو ماں باپ یاد آئے۔ پھر رشتہ داروں کے چہروں نے شکایتیں کیں۔ ندی اور نالوں نے اپنے مدھرے نغموں سے رات کی تاریکی میں آوازیں دیں۔ آخر میں دوستوں کے روٹھے ہوئے چہرے ہی یاد رہ گئے۔ اور پھر ایک دن سارے نقوش دھندلے پڑ گئے۔ ساری شبیہیں تاریکی کے پردوں میں گم ہو گئیں صرف یادیں ہی باقی رہ گئیں۔ دھندلی یادیں۔"

اجنبی دم لینے کے لئے ذرا رکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بول نہیں رہا ہو بلکہ الفاظ اس کے دل کی گہرائیوں سے پھوٹ کر نکل رہے ہوں اور ذہن پر نقش ہوتے جا رہے ہوں۔

"ایک دن قصبے کے ایک متمول کسان نے مجھے اپنی بیل گاڑی چلانے پر مامور کر لیا۔ یعنی جب فصل کا زمانہ ہوتا تو مجھے اناج بیل گاڑی میں ڈال کے ریلوے اسٹیشن تک لے جانا ہوتا تھا۔ اسٹیشن کی دوری شاید بیس میل رہی ہوگی۔ ہفتہ میں ایسے دو تین پھیرے لگانے ہوتے تھے۔ اور جب غلے کی کھیپ ختم ہو جاتی تو پان کی بیٹھوں سے پان بذریعہ بس بھیجنے کا کاروبار شروع ہو جاتا تھا۔

خدا کی قدرت دیکھئے کہ جب سے مجھے اس کسان کی حویلی میں ملازمت ملی تھی۔ انہی دنوں سے کسان کی حویلی میں دھن برسنا شروع ہو گیا تھا۔ قصبے کی چوتھائی زمینیں اب اس کی ملکیت میں آ چکی تھیں۔ اور قصبے سے باہر کئی گودام اور مکانات تعمیر ہو چکے تھے۔

میں ان دنوں بے فکری سے کھانا کھاتا تھا اور ہر ہفتے کسان کا مال قصبے سے اسٹیشن کو لے جاتا تھا۔ میں کھاتا تھا ہوتا تھا اور کسان کی بیل گاڑی چلاتا تھا۔ بیل گاڑی کے سست رفتار پہیوں کی طرح میری زندگی بھی اپنے محور پر گردش کر رہی تھی۔ دھیرے دھیرے۔ رک رک کر، تھکے ہارے قدموں سے، ایک ہی راستے پر۔ راستہ جو قصبے سے ریلوے اسٹیشن کو جاتا تھا۔ اور پھر قصبے کو واپس لوٹ آتا تھا۔"

اجنبی معاً خاموش ہو گیا۔

واقعات کے بکھرے ہوئے تانوں باتوں کو ترتیب دے کر پھر اپنا سلسلۂ کلام اس طرح شروع کیا۔

"جب ہم قصبے سے سامان لے کے نکلتے تھے تو عموماً اکیلے ہی ہوتے تھے۔ لیکن واپسی میں ہم ٹولیوں کی صورت میں آتے تھے۔ کسان کا مال ریلوے کے عملے کی تحویل میں دے کے ہم نیم شب تک پسنجر ٹرین کا انتظار کرتے۔

یہ ایک دیہی ریلوے اسٹیشن تھا۔ اور یہاں پر اترنے والے اکا دکا ہی مسافر ہوتے تھے۔ جب ٹرین رکتی تو ریلوے کا کوئی ادھیڑ گارڈ بابو کی لالٹین لے کے ہر ڈبے کے قریب جاتا اور صدا لگاتا 'بھئی اسٹیشن آ گیا کوئی ہے جو یہاں پر اترے گا'۔

ٹرین کے بیشتر ڈبوں میں مدہم روشنی کے بلب ٹمٹماتے ہوتے تھے اور تھکے ہارے نیم خوابیدہ مسافروں کے آرام میں خلل انداز

ہونے سے گریز کرتے تھے۔

جب ریلوے کا آدمی گاڑی کے دو تین چکر لگا لیتا۔ تو لالٹین گارڈ بابو کے ہاتھ میں تھما کر۔ پلیٹ فارم کی کسی بنچ پر جا کے بیٹھ جاتا۔ گاڑی ایک ہلکی سی آواز میں سیٹی دیتی۔ اور آگے کے سفر کو روانہ ہو جاتی۔ اسٹیشن رات کی تاریک فضا میں اپنا وجود سمیٹ کے ایک بار پھر اونگھنے لگتا۔ اسٹیشن سے باہر ہماری گاڑیاں سواریوں کا انتظار کرتی ہوتی تھیں۔ اور اُن کے قریب ہی میں بیل جگالی کرتے ہوتے تھے۔

جب گاڑیاں ہر طرح سے لیس ہو جاتیں۔ جب بیلوں کے بچے کھچے چارے گاڑی میں ڈال دیئے جاتے۔ اور جب لالٹین کی بتیوں کو تیز کر دیا جاتا۔ تو سب سے آگے والا گاڑی بان بہ آواز بلند پکارتا۔ "اللہ نام۔ گاڑی ہانکو۔"

بیل کسمساتے۔ پہیئے چرچراتے اور ہمارا قافلہ اپنی منزل کی طرف چل پڑتا۔ ایک سرے پر قصبہ تھا۔ اور دوسرے سرے پہ اسٹیشن۔ اور بیچ میں بیس میل کا فاصلہ حائل تھا۔ بیل ہمارے بوجھ ڈھوتے تھے اور ہم ایک لاحاصل زندگی کا بوجھ ڈھو رہے تھے۔ کسان میرا آقا تھا اور میں اس کا ملازم۔ کسان کے پاس بیل تھے۔ اور میں بیلوں کو گاڑی میں جوتتا تھا۔ روز و شب کی محنت میری روزی مہیا کرتی تھی۔ اس سے آگے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

حسبِ معمول ایک دن ہم نیم شب کی تاریکی میں اپنے قصبے کو واپس ہو رہے تھے۔ اسٹیشن سے ملحق دیہات جہاں پر ختم ہوتا تھا وہاں پر قریباً پچاس گز کا ایک چوڑا نالہ تھا۔ جو برسات کے دنوں میں تو جل تھل ہوتا تھا۔ اور سواریاں ناؤ کے ذریعے اس سرے کنارے تک لائی جاتی تھیں۔ لیکن دوسرے موسموں میں یہ نالہ خشک ہی رہتا تھا۔ اور سواریاں بلا روک ٹوک آسانی سے گزر جاتی تھیں۔ جہاں پر یہ نالہ ختم ہوتا تھا۔ وہاں پر چڑھائی تھی اسی لئے بیل یہاں پر اپنی پوری قوت صرف کر کے دوڑتے تھے اور بمشکل تمام چڑھائی عبور کرتے تھے۔"

اجنبی کچھ ساعت کے لئے خاموش ہو گیا۔ جیسے اُسے اتنی باتیں بیان کرنے میں جوانی سے لے کر بڑھاپے کی چڑھائی عبور کرنی پڑی تھی۔ اور وہ تھک چکا تھا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے۔ ماضی کے افق پر ایک سپاٹ عریض سڑک پھیلی ہوئی تھی۔ اور بیل گاڑیوں کا قافلہ اپنے مدہم قدموں سے آگے کی طرف آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ چرچوں، چرچوں۔ سکوت۔ تاریکی۔ اور جھینگروں کی بے ہنگم آواز کا فسوں۔

"میری آنکھیں جب کھلیں تو صبحِ کاذب کا اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ اور آسمان کے روشن کناروں کے افق پہ آبی پرندوں کے غول اپنے بازو پھیلائے کسی ندی کی سمت محوِ پرواز تھے۔

بیل ایک جھٹکے سے رُک گئے۔ اور سب ہی نے سانس کھینچ کے اپنی دل گرفتگی کا اعلان کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں خواب میں تھا۔ اور میرے گرد و پیش کا سماں ایک طلسماتی منظر پیش کر رہا تھا۔ بیل کسی دہقان کے مکان کے عقب میں آکر کھڑے ہو چکے تھے۔ تب تو میں نے اپنی آنکھوں کو میچا پھر جو غور سے دیکھا تو وہی منظر [illegible] سامنے تھا۔ ایک نئی فضا۔ نئی جگہ۔ کیا میں دوسری جگہ تو نہیں پہنچ گیا تھا۔ کیا وہ بیلوں کی نئی بن سدھائی جوڑی تو نہیں تھی۔ جو اپنے سابق آقا کے پاس ہمیں بیسیوں کوس دور لے آئی تھی۔ کسی دور دراز کے گاؤں میں۔ یا یہ سب کچھ میرا محض ایک خواب تھا۔

سامنے ایک دیہاتی حسینہ مویشیوں کے باڑے میں کھڑی تھی۔ نیم خوابیدہ دوشیزہ حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ میں گاڑی سے

نیچے اترا اور سیدھا اس کے پاس پہونچا۔ لڑکی نے مجھے نیچے سے اوپر تک ایک بار دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولی۔

'شائد پردیسی ہو'

میں اسٹیشن سے عافیت پور جا رہا تھا۔ اور اب اس جگہ کس طرح۔ اور کیسے پہنچ گیا۔ تعجب ہے۔

میں نے ایک طائرانہ نگاہ ڈال کے اس لڑکی کی آنکھوں میں اپنی مشکل کا حل تلاش کیا۔

'ایسے میں تم یہاں پر مل گئے۔ کتنا اچھا ہوا پردیسی۔ اب تم بھی میرے دکھ کے ساتھی ہو گئے'۔ لڑکی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرزنے لگے۔

میں نے سوچا۔ میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا ہوں۔ جہاں کوئی شخص بھی مجھے نہیں پہچانتا۔ اب بھلا میں ایسے میں اس لڑکی کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ لڑکی نے شائد میری فکر کا اندازہ لگا لیا تھا۔

'جب زمین پر دو انسان آئے تو اتنی بڑی دنیا بس گئی اور تم میرا ساتھ دو تو کیا مجھے رہائی نصیب نہیں ہو سکتی'۔

میں نے صیاد کی قوت کا اندازہ لگانے کے لئے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

'وہ دور اس پہاڑی پر اس شخص کی عمارت کھڑی ہے'۔

پہاڑی کی بلند چوٹی پر سورج کی کومل کرنیں شاہ بلوط کے درختوں سے گزر کر گیروے رنگ کی عمارت پر دھیرے دھیرے مور چھل جھل رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی میں یوکلپٹس کے طویل قامت درخت خاموش لیکن غرور میں ڈوبے ہوئے اپنی عظمت کا اعلان کر رہے تھے ان سے ذرا نیچے ڈھلوانوں میں فالسے کے درختوں کی بے ترتیب قطار پھیلی ہوئی تھی۔ اور جہاں پر یہ سلسلہ ختم ہوتا تھا۔ وہاں پر ایک بڑا سا برگد کا پیڑ تھا۔ جس پر بے شمار پرندے چیخ چیخ کر ایک ہنگامہ سا بپا کئے ہوئے تھے۔

میری نگاہیں ان سب چیزوں کا تعاقب کر کے واپس لوٹ آئیں۔

لڑکی نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اور مطمئن سی ہو گئی جیسے میں نے اپنی مدِ مقابل کی قوت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ 'لیکن تمہیں لڑنا نہیں ہے'۔

اس کا مطلب۔

'اس کا مطلب یہ کہ ہم دونوں ایک ساتھ مل کر اس شرط کو پورا کریں گے۔ جس کا وعدہ میرے باپ نے اس شخص سے کیا تھا'۔

کیا وعدہ تھا؟

'وہ وعدہ تھا کہ ہم سامنے والی پہاڑی پر بجنسہ ایسی ہی ایک اور عمارت تعمیر کریں گے۔ اور اس کے حصار میں ایک اونچی سی دیوار کھڑی کی جائے گی۔ جس کی بلندی اتنی ہو کہ تیز ہواؤں کی زد سے عمارت بچی رہے۔ اور سورج کی تیز شعاعیں اس عمارت پر اپنا سایہ زیادہ دیر تک نہ ڈال سکیں'۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کئی برس تک کڑی محنت کرنی پڑے گی۔ تب کہیں جا کر یہ کام مکمل ہو سکے گا۔ پھر کہیں میری واپسی کا سوال پیدا ہوگا۔

اس وقت تک زمیندار مجھے بھول چکا ہو گا۔ میں نے حامی بھری۔ بیلوں کو آزاد کیا اور منہ ہاتھ دھونے پہاڑی چشمے پر چلا گیا۔

دوسرے دن میں نے اپنے ہاتھوں میں معماری کے اوزار لئے اور لڑکی نے اینٹیں جمع کرنی شروع کیں میں نے گارا تیار کیا اور اینٹ گارا جمایا۔ حتیٰ کہ سورج غروب ہونے تک بیس فٹ چوڑی دیوار کھڑی ہو چکی تھی۔ اور ساتھ ہی میرے ہاتھ اور پاؤں کی قوت بھی جواب دے چکی تھی۔ جسم میں نقاہت اور آنکھوں میں غنودگی طاری تھی۔ میں وہیں صحن پر لیٹ گیا اور لڑکی نے خشک پتوں کی مدد سے آگ جلائی اور روٹی سینکنے لگی۔ جب روٹی تیار ہو گئی تو ہم دونوں نے وہیں پر بیٹھ

بیٹھے روٹی کھائی۔ دن بھر سخت محنت کرنے کی وجہ سے میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا۔ کہ لڑکی دھیمے سُروں میں کوئی نغمہ آلاپ رہی تھی۔ اور اُس کی آواز پہاڑی نالے کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ دور تک اڑتی چلی جا رہی تھی۔ گھاٹیوں سے دور۔ میدانوں سے پرے، پہاڑوں پر، ہواؤں میں۔ دور بہت دور۔ اس رات میں نے دیکھا کہ وہ جگہ ایک ریگ زار میں تبدیل ہو چکی ہے۔ وہاں نہ کوئی آدمی ہے اور نہ کوئی آدم زاد۔ ہر سُو تاریکی ہے اور طوفانی ہواؤں کا سمندر ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ میں نے محسوس کیا جیسے کوئی انسانی پیکر۔ میرے سامنے کھڑا مجھ سے سوال کر رہا ہے۔ میں نے کسی قدر توقف کے بعد پوچھا۔

تو کون ہے جو رات کی اس تاریکی میں محوِ سفر ہے۔ کیا تو ایک انسانی ہیولہ ہے۔ یا کوئی آسیب۔ اگر تو انسان ہے تو آ میرا ہم سفر بن جا۔ اور اگر کوئی آسیب ہے۔ تو جا۔ اپنی راہ لے۔

انسانی ہیولے نے تاسف بھری آواز میں کہا۔

'آہ تو ان راستوں کی ہزیمتوں سے آگاہ نہیں۔ ان راستوں کی کوئی منزل نہیں۔ یہ بے ترتیب راستے ہر چہار طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

آ میں تجھے اپنی ہستی کے رموز سے آگاہ کروں۔

میں اُس انسان کی روح ہوں جس نے اپنے بدنما اور بھیانک چہرے پر ایک سفید اور بے داغ قباء اوڑھ رکھی ہے میرا کوئی دین نہیں۔ کوئی دھرم نہیں۔ کوئی ایک نظریہ نہیں۔ میری زندگی کا کوئی ایک اچھوتا نصب العین نہیں۔ میں ہر قوم، ہر ملک اور ہر تہذیب میں اپنے بدنما داغوں والے۔ اس چہرے پر ایک سفید نقاب ڈالے گشت کرتی پھرتی ہوں۔ واقعات اور حالات کے تحت میں اپنا انسانیت کش ہتھیار استعمال کرکے مظلوموں کو زیر کرتی ہوں۔ اور ظالموں کی قوت کو فروغ دیتی ہوں کہیں پر کالے اور گورے انسانوں کی تفریق کا جال پھیلا رکھا ہے کہیں پر نسل اور زبان کا مسئلہ لا کھڑا کیا ہے۔ مجھے جہاں، کہیں، کسی بھی جگہ ہمدردی، محبت اور اخوت کا سوتا نظر آیا ہے۔ میں ایک ناقابلِ تسخیر چٹان بن کر اس ابلتے ہوئے چشمے کو ہمیشہ کے لئے خشک کر دینے کے درپے ہو جاتی ہوں۔ مجھے جس جگہ بھی روشنی کی ایک ہلکی سی شعاع نظر آئی ہے میں نے اپنی گھناؤنی عنقریب اور منافقت سے بھری غلیظ چادر ڈھانک کر اُس روشنی کی کرن کو ہمیشہ کے لئے تاریکی کے پردے میں پس پشت ڈال دیا ہے۔ لوگ میری پوجا کرتے ہیں۔ میرے نعرے بلند کرتے ہیں۔ میں نے ان کے ذہن کے ہر گوشے کو اس طرح تاریک کر دیا ہے۔ جس طرح کالی اور مہیب رات دن کی روشنی کو نگل لیتی ہے۔ دن کے روشن لمحات کو اپنی خاموش فضا میں تھپک تھپک کر گہری نیند سلا دیتی ہے۔ میں ہوں جھوٹی اور ناپختہ تہذیب و تمدن کی علمبردار۔ انسان دشمنی کی ننگی تلوار'۔

اے بے نام روح۔ اب تو بڑی دیر ہو چکی ہے محرومیوں اور نامرادیوں۔ یقین اور بے یقینی کی اس طویل مدت میں احساسات کی ایک خلیج حائل ہے۔ جسے کس طرح اتنی جلدی پاٹ دیا جائے آہ وہ کونسا راستہ ایسا ہے جو میری سوچ کے تانے بانے کو تیری سوچ سے ملا دے۔ وہ کونسی ایسی کمند ہے جو میری عقل تیری عقل پر ڈال سکے۔ آہ اب خرد کہیں نظر نہیں آتی۔ اور ہر طرف تاریکی مکمل سایہ کئے ہوئے ہے۔ اور میں ایک انسان۔ اس بے برگ و گیاہ ویرانے میں حیران و پریشان۔ روح نے اپنی ننگی تلوار کا وار مجھ پر کیا۔ اور میری آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئیں۔

میرے سامنے نہ جھونپڑی تھی اور نہ بیل گاڑی۔ اور نہ ہی اس لڑکی کا کہیں دور دور تک کوئی پتہ تھا۔ پہاڑی سامنے تھی اور عمارت اس حقیقت کا پتہ دے رہی تھی۔ میں نے دوسرے ہی لمحے واپسی کی ٹھانی۔ اور سوچا کہ اپنے آقا کے پاس جاؤں۔ اور

اس طویل غیر حاضری کی معذرت چاہ لوں۔

کئی دنوں کی مسافت کے بعد جب میں بھوک سے نڈھال ہو گیا۔ میرے جسم کی قوت جواب دے گئی۔ حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ تو میں ایک چھدرے درخت کی چھاؤں تلے لیٹ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی روح ایک بار پھر میرے سامنے نمودار ہوتی ہے۔ اور مجھے مخاطب کرتی ہے۔

'اے بدنصیب شخص تو جس سرزمین پر ہے وہاں انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔ اور مردہ تہذیب کو پھر سے جنم دیا جاتا ہے۔ اور تو جس منزل کی جانب گامزن ہے وہاں حیوان افضل اور انسان بے بسی و لاچارگی کی زندگی گزارتے ہیں۔ تو اکیلا ہے اور تیری اپنی سوچ تجھے بادِ سموم کے طوفانوں سے ٹکرا دے گی۔ تو روئے گا۔ کفِ افسوس ملے گا۔ لیکن اس وقت تیری کوئی نہ سنے گا۔

آ۔ اور میرے ساتھ چل جو میں کہتا ہوں سن۔ اور جس طرح میں سوچتا ہوں اسی طرح سوچ۔ ظالم قوی اور نگہبان بے بس۔ فرار کا ہر راستہ تیرے لئے اب مسدود ہو چکا ہے۔

ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ اور میری آنکھیں اچانک کھل گئیں۔

ہر طرف گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ بوڑھوں بچوں اور مردوں کی چیخیں ہر طرف سے بلند ہو رہی تھیں۔ لوگ بھاگ رہے تھے اور لوگ نیزوں اور برچھیوں سے اُن کا تعاقب کر رہے تھے۔ بندوقیں چل رہی تھیں اور مکانوں کو نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔ قتل و غارت گری کا طوفان قریباً دو گھنٹوں تک اسی طرح جاری رہا۔

سورج جب غروب ہو چکا اور شام نے اپنی ملگجی چادر جب چاروں سمت پھیلا دی۔ تو میں نے انسانی آبادی کی جانب رینگنا شروع کیا۔ جب میں بستی میں پہنچا تو بلغاری اپنا کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ اور زندگی کے آخری آثار بھی بستی سے قریباً مٹ چکے تھے۔

کسی کسی مکان میں آگ اب تک سرد نہیں پڑی تھی۔ اُن مکانوں میں انسان جان کنی کی حالت میں زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھے۔ لیکن آہ! موت اُن سے صرف چند قدم کے فاصلے پر آخری وار کرنے کھڑی تھی۔ میدانوں میں انسانی جسم خون میں لت پت جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ کہیں کہیں تو بیسیوں، عورتوں، مردوں اور بچوں کے مردہ جسم ایک ہی جگہ ڈھیر کی شکل میں یکجا تھے۔ جوان عورتیں اور جوان مرد بوڑھے باپ اور سن رسیدہ مائیں۔ پاؤں چلنے والے بچے اور شیر خوار بچے۔ گولیوں کا نشانہ اور تلواروں سے تہہ تیغ کئے ہوئے ان انسانی اجسام کو موت نے ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں اچانک آ لیا تھا۔

کسی کے ہاتھ میں صرف چاول کی ایک پوٹلی بندھی تھی اور وہ بھاگتے ہوئے موت سے دوچار ہو گیا تھا۔ ایک کے ہاتھ میں فائل تھی جس میں چند تعلیمی اسناد اور کچھ کاغذات پڑے تھے۔ اس شخص کی گردن کچھ فاصلے پر کٹی پڑی تھی۔ ایک ہاتھ دعا کی کوئی کتاب تھامے جسم سے دور جا پڑا تھا۔ خدا سے فریاد یا ظالم سے پناہ کی آخری التجا بھی خالی گئی تھی۔

میں نے جلد از جلد اس گاؤں کو چھوڑ دینے ہی میں اپنی خیر سمجھی اور کہیں دور، کسی جنگلی مقام کی تلاش میں انسانی آبادی سے میلوں پرے چل پڑا۔

رات میں نے ایک گھنی جھاڑی میں گزاری۔ اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگا۔ ہر لمحہ جو گزرتا جاتا تھا صبح سے قریب اور میری موت کو قریب تر لاتا دکھائی دیتا تھا کوئی گھنا جنگل جہاں شیر اور بھیڑیئے بسیرا کرتے ہوں میری امید کی آخری کرن اور میری خوشیوں کا معراج بن چکا تھا۔ صبح ہونے

سے قبل آسمان کا ہر کونا بادلوں سے گھر گیا۔ اور بجلی کی کوندیں ہر جانب لپکنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔ بارش دن بھر اسی طرح سے ہوتی رہی۔ اور شائد کئی دنوں تک اسی طرح جاری رہی۔ اُسی وقت میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے انسانی آبادی کی سرحد کو جلد از جلد عبور کر لینا چاہیئے۔ نجانے کب بلوائی اس جگہ پر بھی پہنچ جائیں۔ اور موت راستہ دیکھ لے۔

رات کی تاریکی میں مَیں اپنا سفر جاری رکھتا دن کا وقت بانس کے گھنے جنگلوں یا پٹ سن کے کھیتوں میں گزارتا۔ جنگلی پھلوں سے بھوک کی آگ بجھا لیتا ۔ اور جوہڑ کا پانی پی لیتا۔ کئی دنوں کی مسافت کے بعد مجھے دریا کے کنارے ایک گھنا سا جنگل نظر آیا۔ اور میں بلا خوف وخطر جنگل میں اس طرح داخل ہو گیا جیسے وہ میری محفوظ ترین پناہ گاہ ہو۔ چند لمحوں بعد ہی میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ جنگل شیر، چیتے اور خونخوار جانوروں سے کسی طرح خالی نہیں تھوڑی سی دیر کی تلاش کے بعد میں نے ایک کہنہ درخت کا انتخاب کر لیا اور ایک مستحکم سی شاخ پر جا کے بیٹھ رہا۔ اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ میرا قریب ترین پڑوسی ایک بندر دوسری شاخ پر بیٹھا میری طرف پُرتجسس نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی خیاؤں خیاؤں کی آوازیں حلق سے نکال رہا تھا نجانے کس گھڑی میری آنکھ جھپک گئی۔

ایک چیختی ہوئی آواز میرے کان سے ٹکرائی اور میں بیدار ہو چکا تھا۔ بہت سے بندر ایک ساتھ ہی اچھل کود کے کھیل میں مصروف تھے۔ اور اپنی بتیسی دکھا کر مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رات کی دم توڑتی ہوئی سیاہی میں دن کا اُجالا آہستہ آہستہ قدم رکھ رہا تھا۔ پرندوں نے اپنے گھونسلے چھوڑ دیئے تھے اور صبح کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ مجھے تب خیال آیا میں نے انسانی آبادی چھوڑ دی تھی اور جنگل میں پناہ گزیں تھا۔ میرے دل ودماغ سے خوف کا احساس آہستہ آہستہ رفع ہوتا جا رہا تھا۔ غذا اب میری اہم ترین ضرورت بن کر سامنے کھڑی تھی۔ رنگ برنگ کے جنگلی پھل صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اپنا روپ دکھا رہے تھے۔ جب میرے آس پاس کے سارے جانور شکار کی تلاش میں دور نکل گئے تو میں درخت سے نیچے اُترا کچھ جنگلی پھل توڑا اور ذائقہ معلوم کرنے لگا۔ کچھ میٹھے اور ترش، کچھ کڑوے اور کسیلے تھے۔ پیٹ بھر پھل کھانے کے بعد میں پانی کی تلاش میں جنگل سے باہر نکلا۔ ایک جوہڑ سے پانی پیا اور جنگل سے پرے دریا کی جانب چل دیا۔ دریا کے کنارے بیٹھ کر میں نے اپنی نئی زندگی کے آغاز کے متعلق سوچنا شروع کیا۔

مجھے اُس جنگل میں آئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے اور اُس وقت میں اپنی شاخ پر بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے کالے بادلوں کی ایک فوج آسمان کے مشرقی کنارے سے نمودار ہوتی نظر آئی۔ کچھ ہی دیر میں بادلوں نے ساری کائنات کو ایک گمبھیر تاریکی میں ڈبو دیا۔ بادل گرجے اور بجلیوں کی کوندیں ہر جانب تڑپنے لگیں۔ بارش کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ کئی دنوں تک بارش یکساں طور پر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ندی اور نالے پُر آب ہو گئے۔ پانی کی سطح بلند ہوتی گئی حتیٰ کہ بارش کا پانی جنگل میں گھس آیا اور درختوں کی جڑیں زیرِ آب ہو گئیں۔ شام تک پانی درختوں کی نچلی سطح تک چڑھ آیا۔ مجھے ایک بلند شاخ پر چڑھ جانا پڑا۔ کئی راتیں میں نے جاگ جاگ کر گزار دیں۔

ایک ہفتہ گزر جانے پر بارش تھمی اور کم وبیش یہی عرصہ پانی گھٹنے میں لگا۔

پانی جب دریا کی سطح تک واپس جا چکا تو میں جنگل سے

باہر نکلا۔ دریا میں اور زمین پر انسانی لاشیں اور جانوروں کے مردہ جسم ہر طرف بکھرے نظر آئے۔ کتے، بلی، گائے بیل اور انسان ایک ہی جگہ ڈھیر پڑے تھے۔ سیلاب نے تباہی مچادی تھی۔

میں نے سوچا مجھے انسانی آبادی کی طرف چلنا چاہیئے۔ جب انسان پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ دوسروں کی دشمنی بھول جاتا ہے۔ میں نے بیسوں میل کا سفر ہر سمت میں کیا، لیکن مجھے اتنے بڑے خطے میں ایک بھی انسانی نفس نظر نہیں آیا۔ یہ تلاش کئی دنوں تک جاری رہی لیکن انسان شائد نا پید ہو چکے تھے۔ تم وہ پہلے شخص ہو جو مجھے اتنی بڑی آبادی میں زندہ حالت میں ملے ہو۔

نوجوان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ آہ! میں نے اپنے ان ظالم ہاتھوں سے نجانے کتنے ہی بے قصوروں اور معصوم لوگوں کا قتلِ عام کیا ہے۔ اور اب مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوگئی ہے۔ میری اس بدکار شکل کو دیکھنے والے اس سرزمین پر اب تم ہی واحد شخص رہ گئے ہو۔ میں اپنے اس جسم پر اپنے بھاری بھرکم سر کو اب اس طرح لئے چلتا ہوں، جیسے آبِ دریا میں کوئی دیو قامت سمندری جہاز۔

اجنبی اور نوجوان دونوں اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں اور انسانی نفس کی تلاش میں چل پڑتے ہیں۔ ایک پورب کو جاتا ہے۔ اور دوسرا پچھم کو۔

موت کی تاریکیوں کے درمیان زندگی کی کرن کا ایک بار پھر آغازِ سفر ہوتا ہے ٭

جہاں آراء بیگم

مسرت سہیل

خاندانِ مغلیہ کی وہ بیگمات جن کی قابلیت، ذہانت، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں کوئی ثانی نہ تھا ان میں جہاں آراء بیگم کا بھی شمار ہوتا ہے۔ وہ ایک نہایت سعادت مند بیٹی، غمگسار بہن اور بہترین اتالیق تھی۔ وہ محض ایک ماہر طبیبہ ہی نہ تھی حافظِ قرآن اور ادب شناس شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ قرأت اور خطاطی میں بھی مشاق تھی۔ اس کی زندگی انسانی ہمدردی، زہد و اتقاء، غریب پروری اور ایثار و قربانی کا بہترین نمونہ تھی۔

جہاں آراء بیگم کا سلسلۂ نسب ننھیال کی طرف سے مرزا غیاث بیگ طہرانی الملقب بہ "اعتماد الدولہ" سے جا ملتا ہے۔ اس کی ولادت ۱۰۲۳ھ مطابق ۱۶۱۴ء میں ہوئی۔ اس کی دل آویز صورت اور من موہنی مورت سے متاثر ہو کر جہانگیر نے اس کا نام "جہاں آراء" رکھا۔ اس کا اعزازی لقب "فاطمۃ الزمان" تھا جس کی وجہ سے MACDONALD اور اس کے بعد VON KRAMER کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس کا اصل نام فاطمہ تھا۔ عبدالحمید لاہوری اور محمد صالح کنبوہ، جو اس کے ہم عصر مورخین ہیں، اس کو "بیگم صاحب" اور "بادشاہ بیگم" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

شاہجہان اور ممتاز محل کو اپنی اس بیٹی سے بے حد انسیت تھی چنانچہ انہوں نے اس کی تعلیم و تربیت میں خصوصی دلچسپی لی۔ ستی النساء خانم، جو ملک الشعراء طالب آملی کی بہن اور زباندانی، ادب شناسی قرأت اور فنِ خطاطی کی ماہر سمجھی جاتی تھی، جہاں آراء بیگم کی معلمہ مقرر ہوئی۔ جہاں آراء کے جو کمالات بعد میں ظہور پذیر ہوئے ان کی اساسی وجہ ستی النساء خانم ہی کی ابتدائی تربیت تھی، جو رنگ لائی۔

۱۶۲۸ء میں جب شاہجہان تخت نشین ہوا تو جہاں آراء صرف چودہ سال کی تھی لیکن غیر معمولی ذہانت اور اطوارِ حسنہ کے سبب اپنے تمام بہن بھائیوں میں نمایاں تھی "بادشاہ نامہ" میں عبدالحمید لاہوری تحریر کرتا ہے کہ اس موقع پر شہزادی نے شاہجہان کو قیمتی جواہرات پیش کئے جس کے جواب میں اس کا چھ لاکھ سالانہ کا وظیفہ مقرر ہوا۔

محض ۱۷ برس کی عمر میں وہ لذتِ غم سے آشنا ہوئی یعنی اس کی ماں ممتاز محل کا سانحہ ارتحال ہوا۔ بقول سر جادو ناتھ سرکار جہاں آراء

۱۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام آرٹیکل، جہاں آراء بیگم۔

۲۔ مصنف "خزانہ عامرہ" اس کو بلبل آمل کے لقب سے یاد کرتا ہے بحوالہ ضیاالدین برنی ملے

پر اس حادثہ کا بہت گہرا اثر ہوا اپنی ماں کی وفات کے بعد جہاں آراء ہی پر محل کے جملہ امور انتظامیہ کی ذمہ داریاں آپڑیں۔ شاہجہان نے وہ تمام حقوق و اختیارات، جو ممتاز محل کو حاصل تھے، جہاں آراء کو تفویض کردیئے۔ جہاں آراء نے بھی خود کو دل و جان سے اپنے والد کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔[1] پروفیسر محمد اسلم اپنے ایک گراں قدر مقالے[1] میں رقمطراز ہیں کہ جہاں آراء نے اپنے بہن بھائیوں کو ماں کا پیار دیا اور ان کی تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ دی۔

شاہجہان کو اپنی اس بیٹی پر نہایت درجہ اعتماد تھا۔ شہزادی کا امورِ سلطنت میں انہماک دیکھ کر بادشاہ یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ وہ انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے ہر طرح موزوں ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر بقول مصنف "بادشاہ نامہ" شاہجہاں کی خاص مہر بھی اس کے سپرد کر دی گئی۔ سرکاری کاغذات اور احکام جب اُس کی نظر سے گزرنے لگے تو وہ سلطنت کے جملہ رموز اور ان کے نشیب و فراز سے واقف و آگاہ ہوئی[2] جس سے اس کی سیاسی بصیرت اور معاملہ فہمی کی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

جہاں آراء کو اپنے والد سے بے پناہ محبت تھی وہ شاہجہاں کی محافظ و نگہبان تھی۔ اس ضمن میں وہ اس قدر محتاط تھی کہ دسترخوان پر کسی قسم کا ایسا کوئی بھی کھانا سامنے نہیں پیش نہیں کیا جاسکتا تھا جو اس کی نگرانی میں تیار نہ کیا گیا ہو۔[3] باپ سے اس کی محبت کی سب سے بھی بڑی مثال ایک یہ بھی ہے کہ شاہجہاں کی امورِ حکومت سے جبریہ علیحدگی کے بعد بھی جہاں آراء بدستور معزول شہنشاہ اور بے کس باپ کی خدمت بجا لاتی رہی گویا اس نے اپنے غمزدہ باپ کی خاطر قید و بند کی سختی بھی قبول کر لی۔ اس جذبۂ قربانی کے سبب نہ صرف یہ کہ جہاں آراء کو ہماری تاریخ میں شہرت عام حاصل ہوئی بلکہ آفاقی سطح پر بقائے دوام ملی یعنی فرانسیسی شاعری میں بھی اس کے گیت گائے گئے۔ چنانچہ ایک فرانسیسی شاعر لی کانتے دلائل۔ (LECONTE DELISLE) اس کے اس ایثار سے بے حد متاثر نظر آتا ہے جہاں آراء نے محض باپ کی خاطر دولت و عزت پہ لات ماری جبکہ اسی کی بہن روشن آراء اورنگ زیب کے حلقۂ اثر سے وابستہ ہو کر دولت مندی، عیش کوشی اور آزادی کی پر بہار زندگی گزار رہی تھی۔[4]

شہزادی جہاں آراء صلح کل و صلح جو ہی نہیں صلح و آشتی کی گویا دیوی تھی۔[5] شاہی محل کے دوران قیام میں اس کی زندگی کا مقصد اولین و آخرین تمام خاندان میں رابطہ قائم رکھنا تھا۔ جس وقت شاہجہاں کے بیٹوں میں تخت نشینی کے لئے تنازعہ شروع ہوا تو جہاں آراء نے داراشکوہ کی حمایت کی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ رسم و رواج اور قانون کے مطابق دارا ہی کو تخت کا اصل وارث سمجھتی تھی جیسا کہ اس کے اس مکتوب کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے جو اُس نے اورنگ زیب کو مصالحت پر آمادہ کرنے کے لئے تحریر کیا تھا:

> "تمہاری مسلح پیش قدمی خود تمہارے والد بزرگوار کے خلاف جنگ کرنے کے مترادف ہے، اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ یہ پیش قدمی دارا کے خلاف ہے تو بھی کچھ کم گناہ نہیں اس لئے کہ رسم و رواج اور شرع کے مطابق وہ بجائے باپ کے ہے۔"[6]

اس کے برعکس یورپین مورخین کے خیال میں جہاں آراء نے

۱۔ محمد اسلم "سیارہ ڈائجسٹ" اکتوبر ۱۹۷۲ء

۲۔ جہاں آراء بیگم بنت شاہجہان از ضیاء الدین برنی ص نمبر ۲۲

۳۔ وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر، مترجم خلیفہ محمد حسین ص ۲۰

۴۔ سرجادو ناتھ سرکار "ہندوستانی اینٹی گنی" دی ماڈرن ریویو نمبر ۱۹۲۹ء

۵۔ ضیاء الدین احمد برنی ــ "جہاں آرا بیگم"

۶۔ جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں از ضیاء الدین احمد برنی ص نمبر ۳۰

دارا شکوہ کی حمایت محض اس لئے کی تھی کہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ بادشاہ بن جانے پر وہ جہاں آراء کو شادی کی اجازت دے دے گا[۱]۔ سر جادوناتھ سرکار باوجود ہندو ہونے کے اس الزام کو جہاں آراء کے کردار پر "چھینٹے ڈالنے کی سعی" کہتے ہیں۔ دارا کی حمایت کا وہ یہ سبب بتاتے ہیں کہ دارا بلحاظ عمر اس سے قریب ترین تھا اس کے علاوہ ان کے خیالات، مقاصد، حتیٰ کہ تصوف کے روحانی مشاغل یکساں تھے[۲]۔ اس کے باوجود جہاں آرا نے اور بھائیوں میں سے کسی کے حقوق کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف سلطنت مغلیہ کو پُر جلال دیکھنے کی متمنی تھی۔ وہ خانہ جنگی کے نقصانات سے بخوبی واقف تھی۔ ساموگڑھ میں دارا کو شکست فاش ہوئی اور نگ زیب آگرہ تک آپہنچا۔ مراد بخش اس کے ساتھ تھا جہاں آرا نے اس وقت جو قدم اٹھایا اگر وہ کامیاب رہتا تو تاریخ آج وہ نہ ہوتی کہ جو ہے۔ اس نے اپنے چاروں بھائیوں میں سلطنت کی پُر امن تقسیم کے اصول پر مصالحت کرانے کی کوشش کی لیکن اس کی مساعی جمیلہ رائیگاں گئیں[۳]۔

اس کا محبوب بھائی دارا شکوہ مارا گیا اور اورنگ زیب برسرِ اقتدار آگیا۔ شہزادی جہاں آرا اپنے باپ کے انتقال کے بعد ۱۵ سال تک زندہ رہی اور نگزیب اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اس نے جہاں آرا کو کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ اب اس کا اقتدار ختم ہو چکا ہے بلکہ اس نے جہاں آرا کو شاہی محل کی سب سے بڑی ملکہ کے درجہ پر بحال رکھا[۴]۔

شہزادی جہاں آرا کی سیرت کا نمایاں ترین پہلو اس کا زہد و تقویٰ ہے۔ بقول اس کے وہ خاندان تیموریہ کی پہلی خاتون ہے جس نے تصوف کو اپنا شیوہ بنایا[۵]۔ ابتداء میں وہ ملا شاہ کی مرید تھی لیکن پھر چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں سے اس کی عقیدت بڑھ گئی تھی[۶]۔

عین جوانی میں جہاں آرا نے 'مونس الارواح' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں اس نے خواجہ معین الدین اجمیریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، صوفی حمید الدین ناگوریؒ، بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا ذکر بڑے عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے[۷]۔ شہزادی اپنی اس تصنیف کا مقصد ان الفاظ میں تحریر کرتی ہے:

> "چونکہ یہ فقیرہ اپنے آپ کو حضرت پیر دستگیر کا حقیر ترین مرید تصور کرتی ہے..... (اس لئے) حضرت پیر دستگیر کے رسالہ "انیس الارواح" کے نام پر اس عقیدت مند نے اس رسالہ کا نام "مونس الارواح" رکھا ہے اور امیدوار ہے کہ جو کوئی شخص چشتیوں کی عقیدت کی کشتی میں بیٹھے گا۔ حق سبحانہ تعالیٰ اسے گناہوں کے سمندر کی متلاطم لہروں سے نجات دے کر ساحلِ مراد تک پہنچائے گا۔"

"مونس الارواح" کے علاوہ جہاں آرا رسالہ صاحبیہ' کی بھی مصنف ہے[۸]۔ جو اس کے پیر و مرشد کی ایک نامکمل سوانح عمری ہے پاکستان میں اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ جناب پروفیسر محمد اسلم صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی کی ملک ہے۔ مذکورہ بالا مخطوطے کے باب میں گمان غالب یہ ہے کہ اسے شہزادی نے بنفسِ نفیس اپنے ہاتھ سے خود تحریر کیا ہے[۸]۔

جہاں آرا کی ایک اور اہم کتاب "آیات بینات" ہے جس میں قرآن پاک کی بعض آیات اور احادیث نبوی کا فارسی میں ترجمہ

۱۔ جہاں آرا بیگم بنت شاہجہان، از ضیاء الدین احمد برنی ص ۳۱

۲۔ ہندوستانی اینٹی کنی" از سر جادو ناتھ سرکار۔

۳۔ جہاں آرا بیگم، ضیاء الدین برنی ص ۵۳

۴۔ اورینٹل کالج میگزین ۱۹۳۷ء

۵۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، آرٹیکل جہاں آرا بیگم

۶۔ "سیارہ ڈائجسٹ"، اکتوبر ۱۹۶۲ء

۷۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام آرٹیکل جہاں آرا۔

۸۔ سیارہ ڈائجسٹ' ص ۱۳۳

کیا گیا ہے۔ اس کا مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہے[۱] اس کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی میں نے جناب محمد اسلم کی تحویل میں دیکھی ہے جو دیدہ زیب اور جاذبِ توجہ ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جہاں آرا نے ایک مثنوی بھی لکھی تھی لیکن وہ آج تک دستیاب نہ ہو سکی[۲]۔ البتہ "مونس الارواح" میں جا بجا اس کے اشعار ملتے ہیں جو اس کے ذوقِ شعری کی نہایت مناسب عکاسی کرتے ہیں۔ نمونہ درجِ ذیل ہے:

اے بہ وصفت بیان ما ہمہ ہیچ
ہمہ آں تو آں ما ہمہ ہیچ

ہر چند بیند خیال ما ہمہ نقص
ہر چہ گوید زباں ما ہمہ ہیچ

اسی طرح اس کے چند اشعار جو خواجہ اجمیریؒ کی منقبت میں ہیں، درجِ ذیل ہیں:

آں شہنشاہِ جہاں معرفت
ذاتِ او بیرون ز ادراک وصفت

خسرو ملک فنا بے تخت و تاج
از خود و از غیر خود بے احتیاج[۳]

اپنے والد کی وفات پر جہاں آرا کو بے حد صدمہ ہوا جس کا اظہار اس نے اپنے تصنیف کردہ مرثیہ میں اس طرح کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اے آفتابِ من کہ شدی غائب از نظر
آیا شبِ فراق ترا ہم بود سحر!

جہاں آرا نہ صرف یہ کہ خود شاعرہ تھی بلکہ سخن فہمی میں ملکہ رکھتی تھی ایک مرتبہ رات کے وقت وہ بادشاہ سے ملاقات کر کے واپس آ رہی تھی کہ یکایک اس کے آنچل میں کسی موم بتی سے آگ لگ گئی اور آن کی آن میں شہزادی کا سارا جسم شعلوں نے جھلس گیا شہزادی کی صحت یابی پر ملک الشعراء حاجی محمد جان قدسی نے ایک قصیدہ لکھا جس کا ایک شعر ہے:

تا سرزدہ از شمع چنیں بے ادبی
پروانہ زعشقِ شمع را سوختہ است

چنانچہ جہاں آرا نے ملک الشعراء کو اپنی سرکار سے پانچ ہزار روپے عطا کئے۔ یہ واقعہ بجائے خود اس کی فیاضی و سخن فہمی کی واضح دلیل ہے۔

جہاں آرا کا جمالیاتی، فنی اور ادبی ذوق اس کی تعمیرات میں بھی جھلکتا ہے اُس کا آگرے کا محل طرح طرح کے طلائی نقش و نگار کے علاوہ پاکیزہ اشعار سے مزین و منقش تھا اور "پادشاہ نامہ" میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ شہزادی جہاں آرا بے انتہا دولت کی مالک تھی[۵] اور اس نے اپنی دولت کو فلاحِ عامہ کے کاموں میں فیاضی سے صرف کیا۔ "آگرہ کی جامع مسجد اس کی فیاضی کی زندہ یادگار ہے جو کہ ۱۶۴۳ء میں چار لاکھ کے خرچ سے تیار ہوئی تھی[۶]۔ اس کی دوسری بڑی عمارت "بیگمی دالان" ہے جو اس نے ۱۰۵۳ھ میں اجمیر میں حضرت معین الدین چشتیؒ سے عقیدت کے اظہار میں تعمیر کروایا[۷] اس کے علاوہ بھی شہزادی نے بہت سی عمارتیں، باغات، حمام اور سرائیں تعمیر کرائیں[۸]۔

۱- "سیارہ ڈائجسٹ"، ص ۱۴۴
۲- جہاں آرا بنتِ شاہجہاں، ضیاء الدین احمد برنی ص ۶۳
۳- " " " " " ص ۶۵
۴- "جہاں آرا" ص ۲۰ از طوب الرحمٰن کلیم
۵- جہاں آرا بیگم "ہندوستانی اینٹی گنی" سر جادو ناتھ سرکار
۶- ارضِ تاج، از منشی واحد یار خاں ص "
۷- مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۸۳ سید نجیب اشرف
۸- جرنل آف دی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جلد ۲ نمبر ۲

جناب پروفیسر محمد اسلم اپنے ایک مقالے میں فرماتے ہیں۔ "جہاں آرا کو نوجوانی ہی کے عالم میں عبادت اور تصوف کا چسکا پڑ گیا تھا۔ اُس نے حضرت ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی اس نے اپنے مرشد و دادا مرشد (حضرت میاں میر) کی طرح شادی نہیں کی اور اپنی ساری عمر عبادت اور فقر میں گزار دی۔ اس کا یہ شعر اس کے حسبِ حال ہے۔

اے صدف تشنہ بہر دو سوتے نیساں منگر
بہر یک قطرۂ آب کہ شکم بشگافند

"مفتاح التاریخ" میں طامس ولیم بیل جہاں آرا کی سیرت پر یوں تبصرہ کرتے ہیں "جہاں آرا بیگم عورتوں کی تاریخی دنیا میں بلحاظ عصمت و حیا کے بے مثل شہزادی گزری ہے تمام کتبِ تاریخی میں ایک نامور بذلہ سنج، خوش اخلاق، فاضل اور خوبصورت بیگم مشہور ہے جہاں آرا کا نام ہمیشہ صفحاتِ تاریخ کو آراستہ رکھے گا اور قیامت تک اطاعتِ والدین اور ادائے فرضِ منصبی میں ضرب المثل رہے گی۔"[1]

شاہجہاں کے عہد کا ایک سیاح ٹیورنیر (TAVERNIER) رقمطراز ہے۔ "اس میں کچھ شک نہیں کہ جہاں آرا ایسی عورت ہے جس میں تمام اوصاف و خوبیاں پائی جاتی ہیں یہ وہ عورت ہے کہ اگر تمام دنیا کی سلطنت اس کے ہاتھ میں دے دی جائے تو وہ نہایت عمدگی کے ساتھ اس پر حکومت کر سکتی ہے۔"

"تاریخِ اورنگ زیب" میں سر جادو ناتھ سرکار، جو ایک ہندو مورخ ہیں جہاں آرا کی سیرت کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اپنی والدہ کی وفات کے بعد، جہاں آرا کی فہم و فراست نے شاہجہان کو خانگی الجھنوں میں پڑنے سے محفوظ رکھا اس کی شرافتِ قلبی اور نیک نفسی اس کی ذہنی قابلیتوں سے کہیں زیادہ اس کے رنج و غم میں تسلی و تشفی کا باعث رہی اور اُس نے اپنی نیک دلی کی بدولت شاہی گھرانے کے تمام تنازعات کا خاتمہ ہمیشہ خوش اسلوبی سے کیا اور اپنے رشتہ داروں کے تنگ دائرے کے باہر یتیموں، بیواؤں اور غریبوں کے لئے بھی شاہی سخاوت کے حصول کا تنہا ذریعہ رہی تھی۔ اس کی فیاضی اور رحم دلی میں بے حد مشہور تھی۔ اس کی شرافت اس سے ظاہر ہے کہ اس نے بالآخر اس بیٹے کے لئے معافی نامہ لکھوایا جس نے اپنے باپ کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا تھا اور اس کی موت کے بعد بھی اس کی نیکی اور انکساری کی یاد اس عاجزانہ شعر کی صورت میں قائم رکھی گئی ہے جس نے آج تک کسی اور شہزادی یا شہزادے کی قبر کو مزین نہیں کیا ذیل کا شعر اس سے یادگار ہے اور اس کی آخری خواہش کا مرقع پیش کرتا ہے۔

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

۱۔ مفتاح التاریخ، طامس ولیم بیل بحوالہ ضیاء الدین برنی۔

کتابیات

۱۔ "جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں بادشاہ" از ضیاء الدین احمد برنی بی اے
۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، آرٹیکل جہاں آرا
۳۔ سیارہ ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۷۰ء، مضمون جہاں آرا بیگم از پروفیسر محمد اسلم
۴۔ تاریخِ اورنگ زیب، از پروفیسر جادو ناتھ سرکار
۵۔ "ہندوستانی اینٹی گنی" ذی ماڈرن ریویو ستمبر ۱۹۲۹ء از جادو ناتھ سرکار۔
۶۔ اورینٹل کالج میگزین، ۱۹۳۵ء
۷۔ "جہاں آرا"، محبوب الرحمٰن کلیم
۸۔ مقدمات رقعات عالمگیر، سید نجیب اشرف
۹۔ وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر، ترجمہ خلیفہ محمد حسین
۱۰۔ "ارض تاج" منشی واحد یار خان۔

ستمبر — اکتوبر — ۱۹۷۶ء
جلد ۲۹ — شمارہ ۵

ماہِ نو

اس شمارے میں

مدیر اعلیٰ: بیگم مسرت برکی
مدیر: فضل قدیر
نائب مدیر: سیّد علی محمد حسینی

★

چندہ سالانہ: ۹ روپے
فی پرچہ: ڈیڑھ روپیہ

ادارۂ مطبوعات پاکستان — پوسٹ بکس نمبر ۲۵۵ — راولپنڈی

خورشید پرنٹرز، اسلام آباد

ابتدائیہ

ستمبر کا مہینہ ہمارے لئے دوہری اہمیت کا حامل ہے۔ اس مہینے ہمارے عظیم رہبر اور بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے ہمیں اس وقت الوداع کہا جب ہمیں ان کی رہبری اور رہنمائی کی شدید ضرورت تھی۔ ان کے اٹھ جانے کے کچھ ہی عرصے بعد ان کے دست راست شہید ملت لیاقت علی خان بھی ہم سے جدا ہو گئے اور اس کے بعد بے چارگی کی اس سنسناتی ہوئی طویل رات نے ہمیں گھیر لیا جس کی سحر آخر عوامی حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہوئی۔ قائدِ اعظم کے اصولوں کا زبانی دم بھرنے والے تو بہت تھے مگر اس اُدارہ کو نے محبت کی راہ پر چلنے والے کتنی کے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ قائداعظم کے سیاسی افکار اور ان کی عظیم شخصیت کے انتہائی تابناک پہلوؤں پر پردے پڑے رہے اور ان کے مقبرہ کی طرح ان کے افکار سے بھی لاپروائی برتی جاتی رہی۔ یہ شرف بھی خدا نے عوامی حکومت ہی کو بخشا کہ اس نے بانیٔ پاکستان کے مقبرے کو جہاں شایانِ شان حیثیت دے کر اس کو مکمل کیا وہاں ان کے افکار اور نظریات کو بھی دوبارہ زندہ کرنے کا سامان کیا۔ قائدِ اعظم صدی منانے میں جس طرح حکومت بھرپور کوششیں کر رہی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ موجودہ حکومت قائد کے افکار کو زندہ جاوید سمجھ کر یہ چاہتی ہے کہ موجودہ نسل اور آنے والی نسلیں اپنی تاریخ اور اپنے ماضی سے اپنا رشتہ مضبوط تر کریں کہ ماضی سے کٹ کر کوئی قوم عظمت حاصل نہیں کر سکتی۔ "ماہِ نو" بھی قائداعظم نمبر کی تیاریوں میں مصروف ہے اس سلسلے میں ہمیں اپنے بعض معاونین سے یہ درخواست کرنا ہے کہ خدارا جلدی کیجئے۔ یہ نمبر تکمیلی مراحل میں ہے اپنے وعدے پورے کیجئے اور ہمیں ہمیشہ کے لئے ممنون ہونے کا موقع دیجئے۔

ستمبر کے مہینے کی دوسری اہمیت اس عظیم مدافعتی جنگ کی ہے جو ۱۹۶۵ء میں وطنِ عزیز کو بیرونی جارحیت سے بچانے کے لئے لڑی گئی۔ خدا نے ہمیں اس جنگ میں سرخرو کیا۔ ہم پُرامن زندگی گذارنا چاہتے ہیں اور اپنی سماجی و اقتصادی ترقی کے ساتھ تیسری دنیا کی بھی بہتری کے خواہاں ہیں ہمارے دانش سال رہبر اس سلسلے میں جو عظیم کردار ادا کر رہے ہیں تاریخ اسے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ اس شمارے میں تیسری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے سلسلے میں قائدِ عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کا مشہور عالم مقالہ ہمارے صفحات کی زینت ہے ہماری اپنے قارئین سے استدعا ہے کہ وہ اس مقالے کا غور سے مطالعہ فرمائیں اور خود کو ایک عظیم قائد کے جھنڈے تلے عظیم کردار ادا کرنے کے لئے تیار کریں۔

پچھلے دنوں کا سب سے اندوہناک واقعہ چین کے عظیم راہنما ماؤزے تنگ کا بساط عالم سے اٹھ جانا تھا ہمیں امید ہے اس شمارے کے دو مضامین جو اس عظیم انسان کی شخصیت اور اس کے بے مثال زرعی انقلاب سے متعلق ہیں مرغوب قارئین ہوں گے۔

اکتوبر کا آغاز نہایت مبارک اور پُرسعید ہے کہ اس کے پہلے ہفتے میں مملکت عربیہ السعودیہ کے فرماں رواں ذی وقار محتشم شاہ خالد بن عبدالعزیز پاکستان کے پہلے سرکاری دورے پر تشریف لاتے ہیں وہ اس موقع پر دنیا کی سب سے بڑی مسجد شاہ فیصل شہید کا اسلام آباد میں سنگِ بنیاد رکھیں گے بلاشبہ شاہ خالد کے وجود میں ہمیں پھر ایک فیصل میسر آگیا ہے اور اب اسلامیان عالم کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے کہ خالد اور ذوالفقار ان کے لئے سینہ سپر ہیں

(ف۔ق)

بہ فیضِ قائدِ اعظمؒ

ناصر زیدی

ہم وہ ہیں جن کی روایاتِ سلف کے آگے
چڑھتے سورج تھے نگوں
قیصر و کسریٰ تھے زبوں
گردشِ وقت سے اِک ایسا زمانہ آیا
ہم نگوں سار و زبوں حال و پراگندہ ہوئے
سال ہا سال کی اس صورتِ حالات کے بعد
ایک انسان اُٹھا ایسا کہ جس نے بڑھ کر
عزم و ہمت کا شجاعت کا چلن عام کیا
اور برسوں کی غلامی کے شکنجوں میں کسے
راہ گم کردہ بھٹکتے ہوئے انسانوں کو
لفظِ "آزادیٔ جمہور" سے آگاہ کیا
اِک نئے دورِ درخشندہ کا پیغام دیا
قافلے بڑھتے رہے، بڑھتے رہے، بڑھتے رہے
سورج آزادیٔ انساں کے یونہی چڑھتے رہے
ہم کہ واقف تھے روایاتِ سلف سے اپنی
ڈٹ گئے نظمِ وطن کی خاطر
عزم و ہمت سے شجاعت سے نیا کام لیا
اور قائدؒ کے اصولوں کا چلن عام کیا
آج ہم پھر وہی مردانِ جری ہیں کہ جو تھے

بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمدؐ علی جناح

عبرت صدیقی

ملک پاکستان کے اے بانیٔ ذوالاحترام
قائدِ اعظم رفیقِ ملک و ملّتِ السلام

عزم راسخ، جسم لاغر، حوصلہ آہن مزاج
فطرتاً خود دار سر پر حسن آزادی کا تاج

زندگی ملّت کو بخشی جذبۂ بیدار نے
دشمنوں کے دل ہلا ڈالے تیری للکار نے

چاندنی چھٹکی فضاؤں پر اجالے چھا گئے
نور کی چادر بچھی سمٹے اندھیرے رات کے

روح میں ایماں کی گرمی رگوں میں اضطراب
آرزوؤں میں تلاطم لب پہ شورِ انقلاب

تیری کوشش کا ہے پاکستان روشن شاہکار
تا ابد قائم رہے گی یہ سنہری یادگار

وقت کے طوفاں کے ہر دھارے سے ٹکراتا ہوا
ساحلِ مقصود پر تیرا سفینہ آگیا

کاش ہم عامل ہوں اس پر جو تیرا پیغام ہے
روحِ پاکستان صرف اسلام ہی اسلام ہے

ہم کو پاکستان کا تحفہ عطا تو نے کیا
دامنِ ملّت متاعِ آرزو سے بھر دیا

فکر نے تیری، بدل ڈالا رُخِ حالات کو
عین ممکن کر دکھایا غیر ممکن بات کو

ماہرِ علمِ سیاست آشنائے فکر و فن
ہیں ترے مدح سب اہلِ جہاں اہلِ وطن

شہسواران سیاست کھا گئے تجھ سے شکست
جادۂ فکر و نظر میں پا گئے تجھ سے شکست

قوم کی خدمت کے بدلے میں ملا اچھا مقام
حق نے بخشا ہوگا تجھ کو خلد میں عالی مقام

پھر مسلماں کو ضرورت ہے ترے پیغام کی
ملکِ پاکستان میں تنظیم ہو اسلام کی

ملک پاکستان کے اے بانیٔ ذوالاحترام
قائدِ اعظم رفیقِ قومِ مسلم السلام

بیادِ قائدِ اعظمؒ

باتیں اُن کی یاد رہیں گی

جناب حسین امام

قائدِ اعظم محمد علی جناح کی رفاقت مجھے ۱۹۲۵ء سے نصیب تھی۔ وہ جب مرکزی اسمبلی کے رکن بنے تو پھر مجھ سے ان کے تعلقات استوار ہوئے۔ وہ ۱۹۳۵ء میں ممبر ہو کر آئے جبکہ میں ۱۹۳۱ء سے مرکزی ایوانِ بالا کا ممبر تھا۔

قائدِ اعظمؒ کا قیام اسمبلی کی نشست کے دنوں میں دہلی میں رہا کرتا تھا اس طرح ملاقاتوں کا سلسلہ رہتا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں جب مسلم لیگ پارٹی دونوں ایوانوں میں بنی تو مجھے قائدِ ایوانِ بالا کی حیثیت سے اور بعد ازاں رکن مجلس عاملہ اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کی حیثیت سے اور بھی زیادہ قرب نصیب ہوا اور قائدِ اعظم کی پہلو دار شخصیت سمجھنے کے بہتر مواقع ملے میں ان چند خوش نصیبوں میں اب تک بہ قید حیات ہوں جو ذاتی طور پر ان کے نزدیک ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ میرے علاوہ جناب عبدالستار سیٹھ، ایم اے اصفہانی، ایم اے کھوڑو اور ایک دو باقی رہ گئے ہیں۔

"غنیمت ہے کہ ہم صورت ابھی دو چار بیٹھے ہیں۔"

تحریکِ پاکستان کے دوران جس یکجہتی کا ہم نے ثبوت دیا اس کی سب سے بڑی وجہ قائدِ اعظم کی قائدانہ صلاحیت اور ان کی غیر بحث طلب شخصیت تھی، گو ہندو پریس نے جو ہندوستان کی سیاست پر چھایا ہوا تھا۔ قائدِ اعظم کے بارے میں طرح طرح کے افسانے تراشے مگر ہر بار منہ کی کھائی۔ کبھی ان کو اسٹیف نیکڈ (STIFF NECKED) اور کبھی اسٹینڈ آفش (STAND OFFISH) لکھتے تھے۔ اُردو میں ان الفاظ کے معنی اکڑی گردن والے۔ اکڑفوں میں اپنے کو "ہم چناں دیگرے نیست" سمجھنے والے صاحب ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہتے کہ وہ سرد دماغ ہیں۔ جذبات سے عاری ہیں۔ ان سے کون سر کھپائے۔

یہ سب الزام تراشیاں اس لئے تھیں کہ قائدِ اعظم بڑی خوددار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ وقار قائم رکھتے ہوئے اپنے سیاسی حریف سے ملاقی ہوتے تھے۔ وہ چاپلوسی سے کام لینا نہیں چاہتے تھے۔ کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی۔ کبھی کسی کو "بڑا بھائی" کہہ کر اپنی عزت نفس کو ذلیل نہیں کیا۔ سیاسی نکات کو ٹھنڈے دماغ سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کے متعلق ایک اور غلط فہمی اب تک لوگوں میں باقی ہے کہ قائدِ اعظم مخالفت برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ جمہوری اصولی بحث و استدلال کی جگہ اپنا فیصلہ صادر کر دیا کرتے تھے۔ جہاں تک مجلس عاملہ کی نشست کا تعلق ہے میں آپ کو یہ بتا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ طریق کار یہ ہوتا تھا کہ زیر بحث مسئلہ پر قائدِ اعظمؒ اپنے رفیقوں سے ان کی رائے معلوم کرتے تھے اور پھر ہر رائے کا احاطہ کرتے ہوئے آپ ماہر وکیل کی طرح جرح کرتے اور پھر اپنی رائے بتاتے کہ یہ بہتر فیصلہ ہو سکتا ہے اس کے بعد بھی کسی کو اختلاف ہوتا تو اس کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیتے تھے۔ اس طرح ایک متفق فیصلہ مجلس عاملہ کا سامنے آتا۔ ایک مرتبہ لیگ کے کھلے اجلاس میں ایک قرارداد

پر حسرت موہانی نے مخالفت میں تقریر شروع کی تو سارا مجمع ان کی مخالفت کے خلاف کھڑا ہوگیا اور ان سے بیٹھنے کے لئے کہنے لگا۔ اس موقع پر قائدِ اعظمؒ جو جلسہ کی صدارت کر رہے تھے کھڑے ہوگئے اور مجمع کو خاموش رہنے کی تلقین کی اور کہا کہ مولانا کو مخالفت کا حق ہے اور آپ کو ان کی تقریر سُننی پڑے گی۔ ایسے جمہوریت پسند کو کانگریسی اخبار اور کانگریسی نظریہ رکھنے والوں کے پروپیگنڈہ نے کیسا مسخ کیا کہ آج پاکستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو قائدِ اعظمؒ کو "آمر" کہتے ہیں۔

"ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیئے"

قائد اعظمؒ طلباء کو بہت عزیز رکھتے تھے کہ ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ جب بھی طالب علم ان کے پاس آتے قائدِ اعظم ایک شفیق باپ کی طرح کھلے دل سے ان سے ملتے۔ ان کے ہر سوال کا شافی جواب دیتے۔ اس دور کے طالب علم لیڈر گواہ ہیں کہ قائدِ اعظم نے کبھی ان سے فاصلہ سے ملاقات نہیں کی، کبھی ان کو چھوٹا نہیں سمجھا۔ انہیں یقین تھا کہ یہ کچا سونا جب تپے گا کھرا سونا بن کر سامنے آئے گا۔ چنانچہ جب کل ہند و پاک الیکشن میں وقت پڑا تو نوجوان مسلم لیگ کا ہراول دستہ ثابت ہوئے۔ مسلم لیگ کی کامیابی کا بڑا حصہ ان نوجوانوں کی دن رات کی کوشش پر منحصر تھا بڑا قائد وہ ہے جو تخریب کی جگہ جوانوں کو تخلیق کا سبق دے۔ پاکستان کی تخلیق کا ان جوانوں کے سر سہرا ہے!

قائدِ اعظم خود بھی خوددار تھے اور دوسروں میں بھی خودداری دیکھنا چاہتے تھے میرے ایک عزیز جن کے مرحوم والد مجلس عاملہ کے رکن رہ چکے تھے اور جن سے قائدِ اعظم کے بڑے گہرے تعلقات تھے، میرے ہمراہ قائدِ اعظم سے ملنے گئے۔ وہ ایک ملازمت کے لئے ایک سفارشی خط قائدِ اعظم سے لینا چاہتے تھے۔ ان کے اس سوال پر قائدِ اعظم نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ جب وہ پہلے پہلے کراچی سے بمبئی وکالت کرنے آئے تو تین سال بڑی عسرت سے گذارے جب ایک انگریز دوست نے ان کو چند ماہ کے لئے عارضی پریذنسی مجسٹریٹ کا عہدہ دلوادیا تو انہوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کرلیا اور جب عارضی ملازمت ختم ہوئی تو اس انگریز نے دوسری بار ایک مستقل ملازمت ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ کی پیشکش کی تو قائد نے شکریہ کے ساتھ رد کردیا کہ چند برس میں اپنے پیشہ میں اس سے زائد کماؤں گا۔ اس واقعہ کو سن کر میرے عزیز (جن کا انتقال ہوگیا ہے) اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ملازمت کا خیال ہی ترک کردیا۔ اور اپنے پیشہ وکالت میں خاصے کامیاب رہے!

قائدِ اعظم کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی کا احسان اس وقت تک لینا نہیں چاہتے تھے جب تک وہ اس احسان کا بدلہ خود نہ کرسکیں۔ ایک دفعہ ہم لوگ بیٹھے تھے کہ کسی صاحب نے قائدِ اعظم سے ان کے پرانے مکان کا ذکر چھیڑا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا وہ مکان کسی اور جگہ تھا تو قائدِ اعظم نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ جس طرف مکان کا رخ تھا وہ زمین سرکاری تھی اور پی ڈبلیو ڈی کا دفتر تھا۔ دفتر والوں نے شرارت سے اس سامنے والی زمین پر ملازموں کیلئے پائخانے بنوانے شروع کردیئے تو بجائے اس کے کہ میں افسر بالا سے شکایت کروں اور کہوں کہ وہ اُن کا رخ بدل دیں۔ میں نے اپنے مکان کا رخ ہی بدل دیا اور اسی وقت قصد کیا کہ نیا مکان کسی اور جگہ بنواؤں گا۔ چنانچہ لندن سے واپسی کے بعد نیا مکان مالابار ہل پر بنوایا جہاں اس وقت ہم سب بیٹھے ہیں!

ہند و پاکستان کی سیاسی شخصیتوں میں قائدِ اعظم کی شخصیت یکتائے روزگار رہے کہ ان پر کبھی کسی نے کسی قسم کی خرد برد کی الزام تراشی نہیں کی۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی رقم کی بھی رسید بھیجتے تھے۔ قائدِ اعظم گو آج ہم میں جسمانی طور پر نہیں ہیں مگر ان کی روح آج بھی نگران ہے۔

ماؤزے تنگ کو سلام

ادارہ

چین کے عظیم راہنما اور ۸۰ کروڑ چینی عوام کے نجات دہندہ ماؤزے تنگ پچھلے دنوں انتقال کر گئے۔ وہ بلاشبہ ایشیاء کے عظیم ترین فرزند تھے، انہوں نے گراں خواب چینیوں کو فکر و عمل کی وہ حرارت بخشی جس نے انہیں خود آگہی اور تیقن عطا کرنے کے ساتھ ظلم و استحصال سے نجات حاصل کرنے کا جویا بنا دیا۔ ایک مختصر مدت میں انہوں نے قومی تعمیر کے لئے وہ کچھ کر دکھایا جو صدیوں کے مسلسل عمل سے بھی تکمیل کو نہیں پہنچتا۔

وزیر اعظم بھٹو نے جو سیلاب سے متاثرہ اپنے عوام کی دلجوئی اور خدمت کے لئے دریائے سندھ کے دائیں کنارے کا دورہ کر رہے تھے۔ اس افسوسناک خبر کو سن کر فرمایا:

"ماؤزے تنگ جیسے لوگ ایک صدی بلکہ ایک ہزار سال میں پیدا ہوتے ہیں یہ لوگ دنیا کی قیادت پر چھا جاتے ہیں اور تاریخ ساز ہوتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ چیئرمین ماؤزے تنگ عظیم لوگوں میں سب سے عظیم تھے انہوں نے انتہائی مختصر عرصہ میں تاریخ کو مسخر کر لیا۔ ان کے افکار اور ان کی شخصیت نے لاکھوں انسانوں کے دلوں پر گہرے نقوش ثبت کئے ہیں ــــ ماؤزے تنگ انقلاب کی پیداوار بلکہ انقلاب کی روح اس کا نعرہ اور اس کے محرک تھے وہ ایک نئے تابناک دور کے معمار تھے جس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کے افکار رہتی دنیا تک لوگوں اور قوموں کو راہنمائی فراہم کرتے رہیں گے۔"

آگے چل کر وزیر اعظم نے فرمایا:

"آج دنیا ماؤزے تنگ کی موت پر نوحہ کناں ہے لیکن کل جب سورج طلوع ہوگا تو لوگ اس کی تعریف کے گیت گائیں گے ــــ ہم پاکستانی ماؤزے تنگ کو سلام کرتے ہیں۔"

صدر مملکت جناب فضل الٰہی چودھری نے وزیر اعظم چین کے نام اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا:

"ہم نے چیئرمین ماؤ کی وفات کی خبر انتہائی دکھ سے سنی۔ وہ چینی انقلاب کے بانی تھے جس نے دنیا کے چوتھائی عوام کی زندگیاں تبدیل کر دیں۔ بلاشبہ وہ بہت بڑے راہنما تھے جنہوں نے ایک مدبر اور سیاسی مفکر کی حیثیت سے انسانی تاریخ کے صفحات پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

ان کی موت نہ صرف چینی عوام کے لئے بلکہ پوری
دنیا کے لئے ایک عظیم نقصان ہے۔ پاکستان کے
عوام انہیں ہمیشہ ایک مخلص اور قابل اعتماد دوست
کی حیثیت سے یاد رکھیں گے۔"

ماؤزے تنگ ۲۶ دسمبر ۱۸۹۳ء کو چین کے صوبہ ہیسانگ تان سین کے ایک گاؤں سؤاشن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک غریب کسان تھے۔ ماؤ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں حاصل کی پرائمری اسکول میں پانچ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے کھیتوں میں کام کرنے لگے۔ ابتدا ہی سے انہیں تعلیم سے عشق تھا اسی لئے انہوں نے محنت ومشقت کے ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی اور نجی طور پر کتابیں پڑھتے اور اپنی فراست اور دانائی میں اضافہ کرتے رہے۔ پھر تین سال گھر پر رہنے کے بعد وہ گھر کے تنگ ماحول اور باپ کی سخت گیری کے باعث گھر سے بھاگ گئے اور کام کاج کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اسکول میں تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔

۱۹۱۱ء میں ماؤزے تنگ، چانگ شا چلے گئے جہاں تقریباً دس سال وہ مقیم رہے۔ انہوں نے مانچو خاندان کی حکومت کے زوال کو اپنے نظروں سے دیکھا اور حب الوطنی کے جذبے کے تحت انقلابی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک ہوگئے ۱۹۱۲ء میں وہ اس فوج سے علیحدہ ہوگئے اور واپس اپنے اسکول پہنچ گئے۔ اس تاریخی شہر میں انہوں نے علم کے موتی جہاں میسر آئے اپنے دامن میں خوب خوب سمیٹے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ نارمل اسکول میں داخل ہوئے اور یہاں انہوں نے معلمی کی تربیت حاصل کرنا شروع کی۔ مگر بعض وجوہ کی بناء پر اس تعلیم کو انہوں نے ہونان کے نارمل اسکول میں مکمل کیا۔

۱۸ - ۱۹۱۷ء میں ماؤ اور ان کے چند ساتھیوں نے ایک اسکول کی بنیاد رکھی جہاں نوجوانوں کو سیاسی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس اسکول نے چین میں انقلابی ذہن تیار کرنے میں بڑی مدد دی۔

۱۹۱۸ء میں ماؤ پیکنگ کی ایک لائبریری میں اسسٹنٹ ہوگئے یہاں انہیں نوجوان انقلابیوں کی صحبتیں میسر آئیں۔ ماؤ پیکنگ میں ایک سال کے لگ بھگ رہے پھر شنگھائی چلے گئے جہاں مختصر قیام کے بعد وہ چانگ شا چلے گئے۔ چانگ شا میں انہوں نے ایک اخبار کی ادارت سنبھال لی اور نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کی۔ حکام نے ایک ماہ کے بعد ہی اس اخبار کو بند کر دیا۔ انہوں نے دوسرا اخبار نکالا مگر جلد ہی یہ بھی بند کر دیا گیا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں ماؤ بڑے واضح انداز میں میدان سیاست میں اتر آئے اور انہوں نے پہلی بار طلباء کی ایک ہڑتال کی قیادت کی صوبے کے گورنر نے ماؤ کو صوبہ بدر کر دیا۔ اور مجبوراً اب انہیں پھر شنگھائی کا رخ کرنا پڑا۔ یہاں ان کی ملاقاتیں مارکسزم کے حامیوں سے ہوئیں اور ان ہی کی تلقین سے انہوں نے مارکس کے افکار کا مطالعہ شروع کیا۔

۱۹۲۰ء میں ماؤ ایک بار پھر چانگ شا پہنچے جہاں انہیں ایک پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا گیا۔

۱۹۲۰ء میں چین میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ماؤ نے جو مارکسزم کے مطالعے سے کمیونسٹوں کے حامی بن گئے تھے چانگ شا میں کمیونسٹ پارٹی کا ایک سیل اور یوتھ لیگ قائم کر دی۔ کمیونسٹوں کی پہلی کانگریس کا اجلاس شنگھائی میں جولائی ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ ماؤ نے اس اجلاس میں سیکرٹری کے فرائض ادا کئے۔ اس کے بعد انہیں ہونان میں پارٹی کا سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔

جون ۱۹۲۳ء میں ماؤ نے کینٹن میں تیسری کمیونسٹ کانگریس میں شرکت کی اس کانگریس میں ماؤ کو پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کا رکن مقرر کر لیا گیا۔ ۱۹۲۴ء کے اواخر تک ماؤ شنگھائی میں رہے۔

مئی ۱۹۲۵ء میں ان کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب آیا۔

انہوں نے سوچا محنت کشوں اور مزدوروں کے علاوہ کسانوں کی قوت کو منظم کرنا پارٹی کا اولین مقصد ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے بڑے خلوص اور لگن سے کسانوں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ان کی کوشش اور سرگرمیوں سے حکومتِ وقت سخت چوکنا ہوگئی اور ۱۹۲۵ء میں انہیں ایک مرتبہ پھر صوبے سے نکال دیا گیا۔

جنوری ۱۹۲۶ء میں ماؤ کو چین کی تحریکِ آزادی کومنتانگ کے پراپیگنڈے کے شعبے کا سربراہ منتخب کر لیا گیا اور فروری میں انہیں کسان کمیٹی کا رکن چُنا گیا۔ کومنتانگ اور کمیونسٹ اب تک ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے مگر اب ان میں اختلافات نمایاں ہونے لگے تھے اور جب ۱۹۲۶ء میں کومنتانگ کے سربراہ چینگ کائی شیک نے محنت کشوں کے خلاف بعض سخت اقدامات کئے تو ماؤ کو مشکوک سمجھتے ہوئے انہوں نے انہیں شعبہ نشر واشاعت کے عہدے سے ہٹا دیا۔

مستقل مزاج ماؤ اس سلوک سے شکست قبول کرنے والے نہیں تھے انہوں نے کسانوں کی تربیت کے اسکول میں اپنے خیالات کی زبردست تبلیغ کی۔ یہ ادارہ کمیونسٹوں کا اڈہ بن گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ماؤ کینٹن چلے گئے۔ اب وہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کسان کمیٹی کے صدر تھے۔ اس حیثیت میں انہوں نے لمبے دورے کئے اور زبردست تقاریر سے کسانوں کو منظم کیا۔

۱۹۲۷ء میں کچھ عرصے تک انہوں نے کسانوں کی حالت زار کا جائزہ لیا اور اپنی مشہور عالم رپورٹ لکھی۔ اس رپورٹ میں انہوں نے آخر میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن غریب کسان بڑے زمینداروں کے استحصال کا خاتمہ کر دیں گے۔

۱۹۲۷ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی پانچویں کانگریس ہوئی ماؤ نے اس کانگریس میں جب کسانوں کی طرف توجہ نہ پائی تو وہ اس کے جلسوں میں شریک نہ ہوئے۔

کمیونسٹوں اور کومنتانگ کے مابین اشتراک ختم ہونے لگا۔ اور اس کے نتیجے میں ۱۹۲۷ء میں کمیونسٹوں نے نانکنگ میں مسلح بغاوت کر دی۔

دسمبر ۱۹۳۱ء میں جنرل چینگ کائی شیک نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ کمیونسٹ باغیوں کو کچل دیں۔ مگر ماؤ نے چینگ کی اس مہم کو ناکام بنا دیا۔

ماؤ نے اب پہاڑی علاقوں میں اپنی گوریلا فوج کی تنظیم شروع کی۔ نومبر ۱۹۳۱ء میں عوامی جمہوریہ چین کا اعلان کمیونسٹوں کی جانب سے کیا گیا اور ماؤ اس کے چیئرمین مقرر کئے گئے۔

کومنتانگ نے اب ماؤ کے ساتھیوں پر ہر طرف سے یورش کر دی حالات اتنے نازک ہوگئے کہ ماؤ کو آخر وسط ۱۹۳۴ء میں چھ ہزار میل لمبا پیادہ عظیم مارچ کرنا پڑا جسے تاریخ میں لانگ مارچ کہا جاتا ہے۔ یہ مارچ ایک سال جاری رہا اور اس میں بے پناہ جانی نقصان ہوا۔ اس لانگ مارچ کے بعد ماؤ نے بچے کھچے سپاہیوں کو دوبارہ ایک زبردست گوریلا جنگ کے لئے منظم کیا۔ انہوں نے تمام علاقے کے کسانوں کو منظم کر کے ان کے دستے ترتیب دیئے اور اس طرح دس ہزار سے زیادہ فوج اکٹھی کر لی۔

۱۹۳۰ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ لائی لائی سان مقرر ہوئے۔ ماؤ ان کے خیالات سے ہم آہنگ نہ تھے۔ تاہم طویل بحث و مباحثہ کے بعد انہوں نے لائی لائی سان کے منصوبوں پر طوعاً و کرہاً صاد کر ہی دیا۔ اور جون ۱۹۳۰ء میں اپنے فوجی دستوں کی تنظیم نو کے بعد انہوں نے ہونان کے دارالحکومت چانگ شا پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۳۵ء میں ماؤ کومنتانگ سے مل کر جاپانی حملہ آوروں کو پسپا کرنے میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ ۱۹۴۵ء میں جب جاپانیوں کا زور ٹوٹ گیا تو کومنتانگ اور کمیونسٹوں نے شمالی چین پر اپنا اپنا قبضہ مستحکم کرنا شروع کر دیا اور یوں ایک مرتبہ پھر کومنتانگ

اور کمیونسٹوں میں تصادم شروع ہوگیا۔ سرخ فوج منچوریا پر قابض ہوگئی اور اب چین میں زبردست خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اور بالآخر کمیونسٹوں نے میدان مار لیا اور ۱۹۴۹ء تک چیانگ کائی شیک کی فوجوں کا صفایا ہوگیا اور انہوں نے اپنے حامیوں کے ساتھ جزیروں میں پناہ لے لی اور ماؤ نے عوامی جمہوریہ چین کے قیام کا اعلان کر دیا۔ جس کے صدر وہ خود تھے۔ اور وزیرِ اعظم چواین لائی۔

ماؤ نے اس آزادی کے لئے ذاتی حیثیت سے بڑی عظیم قربانیاں دیں۔ ان کے دو بھائی انقلابی جدوجہد میں کام آئے ان کی بہن اور ان کی بیوی کو پھانسی دے دی گئی اور ان کا بیٹا کوریا کی جنگ میں مارا گیا۔

ماؤ کے لائے ہوئے انقلاب کا سب سے بڑا پہلو وہ معاشرتی انقلاب ہے جس نے ایک نئے مثالی بین الاقوامی اخلاق اور حکمت عملی کو جنم دیا۔ انہوں نے اپنے حامیوں اور ہموطنوں کو صاف لفظوں میں ہدایت کی کہ وہ سیدھا راستہ اختیار کریں اور کسی قسم کی چودھراہٹ یا بالا دستی قائم کرنے کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔ اپنی تمام تر طاقت ملکی پیداوار بڑھانے اور محنت کش طبقے کی جمہوریت قائم کرنے پر صرف کریں۔ موجودہ چین کا معاشرہ اور اقتصادی نظام ماؤ کے افکار کی زندہ تصویر ہے۔

غزل

غلام محمد قاصر

یوں تو صدائے زخم بہت دور تک گئی
اک چارہ گر کے سامنے جا کر بھٹک گئی

خوشبو، گرفتِ عکس میں لایا اور اس کے بعد
میں دیکھتا رہا تری تصویر تھک گئی

گل کو برہنہ دیکھ کے جھونکا نسیم کا
جگنو بجھا رہا تھا کہ تتلی چمک گئی

میں نے پڑھا تھا چاند کو انجیل کی طرح
اور چاندنی صلیب پہ آکر لٹک گئی

روتی رہی لپٹ کے ہر اک سنگ میل سے
مجبور ہو کے شہر کے اندر سڑک گئی

اب تلخ ذائقوں کے تعاقب میں ہے زباں
مدت ہوئی شراب سے مستی چھلک گئی

قاتل کو آج صاحبِ اعجاز مان کر
دیوارِ عدل اپنی جگہ سے سرک گئی

✳

ماؤزے تنگ کے دیس میں

قیصر سلیم

مجھے ۱۹۶۶ء کے اوائل میں دو ماہ کے لئے چین جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں پر میں صرف انہی تفصیلات کو درج کر رہا ہوں جو زمین اور زراعت سے متعلق ہیں۔ پیکنگ کے نواح میں ہم پیپلز کیمون PEOPLES COMMUNE دیکھنے گئے۔ کیمون کے ڈائرکٹر نے بڑا پر تپاک خیر مقدم کیا ان کے دفتر کی عمارت ویسی ہی تھی جیسی کہ عام طور پر دیہاتوں میں ہوتی ہے۔ ہال میں کرسیوں پر بٹھانے کے بعد ہمیں چین کی مخصوص چائے سے نوازا گیا۔ اس کے بعد ڈائرکٹر نے اپنے کیمون کی تفصیلات بتائیں جو یہ ہیں:۔

کیمون کا رقبہ ۵۷۵۰ ایکڑ ہے۔ ۵% زمین نجی پلاٹوں کے لئے مختص ہے۔ پانچ پیداواری بریگیڈ ہیں کل آبادی بیالیس ہزار ہے جن میں کام کرنے والے (ABLE BODIED) انیس ہزار ہیں، نو ہزار سے اوپر مکانات ہیں۔ سالانہ پیداوار ۱۲۵ ملین کیلوگرام (تقریباً ۳۳,۷۵,۰۰۰ من) ہے سات ورکشاپ ہیں ۳۱ ٹریکٹر ۴۵ ٹرک اور ۴۵۲ بجلی کے پمپ ہیں۔ ابتداء میں حکومت نے تین لاکھ یوآن (چھ لاکھ روپئے) خرچ کئے ہیں۔ کل پیداوار کا ۴۳% بطور ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ بقیہ میں سے کیمون کے جملہ اخراجات منہا کر کے کام کی اکائیوں (WORK POINTS) پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

جن گھرانوں میں زیادہ کام کرنے والے ہیں وہ نسبتاً خوشحال ہیں۔ چنانچہ ۶۰% گھرانوں کے پاس ریڈیو ۲۰% گھرانوں کے پاس سلائی مشینیں اور ۸۰% کے پاس سائیکلیں ہیں۔ جو کارکن سب سے زیادہ اکائیاں حاصل کرتا ہے اسے ڈائرکٹر کی سفارش پر ایک بڑی تقریب میں LABOUR HERO کا اعزاز عطا کیا جاتا ہے۔

اس موقع پر ہم نے یہ سوال اٹھایا کہ ایسے گھرانے بھی ہو سکتے ہیں جن میں کوئی کام کرنے والا نہ ہو، صرف بوڑھے رہ گئے ہوں، ان کی گزر اوقات کے لئے آپ کے پاس کیا انتظام ہے؟ جواب ملا کہ ایسے افراد کے لئے کیمون کی جانب سے پانچ ضمانتیں مہیا کی جاتی ہیں جن میں کھانا، کپڑا، رہائش، طبی امداد اور سردی سے بچاؤ کے لئے کوئلہ اور لکڑی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد ڈائرکٹر نے بتایا کہ مہینے میں دس دن وہ بذاتِ خود کھیتوں میں جا کر کام کرتے ہیں اور یہ نظم و نسق کے لئے بیس دن کافی ہیں لوگوں کے ذاتی مکان ہیں جن میں وہ اپنے ذاتی استعمال کے لئے مویشی رکھ سکتے ہیں، مرغیاں پال سکتے ہیں اور سبزیاں اُگا سکتے ہیں اس کیمون میں نوے اقسام کی سبزیاں پیدا کی جاتی ہیں برفباری کے زمانے میں بھی سبزیاں اگائی جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے آٹھ سو HOT HOUSES تعمیر کئے گئے ہیں۔

ان معلومات کے بعد ہم کیمون کی سیر کو نکلے ۔ سب سے پہلے ہم نے ایک HOT HOUSE دیکھا جو اندازہ ہے کہ پچاس گز لمبا اور بیس گز چوڑا ہوگا دیواریں کچی تھیں اور صرف ایک دروازہ تھا ۔ چھت شیشوں کی بنی ہوئی اور ڈھلوان تھی ۔ ڈھلوان کافی تھی تاکہ برف پگھل کر آسانی سے نیچے چلی جائے اور دھوپ اور روشنی اندر آتی رہے ۔ نگراں ایک بڑے میاں تھے ۔ اندرونی حصہ گرم رکھنے کے لئے ایک کونے میں چولہا تھا جہاں سے تمام حصے میں گرمی پہنچانے کے لئے کھپریلوں کے پائپ کا انتظام تھا ۔ درجۂ حرارت کو خاص حد تک رکھنے کے لئے ہاتھ دو ہاتھ فاصلے پر بندھے ہوئے بانس کی قمچیوں میں تھرمامیٹر بھی لگے ہوئے تھے ۔ ایک اور خاص بات یہ بھی دیکھی کہ کھیرے وغیرہ کے ابتدائی پھلوں کے ساتھ ، دھاگے سے بندھی ہوئی مٹی کی گولیاں بھی تھیں ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس طرح پھل سیدھا سڈول اور لمبا ہوتا ہے غرضیکہ شدید برفباری میں بھی انہوں نے ٹماٹر ، مرچیں ، کھیرے ، ککڑیاں ، ساگ اور سلاد وغیرہ اگانے کا انتظام کر رکھا تھا جن کی مانگ شہروں میں ہمیشہ رہتی ہے ۔

یہاں سے ہم ، ان کے ذاتی مکانات دیکھنے گئے ، پہلا مکان کافی بڑا تھا ۔ تیرہ کوٹھریاں تھیں ، کمپاؤنڈ بھی بڑا تھا جہاں ایک ہینڈپمپ تھا اور سبزی کے پلاٹ بنے ہوئے تھے ۔ ایک بڑے میاں بھی تھے اور بچکانہ پاؤں والی بڑی بی بھی تھیں ۔ دونوں نے بڑے خلوص اور تپاک کا اظہار کیا ، پھر ایک خاتون آئیں اور انہوں نے تفصیلات بتائیں ۔ جوان لڑکیاں دور دور سے دیکھتی رہیں ۔ سب کی سب سمارٹ اور صحت مند نظر آئیں ۔ ان کے پاؤں قد کے مطابق نارمل تھے خاتون نے بتایا کہ ان کے یہاں ۱۶ افراد ہیں جن میں پانچ کام کرنے والے اور بقیہ بچے اور بوڑھے ہیں ۔ دوسرے مکان میں گئے تو بتایا گیا کہ اس مکان میں آٹھ افراد ہیں ۔ پانچ تو کیمون میں کام کرتے ہیں ، ایک ٹیچر ہیں اور دو شہروں میں ہیں ۔ تیسرے مکان میں صرف دو کمانے والے بقیہ نو افراد بوڑھے اور بچے تھے ۔

کیمون کے تمام علاقے پر نظر ڈالنے سے ایسا معلوم ہوا کہ زمین کا کوئی حصہ بے کاشت نہیں چھوڑا گیا ہے ۔ حتیٰ کہ سڑک کے کناروں تک کھیتی کی جا رہی ہے بعد میں جب وہاں موسم بہار شروع ہوا تو ہم نے گندم کے پودے ہر طرف ابھرتے دیکھے ۔ یہاں تک کہ پہاڑوں پر بھی گندم کے پودوں کی ہریالیاں نظر آئیں ۔

ایک روز قومی زراعتی نمائش کا مرکز (NATIONAL AGRICULTURAL EXHIBITION CENTRE) دیکھنے گئے یہ مرکز دس بڑے ہال پر مشتمل ہے اور یہ بھی آزادی کی دسویں سالگرہ کے موقع پر یعنی ۱۹۵۹ء میں کل دس مہینوں میں تعمیر ہوا ہے بے شمار اشیاء دیکھنے کے بعد ہمیں TAIZAI BRIGADE کا کارنامہ دکھایا گیا ۔ دیوار پر ایک بڑے نقشے میں اس علاقے کی تصویر تھی ۔ پہاڑوں پر کھیتیاں بنانے کا سب سے پہلا تجربہ یہیں کیا گیا ۔ پارٹی کے سیکرٹری کی تصویر بھی بڑے نمایاں طور پر دکھائی گئی تھی ۔ معلوم ہوا کہ ان ہی کی رہنمائی میں یہ کام انجام کو پہنچا ہے ۔

دوسری جانب سیم و تھور دور کرنے کی ترکیبیں تصویروں اور نقشوں کے ذریعے واضح کی گئی تھیں یہ چونکہ ہمارے لئے بھی ایک مسئلہ ہے ۔ اسلئے ہم نے اس میں خاص دلچسپی لی ۔ ڈیمانسٹریٹر ، جو ایک خاتون تھی ، نے بتایا کہ پورے سیم زدہ علاقہ میں مشرق تا مغرب ڈیڑھ میٹر گہرا اور شمال تا جنوب ڈھائی میٹر گہرا نالہ کھود دیا جاتا ہے تاکہ تمام علاقے کی نمی ان نالوں کے ذریعہ بہہ نکلے ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ گوار کے بیج بو دیتے ہیں اور جب یہ پودے بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کو سیم زدہ علاقے میں جوت دیتے ہیں ۔

قدرتی کھاد کا بھی عجیب انتظام کیا گیا ہے ۔ پانچ قسم کی فصلیں اس طرح الگ الگ قطار میں بوئی جاتی ہیں کہ ایک فصل تیار ہو تو اس کی پھلیاں کاٹ کر پودوں کو کھیت میں جوت دیتے ہیں جو دوسرے پودوں کے لئے کھاد کا کام دیتے ہیں ۔ اس طرح دوسری فصلیں بھی یکے بعد دیگرے کھاد کا کام دیتی ہیں ۔

یہاں ایک مچھلی بھی دیکھی جسے BABY FISH کہتے ہیں یہ پانی کے علاوہ خشکی میں بھی رہ سکتی ہے اور جب بولتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچہ رو رہا ہے۔

شہرت یافتہ بطخ (PEKING DUCK) بھی دیکھی جو دو مہینے میں FORCED FEEDING کے ذریعے سات کیلوگرام وزنی ہو جاتی ہے۔

کمیون نظام کا مظاہرہ صوبہ ہوپی میں بھی دیکھنے میں آیا جہاں کئی کمیون مل کر دریا کا رُخ تبدیل کرنے میں مصروف تھے۔ یہ کارروائی بھی سیم و تھور کا خاتمہ کرنے کے لئے کی جا رہی تھی۔

یہ تو تھا آنکھوں دیکھا حال۔ اب اس سلسلے کی ایک فلم کا بھی ذکر سنئے پیکنگ سے دیوار چین جاتے ہوئے ایک ذخیرۂ آب MING RESERVOIR تعمیر کیا گیا ہے اس فلم میں چیئرمین ماؤزے تنگ، وزیراعظم چو این لائی اور مارشل چو تہہ کو کام کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ حضرات بہنگی کو کندھے پر رکھے ہوئے مٹی ڈھوتے دکھائے گئے ہیں۔

کمیون نظام کی افادیت کا اندازہ چند چینی کتب کے مطالعے سے بھی ہوا۔ موسمی پیشین گوئیاں جہاں ریڈیو سے نشر کی جاتی ہیں وہاں کمیون کے اندر بھی موسمیات کا ایک شعبہ ہوتا ہے۔ ڈائرکٹر، ریڈیو رپورٹ کے بعد اپنے ماہر موسمیات سے بھی معلومات حاصل کرتا ہے۔ اب فرض کر لیجئے کہ ریڈیو نے ایک بڑے علاقے کے لئے آئندہ چوبیس گھنٹوں میں بارش کی پیشین گوئی کی ہے۔ اس کے بعد متعلقہ کمیون کے ماہر موسیات نے بھی اس کی تصدیق کر دی ہے لیکن ڈائرکٹر اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ اُن بزرگوں کی خدمت میں بھی جاتا ہے جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے کہ جو ضعیف العمری کے سبب کام کرنے کے قابل نہیں رہتے اور جو لاولد ہوتے ہیں لو جن کو کمیون کی طرف سے پانچ ضمانتیں دی جاتی ہیں اور جہاں انہیں سکونت دی جاتی ہے اس کا نام "HOUSE OF RESPECT FOR OLD MEN" ہوتا ہے۔ ان بزرگوں میں ایسے حضرات بھی ہوتے ہیں جنہیں بھیڑیں چرانے کا پچاس سالہ تجربہ ہوتا ہے یہ حضرات باہر نکل کر آسمان کو دیکھتے ہیں، ہواؤں کے رُخ پر نظر رکھتے ہیں اور زمین سے پتھر اُٹھا کر اُس کے نیچے کی نمی کا اندازہ لگاتے ہیں اس طرح اگر انہوں نے بھی تصدیق کر دی کہ کل بارش ہوگی تو ڈائرکٹر اپنے پیداواری بریگیڈوں کو ہدایت دیتا ہے کہ فلاں مقام پر جو کئی سو ایکڑ زمین تیار ہے آج کے آج اس میں شکر قندی بو دی جائے ــــ اس قدر احتیاط اور اعتماد کے بعد دوسرے دن بارش یقیناً ہو جاتی ہے اور شکر قند کے پودے لہلہا اُٹھتے ہیں۔

جب کہر پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو کمیون والے پودوں کی حفاظت کے لئے ہزاروں من سوکھی گھاس اور پیال جلا دیتے ہیں۔ تاکہ پودوں کو نقصان نہ پہنچے۔ ہدایت ملتے ہی بیل گاڑیوں کا قافلہ چل پڑتا ہے۔ لیکن اس اعلان کے لئے مقامی ماہر موسمیات کو اپنے آلات کے ذریعے سو فیصد درستگی کا یقین کر لینا پڑتا ہے تاکہ غلط پیشین گوئی کے سبب کمیون کو نقصان نہ اُٹھانا پڑے۔

تیسری دنیا۔ اتحاد کا تقاضا

قائدِ عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو

آج بین الاقوامی سطح پر انسانی امور میں اصل مسئلہ غریبوں اور امیروں کے درمیان تقسیم کا ہے۔ ایک طرف تو لکڑیاں کاٹنے والے اور مشکوں کے ذریعہ پانی پہنچاتے والے ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہیں اس سیارے کے وسائل پر مکمل قدرت حاصل ہے اس تقسیم کی حقیقت کو جسے بعض اوقات شمال اور جنوب کی باہم صف آرائی کہا جاتا ہے، پچھلے تین سال کی تبدیلیوں نے مزید اجاگر کر دیا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ اس تقسیم کو ایسی خلیج تصور کر لیا جائے۔ جسے پاٹا نہ جا سکے۔ یہ ایک انوکھی صورت حال ہے جس کے ہم شاہد ہیں اور یہ اس کے سوا اور کسی بات کا تقاضا نہیں کرتی کہ قوموں کے ان دو طبقوں کے درمیان ایک تعمیری گفت و شنید ہو۔ اس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ بین الاقوامی مفاہیم میں مساوات کے منصفانہ اقتصادی نظاموں کو حقیقت کا جامہ پہنایا جائے۔ اور ان طبقاتی جھگڑوں کو طے کیا جائے جن میں شمال یا جنوب، مشرق یا مغرب کی بہت سی قوموں کی نیادتیں اس وقت اپنے نجی دائروں میں الجھی ہوئی ہیں۔

باوصف اس امر کے کہ اس کی مخالفت میں ظاہرا طور پر خاصا زور ہے۔ اس بات چیت کو اس انداز اور اس قسم کے پلیٹ فارم سے شروع کرنا باقی ہے جو کسی قطعی نتیجہ تک پہنچ سکے۔ اسے گڈ مڈ اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ ضابطہ سازیوں کے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گئی ہے اس لئے اب اسے یہ خطرہ لاحق ہے کہ لفاظی میں کہیں اس کا گلا گھونٹ نہ دیا جائے۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ اسے طاقت کی سیاست کی بساط میں ایک مہرہ، عسکری چال کا ایک اڈہ یا ایسے انتظامات کرنے کے لئے ایک آڑ بنایا جا سکتا ہے جو بذات خود ذلیل نہ ہوں لیکن جو تاریخی مسئلہ کی مرکزیت کو مسخ کرتے ہیں۔

اس مکالمہ کو گڈ مڈ کرنے کے کیا اسباب ہیں؟ انہیں منظرِ عام پر لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس حیرت انگیز کام کی خوبی سے انکار کیا جائے جو ۷۷ ممالک کے گروپ کے زیر اہتمام کیا گیا ہے جس کی عکاسی منشور الجیئرز اعلان لیما (پیرو) ایکشن پروگرام، اعلان ڈاکار (سینیگال) کے فیصلوں اور اعلان منیلا میں کی گئی ہے۔ نہ ہی یہ ان قرار دادوں کی قدر و قیمت کو کم کرتا ہے جو غیر جانبدار ملکوں نے قاہرہ، جارج ٹاؤن، الجیئرز، لیما اور سب سے حال ہی کولمبو میں، اقتصادی مسائل پر منظور کی ہیں۔ نہ ہی یہ ایک نئے اقتصادی نظام پر اس قسم کے مباحثے میں کوئی عدم دلچسپی ظاہر

کرتا ہے۔ جس کا آغاز اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے چھٹے خصوصی اجلاس میں کیا گیا تھا اور جس نے ساتویں خصوصی اجلاس میں کچھ ترقی کی۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ اس ساری کوشش نے سوچ کا صرف بنیادی ڈھانچہ تعمیر کیا ہے۔ تاکہ بین الاقوامی اقتصادی تعلقات کو انصاف کی وہ نئی سمت دی جائے جو تنہا انسانیت کو درپیش موجودہ چیلنج کا مناسب طریقے پر جواب دے سکتی ہے۔

انصاف کی یہ سمت اب تک حقیقت کا روپ کیوں نہیں دھار سکی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تیسری دنیا کی جانب سے اس کے لئے اب تک کوئی منظم تحریک نہیں چلائی گئی۔ اقوام متحدہ کے زیرِ اہتمام بین الاقوامی پلیٹ فارموں پر ترقی پذیر ممالک آپس میں یک جہتی کے جو مظاہرے کرتے ہیں وہ بلاشبہ اخلاص پر مبنی ہیں اور ان کو بخوبی محسوس کیا گیا ہے۔ تاہم ہم اپنے آپ کو اس عقیدے پر مائل نہیں کر سکتے کہ تیسری دنیا کی تمام توجہات اس اصل مسئلہ پر مرکوز ہیں جن سے یہ آج دوچار ہے۔ تیسری دنیا کی نفاق انگیز حالت تو اس حقیقت سے ہی عیاں ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کے سارے موجودہ گروپوں کی بنیاد اپنے ارکان کے علاقائی اور سیاسی تعلق پر ہے اور چونکہ وہ سب اپنی ذات کے اندر اس حد تک محدود ہیں اسی لئے وہ اس مسئلہ پر پوری توجہ نہیں دے سکتے جو سارے علاقوں پر محیط ہے اور سیاسی یا نظریاتی اختلافات سے بالاتر ہے۔ اسلامی کانفرنس، عرب لیگ، افریقی اتحاد کی تنظیم اور لاطینی امریکی ممالک کی اقتصادی تنظیمیں اپنے محدود منشوروں کی وجہ سے ایک خاص براعظم، علاقے یا عقیدے کے ملکوں تک محدود ہیں۔ لہٰذا وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتی ہیں کہ وہ ترقی پذیر ملکوں کے اقتصادی مفادات کا بحیثیت مجموعی ادراک کرتی ہیں۔ اور نہ ہی ایسا دعویٰ غیر جانب دار ممالک کا گروپ کرتا ہے اگرچہ اس گروپ نے اب اپنے آپ کو بڑھا کر ۸۰ سے زائد ارکان کا گروپ بنا لیا ہے۔ تاہم بہت سے ترقی پذیر ممالک اس حلقے سے اب تک باہر ہیں۔ اس گروپ کے آغاز کے وقت تشکیل کا جو اصول بڑی طاقتوں سے تعلقات سے منسلک کیا گیا تھا۔ اس کا کوئی نامیاتی تعلق آج تیسری دنیا کے بنیادی مقاصد اور جدوجہد سے نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ بیشتر غیر جانب دار ممالک کے رجحان کے برخلاف پچھلے برسوں میں بے انصافی کے ساتھ اس اصول کا اطلاق کیا گیا ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کے ایک گروپ اور دوسرے گروپ کے درمیان تقسیم سے صرف تیسری دنیا کی اجتماعی قوت گھٹ سکتی ہے۔ دونوں گروپ ایسے ممالک پر مشتمل ہیں جو شہنشاہیت یا نو استعماری غلبے کی سختیاں برداشت کر چکے ہیں اور جو بین الاقوامی اقتصادی ناانصافیوں کو ختم کرنے کی جدوجہد میں برابر کے شریک ہیں۔ میں خوش ہوں کہ اس حقیقت کا زبردست طریقے پر اظہار حالیہ کولمبو کانفرنس میں کیا گیا ہے۔ میری محترم دوست وزیراعظم سری لنکا نے غیر جانب دار ممالک کی اکثریت کے احساسات کی مستند طور پر ترجمانی کی۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ غیر جانب داری کی تحریک کوئی ’’خالصتاً‘‘ الگ کلب نہیں ہے‘‘ اور یہ کہ اگر کوئی خلوت پسندی ہے تو وہ ان ملکوں کی ہے جو کم مراعات یافتہ یا تہی دست ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ’’یہ صرف غیر جانبدار قومیں ہی نہیں ہیں جنہوں نے تبدیلی کے امکان کو محسوس کیا ہے بلکہ ساری تیسری دنیا اس وقت اپنی سیاسی اور اقتصادی قوت کو منظم کرنے میں مصروف عمل ہے تاکہ انحصار اور استحصال کے پرانے طریقوں کو تبدیل کیا جائے‘‘ ساری محروم قوموں کی جانب سے مشترکہ کارروائی کے لئے ایک وسیع تر بنیاد قائم کرنے کی ضرورت کا اس سے بہتر اقرار نہیں ہو سکتا۔

۲

ایک خاص مدت تک ترقی پذیر ملکوں کے اتحاد کی ضرورت دنیا میں اقتصادی قوت اور اثر و رسوخ کے تیز رفتار

اجتماع کے ظہور سے ماند پڑ گئی تھی۔ تیل پیدا کرنے والے ملکوں نے جب اپنے اس حق کا اظہار کیا کہ وہ اپنے بنیادی اور روز بروز کم ہونے والے وسائل پر کنٹرول کریں گے اور اس کی قیمت متعین کریں گے تو دُکھی انسانیت نے اُسے ایک صدیوں پرانی غلطی کی ڈرامائی طریقے سے اصلاح تصور کیا۔ اس سے یہ اُمید بھی پیدا ہوئی کہ وہ اس پرانے نظام کی جگہ جس میں ملکوں کے ایک گروپ کے بنیادی وسائل امیر تر ملکوں کی ترقی اور آسائشوں کے لئے کنٹرول میں رکھے جاتے ہیں انہیں کوڑیوں کے مول خریدا جاتا ہے اور بڑی بے دردی سے خرچ کیا جاتا تھا۔ ایک نیا نظام آئے گا جس میں یہ وسائل اپنے جائز مالکوں کے فائدے کے لئے کام میں لائے جائیں گے۔ لیکن یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ یہ تمام اُمیدیں خاک میں مل گئی ہیں۔ لیکن صرف ایک شے یعنی تیل کی قیمت سے متعلق جو تبدیلی ہوئی اس نے خود یہ ثابت کر دیا کہ مقصد کے اتحاد سے اور تیل پیدا کرنے والے ملکوں کی منظم سیاسی و اقتصادی قوتِ ارادی سے کیا نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ جب قومیں تاریخ کے موڑوں پر اپنے مشترکہ فائدے کے لئے متحد ہو جائیں تو دیرینہ ادارے ٹوٹ کر گر جاتے ہیں اور روایتی اقتصادی طریقے دم توڑ دیتے ہیں۔

ان تمام باتوں کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جب قومیں پارہ پارہ ہو جاتی ہیں۔ جب وہ مقصد کا اتحاد پیدا نہیں کر سکتیں تو وہ نہ صرف موجودہ بے انصافیوں کا برابر شکار رہتی ہیں بلکہ عالمی اقتصادی قوتوں کے عمل سے ان میں مزید اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ تیسری دنیا کے نو آزاد ملکوں کے لئے بین الاقوامی اقتصادی ماحول تو اس وقت بھی سازگار نہ تھا۔ جب انہیں خود مختار مملکتوں کی حیثیت حاصل ہوئی لیکن ان کی سیاسی آزادی کے عشروں کے دوران ان کے اور مالدار ملکوں کے درمیان اقتصادی ناہمواری حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں آج وہ اپنے اس اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے نقطۂ آغاز سے بھی پیچھے ہیں۔ اس قحط کا ذکر کیا جائے جس نے افریقہ کے کچھ حصوں میں حالیہ برسوں میں المناک طور پر بہت سی جانیں لی ہیں۔ ان کی خستہ حالی کی چند علامتوں میں۔ ایک تو بھوک ہے جس کا سایہ دوسرے ملکوں پر منڈلا رہا ہے اور وہ ادائیگیوں کے توازن میں مسلسل خسارے ہیں اور تجارت کی بد سے بدتر ہونے والی شرائط ہیں۔ جب ان میں سے کوئی گروپ ان بے انصافیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو مالدار ملکوں کی زبردست اقتصادی طاقت اپنا روپ دکھاتی ہے اور تجارت اور سرمایہ کے اداروں پر اپنی اجارہ داریوں کے سہارے یہ ممالک اندرونی اور بیرونی رد و بدل کے اثرات کو غریب تر قوموں کی جانب دھکیل دیتے ہیں۔ جب تیل کی قیمت بڑھی تو ترقی یافتہ ملکوں نے بحیثیت مجموعی کوئی خاص قربانی نہیں دی۔ انہوں نے کیا یہ کہ اپنی صنعتی پیداوار کی قیمتیں بڑھا دیں اور اس طرح تیل کے نام نہاد بحران کے بوجھ کو تیسری دنیا کی طرف واپس کر دیا۔ جب تیسری دنیا کی طرف سے برآمد کردہ بنیادی پیداواروں کی بات آتی ہے تو ترقی یافتہ ممالک ہی پھر قیمتوں کا تعین کرتے ہیں کیونکہ اصل منڈیاں انہی کے قبضے میں ہیں اور پیداواری کوٹوں پر اختلاف رائے اور دوسرے اسباب ترقی پذیر ملکوں کو اپنا اثر ڈالنے سے روکتے ہیں۔ اس عمل کو اس وقت تک روکا نہیں جا سکتا جب تک کہ سارے ترقی پذیر ممالک اپنے مقاصد کو مربوط نہ کر سکیں اور متحد ہو کر کام نہ کریں۔ گذشتہ پندرہ سال میں تیل کو چھوڑ کر جو تیسری دنیا کی برآمدات کا بیشتر حصہ بنتا ہے۔ بنیادی اشیاء کی قیمتوں میں حقیقی معنوں میں کافی حد تک کمی ہوئی ہے۔ اس پر مستزاد ان برآمدات کی قیمتوں میں شدید سالانہ اُتار چڑھاؤ ہے جس کا زیادہ تر دارومدار مالدار ملکوں میں ہونے والی اقتصادی سرگرمیوں پر ہے۔ جب کچھ ترقی پذیر ممالک مصنوعات بنانے کی صلاحیت پیدا

کر لیتے ہیں اور مصنوعات فروخت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو ان کی مصنوعات کو امتناعی کوٹے کے ذریعہ امیروں کی منڈیوں سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یہ سارے عوامل متعدد نتائج برآمد کرتے ہیں۔ ابتدائی اشیاء کی قیمتوں کے بارے میں غیر یقینی کیفیت غریب ترملکوں کی اقتصادی منصوبہ بندی کو جوئے کا کھیل بنا دیتی ہے۔ مصنوعات سے متعلق ان کی یہ پوزیشن، ان کے خود کفالت حاصل کرنے کے مقصد کو ناکام بنا دیتی ہے۔ امیر ترملکوں سے انہیں درآمدات کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم ادا کرنے کی ضرورت ان میں سے بہتوں کو قرض کے دلدل میں مزید پھنسا دیتی ہے۔ یہ ایسی صورت حال ہے جو ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان اشیا، مصنوعات، ٹیکنالوجی اور مالیات کے اقتصادی تبادلے میں بے رحمی سے اپنے آپ کو دُہراتی ہے اس کا مجموعی نتیجہ ترقی پذیر ممالک کا تقریباً مکمل انحصار ہے۔

ان ساری باتوں کے پیش نظر، یہ نظریہ روز افزوں طریقے پر پھیلایا جا رہا ہے۔ کہ غریبوں کی ترقی کا دارومدار امیروں کی مسلسل تیز ترقی پر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ صرف اسی صورت میں غریبوں کے مال کی منڈیاں بھی بڑھ سکتی ہیں اور ان کی اشیاء کی قیمتیں بھی برقرار رہ سکتی ہیں۔ یہ ایک تباہ کن نظریہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غریبوں اور امیروں کے درمیان خلا کو برابر بڑھتے رہنا چاہیئے۔ گویا امیروں کو اس کرۂ زمین کی دولت کا زبردست حصہ اپنے تصرف میں لاتے رہنا چاہیئے۔

دوسرے لفظوں میں اگر امیر ممالک محض مال کی ضرورت سے زیادہ بہتات کی وجہ سے اپنی ترقی کی رفتار میں قدرے کمی کر دیں تو غریب ممالک کے لئے کوئی اُمید نہیں۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ چاہے ہم اس نظریہ کی مذمت کرنے میں حق بجانب ہی ہوں۔ یہ موجودہ بین الاقوامی اقتصادی نظام کی مخصوص داخلی خصوصیت کو بیان کرتا ہے۔ یہ اس ناقابلِ انکار حقیقت کی عکاسی بھی کرتا ہے کہ ہماری تجارت کی شرائط ہماری منڈیاں اور ہمارے وسائل کے بہاؤ کا بہت زیادہ دارومدار امیر ترملکوں میں اختیار کی جانے والی اقتصادی اور سیاسی پالیسیوں پر ہے۔ اس نظام کے بنیادی سہاروں کو راتوں رات میں تو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس بات کی فوری ضرورت ہے کہ غریب ترممالک کو سانحہ کی صورت میں بیمہ مہیا کیا جائے۔ کم مراعات والے ممالک کے مستقبل کو بڑھتی ہوئی عدم مساوات پر انحصار کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کوئی ایک راہ نکالنا لازمی ہے تاکہ تیسری دنیا کے لئے تجارت کی شرائط بہتر ہوں، مالدار ملکوں میں کوٹے کی ناانصافیاں اور تجارتی پابندیاں دُور کی جائیں اور بیرونی قرضہ کا مفلوج کرنے والا بوجھ کم کیا جائے جو غریب اور امیر ملکوں کے درمیان زیادہ تر غیر مساوی تجارت اور تبادلے کا نتیجہ ہے۔

۳

ہم تیسری دنیا کے ممالک کو صدیوں کے عرصے کو عشروں میں نپٹنا ہے۔ ہمارے سامنے اُن ملکوں جیسے پُرسکون حالات موجود نہیں جنہوں نے بہت عرصہ پہلے انتہائی سازگار اور پُرامن فضا میں اپنی معیشتوں کو تعمیر کیا۔ ان ملکوں کے ہاں کوئی ایسے ادارے بھی نہیں تھے جنہیں گرانا ضروری ہوتا بلکہ یہ ایسے ادارے تھے جو بتدریج اصلاح اور سماجی تبدیلی کی مسلسل کارکردگی سے مطمئن ہو گئے۔ ہم ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس میں مواقع پیدا ہوں جس میں اپنے عوام کی غیر مراعات یافتہ اکثریت باعزت، باوقار اور پُر امید زندگی بسر کر سکے۔ ہم اپنے عوام کو بہتر معیارِ زندگی فراہم کرنے کے لئے خندہ پیشانی سے خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔ ہم فوری آرام و آسائش سے محرومی کو قبول کرتے ہیں لیکن اپنی قربانی کی قدر و قیمت کو ان اداروں اور رسومات کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے جو اپنے وجود کے اعتبار سے ہی ہمارے خلاف برسرپیکار ہیں۔ ہمارے عوام کی محنت کی قدر و قیمت اس ناہمواری کے باعث مسلسل کم ہو رہی ہے جو ہمارے اور امیر ملکوں کے اقتصادی تعلقات میں پائی جاتی ہے۔ ہم بمشکل وقت گزار رہے ہیں۔ اگرچہ ہمارے لئے اپنے معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں لانا ناگزیر ہے۔ لیکن ان کے لانے کے لئے حکمت عملی کی گنجائش بہت کم ہے۔ ۱۹۷۰ء سے شروع ہونے والے عشرے کے وسطی برسوں میں ترقی یافتہ ممالک میں جو بحران پیدا ہُوا

تھا اس کا بدترین اثر ہم پر پڑا اور ہماری ترقی کی رفتار برسوں پیچھے چلی گئی۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کئی ممالک میں فی کس آمدنی کم ہوگئی ہے۔ اگرچہ ان ملکوں میں سے بعض ملک پاکستان کی طرح اپنی ترقیاتی کوششوں کو برقرار رکھنے بلکہ انہیں تیز تر کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ تاہم اس کے نتیجے میں ان پر قرضوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا۔ چنانچہ ہمیں ایسی ترقی حاصل کرنی ہے۔ جس سے پیداواری عمل خود بخود جاری رہے۔ لہٰذا ہم سب کو چاہیئے کہ خارجی اقتصادی ماحول کا جائزہ لیں اور ہماری اجتماعی کمزوری سے خارجی اقتصادی ماحول کا جو تعلق ہے اس کا بھی جائزہ لیں تاکہ عالمی معیشت ہمارے لئے سمندری تھپیڑوں کا کردار ادا نہ کرے کہ تھوڑا سا سفر طے کرنے کے بعد یہ تھپیڑے ہمیں دھکیل کر وہیں واپس چھوڑ دیں۔ جہاں سے ہم نے اپنی منزل کی جانب سفر کا آغاز کیا تھا۔

۴

اگرچہ بے شمار بین الاقوامی اجتماعات میں ان بنیادی حقیقتوں کا اظہار کیا گیا ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے جواب میں باہمی انحصار کا احساس جسے قدرتی طور پر پیدا ہونا چاہیئے تھا نہ صرف یہ کہ وہ نہیں ہوا بلکہ اس کا اُلٹا ردِعمل ہوا۔ اس بات کا اندازہ امیر ملکوں کے بڑھتے ہوئے احساس خود پسندی سے لگایا جا سکتا ہے لہٰذا قوموں کی غربت کو ان موروثی نقائص کا نتیجہ بتایا جاتا ہے جو ان قوموں میں پائے جاتے ہیں اور اب تو ہمیں بار بار یہ دلیل بھی سننی پڑتی ہے کہ کم ترقی یافتہ ممالک اپنی زبوں حالی کے خود ہی ذمہ دار ہیں۔ امیر ممالک اپنے گروپوں اور انجمنوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنا رہے ہیں اور اب وہ تمام تر توجہ اپنے مفادات کو مستحکم کرنے پر مرکوز کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ ممالک بین الاقوامی مالی اصلاحات اور تجارت و وسائل کی منتقلی کے سلسلہ میں زیادہ تر آپس میں ہی معاملات طے کر لیتے ہیں اور اس ضمن میں ترقی پذیر ملکوں کا اثر محض برائے نام ہے۔

موجودہ بین الاقوامی اداروں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس عدم توازن کو درست کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بالکل غیر حقیقت پسندانہ بات ہے۔

وہ لوگ جو ان اداروں میں غیر ملکی امداد اور مالی امور سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس رجعت پسندانہ رویہ کا شکار ہوگئے ہیں جو امیر اور طاقتور ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ ان میں چوٹی کے جو ممالک ہیں ان کی مجموعی قومی پیداوار میں بیرونی امداد کا تناسب مسلسل کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ بین الاقوامی ادارۂ ترقی اور اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام جیسی تنظیمیں رقوم کی قلت کا شکار ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں کی برآمدات کے کوٹہ پر پابندیاں ختم کرنے کے لئے وہ مذاکرات بھی ناکام ہوگئے ہیں جو سالہا سال سے منعقد ہو رہے تھے۔ ترقی پذیر ملکوں کے خام مال کی برآمدات کی قیمتوں کو مستحکم اور بہتر بنانے کے سوال پر محض الفاظ کی جنگ ہو رہی ہے۔ چنانچہ قراردادوں کی شکل میں علاج کے بجائے محض سُن کرنے کی دوائیں دی جا رہی ہیں۔ جیسا کہ پیش گوئی کی گئی تھی، پیرس کانفرنس بھی افسوس ناک تعطل کا شکار ہے۔ جس سطح پر یہ ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ موجودہ چیلنج کا جواب دے سکیں۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں گفتگو ٹھوس مذاکرات کا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔

۵

ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ تیسری دُنیا کے ممالک کے درمیان بین الاقوامی اقتصادی نظام سے متعلق تمام موضوعات پر کوئی مشترکہ مفاد نہیں پایا جاتا۔ ان ملکوں میں بھی آپس کا اختلاف بیان کیا جاتا ہے۔ ایک طرف وہ ملک ہیں جن کا تعلق صرف اور صرف اشیاء سے ہے اور دوسرے وہ ملک ہیں جو نیم صنعتی ممالک کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرضوں میں کسی رعایت کا معاملہ ان ملکوں کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ جنہیں سرمائے کی منڈی تک براہ راست رسائی حاصل ہے

اور وہ صرف "قرضوں کے حصول کے لئے اپنی ساکھ" برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے تمام ترقی پذیر ملکوں کا مشترکہ مفاد ایک ہے۔ یعنی یہ کہ انہیں عالمی اقتصادی نظام میں برابری کا مقام ملنا چاہیئے۔ اس نکتہ پر ان کے درمیان جو اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ وہ تمام فروعی اختلافات سے بالاتر ہے۔ ایک ایک مسئلہ پر مکمل یگانگت کا ہونا اتحاد کے لئے کوئی ایسا ضروری نہیں، اختلاف کا مطلب مخالفت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یورپی مشترکہ منڈی کا اقتصادی اتحاد دیکھئے۔ جس کی پشت پر کئی اداروں کا ایک جال بچھا ہے اور جو مشترکہ سیاسی مقاصد کو فروغ دے رہے ہیں۔ یہ اتحاد ممبر ملکوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات سے کہیں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اتحاد کو باہمی رواداری سے پروان چڑھایا جاتا ہے۔ یہ اس احساس سے پیدا ہوتا ہے کہ عدم اتحاد کی صورت میں ہر ایک کے مفاد کو لازمی طور پر نقصان پہنچے گا۔

ہم تیسری دنیا کے ممالک بھی[6] اپنے مشترکہ مصائب پر متحد اور استحصال کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی ضرورت پر متفق ہیں۔ اپنے اندرونی سیاسی نظاموں یا خارجی نقطہ ہائے نظر سے قطع نظر ہمارے پاس ایک مشترکہ اختیار ہے وہ یہ کہ ہم دنیا کی اکثریت کو اس اقتصادی نظام سے نجات دلائیں جس نے ان لوگوں کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ ہمیں خود اپنی شخصیت کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس شخصیت کو اس ذہنی پراگندگی کا شکار نہ ہونے دیا جائے۔ جو طویل المیعاد مقاصد کو قلیل المیعاد مفادات سے ہم آہنگ کرنے میں ناکامی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ اگر ہم اپنی اقتصادی اور سماجی ترقی کے لئے باہمی تعاون کی حدود اور دائرۂ کار کا جائزہ نہیں لے سکے تو اس کے نتیجے میں ہماری شخصیت پر کوئی حرف نہیں آنا چاہیئے اس شخصیت کو اس سیاسی عزم کے فقدان کے باعث کمزور نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم ایک ایسے نظام کو تبدیل کرنے کے لئے مشترکہ قوت کو بھرپور طور پر بروئے کار نہیں لا سکے جس کا بنیادی ڈھانچہ ترقی پذیر ملکوں کے خلاف تعصب پر مبنی ہے۔

اس سیاسی عزم کا اظہار ہماری اجتماعی قیادت کی اعلیٰ ترین سطح کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ تیسری دنیا کے پاس ۷۷ ملکوں کے گروپ کا پلیٹ فارم موجود ہے جس سے وہ اپنی مشترکہ کوششوں میں رابطہ پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ گروپ تجارت و ترقی کے ادارے کے سیاق و سباق میں قائم کیا گیا تھا لہٰذا بعض اوقات گروپ کے مستقبل کے امکانات خود اس کے ابتدائی محرکات کے سبب محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ گروپ کی ساخت اور تشکیل کچھ اس قدر بوجھل اور بے ڈھب سی ہے کہ گروپ ان معاملات کا کوئی موزوں حل پیش نہیں کر سکتا جو تبدیلی لانے کے لئے ناگزیر ہو۔ ایک ایسی تنظیم جس کا دائرہ محدود ہو اور جو ترقی پذیر ملکوں کی سیاسی اُمنگ اور اقتدارِ اعلیٰ کی ترجمانی نہیں کر سکتی، اس تنظیم کو ان ملکوں کی حکمت عملی کی رہنمائی کا اہم کام نہیں سونپا جا سکتا۔

تیسری دنیا میں اپنی خوابیدہ اور دبی ہوئی قوت کے بارے میں احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے یہ شعور اور آگاہی اتنی واضح ہے کہ ہمارے دور کا انتہائی اہم مسئلہ نسلِ انسانی کی اکثریت کے لئے مواقع پیدا کرنا ہے۔ اس مسئلہ پر نام نہاد جانب دار اور نام نہاد غیر جانبدار ملکوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف ترقی یافتہ اور کم ترقی یافتہ ممالک کے درمیان ہے۔ اس فرق کی نشاندہی کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عالمی سطح پر طبقاتی جنگ کو کوئی دعوت دی جائے۔ اس مطالبے کا مقصد اقتصادی قوت کو از سرِ نو تقسیم کرنا ہے۔ کیونکہ صرف اسی طریقے پر ہی کشیدگی کا لامتناہی سلسلہ اور آئے دن کے انقلابات کو روکا جا سکتا ہے۔ اس دعوت کا مقصد عالمی برادری کی بقا کی وکالت کرنا ہے۔

ہم اس خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہیں کہ نیا اور منصفانہ اقتصادی نظام کسی ایک اجلاس یا کانفرنس کے نتیجہ میں وجود میں آ سکتا ہے۔ تیسری دنیا کو اقتصادی آزادی کے لئے وادیٔ پُرخار سے گزرنا پڑے گا۔ لیکن اس راہ کو آسان بنایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ تیسری دنیا کی قیادت جس کی پشت پر انسانی رائے عامہ کی بے پناہ قوت موجود ہو، متحد، منظم اور باعزم ہو۔

اس مقصد کے لئے میں نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ترقی پذیر ملکوں کی سربراہ کانفرنس بلانے کی اپیل جاری کی ہے۔ تاکہ تیسری دنیا کی قوموں کی پوری قوت کو یکجا کرکے انہیں بین الاقوامی اقتصادی استحصال سے نجات اور ظلم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے مشترکہ جدوجہد کو آگے بڑھایا جائے۔

اس اپیل کا براہ راست تعلق تیسری دنیا کے اتحاد کے تقاضے کو بڑھتے ہوئے احساس و اعتراف سے ہے۔ گذشتہ ماہ کولمبو میں غیر جانبدار ملکوں کی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہمارے دور کے اس اہم مسئلہ پر توجہ دی گئی۔ آئندہ ہفتے میکسیکو میں ترقی پذیر ملکوں کے نمائندوں کا وزارتی سطح پر اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔ جس میں ان ملکوں کے درمیان اقتصادی تعاون کو فروغ دینے کے ذرائع اور وسائل پر غور کیا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میکسیکو کانفرنس بھی اس منزل کا دوسرا سنگِ میل ثابت ہوگی۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس بھی اس ماہ کے آخر تک منعقد ہو رہا ہے۔ لہٰذا پاکستان کے لئے مناسب وقت آگیا ہے کہ وہ تیسری دنیا کی اس سربراہ کانفرنس کے انعقاد کے لئے اپنی اپیل کے پس منظر میں کارفرما بنیادی ملحوظات کی وضاحت کرے جو بنی نوع انسان کی غیر مراعات یافتہ اکثریت کے اتحاد کو یقیناً مستحکم بنائے گی۔

پاکستان اس کانفرنس کے انعقاد اور اس کی کارروائیوں کو ثمر آور بنانے کے لئے تمام ترقی پذیر ملکوں کے تعاون کا طلب گار ہے۔ ۲۰ سال سے زیادہ کا عرصہ گزرا ہے کہ نو آزاد ممالک کا اجلاس بنڈونگ (انڈونیشیا) میں ہوا اور وہاں وہ سیاسی اصول اور مقاصد مرتب کئے گئے جو بین الاقوامی معاملات میں ان کی رہنمائی کریں گے۔ عالمی سیاسی صورت حال کے خراب ہونے سے متعلق جو خدشات پائے جاتے تھے انہیں بنڈونگ کانفرنس نے غلط ثابت کر دیا۔ بلاشبہ اس کے اعلانات پُر امن بین الاقوامی تعلقات کا ایک بنیادی متن فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح تیسری دنیا کی سربراہی کانفرنس ارتقائی عمل میں ایک اہم قدم ہوگی۔

یہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قوموں کی سیاسی آزادی کے حصول کے بعد اگلے مرحلے میں داخل ہونے کی راہ دکھائے گی۔ یہ مرحلہ وہ ہوگا جب دنیا کی قوموں کے لئے مساوی مواقع فراہم کرنے کا دارومدار بڑی بڑی غیر ملکی امدادی رقوم کی صورت میں خیرات یا مخصوص تجارتی رعایتوں وغیرہ کے ذریعہ جزوی اصلاحات پر نہیں ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بھڑکتے ہوئے جذبات اور تباہ کن محاذ آرائی کا خطرہ نہ صرف ٹل جائے گا۔ بلکہ عالمی سطح پر شراکت کا امکان پیدا ہوگا۔ آخری تجزیہ میں ترقی پذیر ملکوں میں ہونے والی اقتصادی سرگرمیوں میں تیزی، ترقی یافتہ ملکوں کی فلاح و بہبود کے لئے بھی لازمی ہے۔ غریب ملکوں کی سربراہی کانفرنس ان کے اس عزم کا مظاہرہ کرے گی کہ وہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ معیشتوں میں اس مقصد کے حصول تک صرف ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہیں گے۔

صورت حال کا جائزہ لے کر مستقبل کے لئے ایک حکمت عملی اختیار کرکے اور موزوں ادارتی انتظامات کے ذریعہ تیسری دنیا کی سربراہ کانفرنس ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں تیسری دنیا کے ممالک کی پالیسیوں کو مربوط اور ان کی پوزیشن کو بحال کر سکتی ہے اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان تعاون کا کم سے کم متفقہ پروگرام مرتب کرکے اس پر عملدرآمد کرا سکتی ہے۔ اس طرح یہ علاقائی یا بین العلاقائی ترقی پذیر ملکوں کے مختلف گروپوں میں شروع کی ہوئی کوششوں کو مربوط اور ہم آہنگ کرے گی اور تیسری دنیا اس قابل ہو سکے گی کہ مضبوط تر ہو اور عالمی اقتصادی برادری میں اپنا جائز مقام حاصل کرے۔

تیسری دنیا کے پیغام کو گزرے ہوئے دور کی لفاظی کا جامہ نہیں پہنانا چاہیئے اور نہ اسے کسی ملک یا ممالک کے گروپ کے سیاسی مفادات کے مطابق تراشنا چاہیئے۔ اگر متمول اور مقتدر ممالک اپنی دولت اور ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر اپنا غلبہ برقرار رکھنے کے لئے متحد ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ نازک لمحات میں وہ ہمیشہ کرتے رہے ہیں تو

اگر غریب قومیں اپنی ہی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور مزید اور غریب کے درمیان خلیج پیدا کرنے میں اپنی نسبتاً محدود طاقت کو ضائع کرتی رہیں تو یہ انسانیت کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ تیسری دنیا کے افلاس زدہ عوام اپنی اجتماعی مرضی کے لئے ایک نئے محور کی تمنا کر رہے ہیں۔ وہ غیر انسانی سلوک کے خلاف انسان کی آخری فتح کے لئے جہاد کرنے کی غرض سے طاقت کے ایک نئے قلعہ کی تلاش کر رہے ہیں۔ یہ وقت کی ضرورت اور غریبوں کی ترجیح ہے۔ جو کانفرنس میرے تصور میں ہے اس میں شرکت کے لئے ایک اور صرف ایک فولادی کسوٹی ہوگی یعنی تیسری دنیا کی غیر ترقی یافتہ اور مظلوم برادری، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قومیں خواہ وہ جانب دار یا غیر جانب دار ہوں۔ اشتراکی یا غیر اشتراکی ہوں سفید، زرد یا سیاہ یا بھورے رنگ والی ہوں وہ اس مشن میں شریک ہوں گی اور بنی نوع انسان کے لئے ایک قانون کے تحت ایک دنیا کے مقصد کے حصول کی نقیب بن جائیں گی۔

غزل

—— خورشید انصاری

جیسے بگڑے ہوئے کچھ نقش ہوں تحریر نہ ہو
ایسا الجھا ہوا کوئی خطِ تقدیر نہ ہو

آشکارا کبھی حالِ دلِ دلگیر نہ ہو
یہ وہ اجمال ہے جس کی کوئی تفسیر نہ ہو

ساری دنیا کو جو سرِ رشتۂ آزادی ہے
وہ مرے پاؤں کی اتری ہوئی زنجیر نہ ہو

اپنی امیدوں کا انجام طلب کرتے ہیں
خواب کیوں دیکھیں اگر حسرتِ تعبیر نہ ہو

شوق ایسا کہ جو دل میں ہے وہ سب کچھ لکھ دوں
دل کا وہ حال کہ چاہوں بھی تو تحریر نہ ہو

اُن کی محفل میں بھی جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
بے گناہی بھی وہاں قابلِ تعزیر نہ ہو

اتفاقاً مری تقدیر جو تم بن جاؤ
پھر زمانے میں مجھے شکوہ تقدیر نہ ہو

میری دیوانگیٔ شوق کو رسوا نہ کرو
کم سے کم جرمِ محبت کی تو تشہیر نہ ہو

روح کا حسن نمایاں نہیں ہوتا ہرگز
یہ وہ جلوہ ہے جو منتِ کشِ تصویر نہ ہو

چاہتا ہوں کہ زمانے میں محبت کے سوا
کوئی خنجر نہ ہو تلوار نہ ہو تیر نہ ہو

دن ڈھلا جاتا ہے خورشید نکلئے گھر سے
میکدے جاتے ہیں بے وجہ کی تاخیر نہ ہو

برقاب

شیر افضل جعفری

شیر افضل جعفری صاحب نے حالیہ سیلاب سے متاثر ہو کر ذیل کے اشعار اپنے مخصوص رنگ میں کہے ہیں۔

چنہاں[1] میں ہیرمائی جل رہی ہے
قفنا موجوں کے پنکھے جھل رہی ہے

اگن چکی میں راوی کی روانی
نشیلے جھونپڑوں کو دل رہی ہے

اُبلتے سندھ کی گہرائیوں میں
سُنا ہے گرم دلدل پل رہی ہے

چڑھا کچھ اس طرح جہلم کا سورج
زراعت کی جوانی ڈھل رہی ہے

جھلس کر رہ گیا سرسبز بیلا
ترائی بے طرح جل تھل رہی ہے

کڑاہی لے کے مٹیالے بھنور کی
اجل پانی میں انساں تل رہی ہے

دھواں اُٹھنے لگا آب و ہوا سے
گھٹا تیزاب پی کے جل رہی ہے

تعجب ہے کہ پروا کے برن میں
خنک دیپک کی آندھی چل رہی ہے

اُدھر سُلگا کیا "شیراب" دُلھا
کنارے پہ دلہن بے کل رہی ہے

ترموں سے گذرنے کو ہے "برقاب"
مرے سر سے قیامت ٹل رہی ہے

[1] چناب

جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

(انتظار حسین کے افسانوی ادب کا ایک جائزہ)

سراج منیر

"لاریب وقت سب کچھ بکھیر دے گا" تاریخ۔ سٹیفن نے کہا ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ میں جاگ اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک تیز گونجدار سیٹی۔ گول ! "جیمز جوائس"[1]

"نانی جان اللہ کو پیاری ہوئیں تو ہمارے گھر سے کہانیوں کا دفتر مٹ گیا۔ میں سمجھا کہ دن نکل آیا"[2]

انتظار حسین نے جب کہانی کہنی شروع کی تو دن نکل آیا تھا۔ شعور کے ایک منطقے سے دوسرے تک کا، زندگی کو دیکھنے کے ایک رویئے سے دوسرے رویئے تک کا، اوہام و تصورات، بھید اور اسرار سے سائنسی حقیقت پرستی اور عقلیت پسندی کا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ ان دو منطقوں، زندگی کو دیکھنے کے دو متخالف زاویہ ہائے نظر کے درمیان پس و پیش کی ایک ہراساں کر دینے والی کیفیت کے بیچ اردو افسانے نے جنم لیا کہ اگر ڈرامہ تضاد کے درمیان تناؤ سے پیدا ہوتا ہے تو کہانی پس و پیش، پریشانی اور گھبراہٹ بعض اوقات دہشت کے اس لمحے میں بنی جاتی ہے، جب حقیقت اشیاء بے نام، بے پہچان ہو رہی ہوں کہ خواب اور بیداری کا لمحہ، یہی ہے اور یہیں سے دراصل فرد کے لئے زندگی اور موت کے درمیان کش مکش کی ایک علامت پیدا ہوتی ہے اور اسی لئے ہمارے ہاں نیند کو موت کی بہن کہتے ہیں۔

رات انتظار حسین کے ہاں ایک بہت اہم موٹیف ہے اور ان کے ہاں کہانی نے جنم ہی رات کو لیا۔ "انجنہاری کی گھریا" سے لے کر الف لیلہ کے دیباچے تک اور اس کے بعد بھی انتظار حسین کے لئے رات ایک پورا طریقۂ حیات ہے جس کی بنا خارج کی دہشت کے عالم میں تخیل کی بنیاد پر زندہ رہنے کی کوشش پر ہے۔ سو ہر وہ جگہ جہاں خارج کا خوف مسلط ہے، بے تحفظی کے گہرا احساس ہے اور ہو کے عالم میں نامعلوم کی دہشت اعصاب میں تناؤ پیدا کرتی ہے۔ رات ہے۔ رات جس کے اپنے بھید ہیں، جس کی دہشت میں ایک جمال ہے تخیل کو زندہ کرنے والی صورتحال ہے جہاں محض تخیل کے زور پر ہی آدمی ایک پر اسرار کائنات میں کہیں سے بھی نکل کر آنے والی چڑیل کے خوف میں اپنے اعصاب کے توازن کو قائم اور اپنی حیات کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ اگرچہ لارنس نے اصول تو یہ مرتب کیا ہے کہ کہانی کا اعتبار کرو کہانی کہنے والے کی نہ سنو، لیکن اگر خود اپنے موضوعات کے بارے میں انتظار حسین کی رائے دیکھ لی جائے تو کیا ہرج ہے۔

"میلے سے واپسی میں راہ سے بھٹک جانے والا بچہ، وہ
اکیلا کبوتر جو اپنی چھتری سے بہت دور کسی اونچے کوٹھے
پر بیٹھا رہ جائے اور اسے رات آئے، اندھیرے ہوتے
ہوئے آسمان پر وہ ڈگمگاتی ہوئی اکیلی پتنگ جسے کھینچتے
ہوئے ہر بار پتنگ باز یہ محسوس کرے کہ اب درخت میں الجھی

(۱) جیمز جوائس۔ یولیسس۔ (۲) انجنہاری کی گھریا

مرغی کا وہ بچہ جو شام پڑے آنگن میں اکیلا رہ جائے اور
سارے آنگن کا بدحواسی میں چکر کاٹے مگر ڈربے میں داخل
نہ ہو سکے۔ یہ تصویریں مجھے رہ رہ کر ستاتی ہیں۔۔۔۔"[۱]

بنیادی طور پر یہ چار تصویریں ہیں اور دو تین چیزیں ان میں مشترک
ہیں:

(۱) منزل پر پہنچنے کا احساس۔
(۲) اکیلے رہ جانے کے عالم میں ایک خوف اور بدحواسی۔
(۳) شام کی آمد۔
(۴) ایک ہمہ گیر بے تحفظی۔

اور ان چار تصویروں میں آدمی صرف ایک ہے۔ گم ہونے والا بچہ
دیگر دو تصویریں جانوروں کی ہیں، ایک پتنگ کی۔ خیر اس سے مقصود ایک
مختصر سے بیان کے ذریعے انتظار حسین کے کینوس کا، ایک غیر معتبر اور نامکمل
سہی، ایسا تعین کرنا ہے جس میں ذرا بات کے بنیادی حوالے طے ہو سکیں
نہ کہ شکاگو سکول کے نقادوں کی طرح ایک شیئی شمار یہ فراہم کرنا۔

بہرحال تو ذکر رات اور اس کے اسرار کا تھا اور جو چیز انتظار کے
اپنے بیان کے مطابق اسے ستاتی ہے وہ تصویریں ہیں جن سب کا پس منظر
شام کی آمد ہے اور شام کی یہ آمد منزل بلکہ زیادہ صحیح طور پر گھر پہنچنے
کے احساس سے مشروط ہے۔ اور رات کی آمد کے ساتھ ہی گھر تک پہنچنے
کا یہ احساس ایک خواب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک تکلیف دہ نیم غنودگی
کے عالم میں دیکھا جانے والا خواب، یا بشارت کی حیثیت میں نظر آنے والا
ہر دو حیثیتوں میں خواب باطن کا ظہور ہے اور جاگتے آنکھوں اگر یہی
خواب دیکھا جائے تو کہانی ہے۔

"تخلیقی فن کار وہی کچھ کرتا ہے جو بچہ
کھیلتے ہوئے کرتا ہے۔ وہ فینٹسی کی ایک دنیا
تخلیق کرتا ہے اور اس کے بارے میں بڑا سنجیدہ
ہوتا ہے۔ یعنی جذبے کی بڑی مقدار اس پر مرتکز
کرتا ہے درآنحالیکہ وہ اسے حقیقت سے واضح
طور پر الگ رکھتا ہے"[۲]۔

فرائڈ کی نثر مجھ سے نہیں سنبھلتی لیکن لستم پشتم میں نے اس
کا ترجمہ کر مارا ہے۔ خیر تو خواب کی یہ تخلیقی دنیا ایک طرح کی جذباتی
INVESTMENT کا تقاضا کرتی ہے اور اسی مضمون میں فرائڈ
نے آگے چل کر اس جذباتی ارتکاز کا منبع "خواہش" کو بتایا ہے۔
کہانی کے سلسلے میں اورٹیگا گیسٹ تو اس قدر آگے چلے گئے ہیں کہ
ان کا کہنا ہے کہ کہانی کی دنیا خواب کی ہی دنیا ہوتی ہے، جہاں حقیقت
سے اس کا مس ہوا وہاں یہ گم ہو جاتی ہے۔ لیکن انتظار حسین
کے سلسلے میں کہانی کی دنیا کا اس طرح تعین کرنا نہ تو ضروری ہے اور
نہ ہی ممکن یہاں تو خواب غنودگی اور بیداری کے لمحے کی ایک
واردات ہے جس میں خواب حقیقت میں، اس طرح ڈھلتا ہے کہ بشارت
بن کر کوئی پھول یا کوئی اورشے چھوڑ جاتا ہے، یا پھر موجودہ حقیقت
خواب کا روپ اس طرح دھارتی ہے کہ "چاند گہن" کی ابتدا میں
یوجی کے تجربے کی شکل بن جاتی ہے یا پھر

"۔۔۔۔۔ دن چھپ چلا تھا اور اندھیرے میں گم ہوتے
ہوئے ہرے پتوں پر سفید سفید دھواں سا منڈلا رہا تھا۔ بھدا نیلا
آسمان، چپ چاپ اونچے پیڑ، سوتے ہوئے کھیت، سب کے
سب گھلے جا رہے تھے، سفید دھواں سا بنتے جا رہے تھے۔
اور وہ سفید سفید دھواں خود شام کی گہری ہوتی ہوتی کالونس میں
گھل رہا تھا، گم ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہ اچٹ کر سامنے والے
پیپل پر جا پڑی"[۳]۔

بہرحال تو انتظار حسین کے ہاں خواب ذات کے ظہور کا لمحہ
ہے اور انسان کے باطن کے اور اس کے باہر موجود کائنات کے

۱- انجھناری کی گھریا۔

۲- CREATIVE WRITING AND DAY DREAMING

۳- کنکری۔

درمیان رابطے کا ایک ذریعہ! اور یہ ذریعہ دراصل گھر ڈھونڈنے، یا اپنی ذات کا تعین کرنے کی خواہش پر اپنی اساس رکھتا ہے۔ اس طرح انتظار حسین کی کہانیوں کی ایک رو میں خواب کا موٹیف اہم ترین یوں ٹھہرتا ہے کہ یہ دراصل بطون ذات اور خارجی کائنات کے درمیان رابطے کو ایک بنیادی خواہش کے حوالے سے بیان کرتا ہے اور اسی کے ذریعے کہانیوں میں باطنی دنیا کا اسرار، تخیل کی بھرپور زندگی اور فرد کی حقیقت بار پاتی ہے اور یہیں سے انتظار حسین کے ہاں تقدیر کا تصور بھی ظہور کرتا ہے کہ ہم اسی طرح دوسروں کے خواب نہیں دیکھ سکتے جس طرح دوسروں کی تقدیر میں شریک نہیں ہو سکتے اور دوسروں کے خواب میں شریک ہونے کا بس ایک ذریعہ ہے ——— کہانی۔

"اختر تو میں جانوں سوتا ہی نہیں ہے۔ آدھی رات تک خواب بیان کرتا ہے، آدھی رات کے بعد خواب دیکھنے شروع کرتا ہے[1]۔"

اور یہی صورت حال کہانی کہنے والے کی ہے۔ اسی کہانی میں دوسری جگہ آتا ہے۔

"سید نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں، رضی کی طرف دیکھتے ہوئے پر اسرار لہجے میں بولا۔ میرا دل دھڑک رہا ہے، کوئی خواب دیکھے گا آج۔"

یہ نامعلوم کے سامنے کھڑے ہونے کی دہشت ہے اور اس کے پس منظر میں ہجرت کا حوالہ موجود ہے کہ یہ بھی معلوم کے ایک منطقے سے ایک ایسے علاقے کی طرف سفر کا استعارہ ہے جہاں ہر شے بطون اسرار میں ہے۔

اِک مسافت پاؤں شل کرتی ہوئی سی خواب میں
اِک سفر گہرا مسلسل، زردیٔ مہتاب میں

بلکہ سچ پوچھیئے تو خواب خود بھی شعور کے ایک علاقے سے دوسرے کی طرف ہجرت کا نام ہے۔ اور اس عمل کی معنویت اس میں ہے کہ یہ محض فرد کا پردیس کو سفر نہیں ہے کہ سفر کی یہ کہانیاں اُردو میں بکھری پڑی ہیں مگر انتظار حسین کو کچھ زیادہ INSPIRE نہیں کرتیں بلکہ ہجرت تو ایک زمین سے دوسری کی طرف سفر نہیں بلکہ رشتوں کے جو انسانوں کے درمیان ہوں، ان علامتوں کے جو ان سے ظاہر ہوں اور ان ترجیحات اور معنویتوں کے پورے نظام سے جو اس سر زمین پر ایک تاریخ نے قائم کی ہوں، سفر ہے۔ گویا اس طرح یہ تجربہ ایک REBIRTH کا تجربہ ہے۔ لیکن انتظار حسین کے سلسلے میں ایک بات ہمیں بہر حال ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ ان کے ہاں ہجرت محض اکیلا واقعہ نہیں بلکہ اس کی حیثیت ایک ایسے تجربے کی ہے جو نیا زاویہ نگاہ فراہم کرتا ہے واقعات کے ایک ایسے سلسلے کو دیکھنے کا جو واقعہ کربلا سے سن ستاون تک اور سن ستاون سے سن اکہتر تک قائم ہے اور ہر واقعہ فی الاصل ایک پوری قوم کے سفر کے معنی یا اس کی بے معنویت کا تعین کرتا ہے اور کچھ یہی حوالہ ایک سطح پر انسانوں کے لئے بھی ہے۔

"کتنا اچھا ہوتا کہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہوتے اور انسانی رشتے جوں کے توں رہتے اور مجھے افسانہ لکھنے کی مصیبت نہ اٹھانی پڑتی۔ مگر افسوس ہے کہ انسانی رشتے ہر آن بدلتے ہیں اور بکھرتے ہیں۔ لوگ مر جاتے ہیں یا سفر پر نکل جاتے ہیں، یا روٹھ جاتے ہیں۔ پھر میں انہیں یاد کرتا ہوں اور انہیں خوابوں میں دیکھتا ہوں اور افسانے لکھتا ہوں[2]۔"

(۴)

ڈرامے کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ارتکاز ہے کسی

۱۔ سیڑھیاں

۲۔ اپنے کرداروں کے بارے میں

دور کے اعمال اور تضادات کا اور رزمیئے کے بارے میں یہ خیال رہا ہے کہ اس میں کسی دور یا ادوار کی اشیاء مجتمع ہوتی ہیں[1]۔ رزمیئے کی کم از کم ایک خصوصیت تو انتظار حسین کے ہاں یہ دکھائی دیتی ہے کہ ان کی تحریروں میں جس قدر اشیاء کا ذکر ہے شاید اردو کے کسی ناول نگار کے ہاں بھی اتنی اشیاء دکھائی نہیں دیتیں اور پھر یہاں ایک اور بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ مثلاً داستانوں میں بھی اشیاء کی فہرست پر فہرست مرتب ہوتی چلی جاتی ہے۔ مگر وہاں ان کی حیثیت منظر نامے کی ترتیب میں ضمنی اور فروعی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ داستان اگرچہ ایک ماضی کا بیان ہے لیکن جس زمانے میں اسے بیان کیا جا رہا تھا ابھی وہ ماضی مکمل طور پر ماضی نہ ہوا تھا لہٰذا فضا ایک بیان سے مبنی تھی اور اشیا اس بیان کا ایک حصہ ہوتے تھے۔ لیکن انتظار کے ہاں اکثر کہانیوں میں، فضا بندی، بلکہ کہانی کو آگے بڑھانے کے عمل میں اشیاء اور مقامات کا ایک بہت حرکی رول ہے اور معمولی سے معمولی شے کا تذکرہ ایک پوری تہذیبی روایت کی علامت ہے بلکہ یوں کہیں تو درست ہوگا کہ انتظار حسین کے ہاں بین الافرادی تعلقات کی جس بُنت سے معاشرے کا منظر نامہ مرتب ہوتا ہے اس میں یہ تعلقات اشیاء اور مقامات کے ذریعے ہی قائم ہوتے ہیں، مثلاً "گلی کوچے" میں نیوما کی دکان جب ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے اور تحویل صورت کرتی ہے تو وہ پوری معنویت جو اسے حاصل تھی یوں گم ہو جاتی ہے کہ اس دکان کا ارد گرد کی دکانوں سے اور آنے والوں سے ایک خاص رابطہ استوار تھا جبکہ ہجرت کے بعد اس کی شکل کے تبدیل ہونے میں ان بین الافرادی تعلقات کی نوعیت کے بدل جانے کی معنویت ہے۔ اسی طرح کنکری کے بہت سارے افسانے مثلاً دیولا، پٹ بیجنا وغیرہ ایک رشتے کا حوالہ بنتے ہیں۔ بلکہ اس مجموعے میں "محل والے" کی کہانی جج صاحب کی تصویر کے گم ہونے سے شروع ہوتی ہے، لباسوں، اشیائے ضرورت مکان کے نقشے کے حوالے سے تغیر پذیر رشتے سامنے آتے ہیں یا اس طرح کے بہت سارے افسانوں کے حوالے دیئے جا سکتے ہیں۔

انتظار حسین کے ہاں اشیاء اور مقامات، واقعات یہ سب ایک بہت پیچیدہ نظام میں گندھے ہوتے ہیں اور ان کا مطالعہ وسیع تر حوالوں کا مقتضی ہے۔

وقت کی بہت ساری تعریفوں میں سے ایک تعریف یہ بھی ہے کہ وقت واقعات کے درمیان فاصلے کو کہتے ہیں اور اسی طرح ایک بیان ملتا ہے کہ "وقت حرکت کی مقدار کا نام ہے"[2]۔

ان دونوں صورتوں میں وقت جب تک ایک انسانی حوالے سے بلکہ زیادہ درست طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسانی رشتوں کے حوالے سے سامنے نہ آئے اس وقت تک مجرد محض ہے اور زمان کے بغیر زمین بھی ناقابل شناخت ہے۔

"شبیر شاہ نے زمین کی طنابیں خوب کھینچیں اور
بے فرسنگ فاصلوں کو خوب جکڑا، مگر وقت کے دریا
پر بند نہ باندھا، وقت بغیر کرۂ ارض مٹی کا ڈھیلا
ہے"[3]

اور انتظار حسین کے بیشتر کردار وقت کی اسی حرکت کے تابع بلکہ اس کے جبر میں ہیں جو وہ واقعہ در واقعہ ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح وقت کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو وہ جب وقت واقعے میں اپنا ظہور کرے۔ دوسرے وہ جب اشیاء سے ظاہر ہوا اور وقت کی پہلی حرکت دوسری کو مشروط کرتی ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں کہانیوں میں ہم وقت کے، یا تاریخ کے اول الذکر تجربے تک موخر الذکر تبدیلی کی وساطت سے پہنچتے ہیں۔ یہ وقت کا باطنی اور روحانی تجربہ ہے۔ مارترنے وقت

۱۔ یہ خیال غالباً لوکاش نے ہسٹاریکل ناول میں ظاہر کیا ہے۔

۲۔ ابن سینا۔

۳۔ جل گر جے۔

کی روحانی حیثیت کے ظہور کے عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ

"زمانِ نفسی" PSYCHIC TIME اشیائے زمانی
کے ایک رابطے میں سامنے لانے کا نام ہے[۱]۔"

اسی باب میں آگے چل کر اس نے ایک اور بڑی پتے کی بات کہی ہے جس سے ہمیں انتظار حسین کے تجربے کی پوری نوعیت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جہاں وقت بحیثیت زمانِ نفسی اپنا ظہور کرے وہاں مستقبل کا تجربہ بھی بحیثیت ماضی کے ہوتا ہے[۲]۔

بہر حال تو ذکر تھا اور اس سے منسلک انسانی تجربے کا تھا۔ انتظار کے ہاں ہر مرحلے پر ایک ہجرت دکھائی دیتی ہے اور جب آدمی ہجرت کرتا ہے تو اشیا کے ایک پورے منظر یا تی نظام سے دوسرے کی طرف جاتا ہے اور یہ ہجرت ایک واقعے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہاں میں نے ہجرت کو بہت ہی وسیع متن میں استعمال کیا ہے اور وہ کوئی بھی سفر ہو وہ اشیاء کے ہی تعلق ٹوٹنے اور جڑنے سے بنتا ہے ـــــ

"اسے اپنے جانے کا خیال آنے لگا۔ حویلی
کہ اس کے تئیں ماضی کی اڑتی ہوئی خوشبو تھی۔
مانند ایک خواب کے ذہن سے لبرنے لگی۔ اب سفر
اس پر سوار تھا[۳]۔"

بلکہ اس سلسلے میں ایک یہ تحریر بھی اشیاء اور مقام کے حرکی رول کو بیان کرتی ہے اور یہاں آکر محسوس ہوتا ہے کہ افراد سے انتظار حسین کا رشتہ بحیثیت فزوکتنا کمزور ہے بلکہ سچ پوچھئے تو کردار کی حیثیت میں انتظار حسین کے ہاں کردار بھی وہی بڑے بنے ہیں جو اشیاء میں ڈھل گئے ہیں۔ یعنی چچا کا کردار وہی کہانی بیان کرتا ہے جو ہار سنگھار کا درخت اور شکستہ حویلی علامت کی حیثیت میں کہتی ہے[۴]۔

بہر حال فی الحال تو کردار کا یہ تصوّر زیرِ بحث ہے۔

"ہاں ایک کردار ہے جو فضا سے اونچا اٹھتا ہے
بلکہ مجھے تو اب سب کرداروں کا تصوّر کرنے کے بعد
یوں احساس ہو رہا ہے کہ وہ سب کے سب ضمنی کردار
ہیں کہ اس مرکزی کردار کے گرد گھوم رہے ہیں۔ مگر
تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
یہ ایک شخص لال قلعہ ہے۔ لال قلعہ اک شخص ہے کہ
اپنی اردگرد کی ساری فضا پر محیط نظر آتا ہے[۵]۔"

اور انتظار کے تخیل کو وہی صورت حال زیادہ مواد فراہم کرتی ہے جہاں اشیاء یا ماحول بلند ہو کر کرداروں کا تعین کریں۔ مثلاً کنکری کی کہانیاں لے لیں جن میں بظاہر انتظار حسین کا تاریخی شعور بہت کم رونما ہوتا دکھائی دیتا ہے، مجمع میں مختلف اجتماعات ایک بچے کے شعور کے ذریعے اپنی معنویت اور اہمیت کا ظہور کرتے ہیں۔ اصلاح میں وہ پوری فضا جو گلی ڈنڈے اور پتنگ بازی سے بنتی ہے کرداروں کو معنویت دیتی ہے۔ دیولا میں دیولا خود اہم ترین کردار ہے۔ "یاں آگے درد تھا" میں پس منظر ہی اصل ہیرو ہے۔ البتہ گلی کوچے میں چند کہانیاں ایسی مل جاتی ہیں جن میں کردار کو بنیاد بنانے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً "عقیلہ خالہ"، "استاد" اور "بن لکھی رزمیہ" لیکن غور سے دیکھنے پر معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان کہانیوں کا بھی طاقتور عنصر ماحول ہی ہے اور کردار یہاں بھی دراصل ماحول کے بل پر ہی ابھرتے ہیں۔ "چاند گہن" میں البتہ کرداروں کو پرت در پرت سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اپنی اس حیثیت میں یہ ایک ناکام تحریر ہے تو اشیاء اور ماحول کا کرداروں پر چھا جانا

۱۔ BEING AND NOTHINGNESS–TEMPORALITY
۲۔ " " " "
۳۔ دن۔
۴۔ ہندوستان سے ایک خط۔
۵۔ کہاں گئے وہ لوگ۔

دراصل وقت اور اس سے منسلکہ منظر نامے کی قوت کے ادراک کی
علامت ہے۔ اس سارے جائزے سے معلوم ہوا کہ انتظار حسین کے
ہاں اصل کہانی افراد کی نہیں بلکہ ایک لمحۂ زمان میں ایک مخصوص لینڈ
سکیپ کی ہے جس کے قائم رہنے اور مٹ جانے پر افراد کے رشتوں
کے قیام اور ان کے تغیر اور نتیجۃً افراد کی زندگی کی معنویت یا بے معنی
پن کا دارومدار ہے اور وہ لمحۂ زماں جس میں کسی لینڈ سکیپ کو دریافت
کیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے لئے واقعہ در واقعہ پھیلتے جاتے ایک
وسیع تر متن کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی لئے انتظار حسین کے ہاں
دورانیہ الگ الگ لمحات کی، جو ایک تجربے کی سطح پر ایک دوسرے
سے منسلک ہیں، تکثیر کا نام ہے اور اس کی ایک اہم مثال "زرد کتا"
ہے جہاں چھوٹی چھوٹی حکایتوں سے جو وقت کے ریزوں کی نمائندہ
ہیں، پوری کہانی بنی گئی ہے۔ چنانچہ اسی لئے انتظار حسین کے ہاں
صورت حال کا بننا یا بگڑنا ایک پوری تاریخ کے بننے یا بگڑنے سے
عبارت ہے کہ دراصل تاریخ اپنا ظہور اشیا میں ہی کرتی ہے اور
اسی لئے ایک جگہ غالباً کسی کالم میں انہوں نے لکھا بھی تھا کہ جب کوئی
تہذیب اجڑتی ہے تو سب سے پہلے اس کا دسترخوان الٹتا ہے۔ یہاں
دسترخواں تو محض نمائندگی کرتا ہے۔ اشیاء کی ایک پوری ہائرارکی کا
جو آدمیوں کے گرد ان کے تہذیبی شعور کے اظہار کے طور پر قائم ہوتی
ہے۔ اب رہ گیا مسئلہ اس تصور زماں کا جس میں وقت واقعات کے
درمیان فاصلے سے عبارت ہے تو اس سلسلے میں بھی کربلا کے واقعے سے
لے کر سقوط ڈھاکہ تک ایک زنجیر ہے جس میں ہر واقعے کی معنویت دوسرے
سے جڑی ہوئی ہے اور یہاں بھی ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ
انتظار حسین کے لئے وہی واقعات اہم ٹھہرتے ہیں جو افراد پر چھا
جاتے ہیں بلکہ اس سلسلے میں ان کا ہی ایک بیان جس سے ان کا تصور
تاریخ بھی واضح ہوتا ہے یہ ہے۔

"میرے ساتھ بڑی مشکل یہ ہے کہ میں تاریخ کو
افسانہ بنا کر پڑھتا ہوں۔ یہ روش ثقہ لوگوں کو تو کیوں
پسند آنے لگی۔ لیکن ثقاہت شاید افسانے کے ساتھ
ساتھ تاریخ کے لئے بھی ایسی سازگار نہیں ہے۔ افسانہ
اور تاریخ آپس میں غیر متعلق تو نہیں ہیں۔ افسانہ تو شاید
تاریخ سے الگ رہ کر چار دن سانس بھی لے جائے مگر
تاریخ تو افسانے سے رشتہ توڑ کر چار قدم نہیں چل
سکتی۔ وہ تاریخ کیا ہوئی جس پر تخیل نے تہیں نہیں
چڑھائیں اور وہ کہاں کی تاریخی شخصیتیں ہوئیں جن کے
گرد افسانے نہیں بنے گئے اور جن کے قد و قامت میں
قدرے اضافہ نہیں کیا گیا۔ وہ تاریخ تو نہ ہوئی واقعات
اشخاص کا تذکرہ ہوا اور ایسی تاریخ رکھنے والی قوم کے
متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ تخلیقی صلاحیت سے عاری
ہے۔ تاریخ اصل میں تخلیقی عمل ہے۔ وہ کتابوں سے
زیادہ سینوں میں رقم ہوتی ہے اور اجتماعی تخیل سے
مس ہو کر زندہ حیثیت اختیار کرتی ہے۔.........
...... یہاں کہانی کرداروں پر چھا گئی ہے۔ یہ معرکہ
اتنے بڑے پیمانے پر گرم ہوا ہے کہ کسی ایک شخصیت
کے لئے ابھر کر واقعہ پر چھا جانے یا واقعہ کا مرکز بن
جانے کی گنجائش نہیں رہتی۔"

اس ضمن میں انتظار حسین نے ٹیپو سلطان، سراج الدولہ اور سید احمد
بریلوی وغیرہ کا حوالہ بھی دیا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ وہ سارے
واقعات جہاں افراد صورت حال پر چھا گئے ہیں انتظار حسین کی کہانیوں
کے لئے کوئی مواد فراہم نہیں کر سکے حتیٰ کہ کربلا کا واقعہ بھی جہاں جہاں
ظاہر ہوا ہے۔ مثلاً "شہادت" میں وہاں بھی کردار ایک ضمنی شے
ہے اور تاریخ کے وسیع پس منظر میں بٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا
ہے اور وہ پس منظر جس میں یہ شہادت طلب کی جاتی ہے اہم ہے۔

۱۔ کہاں گئے وہ لوگ۔

ں صورت حال کا سٹرکچر کی سطح پر بہترین اظہار جو در اصل انتظار حسین
ں افسانہ نگاری، یا صورت حال سے فرد کے ربط کا جوہر ہے۔ آخری
دمی کا سٹرکچر، یہاں الیاسف کے کردار پر پورا ماحول غالب آتا چلا
جاتا ہے اور ایک طویل کرب سے گزرنے کے بعد اسے اپنے عمل
ے خمیازہ کے طور پر ہی سہی لیکن صورتِ حال کے جبر میں آنا پڑتا
ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی تاریخ میں سے اب ان واقعات کی ایک
جمالی فہرست مرتب کر لی جائے جو انتظار حسین کو ستاتی ہے۔

(۱) واقعہ کربلا۔
(۲) جنگِ آزادی۔
(۳) ہجرت۔
(۴) سقوط ڈھاکہ۔

کہیں کہیں ایران سے ہندوستان کو ہجرت کر کے آنے
والوں کے تذکرے بھی ملتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ضمنی صورتحال ہے
یہ سارے واقعات انتظار کی کہانیوں کی ایک قسم پر محیط ہیں اور
ان سب میں ایک بات مشترک ہے کہ یہ سب اجتماعی وارداتیں
ہیں۔ جن کرداروں کا تذکرہ پہلے انتظار حسین نے کیا تھا ان کی بلند
حیثیت سے انکار ممکن نہیں لیکن یہ اس سطح پر اجتماعی وارداتیں
نہیں بن سکیں جیسی وہ کہ جو انتظار حسین کے تاریخی شعور کو مواد
فراہم کرتی ہیں۔

یورپ کی صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے رومانی ادب
کے سلسلے میں ایک بیان ہمیں یہ ملتا ہے کہ انقلابِ فرانس میں پہلی بار
تاریخ عام آدمی کا تجربہ بنی اور اس کے بعد کے ادب میں نثری
کہانی کو تو چھوڑیئے شاعری میں اتنی کہانیاں لکھی گئیں کہ یہ شبہہ
پیدا ہوا کہ کہیں شاعری ناول کی جگہ نہ لے لے۔ بلکہ ایک صاحب
نے تو یہ بھی کہا کہ اگر لارنس اور ورجینیا وولف وغیرہ ورڈز
ورتھ کے ہم عصر ہوتے تو طویل منظوم کہانیاں لکھتے۔[۱] چنانچہ جنگِ آزادی
کی حیثیت بھی کچھ یہی ہے کہ اس کے ساتھ ہی پہلی بار تاریخ "جنتا"
کا تجربہ بنی اور جس طرح یہ شعور ایک تجربے کو اس کے مماثل دوسرے
تجربے کے ساتھ لڑی میں پروتا چلا جاتا ہے اسی طرح ہجرت اور
پھر سقوط ڈھاکہ اس سے منسلک ہوتے چلے گئے ہیں۔ جنگ آزادی
کے آس پاس جاگیر کے پروانوں کا ملنا اور گم ہو جانا[۲]، خاندانی تذکروں
کا کھو جانا[۳]، ہجرت کے عمل تمثالوں اور تصویروں کا رہ جانا[۴]، ا ر؛
کی لاسنا خیز میں شجرۂ نسب کا ہاتھ سے نکل جانا[۵]۔ ایک آہستہ آہستہ
مٹتے ہوئے تاریخی شعور پر دلالت کرتا ہے اور اس تاریخی شعور
کے مٹنے کے ساتھ ساتھ ایک حافظہ اور اس سے منسلک اشیاء
کا نظام بھی مٹتا چلا جاتا ہے اور جب یہ سب کچھ مٹنے لگے تو یہ اصل
میں اعتبار کے کھو جانے کی علامت ہے۔

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

جب اعتبار کی قوت ختم ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی
ساتھ معنی کا ایک نظام بھی مٹتا ہے۔

"جسے حق کہتے ہیں وہ بھی باطل ہے[۶]۔"

یہ دراصل ایک تصورِ انسان اور تصورِ کائنات کے زوال
کا عمل ہے۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل انتظار حسین نے رامائن
اور مرثیوں کا تقابل کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

" رامائن اور مہابھارت میں کائنات پھیلتی جاتی
ہے اور آدمی سکڑتا جاتا ہے۔ مرثیوں میں آدمی پھیلتا

ROMANTIC NARRATIVE ART — KARL KROEBER ۱

۲۔ چاند گہن، بیل گرجے۔
۳۔ ہندوستان سے ایک خط۔
۴۔ محل والے۔
۵۔ ہندوستان سے ایک خط۔
۶۔ شہر افسوس۔

ہے اور اس کے سامنے کائنات چھوٹی ہوتی چلی
جاتی ہے[۱]۔"

چنانچہ جنگِ آزادی کے بعد کی ساری صورت حال انتظار حسین کے لئے آدمی کے چھوٹے ہوتے جانے اور سکڑتے جانے کی صورت حال ہے۔ لہٰذا اسی لئے انتظار حسین جب بھی رزمیہ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو صورت حال کا جبر یا تو اس رزمیئے کو نامکمل چھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے یا پھر ایسے ہیرو جن میں رزمیئے کو سہارنے کی قوت ہوتی ہے چوہوں کی طرح مار دیئے جاتے ہیں یا خود ہی آگے بڑھ کر موت کو قبول کر لیتے ہیں۔ "بن لکھی رزمیہ" میں پچھوا کا کردار یا چاند گہن میں کالے خان کا کردار اور یہ رزمیہ کا ہی طرزِ احساس ہے جو انتظار حسین کو بار بار داستان کے اسلوب اور داستان کی فضا کی طرف لے جاتا ہے لیکن پوری صورت حال پر ہیرو ایک بار غلبہ پانے کی کوشش کرتا ہے پھر گم ہو جاتا ہے یا بے فائدہ مارا جاتا ہے۔ مثلاً "جل گرجے" میں سمند خان کا یہ بیان ——

—— "میں نے یہ افسانۂ جگر پاش سنا تو آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مگر سمند خان آج تنہا تھا۔ کیا کر سکتا تھا[۲]......"

اس طرح کے واقعات کے بعد کی صورت حال کا سب سے اچھا بیان یقیناً "آخری خندق" کا اختتام ہے۔

کسی اجتماعی واردات کا ادب یا پوری زندگی پر کیا اثر ہو سکتا ہے اس کے لئے خود انتظار کے بیانات دیکھئے۔

"زمانہ زمین سے رشتہ پیدا کر کے بدلتا ہے زمین بہت پرانی ہے مگر انسانی وارداتوں کے اثر میں آکر بار بار وہ قالب بدلتی ہے اور نئی حقیقت بن جاتی ہے۔ اور اٹھارہ برس سے ہمارے لئے یہ مسئلہ چلا آرہا تھا کہ اس نئے حقیقت کو جسے پاکستان کہتے ہیں کیسے درک کریں۔ کیسے اسے اپنے شعور کے دائرے میں لائیں۔ شاید واردات بڑی تھی ہم چھوٹے تھے، ہم اس میں کھو سے گئے تھے۔ پاکستان کی صورت میں زمین سے جو ہماری نئی رشتہ داری قائم ہوئی تھی وہ ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور آخر آدمی مٹی کا بنا ہوا ہے۔ مٹی سے اپنا رشتہ اس کی سمجھ میں نہ آئے تو اسے خود اپنی ذات سمجھ سے باہر نظر آتی ہے[۳]۔"

اسی مضمون میں آگے چل کر ذات کے انکشاف کا عمل بیان ہوا ہے ——

—— "ہم مقامِ حیرت میں ہیں اور توجیہیں اور تفسیریں کر کے اس حیرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اپنے اپنے خواب سناتے ہیں اپنے اپنے مشاہدے بیان کرتے ہیں۔ کسی نے آنحضرت صلعم کو خواب میں دیکھا ہے۔ کسی نے حضرت علیؓ کو سفید گھوڑے پر سوار سر پر عمامہ باندھے، ہاتھ میں تلوار لئے میدان جنگ کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ کسی نے کسی سفید پوش بزرگ کو بم کے گولے لپکتے اور راوی میں غرق کرتے دیکھا ہے۔ ہمارے اندر سوئے ہوئے منظر جاگ رہے ہیں۔ یہ ہماری ذات کے ظہور کا وقت ہے[۴]۔"

اور جب آدمی کسی روحانی واردات کا اسیر ہو تو اسے

۱۔ ماہِ محرم ۷۰ء میں ٹیلی ویژن پر سجاد باقر رضوی کے ساتھ ایک مکالمہ۔
۲۔ جل گرجے۔
۳۔ ادب جنگ کے بعد۔
۴۔ " " " فنون فروری، مارچ ۱۹۶۶ء

ذات کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ چنانچہ اسی لئے روحانی واردانوں کے حوالے سے انتظار حسین نے خواب کے عالم میں ذات کے ظہور کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

اصل میں کائنات کو دیکھنے کے بنیادی طور پر دو رویئے ہیں ایک وہ جو کائنات کو بحیثیت فطرت دیکھتا ہے اور دوسرا وہ جو کائنات کو بحیثیت تاریخ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اوّل الذکر اصل میں اساطیری شعور ہے اور دوسرا تاریخی۔ ان دونوں کی متوازن تالیف میں تخلیقی عمل اپنا ظہور کرتا ہے۔ زمین و زماں کا وہ رشتہ جس کا انتظار حسین بار بار تذکرہ کرتے ہیں دراصل انہیں دونوں رویوں کی آمیخت سے وجود میں آتا ہے اور اس تناظر عالم کے سلسلے میں کہانی کہنے والا یا فلسفہ لکھنے والا دونوں مجبور ہیں کہ اجتماعی شعور کی گرفت میں ہوتے ہیں۔

> "مفکر ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کا کام
> اپنے ویژن اور اپنی سمجھ کے مطابق وقت کو علامت
> میں ڈھالنا ہے .... اس کے لئے صداقت بالآخر
> وہ منظر کائنات ہے جو اس کے جنم کے ساتھ ہی
> پیدا ہوا۔ یہ منظر وہ ایجاد نہیں کرتا بلکہ اپنے اندر
> دریافت کرتا ہے۔ یہ پھر وہ خود ہی ہے، الفاظ میں
> خود اپنے وجود کا اظہار کہ صداقت اور اس کی
> زندگی دونوں ایک ہیں[1]..."

اسی لئے انتظار حسین کی حیثیت زمین و زمان کے رشتے کے حوالے سے، انسانی واردات کے پس منظر میں ایک خاص طرزِ احساس کے تصورِ زماں کو علامت میں ڈھالنے والے کی بنتی ہے۔ تصورِ زمان تو کسی بھی تہذیب کا بنیادی استعارہ ہے:

(۴)

لیکن یہ ساری گفتگو زیادہ تر انتظار حسین کی ایسی تحریروں کے حوالے سے رہی جو ان کا ایک عجیب اور مخصوص اسلوب اظہار و فکر سمجھی جاتی ہیں۔ انتظار حسین کی ایک اہمیت ہمارے لئے یہ بھی ہے کہ اسالیب کا اتنا وسیع دائرہ شاید ان سے پہلے کسی اور افسانہ نگار میں دکھائی نہیں دیتا۔ جل گرجے کا خالص داستانی اندازِ بیان۔ "زرد کتا" کے ملفوظاتی طریقۂ اظہار" آخری آدمی" کے الہامی کتابوں والے اسلوب کچھوے میں جاتکوں کے حوالے سے ایک مخصوص تجرباتی اور لفظیاتی فضا ان سب کے ساتھ ساتھ ایک اور بہت اہم انداز وہ بھی ہے جو گلی کوچے کی اکثر کہانیوں میں، کنکری میں اور آج تک "نیند" اور "بادل" جیسی کہانیوں میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک حیثیت میں انتظار حسین کے ہاں یہ کہانیاں ان کہانیوں کی، جن کے حوالے سے آج زیادہ تر انتظار حسین کا تذکرہ ہوتا ہے، متخالف رد ہیں، اگر ان کہانیوں میں اجتماعی تجربات زیر نظر ہیں تو ان میں فرد کا ایسا تجربہ سامنے آتا ہے جہاں وہ اجتماع سے کٹا ہوا ہے اور اپنی چھوٹی سی واردات میں گم ہے اور اسی واردات سے پوری کہانی کی فضا بنتی ہے۔ اس بات کا تذکرہ انتظار حسین نے "انجھناری کی گھریا" میں بھی کیا ہے

> "اجتماعی شعور بیشک بڑی شے سہی مگر انسان کا بنیادی
> احساس، اپنی تنہائی کا احساس تو اس کی تہہ میں جوں کا توں
> موجود ہے کسی بھی لمحہ وہ اجتماعی شعور کے غلاف کو چیر کر
> سطح پر آسکتا ہے ...."

یہ تنہائی کا احساس "کنکری" میں بہت واضح ہے۔ لیکن اس احساس کے ساتھ اس دور کی کہانیوں میں ایک بات اور ہے یعنی نا آسودگی کا احساس بچوں کے حوالے سے کچھ کہانیوں میں یہ جنس کے جذبے کا ظہور پھر اس اجنبی تجربے میں گم ہو کر رہ جانے کی صورت دکھائی دیتی ہے۔[2]
جنس کے بارے میں انتظار حسین کے ہاں دو ہی صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر ایسی کہانیوں میں جو اجتماع سے منسلک ہیں عورت کا ذکر آتا ہے تو ساری امیجری اور حسن کا سارا بیان داستانوں، الہامی

1- DECLINE OFTHE WEST—PREFACE

2- دیولا ۔ کیلا ۔

کتابوں سے ماخوذ ہے۔ لیکن جہاں بچپن اور جوانی کی سرحد پر جنس
کے تجربے کا تعلق ہے یا ڈھلتی ہوئی عمر میں ناسودگی کا اظہار ہے
وہاں تجربہ اپنی تمام جہتوں میں مکمل ہے۔ "پٹ بیجنا، ساتواں در،
دیوتا، کیلا وغیرہ اس کی اہم مثالیں ہیں اور ان سب میں ایک طرح
کی لاحاصلیت ہے جس نے ایک پختہ تر شکل انتظار حسین کی تازہ
کہانی "بادل" میں اختیار کی ہے۔ ڈھلتی عمر میں جنس کے تجربے اور
ناسودگی کی کیفیت "عقیلہ خالہ" اور ٹھنڈی آگ میں نظر آتی ہے
اور وہ جسے جنسی حقیقت نگاری کہتے ہیں اور ہمارے ہاں جس سے
مراد مبتذل بیان لیتے ہیں اپنی بہت فنکارانہ صورت میں ان کہانیوں
میں دکھائی دیتی ہے۔ اور اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ پورا وجود
اس تجربے کی گرفت میں ہوتا ہے۔ اسی طرح کی کہانیوں میں ایک اہم
بات یہ دکھائی دیتی ہے کہ تجربے کے بیان میں زبان ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔
"دیوتا" میں بھی صورت حال پیش آتی ہے اور ایک وسیع تر پس منظر
میں پچھلے برسوں میں لکھی جانے والی کہانی "نیند" اسی احساس کی توسیع
ہے ــــ لفظ کا ساتھ چھوڑ جانا:

(۴)

لسانی رابطے کے بارے میں سارتر کا ایک بہت اہم بیان ملتا
ہے جو اس کیفیت کو سمجھنے میں مد ثابت ہو سکتا ہے

"لسان، وجود ..... پر الگ سے نافذ
کیا گیا کوئی مظہر نہیں ہے۔ فی الاصل یہی وجود .....
ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں ایک موضوعیت
اپنا تجربہ دوسروں کے لئے ایک معروض کی حیثیت سے
کرتی ہے"۔

چنانچہ ہر وہ صورت حال جہاں فرد اپنے تجربے میں گم خود ہی
موضوع اور خود ہی معروض ہو، دوسروں سے اس کا رشتہ منقطع ہو چکا
ہو وہاں زبان ساتھ نہیں دیتی۔ چنانچہ اسی لئے یہ مسئلہ کہانیوں کے
سٹرکچر میں بھی ظاہر ہوا ہے کہ جہاں تجربہ اجتماعی ہے وہاں زبان
کی پرتیں بھی بہت ہیں اور جیسے جیسے تجربہ انفرادی ہوتا چلا جاتا
ہے ویسے ویسے زبان اور لہجہ جو انتظار کی بہت سی کہانیوں میں
بڑا اہم ایک کردار ہے، اس کا رول کم سے کم ہوتا جاتا ہے اور اس
کی سطح عام طور پر مستعمل زبان سے قریب ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ
زبان، اسماء اور افعال کے استعمال کے انداز میں تبدیلی اور اس
کے ساتھ بدلتے ہوئے اشیاء کے منظر نامے کے ایک مطالعے سے
ہم انتظار حسین کے ہاں ہمہ وقت تغیر پذیر انسانی رشتوں کا بخوبی
اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ویسے کسی بھی لکھنے والے کے ہاں طرز احساس
کی تہہ داری اور دوسروں سے اس کے رشتے کا اندازہ لگانے کے
لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے کہ بقول سپنگلر

"وہ ہیئت جس میں ایک آدمی کا جاگتا
ہوا شعور دوسرے کے شعور سے رابطہ استوار کرتا
ہے، میں اسے لسان کا نام دیتا ہوں"

چنانچہ انتظار حسین کے ہاں انسانی رشتوں کا ہر تصور زبان
کی ایک مخصوص سطح سے مشروط ہے اور زبان کی وہ مخصوص فضا اشیاء
کے ایک مظہر یاتی نظام کا عکس کہ بقول ہیگل

"گفتگو کی کائنات، کائنات کی گفتگو ہے"۔

چنانچہ اس طرح انتظار حسین کے ہاں موضوع سے اس کے
اظہار تک ایک ہائرارکی بنتی ہے جو ایک طرز احساس میں رچی ہوئی ہے۔

(۵)

گم ہوتی ہوئی دستاویزیں، گھروں میں سونے والوں کے
بستروں کے گرد چکراتے ہوئے الّو۔ راستہ کاٹ جانے والی بلیاں اور نیل کنٹھ

BING AND NOTHINGNESS BEING FOR OTHERS

CLINE OF THE WEST, PEOPLES, RACES, TONGUES

EGEL METAPHYSICS OF LANGUAGE

دکھائی نہ دینے والے لوگوں کی صدائیں، بشارتیں، بددعائیں، محرم میں سرخ ہو جانے والی تسبیح کے دانے اور پنجے، زمین کے نیچے دبے ہوئے خزانوں کی پاگل کر دینے والی پکار...... بھید اور اسرار سے لبریز یہ فضا ہماری زندگیوں کے بیچ سے گم ہو گئی ہے، بڑی بوڑھیوں کے دم سے جو کچھ باقی ہے وہ بھی آہستہ آہستہ مٹتی جاتی ہے کہ اوہام سائنسی دنیا میں پنپنے کی سکت نہیں رکھتے ——— انتظار حسین کی کہانی کے منظر نامے کو مرتب کرنے والے تصورات اور اشیاء میں یہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔

انسان اور کائنات کے رابطے کے سلسلے میں دو متصادم نکتہ ہائے نظر ہمیشہ سے موجود رہے ہیں ایک وہ جو انسان کو کائنات کا غیر سمجھتا ہے، کائنات کو ایک غیر اہم، بے جان، جولان گاہ جانتا ہے اور دوسرا وہ جو انسان اور کائنات کو باہم ربط میں دیکھتا ہے اور اس کا ہر کائناتی مظہر انسانی صورت حال سے منسلک ہے۔ دوسرا رویہ ایک اساطیری ذہن کا رویہ ہے جو اپنے سے خارج میں ایک فعال اور موثر کائنات کا شعور رکھتا ہے۔ اوہام اسی دوسرے رشتے کی پیداوار ہیں۔ ہمارے ہاں پہلے بھی وہم اور شگون کے خلاف کوئی متشددانہ رویہ موجود نہیں ہے بلکہ بعض صوفیانے تو کہا ہے کہ وہم سلطان العارفین ہے کہ غیر موجود کو موجود کرتا ہے۔ یہ ایک تخلیقی عمل ہے، اور انتظار حسین خلقت کے جس حافظے پر بڑا زور دیتے ہیں اس کا سب سے اہم ادارہ توہم ہے کہ جس کے ذریعے ایک پوری مابعد الطبعیات وجود میں آتی ہے جو خلقت کا خواب بھی ہے، اس کا عقیدہ بھی اور اس کی کہانی بھی۔ تاریخ کے ایک فلسفی نے بڑی شکایت کی تھی کہ تاریخ شہروں کی لکھی گئی ہے شہروں میں بھی محض سیاست اور معیشت کی اور بادشاہوں کی۔ چنانچہ جس طرح لکھے جانے والے ادب کے متوازی ایک بولا اور گایا جانے والا ادب موجود ہوتا ہے اسی طرح اوہام کا یہ نظام تاریخ کے متوازی خلقت کی تاریخ ہوتی ہے جو بے نام و نشان صرف حافظوں میں سفر کرتی رہتی ہے اور اسی کے ذریعے عام آدمی کا کائنات سے بُرا یا بھلا ایک رابطہ استوار رہتا ہے بہرحال توہم عوام کی METAPHYSICS بھی ہے اور METAHISTORY بھی اور اسی ادارے کے حوالے سے انسانوں کے درمیان رشتوں کی معنویت، انسان اور کائنات کے درمیان رشتے کی حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح معنوں میں انتظار حسین کے تجربے کا بنیادی سرچشمہ یہی اوہام کا نظام ہے جو کہانیوں میں ڈھلتا ہے اور کہانیاں ڈھاتا ہے یہ کائنات ہی الگ ہے۔

وقت کے باطنی تصور کے بارے میں ابھی ایک بات سامنے آئی تھی کہ وقت جب باطنی تجربے کی حیثیت میں ہوتا ہے تو مستقبل بھی ماضی کی حیثیت میں دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کی سند ہمیں انتظار حسین کی افسانوی تحریروں کے علاوہ دیگر تحریروں سے بھی ملتی ہے جہاں ہر بڑے واقعے اور ہر بڑی واردات سے پہلے پکارتے ہوئے، خبردار کرتے ہوئے، بشارتیں دیتے ہوئے نامعلوم لوگ دکھائی دیتے ہیں، اور ان تذکروں سے تاریخ بھی خالی نہیں ہے۔ خیر۔ فی الحال تو یہ ایک ایسا ملتا ہوا ادارہ ہے جو تجربوں کی تخلیقی سطح پر تحویل صورت کر دیتا تھا۔ اور اس کی حیثیت بھی ایک اجتماعی خواب کی تھی۔

انتظار حسین کے ہاں یہ ایک ایسا نظام ہے جس کے ذریعے ہر واردات کے تاثر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ہر شخصی تجربہ ایک کائناتی تجربے میں ڈھل جاتا ہے۔ اس متوازی غیر محسوس کائنات سے کسی خاص لمحے پر علامتیں نکل کر آتی ہیں اور پھر اس میں روپوش ہو جاتی ہیں۔ دراصل انہیں کے ذریعے ہماری ذات اپنا ظہور کرتی ہے اور اپنی ذات سے باہر ان شہادتوں پر ایمان رکھتی ہے جو اس کے ارادوں میں موثر ہیں اور اسے نامعلوم کے خوف سے محفوظ رکھتے ہیں اور یہ چیز ایک ایسے ہی معاشرے میں جنم لے سکتی ہے جہاں انسان خدا بننا نہ چاہتا ہو۔

انتظار حسین کا پورا رویہ اس کا متقاضی ہے اور پردۂ غیب سے ظہور میں آنے والے اور پھر اس میں روپوش ہو جانے والے

یہ کردار، ان کی چاہے کتنی ہی نفسیاتی تعبیریں اور توجیہیں کیوں نہ کردی جائیں بہرحال ایک قوم کی باطنی قوت کی علامت تھے اور ساتھ ہی ساتھ کائنات میں انسان کے بے یار و مددگار ہونے یا ایک نامعلوم میں بھٹکتے رہنے کے تصور کی نفی کرتے تھے، بوجی کا گرہن کے وقت نمازیں پڑھنا، منحوس پرندوں سے خوفزدہ رہنا، منتیں اور مرادیں مانگنا، دن میں کہانیاں کہنے سے مسافروں کا راستہ بھول جانا یہ سب علامتیں تھیں فطرت اور انسانی زندگی کے درمیان ایک تعلق کی جو آہستہ آہستہ گم ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی فطرت اور انسان کی مغائرت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس ایک ادارے کا مٹتا چلا جانا دراصل ایک ایسے شعور کے گم ہونے کی صورت حال ہے جس کے بعد زندگی کی ایک جہت مٹ جائے گی اور یہ مغائرت تکمیل کو پہنچے گی کہ خلق کے حافظے کا غیر معتبر ہو جانا ہماری زندگی سے عینیت کے اٹھ جانے کی گھڑی ہے۔ اسی لئے شاہ ولی اللہ نے کہا تھا کہ جو باتیں خلق کی زبان پر جاری ہوں ان کی تکذیب نہ کرو کہ وہ حظیرۃ القدس کے فیصلے ہوتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آدمی انہیں کے آئینے میں اپنی صورت حال کا مشاہدہ کرتا ہے۔

(۶)

انتظار حسین کے ہاں اگر ہم گلی کوچے سے شہر افسوس تک کا سارا سلسلہ نظر میں رکھیں اور ان میں اسلوب کی تبدیلیوں پر نگاہ ڈالیں تو یہ اندازہ ہوگا کہ انتظار حسین کے ہاں اردو کہانی کا تقریباً ہر قابلِ ذکر اسلوب موجود ہے اور اس طرح انتظار حسین کے ادبی کیریئر میں اردو کہانی کی تاریخ نے اپنے آپ کو دہرا دیا ہے مغرب کے افسانہ نگاروں اور وہاں کی روایتوں کے حوالے سے میں نے دانستہ اغماض برتا ہے اس لئے کہ ان اثرات اور ان رابطوں کا جائزہ بین التہذیبی صورت حال کے ایک جائزے کا متقاضی تھا جس کا حق بہرحال اس مضمون میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ویژن کے اعتبار سے انتظار حسین کے ہاں ایک ہی مسئلہ بار بار شدت سے سامنے آتا ہے اور وہ ایک تہذیبی نظام کی ریختگی کے عمل میں انسان کا چھوٹا ہوتا چلے جانا، اس کا جانور میں تبدیل ہوتے جانا۔ "کچھوے" کا لسانی پیٹرن انتظار حسین کے پہلے سے موجود لسانی پیٹرن سے الگ تھا اور یہ بات خاصی چونکا دینے والی تھی لیکن مسلم تہذیب کے ایک نظام سے بدھسٹ فضا میں سفر کر جانا دو حیثیتوں سے اہم ہے۔ ایک تو قدیم ہندی فلسفوں میں انسان کی حیثیت کائنات میں بہت چھوٹی ہے، جس کا اظہار اس کہانی میں بخوبی ہوتا ہے، دوسرے وہاں وجود کی ایک پراسرار کی میں ظہور در ظہور کا نظام موجود ہے اور غیب و ظہور کی یہ فضا انتظار حسین کی فکری منہاج کو راس ہے، یہی فضا اور یہی طریقۂ کار داستانوں میں بھی موجود ہے اور اسی لئے یہ پیٹرن بھی انتظار حسین کے طرز اظہار کا بنیادی پتھر رہا ہے۔ خواب اور حقیقت کی باہم آمیختگی سے جو کائنات وجود میں آتی ہے اس کے لئے یہ ساری فضائیں بڑی سازگار رہیں۔

انتظار حسین نے خسرو پر اپنے ایک مضمون میں اس بات کا گلہ کیا تھا کہ لوگوں نے خسرو کو ٹکڑوں میں بانٹ کر دیکھنا شروع کر دیا ہے اور یہ صورت تقریباً ہر قابل ذکر لکھنے والے کے ساتھ پیش آئی ہے۔ ہماری تنقید نے انتظار حسین کی تحریروں کے محض ایک حصے کو متعلق اور اہم سمجھا اور اس طرح انتظار کے صرف دو موٹیف ہمارے سامنے آسکے یعنی ہجرت اور خواب درآں حالیکہ انسانوں میں ہی اردو کہانی کی کم و بیش ہر رو غالب سے خود انتظار تک دکھائی دیتی ہے اور باقاعدہ ایک فکری نظام میں گندھی ہوئی ہے۔ دوسری طرف انتظار حسین نے افسانہ نگاری کے عمل پر بہت سے اہم مضامین لکھے ہیں اور اس کے علاوہ دیگر تہذیبی اور تاریخی مسائل پر ان کا قلم رواں ہے۔

اگر ان سب کو ایک ساتھ رکھ کر اور ایک دوسرے کی صداقت پر ان کی گواہی طلب کر کے تنقید کے میدان میں انتظار حسین کے وژن کو مربوط انداز میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تو اس سے

تاریخ اور تہذیب کے بارے میں ایک پورا رویہ سامنے آئے گا، اور اس حیثیت میں انتظار حسین کی ہمہ جہتی سے ان کی فکری جہت اور ادبی روایت دریافت کی جا سکے گی۔

انتظار حسین کے ہاں تاریخ کا ایک مٹا دینے اور برباد کر دینے والا تصور نظر آتا ہے اور اسی بنیاد پر قنوطیت کا الزام ایک عرصے تک یہاں کی فضا میں گونجتا رہا ہے۔ مجھے پھر سپنگلر کا ایک بیان دہرانا پڑے گا۔

"بیشک "قنوطیت" کا شور فوراً ان لوگوں نے مچایا تھا جو ہمیشہ دیروز میں رہتے ہیں اور صرف ان خیالات کا استقبال کرتے ہیں جو آنے والے کل کے لئے راستے کی تلاش میں مدد دیں۔ لیکن میں نے ان لوگوں کے لئے نہیں لکھا جو یہ سمجھتے ہیں کہ عمل کے سرچشموں کی تلاش اور عمل ایک ہی چیز ہیں۔ وہ جو تعریفیں گھڑتے ہیں اور تقدیروں سے غافل ہیں۔ کائنات کے فہم سے میری مراد خود کائنات بن جانا ہے۔ اصلی چیز زندہ رہنے کی تلخ حقیقت ہے نہ کہ تصورِ حیات۔"

یہ تحریر اس نے اپنے فلسفے کے بارے میں لکھی تھی مگر کسی حد تک قنوطیت کے تصور سے جو ہمارے ہاں انتظار حسین کے حوالے سے بار بار دہرایا جا رہا ہے، متعلق ہے۔

بہر حال ہمارے لئے انتظار حسین کی تحریریں اپنی تاریخیت HISTORICITY کو مرحلہ در مرحلہ اپنی ذات کے ظہور کو دریافت کرنے کا ایک طریقہ کار ہے اور اس کائنات سے رشتہ جوڑنے کی ایک پر ہمت کوشش ہے یہ کوشش جو تقدیر کے خلاف جنگ ہے جو شاید فنا اور ظہورِ نو کے درمیان کہیں ہے اور جسے انتظار حسین جڑوں کی تلاش کا نام دیتے ہیں ـــــ اس سے پہلے کہ تلاش کا یہ عمل بھی گم ہو جائے اور برصغیر کی پوری اسلامی روایت ایک تہذیبی نظام سے کھسک کر محض زندگی گزار دینے کی مادی روایت میں کلیتاً ڈھل جائے۔ چاہیئے کہ شہر افسوس میں یہ شعور ہی حاصل کر لیں کہ

بے یار شہرِ دل کا ویران ہو رہا ہے
دکھلائی دے جہاں تک میدان ہو رہا ہے

اپنے لئے تو یہ یاد وہ تہذیبی روایت ہے جو شجرۂ نسب کے ساتھ گم ہو گئی۔

حق گوئی کا صلہ

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اشرف صبوحی

دولتِ عباسیہ کے بعض نامور خلفاء عجیب اوصاف کے مالک تھے جہاں وہ علوم و فنون کے قدرداں، حرب و طرب کے شوقین، جہاں داری و جہاں بانی میں شہرۂ آفاق تھے وہاں گانے بجانے کی محفلوں اور عیش و عشرت کی مجلسوں کے بھی دلدادہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دورِ حکومت میں موسیقاروں، مغنیوں اور شاعروں کی بڑی کثرت تھی۔ وہ جو کہتے ہیں جیسا راجا ویسی پرجا۔ سربراہِ حکومت کی رنگین محفلوں کا سماں دیکھ کر انھوں نے بھی اپنی محفلوں کو رنگین بنا لیا تھا۔ ان میں سے چند موسیقاروں نے اپنے فن میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ دور دور مشہور ہو گئے تھے۔

ان مشاہیر موسیقاروں میں ایک تو ابراہیم موصلی تھے اور دوسرے اسمٰعیل بن جامع۔ ان دونوں موسیقاروں کے سامنے بڑے بڑے موسیقار کان پکڑتے تھے۔ ایک روز ابراہیم موصلی کے فرزند اسحٰق نے اپنے والدِ ماجد سے کہا کہ "ابا جان وہ بڈھا مر جائے گا اور مجھے اس کا گانا سننا نصیب نہ ہوگا۔ اور میرا حال یہ ہے کہ اس کا گانا سننے کے لئے میری بےتابی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔"

ابراہیم موصلی۔ بیٹا! کون ہے وہ بڈھا؟

اسحٰق۔ ابا جان! وہی اسمٰعیل بن جامع۔

ابراہیم۔ بیٹا! یہ کونسی مشکل بات ہے۔ کسی روز میرے ساتھ چلے چلنا۔

اسحٰق۔ (اشتیاق بھرے لہجے میں) ابا جان! پھر اسی وقت کیوں نہ چلیں۔

ابراہیم۔ بیٹا! اگر تمہاری یہی خوشی ہے تو آؤ ابھی چلیں۔

غرض دونوں باپ بیٹے اسمٰعیل بن جامع کے مکان پر پہنچے۔ ابن جامع نے نہایت خندہ پیشانی سے دونوں باپ بیٹے کا استقبال کیا۔ عزت کے ساتھ بٹھایا۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد ابراہیم موصلی نے ابن جامع سے درخواست کی کہ از راہِ کرم آپ اس وقت ہم باپ بیٹے کو اپنی موسیقی سے نوازیں۔ ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ آپ سوائے امیرالمومنین کے اور کسی کو اپنی موسیقی سے شادکام نہیں فرماتے اس لئے میں آپ سے خصوصی درخواست کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے دروازے سے محروم نہ بھیجئے گا۔

اسمٰعیل بن جامع نے کہا کہ مجھے زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔ میں آپ کے ارشاد کی بسر و چشم تعمیل کروں گا۔ مگر پہلے آپ میری خوشی پوری کر دیں۔ وہ یہ کہ اوّل کچھ تناول فرمالیں۔ پھر اطمینان سے دعوتِ روحانی کا سامان پیش کروں گا۔ چنانچہ فوراً دسترخوان بچھایا گیا۔ انواع و اقسام کے کھانے چنے گئے۔ دونوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور کھانے سے فارغ ہو کر گانا سننے بیٹھے۔

ابنِ جامع نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ وجد آفریں اشعار سنانے شروع کئے پھر کچھ ایسا سماں بندھا کہ ابن جامع خود بھی لطف اندوز ہو کر جھومنے لگا اور اِدھر باپ بیٹے پر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔ در و دیوار جھومتے نظر آ رہے تھے۔

جب ابن جامع کا جوش کم ہوا اور اس کی حالت اعتدال پر آئی تو باپ بیٹے بھی اپنے ہوش میں آئے دونوں نے ابن جامع کی بے حد تعریف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ان کی درخواست کو قبولیت کا شرف بخشا اور دعوتِ روحانی کا بھرپور سامان مہیا کیا۔

گانا سننے کے بعد دونوں باپ بیٹا ابنِ جامع کے گھر سے رخصت ہوئے تو راستے میں ابراہیم موصلی نے بیٹے سے پوچھا کہو ابن جامع کو تم نے اپنے فن میں کیسا پایا

اسحٰق اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں کچھ عرض کروں۔

ابراہیم اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو آزادی کے ساتھ کہو۔

اسحٰق۔ ابا جان! آج سے پہلے میں آپ کو اس فن میں نہ صرف کامل بلکہ یگانۂ روزگار سمجھا کرتا تھا اور اپنے دل میں خیال کرتا تھا کہ میرے والدِ ماجد سے بڑھ کر اور کوئی مغنی نہیں ہے۔ لیکن جب سے ابن جامع کا گانا سنا ہے قلب کی کیفیت کچھ اور ہے۔

ابراہیم۔ کیا کیفیت ہے صاف صاف بیان کرو۔

اسحٰق۔ کیفیت یہ ہے کہ ابن جامع کا گانا سننے کے بعد اب میں آپ کی بجائے ابنِ جامع کو اس فن کا امام سمجھتا ہوں۔

ابراہیم بیٹے کی یہ بات سن کر خاموش ہو گئے اور اس عرصے پھر باپ اور بیٹے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ رات ہو چکی تھی دونوں گھر پہنچ کر اپنے اپنے بستر پر لیٹ کر سو رہے۔ اسحٰق صبح سو کر اٹھا تو دل میں یہ خیال آ کر اسے حد درجہ پشیمانی ہوئی کہ اس نے اپنے والد ماجد کے سامنے کیوں اس جسارت اور صاف گوئی سے کام لیا جس سے والد ماجد کے جذبات کو ضرور ٹھیس پہنچی ہو گی کہ بیٹے نے میرے باپ ہونے کا خیال نہ کیا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

جب ضروریات سے فارغ ہو کر اسحٰق باہر جانے لگا تو باپ نے اسے آواز دے کر کہا "میاں! ذرا میری بات سنتے جانا۔" اسحٰق کے دل میں تو چور تھا۔ وہ ایک مجرم کی طرح ڈرتا جھجکتا باپ کے سامنے گیا کہ دیکھئے والدِ ماجد اب میرے ساتھ کس سختی سے پیش آتے ہیں۔ مگر جب والد صاحب کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ان کے پاس دیناروں کی ایک ڈھیری پڑی ہے اور باپ کے چہرے پر غصے کے آثار کی جگہ بشاشت ہے۔

اسحٰق نے باپ کے سامنے پہنچ کر ادب سے سلام کیا اور ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابراہیم بولا۔ "دیکھو میاں اسحٰق! سردی کا موسم آ رہا ہے۔ تمہیں گرم کپڑے بنانے کے لئے رقم کی ضرورت ہو گی۔ یوں بھی جاڑے میں کھانے پینے کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ اس لئے یہ دینار لے جاؤ اور اپنے کام میں لے آنا اور کہا تم بتا سکتے ہو کہ اس بار میں نے تمہیں اتنے دینار کیوں دیئے ہیں۔ !

اسحٰق (نہایت ادب کے ساتھ) اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو میں جانتا ہوں

ابراہیم۔ اچھا بتاؤ۔

اسحٰق۔ ابا جان! کل جس بیباکانہ جرأت کے ساتھ میں نے آپ کے حضور اپنے دل کی بات سچ سچ عرض کر دی تھی میری اس سچائی سے خوش ہو کر آپ نے مجھے اس عطیے سے نوازا ہے۔ اب میں اپنی اس طفلانہ جسارت پر آپ سے دست بستہ معافی مانگتا ہوں۔ یقین فرمایئے ساری رات میں اپنی اس جسارت پر پشیمان رہا ہوں کہ مجھ سے یہ نازیبا حرکت کیوں سرزد ہوئی جو سراسر ادب کے خلاف تھی۔

ابراہیم۔ میاں تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں نے تمہیں یہ دینار سچ بولنے پر دیئے ہیں۔ جاؤ اور ہمیشہ ہر حالت میں سچ بولو۔ اور سچ بولنے میں کسی شخصیت سے بھی مرعوب نہ ہونا۔ تمہاری حق گوئی پر میں ناراض نہیں ہوں بلکہ خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ہمیشہ سچ بولنے کی توفیق عطا فرمائے اور تم سے خوش رہے۔

پٹ فیڈر کے کسانوں کی قسمت جاگ اٹھی

> " میں ضروری سمجھتا ہوں کہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کو خبردار کر دوں اس طبقے کی خوشحالی کی قیمت عوام نے ادا کی ہے اس کا سہرا جس نظام کے سر ہے، وہ انتہائی ظالمانہ اور شر انگیز ہے۔ اور اس نے اپنے پروردہ عناصر کو اس حد تک خودغرض بنا دیا ہے کہ انہیں دلیل سے قائل نہیں کیا جاسکتا۔ اپنی مقصد براری کے لئے عوام کا استحصال کرنے کی خوئے بد ان کے خون میں رچ گئی ہے۔ کیا آپ نے محسوس کیا کہ کروڑوں عوام کا استحصال کیا گیا ہے، اور اب ان کے لئے دن میں ایک وقت کھانا حاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ اگر زمیندار اور سرمایہ دار عقلمند ہیں تو وہ نئے حالات کے مطابق خود کو ڈھال لیں گے اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو پھر خدا ان کے حال پر رحم کرے ہم ان کی کوئی مدد نہ کریں گے۔"

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے یہ الفاظ ۲۴ مارچ ۱۹۴۳ء کو دہلی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمائے تھے۔ اس تقریر میں قائداعظم نے پاکستان کے قیام سے چار سال پانچ ماہ پیشتر دو اہم نکات پوری طرح واضح کر دیئے تھے۔ اوّل یہ کہ زمیندار، جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ ایک ایسا استحصالی طبقہ ہے جس نے ملک کے کروڑوں عوام کا استحصال کر کے، ان کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ کر کے اور انہیں زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم کر کے اپنی خوشحالی کے محل تعمیر کئے ہیں ——— اور دوسرا یہ کہ پاکستان کے قیام کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ان کروڑوں عوام کی حالت تبدیل کی جائے جن کو ایک ظالمانہ اور شر انگیز نظام کی بنیاد پر ایک وقت کی پیٹ بھر روٹی بھی نصیب نہیں ہے۔

بانئ پاکستان کی اس تقریر کی بنیادی اہمیت ہے کہ اس کے ذریعہ اس امر کی بھرپور نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ پاکستان کو اسلام کے نام پر محض اس لئے قائم نہیں کرنا چاہتے تھے کہ لوگ یہاں صرف اسلامی شعائر کے مطابق آزادانہ زندگی گزار سکیں، بلکہ پاکستان کا اولین مقصد ان کے نزدیک ایک ایسا عادلانہ اسلامی معاشرہ بھی قائم کرنا تھا۔ جس میں کسی کو کسی کا استحصال کرنے کی اجازت نہ ہو۔ معاشی و اقتصادی عدل قائم کیا جائے اور سماجی

میں ناانصافی، ظلم اور استحصال کے شکار ہونے والے کروڑوں عوام
کو استحصال سے نجات دلائی جائے اور ان کی زندگی میں خوشگوار
تبدیلی لائی جائے۔

قائد اعظم نے اس مسئلے کا ہر پہلو سے جائزہ لیا تھا، اور اس
سلسلے میں واضح فیصلوں کا اعلان کر دیا تھا۔ ۳ جولائی ۱۹۴۳ء کو کوئٹہ
میں تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے بلوچستان کے بدنام زمانہ سرداری
نظام کو جاگیردارانہ اور استحصالی نظام کی بدترین صورت قرار دیا اور
سرداروں کو خبردار کیا کہ وہ پرانی روش ترک کر کے نئے حالات
اور تقاضوں کو محسوس کریں۔ اور اپنے عوام کا استحصال کرنے کے
بجائے ان کی خدمت کے لئے کربستہ ہوں۔ انہیں آنے والی تبدیلیوں
کے مطابق قوم و ملک کی خدمت کے لئے اپنا کردار مثبت طور پر ادا
کرنا ہوگا۔ پھر ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوسی ایٹیڈ پریس آف امریکہ کے
نمائندے سے انٹرویو کے دوران قائد اعظم نے اعلان کیا کہ،

"پاکستان بننے پر موجودہ دور میں ضروری اور
بنیادی نوعیت کی صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینا ہوگا
اور یہی عمل عوامی ضروریات کے تحت بعض دوسرے
شعبوں میں بھی کرنا ہوگا۔"

یہ پس منظر واضح کرنا اس لئے ضروری تھا کہ اس سے پاکستان کی
معاشی و اقتصادی پالیسی کے وہ خدوخال واضح ہو جائیں جو قائدِ اعظم
کرنا چاہتے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد قائدِ اعظم کو قدرت نے
اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے نظریات، اعلانات اور وعدوں کو عملی صورت
دے کر نافذ کرتے۔ اس کے بعد سے پورے بیس پچیس سال تک اس
ملک پر وہی استحصالی طبقہ قابض رہا جس کی گرفت کو توڑنا قائدِ اعظم
کے نزدیک پاکستان کے قیام کا اولین مقصد تھا۔ یہ استحصالی طبقہ
استحصال کو کیسے ختم کر سکتا تھا۔ یہ لوگ دوسروں کے حقوق اور
کروڑوں استحصال زدہ عوام کے دکھ درد کو کیسے محسوس کر سکتے تھے
چنانچہ اس طبقے کی خودغرضی، حرص و ہوس اور صریح ناانصافیوں
کی بنا پر ملک میں سنگین معاشی اور اقتصادی ناہمواری پیدا ہوئی
اور نتیجتاً ملک شدید سیاسی، اقتصادی اور ذہنی بحران سے
دوچار رہا۔

اسی عالم میں ملک کی پہلی منتخب جمہوری حکومت برسرِ اقتدار آئی۔
اور اس کے ساتھ ہی ملک میں ایسے اقدامات کا سلسلہ شروع ہوا جو
قیامِ پاکستان کے بنیادی مقاصد اور قائد اعظم کی دلی خواہشات کے
عین مطابق تھے۔ وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے "اسلام
خطرہ میں ہے" کے پرانے فرسودہ، گمراہ کن اور استحصالی نعرے کو
مسترد کر کے ٹھوس حقیقت عوام کے سامنے رکھی کہ اسلام کو نہ آج
کوئی خطرہ ہے نہ پہلے کبھی تھا، اس لئے اسلام کو بچانے کا کوئی
مسئلہ نہیں، اسلام کی حفاظت اور دفاع پاکستان کے غیور عوام کا
قومی، اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے البتہ اصل مسئلہ استحصال اور
استحصالی نظام کے کروڑوں استحصال زدہ عوام کے ساتھ منصفانہ برتاؤ
کے لئے سماجی اور اقتصادی اصلاحات نافذ کرنے کا ہے۔ یہ بات
بنیادی صداقت کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن قومی قیادت کی جانب
سے پہلی بار اس کا اظہارِ خیال ہوا تھا، عوام نے اس کا پُرجوش خیر مقدم
کیا اور عوامی حکومت سے بھرپور تعاون کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ عوامی
دورِ حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی پاکستان کی تعمیرِ نو، اور عوامی
زندگی میں استحصال کے خاتمے کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس جدوجہد کے پہلے ہی مرحلے میں اس استحصالی طبقے
پر ضرب لگائی گئی جس کی نشاندہی قائدِ اعظم نے ۱۹۴۳ء میں کی تھی
زرعی اصلاحات کے نفاذ کے ذریعہ اراضی کی حد ملکیت مقرر
کر دی گئی اور فاضل اراضی زمینداروں اور جاگیرداروں سے
سرکاری تحویل میں لے کر بے زمین کسانوں میں بلا معاوضہ تقسیم کر دی
گئی۔ اس کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں اصلاحات نافذ کی گئیں
تاہم بنیادی توجہ کسانوں، کاشتکاروں اور چھوٹے زمینداروں پر
مشتمل دیہی آبادی کی فلاح و بہبود پر مرکوز کی گئی جو دراصل اس

ملک کی ۸۰ فیصد آبادی اور ہماری معیشت کی اصل معمار ہے۔

زرعی اصلاحات کے بعد کسانوں کو بے شمار سہولتیں فراہم کی گئیں تاکہ وہ پیداوار میں اضافہ کر سکیں انہیں آبپاشی کے وسائل کیمیائی کھاد کی سہولتیں اور ایک تہائی قیمت پر زرعی مشینری خریدنے کی مراعات دی گئیں اور ان کی ضرورتوں کی کفالت کیلئے وسیع پیمانے پر قرضے بھی دیئے گئے جو بعض حالات میں معاف بھی کئے جاتے رہے ان میں بلوچستان کے کاشتکاروں کے ذمہ صوبائی حکومت کے ۳۶ لاکھ روپے کے وہ قرضے بھی شامل ہیں جو وزیرِ اعظم بھٹو نے گذشتہ مارچ میں اپنے دورۂ بلوچستان کے دوران معاف کر دیئے تھے۔

جہاں تک بلوچستان کے عوام کا تعلق ہے، ان کا تجربہ یہ ہے کہ وزیرِ اعظم جب بھی اس خطۂ وطن کے دورے پر تشریف لاتے ہیں اہلِ بلوچستان کے لئے نئی خوشخبریاں لے کر آتے ہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ وزیرِ اعظم نے اپنا دورہ صوبے کے ساحلی علاقوں سے شروع کیا، اور اس کے دوسرے مرحلے میں جوں ہی ضلع لسبیلہ میں اتھل کے مقام پر پہنچے، عوام نے پہلی خوشخبری سنی، وزیرِ اعظم نے ضلع لسبیلہ کی سرکاری اراضی کے موروثی مزارعین کو اس اراضی کے مالکانہ حقوق دینے کا اعلان کیا اور کہا کہ یہ لوگ کئی صدیوں اور کئی نسلوں سے اس اراضی پر کاشت کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے مالکانہ حقوق تسلیم نہیں کئے گئے اب عوامی حکومت ۳۰ سال کی ناانصافیوں کے ازالے کا تہیہ کر چکی ہے چنانچہ ان موروثی مزارعین کو ضلع لسبیلہ کی سرکاری اراضی کے مالکانہ حقوق دیئے جا رہے ہیں۔

وزیرِ اعظم کے حالیہ دورے کا اہم ترین اعلان ۲۵ جولائی کو بلوچستان کے ضلع نصیر آباد میں ٹمپل ڈیرہ کے مقام پر کیا گیا اور بلاشبہ یہ اعلان اپنے تاریخی پس منظر اور اثرات و نتائج کی بنا پر ایک اہم تاریخی اعلان ہے۔

یہ علاقہ بلوچستان کا مایہ ناز زرعی علاقہ ہے اور پٹ فیڈر نہر سے سیراب ہوتا ہے۔ اس علاقے میں لاکھوں ایکڑ اراضی پر پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیت اور یہاں کی زرخیز زمینوں کی سونا اگلنے کی صلاحیت ہمیشہ مفاد پرست اور استحصالی قوتوں کی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بنی رہی ہے۔ یہاں کے کاشتکاروں کے حقوق و مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی ضرورت کبھی کسی نے محسوس نہ کی۔ بلوچستان میں تو یہ کہاوت عام رہی ہے کہ "پہاڑ سرداروں کا قلعہ ہیں اور ضلع کچھی اور پٹ فیڈر کے میدان ان کی شکارگاہیں ہیں۔"

۱۹۷۲ء کا وہ تاریک دور یہاں کے لوگوں کو ہمیشہ یاد رہے گا جبکہ پٹ فیڈر کے نہتے، پُرامن، سادہ دل اور محنت کش کسانوں پر مسلح حملے کئے گئے، ان کے گھر لوٹے گئے، ان کے مویشی اور ٹریکٹر چھینے گئے۔ ان کی فصلوں اور جھونپڑوں کو آگ لگائی گئی، ان کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے آدمی اغوا کئے گئے۔ اور یہ سب کچھ ایک ایسی صوبائی حکومت کے دور میں دیدہ و دانستہ اور صوبائی حکومت کی مکمل پشت پناہی کے ساتھ ہوا، جو بلوچستان کے عوام کے حقوق کی بحالی اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے ازالے کے نام پر اقتدار میں آئی تھی۔

مفاد پرست عناصر کی ریشہ دوانیوں، سابق سرداروں کے استحصالی حربوں، سابق حکومتوں کی بے تدبیری اور بلوچستان میں کالعدم نیپ کی سابق صوبائی حکومت کے بے رحمانہ رویہ نے کاشتکاروں کے حقوق کی بحالی اور اراضی پر ان کے مالکانہ حقوق تسلیم کرنے کے سیدھے سادے مسئلے کو اس قدر الجھا دیا کہ اس کا حل اگر ناممکن نہیں تو شدید طور پر مشکل ضرور دکھائی دینے لگا تھا۔ لیکن مسائل کو حل کرنے کی بے غرضانہ اور مخلصانہ خواہش اور اس خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عظیم جذبہ موجود ہو تو کوئی مسئلہ لاینحل نہیں رہتا۔

۲۵ جولائی کا دن پٹ فیڈر کے علاقے میں ناانصافی، محرومی اور مایوسی کا آخری دن تھا۔ وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے

اس روز ایک عظیم الشان جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے پٹ فیڈر کی ۵ لاکھ ایکڑ اراضی کے مالکانہ حقوق کسی معاوضے اور قیمت کے بغیر کاشتکاروں کو منتقل کرنے کا تاریخی اعلان کر کے یہاں کے کاشتکاروں کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل کر دیا اور انہیں مایوسی کے گہرے سمندروں سے نکال کر مسرّت و اطمینان کے آسمانوں پر پہنچا دیا۔ اس علاقے میں وزیرِ اعظم کے تاریخی اعلان سے تقریباً ۳۲ ہزار خاندانوں کو فائدہ پہنچا۔ تاہم پہلے مرحلے میں ۱۵ ہزار خاندان اس سے مستفید ہوں گے۔ ان میں وہ خاندان بھی شامل ہیں جو پہلے سے زمینوں پر قابض ہیں اور وہ کاشتکار بھی فائدہ اٹھائیں گے جن کے پاس اس وقت کوئی زمین نہیں۔

وزیرِ اعظم نے اس تاریخی اعلان میں حکومت کے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ:

"پٹ فیڈر کے مسئلے کا حتمی، منصفانہ اور مؤثر حل تلاش کرنے کے لئے حکومت نے اعلیٰ اختیارات کی دو کمیٹیاں قائم کی تھیں جنہوں نے مسئلے کا ہر پہلو سے جائزہ لینے کے بعد اپنی سفارشات پیش کر دی ہیں۔ ان سفارشات کی روشنی میں پٹ فیڈر نہر سے سیراب ہونے والی ساڑھے پانچ لاکھ ایکڑ اراضی میں سے ۲۵ ہزار ایکڑ ان شہداء کے خاندانوں کے لئے وقف کر دی گئی ہے جنہوں نے مادرِ وطن کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ ۵ لاکھ ایکڑ اراضی ۱۶ ایکڑ فی خاندان کے حساب سے کسی قسم کے معاوضہ یا قیمت کے بغیر اس علاقے کے کسانوں کو مالکانہ حقوق کے ساتھ منتقل کی جا رہی ہے۔ حکومت اس اراضی کی کوئی قیمت وصول نہیں کر رہی کیونکہ میں کسی کاشتکار کو مقروض دیکھنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ اس اراضی کی بلا قیمت تقسیم سے حکومت ۵ کروڑ روپے کا نقصان خود برداشت کرے گی۔"

پٹ فیڈر کے علاقے کی ۵ لاکھ ایکڑ اراضی کے مالکانہ حقوق کسانوں کو منتقل کرنے کے لئے کسانوں کو تین گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا گروپ ان کسانوں کا ہے جن کے پاس پہلے سے اراضی موجود ہے ان میں ایسے بھی ہیں جن کے پاس ۱۶ ایکڑ یا اس سے کم رقبے کے زرعی یونٹ ہیں، اور ایسے بھی جن کے پاس ۳۲ ایکڑ تک اراضی موجود ہے۔ ان سب کو یکساں طور پر سولہ ایکڑ اراضی کے مالکانہ حقوق دیئے گئے ہیں۔ اس گروپ کے ۲۰ کاشتکاروں کو زمین کی ملکیت کی منتقلی کا کام ۱۵ اگست تک مکمل کر دیا جائے گا۔

دوسرے گروپ میں وہ کاشتکار ہیں جو ان اراضی پر کاشت تو کر رہے ہیں لیکن ان کے پاس کوئی زمین نہیں ہے۔ تیسرا گروپ اراضی کے ان قابضین کا ہے جن کے پاس اراضی کی ملکیت اور قبضے سے متعلق بعض پرانی سندیں موجود ہیں۔ ان تمام کاشتکاروں کو سولہ سولہ ایکڑ اراضی منتقل کی جائے گی اور یہ کام وزیرِ اعظم کی ہدایت کے مطابق ۱۵ اگست تک پورا کر لیا جائے گا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، وزیرِ اعظم بھٹو کے اس تاریخی فیصلے سے پہلے مرحلے میں ۱۵ ہزار کاشتکار خاندان مستفید ہوں گے لیکن جیسا کہ اعلان کیا گیا ہے کہ ۵ لاکھ ایکڑ اراضی ۱۶ ایکڑ فی خاندان کے حساب سے تقسیم کرنے پر تقریباً ۳۲ ہزار کاشتکار خاندان فائدہ اٹھائیں گے۔

وزیرِ اعظم بھٹو کا یہ فیصلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک بے حد اہم تاریخی فیصلہ ہے اور اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے بے مثال قومی افادیت کا حامل فیصلہ ہے۔ پٹ فیڈر کے کسان عرصہ دراز سے غیر یقینی حالات اور غیر محفوظ مستقبل کے اندیشے دوچار رہتے تھے اور جیسا کہ وزیرِ اعظم نے اپنی تقریر میں بتایا سابق حکومتوں کا اندازِ فکر یہ تھا کہ،

"ان کسانوں کے حقوق و مفادات کی فکر کسی

کو نہ تھی، سوچا جاتا تھا تو ان زاویوں سے کہ یہ
اراضی بڑے افسروں اور ان کی بیگمات کو دے دی
جائے تاکہ وہ اس پر سرمایہ کاری کر سکیں، مشینی کاشت
کے ذریعے پیداوار بڑھا سکیں، ان کسانوں کے
پاس کیا رکھا ہے، یہ تو نہ سرمایہ لگا سکتے ہیں،
نہ ٹریکٹر خرید سکتے ہیں اور نہ ہی پیداوار بڑھا
سکتے ہیں۔"

کسانوں کو اس غیر یقینی صورت حال سے نجات مل گئی ہے
اب وہ ان زمینوں کے مالک خود ہیں، اور ان کے بعد ان کی اولادیں
اس زمین کی مالک ہوں گی۔ اب انہیں نہ کسی بڑے زمیندار اور
جاگیردار کے استحصالی حربوں کا خوف ہے، نہ کسی سردار کے مسلح
حملے کا اندیشہ اور نہ کسی بڑے افسر کو زمین کی ملکیت منتقل ہونے
کا خطرہ۔ انہیں مکمل ذہنی سکون اور تحفظ فراہم کر دیا گیا ہے۔ آبپاشی
کے لئے انہیں پٹ فیڈر نہر کے ذریعہ ان کے اصل حصے سے بھی
زائد پانی فراہم کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ کیمیائی کھاد، عمدہ بیج
اور ٹریکٹروں سمیت ہر قسم کی زرعی مشینری حاصل کرنے کی وافر
سہولتیں اور زرعی قرضوں کی فراہمی کی صورت میں مزید مراعات
فراہم کر دی گئی ہیں۔

ان تحفظات اور سہولتوں کی بنا پر پٹ فیڈر کے علاقہ
میں بسنے والے کاشتکار اب خوب دلجمعی کے ساتھ اپنی زمینوں
پر محنت کریں گے، ان کی زرخیزی اور شاندار پیداواری صلاحیت
سے بھرپور فائدہ اٹھائیں گے اور زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل
کرنے کی جدوجہد کریں گے۔ یہ جدوجہد نہ صرف ان کی اپنی خوشحالی
اور ترقی کا ذریعہ ثابت ہوگی بلکہ اس کے ذریعہ ملک کو غذائی طور پر
خود کفالت کی منزل تک پہنچانے میں بھی زبردست مدد ملے گی۔
اور اس طرح یہ فیصلہ پوری قوم کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ وزیراعظم
بھٹو کے اس حقیقت پسندانہ، منصفانہ اور انتہائی جرأت مندانہ فیصلے
پر پوری قوم کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ خصوصاً ضلع نصیر آباد
کے خوش قسمت کسانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے جذبۂ تشکر
کے عملی اظہار کے لئے اس علاقے کی زمینوں سے بھرپور پیداوار
حاصل کر کے انہیں پوری قوم کے لئے سرمایۂ فخر بنا دیں۔

ڈسیکشن ہال میں ایک تاثر

بشریٰ خاور

آنسہ بشریٰ خاور میڈیکل کالج کی طالبہ ہیں اور ساتھ ہی ایک شاعرہ بھی۔ ان کے سینے میں ایک پُرسوز دل ہے، یہ نظم ڈسیکشن ہال میں ایک مردہ جسم کی تجزیاتی جراحی سے پیدا ہونے والے ان کے تاثر کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ہمیں یقین ہے۔ آنسہ بشریٰ ان لطیف و عظیم جذبات کو حقیقی معنوں میں ایک مستند ڈاکٹر بن کر بروئے کار لائیں گی اور جس جسم نے انہیں چارہ سازیٔ بیمارانِ بے کساں کی عملی تربیت کا موقعہ فراہم کیا، اس کے سیکڑوں ہزاروں ہموطن بہن بھائیوں کی دردمندانہ خدمت کرکے وہ صحیح نذرانہ پیش کریں گی۔

میرے ہاتھوں میں نشتر ہے اور سامنے میز پہ ہے تمہارا بدن
جس کی ہڈیوں پہ چمڑے کا ہے سخت سا پیرہن
جس کے چہرے کا ہر نقش ہے دراصل
ایک ویران اجڑا ہوا سا کھنڈر
میرے سامنے میز پہ ہے تمہارا بدن
اور میں سوچتی ہوں
کہ تم آخری وقت کیا کہہ رہے تھے
کہ اب تک تمہارے لبوں کے دریچے کھلے ہیں
تمہیں کون سی شے کے چھننے کا ڈر تھا
کہ اب بھی
اسی طرح سے ہاتھ بند ہیں تمہارے
مرے سامنے ہے تمہارا بدن
اور میں سوچتی ہوں
کہ پتھر کی طرح یہ خاموش سینہ
کبھی زندہ جذبوں کی حدت سے تپ کر
سلگ اٹھتا ہوگا، دہک اٹھتا ہوگا
یہ خاموش سینہ کہ جس کی تہوں میں
وہ قبریں بھی ہوں گی
جہاں دفن ہیں
کتنی معصوم سی خواہشوں کی وہ کلیاں
جنہیں اپنے کھلنے سے پہلے ہی
مجبوریوں کی صلیبوں پہ قربان ہونا پڑا
اور یہیں دفن ہوگا وہ دل بھی کہ جس میں
کبھی دھڑکنوں کے ترنم پہ نغموں کی جھنکار ہوگی
کبھی بستیوں کے اجڑنے کا غم
اور کبھی پیار لٹنے کا ماتم بھی ہوگا
مرے سامنے ہے تمہارا بدن
اور میں سوچتی ہوں
کہ بے جان و بے بس یہ مردہ بدن
کبھی ماں کی ممتا بھری گود میں

اک حسین پھول کی طرح مہکا تو ہوگا
اور اس کی ہنسی
پاک و معصوم و دلکش رُو پہلی ہنسی
کسی گھر کے آنگن میں سورج کی طرح چمکتی تو ہوگی
مرے سامنے میز پر ہے تمہارا بدن
اور میں سوچتی ہوں
تمہارے لئے بھی کبھی تو کسی کی
نگاہوں میں چاہت چمک اٹھتی ہوگی
کسی نے تمہارے دکھوں کی تپش میں
کئی راتیں جل جل کے کاٹی بھی ہوں گی
مگر آج یہ کیا عجیب بے کسی ہے
کہ اتنی بہت ساری آنکھیں ہیں لیکن
کسی میں تمہارے لئے کوئی آنسو نہیں
کوئی غم کوئی چاہت نہیں
مرے سامنے ہے تمہارا بدن
اور میں سوچتی ہوں
کہ ویران چہرے کے اجڑے گڑھوں میں
کبھی زندہ آنکھیں بھی ہوں گی کہ جن میں
کسی ماہ رُخ کی محبت کی شمعیں
چراغاں کیئے رہتی ہوں گی سدا
وہ آنکھیں کہ بھر آتی ہوں گی جو غم سے
وہ آنکھیں کہ جو مسکراتی بھی ہوں گی
مرے سامنے ہے تمہارا بدن
اور میں سوچتی ہوں
کہ شاید کبھی
کسی موڑ پر یا کسی راہ پر
ہم اور تم
ایک لمحے کو مل کر جُدا ہو گئے ہوں
مگر آج اُس ایک لمحے کی پہچان کا
کوئی غنچہ نہیں
اس شناسائی کی کوئی خوشبو نہیں
اور ابھی چند لمحوں میں نشتر سے میں
تمہارا بدن ریزہ ریزہ کروں گی
اگر تم کو تکلیف ہو تو خُدارا
قسم ہے اُس ایک لمحے کی تم کو
مجھے معاف کرنا مجھے بخش دینا!

فاروق شاہ پوری

اشرف ایرایانی

"شاہ پور" ضلع فتح پور ہسوہ (یو۔پی) کہنے کو ایک چھوٹی سی آبادی ہے لیکن قدرت نے یہاں شخصیتیں عظیم پیدا کیں۔ اسے آباد کرنے کا شرف اوچ شریف کے ایک بزرگ محمد معروف شاہؒ کو حاصل ہے جن سے عقیدت رکھنے کے سبب اکبر اعظم[1] نے ۹ر صفر ۹۸۲ ہجری کو ایک فرمان کی رُو سے طویل و عریض اراضی بہ مد معاش آپ کی نذر کی جس کو آباد کرکے آپ نے اس بستی کا نام "شاہ پور" رکھا۔

اس بستی میں جہاں دوسرے علوم و فنون کے ماہرین پیدا ہوئے وہاں شعر و ادب کا صحیح ذوق رکھنے والوں نے بھی جنم لیا ان میں مولوی محمد شجاع مصنف "منہاج الرشاد" میر مظفر علی۔ مولوی دائم علی، سجاد شاہ پوری۔ اصغر وارثی، محمد اعظم۔ ذاکر شاہ پوری، فاروق شاہ پوری اور منشی شوکت علی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

منشی شوکت علی اردو اور فارسی ادبیات کے ماہر تھے ریاست جھجھر میں قیام کی وجہ سے غالب اور عارف[2] سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے الکزنڈر ہیڈرلی فرانسیسی نژاد اردو اور فارسی زبان میں ان کا شاگرد تھا اس کے دیوان کا دیباچہ منشی شوکت علی کا تحریر کردہ ہے

سید ذاکر علی ذاکر شاہ پوری کا اردو دیوان "نغمۂ بہار" کے نام سے ۱۸۸۶ء میں بہار ہند پریس آگرہ سے شائع ہوا آپ حاتم علی مہر اکبرآبادی کے شاگرد تھے مومن علی صفی امروہوی آپ کے دوست تھے ذاکر شاہ پوری کا انتقال ۱۳۱۵ ہجری میں آگرہ میں ہوا احاطۂ منوہر داس میں مدفون ہیں۔

حاجی سید سجاد حسین سجاد شاہ پوری کا نعتیہ دیوان (قلمی) انجمن ترقی اردو حیدرآباد (دکن) طبع کرانے کے لئے علی شبر حابی ۱۹۴۶ء میں لے گئے تھے ــــ لیکن تقسیم ہند کے بعد دکن کے فسادات میں وہ قلمی دیوان تلف ہوگیا لیکن اس سے قبل انتخاب کلام سجاد الکٹرک پریس الہ آباد سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوچکا تھا ایک زمانہ میں سجاد حسین صاحب نے رسالہ اکبر انقلاب[3] زمانہ اخبار۔ ترجمان اور ہفتہ وار پنچ چون چون نکال کر اردو کی بڑی خدمت کی وہ اپنی بہت سی صفات خصوصاً

---

[1] بحوالہ تاریخ شاہ پور مصنف اصغر وارثی

[2] منقولہ شجرۂ سادات شاہ پور مرتب حاجی سید سجاد حسین سجاد شاہ پوری۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی از مقالات ماجد صفحہ ۱۰

[3] جولائی ۱۹۲۳ء میں روزنامہ اخبار "انقلاب زمانہ" کلکتہ سے شائع کیا جس کے ایڈیٹر محمد مبین کیفی ولد مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی تھے ۱۶ر نومبر ۱۹۲۳ ہفتہ وار اخبار "پنچ چونچوں" اودھ پنچ کے طرز پر شائع کیا اس کے ایڈیٹر اصغر وارثی تھے۔ رسالہ اکبر الہ آباد سے اعظم کریوی کے زیر ادارت شائع ہوا

فیاضیٔ طبع، مہمان نوازی، حاجت روائی اور رفاہ عامہ کے کاموں میں دلچسپی لینے کے سبب عظمت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

اعظم شاہپوری کا اُردو دیوان اُن کے ایک خاص عزیز محمد یوسف نے یادگارِ اعظم کے نام سے سہیل پریس حیدرآباد دکن سے ۱۳۰۹ھ میں ان کے انتقال کے بعد شائع کرایا ان کے انتقال کو ایک حیرت انگیز واقعہ کی حیثیت حاصل ہے جو یادگار اعظم[۵] کے حوالے سے مختصراً یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"یہ ایک عجیب واقعہ گزرا ۲۹ رمضان المبارک ۱۲۰۷ھ کو روزہ افطار کے بعد محمد اعظم نماز مغرب ادا کرنے مسجد میں گئے اسی وقت کچھ ترشح ہونے لگا جس وقت امام مسجد نے نیت نماز باندھی تو دفعتاً گنبد مسجد پر بجلی گری اور اس کو توڑ کر جماعت پر آئی ساری جماعت حالت نماز میں فرشِ مسجد پر گر پڑی اور بے ہوش ہوگئی کچھ وقت گذرنے پر رفتہ رفتہ لوگوں کو ہوش آتا گیا لیکن مرحوم اُسی طرح نماز پڑھتے ہوئے جنت کو سدھارے بجلی گرنے سے مسجد کی عمارت کو کوئی نقصان سوائے اس کے نہیں پہنچا۔ کی شمالی گنبد کے کلس کی نوک دو چار انچ ٹوٹ گئی اور منبر کے سامنے چھ سات انچ کا گڑھا پڑ گیا لیکن انتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ جاء نماز محلی اپنی جگہ بالکل درست رہی۔"

سید محمد فاروق شاہپوری کا قلم نظم ہو یا نثر دونوں میں خوب چلتا ہے دنیا میں شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی ایسے لوگ کم ملتے ہیں جن میں یہ دونوں خوبیاں بہ یک وقت موجود ہوں اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی اچھا شاعر ہے تو نثار مکمل نہیں یا نثار ہے تو شاعر نہ ہونے کے برابر لیکن سید محمد فاروق شاہ پوری میں یہ دونوں اوصاف بدرجہ اتم موجود ہیں۔ آپ محمد اعظم صاحب کے بڑے صاحبزادے ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے آپ کی ولادت ۱۸۸۳ء میں ہوئی ابھی آپ کا عالم طفلی ہی تھا کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا آپ کی کفالت اور تعلیم میں آپ کے حقیقی نانا کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالقادر وکیل سرکار حیدرآباد (دکن) کو بڑا دخل ہے مروجہ اصول کے تحت آپ کی تعلیم کا آغاز مکتب سے ہوا کلام پاک ختم کرنے کے بعد اردو اور فارسی آپ نے مولوی امیر احمد صاحب جو ایرانی کے باشندے تھے سے حاصل کی اس کے بعد اسلامیہ مدرسہ فتح پور میں داخل ہو گئے کچھ عرصہ وہاں تعلیم حاصل کی اس کے بعد عبدالقادر صاحب کے پاس حیدرآباد چلے گئے اور حیدرآباد گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہو کر میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔

شعر و سخن سے چونکہ فطری لگاؤ تھا تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ ذوق و شوق پروان چڑھتا رہا مضامین کی ابتدا پیسہ اخبار سے ہوئی اور کچھ عرصہ ایڈیٹوریل اسٹاف سے منسلک رہے اس کے بعد پولیس میں ملازمت کرلی اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ۱۹۴۴ء میں پنشن لے کر سبکدوش ہوئے "خان صاحب" کا خطاب حاصل کیا تاریخ اقوام جرائم پیشہ کا انگریزی سے ہندی میں ترجمہ کرنے پر برٹش گورنمنٹ سے نقد انعام حاصل کیا۔

آپ نے اپنا تخلص آس رکھا تھا لیکن پھر فاروق لکھنے لگے کسی کے شاگرد نہیں ہوئے لیکن علمِ عروض اور قواعد شعر و سخن سے پوری آگاہی تھی مضامین نظم و نثر قلم بر داشتہ لکھتے تھے ایک مدت تک رسالہ زمانہ، العصر، الناظر، ادیب، مخزن، تمدن، آئینہ، نقاد، نگار، پنجاب ریو وغیرہ میں کثرت سے مضامین نظم و نثر شائع ہو کر شائقین علم و ادب سے خراج عقیدت وصول کر چکے ہیں، ظاہری شہرت اور نام و نمود سے سروکار نہ تھا یہی وجہ ہے کی کتابی شکل میں آپ کا کوئی مجموعہ منظر عام پر نہ آسکا ویسے آپ کے تمام مضامین نظم و نثر آپ کے بڑے صاحبزادے اختر تاباں کے پاس محفوظ ہیں۔

---

[۵] اس واقعہ کی تفصیل یادگار اعظم میں صفحہ اوّل پر درج ہے۔

فاروق شاہپوری کا انتقال ۱۹۶۰ء میں ہوا ہے اگر آپ ایک طرف کامیاب نقاد تھے تو دوسری طرف ایک بہترین شاعر اس سے ذرا ہٹ کر دیکھئے تو مخلص انسان جو اپنی بااصول زندگی۔ نفاست پسندی علمی و ادبی مشغلے۔ اعلیٰ اخلاق۔ نیک نفسی۔ زہد و تقویٰ۔ محبت و مروّت اور ساتھ ہی ساتھ انتہائی صاف گوئی کیلئے مشہور تھے۔

آپ کے دوستوں میں نیاز فتح پوری۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نوبت رائے نظر۔ عارف ہسوی سحر ہنگامی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں یہ تھے وہ مختصر حالات فاروق شاہپوری سے متعلق جو پیش کئے گئے جن سے موصوف کی تہذیبی۔ تمدنی اور معاشرتی زندگی کا پتہ چلتا ہے علم و ادب سے فطری مناسبت نظر آتی ہے اور ان کے شخصیت کے رنگا رنگ پہلوؤں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اس مضمون میں ہم ان کی شاعری کے بارے میں عرض کرنا چاہتے ہیں اس باب میں انہوں نے اپنی ذہانت اور فنکاری کا جو ثبوت پیش کیا ہے اس سے کسی ذی علم کو انکار ممکن نہیں۔

اشعار میں موصوف کی زبان سادہ اور بامحاورہ ہے شیرینیٔ گفتار۔ ندرتِ بیان۔ تشبیہات اور استعاروں کا برمحل استعمال فاروق شاہپوری کے فن اور ان کی بالغ النظری کی عکاسی کرتے ہیں۔ دوست ہی دوست کے افتادِ طبع سے واقف ہوتا ہے خوددار شخص کسی غیر کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا کیونکہ یہ بات شانِ خود داری کے خلاف ہے دوستوں کا کرم دشمنوں کے ستم سے زیادہ گراں ہوتا ہے اس نزاکت کو کس خوبی سے اس شعر میں ڈھالا گیا ہے ملاحظہ ہو۔

دوست کے آگے بڑھاؤں کس طرح دستِ طلب
مانگنے کی ایسے ویسوں سے نہیں عادت مجھے

محبوب کی گلی کا تجزیہ فاروق صاحب نے کس حسین پیرائے میں کیا ہے صبا کی پریشانی سے جو حسن اس شعر میں پیدا ہو گیا ہے یہ ان کے قادر الکلامی کی دلیل ہے اور صفتِ حسنِ تعلیل ہے۔

ترے کوچے سے جو آیا وہ پریشاں آیا
خاک اڑاتی ہوئی آئی جو صبا بھی آئی

محبوب کی ضد کو ادا سمجھ لیجئے عاشق کے لئے محبوب کی ادا ہی سب کچھ ہے حسن اپنی فطرت سے مجبور ہے تو عشق اپنی عادت سے یہ شعر نفسیاتی تجزیے کے مترادف ہے۔

کیا قیامت ہے کہ جب آپ بگڑ جاتے ہیں
وہی کرتے ہیں کہ جس بات پہ اڑ جاتے ہیں

محبت کی منزل سے گذرنا صرف دیوانوں ہی کا کام ہے اس راہ میں اہلِ خرد تو کیا خضر بھی کام نہیں آتے اس شعر میں اسی طرف اشارہ ہے

خضر جس کا راستہ بتلا سکیں
وادیٔ الفت کی وہ منزل نہیں

کسی کا احسان لینا ایک عزت مند انسان کے لئے کسی طرح مناسب نہیں دوسروں کے آگے وہی ہاتھ پھیلاتے ہیں جنہیں خدا پر بھروسہ نہیں ہوتا یعنی جو ظرف خالی ہوتا ہے وہی صدا دیتا ہے۔ قید و بندگی زندگی کو آزادی سے بہتر تصور کرتے ہیں ذیل کے اشعار میں ان باتوں کا عکس ملاحظہ ہو۔

در خورِ احسانِ پیہم کس لئے ہوں اور کا
ہے تہی ظرفوں سے پیچ پوچھو تو بیزاری مجھے
بارِ منت لے کے آزادی جو قیدِ غم سے ہو
اس سے تو بہتر ہے سو درجہ گرفتاری مجھے
خاک کی صورت نہیں آتی ہے سر افگندگی
رکھتی ہے دوشِ صبا پر طرزِ خودداری مجھے

اس شعر میں لطفِ زبان کے ساتھ ساتھ شباب آتے پر حیرت و استعجاب ملاحظہ ہو۔

یہ دیدہ دلیری رقیبوں کے ساتھ
شباب آتے ہی تم کو کیا ہو گیا

اردو شاعری تصوف کے آب و ہوا میں پروان چڑھی ہے اس

لئے تصوف کا رنگ اشعار میں آجانا لازمی بات ہے کیا لطیف شعر فرمایا ہے حوالۂ قلم کرتا ہوں۔

اللہ اللہ کیا فروغِ جلوۂ جانانہ ہے
سامنے جس کے چراغِ طور اک پروانہ ہے

رندوں کی عظمت و احترام کے اشعار غالبؔ۔ جگرؔ۔ ریاضؔ خیرآبادی وغیرہ کے یہاں پائے جاتے ہیں فاروق صاحب کے شعر پر بھی نظر ڈالتے چلئے۔

ہوں وہ مست اگر رُخ کروں میکدے کا
تو ساقی مجھے بڑھ کے لے دس قدم سے

چند اشعار اور دیکھیں ان میں ندرت کلام کیساتھ ساتھ آپ لطف زبان بھی پائیں گے۔

کیا شکر بھی تو گلا ہو گیا
بھلائی بھی کرتا بُرا ہو گیا

یہ آزاد کیا ہوگا قید الم سے
ہے انساں کے پیکر کی تعمیر غم سے

روتے والے روئیں کیا مرگ تمنا کے لئے
شام سے پہلے چراغِ آرزو ٹھنڈے ہوئے

اللہ رے یہ دستِ درازی تری جنوں
دامن جو کل نہیں تھا تو آج آستیں نہیں

وطن سے دور غریب الوطنی میں یاد وطن سوہانِ روح ہوتی ہے جس کا احساس فاروق صاحب کو بھی ہے وہ فرماتے ہیں۔

وہ جلسے یاد آتے ہیں وہ باتیں یاد آتی ہیں
وطن والوں کو ہم فاروق جیسدم یاد کرتے ہیں

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اہل وطن ہی کو یہ یقین ابتدائی دور میں نہ ہوتا رہا ہوگا کہ یہ کلام خود انہیں کے کاوش قلم کا نتیجہ ہیں۔ جیسا کہ ان کی ایک غزل کے مقطع سے ظاہر ہوتا ہے۔

جانے کہ نہ جانے کوئی مانے کہ نہ مانے
شاعر تو ہیں فاروق ہم اللہ کے در سے

ذاکرؔ اور اعظمؔ کے بعد شاہ پور میں شمعِ شاعری کو آپ نے گردش میں رکھا اور بڑے عزم و حوصلہ سے جو کہا تھا کر دکھایا ۔

اب کہاں سودائے الفت وحشت و دیوانگی
وہ زمانہ اب کہاں وہ تم نہیں وہ ہم نہیں
اب ہماری ذات مشہور ہوگا "شاہ پور"
فکر کیا فاروق اگر ذاکرؔ نہیں اعظمؔ نہیں

مختصر یہ کہ فاروق شاہپوری ایک جامع الصفات ادیب و شاعر ہیں انہوں نے ایک دو سال نہیں ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں گزاری ہے، عوام نہ سہی خواص ضرور ان کے نام اور کام سے واقف ہیں ان کے تحقیقی مقالات، علمی مضامین اور تنقیدی شہ پارے انیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل کے ادبی رسائل میں بکھرے پڑے ہیں نظمیں اور غزلیں مستزاد ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی شخص ان بکھرے ہوئے جواہر پاروں کی طرف توجہ کرے اور انہیں ایک لڑی میں پرو کر ایسی مالا بنا دے جو فاروق شاہپوری اور اردو ادب دونوں کے لئے یادگار ہو جائے۔

غزل

رشیدہ سلیم سیمیں

شام تنہا ہے تو شب اور بھی ویراں ہوگی
صبح ہوگی تو بہت بے سر و ساماں ہوگی

اَبر برسا ہے جو سیلاب کی صورت اب کے
مُدّتوں اب نہ کبھی خواہشِ باراں ہوگی

اور ہر شے کی طرح جنسِ وفا بھی ہے گراں
جانے کس شہر کے بازار میں ارزاں ہوگی

چاند آنگن کی منڈیروں پہ تو اُترا ہوگا
چاندنی صحن کی دیواروں پہ لرزاں ہوگی

لحظہ لحظہ کوئی آہٹ سی ہے اُترتی دل میں
خواہشِ قربِ ملاقات کی خواہاں ہوگی

شام سے پھیل گئے درد کے گہرے سائے
آج کی شب میرے گھر کی شبِ زنداں ہوگی

آپ مائل بہ کرم ہوں نہ خدارا ہم پر
اپنی بے مائگی کچھ اور نمایاں ہوگی

اب تو الزام ہی ٹھہرا ہے مقدر اپنا
زندگی کیوں نہ میرے حال پہ گریاں ہوگی!

پھر وہی عرضِ تمنّا، وہی بے تابیٔ شوق
آمدِ فصلِ گُل و موجِ بہاراں ہوگی!!

اسرار و رموز

ڈاکٹر ناظر حسن زیدی

تاریخِ عالم میں بیسویں صدی وہ زمانہ ہے جب یورپ کی تمام قومیں خود نمائی، تسخیر اور غلبے کی خواہش میں گرفتار ہو کر مشرقی ممالک کو اپنی جولان گاہ بنائے ہوئے تھیں۔ برصغیر ہند و پاکستان میں انگریزی اقتدار انتہا کو پہنچ چکا تھا اور ان کی ترقی دیکھ دیکھ کر یورپ کی دوسری قوموں کو رشک و حسد ہوتا تھا کہ ہم بھی تجارتی اور سیاسی میدان میں انگریزوں کے برابر آجائیں۔ رشک اور ہمسری کے اس جذبہ کی وجہ سے پہلی جنگِ عظیم برپا ہوئی جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ اس جنگ میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی اور ان کے مخالفوں کو جن میں جرمنوں کے علاوہ ترک قوم بھی شامل تھی شکست ہوئی۔ ترکیہ کی عظیم حکومت کے جو اسلامی خلافت کی یادگار اور مرکز تھی، ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ایران کی سلطنت کمزور ہوتے ہوتے جاں بلب ہو گئی۔ مصر پہلے ہی برطانیہ کے زیرِ اقتدار تھا۔ غرض پوری اسلامی دنیا پر افسردگی، مردنی اور تباہی چھا گئی۔

ہندوستان نے اس جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا لیکن برطانوی حکام نے آزادی دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہ ہوا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکی سلطان کے شکست کھانے کو اسلامی خلافت کی تباہی سمجھا اور اس کی بحالی کے لئے پورے ملک میں تحریکِ خلافت چلائی گئی جس کے روحِ رواں مولانا شوکت علی اور محمد علی تھے۔ غرض پورا عالمِ اسلام مایوسی اور ناکامی کا شکار ہو گیا۔ اس وقت قدرتاً ہر مسلمان کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش کوئی مردِ مجاہد میدان میں آئے اور ترکیہ، ایران، عرب اور ہندوستان کو برطانیہ کے فولادی پنجے سے نجات دلوائے۔

اسی جذبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے علامہ نے انہی دنوں جمال الدین افغانی کی تحریکِ اتحادِ عالمِ اسلام پر ۱۹۱۵ء میں مثنوی اسرارِ خودی اور ۱۹۱۸ء میں رموزِ بےخودی لکھی۔ اپنا پیغام اکثر ملکوں تک پہنچانے کے لئے انہوں نے یہ مثنوی فارسی زبان میں لکھی کیونکہ فارسی زبان ایران کے علاوہ ترکیہ، عراق اور ہندوستان میں بھی سمجھی جاتی تھی۔ اس کا آغاز مولانا جلال الدین رومی کے ان ولولہ انگیز اشعار سے کیا جن کا مضمون یہ ہے کہ کل شیخ اسلام دن دہاڑے چراغ ہاتھ میں لئے گھوم رہا تھا۔ میں نے پوچھا حضرت آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟ بولا کہ میں حیوانوں اور چوپاؤں کے ساتھ رہتے رہتے بیزار ہو گیا ہوں۔ اب مجھے کسی انسان کی تلاش ہے۔

میرے رفیق سست قدم ہیں۔ میری آرزو ہے کہ کوئی رستم یا
شیرِ خدا جیسا کوئی جواں مرد مجھے مل جائے۔ میں نے کہا تلاش میں
نے بہت کی لیکن شیرِ خدا علی مرتضیٰ اور رستم دستاں جیسے آدمی
کہیں نظر نہیں آتے۔ شیخ نے کہا جو چیز نہیں ملتی نہ ملے۔ میرے
دل میں آرزو بھی ایسی چیز کی ہے جو میسر نہ آسکے۔ مثنوی اسرار و
رموز کے سرورق پر لکھے ہوئے اشعار یہ ہیں ؎

دی شیخ با چراغ ہمے گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست

ان اشعار کے پردے میں بلکہ پوری مثنوی اسرار و رموز
کے پس منظر میں یہی جذبہ اور خواہش جلوہ گری کر رہی ہے کہ کوئی
مردِ مجاہد میدان میں آئے اور مشرقی اقوام بالخصوص مسلمانوں کو
برطانوی اقتدار سے نجات دلوا دے۔ اور جب تک کوئی ایسا
مردِ کامل نمودار نہیں ہوتا، ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی حالت
کو بہتر کرے، اپنی اخلاقی اور روحانی قوتوں کو ترقی دے اور چونکہ
انسان کو خدا کا خلیفہ یا نائب کہا جاتا ہے لہٰذا وہ اپنے اندر ایسی
صفات پیدا کرے جو اسے غلامی سے نکال کر کے آزاد، غیرت مند
اور باعزت مسلمان بنا دیں۔ انہی صفات کے مجموعے کو علامہ اقبال
نے لفظ "خودی" سے تعبیر کیا ہے یعنی مسلمان اپنا درجہ پہچانے کہ
وہ خدا کا نائب ہے اور اپنے اندر خدائے پاک کی صفات پیدا
کرلے جن میں قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت جیسے عناصر شامل
ہیں تاکہ اسے غیروں کی غلامی سے نجات مل جائے۔

انسان کی خودی کو بیدار کرنے کے لئے اور اسے خودشناسی
کے اونچے زینے تک پہنچانے کے واسطے علامہ نے خودی کے تین
مرحلے متعین کئے ہیں۔ انہوں نے ان کا نام اطاعت، ضبطِ نفس اور
نیابت الٰہی رکھا ہے۔ اطاعت سے مراد یہ ہے کہ انسان کے لئے اس
کے روحانی پیشواؤں یعنی پیغمبروں نے جو آئین مرتب کیا ہے اور جسے
عام اصطلاح میں مذہب کہتے ہیں وہ اس کی پابندی سختی سے کرے۔
ضبطِ نفس سے یہ مراد ہے کہ وہ تمام بری باتیں جو ہر مذہب میں ناجائز
سمجھی جاتی ہیں۔ ان سے اجتناب کرے اور نیابت الٰہی کا مطلب یہ
ہے کہ انسان اپنی روحانی قوتوں کو ترقی دے کر وہ صفات پیدا
کرے جو خدا کی ذات میں ہیں یعنی اس میں قہر و غضب، رحم و کرم،
لطف و عنایت، رزاقی، جہاں بانی اور تسخیرِ فطرت کے اوصاف
پیدا ہو جائیں۔

وہ تمام عادتیں اور رجحان جو صدیوں کی غلامی کی وجہ سے
مسلمان ملکوں میں پیدا ہو گئے ہیں ان کی اصلاح ہو جائے۔ غلط
تصوف اور صبر و قناعت کے غلط مفہوم نے مسلمانوں کو بے عمل
کر دیا ہے۔ انہیں دوبارہ ذوقِ عمل سے آشنا کیا جائے۔ یہ
صفات پیدا کرنے کیلئے علامہ نے توحید کو پہلا اصول قرار دیا
ہے کیونکہ اگر انسان خدائے واحد کی معرفت حاصل کرے تو اسے
ہر طرح کے خوف سے نجات مل جاتی ہے۔ پھر وہ بادشاہوں
کے سامنے بھی گردن نہیں جھکاتا۔ علامہ کے اشعار اس سلسلے میں
یہ ہیں ؎

تا عصائے لا الٰہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش
خم نگردد پیشِ باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست
خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

اطاعت اور توحید کے سلسلے میں علامہ مغفور نے یہ نکتے بھی
سمجھائے ہیں کہ جو شخص دل سے لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہوتا ہے

اسے نہ فرزند و زن کی محبت باقی رہتی ہے نہ اہل و عیال کا فکر ہوتا ہے بلکہ وہ ہر وقت اپنے رب کی اطاعت کرتا ہے۔ جب حکم ملتا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح وطن کو چھوڑ کر مکے کے بے آب و گیاہ میدان میں رہنے لگتا ہے اور اپنے اکلوتے بیٹے کے حلق پر چھری پھیرنے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے۔ حضرت علی مرتضٰی کی طرح وہ کائنات پر حکومت کرتا ہے، آفتاب اس کے اشارے سے پلٹ آتا ہے اور رزم حق و باطل میں وہ تنہا پورے لشکر کے سامنے آتا ہے یعنی علامہ کے الفاظ میں اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ؎

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بند زن و اولاد شد

می کند از ما سوا قطع نظر
می نہد ساطور بر حلق پسر

گردش ایام را برہم زند
چرخ نیلی فام را برہم زند

اپنی ان قوتوں کے باوجود یہ شخص، نماز، روزے، حج، زکوٰۃ اور جہاد کا پابند ہوتا ہے کیونکہ نماز سے اس کا دل طاہر ہوتا ہے۔ روزے سے نفس امارہ کی سرکشی ختم ہوجاتی ہے۔ حج سے وہ ایک مرکز پر جمع ہونا سیکھتا ہے۔ زکوٰۃ سے یہ فائدہ ہے کہ انسان کے دل سے دولت کی ہوس نکل جاتی ہے اور غریبوں کو سہارا ملتا ہے اور تمام انسانوں میں مساوات کا رنگ آتا ہے۔ جہاد کے معنی یہ ہیں کہ جب باطل کی گھٹائیں چاروں طرف سے امنڈ کر آجائیں تو ایک غیرت مند انسان کی طرح مسلمان کا فرض ہے کہ وہ باطل کے خلاف سینہ سپر ہوجائے اور اپنی جانِ عزیز خدا کی راہ میں قربان کردے۔ مثنوی اسرار و رموز کے اشعار آپ حضرات کی مزید رہبری کریں گے ؎

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز
قلبِ مسلم را حجِ اصغر نماز

مومناں را فطرت افروز است حج
ہجرت آموز و وطن سوز است حج

حب دولت را فنا سازد زکوٰۃ
ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

دل ز حتیٰ تنفقوا محکم کند
زر فزاید الفت زر کم کند

دولت اور وطن دو ایسی چیزیں ہیں کہ انسان ان کے جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ لیکن مسلمان ان پھندوں میں گرفتار نہیں ہوتا ؎

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم
چوں نگاہ نورِ دو چشمیم و یکیم

مست چشم ساقیِ بطحا ستیم
در جہاں مثل مے و میناستیم

امتیازات نسب را پاک سوخت
آتش او ایں خس و خاشاک سوخت

جب انسان ان مرحلوں سے گزر جاتا ہے تو اس میں نیابت الٰہی کا یا خلیفۂ رحمان بننے کا جوہر پیدا ہوجاتا ہے۔ چونکہ اس کی تمام خواہش اور سارے افعال خدا کی رضامندی کے لئے ہوتے ہیں اس لئے خدا بھی اس سے راضی ہوتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جب اس کے تمام افعال کو خدائے پاک اپنا فعل قرار دیتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں خدا خود بندے سے پوچھتا ہے کہ تیری رضا کیا ہے۔ یہی وہ درجہ ہے جب انسان کے نالوں کا جواب افلاک سے آتا ہے۔ حجاب اٹھتے ہیں، خطاب ہوتا ہے اور انسان اپنے رب کی بارگاہ میں باریاب ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ خودی جس کی تعلیم علامہ اقبال نے اسرار و رموز کے علاوہ پیام مشرق، زبور عجم، بالِ جبریل اور ضرب کلیم میں بھی دی ہے ان خیالات پر مبنی ہے جو انھوں نے قیام یورپ کے دوران میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ کے مفکروں سے

حاصل کئے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی تصنیف فکرِ اقبال میں لکھا ہے کہ اسرارِ خودی
میں نطشے کا اثر بہت نمایاں ہے۔ مجھے بڑے ادب کے ساتھ اس بات
سے اختلاف ہے وجہ یہ ہے کہ اقبال ایک صوفی اور عابد و زاہد آدمی
کے بیٹے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر میں اسلامی تصوّف اور فقر کے
اصول سنے تھے۔ اپنے زمانے کے دستور کے مطابق انہوں نے قرآن
پڑھا تھا اور اپنے استاد میر حسن سیالکوٹی کی تعلیم کی بدولت وہ عربی
پر خاصہ عبور رکھتے تھے اور فارسی میں کامل تھے۔ انہوں نے کلام اللہ
کی ان تمام تعلیمات سے سبق لیا تھا جو انسان کو شرافت، خودشناسی،
اخلاقِ حمیدہ اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا درس دیتی ہیں۔ کلام اللہ
میں جا بجا لاتعداد، لاتحزنوا اور لایخلف المیعاد وغیرہ کی تعلیم
ملتی ہے، جو انسان کو مومن، کامل اور مردِ کامل بناتی ہے۔ علاوہ ازیں
خودشناسی، خودگری اور تسخیرِ فطرت کے متعلق انہوں نے عرفی، رومی
اور سنائی کے کلام سے بھی اثر لیا تھا وہ عرفی کو اتنا بڑا صاحبِ فکر و
تخیل سمجھتے تھے کہ جس کے خیالات پر حیرت خانۂ سینا و فارابی تصدق
ہوتا تھا۔

رومی وہ مرشدِ کامل ہے جس نے اقبال کو مطالعۂ نفس و ذات
سے آشنا کیا۔ سنائی نے اس کے واسطے اپنی کلیات کا بحرِ بیکراں دیا۔
جس کے ادب میں انہوں نے خوب غواصی کی اور ہزاروں لولوئے لالا
حاصل کئے۔ یہاں برسبیلِ تذکرہ ان شعراء کے کچھ اشعار پیش کرنا
ضروری سمجھتا ہوں جس سے ان کے بلند افکار، رفعتِ تخیل اور
گیرائی ذہن کا اندازہ ہوگا۔ عرفی کا وہ شعر ہم سب کو یاد ہے جس
میں وہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر سننے والے ذوقِ نغمہ نہ رکھتے ہوں تو اپنی
لَے اور زیادہ تند و تیز کر دیں۔ یہ شعر جسے بانگِ درا میں تضمین کیا
ہے اور جو انسان کو سخت کوشی کی تعلیم دیتا ہے، یہ ہے:۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

لیکن عرفی کے بعض روح پرور اشعار اور بھی ہیں جن میں وہ
نئے عالموں اور نئی دنیاؤں کی تلاش بلکہ نئی کائنات کی تخلیق کا
منصوبہ بناتا ہے ؎

بساطِ کاندر و طرح دو عالم می تواں کردن
بدست آوردہ ام اندازہ در کار می باید

ان پر سب سے زیادہ اثر مولانا جلال الدین رومی کا ہے جن
کی تعلیم کو وہ تمام مسائل کا حل قرار دیتے ہیں۔ اکثر اشعار میں وہ رومی
کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور ہر مغرب زدہ مسلمان سے کہتے
ہیں کہ اگر تم تہذیبِ مغرب کے جال سے نکلنا چاہتے ہو تو رومی
کا مطالعہ کرو۔ یہ اشعار ان کی عقیدت کو ظاہر کرتے ہیں ؎

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

ایک جگہ بڑی حسرت سے کہتے ہیں کہ ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

رومی کی مثنوی معنوی ان کی نگاہ میں حق اور رومی کی غزلیں جو
دیوانِ شمس تبریز کے نام سے مشہور ہیں ان کے مطالعے میں تھیں۔ بہت
سے اشعار کی گنجائش نہیں۔ یہاں رومی کا ایک شعر جو انسان کو تسخیر
کائنات کی دعوت دیتا ہے اور جس سے تعمیرِ خودی کا سبق ملتا ہے
درج کرنا مناسب ہے اس شعر میں رومی نے پتے سے کہا ہے کہ اے
پتے تو شاخ کے اندر بند تھا، تو نے اپنی ذوقِ نمود اور کوششِ پیہم
سے شاخ کو توڑا اور کونپل بن کر باہر نکل آیا مجھے بھی یہی ترکیب بتادے
تاکہ میں اس جسمِ خاکی کے زندان سے نکل کر اور خواہشاتِ نفسانی
کے چنگل سے چھوٹ کر اپنی شخصیت کا صحیح جلوہ دکھا دوں۔ شعر
یہ ہے:۔

اے برگ قوت یافتی تا شاخ را بشگافتی
چوں رستی از زندان بگو تا من دریں حبس آں کنم

قرآنِ پاک کی تعلیم سے انہوں نے معراج کا سبق سیکھا تھا

اور شعرائے ایران کے اثر سے خودی کے نکتے ذہن نشین کئے تھے۔ ان
کے اُردو کلام سے یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کے عروجِ
نفس، اس کے امکانات اور اس کے رتبۂ عظیم سے کس قدر آگاہ تھے۔
اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج
ناوک ہے مسلماں ہدف اس کا ہے ثریا
ہے سرِّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

جاوید نامے میں انہوں نے افلاک پر اپنی روحانی سیر اور
مختلف زمانوں کی جلیل القدر ہستیوں سے اپنی ملاقات کا حال تفصیل
سے لکھا ہے۔ ایسے بلند نظر شاعر کے متعلق ہمارا یہ خیال صحیح نہیں ہے
کہ وہ نطشے سے متاثر تھا۔ ان پر اسلامی تعلیم کا رنگ اتنا چڑھ چکا
تھا کہ انہیں نطشے سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بلکہ انہوں
نے ایک شعر میں بیان کیا ہے کہ اگر نطشے میرے زمانے میں زندہ ہوتا
تو میں اسے اللہ کی معرفت کا سبق خوب پڑھاتا اور مقامِ کبریا سے
آگاہ کرتا ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

علامہ اقبال کو عرفانِ نفس اور خود شناسی کا وہ مقام حاصل
ہو چکا تھا جب انسان اپنے آپ کو خدائے قادر کا نمائندہ بلکہ رفیق
سمجھتا ہے۔ ان کا یہ مصرع بہت مشہور ہے ؏

خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

ایک اُردو شعر میں ان کا یہ نازِ بندگی انتہا کو پہنچ گیا ہے
جس میں وہ بندگی کو خدائی سے بھی بہتر سمجھتے ہیں ؎

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ایک فارسی شعر میں اس سے بھی زیادہ پُر لطف بات کہی ہے یعنی
خدائے پاک نے انسان کو کہیں کھو دیا ہے۔ اب اسے گم کرنے کے بعد
وہ اسے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح انسان آرزو
کے دام میں گرفتار ہے خدا کی ذات بھی آرزومندی سے
خالی نہیں ؎

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو ست
چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزو ست

یہی انسانیت کی وہ معراج ہے جس طرف اقبالؔ ہر انسان کو
لے جانا چاہتا ہے۔ اس تخیل کو نطشے کے مردِ کامل یا فوق البشر
سے کوئی واسطہ نہیں۔ نہ اقبال کو یہ ضرورت تھی کہ وہ مردِ کامل کا
تصور کر لے یا نمونہ پیش کرنے کے لئے نطشے کی گدائی کرتا۔ علامہ کی
نگاہ میں حضور سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰؐ کی ذات تھی جنہوں نے
ساری دنیا کو کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفس کا سبق دیا۔ ان کی ذات
میں حضرت محمد مصطفیٰؐ کا خاندان یعنی وہ اہلبیت تھے جن کی زندگی
تقویٰ و طہارت، شرافت و شجاعت اور حکمت و سخاوت کا بہترین
پیکر تھی۔ ہر صاحبِ بصیرت کی طرح علامہ کی نگاہ میں اہلبیتِ اطہار
کی سیرتِ عالیہ تھی بالخصوص مولا علی مرتضیٰؑ جن کے نام نامی کو
علامہ اقبالؔ مخزنِ اسرار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اسرارِ خودی میں حضرت علی
مرتضیٰؓ کی صفات کو انہوں نے بڑے والہانہ انداز میں پیش
کیا ہے ؎

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما

طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش
تازہ کن با مصطفیٰؐ پیمانِ خویش

حریت زاد از ضمیر پاک او
ایں مے نوشیں چکید از تاک او

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسول ما رسالت ختم کرد

کل مومن اخوۃٌ اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش

در جہاں وابستۂ دینش حیات
نیست ممکن جز بہ آئینش حیات

مسلم اول شہ مرداں علی
عشق را سرمایۂ ایماں علی

از ولائے دودمانش زندہ ام
ہمچو گوہر در جہاں تابندہ ام

از رخ او فال پیغمبر گرفت
ملت حق از شکوہش فر گرفت

قوت دین مبیں فرمودہ اش
کائنات آئیں پذیر از دودہ اش

مرسل حق کرد نامش بوتراب
حق ید اللہ خواند در ام الکتاب

زیر پاش اینجا شکوہ خیبر است
دست او آنجا قسیم کوثر است

ذات او دروازۂ شہر علوم
زیر فرمانش حجاز و چین و روم

علامہ کی نگاہ میں مرد کامل کا ایک اور نمونہ امام حسین علیہ السلام کی ذات ہے جنہوں نے ایمان اور اصول کو قائم رکھنے کے لئے اپنے خاندان اور دوستوں کو قربان کر دیا۔ علامہ کی نگاہ میں امام علیہ السلام کی ذات عشق کی معراج ہے۔ یہ عشق مختلف شکلوں میں جلوہ گری کرتا ہے۔ کبھی آتش نمرود کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود پڑتا ہے جبکہ عقل تماشائے لب بام میں محو رہتی ہے۔ کبھی فرعون جیسے سرکش و قہار بادشاہوں کے دربار میں کلمۂ حق کہہ گزرتا ہے، کبھی سرمایۂ محراب و منبر بن جاتا ہے، کبھی خیبر شکنی کرتا ہے، غرض جہاں کہیں حق و باطل کی پیکار ہوتی ہے عشق وہاں بے تیغ و براق آتا ہے۔ علامہ کی نگاہ میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی نسل میں عشق و شہادت کا جذبہ ازل سے آخر تک قائم رہا ہے۔ داستانِ حرم غریب و سادہ و رنگین ہے جو ابراہیم و اسماعیل سے شروع ہوتی ہے اور امام حسینؑ کی ذات پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس ذات گرامی سے اقبال کو جو والہانہ لگاؤ ہے اس کا اندازہ رموز بے خودی کے ان اشعار سے کیجئے جن میں انہوں نے اہلبیت سے عشق اور اُن کی پیروی کو دین و ایمان کی شرط قرار دیا ہے ؎

آں امام عاشقاں پور بتول
سرو آزادے ز بستان رسول

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر

سرخ رو عشق غیور از خون او
شوخی ایں مصرع از مضمون او

بر زمین کربلا بارید و رفت
لالہ ھا در خاک ما کارید و رفت

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات ما نوشت

رمز قرآں از حسینؓ آموختیم
ز آتش او شعلہ ھا اندوختیم

تار ھا از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

اے صبا اے پیک دور افتادگاں
اشک ما بر خاک پاک او رساں

غرض علامہ اقبال نے خودی، ایمان اور قلندری کا نسخہ ہی نہیں بتایا بلکہ ان مقدس ہستیوں سے روشناس بھی کرا دیا ہے جو فقر غیور اور ایمان کا نمونہ تھے۔ وہ اپنی اکثر تصانیف میں ان حضرات کے نام بڑے ادب سے لیتا ہے۔ یہاں ایک دو نام آپ کے سامنے پیش کر دینا مناسب ہوگا۔ ؎

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دل مرتضیٰ سوز صدیق دے

دل بیدار فاروقی دل بیدار کراری
مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زور حیدر، فقر بوذر، صدق سلمانی

اب تک ان اشخاص کا ذکر ہوا جنہیں اقبال مومن کامل، مرد کامل، مرد حق یا قلندر کہہ کر پکارتا ہے۔ اسرار و رموز کے آخر میں علامہ نے مسلمان عورت کا مرتبہ بھی متعین کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ مخلوق جسے ہم صنف نازک کہتے ہیں اپنی نزاکت اور لطافت کے باوجود دنیا کی بہت بڑی خدمت کرتی ہے۔ نبی، ولی، پیر، پیغمبر، عالم، فاضل، فلسفی سب اسی کی آغوش میں پل کر جوان ہوتے ہیں۔ علامہ نے براہ راست قرآن اور حدیث رسولؐ سے زندگی کے آداب سیکھے ہیں۔ اس لئے ان کی نگاہ میں عورت کا درجہ نہایت محترم اور قابل عزت ہے۔ یعنی وہ ماں کی صورت میں، بہن کے روپ میں، بیٹی کی شکل میں یا بیوی کے پیکر میں غرض بہرصورت انسان کی ہمدم ہے۔ اگرچہ اس میں مردانہ صلاحیت نہیں لیکن حیدر کرارؓ اور حسینؓ شہید جیسے بہادر اسی کی آغوش میں پلتے ہیں۔ شرافت میں اس کی مشت خاک ثریا اور کہکشاں سے بلند ہے۔ اگرچہ افلاطون اور ارسطو کی سی تصانیف اس نے نہیں لکھیں لیکن ارسطو اور افلاطون نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ ؎

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے علامہ نے عورت کے منصب کو منصب نبوت سے تشبیہ دی ہے انہوں نے رسول کریمؐ کی ایک حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ غرض عورت کے احترام کے تمام حق ادا کئے ہیں۔ اشعار یہ ہیں ؎

نیک اگر بینی امومت رحمت است
زانکہ او را با نبوت نسبت است
شفقت او شفقت پیغمبر است
سیرت اقوام را صورتگر است
گفت آں مقصود حرف کن فکاں
زیر پائے امہات آمد جناں

عورت میں شفقت ہو تو زرد رو کمزور ماں اُن تہذیب یافتہ فرض فراموش لڑکیوں سے بہتر ہے جو خانہ داری اور تربیت اولاد کی ذمہ داری یا تخلیق اولاد کے فریضے کو وبال سمجھتی ہیں۔

عورتوں کیلئے علامہ نے بہترین نمونہ حضرت فاطمہ زہراؓ کو قرار دیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ جناب مریم کو تو ایک ہی شرف حاصل ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ تھیں۔ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو تین شرف حاصل ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ رسول پاکؐ

حضرت احمد مختار ؐ کی بیٹی ہیں۔ دوسرا شرف یہ کہ وہ حضرت علی مرتضیٰؓ
کی شریکِ زندگی ہیں اور تیسری بزرگی یہ کہ وہ امام حسن علیہ السلام
اور امام حسین علیہ السلام جیسے شہزادوں کی والدہ محترمہ ہیں۔ ذیل
کے اشعار میں علامہ نے یہ تمام فضائل بیان کئے ہیں ؎

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز

نور چشم رحمۃ للعالمین
آں امام اولین و آخرین

بانوئے آں تاجدار ہل اتیٰ
مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا

مادر آں مرکز پرکار عشق
مادر آں کارواں سالار عشق

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں خودی اور عشق کے علاوہ
علامہ نے ذوقِ عمل کا درس بھی دیا ہے۔ وہ فلسفہ جو انسان کو کاہل اور
تن آسانی کا سبق دے یا جو اسے ذوقِ عمل سے عاری کر دے علامہ کے
نزدیک مردود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے افلاطون کی بعض تعلیمات
کو رہبانیت اور ترکِ دنیا سے تعبیر کیا ہے اور اسے "راہبِ دیرینہ
افلاطون حکیم، گوسفند از گوسفندانِ قدیم" کہا ہے۔ اسی بنا پر انہوں
نے حافظِ شیرازی کے کلام پر بھی اعتراضات کئے تھے کہ اس کی غزلوں
میں رندی، سرمستی اور بیخودی کے ایسے مضامین ہیں جو انسان کو
آرام طلبی اور عیش پرستی پر مائل کرکے سخت کوشی سے دور کر دیتے ہیں
لیکن حافظ کا نام شروع سے لے کر آج تک اتنا مقبول رہا ہے کہ
لوگوں کو علامہ کی یہ تنقید ناگوار گزری اور ہنگامے سے بچنے کے لئے
انہوں نے ان اشعار کو اپنی مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں حذف
کر دیا تاہم اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کے اکثر اشعار سے یہ
مضمون نکلتا ہے کہ وہ علم و دانش اور فلسفہ جو ذوقِ عمل سے انسان
کو دور کر دے ہرگز قابلِ قبول نہیں۔ وہ علم جس سے انسان میں
بے عملی پیدا ہو جائے، وہ دانش و حکمت جو اسے مقصدِ حیات سے
دور کر دے، کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں۔ اس مسئلے کو علامہ نے بہت
ہی سادہ الفاظ میں پیش کیا ہے اور تخلیقِ مقاصد، جفاکشی اور
سخت کوشی کو انسان کا نصب العین ٹھہرایا ہے ؎

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شرارِ آرزو تابندہ ایم

سخت کوشی کا یہی فلسفہ انہوں نے بعد میں بالِ جبریل میں
بھی پیش کیا ہے۔ ضربِ کلیم تو تمام تر اسی تعلیم سے بھری ہوئی
ہے۔ یہاں تک کہ بعض معترضوں نے ان پر فاشسٹ ہونے کا الزام
بھی لگا دیا۔ لیکن علامہ نہ جابر ہیں نہ ظالم۔ وہ انسان کو صلابت،
سخت کوشی اور جفاکشی کی تعلیم دیتے ہیں کہ مرد کے لئے یہی چیز باعثِ
فخر ہے۔ وہ فارسی کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان کا حوالہ دیتے
ہوئے یہ اشعار پیش کرتے ہیں ؎

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمان خوش آہنگ
دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہیئے شاہین کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ان تعلیمات کے علاوہ اسرار و رموز میں بعض اور مقاصد عالیہ اور اخلاق کا بھی بیان ہے مثلاً توحید و عبادت کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا واقعہ لکھا ہے جس نے جنگل میں شیر کی دھاڑ سننے کے باوجود نماز جاری رکھی اور سلام پھیرنے کے بعد تلوار سے شیر کو ہلاک کر دیا اسی طرح سلطان مراد کا حال لکھا ہے جس نے ایک عمارت کو ناپسند کرتے ہوئے معمار کا ہاتھ کٹوا دیا تھا۔ معمار نے قاضی کی کچہری میں فریاد کی اور قاضی نے بادشاہ کو بلا کر فردِ جرم سنائی اور یہ فیصلہ کیا کہ اس ظلم کی پاداش میں بادشاہ سلطان مراد کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ ان تمام مثالوں سے اسلامی مساوات، عظمتِ انسان اور احترام آدمیت کا سبق علامہ نے ہمیں دیا ہے اور سمجھایا ہے کہ ؎

باخبر شو از مقام آدمی

اس گفتگو سے میری مراد یہ ہے کہ مثنوی اسرار و رموز کو محض وعظ و پند سمجھ لینا درست نہیں۔ یہ مثنوی ایمان کا دفتر ہے، عشق کا صحیفہ ہے اور انسانیت کا آئین ہے۔ علامہ نے اس مثنوی کو نہایت کرب کے عالم میں راتوں کو جاگ جاگ کر لکھا ہے۔ ان کا خونِ جگر اس میں صرف ہوا اور یہ مثنوی شائع ہوتے ہی آج سے پچپن سال پہلے مشرق و مغرب میں مشہور ہوئی۔ ایران میں اسے بڑے احترام سے پڑھا گیا۔ ترکیہ میں جہاں فارسی زبان بخوبی رائج تھی لوگوں نے اسے حرزِ جان بنایا۔ انگلستان میں ڈاکٹر نکلسن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا جس سے امریکہ اور یورپ کے ممالک اس مردِ قلندر کے افکار سے بلکہ قرآن و حدیث کی تعلیم سے آشنا ہوئے آج یہ کتاب فارسی اور اردو کی اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں شامل ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ طلباء کے علاوہ یہ ہر مسلمان کے لئے دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر میں اس کی صحیح تعریف کرنے کے لئے نظیری نیشاپوری کی ایک بیت پیش کر دوں تو وہ اس مضمون کے خاتمے کے لئے موزوں ہوگی: ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم

بونگا

فرخندہ لودھی

کالج میں آئے ہوئے ابھی اُسے چند ہفتے ہوئے تھے کہ اس کی مڈبھیڑ علما سے ہوئی۔ یونہی چلتے چلتے وہ انگریزی ڈیپارٹمنٹ کی طرف جانکلا۔ بوگن ویلیا کی بیل کی اوٹ میں کھڑی علما شاید کسی کا انتظار کر رہی تھی ستمبر کی ڈھلتی دوپہر میں کوئی حسن نہ تھا کسی قسم کی دلکشی نہ تھی۔ کہیں پھول نہ کھلے تھے تاہم مہک میں بسی ہوا اُس کے قریب سے گزری یا وہ خوشبو کے پاس سے گذرا۔ بہرکیف برآمدے میں خوشبو ڈول رہی تھی۔ وہ اس کا پتہ لگانے بڑھتا چلا گیا۔ تعاقب میں چکر لگاتا 'یو' شیپ برآمدے کو عبور کر گیا۔ واپس آیا۔ علما وہیں کھڑی تھی۔ خوشبو اُس کے بدن سے پھوٹ رہی تھی۔ اب کے ذرا رک کر اُس نے علما کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ فیروزی رنگ کی لان کا ڈھیلا ڈھالا کرتا پسینے کے باعث علما کے کاندھوں سے چپکا ہوا تھا۔ گلابی ربن سے بندھے بندمٹھی کے سے بال گوری گردن پر ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ علما اسے سراپا حسن اور خوشبو نظر آئی۔

انسان جہاں بھی ہو جیسے حالات میں بھی ہو اپنے لئے دلکشی کے سامان پیدا کر لیتا ہے زندگی یہی ہے کہ دل کھنچتا رہے۔

جب وہ کشش دل کے ہاتھوں مجبور چوتھی بار علما کے پاس سے گذرا تو علما نے اُسے روک لیا اور انگریزی میں پوچھا۔

"WHAT DO YOU WANT CHILD?"

رشید وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ علما کو اپنی شرارت پر آپ ہی ہنسی آگئی۔

"NAUGHTY BOY?"

وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی۔

سٹوڈنٹس یونین کے دفتر میں شیطان ٹولہ کسی آئندہ تقریب کے سلسلے میں جھگڑ رہا تھا۔ برآمدہ اُن کی آوازوں اور قہقہوں سے آباد تھا۔ رشید کسی بہانے پھر ادھر آنکلا۔ سیڑھیوں کے پل پر کھڑے کسی طالبعلم نے نعرہ لگایا۔

"بونگا اِی اوئے"

رشید نے نظر اُٹھا کر اوپر دیکھا سارے چہرے اجنبی تھے۔ وہ جھینپ مٹانے کے لئے یونین کے دفتر میں گھستا چلا گیا۔ یہاں بھی کوئی اُس کا شناسا نہ تھا۔ وہ پرانے یار دوستوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اُس کی ماں اگر اُسے اپنا حاصلِ حیات تصور نہ کرتی تو ممکن ہے وہ بھی اس قدر بڑے شہر کی اتنی پرانی درسگاہ میں قدم نہ رکھ سکتا۔ قدرت نے اُسے حافظہ اچھا دیا تھا۔ نصابی کتابیں صفحہ در صفحہ ذہن میں محفوظ ہو جاتیں۔ ہر امتحان میں کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل کر لیتا

تھا. شہر میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کا شوق اُس سے زیادہ اُس کی ماں کو تھا.

جب رشید کے دادا نے کہا کہ بیٹا پٹوار پڑھ لے تو اُس نے کوئی احتجاج نہ کیا بلکہ کہا "ٹھیک ہے". نانا اُسے سکول ماسٹر بنانا چاہتے تھے اُس نے نانا کی ہاں میں ہاں ملا دی اور کہا "یہ بھی ٹھیک ہے" دونوں بزرگوار اصل میں اسے جلد سے جلد اہل کار بنانا چاہتے تھے. اس کی ماں فیضاں کو سسر کی بات پسند تھی نہ باپ کی. ان بزرگوں کو قائل کرنے کے لئے فیضاں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ عام طور پر اثر انگیز ہی ہوتا ہے. بزرگ جوانوں کے اُن جذباتی مظاہروں میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں جن میں انکی انا کی تسکین ہو.

فیضاں اپنا شباب ان بزرگوں کی انا کی بھینٹ چڑھا چکی تھی. بچے کے مستقبل کے فیصلے کی گھڑی آئی تو وہ چُپ نہ رہ سکی. اُسے ماضی یاد آ گیا. کیسے کیسے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر اُس نے بزرگوں کی آبرو کا پالن کیا. رشید نہ ہوتا اور وہ اُس کی ذات کی وساطت سے ایک اچھے زمانے کا خواب نہ دیکھتی تو نہ معلوم کیا ہوتا. ایک طرح سے باپ، دادا اور سسر کی عزت اُس کے ہاتھ میں تھی اور اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اُسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرے.

چنانچہ جس روز رشید کے نانا اور دادا جو آپس میں سگے بھائی بھی تھے رشید کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک دوسرے سے بحث رہے تھے تو فیضاں نے صحن میں کھڑے ہو کر علی الاعلان کہا:

"بہت ہو چکا. رشید میری ساری عمر کی کمائی ہے. اس کی زندگی بنانے یا بگاڑنے کا حق میں ہی رکھتی ہوں."

"کیا ــ ؟" دونوں بوڑھوں کی لال داڑھیاں کانپ کر رہ گئیں رشید کو ماں کی جرأت پر سخت حیرت ہوئی اور وہ چارہ کاٹنے والی مشین چلاتے چلاتے رُک گیا. نانی اور دادی جو آپس میں دیورانی اور جیٹھانی تھیں. پھٹکار ڈالتے ہوئے بولیں.

"فیضاں ــ مت ماری گئی ہے. کیا کہہ رہی ہو. کس سے کہہ رہی ہو. کس سے کہہ رہی ہو؟"

"میں کہہ رہی ہوں ــ میرا رشید کالج میں پڑھے گا."

"لے ــ ٹڈی کو بھی میلے کا چاؤ چڑھا ــ"

فیضاں کی ساس نے شوہر کو متوجہ کرتے ہوئے کہا اور وہ حقہ گڑگڑاتے ہوئے سوچ رہا تھا ــ فیضاں جب بھتیجی تھی تب تھی اب وہ بہو ہے اور وہ بھی بیوہ ــ اسے عقل سے کام لینا چاہیئے. فیضاں کا باپ اس وقت سر جھکائے چارپائی کے بان پر بے مقصد انگلیاں پھیر رہا تھا اور خاموش تھا. چند ثانیے اسی طرح گذرے تو فیضاں کی ماں افسردہ لہجے میں بولی.

"فیضاں ! دھیئے. تیرا کون خصم زندہ ہے جو تو ناز کرے گی اور لڑکے کو کرائے گی. تیرے باپ اور تایا جو فیصلہ کریں تیرے فائدہ ہی کا ہوگا. برے وقت میں سب پرائے میری بچی ــ"

"اچھا اچھا ــ تو تم سب پرائے ہو؟ یہ مجھے آج پتہ چلا. کاش. کاش ــ" فیضاں نے دو تین دو ہتڑ اپنے سر پر مارے منہ پر طمانچے مارتی دیوانہ وار رشید کی طرف بڑھی اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی.

چل پتر چل ــ ابھی چل ــ یہ ہمارے کچھ نہیں ہوتے ــ ارے میں کن کی لاج سنبھالے رہی جو میرے اپنے نہ تھے."

رشید ماں کو بین کرتے دیکھ کر دھاڑیں مارنے لگا. پندرہ سولہ برس کا لڑکا جس کی ابھی چند دن پہلے آواز ٹوٹی تھی "بھائیں بھائیں" رو رہا تھا. پاس پڑوس کی عورتیں مرد بچے دوڑے آئے. عورتوں نے فیضاں کو گھیر لیا. "پاگل ہو گئی ہے. ساری عمر کی رکھی رکھائی یوں غارت کر رہی ہو ــ ہائے تو تو گائے تھی ــ تجھے کیا ہوا؟"

"میں گائے ہوں نہ بکری. ایک نوجوان بیٹے کی ماں ہوں اور میرا اس کے سوا دنیا میں کوئی نہیں."

فیضاں نے اپنے گرد جمع عورتوں کو دھتکار دیا.

"جاؤ ــ اپنے اپنے گھروں کو ــ تماشا دیکھنے آئی ہو چڑیلو! ساری عمر تماشا دیکھتی رہیں ہو ــ جی نہیں بھرا ــ"

فیضاں نے رشید کے کندھے پر ہاتھ رکھا. ماں بیٹا شست

قدموں سے احاطے کے دروازے کی سمت چل دیئے۔ رشید مجبور بچھڑے کی مانند اپنے پالنے والوں کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔

نانی جو اسے مصری اور مکھن چٹایا کرتی تھی اور دادی پراٹھوں کی چوری میں مغز بادام ڈال کر کھلاتے ہوئے "صدقے جاواں میرے موئے جان محمد دی نشانی" کہتی تھی۔ اُس کا دادا نانا اور رشتے کی چچیاں تائیاں اور ممانیاں یہ سب اُسے میلہ دیکھتے آئے ہوئے لوگ نظر آتے تھے اور رشید کی آنکھوں میں دنیا گھوم رہی تھی۔

ماں کے زبان کھولنے نے آج گھر کا نقشہ ہی بدل دیا۔ رشید کو ماں پر ترس بھی آ رہا تھا اور غصہ بھی۔ ماں کی بلند آواز نے آج گھر کے درو دیوار میں دراڑیں سی ڈال دی تھیں عورتیں فیضاں ہی کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"بیٹا دس جماعت کیا پڑھ گیا فیضاں بی اے ایم اے ہو گئی۔ دیکھو کیسے سر اٹھا کے چل رہی ہے۔"

ماں بیٹے نے لمبا چوڑا صحن عبور کر لیا تھا کہ رشید کی دادی باز کی طرح جھپٹ کر رشید کو بازو سے کھینچتے ہوئے چیخی۔

"یہ نہیں جائے گا۔ تو بے شک جا۔ ہم بھی دیکھیں کس کو تاک رکھا ہے۔"

پھر وہ مردوں کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"جان محمد کے ابّا! کیا بٹ بٹ تک رہے ہو اور غفورے عزت جاتی کیا تجھے نظر نہیں آتی؟"

فیضاں کا باپ کسی سوچ میں گم تھا۔ چونک کر اٹھا اور رشید کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

"بھابی! منہ سنبھال کر بات کر۔ فیضاں کے منہ پر کالک نہ مل۔ اُس نے اپنی جوانی اس گھر کی عزت پر قربان کر دی اور آج تو اسے راہ دکھانے چلی ہے۔"

"رشید میرے بچے کا خون ہے اس پر میرا حق ہے۔" ساس چلائی۔

"حق ہے تو لے پکڑ۔" فیضاں کے باپ غفور نے رشید کو زور سے دھکیل دیا۔ وہ چارے والی مشین پر گرتے گرتے سنبھلا۔ اُس وقت اُسے خیال آیا کہ ماں اُسے پیار سے کھلونا کہتی تھی تو سچ ہی کہتی تھی۔ ان بوڑھے ہاتھوں میں وہ کھلونا ہی ہے۔ اُس میں جان نہیں۔ یہی چابی دیتے ہیں تو اس کے کل پرزے چلتے ہیں۔

آج یہ پہلا موقعہ تھا کہ فیضاں کی ماں اور ساس روایتی دیورانیاں اور جٹھانیاں نظر آ رہی تھیں ورنہ فیضاں کی ماں اپنی جٹھانی کے سامنے ہمیشہ دبی ہوئی، کم آمیز اور صلح کل سی بنی رہی۔ اُس نے جتنی بسر کی جیٹھ اور جٹھانی کے سائے سائے بسر کی۔ اُس کی اپنی کوئی حیثیت نہ تھی۔ بیٹی بیاہی اُسے پتہ ہی نہیں چلا۔ سب اہم کام کیونکہ انجام کو پہنچے پھر فیضاں کا میاں مرا تو جیٹھ جٹھانی نے فیضاں اور بچے کو اپنے پروں کے نیچے سمیٹ لیا جیسے وہ صرف انہی کی ذمہ داری تھے۔ فیضاں کا باپ اور تایا کھیتوں میں کام کرتے اور عورتیں گھرداری کرتیں۔ زندگی ایک نہج پر چل رہی تھی۔ بیاہ اور بیوگی جیسے حادثات سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ سب کام اسی احاطے کے اندر انہی چھتوں کے نیچے بخیر و خوبی ہو گئے۔

مگر آج جب نانا نے نواسے کو کھینچ کر چارے کی مشین پر دے مارا تو اہلِ خانہ کے اندر نہ جانے کیا کیا ٹوٹ گیا۔ رشید کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی مگر نانی مظلوموں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور فیضاں دروازے کا پٹ تھامے کھڑی اور اُس کے مکینوں کو یوں تک رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ دادا نہ معلوم کس خیال کے تحت اچانک اٹھے اور فیضاں کو بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے آہستہ سے بولے

"فیضاں! دھیئے۔ غصہ تھوک دے۔ تو مالک ہے جو کہے گی ہوگا۔ لڑکا کالج میں پڑھے گا۔"

جان محمد کے ابا! لڑکا کالج میں نہیں پڑھے گا۔ سمجھے۔ دس جماعتوں نے بہو کا دماغ خراب کر دیا۔ بی اے پڑھ گیا تو ماں بیٹا آسمان توڑ دیں گے۔ تم گھر کے بڑے ہو عقل سے کام لو۔" یہ رشید کی دادی تھی جو شوہر کو نرم پڑتے ہوئے دیکھ کر آنے والے وقت سے آگاہ کر رہی تھی۔ فیضاں کی

ماں بیٹی کو پکڑا کر چارپائی تک لاتے ہوئے میاں نے۔

"بھابی! دھن جگرا میرا میں نے ساری عمر تیرے سامنے سی نہیں کی لیکن اب نہیں چلے گی۔"

رشید کو کالج میں پڑھانے کی خواہش نے گھر کے اندر دو مختلف آرا کو جنم دیا۔ ان آرا کی روشنی میں ہر شخص نے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ ورنہ اس گھر میں چھ لوگوں کی بجائے ایک شخصیت رہتی تھی اور یہ شخصیت نسل در نسل منتقل ہوتی چلی آرہی تھی جس کو عام طور سے کسی گھرانے کی روایت کہا جاتا ہے۔ لوگ روایت سے اپنا دامن آتنا کس کے باندھتے ہیں کہ صدیوں گرفت عادت اور عادت ایک قدر بن جاتی ہے۔

فیضاں نے اس قدر کو کیونکر منفی قرار دیا۔ اُس کی امنگوں کی قربانی کا نتیجہ تھا یا بیٹے کے تعلیم یافتہ ہونے نے اُس میں عجیب حرارت پیدا کر دی جس پر سب حیران تھے۔ اور رات ہونے تک دو بھائی ایک دوسرے سے الگ سوچ چکے تھے دو گھرانے وجود میں آچکے تھے۔ فیضاں کا میکہ اور فیضاں کی سسرال۔ آج گھر میں چولہا جلا نہ روٹی پکی۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کا پیٹ طعن و تشنیع سے بھرتے رہے۔ چیخ چیخ کر اپنی قربانیوں اور دوسرے کی زیادتیوں کا پرچار کرتے ہوئے گھرانے کی ساکھ اور آبرو کے پرخچے اُڑاتے رہے۔ فیضاں کی ماں نے صاف کہہ دیا۔

"فیضاں کے ابّا۔ اب جو فیضاں کہے گی وہی ہوگا۔"

اُس وقت گھر میں دو عورتیں دو مرد، ایک لڑکا ایک طرف تھے۔ بوڑھے جوان اور نوخیز تینوں زمانے ایک بات کہیں تو وہ حقیقت بن جاتی ہے۔ رشید کی دادی ایک روایت تھی رد کر دی گئی۔

اگلے ہفتے داخلے کے سلسلے میں دادا ابا خود رشید کے ہیڈ ماسٹر کے پاس گئے اور اس طرح وہ ہیڈ ماسٹر کے وسیلے سے کالجیئٹ بن گیا۔

یہاں اُس کا حلقۂ یاراں چند ہی ہفتوں میں وسیع ہو گیا کیونکہ ہاسٹل کی خوراک سے اکتائے ہوئے نوجوانوں کے لئے اُس کے پاس کافی سامان ہوتا تھا۔ طرح طرح کی پنجیریاں، مکھن، انگوری گیہوں کے مرونڈے، قسم قسم کے حلوے، پنیڈیوں کے کنستر تو کبھی خالی نہ ہوتے تھے۔ گھر والے باقاعدگی سے بھجواتے رہتے دنیا میں کھانے والے یاروں کی کمی نہیں ہوتی کام کرنے والے کم ہوتے ہیں۔

وہ اپنے نانا دادا کا اکلوتا نواسا اور پوتا تھا۔ دونوں طرف سے مہربانیوں کی زنجیروں نے اُسے جکڑ رکھا تھا لیکن لاہور آکر اُسے یوں لگا جیسے یہ زنجیریں ربڑ کی تھیں۔ وہ انہیں جتنا چاہے کھینچ سکتا ہے۔ شہر کی رونق اور بھیڑ بھاڑ میں گم ہونے کے لئے رشید بے تاب تھا۔ وہ اب تک پیار کی جانے والی ہستی تھا مگر انسان تھا خدا تو نہیں کہ فقط چاہے جانے کا تقاضا کرے۔ چاہت کے درد سے آشنا ہونا ہی زندگی کی مٹھاس ہے

رشید کے لئے کالج کا زمانہ مطلق العنانی کا دور تھا جو چاہے کرے۔ وہ شروع شروع میں ایک دو بار گاؤں گیا تو شہر گاؤں کے واضح فرق نے اُسے خاصا بد مزہ کیا۔ یاروں کی محفلیں یاد آتی تھیں ہر لڑکی کو عاشق کی نظر سے دیکھنے میں کتنا لطف تھا۔ گاؤں میں عورت کو ماں بہن سمجھنے کی وہی صدیوں پرانی ریت، وہی پرانے رستے وہی پرانے لوگ مگر شہر کا لطف ہی اور تھا۔ اُس کے اپنے کالج میں ہی سیکڑوں رنگ سیکڑوں زاویئے تھے۔ یہاں نیلی آنکھوں والی سلمیٰ تھی، بلونڈ طاہرہ تھی، سانولی رقیہ کے سراپا کے ساتھ پورا کالج سانس لے رہا تھا۔ اور ان سب سے زیادہ محبوب ہستی علما کی تھی جس کے پاس سے گزر جانا ہی نئی دنیا سے آگاہ ہونا تھا۔

جب سے بوگن بیلیا کی اوٹ میں کھڑی علما نے اُسے مسکرا کر پاس بلایا تھا۔ وہ اُس کے ذہن سے محو ہونے کا نام نہ لیتی تھی صبح شام رات دن، سفر میں حضر میں، اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک تصویر پھرتی رہتی جس کے پس منظر میں مہندی اور توت کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ لال اینٹوں کے ستون سے لپٹی ہوئی سبز بیل میں گلابی پھولوں کے گچھے۔ بے شمار گچھے جن میں پتوں کا سبزہ محض زمین سے

بیوشگی کا بھرم تھا۔ ورنہ بوگن بیلیا کے گلابی اور سنہری شعلوں نے کالج کی بلڈنگ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور یہ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ان شعلوں میں چھپی ایک چنگاری تھی عِلما جس نے رشید کے بھُس بھرے دل میں سلگن پیدا کر دی۔ چڑھتی عمر میں لڑکوں کا خون خون نہیں ہوتا خالص پٹرول ہوتا ہے۔ دھوپ سے آگ پکڑنے کو تیار۔ اگر عِلما سولہویں کی طالبہ تھی اور وہ صرف گیارھویں میں پڑھتا تھا تو کیا؟ عشق اور مشک موقع محل کب دیکھتے ہیں بس چل نکلتے ہیں۔

عِلما برآمدے کے ستونوں کا سہارا لئے حسبِ معمول کسی گتھی کو سلجھانے میں غرق تھی۔ اُس کے گرد لونڈے پاٹے ہمیشہ کی طرح منڈلا رہے تھے۔ رشید اُس کے قریب جاکر ایک دم رُک گیا گویا کسی نے بریک لگا دیا ہو ـــــ عِلما اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"ہیلو ـــــ"

"ہیلو ـــــ"

عِلما عام لڑکیوں کی طرح چھوئی موئی نہیں تھی۔ لٹک مٹک کر کم دکھاتی تھی۔ اعتماد سے بات کرتی اور لڑکوں کے لئے اس کا یہی رویّہ دلکش کا باعث تھا۔ عِلما کے لئے رشید کا یوں ہیلو کہنا کوئی نئی بات نہ تھی اور نہ ہی اُسے خیال آیا کہ اُس میں کوئی پیغام چھپا ہے۔ رشید نے ہمت کر کے انگریزی میں کہا۔

"میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

اوہ ـ یقیناً۔"

اس کے بعد وہ بلا جھجک عِلما کے پاس جاکر کھڑا ہوتا۔ وہ اس سے اُس کی عمر اور سمجھ بوجھ کے مطابق باتیں کرتی اور اپنے خاص انداز میں نصیحتیں کرتی رہتی۔ اُن کی گفتگو کا موضوع محبت کبھی نہ ہوا۔ تاہم رشید روز بروز عِلما کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا گیا۔

بڑے دنوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ رشید عِلما کو نئے سال کا ایسا تحفہ دینا چاہتا تھا جو وہ اپنے سے جدا نہ کر سکے۔ دادا دادی سے روپے منگوالئے۔ انہوں نے معذوری ظاہر کی تو نانا نانی کو آزمایا ـــ مطلوبہ رقم وہ بھی فراہم نہ کر پائے۔ ماں کا دل بیٹے کی خوشی سے زندہ تھا۔ بیٹا جاکر ماں کے پاس رویا اور اُس نے چپکے سے اپنی شادی کے وقت کا طلائی کڑا بیٹے کے حوالے کیا۔

"تو جا۔ ضرورت پوری کر۔ پوچھیں گے تو دیکھا جائے گا۔"

رشید سوچ رہا تھا۔ پوچھے گا کون؟ آخر ان تمام چیزوں کا مالک میں ہوں۔ یہ بوڑھے ایک ایک کر کے لدجائیں گے۔ رہ جائے گی اماں تو وہ میرے دم سے زندہ ہے۔

لاہور واپس آتے ہی اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ پرانے فیشن کا کڑا اونے پونے فروخت کیا۔ پھر بھی اُس کے ہاتھ میں معقول رقم تھی اُسے رات بھر نیند نہیں آئی۔ دن بھر چین نہیں آیا۔ جیب میں رقم ڈالے وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ عِلما آج کل سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف متوجہ تھی۔ کبھی کبھی لائبریری میں نظر آتی یا پھر سیمینار روم میں کتابیں سامنے اور سر پر ہاتھ دھرے کسی سوچ میں گم ـــــ اچانک دھڑا دھڑ نوٹس لینے شروع کر دیتی ـــ کتنے اس کے غم میں سُلگتے تھے اُسے کیا؟ لڑکیاں کالج میں عام طور سے عشق کرتے یا بر ڈھونڈنے کی غرض سے داخل ہوتی ہیں۔ سب اپنے حساب سے کام میں مصروف تھیں ـ

سیمینار روم میں عِلما کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے صفحات سیاہ کر رہی تھی۔ رشید پہنچ گیا۔

"باجی! آپ میرے ساتھ چلیں گی۔"

"کہاں ـ؟" عِلما نے کام میں منہمک رہتے ہوئے پوچھا

"انارکلی ـ"

"کیا لینا ہے؟" عِلما نے کتاب سے نگاہیں نہ اٹھائیں۔

"تحفہ ـ"

کس کے لئے؟

عِلما کی توجہ کتاب سے ہٹ گئی۔ رشید نے بچوں کی طرح جھینپ کر کہا۔

"آپ کے لئے۔"

"میرے لئے۔؟" عِلما نے کاغذ اور قلم ایک طرف رکھ دیا اور بظاہر چونکتے ہوئے بولی۔

تو تم میرے لئے تحفہ خریدو گے؟

اُس کا لہجہ کچھ یوں تھا۔ جیسے تتلا کر کہہ رہی ہو۔

"منے میاں کتنے پیسے ہیں تمہارے پاس؟ چلو میری طرف سے ٹافی کھالو ان کی۔" اور جب رشید نے سو سو روپے کے پندرہ نوٹ اُس کے سامنے رکھ دیئے تو وہ کبھی رشید اور کبھی نوٹوں کو دیکھ رہی تھی پھر اُس نے اپنے حواس مجتمع کر کے پوچھا۔

"کہاں سے لئے؟"

"اماں سے۔"

چوری تو نہیں کئے؟"

"ہرگز نہیں ــ میں آپ کے لئے تحفہ خریدنا چاہتا ہوں اور چوری کروں؟ ــ نا"

"شاباش ــ" عِلما نے اُس کی پیٹھ تھپکی۔

"اچھا چلو سمیٹو انہیں۔ چوری نہیں کئے تو چوری ہو جائیں گے۔"

"آپ رکھ لیجئے ــ اور ــ"

"کیوں میں کیوں رکھوں؟"

"آپ ہی کے ہیں۔"

ایسے نہیں کہتے ــ"

کیسے کہتے ہیں؟ ــ میں تو آپکا احترام کرتا ہوں عزت کرتا ہوں اور ــ اور ــ مجھے ــ" وہ ہکلانے لگا تھا۔ عِلما نے ہنستے ہوئے فقرہ مکمل کر دیا۔

"مجھے آپ سے محبت ہے۔"

رشید کی آنکھیں چھلک اٹھیں اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ عِلما نے دیکھا کہ رشید کا وجود دھیرے دھیرے کانپ رہا ہے اور وہ انتہائی بے بس ہے۔

چند لمحے اسی خاموشی میں گذر گئے۔ رشید روتا رہا۔ عِلما سوچتی رہی کہ کیا کرے۔ پھر اُس نے رشید کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے نیم وا بھیگی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں وہی ازلی گواہی تھی۔

میں نے تیرے لئے جنم لیا ہے ــ دیکھ میں تیرے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہوں ــ عِلما نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے ہاتھوں سے رشید کے ہاتھ یوں چھوٹ گئے۔ جیسے نیند کے ماتے ہاتھوں سے کھلونا۔ اُس وقت وہ دونوں بچوں کی مانند تھے۔ بے خیال، حیران سے۔

کافی دیر کے بعد عِلما نے سوال کیا۔

"رشید مجھ سے بیاہ کرو گے؟"

رشید کو اس سوال کی توقع نہ تھی وہ UP SET ہو گیا۔ یہ تو اُس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ کبھی نہیں۔ اور یہ بات فی الحال سوچنے کی تھی بھی نہیں۔ تاہم سوال بے حد اپیلنگ تھا۔ اُس کے رومان زدہ ذہن نے فوراً ہامی بھری۔

"آپ مجھے EMBARESS کئے دے رہی ہیں ــ دیکھئے ــ اس سوال کا جواب ــ" اُسے پھر کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ عِلما نے خود جواب بنایا ــــ

اس کا جواب تم اماں سے پوچھ کر دو گے ــ ہیں نا۔"

"ہوں ــ مگر آپ میرے ساتھ چلیں نا! تحفہ خریدنا ہے ــ"

مگر مجھے آپ سے کچھ نہیں لینا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ نے اپنی اماں سے پوچھا نہیں ــ"

عِلما نے میز پر بکھرے ہوئے کرنسی نوٹ سمیٹ کر اُس کی جیب میں بھر دیئے اور کتابیں اکٹھی کر کے جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

"میں تو چائے پیوں گی ــ بڑی سردی لگ رہی ہے چلتے ہو؟"

اور وہ اُس کے پیچھے پیچھے سر جھکائے سیمینار روم سے باہر نکل آیا۔

دونوں چپ چاپ سیڑھیاں اترے۔ رشید کا دل بھاری تھا اور منہ سے ٹھنڈی آہیں نکل رہی تھیں۔ ریڈنگ روم میں اُس کے ہم جماعت

پڑھنے کے بجائے شور مچا رہے تھے۔ کاؤنٹر پر بیٹھا کلرک انہیں بار بار منع کرتا تھا۔ علما نے لائبریری کی کتابیں واپس کیں اور الٹے قدموں واپس آگئی رشید لڑکوں کے جھنڈ میں سر دے کر کھڑا تھا۔ لڑکے کسی TRIP پر جانے کا پلان بنا رہے تھے۔ رشید کو ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی پھر وہ علما کے ساتھ ساتھ چلتا لیڈیز روم تک چلا گیا۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ چلیں گی نا؟"

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

وہ بوکھلا کر رہ گیا۔

"پہلے آپ۔"

"نہیں۔ پہلے آپ۔"

وہ بے ساختہ ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر پہلے کی یبوست ایک قہقہے سے کافور ہوگئی۔

کالج OVER ہوگیا۔ علما گھر چلی گئی۔ فرد فرد کرکے رونق ختم ہوئی صرف میوزک روم سے طبلے اور ستار کی آواز آرہی تھی۔ مالی گھاس کاٹنے والی مشین سے سکوت توڑنے کا اہتمام کر رہا تھا۔ رشید ہوسٹل جانے کے بجائے لان میں پڑے بنچ پر لیٹ کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ اسے بھوک تھی نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔

وہ اب تک با اعتماد دوست بھی بنا نہیں سکا تھا اور پھر کالج میں داخل ہوتے ہی مخالف جنس کی کشش نے اسے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی جنس کی طرف توجہ دے۔

اگلے روز علما سے پھر مایوس ہوا۔ آج تو اس نے انتہا کر دی۔ گھپ اندھیرے کاریڈور میں سے گذر کر وہ کسی پروفیسر کے کمرے میں جا رہی تھی اُس کے ساتھ اُس کی ہم جماعت لڑکیاں تیز تیز باتیں کرتی چلی آرہی تھیں۔ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے رشید کو دیکھ کر علما رُک گئی اور اندھیرے سے روشنی میں کھینچ لائی۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

علما کی سہیلیاں یوں ہنسیں جیسے انہیں رشید کے بارے میں پورا علم ہو۔ ناٹے قد کی زرد رُو انیسہ آگے بڑھی۔

"سنا ہے آپ بڑے اداس ہیں آج کل؟"

"قطعی نہیں۔"

"تو پھر علما آپ کے لئے پریشان کیوں ہے؟"

"نہیں تو۔"

وہ لڑکھڑا گیا اور کتابیں اُس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچیں۔ علما مسکرا رہی تھی رشید کو اس وقت علما کی مسکراہٹ زہر لگی اور اندازہ ہوا کہ وہ جان بوجھ کر لڑکیوں کو تیار کرکے لائی ہے تاکہ اس کا مذاق اڑایا جائے۔

دو دن اور گذر گئے۔ وہ علما کو تحفہ دینے میں کامیاب نہ ہو سکا علما ہر بار "CRAZY BOY" کہہ کر ٹال دیتی تھی۔ باقاعدہ جھڑکتی بھی نہ تھی اور رشید کو اُس کا یہ رویہ قتل کئے دے رہا تھا۔ ان دو دنوں میں اُس کی جان پہچان انیسہ سے ہوگئی۔ انیسہ خود ہی اُس کے پاس آکر رک جاتی۔ بہت سی باتیں پوچھتی اور بہت کچھ بتاتی اور رشید کو ایسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی کی پناہ میں چلتا جا رہا ہے۔ اُس کی آوارہ روح کو سہارا سا مل گیا ہے۔

انیسہ میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ لباس اور طور اطوار سے بھی معمولی گھرانے کی لگتی تھی مگر لڑکوں کے ساتھ بے تکلف ملتی۔ ہر کلاس کا لڑکا اُس سے مخاطب ہو سکتا تھا وہ ہر ایک سے یہی کہتی۔

"مجھے بھائی بنانے کا بے حد شوق ہے۔"

"کیا آپ کا اپنا بھائی کوئی نہیں؟"

کیوں نہیں۔ چار ہیں۔ مگر بھائی تو جتنے ہوں کم ہوتے ہیں اور بھائی بہن کا رشتہ دنیا کا مقدس ترین رشتہ ہے۔ میں نا رشید!"

رشید کی کوئی حقیقی بہن نہ تھی۔ اس لئے بہناپے کا اُسے عملی تجربہ نہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ نانی اور دادی گاؤں کی ہر لڑکی کو اُس کی بہن

بتاتی تھیں، اور وہ انہیں اسی نگاہ سے دیکھتا بھی تھا۔

اب کے عید پر وہ گھر گیا تو ماں نے کسی لڑکی کا ذکر کرتے ہوئے کہا "میں اُس سے تمہاری منگنی کرنے والی ہوں۔"

تو اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کل تک وہ اس لڑکی کو بہن سمجھتا تھا۔

"وہ تو میری بہن ہے ماں!"

اُس نے بغیر سوچے ماں سے کہا تھا اور ماں نے اُسے پیار سے ڈانٹا۔

"چھی۔ میں جو کہتی ہوں اُس سے تمہاری شادی ہوگی۔"

اور پھر وہ نانی کے پاس گیا۔ دادی سے پوچھا۔ انہوں نے چرخوں کی ہتھیوں کو مسلسل گھماتے تکلوں پر تانت ڈالتے ہوئے جواب دیا

"ہاں بیٹا... ٹھیک کہتی ہے۔ اب تم بڑے ہوگئے ہو۔ سوچ کے بدلو اور تمہاری منگنی تو طے ہے۔ بڑے دنوں کی چھٹیوں میں اُڑ گئے نا تب۔"

"لیکن ـــ"

وہ ہکلانے لگا۔

"ارے جا ــ تیری کون سنتا ہے ــ تیرے نام پر پینو اتنا شرماتی ہے۔ ہے نا"

"بہن۔ برکتے! توبہ میری توبہ لڑکیاں بھی کیا ہوتی ہیں۔"

رشید کی نانی منہ پر دوپٹہ رکھ کر ہنسی۔ وہ خود شرما رہی تھی اور دادی تکلے پر تانت ڈالنے میں مصروف تھی۔ رشید احتجاج کے طور پر چلایا۔

"مگر پینو تو ماسی پھجاں کی لڑکی ہے اور میری بہن ہے۔"

"چل ــ بک نہ ــ کاڑھنی میں دودھ پڑا ہے۔ موٹی موٹی ملائی آ چکی ہوگی۔ کھالے شکر ڈال کر۔"

"ملائی تو خود میٹھی ہوتی ہے۔ شکر کی کیا ضرورت ـــ"

"جا تجھے کھانے سے کام یا حجتیں کرنے سے۔"

وہ نانی دادی کو مائے زنی کرتے چھوڑ کر ڈھارے میں گیا۔ ملائی سے پیالہ بھرا اور مزے سے کھانے لگا۔

"اچھا تو اب اُس کی شادی ہونے والی ہے"! اور جب علا نے سیمینار روم میں اس سے پوچھا کہ مجھ سے شادی کروگے تو وہ اُلجھ کر رہ گیا۔ دنیا نے اُسے ایک دم شادی کے قابل قرار کیوں دے دیا۔ کیا مصیبت ہے؟ اور اب انیسہ کہہ رہی تھی۔

"مجھے تو بھائی بنانے کا شوق ہے ـــ"

ایک دن وہ انیسہ کے ساتھ باتیں کرتا انارکلی تک پہنچ گیا۔ اچانک ہی وہ ایک جنرل اسٹور پر کھڑے تھے۔ انیسہ زنانہ جرسیاں نکلوا کر دیکھنے لگی۔

"کتنی پیاری ہے ـــ ہے نا رشید!"

اور رشید اپنے ساتھ نوجوان لڑکی کے وجود کے احساس سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ انیسہ اتنی جلدی اُس کے ساتھ آنے پر رضامند ہو جائے گی۔ اُسے عجیب سا لگ رہا تھا اور اب وہ جرسی کو کاؤنٹر پر پھیلائے نرم لہجے میں اُس کی رائے معلوم کر رہی تھی جیسے بیویاں شوہروں سے پوچھتی ہیں۔ لگاوٹ اور انجان پن سے آنکھوں میں جھانکتے ہوئے۔

رشید نے بغیر کچھ کہے سر کی ہلکی جنبش سے رائے ظاہر کی۔ اُس لمحے اُسے عجیب طرح کی خوشی اور آسودگی حاصل ہوئی اور یقین سا ہو چلا کہ وہ واقعی شادی شدہ ہونے کے قابل ہو گیا ہے اور جب وہ پے منٹ کر کے دکان سے باہر نکلے تو انیسہ نے پوچھا۔

رشید! تمہیں سچ مچ پسند ہے نا؟"

رشید کو یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ایسے موقعہ پر کیا جواب دیتے ہیں۔

رات کو اس نے علا کو تڑپ تڑپ کر یاد کیا۔ ظالم ـ ظالم ـ صبح اُس کے روم میٹ نے اُسے بتایا کہ تم لحاف میں منہ دیئے ظالم ـ ظالم کی رٹ لگا رہے تھے۔ اپنا سائیکو انیلیسز کراؤ۔

علا جہاں تھی وہیں تھی۔ انیسہ روز بروز اُس کے قریب آ رہی
تھی ماں کا کڑا بیچ کر جتنی رقم حاصل کی تھی خرچ ہو گئی۔ وہ چھٹیوں میں
گھر نہ جا سکا۔ انیسہ لائبریری سے کتابیں نکلوانے آتی تو وہ کسی خاموش
گوشے میں جا بیٹھتے۔ انیسہ تقریباً ہر روز آ جاتی۔ اب وہ اپنے کسی کلاس
فیلو سے نصابی بحث لے بیٹھتی تو رشید کا جی جلنے لگتا۔ وہ ہمیشہ سے
ایسی تھی مگر رشید کو اس کا بے تکلف ہونا اب زیادہ کھلنے لگا تھا۔ رشید
کی تیوری پر بل پڑے ہوئے دیکھ کر جب وہ ہلکورا سا کھا کر کہتی۔

"I KNOW YOU ARE JEALOUS"

تو وہ حسبِ معمول شرما کر رہ جاتا۔

پھر علا اور انیسہ دونوں امتحانات کی تیاریوں میں مصروف ہو
گئیں وہ سالانہ امتحان سے فارغ ہو کر بھی گھر نہیں گیا۔ اس دوران اُسے
علا سے خاص رغبت نہ رہی۔ علا نے کب اُسے CRAZY BOY
کہنا چھوڑا اُسے یاد نہیں اور کب اُس نے علا کی راہوں میں کھڑے ہونا
ترک کیا پتہ نہیں چلا اگرچہ انیسہ کالج میں کم دکھائی دیتی تھی۔ رشید
پر رومانوی اداسی کے دورے پہلے سے کم پڑتے تھے۔

نیا سیشن شروع ہو چکا تھا پھر بھی کالج میں ہما ہمی نہیں تھی
گرمیاں دھوم دھام سے آ رہی تھیں۔ بارش کے چھینٹے، ہوا کے
جھکڑ۔ بڑا پور موسم تھا۔ کالج کی تین کلاسیں جا چکی تھیں نئی کھیپ
آنے میں کافی دن باقی تھے۔ یاروں میں بیٹھ کر گفتگو کرنے کا ڈھب
اُسے اب تک نہ آیا تھا۔ کتابوں سے شغف پیدا ہو ایسی کوشش
ہی نہ کی۔

بہت دن بعد گھر سے خط آیا تمہاری منگنی کی رسم ادا ہو گئی،
مبارک ہو۔ وہ انیسہ سے اپنی منگنی کے واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا تھا۔

"انیسہ! مجھے گھر والوں نے بلایا ہے۔"

"کس لئے؟"

"میری منگنی کی بات ہے۔"

"کیا۔؟ انیسہ نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا
"مجھے ساتھ نہیں لے چلو گے؟"

"نہ۔"

رشید ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے ایسے بولا جیسے ایک بچہ دوسرے
بچے کو ڈرائے۔

کیوں؟۔ میں تمہاری بہن نہیں۔؟ اور گاؤں کے لوگ تو بہنوں
کو قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہیں نا؟"

"وہ تو ہے۔"

"پھر۔؟"

"مگر میں تمہیں ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔"

"بھئی۔ یہاں سے اکٹھے چلیں گے۔ آگے چل کر علیحدہ علیحدہ
گھر پہنچیں گے۔

"ٹھیک۔"

میں نے تمہارے بارے میں گھر والوں کو نہیں بتایا۔"

"ہٹو۔ ہم نہیں بولتے۔"

انیسہ روٹھتے ہوئے بولی۔

کتنے بزدل ہو۔ مجھے تمہاری یہ بزدلی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔
میں جاؤں گی اور اماں کو بتاؤں گی اتنا ڈرپوک تھا تو گود سے الگ کیوں
کیا؟"

رشید منتیں کرنے لگا۔

پلیز انیسہ۔ اللہ کے واسطے یہ غضب نہ کرنا۔ اور تم جو بھی
کہو کروں گا۔ گاؤں مت جانا۔"

"دیکھا۔ دیکھا۔ کیسے کانپ رہے ہو جیسے میں تمہاری ماں سے
ملنے کے لئے مری جا رہی ہوں۔ اونہہ۔"

اور وہ ناراضی دکھا کر جانے لگی۔

انیسہ پلیز۔" وہ راستے میں کھڑا ہوگیا۔ انیسہ ایک خاص ادا کے ساتھ بدن چھٹکتی رُک گئی۔ پھر رشید کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

"رشید۔ میں جان گئی۔ تمہارے دل میں میرے لئے کتنی جگہ ہے۔"

رشید کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ اس لمحے اپنے جذبات کا جائزہ لے رہا تھا۔ دل کو ٹٹول رہا تھا۔ انیسہ کا مسکن دل کے کس کونے میں تھا۔ انیسہ کی طرف تکتے تکتے اُس نے انیسہ کی نگاہوں کی گرمی کو سر سے پاؤں تک گزرتے محسوس کیا اور پھر مسکرا کر آنکھیں جھکا لیں۔

"اچھا۔ جیسے تم کہو۔ مگر گھر والوں کو جواب تم دینا۔ ہاں۔"

"ارے۔ وہ تم مجھ پر چھوڑو۔ میں یوں کر لوں گی۔"

انیسہ نے چٹکی بجائی

"تم مجھے سمجھے نہیں۔"

سوچی سمجھی سکیم کے مطابق انہوں نے سفر کا آغاز کیا۔

پنجاب کے گاؤں کے باسی مہمان کے معاملے میں بے حد متجسس ہوتے ہیں کون ہے؟ کس کا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے! کب تک رہے گا؟ گاؤں کی حدود میں داخل ہوتے ہی پہلا استقبال کُتے کرتے ہیں۔ کوئی اجنبی مقامی شخص کی مدد کے بغیر گاؤں میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

اسٹیشن سے اتر کر رشید نے انیسہ کو گھر جانے والی پگڈنڈی پر ڈال دیا۔ کھیت کھیت، روش روش چلتی انیسہ خاصی محتاط تھی۔ آبادی کے قریب پہنچی، کتے بھونکے۔ انیسہ نے انہیں پیار سے پچکارا اور سنبھل سنبھل کر چلنے لگی۔ اسی دوران گاؤں کے بچے رضا کارانہ اُس کی مدد کو آپہنچے اور یوں وہ رشید کی حویلی میں پہنچا دی گئی۔

جب اُس نے بتایا کہ وہ شہر سے آئی ہے اور رشید سے ملنا چاہتی ہے تو تجربہ کار عورتوں کا ماتھا ٹھنکا۔ رشید کی دادی اور نانی نے ایک دوسری پر آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال و جواب کی بوچھاڑ کر دی۔

ہاتھ منہ دھونے کے بعد انیسہ مزے سے میٹھی چھاچھ پیتی، مکھن روٹی کھاتی لمحہ لمحہ اپنے گرد جمع ہوتی عورتوں بچوں کو دیکھ رہی تھی اور زیادہ پریشان نہ تھی۔ یہ سب رشید کی رشتہ دار، ہمسائیاں اور جاننے والیاں تھیں۔ دادی نے فیضاں کو اشارہ کیا اور وہ انیسہ کو لے کر کمرے میں چلی گئی۔

موسم گرما کے آغاز کی سہ پہر خاصی طویل تھی۔ فیضاں اسے آرام کرنے کی تاکید کر کے جانے لگی تو انیسہ نے پوچھا۔

"آپا۔ رشید کب آئے گا؟"

"نہیں پتہ ہوگا۔"

انیسہ کو فیضاں کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ فیضاں نے اُسے پسند نہیں کیا اس کے باوجود جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی وہی اُس کی آؤ بھگت اور دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھی۔

"آپ میرے پاس بیٹھیں۔ مجھے تنہائی سے خوف آتا ہے۔"

فیضاں دل میں ہنسی اور روایتی طریقے سے کہا۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔"

جب ہی تو میں آ بھی گئی۔"

سفر کی تکان اور مرغن کھانے کے بعد پُرسکون کمرے اور فیضاں کی مدھم مدھم باتوں نے انیسہ پر غنودگی طاری کر دی۔ فیضاں کے ذہن میں اوہام کا ڈیرا تھا۔ انیسہ کی آنکھ لگی تو وہ سوچنے لگی۔ یہ کیوں آئی ہے؟ یہ کون ہے؟۔ رشید آجائے فوراً آجائے۔ اچانک انیسہ کی سسکی نے اُس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔

مجھے معلوم ہے آپ مجھے پسند نہیں کر رہیں اور آپ کو یہ اندازہ بھی ہوگیا ہوگا کہ میں کیوں آئی۔"

پھر وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"رشید اور میں اکٹھے آتے مگر وہ آپ سے ڈرتا ہے۔ میں آپ کے پوتے کی" انیسہ پھر رونے لگی۔

"کیا کہا ؟ ــ"

لفظ فیضاں کے حلق میں پھنس گئے۔

"آپ کا لڑکا ڈرپوک اور بزدل ہے۔ وہ آپ لوگوں کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے۔ مگر میری زندگی تو خراب ہوئی۔ میں کہاں جاؤں؟"

رشید کو لانے کے لئے آدمی دوڑایا گیا۔ وہ آیا تو سورج کافی نیچے جاچکا تھا رشید کی آمد سے گھر کے در و دیوار پر جو غیر معمولی رونق دوڑ جایا کرتی تھی آج سرے سے مفقود تھی۔ نانا اور دادا کھیتوں میں کام ختم کرکے آچکے تھے اور چولہے کے پاس بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھے چپ چاپ حقہ پی رہے تھے۔ فیضاں حسبِ معمول توے پر روٹیاں ڈال رہی تھی۔ دوسری طرف رشید باہوں کا تکیہ بنائے نیم دراز تھا۔

نانا نے حقے کی نے بھائی کو پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

"سنا ہے شہر سے مہمان آئے ہیں۔ کیوں کڑ بیٹے۔ ؟"

رشید نے کروٹ بدلی۔ فیضاں نے اُسے آنکھ کے اشارے کھسک جانے کے لئے کہا تو وہ سلسلۂ کلام شروع ہونے سے پہلے مویشیوں کے پاس جاکر انہیں چارہ کھلانے لگا۔

دادی نے رکابیوں میں سالن نکالتے ہوئے فیضاں کی ماں کو حکم دیا۔

"کمرے میں دیا رکھ آؤ۔"

"رکھ دیا۔"

فیضاں کی ماں ! میں نے سنا ہے شہر سے مہمان آئے ہیں۔"

"کیوں جان محمد کی ماں ؟" بڑے بھائی نے اپنی بیوی سے پوچھا

رشید کی دادی جنتے [illegible] وہ بہ بیں تھی۔

تم بولو ــــ اب کیوں سانپ سونگھ گیا۔"

"بہو سے پوچھو۔"

"کیوں دھیئے ! تو ہی کچھ بول ؟"

فیضاں خاموش رہی۔ اُس کے ہاتھ تیزی سے روٹی گھڑ رہے تھے۔

"اب سمجھانا سسر کو۔"

ایسے موقعہ پر جنتے کہاں معاف کرنے والی تھی۔ دو برس ادھر اُس نے یہی انجام سوچ کر تو کہا تھا کہ رشید شہر نہیں جائے گا۔ اب صرف وہ سچی تھی اور باقی سب جھوٹے۔

"فیضاں دھیئے ــ"

فیضاں کی ماں برکتے عمر بھر فقط اتنا ہی کہنے کی جسارت کرتی رہی تھی۔ ان دو لفظوں میں فیضاں کے لئے بے چارگی، محبت، عزم سب کچھ چھپا ہوتا تھا اُس نے ماتھے پر لٹکے ہوئے دوپٹے کو قدرے پیچھے سرکایا۔

"تایا تمہاری پوت بہو آئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں میرے بیٹے نے جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔"

ہاں پڑھا لکھا ہے۔ ہم سے زیادہ دماغ رکھتا ہے۔" فیضاں کی ماں نے بیٹی کی بات پر پیوند کاری کی۔

دماغ رکھتا ہے۔ پھٹے منہ۔"

جنتے دیورانی کا فقرہ چبا کر بولی۔

"میں بیٹوں کی ماں کو کیا جواب دوں گی۔ گاؤں والے تھڑی تھڑی کریں گے۔ فیضاں جس طرح تو سینوں پر مونگ دل رہی ہے بہتر تھا خصم کر لیتی۔ رنڈاپے کا بدلہ پھیر پھیر کر ہم سے نہ لیتی۔"

"بہن جنتے ! منہ سنبھال کے بات کر۔ میری فیضاں نے جس طرح عزت رکھی کوئی رکھ کر تو دکھائے۔"

برکتے ہائے، ہائے میری کومل بیٹی، کہہ کر فیضاں سے لپٹ گئی

جنتے ہنڈیا کے کنارے پر ڈوئی بجاتے ہوئے چیخی۔

"میری تو نہ کسی نے کبھی سنی ہے نہ سنے گا۔ میں بڑی ہوں بس نام کی۔ کان کھول کر سُن لو آج کے بعد اس گھر میں رہوں گی یا۔"

وہ روٹیوں سے بھری چنگیر کو دونوں بھائیوں کے درمیان پٹختے ہوئے اٹھی۔

"جس گھر میں چلتی پھرتی عورتیں رہیں اس گھر میں میرا کیا کام؟ میں کوئی گری پڑی نہیں میکے چلی جاؤں گی۔"

جنتے نے آخری پتہ پھینکا اور چادر کو جسم کے گرد لپیٹا جیسے وہ سفر پر جانے کے لئے تیار ہو

"جنتے کوئی عقل کر۔"

"بھائی یہ نہیں ہونے کا۔"

فیضاں اور بہکتے خاموش تھیں۔ اسی لمحے کوٹھڑی سے انیسہ نکلی۔ شام کے پھیکے اندھیرے میں بغیر کچھ کہے صدر دروازے کی طرف چلنے لگی۔ رشید جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ وہ ان اَن مِل بے جوڑ واقعات سے خاصا پریشان تھا۔ انیسہ نے اس پر جتنے حملے کئے تھے اچانک کئے تھے۔ اور اب نا معلوم کیا کرنے کا ارادہ لئے وہ کمرے سے نکل کر باہر جارہی تھی۔ وہ بالکل اضطراری طور پر بھاگتا ہوا صدر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ فیضاں نے بڑھ کر انیسہ کو بازو کے گھیرے میں لے لیا اور ساس کی طرف منہ کر کے بولی۔

"تائی۔ تو کیوں جائے۔ گھر والے گھر میں رہیں۔ فالتو تو ہم ہیں۔ چل، چل دیجئے۔"

ایسے لمحوں میں وہ یہ کبھی نہیں سوچتی تھی کہ جائے گی کہاں؟

"رشید! لے چل پتر۔ جہاں سینگ سمائیں۔ اب ہم دو نہیں تین ہیں۔ تین نہیں چار ہیں۔"

تایا نے حالات کو زیادہ بگڑتے ہوئے پایا تو دروازے کی کنڈی چڑھا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

تم سب جیتے۔ جانے دے فیضاں۔ کچھ تو عقل کر، کیوں مٹی اڑا رہی ہو ہمارے سپید سروں پر۔ جو تو کہے گی وہی ہوگا۔"

اور رشید کا سر یوں گھوم رہا تھا جیسے وہ چرخ پر سوار ہو۔

نیا فرہاد

اسلم جدون

وہ چٹان پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی دونوں ہاتھوں سے تھام لی اور سوچ میں گم ہو گیا۔

"شیریں کے باپ نے کتنی کڑی شرط لگائی ہے۔۔۔۔ وہ لوگ ترلور (رشتہ دار) ہیں تو اس کے ہیں میرے تو نہیں۔ لیکن ہاں شیریں سے شادی کے بعد ان کے ترلور میرے بھی ترلور بن جائیں گے مجھے اپنے رشتہ داروں کا ساتھ دینا ہو گا۔ پر مجھے کیا پڑی ہے کہ ان کے معاملوں میں ٹانگ اڑاؤں؟ ایک بار شیریں کو اپنا لوں تو پھر کون کسی کا۔۔۔۔ اب تو شیریں کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے والا معاملہ ہو گیا ہے۔ یار حسن یہ جوئے شیر تو شیریں کے لئے لانا ہی ہو گی کیونکہ تم شیریں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نہ جانے یہ شیریں کہاں سے آ گئی۔ اچھی بھلی زندگی گذر رہی تھی۔ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اڑان تھی۔ اب شیریں کے تنے سے بندھ جاؤں گا۔ شیریں پر سب ہی قربان ہیں شیریں، شیریں، تم کہاں ہو؟" وہ زیر لب مسکرایا۔ "حسن یار دیوانے کیوں بنے جا رہے ہو ۔۔ تم آئے تھے شیریں سے شادی کا دن مقرر کرانے اور پالا پڑ گیا اس شرط سے۔ اس زمانے میں بھی اس علاقے کے لوگ کسی خسرو پرویز سے کیا کم ہیں۔"

حسن نے سامنے دیکھا۔ بنجر و سنگلاخ مہیب پہاڑوں کا ایک نیم دائرہ پورے ماحول کو گھیرے ہوئے تھا لیکن جہاں وہ بیٹھا تھا وہ ٹکڑا سرسبز تھا۔ قدرت کی فیاضی سے ایک چشمے کا پانی اس طرف کے پہاڑ کے اس ٹکڑے کو سیراب کر رہا تھا۔ ورنہ یہ جگہ بھی سامنے والے پہاڑ کی طرح ہوتی کیونکہ کچھ فرلانگ ادھر اور اُدھر سامنے والے پہاڑ کی اسی طرح کی چٹانیں اور ریت کے وہ ملغوبے تھے جو ہزارہا برس قبل کسی ارضی عمل سے گندھ کر ٹھوس چٹانوں کی صورت اختیار کر گئے تھے ایک طوفانی ندی دونوں پہاڑوں کے درمیان بہہ رہی تھی جو دریا سے کم نہ تھی۔ حسن کو اس ندی سے اتنا ہی پیار تھا۔ جتنا اس ندی کو ان میدانوں سے جن کی جانب وہ رواں دواں رہتی ہے۔

ایک بار تو وہ اس ندی کی نذر ہو چلا تھا۔ لیکن پیاری ندی نے اُسے بچا لیا تھا اسی لئے تو وہ اسے اچھی لگتی تھی۔ بالکل شیریں کی طرح۔ وہ آج تک یہ عقدہ حل نہ کر سکا کہ اس دن ندی نے خود اُسے بچایا تھا، یا شیریں نے کیونکہ جب اُس کی جیپ ندی میں گری تھی تو وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا، جیپ کہیں جا پڑی اور وہ کہیں اُسے جب ہوش آیا تو وہ ندی کے کنارے تھا اور اُس کا سر شیریں کی گود میں تھا۔ شاید قدرت نے شیریں اور اُسے ملانے کے لئے ندی کو وسیلہ بنایا تھا۔ وہیں سے تو حسن دیوانہ ہوا تھا۔ شیریں کا اور پرستار ندی کا، یہ سب

کیونکہ ہوا وہ تو خونی ندی مشہور تھی جو ہر سال کئی انسانی جانوں کی بھینٹ لیتی تھی اور جیپ سے اس کے کنارے کنارے سڑک بننا شروع ہوئی تھی تب سے وہ خاص طور پر ناراض نظر آتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسکے حسن کو یوں

پامال کیا جائے۔ اسی لئے تو سڑک بنانے والے کچھ لوگوں کو اس نے ناگ دیوتا کی طرح ڈس لیا تھا۔ البتہ اُسے گاؤں والوں سے اُنس تھا کیونکہ انہوں نے کبھی اُسکے کاروبارِ حیات میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔ ندی اور سڑک۔ دونوں اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ دونوں ہی سے اسے لگاؤ تھا۔ وہ پھر بڑبڑانے لگا۔ "یہ میں وہاں سے یہاں کیسے لا سکتا ہوں ڈیڑھ دو میل کی بلندی۔ کچے پہاڑ، عجیب چٹانیں اور خطرناک موڑ۔ شیطانی نالے بھلا یہاں تک سڑک کیسے آسکتی ہے؟"

اُس کی نگاہ اُٹھی اور شیریں پر ٹک گئی۔ جو گھڑا اٹھائے کچھ فاصلے پر گھر کی طرف رواں تھی۔ اس نے اشارہ کیا شیریں نے گھڑا اتارا اور لجاتی ہوئی آگئی۔ شیریں نے حسن کو خلافِ معمول پریشان دیکھا اور بولی "کیا بات ہے حسن؟" حسن خاموش رہا تو شیریں نے پھر پوچھا۔ اس پر حسن نے جواب دیا۔ "گویا تم کو معلوم ہی نہیں"۔ شیریں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اچھا وہ سڑک والی بات"۔ "ہاں"۔ حسن نے کہا۔ "تو اس میں کیا مشکل ہے۔ سڑک کو وہاں سے اٹھا کر یہاں لے آؤ۔ تم ہی تو کہتے تھے کہ تم اس سڑک کے سب سے بڑے افسر ہو۔

تم جو چاہو کر سکتے ہو۔ سڑک وہاں سے نہ سہی یہاں سے گزر سکتی ہے۔" "نہیں۔ شیریں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ میرے بس میں نہیں۔ میرے اختیار میں نہیں۔ تم اپنی ماں کو سمجھاؤ کہ وہ تمہارے باپ کو سمجھائے کہ یہ شرط نہ لگائے۔" "میں نہیں سمجھاؤں گی۔" "کیوں"۔ حسن نے پوچھا۔ "سڑک کا یہاں سے گزرنا اب تو ضروری ہے۔ وہ ہے نا گل میری چچازاد بہن۔ وہی ہمارے ترلوچن۔ وہ لوگوں میں کہتی پھرتی ہے کہ حسن شیریں سے پیار نہیں کرتا ہے۔ وہ اُسے خوار کرے گا۔ اگر حسن کو شیریں سے واقعی پیار ہے تو پھر حسن سڑک کو ان کے گھر کے سامنے کی بجائے شیریں کے گھر کے سامنے لے جائے۔ حسن تم مجھ سے سچا پیار کرتے ہو نا؟ اگر تم کو سچا پیار ہے تو سڑک کو یہاں لا دو نا۔" "شیریں۔ تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ مگر سڑک کو یہاں لانا ممکن نہیں"۔ حسن نے شیریں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اگر سڑک یہاں نہیں آسکتی تو پھر ہماری شادی بھی نہیں ہوگی"۔ شیریں نے کہا "تم کیا کہہ رہی ہو شیریں؟" حسن نے حیران ہو کر پوچھا۔ "میں جانتی ہوں کہ حسن میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں مر جاؤں گی زہر کھا لوں گی۔ اُس ندی میں کود جاؤں گی۔ لیکن سڑک کے بغیر۔"

حسن سوچنے لگا۔ باپ ترلوچنوں کی وجہ سے سڑک یہاں لانا چاہتا ہے اور بیٹی میری سچی محبت کا ثبوت مانگنے کے لئے سڑک یہاں لانا چاہتی ہے۔ اُسے زندگی میں کئی شیریوں سے سابقہ پڑا تھا اُس نے ہر شیریں کو دام کر لیا تھا۔ لیکن اس کو پہاڑی شیریں نے اُسے واقعی فرہاد بنانے پر کمر باندھ رکھی تھی۔ حسن سوچنے لگا شیریں بڑی گھمنڈی اور ہٹیلی ہے۔ شیریں میرے ساتھ بھاگ کر نہیں جائے گی میں اس کو اغوا بھی نہیں کر سکتا۔ اور اس کے بغیر۔ لیکن کیسے؟"

"توفیق"

"سر۔ فرمائیے"

"چھ ماہ گذر گئے۔ کتنا تھک گیا ہوں۔ آج پہلی بار سکون ملا

ہے؟"

"سر۔ آپ نے بھی تو حد کر دی۔ چھ ماہ مسلسل دن رات کام کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ گوشت پوست کے نہیں فولاد کے انسان ہیں۔ سر سچ بات یہ ہے کہ کیمپ میں لوگ اکثر حیران ہوتے تھے آپ جیسے کھلنڈرے آدمی کو کیا ہو گیا ہے اس خلوص۔ محنت اور توجہ کو دیکھ کر۔ پھر خود ہی لوگ کہتے تھے کہ آپ دیانت دار ہیں۔ مقررہ مدت میں کام کو مکمل کرنا چاہتے ہیں۔"

حسن نے قہقہہ لگایا۔ اچھا یہ بات تھی۔ چلئے اُن کو اصل بات کا علم نہیں۔ لیکن توفیق۔ داد تو آپ کو ملنا چاہئے۔

"جی سر۔ داد تو مجھے ملنا چاہیئے لیکن سر معاف کیجئے گا۔ ترقی آپ کو ملی اور ساتھ ہی ایک لاکھ بھی۔"

"میری ترقی تمہاری ترقی ہے توفیق اور یہ ایک لاکھ ان کی مجھے ضرورت نہیں۔ ویسے بھی ترقی کی ضرورت نہ تھی۔"

"جی کیا فرمایا؟"

توفیق۔ "میں کہہ رہا تھا کہ داد تمہیں ملنا چاہیئے۔ تمہارے دماغ نے کیسا عمدہ منصوبہ سوچا۔ چلئے دس، بارہ ہزار خرچ ہو گئے، تو کیا۔ سڑک کی الائینمنٹ بدل دی گئی۔ ہماری مرضی کے مطابق نقشہ منظور ہوا اور سڑک شیریں کے گھر کے سامنے سے گذر کر پیچھے پھر ندی کے کنارے چلی گئی۔ میں سوچتا ہوں توفیق؟"

کیا سوچتے ہیں آپ؟"

"یہ کس لئے دس میل سڑک اور طویل کی گئی۔ یہ ڈیڑھ میل کی بلندی پر چلی گئی۔ کتنے خطرناک موڑ ہیں۔ شیطانی نالے ہیں۔ ان پر جان لیوا پُل ہیں اور سب سے بڑھ کر ہزاروں فرہاد دن رات چٹانوں کو کاٹتے رہے۔ وہ میری شیریں کے لئے جوئے شیر لانے میں مصروف رہے اور میں مسٹر فرہاد بنا چٹانوں پر بیٹھا ان کو دیکھتا رہتا۔ مجھے اکثر وہ سین یاد آتے ہیں جس میں فرعونوں کے مقبرے کے لئے ہزاروں انسان کام کرتے تھے اور میں اُن ٹاسک ماسٹروں کی طرح جو ہاتھوں میں کوڑا لئے گھومتا تھا۔"

"ایسا نہ کہیے سر۔ کچھ بھی ہو آپ نے ڈیوٹی دی ہے۔ نقشہ منظور ہونے کے بعد آپ کی ذمہ داری ختم۔ اب آپ کو تعمیر کی نگرانی کرنا تھی سو آپ نے دل وجان سے کی۔

"لیکن دس میل کے لئے جو بیس انسانی جانیں ضائع ہوئیں ہیں"

"یہ تو ہوتا ہی ہے سر۔ شاید ایسا نہ ہوتا لیکن حکم تھا کہ سڑک جلد سے جلد مکمل ہو کیونکہ اس کی سیاسی۔ اقتصادی اور اسٹریٹیجک اہمیت ہے۔"

"چھوڑیئے توفیق جو کچھ ہوا سو ہوا۔ رات بہت ہو گئی ہے سو جائیے۔ اور ہاں یہ لو ۵ ہزار۔"

اگلے دن لشکارے مارتی ہوئی جیپ شیریں کے گھر کے سامنے کھڑی تھی مسٹر فرہاد نے شیریں کو جیت لیا تھا۔ رسم ورواج کے مطابق شیریں کی حسن سے شادی ہوئی اور حسن اُسے لے کر شہر چلا گیا۔

چھ ماہ اور گذر گئے۔ دس میل کی سڑک اب پندرہ میل ہو چکی تھی۔ شیریں کبھی کبھار اپنے گاؤں آتی۔ اُس کی قسمت پر سبھی رشک کرتے کہ کتنے بڑے افسر اور کتنے حسین انسان سے اس کی شادی ہوئی ہے وہ زیور سے لدی آتی تھی۔ طرح طرح کے کپڑے ← ہر بار نئی کار میں آتی تھی۔ اب اس کے گھر والے بھی نہال ہو گئے تھے۔ یہ شیریں کے خاوند کا فیض تھا۔ حسن نے شیریں کو آہستہ آہستہ ماڈرن سوسائٹی کے لئے تیار کر لیا تھا۔ وہ اب کچھ کچھ انگریزی بھی بولنے لگی تھی۔ بیگماتی انگریزی.....

گُل کے گھر والے شیریں کے خاندان سے اور بھی جلنے لگے۔ گُل کے والد تو خیر کیا کہتے لیکن گُل کی اماں ایک ایسی عورت تھی جس کے بارے میں گاؤں میں مشہور تھا کہ وہ "آسمان خود ہی چیرتی ہے اور خود ہی ٹھگلی لگاتی ہے" (آسمان کو پھاڑتی اور خود ہی پیوند لگاتی ہے) اس

نے ایسا جال پھیلایا کہ حسن اس میں بُری طرح گرفتار ہوگیا۔ جب شکار پھنس گیا تو اس نے گل کے خاندان سے گلُ سے شادی کے متعلق بات کی تو انہوں نے صاف کہا کہ شیریں پہلے ہی حسن کے گھر موجود ہے۔ اب وہ گل کو سوکن کے طور پر نہیں بھجوا سکتے۔ حسن نے ایک دم سے فیصلہ دیا کہ وہ گل کے لئے شیریں کو طلاق دینے کو تیار ہے گلُ کی ماں کے لئے بظاہر یہ خوشی کی بات تھی لیکن وہ اس سے بھی زیادہ شیریں کے خاندان والوں سے بدلہ لینا چاہتی تھی اس لئے اس نے کہا کہ شیریں کال سری ہے ۔۔ (جوان ہے) اس لئے ہم نہیں چاہتے کہ اسے طلاق دی جائے۔ حسن نے کہا کہ پھر وہ گل کی شادی کر دیں وہ گلُ کو شیریں سے بہتر طور پر رکھے گا۔ اب گلُ کے خاندان والوں کو یقین ہوگیا کہ حسن ان کے ہاتھ لگ چکا ہے اس لئے انہوں نے وہی شرط لگائی جو شیریں کے گھر والوں نے لگائی تھی۔ گل کی امی نے کہا کہ شادی ہو سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ پرانی سڑک آگے بڑھے اور ان کے گھر کے سامنے سے گزرے۔

حسن اب بہت ہی پریشان تھا۔ یہ مسئلہ پہلے کی طرح اس کے قابو میں آنے والا نہیں تھا اس پر پھر توفیق حسن کے رسکیو، (RESCUE) کو آیا۔ نئی سڑک اپنا نذرانہ وصول کر رہی تھی چھ ماہ میں کئی ٹرک، جیپیں اور گاڑیاں ڈیڑھ میل کی بلندی سے ندی میں لڑھک چکی تھیں۔ ان حادثات نے ہیجان خیزی کا روپ دھار لیا۔ توفیق نے چال چلی ۔۔ راتوں رات مشہور ہوگیا کہ نئی سڑک ایسے پہنچے ہوئے بزرگوں کے مزاروں سے گذرتی ہے جن کے مزاروں کا نشان تو مٹ گیا ہے لیکن کرامات زندہ ہیں۔ وہ اپنی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتے اسی لئے تنبیہ کے لئے آئے دن کسی نہ کسی گاڑی کو لڑھکا دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں کوئی تیس انسان لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بستی والوں نے بزرگوں کی حرمت بچانے کے لئے ہنگامے کئے۔ توفیق کے ذریعے مشہور ہوگیا کہ آٹھویں میل پر ایک چیخ سُنائی دیتی ہے اور اس کے بعد ڈرائیور گاڑی پر کنٹرول نہیں کر سکتا۔ ہر نئے حادثے سے اتفاق سے بچنے والے اس کی تصدیق کرتے۔ اب ڈرائیوروں نے اس سڑک پر جانے سے انکار کر دیا، جو جاتے وہ دُعائیں مانگتے جاتے۔ منت مان کر جاتے زندہ رہ جاتے تو منت اتارتے۔ مر جاتے، تو ہنگامہ ہوتا۔

توفیق اور حسن کی کارستانی سے سڑک کی الائینمنٹ پھر تبدیل ہو ہوگئی۔ وہی پرانی سڑک آگے بڑھنے کی اجازت مل گئی۔۔ دو ماہ بعد سڑک گلُ کے گھر کے سامنے گذری۔ حسن وہی جیپ لے کر آیا جس پر وہ شیریں کو لے گیا تھا۔ اب کی اس جیپ میں گل دلہن بنی بیٹھی تھی۔ گلُ کی ماں نے اپنی بیٹی کو آخری الفاظ کہے۔

"بیٹی کچھ بھی ہو خاندان کی ناک اونچی رہی۔ تم شیریں پر سوکن بن کر جا رہی ہو۔ شیریں تم پر سوکن بن کر نہیں آ رہی"!

نَشِیدُ التَّرحِیب

بِجَلالَةِ المَلِكْ خَالِدْ بِنْ عَبدِ العَزِیزْ المُعَظَّمْ

جمیل الدین عالی

یا ناصر اسلامیاں   یا خادم خیر الزماں
یا ناصر الاسلام وَالمسلمین   یا خادم خیر المرسلین

اھلاً و سھلاً مرحبا اھلاً و سھلاً مرحبا

اے حامئ ایمان تو   جس ملک کا مہمان ہے
یا حامِیَ الایمَانِ اَنتَ   ضیفٌ للبَلَدِ الّذِیْ
اس ملک کی بنیاد میں   ایمان ہی ایمان ہے
اُسِّسَ علیٰ اُسَاس الاِسْلَامَ   فلَیسَ فی بُنیَانِهِ الّا الاِیمَان

اھلاً و سھلاً مرحبا اھلاً و سھلاً مرحبا

یہ دوستی!
نعیم الصّداقَةُ
یہ ھم دلی!
والاُخُوَّۃ فیما بَیْنَنَا

اھلاً و سھلاً مرحبا اھلاً و سھلاً مرحبا

تو جس کا ہے وہ سرزمیں   اُمَنائے عالم کی اَمیں
اَنتَ تَنتَمِیْ اِلیٰ الاَرضِ الّتِیْ   ھِیَ اَمِیْنَةٌ لِاُمَنَاءِ العَالَمْ
عالی مکاں، عالی مکیں   اے دوست اے دوست آفریں
یا عالِیَ المَکَانْ یا ذوالمعَالِیْ   یا اَیّھا الصَّدِیقُ الوفی یا منشی السلام

(بہ شکریہ روزنامہ مشرق)

خوش آمدید

بہ روشن نگینوی

سرزمینِ پاک! تو قسمت پر اپنی ناز کر — جلوہ گر ہے ملتِ اسلامیہ کا راہبر
گلستانِ حکمت و دانش کی تابندہ بہار — سیرت و گفتار کا غازی، وفا کا شاہکار
وہ صداقت کا علمبردار اخوت کا امیں — وہ مروت کا مبلّغ پیرو دینِ مبیں
وحدتِ ملی کا خواہاں، وہ محبت کا نقیب — وہ رفیقِ اہلِ ایماں، ہر مسلماں کے قریب
وہ شہنشاہِ عرب جو خادمِ حرمین ہے — خدمتِ اسلام و ملت اس کا نصب العین ہے
شاہ فیصل کی طرح اس کی بھی ہے یہ آرزو — مسجدِ اقصیٰ کو واپس لے کر ہو وہ سرخرو
جب کسی مومن کو دُکھ پہنچے تڑپ جاتا ہے وہ — مونس و غمخوار بن کے سامنے آتا ہے وہ
وہ مسلمانانِ فلپائن کے غم سے باخبر!! — قضیۂ کشمیر و قبرص پہ بھی ہے اُس کی نظر
مضطرب ہے قلب اس کا خونچکاں لبنان پر — جینا دوبھر ہے جہاں اس وقت ہر انسان پر
تیسری دُنیا کے منصوبے کی وہ روحِ رواں — اس کے دم سے متحد ہیں ایشیا کے حکمراں!
وہ فراعینِ جہاں سے برسرِ پیکار ہے! — قابلِ تعریف اس کا موسوی کردار ہے
میں فرومایہ، تہی داماں سہی، اس پر نثار — میں تو ہوں کیا چیز، میری شاعری اُس پر نثار
قلعۂ اسلام سے یک گونہ رغبت ہے اسے — یعنی پاکستان سے بے حد محبت ہے اسے

ذی وقار و محتشم، صاحبِ نظر، عالم پناہ!
اہلِ پاکستان کے ہیں دیدۂ و دل فرشِ راہ!

بہ شکریہ روزنامہ مشرق

بند خوش دل خاں (بلوچستان) کا ایک روح پرور منظر

خضدار (بلوچستان) کی پرائمری اسکول کی دو طالبات